

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ

پہلی سورۃ جو میں میں سات آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سورۃ فاتحہ کے فضائل
اس سورۃ کو مفسران کریم میں بہت سی فضیلت حاصل ہوئی اور اَوَّل کو مفسران اور بصیرت
اس سے شروع ہوتا ہے، تاکہ اس سے شروع ہوئے، اور نزول کے اعتبار سے میں
سب سے پہلی سورۃ جو صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی سورۃ کو سورۃ اقصیٰ اور مدثر کے چند
آیت ضرور اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں مگر عمل سورۃ فاتحہ کے پہلے نازل ہوئے تھے۔ اس صحت
معاذ سے سورۃ فاتحہ کا نازل ازل میں نزول میں سب سے پہلی سورۃ ہونا منقول ہے اور ان کا مطلب غالباً یہ ہے کہ
کریم دی سورۃ اس سے پہلے نازل ہوئی تھیں، اور شاید اس وجہ سے اس سورۃ کا نام بھی نازل ہو گیا ہو۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ سورۃ ایک حیثیت سے چلنے کے لئے قرآن کا مفتح اور سارا قرآن اس کی
شرح ہے، اور اس وجہ سے کہ چلنے کے لئے قرآن کے مفتح اور بیان اور حق صانع میں دائر ہیں، اور ان دونوں
چیزوں کی پہلی ہی اصول اس سورۃ میں بیان کر دیئے گئے ہیں، انفسہم فیہ الخ لا اله الا الله اور روح الاستبصار
میں اس کا تفصیل بیان ہے، اسی وجہ سے سورۃ فاتحہ کے نام افتخار القرآن اور ان کتاب اور قرآن عظیم
بکی اندر بہت بھی ہوئے ہیں۔ (فرمان)

اس وجہ سے کہ اس سورۃ میں اس شخص کے لئے جو قرآن کی کتاب کا مطالعہ شروع کرے ایک
خاص ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اس کتاب کو اپنے تمام پہلے نیا کرتا اور لغویات سے خالی اللہ میں جو کہ

خاص غلبہ حق اور مادہ ماست کی چیز کے لئے چلے اور دیکھے اور اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرے کہ حلال
مستقیم کی ہدایت عطا ہو، اور شروع سورۃ میں اس ذات کی حمد و ثنا کا بیان ہے جس کی ہدایت میں
یہ درخواست ہدایت پہلی کرتا ہے، اور اسی درخواست کا جواب چار قرآن ہے، جو انکم اذ انکم من
شروع ہوتا ہے مگر انسان نے جو اللہ تعالیٰ سے رام دست طلب کی جس کے جواب میں دکن کتاب
نہیں کرنا شروع کر دیا کہ جو تم مانگتے ہو وہ اس کتاب میں موجود ہے۔

دوسری کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ
سورۃ فاتحہ کی تفسیر تو بہت میں نازل ہوئی نہ انجیل اور توہمیں اور نہ خود مفسران کریم میں کوئی دوسری
سورۃ اس کی مثل ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ میں الی ہرگز نہ نکال سکے، اور اللہ تعالیٰ میں علیٰ علیہ وسلم علیہ وسلم
اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۃ فاتحہ ہر باری کی شفا ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کی شفا ہے
بہت سچ، منعم ہے

سورۃ فاتحہ کا ایک نام دہرہ میں سورۃ شفاء بھی آیا ہے (قرطب) اور سچ چاکری میں ہر دہرہ اس
دیکھو کہ دوسری اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مفسران کریم کی سب سوگوں میں عظیم ترین الحمد
لہ رب العالمین ہے۔ (قرطب)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو ہے مہربان نہایت رحم کرنے والا

بہت فرق کی اس پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم قرآن میں سورۃ مقل کا جزو
بیک حیثیت ہے، اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ سورۃ فاتحہ کے ہر سورۃ کے شروع میں بسم اللہ
جس میں ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کا انکشاف ہے کہ بسم اللہ سورۃ فاتحہ کا اتمام سوگوں کا جزو کی باتیں
انہم علیہم اور خدۃ کا مسلک ہے، جو کہ بسم اللہ سورۃ فاتحہ کے اور کسی سورۃ کا جزو نہیں، بلکہ ایک مستقل
آیت ہے، جو ہر سورۃ کے شروع میں دوسروں کے دو بیان فعل اور دستہ اظہار کرنے کے لئے
نازل ہوئی ہے۔

کتاب قرآن دہرہ کریم کہم کہم، اہل جاہلیت کی عادت تھی کہ اپنے کاموں کو بتوں کے نام سے شروع کیا کرتے تھے،
بسم اللہ شروع کرتے تھے کہم کہم، یہ جاہلیت کو ماننے کے لئے قرآن کی سب سے پہلی آیت، جو جزو کی بات
کے کرتے اس میں مفسران کہم کہم کے نام سے شروع کرنے کا حکم دیا گیا اور نہایت سچہ تھا۔
حاضر میں نے فرمایا کہ قرآن کے سوا دوسری تمام اساتذہ میں، جس بسم اللہ سے شروع کی گئی ہے

اور بعض علمائے فرمایا ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم قرآن اور اہل بیت علیہ السلام کی خصوصیت ہے۔ دونوں قول کی تعلیم یہ ہے کہ اللہ کے نام سے شروع کرنا تو تمام آسمانی کتابوں میں مشترک ہے، مگر اہل بیت علیہ السلام الرحمن الرحیم قرآن کی خصوصیت ہے، یہاں بعض روایات میں ہے کہ حضرت صل اللہ علیہ وسلم بھی ابتدا میں پرکام کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کے لئے بسم اللہ کہتے اور حضرت جعفر، جب آیات بسم اللہ الرحمن الرحیم قرآن کی تلاوت فرمائی تو انھیں اللہ کا نور عطا فرمایا، اور یہ بسم اللہ کے لئے بہت باری ہو کر قرآن میں اس کے لئے اور فرمایا کہ میں اس کا بابت ہے کہ پرکام کو اللہ کے نام سے شروع کیا جائے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر پرکام جو بسم اللہ سے شروع کرے گا وہ بے برکت رہتا ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ گھر کا دروازہ بند کر دو تو بسم اللہ کہو، جس طرح مٹی کر دو تو بسم اللہ کہو، برحق تو حکم تو بسم اللہ کہو، کھا نا کھا لے، پانی پیئے، دھو کر کھئے، سواری پر سوار چڑھو اور آنے کے وقت بسم اللہ کہئے کی روایات قرآن و حدیث میں وارد ہوتی ہیں و قرآن میں پرکام کو بسم اللہ سے اسلام نے پرکام کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کی وجہ سے کہ اللہ کی حمد کی شریعت کے لئے کی گئی ہے۔ زندگی کا آغاز اللہ تعالیٰ کی طرف سے شروع ہوتا ہے کہ وہ قدم قدم پر اس مخلوق و مادی کی حمد کرتا ہے کہ میرا وجود اور میری کامیابی اللہ تعالیٰ کی شہادت و ارادے اور اس کی مادی کے نہیں ہو سکتا جس نے اس کی برکت و رحمت اور تمام ماضی اور ہستی کی کامیابی کی ایک حمد و ثناء عطا کرنا مقصود ہے کہ خدا میں کوئی وقت شروع ہوتا ہے، رحمت اور نافرمانی کیسی اور طریقہ کو دنیا میں دینی ہی مٹی، ایک کامیابی کا پتہ ہے اور ایک مسلمان بھی، مگر مسلمان اپنے لئے ہے پہلے بسم اللہ کہ کر یہ افتخار کرے کہ یہ حق زمین سے پیدا ہونے سے لیکر یہ کامیابی تک اس کے لئے زمین اور سب زمیں اور ہوا و آسمانی مخلوق کی قاضی، یہ ہوا و آسمانی مخلوق کی نعمت صرف ہو کر بنام ہوا ہے اس کا جمل کرنا میرے میں نہیں، خدا اللہ ہی کی ذات ہے جس نے اس تمام مراحل سے گزار کر یہ امر ایک گونہ سے عطا فرمایا ہے، زمین و آسمان دونوں سے ملے جاتے ہیں، پہلے میرے ہیں، مگر زمین و آسمان سے پہلے اور یہ ہوا ہونے کے وقت اللہ کا نام ہے کہ اللہ کے ساتھ اس طرح اپنے دل کی حمد کرتا ہے جس سے تمام دنیا و آسمان اور ماضی و ہستی و فکر خدا ہو کر ماضی میں جس کی جاتی ہیں، مومن ہوا کی پرستش ہوئے ہیں بسم اللہ کہ کر گیا ہے، بنادیتا ہے کہ اس سواری کی پیدائش کا یا یہ کیا نام چاہو اس کو میرے قبیلے میں دینا، انسان کی خدمت سے! ہر چیز ہے، اور اللہ عزت ہی کے ساتھ ہوتے انتظام فکر کا نام کہ کہیں کی کڑی، کہیں کا نوا، کہیں کی خلقت و ماضی، انہیں کے کا کر، کہیں کے چلنے والے سب

ہری نعمت میں گئے ہوتے ہیں، چند پہے شروع کرنے سے اپنی بڑی خلقی نعمت کو ہم اپنے کام میں لے سکتے ہیں، اور وہ پہلے ہیں، پہلے ساتھ کہیں سے نہیں لاسے تھے، مگر اس کے حاصل کرنے کے تمام اسباب بھی اسی کے پیدا کیے ہوتے ہیں، مگر یہ کہ اسلام کی طرف اس ایک ہی شخص کی تخلیق نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، اس لئے یہ کہنا اصل صحیح ہے کہ بسم اللہ، لکھنا کاتبین سے تائے کا نہیں، بلکہ نمک کا سزا بنتا ہے، فذلک الحمد علی دین الاسلام و تعالیٰ تبار۔

مستقلہ: قرآن کی تلاوت شروع کرنے کے وقت، اولاً اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ اور پھر بسم اللہ الرحمن الرحیم شروع کرنا سنت ہے، اور دوسری تلاوت کا وقت بھی سورۃ براءت کے طے بہرورت کے شروع میں بسم اللہ کی سنت ہے۔

اس جہد کے بعد آیات بسم اللہ الرحمن الرحیم کی تفسیر دیکھئے

بسم اللہ الرحمن الرحیم: بسم اللہ الرحمن الرحیم سے مرکب ہے، ایک حرف باء، دوسرے اسم، جن میں سے جن معنی مناسب مقام ہیں، ان میں سے ہر ایک معنی اس جگہ لے جاتے ہیں:

اول، معصیت، یعنی کسی چیز سے کٹ کر اس سے منقطع ہونا، دوسرے، اعتنا، یعنی کسی چیز سے دور رہنا، تیسرے، عزت، یعنی کسی چیز سے برکت حاصل کرنا۔

لہذا بسم میں انہی اور معنی تفصیلات بہت ہیں، جن کا جانتا عالم کے لئے ضروری نہیں، البتہ بسم اللہ کی ہے کہ اور وہی مگر تفسیر کے نام سے کیا جاتا ہے۔

لفظ اللہ، اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک بڑا اور سب سے زیادہ جانتا نام ہے، اور بعض فرماتے ہیں کہ اسم اعظم کہا ہے، اور وہ نام اللہ کے کو اس کے دوسرے کا نہیں ہو سکتا، اس لئے اس لفظ کا نام اور تفسیر نہیں آئے، کیونکہ اللہ واحد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، غلام ہے کہ اللہ نام ہے اس کو جو اس کا چر تمام صفات کا اس کا جامع اور صاحب ربوبیت کے ساتھ متصف ہو، کیا اور بے مثال ہو۔

اس لئے بسم اللہ کے معنی صرف اللہ کے ذکر و تکرار میں ہی کیے جاتے ہیں، اللہ کے نام کے ساتھ، اللہ کے نام کی حمد، اللہ کے نام کی برکت سے،

لیکن یہ تو ان صورتوں میں ہے جو اس کے کلام کا مکمل ہے، جب تک اس کام کا ذکر نہ کیا جائے جو اللہ کے نام کے ساتھ، اس کے نام کی تکرار، یا مقصود ہے، اس لئے بعض قاعدے کے مطابق یہاں کوئی فعل مناسب مقام ضرورت ہو سکتے، مگر شروع کرنا ہوتا ہے، اللہ کے نام کے ساتھ، اور مناسب ہے کہ فعل میں بعد میں ضرورت آتا جائے، مگر قطعاً شروع اس اسم اللہ سے ہو، فعل ضرورت بھی اسم اللہ سے پہلے نہ آئے، صرف حرف آج کا اسم اللہ سے پہلے آتا ہے۔

جہاں وہاں میں منظر اور دھنوں کی کشش نظر آئے اور کروڑوں متبع مٹن جیسے نرس انسان کے دامن دل کو
جروقت اپنی طرقت کھینچ کر لیتی ہیں اور اپنی خیریت پر مجبور کر دیتی ہیں۔ اگر خود ان کو کھرا کیا جائے تو ان سب
جیسوں کے کہنے میں ایک ہی دست قدرت کا شہرہ خاطر آئے۔ اور وہ ان میں جہاں کہیں گئے ہیں
کی خیریت کی باتیں عام کی حقیقت اس سے زیادہ ہمیں چاہیے کی نقیض و انکار کی تصویر پر ایک حقیقت
کی تصویر کی جانے کے سبب تو یہیں درحقیقت نقاش اور مصور کو ایک عمارت کی پوری جہاں اس جگہ نے
کروڑوں کے خاطر میں سمجھنے ہوئے انسان کے سامنے ایک حقیقت کا اور دائرہ کھول کر دیکھا اور کھرا کر سامنے
کھڑی ایک ہی وحدت سے مربوط ہیں اور ساری خیریتیں درحقیقت اسی ایک قادر مطلق کی جہاں ان کے
کسی دوسرے کی خیریت سمجھنا نظر ابھرتی ہے کہ ان سے

حور را با تو بیست است و بیست

پرو و پرو که رفت پرو و پروست

اور یہ ظاہر ہے کہ چاہے ساری کائنات میں کائناتیں محدود حقیقت ایک ہی ذات پر موقوف
کے مستحق ہوں ہی ذات پر منحصر ہے۔ اس سے معلوم ہو کہ اگر **الْحَقُّ** یقیناً ہر محدود مادی کے لئے
واجب الیاس ہے، لیکن اس میں کسی ایک مجزاۃً انفرادے مخلوق پر کسی کی بنیاد یا ختم کر دی گئی، والد اول پر نہیں
طریق پر توجہ کی جائے۔

[illegible]

رب العالمین کی تفسیر اس مختصر لفظی جملے کے بعد اللہ تعالیٰ کی اصل صفت و ذات العباد و ربوبت کے لئے ہے۔ مختصر الفاظ میں، اس کی بھی شرح دیکھئے۔

لفظ قرابت کے معنی حوالی الفت کے اعتبار سے قرابت و پرورش کرنے والے کے ہیں اور قرابت

اس کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کو اس کے تمام مصالح کی رعایت کر کے ہونے والا درجہ اسے بڑھا دیا جائے۔
 میزان تک کر وہ حتمی کمال کو پہنچ جاتے۔

یہ لفظ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے لئے مخصوص ہے کسی مخلوق کو بدین اضافت کے کہنا نہ شیعہ، نہ کبیرہ، نہ غلامیہ و نہ خارجہ حریثت کے لوگوں اور نہ کسی کی تمنا حریثت کو سمجھتا ہے۔

آنگاه که این عالم کیست به این میں زندگی تمام اجناس : انسان، جانور، سوخت اور تمام
ستارے و نور، غما، برق و باران، فرشتے، چنگا، زمین و آسمان کی تمام مخلوقات، حیوان، انسان

نہایت و جہاد و سب ہی داخل ہیں، اس لئے تربت، اذنی حقین کے سامنے پہنچنے کے لئے اشدّ قہا کی منتہام
 ایسا کہ کائنات کی تربیت کرنے کے واسطے ہیں، اور وہ بھی کبھی بید نہیں کر سکیا یا پاک حاکم کے سامنے ہمیں
 پہنچنے میں اور اس کے خلاف شمس و قمر کی اور برق و باران اور زمین کی فکھور خلخاتوں کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں
 یہ سب ایک ہی عالم ہیں، اور اس سب سے اور بڑا اور انھوں نے دیکھ کر عالم حاکم کی اس عالم سے آپر کی مخلوق
 موجود ہوں، انھام ہر شے کے اپنی تصویر میں فرمایا ہے کہ اس عالم سے آپر کی امت تمام مخلوق اور
 وہی عقیدے سے ثابت ہے، اور یہ بھی ثابت ہے کہ اشدّ قہا کی کوہر جینہ تربت ہے، اس کے لئے کیا
 شکل کے کوہر سے اس لامتناہی مخلوق میں جانے بیٹھ و نظر عالم کی طرح کے اور بھی ہزاروں فکھور
 عالم بنائے ہوں۔

حضرت علامہ رحمہ اللہ نے بتایا ہے کہ عالم کا پس ہزار ہا پروردگار شرف سے منفرد ہے۔ ایک عالم ہے، اسی کے ہوا ہیں، اسی طرح حضرت متعالیٰ نام تو قیہ کے معقول ہے کہ عالم کی ہزار ہیں اور قیہ میں اس پر جو شبہ کیا جاتا تھا کہ غلط میں انسانی مزاج کے مناسب بڑا نہیں ہوئی، اس لئے انسان کو ان کی حیوان وہابی فزہ نہیں رہ سکا، امام زادہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ کیا وہ عالم ہے کہ اس عالم سے خارج غلط میں جو دوسرے عالم کے باشندے ہوں ان کا مزاج بھی جیسا کہ عالم کے باشندے کی طرح ہو جاتا ہے، فزہ نہ کہیں، یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ ان عالموں کے باشندوں کے مزاج و طبع ان کی فزہ و جو ایساں کے باشندوں سے بالکل مختلف ہوں۔

یہ حضرت قاسم سے ملت ہو ستر سال پہلے کے اسلامی حکمران ہارون کا کھنسا ہوا بیوی کے
 اعضاء و خفا کا سرور اس کی بیانی قاضی کے آفت و زوال ایجاد ہوئے تھے آج کا کلن اور اس سچنگی کی
 زمانے میں خط کے مراسلتوں نے جو کچھ کیا تھا اور کئی برس کے لئے انہیں اس کا صلہ تھا جس کی
 خط کو کئی صد جاہلیت نہیں ہے اور کچھ نہیں کہنا کا کس کی غیر متناہی خط میں کیا کچھ جو ہے
 اس و نیکلے قریب ترین سہیلوں کا ہوا اور نیکلے کی باری کے اپنے میں جو کلمات کچھ کے جوہر
 ماہرین سناس ہیں کہ یہ ہے کہ کبھی بھی کہ اگر ان سیاست کا ہر کچھ آج باریوں کے جوہر میں
 کردہ انھیں خصوصیات اور اس مزاج و طبیعت کے ہوں جس عالم کے انسان اور حیوانات و نباتات
 کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ بلکہ اس میں قیاس ہے کہ ان کے مزاج و طبیعت ان کی فضاء و وضوایت
 میں ان کے کوٹوں سے بالکل مختلف ہوں اس لئے ایک کردار کثیر تر بنا کر دے گا کہ کوئی چیز نہیں۔

امام بیاضی کی تائید اور اس مسئلے کی جدید معلومات کے لئے دو مقالات کافی ہیں۔ امریکی خطائی مسافر جان تمکین نے سال میں غصہ کے منتشر واپس آکر شائع کرایا ہے، جس میں شامی سال کا نام دے کر ایکس ملوی حضرت وصاف کا بیان ذکر کیا اور اس کے ذریعے اپنی وصیت لکھ کر جنگ خلا کی طرح لڑان کا کام

وَلَقَدْ عَلَّمْتُمُ الْقُرْآنَ ابْنًا لِّكَ
ذُو الْقُرْبَىٰ اَبْنًا اَوْفَكْتَعْبَرُ
لَقَدْ عَلَّمْتُمُ ابْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ
اور دوسری جگہ فرماتا ہے

عَلَّمَ ابْنًا لِّكَ ابْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ
اَبْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ اَبْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ
اور تیسری جگہ فرماتا ہے

اَبْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ اَبْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ
اور چوتھی جگہ فرماتا ہے

اَبْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ اَبْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ
اور پانچویں جگہ فرماتا ہے

اَبْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ اَبْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ
اور شیشویں جگہ فرماتا ہے

اَبْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ اَبْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ
اور ساتویں جگہ فرماتا ہے

اَبْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ اَبْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ
اور آٹھویں جگہ فرماتا ہے

فَقَدْ عَلَّمْتُمُ الْقُرْآنَ ابْنًا لِّكَ
ذُو الْقُرْبَىٰ اَبْنًا اَوْفَكْتَعْبَرُ
لَقَدْ عَلَّمْتُمُ ابْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ
اور دوسری جگہ فرماتا ہے

عَلَّمَ ابْنًا لِّكَ ابْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ
اَبْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ اَبْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ
اور تیسری جگہ فرماتا ہے

اَبْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ اَبْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ
اور چوتھی جگہ فرماتا ہے

اَبْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ اَبْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ
اور پانچویں جگہ فرماتا ہے

اَبْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ اَبْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ
اور شیشویں جگہ فرماتا ہے

اَبْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ اَبْنًا لِّكَ ذُو الْقُرْبَىٰ
اور آٹھویں جگہ فرماتا ہے

سراپہ مستقیم کو متعین کرنے کے لئے اپنے مقبول بندوں کی فہرست دینا اس کی دلیل ہے کہ محض کتاب کا مطالعہ تعلیم و تربیت کے لئے کافی نہیں، بلکہ کسی ماہر سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

معلوم ہے کہ انسان کی صلاح و فلاح کے لئے دو چیزیں ہی ضروری ہیں، ایک کتاب اللہ ہے اور دوسرا انسان کو زندگی کے ہر شعبے سے متعلق احکام و حدود ہیں، اور دوسرے دو اہل اللہ ہیں اللہ نے ان سے استفادے کی صورت سے کہ کتاب اللہ کے معارف و اصول پر دہلی اللہ کو چکا جانے، چوبیس صدی تک آفریقہ، ان کو دہلی اللہ ہی نہ کیا جانے، اور جب وہاں اللہ کے حق میں حاصل ہو جائیں تو اس سے کتاب اللہ کا مفہوم سمجھنے اور عمل کرنے کا کام لیا جائے۔

فرد و افراد انفرادی
 کا بڑا سبب
 ہے کہ کچھ لوگوں نے صرف کتاب اللہ کو لیا، رجال امثہ سے قطعاً
 کر لی، ان کی تفسیر و تعلیم کو کوئی حیثیت نہ دی، اور کچھ لوگوں نے صرف
 رجال اللہ کو مباح حق سمجھا لیا، اور کتاب اللہ سے انکے ہند کر لی، اور ان دونوں طریقوں کا نتیجہ یہ ہے۔

سُورَةُ فَاتِحَةِ الْكِتَابِ

[illegible]

دعا کا کہنا کہ اے اللہ! اس خاص اسلوب سلام کے ذریعہ انسان کو یہ تعلیم دے جس سے کہ جب اللہ جل جلالہ سے کوئی دعا مانگو اور خواست کرنا ہو تو اس کا طریقہ یہ ہو کہ پہلے اس کی حمد و ثناء کا ذکر فرما دے اور پھر جسے مانگنا چاہے اور دعا مانگو کہ اے اللہ! میں نے تجھ سے دعا کی کہ تیری رحمت میں مشکل کشا اور حاجت روا مانا ہے اس لیے اس کے بعد یہاں سے مطلب کی دعا کر دے اور اس طریقہ سے جو دعا کی چاہے اس کے قبول ہونے کی قوی امید ہے (الحکم جتنا ص ۱۱)

اور وہاں پہنچ کر ایسی حالت دیکھیں کہ روبرو میں انصار کے ساتھ انسان کے علم کا مقصد
اصل ہو جائیں، جیسے دایرہ صراطِ مستقیم کو دنیا و دین کے برنامہ میں اگر انسان کا راستہ سیدھا ہو جائے
تو کہیں شکر کہے اور نقصان پہنچے تو غلغلہ کہیں رہتا، فرض اس جگہ کو حق تعالیٰ کی طرف سے اپنی حمد
و ثناء کر کے اصل عقیدہ انسان کو تسلیم دیتا ہے۔

۱۶) اس سورت کے پہلے چلے میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کر کے کی تعلیم و تربیت
فرما کر انسانی فطرت پر مبنی ہے۔

کاؤر کو نہیں اس میں شائد ہے کہ اگر تمام کی فہمیں ہے غار میں، مانگ کا کوئی انسان، عامل نہیں کر سکتا۔
 جیسا کہ مشرقی کریم کا اشارہ ہے، *وَالَّذِينَ يَتَّبِعُونَكَ يَبْتَغُونَ فِتْنَةً مِنْكَ لِيُقْضَىٰ لَهُمْ أَهْلُ عَذَابِهِمْ* (۱۳۰) میں اگرچہ اشارہ خالی
 کی غرض کو شکار کا ہے تاہم نہیں کر سکتے انسان اگر اس کے عالم کو سمجھ کر اپنے ہی وجود پر نظر ڈالے تو
 سلوم ہو گا اس کا جو خود کا عالم کھینچے، ہیں میں عالم اگر کے سامنے نئے مورچہ ہیں اس کا کچھ
 زمین کی مثال ہے، اس پر گئے دالے ہیں نباتات کی مثال ہیں، اس کی ڈال ہیں پھاؤں کی شبیہ ہیں، اس کے
 بدل کی گلیں ہیں جن کوں دال ہے نرمی کے لیے پتھر دال ہے پتھر اور فول کی مثال ہیں۔

انسان دو چیز سے مرکب ہے ایک اپنی دوسرے روح ، اور دوسری ظاہر ہے کہ قدرتِ حق تعالیٰ نے اسے روحِ اصل ، و اصلی کو باطن میں ، و بدنِ محض کے تابع اور تابعی درجہ رکھ رکھا ہے ، اسی کو اپنی حسرت کے متعلق بدنِ انسانی کی تحقیق کرنے والے علماء اور باطنی شریعت نے بتایا ہے کہ اس میں اضدادِ حق تعالیٰ نے قیاداً باہم صراع اور مواضع رکھے ہیں ، اس کے بدن میں عینِ حق سے زیادہ جوڑیوں ، ہر ایک جوڑی کا وہ تعالیٰ ہی کی قدرتِ کاملہ نے ایسا حکم کیا ہے کہ ہر وقت کی حرکت کے باوجود نہ وہ جھکے ، نہ اس کی حرکت کی ضرورت ہو ، عادت انسان کی عمر ساٹھ ستر سال بنتی ہے ، پوری عمر اس کے نرم و نازک اعضاء اور ہڈی کے سبب جوڑا کثرتِ نباتات اس طرح حرکت میں رہے ہیں کہ کوفہ کو بھی جوتا توکس ملتا ، عمری تعالیٰ نے فرمایا: **لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَخَافُوا عَلَيْهِمْ** ۱۷۸: ۱۷۹ یعنی اگر تم نے ہی انسان کو یہ کیا ، اور ہم نے ہی اس کے سبب جوڑا مضبوط کیا ہے ، اسی قدر ہی مضبوطی کا نتیجہ کہ تمام مادت کے مطابق یہ نرم و نازک جوڑے ہر سال اور ہر لمحہ تک کام نہیں دیتے ، انسان اعضاءِ جلیجی معروف ایک آنکھ ہی کو لے لیجئے ، جس میں جوڑے تعالیٰ جلی شانہ کی نکت کے مطابق جوڑے ، انسان کو کھر بھر کر کے بھی اُن کا پایا اور لگا آسانی نہیں ۔

پھر اس آنکھ کے صحت ایک مرتبہ کے عمل کو یاد کر کے حساب لگائیے تو اس ایک منٹ کے عمل میں اتنا حال کی کتنی کمزورییں کام کر رہی ہیں، جو عورت ہوتی ہے، جو بچہ آنکھ آنکھ اور اس کے کسی چیز کو دیکھا اس میں جس طرح آنکھ کی دونوں حالتوں کے عمل کی سب سے اسی طرح اثر شعل کی بڑی بڑی عظمت کا اس میں بڑا فائدہ ہوگا اگر آفتاب کی روشنی بڑھو تو آنکھ کے اندر کی روشنی کام نہیں لے سکتی، پھر آفتاب کے لئے بھی ایک فضا کی ضرورت ہوتی ہے، انسان کے دیکھنے اور سمجھنے کو کام میں لانے کے لئے سڑا، دوا و جراحی کی ضرورت ہوتی ہے، جس سے معلوم ہوگا کہ ایک مرتبہ نظر آنکھ کو دیکھیں تو اس میں دوسرے عالم کی ظاہریں کام کرتی ہیں، یہ ایک مرتبہ کا عمل ہے، پھر آنکھ میں دن میں کتنی مرتبہ دیکھیں تو دراصل کیا کتنی مرتبہ، ہم کتنی مرتبہ، یہ ایسا سلسلہ ہے جس کے بعد اور دلیل انسانی طاقت سے خارج ہیں۔

اسی طرح کائنات، زبان، دانش و ایمان کے جتنے کام ہیں ان سب میں ہمارے عالم کی قومیں شامل

کی حمد و ثناء کا اہل کائنات کا وسیلہ ہے کہ برام دست اللہ تعالیٰ سے دعا، مانگنا و ادا ہے۔ حدیث اور اشاعت
قرآن سے اس کا بھی جواز ثابت ہے، وہ بھی اس ہی مخالفت میں داخل نہیں جس صورت اللہ تعالیٰ کے لئے
مخصوص اور بجز اللہ کے لئے حرام و مشرک ہے۔

جب وہ مخصوص مخالفت و امداد و جواز اللہ تعالیٰ کے ساتھ حاجی اور مظلوم کے لئے مشرک ہو کر کسی بڑے
اس کی دُعا میں ہیں، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی فرشتے یا پیغمبر یا ولی یا کسی اور انسان کو خدا تعالیٰ
کی قدرت کا وہ مطلق اور یقیناً مطلق سمجھ کر اس سے اپنی حاجت مانگے، یہ تو ایسا کھلم کھلا ہے کہ کام مشرکین
نہ ہے کہ اس کو کھنچتے ہیں، اپنے تئیں اور ان کی اولاد کو اہل خدا تعالیٰ کی مثل قادر مطلق اور یقیناً مطلق
سمجھ کر ہی نہیں مانتے۔

دوسری قسم وہ ہے جس کو کھلم کھلا کرتے ہیں، اور قرآن اور اسلام اس کو باطل و مشرک قرار
دیتا ہے، ایسا فرقہ بندیوں میں ہیں، وہ کہ اس میں مخالفت و امداد و امداد اللہ کے سوا کسی سے نہیں
پا جاتے، وہ یہ کہ اللہ کی کسی مخلوق فرشتے یا پیغمبر یا ولی یا کسی اور ان کے خلق پر عقیدہ رکھنا اگرچہ
تک وہ مطلق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور کامل اختیار اس کی ہے، لیکن اس نے اپنی قدرت و عیشیا کا
کچھ حصہ تقاضا کر سونپ دیا ہے، خود اس واقعہ میں وہ خود مختار ہیں وہ امتحان و استعدا ہے
جو عین و ظاہر میں فرق اور اسلام و کفر میں ہے، اگر ان اس کو مشرک و حرام قرار دیتا ہے،
بت پرست مشرکین اس کے قائل اور اس پر عامل ہیں۔

اس معاملے میں دھوکہ دہیوں سے گھٹا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بہت سے فرشتوں کے اختیارات
ظہار کے بہت سے کام جاری کرتے ہیں، دیکھتے والے اس معاملے میں بڑھ سکتا ہے کہ اس فرشتے کو اللہ تعالیٰ
نے چھتیاں سپرد کر دی ہے، یا انبیا علیہم السلام کے ذریعہ بہت سے ایسے کام جو وہی آتے ہی
جو امام اور اولیٰ کی قدرت سے خارج ہیں، جن کو کھنچتے کہا جاوے، اسے اس طرح اولیاء اللہ کے ذریعے
ہو ایسے ہی بہت سے کام جو وہی آتے ہی، جن کو کرات کہا جاوے، یہاں سرسری غلطیوں کو یہ
مناظرہ گنگ جانا کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کاموں کی قدرت و شہادت دیاں کو سپرد کرنا تو اس کے ہاتھ سے
یہ کیسے وجود میں آئے، اس سے وہ انبیا و اولیاء کے ایک درجے میں یہ خدا کا ہر نہ کا عقیدہ، بلکہ یہی
حالانکہ حقیقت یوں نہیں، بلکہ جبرائیل اور کرامات برام دست حق تعالیٰ کا فضل ہوتا ہے، صورت
اس کا جو وہ پیغمبر یا ولی یا کسی اور بزرگ بران کی عظمت ثابت کرنے کے لئے سمجھا جاوے، پیغمبر اور ولی کو اس
کے وجود میں لانے کا کوئی نہیں ان میں ہر تار قرآن مجید کی بے شمار آیات اس پر شاہد ہیں، مثلاً آیت
فما یؤتیہم اللہ من رزق یشکر اللہ ربہم (۱۰۱) میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس محبوبے کا ذکر
ہے جس میں آپ نے دشمن کے لشکر کی طرف ایک مٹی بکھری تو اس کی پیکیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے

وہ مٹی لشکر کی آنکھوں میں جا گئیں، اس کے مطلق ارشاد ہے کہ آپ نے نہیں سمجھیں بلکہ اللہ تعالیٰ
نے سمجھ لی تھی، جس سے معلوم ہو کہ پیغمبر جو نبی کے واسطے سے صادر ہوتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ
کا مصلیٰ ہوتا ہے۔

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کو جب ان کی قوم نے کہا کہ اگر آپ سچے ہیں تو جس عذاب
ڈرا ہے میں وہ بلائیے، تو انہوں نے فرمایا: ایشا نایت نکذہ یو ایشا ہنٹ ایشا ہنٹ (۲۳: ۲۴) میں نے
کے طور پر آسمان عذاب ازل کرانیر سے قبضے میں نہیں، اللہ تعالیٰ اگر چاہے کہ تو یہ عذاب آج یا
بہتر تم اس سے بھاگ نہ سکو گے۔

سورہ البراکہ میں ان کے ذریعہ سے ایک طاقت کا یہ قول ذکر فرمایا ہے ایشا ہنٹ ایشا ہنٹ
نایت نکذہ یو ایشا ہنٹ ایشا ہنٹ (۲۳: ۲۴) میں نے کھنچا اور کھنچا کرنا ہائے، انہوں میں نہیں، اللہ تعالیٰ
کے ازل و نیست کے لیے کچھ نہیں ہو سکتا اس وجہ سے کہ تو یہ پیغمبر کو ولی جب چاہے ہو چاہے
موجود کر امداد دیکھائے یہ تھا جس کے میں نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرو
انبیاء سے بہت سے سینے مجرات کا مصلح ہر شے کہیں نے کہا، مگر جس کو اللہ تعالیٰ نے پا اٹھا ہرگز یا
جس کو نہ پا انہیں ہوا، پھر امتدادی اس کی شہادتوں سے ہوا ہوا ہے۔

ایک عمومی مثال سے اس کو یوں سمجھ لیے کہ آپ میں کہے ہیں میں نے میں اس میں ہلکے اور دشمنی سے
اور تو بہت پیچھے سے آپ کو پہنچ رہی ہے، مگر یہ جب اور پکھلا اس روشنی اور جو پہنچنے میں خداوند
نہیں، بلکہ یہ اس میں بڑا رکھنے کے محتاج ہیں جو کہ وہ اپنے باور اس کے ساتھ ان کو حاصل ہے
ایک سینڈ کے لئے جو بڑا ٹوٹ جاتا، تو وہ جب کہ روشنی سے نہ پکھلا ہوا ہے سکتا ہے، کہ جو
درحقیقت وہ اصل برباد ہو چکے کا یہ نہیں، بلکہ یہی کی زندگی ہے، جو اور اس سے پہلے پہنچ رہی
ہو انبیا و اولیاء اور سب فرشتے ہر عمل میں برام دست حق تعالیٰ کے محتاج ہیں، اس کی قدرت و
شہادت سے سب کام درجہ دے گئے ہیں، اگرچہ انہوں کو اس کا جب اور پکھلے کی طرح انبیا و اولیاء کے
اختیارات پر ہو گئے۔

اس مثال سے بھی واضح ہو گیا کہ ان چیزوں کے صدور اور وجود میں اگرچہ بہت انبیا و اولیاء
انہیں مگر ان کا وجود باوجود ولی سے باطل ہے، وہ عمل بھی نہیں، جیسے صدور پیچھے کے پیغمبر کو روشنی
اور جواز انہیں پہنچ سکتے ہیں مجرات و کرامات میں انبیا و اولیاء کے پیغمبر نہیں مٹتے، اگرچہ یہ فرقی ضرور
ہو کہ یہی حد تک اور کمش و دست ہونے کے باوجود آپ کو پیغمبر کے وہ روشنی اور پیغمبر کے ہوا
کا مصلحت و فائدہ انہیں سے، اور مجرات و کرامات میں حق تعالیٰ کو سب کچھ قدرت ہے کہ پیغمبر یا ولی
پیغمبر ولی کے جس اس کا پیغمبر فرما دیں، مگر مگر اللہ نہیں ہے کہ ان کا صدور و پیغمبر اور اولیاء یا ان کے

نہیں ہوتا، کیونکہ ایسے خوارق عادات کے اظہار سے جو مقصد کر وہ اس کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔

اس لئے معلوم ہوا کہ عقیدہ تو یہی رکھنا ہو کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت سے ہو رہا کہ اس کے ساتھ انبیاء و اولیاء کی عنایت و ضرورت کا بھی اعتراض ضروری ہے، اس کے بغیر رضائے الہی اور طاعت احکام خداوندی سے محروم رہیگا جس طرح کوئی شخص بلب اور پتکے کی قدر نہ پہچانے اور ان کو ضائع کرنے تو ردشنی اور خواہے محروم رہتا ہے۔

وسیلہ، استقامت اور ہمت اور کس مسئلے میں بکثرت لوگوں کو اشکال رہتا ہے، امید ہو کہ اس تشریح سے اصل حقیقت واضح ہو جائے گی، اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ نہ ہمارا واد لیا، کو وسیلہ بنانا نہ مطلقاً جائز ہے اور نہ مطلقاً ناجائز، بلکہ اس میں وہ تفصیل ہے جو اوپر ذکر کی گئی ہے کہ کسی کو اختیار سمجھ کر وسیلہ بنایا جائے تو شرک و حرام ہے، اور نص واسطہ اور ذریعہ سمجھ کر کیا جائے تو جائز ہے، اس میں عام طور پر لوگوں میں اذیاد و تقریط کا عمل نظر آتا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب والستدروسین المبنیٰ والمعاد

صراط مستقیم کی ہدایت دنیا اور آخرت میں یہ بات وضاحت سے آگئی ہے کہ قرآن کریم نے جس میں کلمہ کا مستیابی ہے دعا کو ہر شخص کے لئے ہر حال میں انتخاب فرمایا ہو وہ صراط مستقیم کی ہدایت کی دعا ہے جس طرح آخرت کی کامیابی اس صراط مستقیم پر ہوتی ہے، جو انسان کو جنت کی طرف لیجاتا ہے اس طرح دنیا کے سامنے کاموں میں بھی غور کرو تو کامیابی کا مدار صراط مستقیم ہی ہے جس کام میں وہ آلات و ذرائع خستہ یا کئے گئے جس کے نتیجے میں مقصد کا حصول عاۃً لازمی ہو تو کامیابی عاۃً لازمی ہوتی ہے، چنانچہ انسان اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا تو اگر وہ غور کرے تو معلوم ہو جائے گا کہ کام کے کسی مرحلے میں اس نے غلطی کی ہے، صحیح راستہ ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا، اس لئے ناکامیابی ہوئی۔

اس کا حاصل یہ ہو کہ صراط مستقیم کی ہدایت صرف آخرت اور دین کے کاموں کے ساتھ مخصوص نہیں، دنیا کے سب کاموں کی درستی اور کامیابی بھی اسی پر موقوف ہے، اس لئے یہ دعا ایسی ہو کہ دین کو ہر وقت عز و جان بنانے کے قابل ہے، شرط یہ ہو کہ آنحضرت اور نبوت کے ساتھ کی جائے، محض الفاظ کا پڑھ لینا نہ ہو، واللہ الموفق والمعين۔

بسم اللہ تعالیٰ تفسیر سورۃ فاتحہ ختم ہوئی،

واللہ اعلم بالصواب والستدروسین المبنیٰ والمعاد

بسم اللہ تعالیٰ

سورۃ الفرقان

ان اور تعداد آیات | اس سورت کا نام سورۃ الفرقان ہے، اور اسی نام سے حدیث اور آثار صحابہ میں اس کا ذکر موات ہے، جس روایت میں سورۃ بقراءہ کہنے کو منع کیا ہے وہ صحیح نہیں، دین کثیر تعداد آیات دو سو تھیاسی ہیں اور کلمات چھ ہزار دو سو اکیس اور حروف پچیس ہزار پانسویں (ابن کثیر)

زمانہ نزول | یہ سورت مدنی ہے، یعنی ہجرت مدینہ طیبہ کے بعد نازل ہوئی، اگرچہ اس کی بعض آیات مکرّمہ میں حج کے وقت نازل ہوئی ہیں، مگر وہ بھی باصطلاح مفسرین مدنی کہلاتی ہیں۔

سورۃ الفرقان قرآن کریم کی سب سے بڑی سورت ہے، اور مدینہ طیبہ میں سب سے پہلے اس کا نزول شروع ہوا، اور مختلف زمانوں میں مختلف آئین نازل ہوئی ہیں، یہاں تک کہ ربیعہ یعنی سورۃ کے متعلق ہر آیات ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں بھیج کر کے بعد نازل ہوئیں، اور اس کی ایک آیت **وَاتَّقُوا** **يَوْمَئِذٍ يَخْلَعُ فِي ذُلٍّ** (۱۸:۲) تو قرآن کی بالکل آخری آیت ہے، جو سند ہجری میں ۱۰ ہجری کو قرآن کے مقام پر نازل ہوئی، جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے فرائض ادا کرنے میں مشغول تھے، و قرطبی، اور اس کے اسی نوے دن کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اور وحی الہی کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

مضامین سورۃ الفرقان | یہ قرآن کریم کی سب سے بڑی سورت اور نبوت سے احکام پر مشتمل ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سورۃ الفرقان کو پڑھا کرو، کیونکہ اس کا پڑھنا برکت ہے، اور اس کا چھوڑنا حسرت اور بد نصیبی ہے، اور اہل باطل اس پر قابو نہیں پاسکتے۔

قرطبی نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ اس جگہ اہل باطل سے مراد جادو گر ہیں، مراد یہ ہے کہ اس سورت کے پڑھنے والے پر کسی جادو نہ چلے گا، قرطبی از مسلم بروایت ابو امامہ باہلی

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس گھر میں سورۃ بقرہ پڑھی جائے شیطان وہاں سے ہٹا جاتا ہے (ابن کثیر از حاکم)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سورۃ بقرہ منام القرآن اور ذرۃ القرآن ہے، اسام اور ذرۃ ہر چیز کے اعلیٰ و افضل حصہ کو کہا جاتا ہے، اس کی ہر آیت کے نزول کے وقت انبی فرشتے اس کے جکو میں نازل ہوئے ہیں (ابن کثیر از مسند احمد) اور حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ اس سورت میں ایک آیت ایسی ہے جو تمام آیات قرآن میں اثر و فضل ہے، اور وہ آیت الکرسی ہے (ابن کثیر از ترمذی) حضرت علیؓ بن مسوٰد نے فرمایا کہ: سورۃ بقرہ کی دس آیتیں ایسی ہیں کہ اگر کوئی شخص ان کو رات میں پڑھے تو اس رات کو جہنم، شیطان گھر میں داخل نہ ہوگا، اور اس کو اور اس کے اہل عیال کو اس رات میں کوئی آفت، بیماری، بچہ و غیرہ ناگوار چیز پیش نہ آئے گی، اور اگر یہ آیتیں کسی مجنون پر پڑھی جائیں تو اس کو فاقہ ہو جائے گا، وہ دس آیتیں یہ ہیں: چار آیتیں شروع سورۃ بقرہ کی پھر تین آیتیں درمیانی یعنی آیت الکرسی اور اس کے بعد کی دو آیتیں، پھر آخر سورۃ بقرہ کی تین آیتیں۔

احکام و مسائل

مضامین و مسائل کے اعتبار سے بھی سورۃ بقرہ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے، ابن عربیؒ منبر مانتے ہیں کہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ سورۃ بقرہ میں ایک ہزار اتر اور ایک ہزار تہی اور ایک ہزار چھتیس، ایک ہزار تہی اور قسطنطین قرطبی و ابن کثیر ایسی وجہ ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے جب سورۃ بقرہ کو تفسیر کے ساتھ پڑھا تو اس کی تعلیم میں بارہ سال خرچ ہوئے، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے یہ سورت آٹھ سال میں پڑھی (قرطبی)

سورۃ فاتحہ در حقیقت پورے قرآن کا خلاصہ ہے، اس کے بنیادی مضامین یہ ہیں: اول اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، یعنی پروردگار عالم ہونے کا بیان، دوسرے اس کا سچا عبادت ہونا، اور اس کے سوا کسی کا لائق عبادت نہ ہونا، تیسرے طلب ہدایت، سورۃ فاتحہ کا آخری مضمون صراطِ مستقیم کی ہدایت طلب ہے اور در حقیقت پورا مسترآن اس کے جواب میں ہے، کہ جو شخص صراطِ مستقیم چاہتا ہو قرآن ہی میں ملے گا۔ اسی لئے فاتحہ کے بعد پہلی سورۃ بقرہ رکھی گئی، اور اس کو ذلک الکتاب سے شروع کر کے اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ میں صراطِ مستقیم کو تم ڈھونڈتے ہو وہ یہ کتاب ہے۔

اس کے بعد اس سورت میں اول ایمان کے بنیادی اصول: توحید، رسالت، آخرت اجمالی طور پر اور آخر سورت میں ایمان مفصل بیان فرمایا گیا ہے، اور درمیان میں ہر شعبہ زندگی: عبادات، معاملات، معاشرت، جہتلات، اصلاح ظاہر و باطن کے متعلق ہدایات کے بنیادی اصول اور ان کے ساتھ بہت سی جہیز نیاات بیان ہوئی ہیں۔

سُورَةُ الْبَقَرَةِ

سُورَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ ۙ آيَاتُهَا ۲۸۶ ۙ رُكُوعَاتُهَا ۲۰ ۙ

سورۃ بقرہ مدنی ہے، اس میں ۲۸۶ آیتیں ہیں اور ۲۰ رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

الْم ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۙ فِيْهِ ۙ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

اس کتاب میں کچھ شک نہیں، راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو،

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ

جو کہ یقین کرتے ہیں بے دبی چیزوں کا اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو ہم نے روزی دی ہے

يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ

ان کو اس میں خرچ کرتے ہیں، اور وہ لوگ جو ایمان لائے اس پر کہ کچھ نازل ہوا تیری طرف اور اس پر

مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُوْنَ ۝ اُوْلٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى

کہ کچھ نازل ہوا تجھ سے پہلے اور آخرت کو وہ یقین جانتے ہیں، وہی لوگ ہیں ہدایت پر اپنے

مِّنْ تَّرْهِيْمٍ ۚ ۝ اُوْلٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

پروردگار کی طرف سے اور وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے۔

خلاصہ تفسیر

یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں رہیں قرآن کے منجانب اللہ ہونے میں کسی شبہ

کی غائب کش نہیں، اگرچہ کوئی نا فہم اس میں مشتبہ رکھتا ہو، کیونکہ یقینی بات کسی کے شبہ کرنے سے بھی حقیقت میں یقینی ہی رہتی ہے، راہ ہٹانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو جو یقین لاتے ہیں چھپی ہوئی چیزوں پر یعنی جو چیزیں ان کے حواس و عقل سے پوشیدہ ہیں صرف اللہ و رسول کے فرمانے سے ان کو بھیج مانی لیتے ہیں، اور قائم رکھتے ہیں خازن کو (قائم رکھنا یہ ہو کہ اس کو پابندی کے ساتھ اس کے وقت میں پورے شرائط و ارکان کے ساتھ ادا کریں) اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں (یعنی نیک کاموں میں) اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر بھی جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری جا چکی ہیں (مطلب یہ ہو کہ ان کا ایمان مسترآن پر بھی ہے اور پہلی کتابوں پر بھی) اور ایمان بچا بچنے کو کہتے ہیں عمل کرنا دوسری بات ہے، جتنی کتابیں اللہ نے پہلے انبیاء پر نازل فرمائی ہیں ان کو بچا بھنا فرض اور شرط ایمان ہے، یعنی یہ سمجھے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے نازل مسترمانی تمہیں وہ صحیح ہیں خود غرض لوگوں نے جو اس میں تبدیل و تحریف کی ہے وہ غلط ہے، وہ غیا علیٰ سورہ صرف قرآن پر ہوگا، پہلی کتابیں سب منسوخ ہو گئیں، ان پر عمل جائز نہیں) اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں، بس یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب (یعنی ایسے لوگوں کو دنیا میں تو یہ نعمت ملی کہ راہ حق ملی اور آخرت میں ہر طرح کی کامیابی ان کے لئے ہے) ۛ

حِلِّ لُغَاتٍ

ذٰلِكَ كَيْفَ يَدْرِكُ الْمَرْءَ حَيْثُ يَنْتَظِرُ الْمَوْتَ اِنَّهُ يَدْرِكُهُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اَوْ يَكْفُرْ بِالْآيَاتِ

کسی اور کی حیسرت کی طرف اشارہ کے لئے استعمال ہوتا ہے، وَتَقِيْلُ شُكَّ وَشُبْہَا
ہوئی بدایت سے بنا ہے، اور بدایت کے معنی رہنمائی، مُتَقِيْلٌ جن میں صفت تعوی ہو
تعوی کے لفظی معنی بچنے کے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنا ہے، غَیْبُ لُغْلُ معنی ہر وہ چیز جو انسان کی
نظر اور دوسرے جو اس سماعت وغیرہ سے باہر ہو، یَقِيْلُ وَتَقِيْلُ اقامت سے بنا ہے، جس کے معنی سیدھا کرنے
کے ہیں، اور نماز کا سیدھا کرنا یہ ہے کہ آداب اور خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کی جائے، وَتَقِيْلُ لُغْلُ رَزَقٍ
بنا ہے، جس کے معنی مہیا و رزق اور گزارنے کا سامان دینا، یُفْقِدُوْنَ اتفاق سے بنا ہے، خرچ کرنے کے معنی
میں آتا ہے، اِنْ خَرَجَ لُغْلُ میں مؤخر اور بعد میں آنے والی چیز کو آخرت کہا جاتا ہے، اس بگ عالم دنیا کے مقابلے
میں عالم آخرت بر لا گیا، یَوْ قِيْلُوْنَ اتفاق سے ہے اور دو یقین سے بنا ہے، اور یقین اس کو کہتے ہیں جس میں
کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو، مُتَقِيْلُوْنَ اخراج سے اور وہ فَلَاحٌ سے بنا ہے، فَلَاحٌ کے معنی پوری کامیابی۔

معارف و مسائل

حروف مقطوعہ جو بہت سی سورتوں
کے شروع میں آتے ہیں ان کی تحفہ تین

الشماء بہت سی سورتوں کے شروع میں چند حروف سے مرکب
ایک کلمہ لایا گیا ہے جیسے الشَّماء حَمْدُ الْقَبْضِ دَعْوَانِ کو

—

اصطلاح میں حروف مقطعه کہا جاتا ہے، انہیں کبر حروف مجزا اور اسائن پڑھا جاتا ہے، الف، لام، میم، حروف مقطعه جو ادراک سور میں آتے ہیں، ان کے متعلق بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ ان سورتوں کے نام ہیں، بعض حضرات نے فرمایا کہ اسباب التبیہ کے رموز ہیں، مگر جہو صحابہ و تابعین اور علماء امت کے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ حروف رموز اور اسرار ہیں، جس کا علم سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں اور ہو سکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم بطور ایک داز کے دیا گیا ہو جس کی تبلیغ اُس کے لئے روک دی گئی ہو اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان حروف کی تفسیر و تشریح میں کچھ منقول نہیں، امام تفسیر قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس کو سخت یاد فرمایا ہے، ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

تعارف میں سفیان ثوریؒ اور ایک جماعت قدس نے فرمایا ہے کہ ہر آسان کتاب میں اللہ تعالیٰ کے کچھ خاص رموز و اسرار ہوتے ہیں، اسی طرح یہ حروف و قلمو مسترقین میں جن تعالیٰ کا راز ہے، اس لئے یہ ان منشاہات میں سے ہیں جن کا علم صرف حق تعالیٰ ہی کو ہے۔ ہمارے لئے ان میں بحث و گفتگو بھی جائز نہیں، مگر اس کے باوجود وہ ہمارے فائدے سے خالی نہیں، اذلی تو ان پر ایمان لانا ہمارے ان کا پڑھنا ہمارے لئے تو اسباقِ کلیم پر دو سرے ان کے پڑھنے کے منوی فوائد و برکات ہیں، جو اگرچہ ہمیں معلوم نہ ہوں مگر فریضے وہ ہمیں پہنچے ہیں۔

میرزا

حضرت صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ، سید عالمؓ میں مسودہ وغیرہ جہود و صابانہ
کلامانِ حروف کے متعلق یہی عقیدہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسرار ہیں، اس لیے اُن پر ایمان لانا چاہیے
کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں اور جس طرح آئے ہیں اُن کی تلاوت کرنا چاہیے، مگر معنی معلوم
کر کے کُل فکر میں پڑنا درست نہیں۔

ابن کثیرؒ نے بھی قرطبیؒ وغیرہ سے نقل کر کے اسی مضمون کو ترجیح دی ہے، اور ابن کثیرؒ نے علامہ سے جو ان حجت کے معنی منقول ہیں اس سے صرف تمثیل و تشبیہ اور تہلیل و تقصیر ہے، یہ نہیں کہ مراد ہی تعالیٰ یہ ہے کہ اس لئے اس کو بھی غلط کہنا تحقیق علماء کے خلاف ہے۔

ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ لَفْظٌ ذَلَالِكَ كَيْسٍ دُورِ كِي چیز کی طرف اشارے کے لئے آتا ہوا اور کتاب سے مراد قرآن کریم ہے، رَیْب کے معنی شک و شبہ، یعنی یہ ہیں کہ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں، یہ موقع بظاہر اشارۃ بعید کا نہیں تھا، کیونکہ اسی مترآن کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو لوگوں کے سامنے ہے، مگر اشارۃ بعید سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ سورۃ فاتحہ میں جس صراطِ مستقیم کی درخواست کی گئی تھی یہ سارا مترآن اس درخواست کا جواب بصورت قبولیت اور صراطِ مستقیم کی تشریح و تفصیل ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے یہ دعا مانگی اور قرآن

↓

نہیں کہتے، مگر اگر چاہیں گے، تو انہیں و شیطانی اور بیست سے کفار کو بھی مائل ہے، مگر ان کو آخستہ صلہ، علیہ وسلم کے صدق کا یقین تھا، مگر اس کو مان نہیں اس لئے وہ مرنے لگے۔ وہ راستہ سلامت کا مستحق تھے، مگر خدا کو چاہئے کہ انہیں اور بہشت سے انصاف سے ملے۔ دوست کرنے کے نام انعام ہی جس میں خائف کے تمام فوائد، و اجابت و محبت اور عجز کی ہر وہام و التماس، سب انعام کے طور میں داخل ہیں، اور جس سے ہر کسی کو ہنگامہ سے کوئی خاص خفا مراد نہیں، مگر اس شخص و اجابت اور اعلیٰ خفا و دل کو یہ غلط فہم ہے، و حلالانہ معنیوں پر برا کہ وہ لوگ جو ساز و دل کی پابندی میں قواعد شرعیہ کے مطابق کرتے ہیں، اور ان کے پاس آداب میں بجا ہوتے ہیں۔

تیسرے مسئلہ | میں یہ بھی سمجھ اور تحقیقات میں کہ جو بہتر مفسرین نے تفسیر دارالام ہے، یہی ہے کہ ہر قسم کے کلام کے لیے کلام و دلیل سے جو اندیشہ کہ وہ ہیں کیا جانتے، خواہ فرض و ذکوۃ ہو، یا دوسرے صدقات واجب یا فعلیہ صدقات و خیرات، و مگر کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں لفظ انفاق یا عاقل ہوا صرف نفل صدقات میں یا عام معنی میں ہر قسم شامل کیا گیا ہے، ذکوۃ فرض کے لئے عموماً لفظ ذکوۃ ہی لایا ہے۔

اس مختصر میں لفظ و مشارفہ فی شہرہ غور کیے تو ایک طرہ سے لفظ اللہ کی راہیں ملنے لگیں مگر یہ کہ لایک قوی مدعی ہے کہ انسانی کے دل میں پیدا کر دیا کہ ہر مال مالہ یا مالہ یا مالہ ہے۔ یہ خدا ہی کا عطا ہوا اور اس کی امانت ہے، مگر ہم اس تمام مال کو بھی اللہ کی راہ میں صرف دینا کے لئے خرچ کر دیں، تو حق اور کہا ہے، اس میں بھی ہمارا کوئی حصہ نہ ہوگا۔

جان ہی دی ہوئی اسی کی قسم حق تو ہے۔ کہ حق اور نہ ہوا میں چیز غنا و غنا کے لئے کرنا، جس کے سبب میں کہ ہم دینے والے کو بھی پورا خرچ کرنا نہیں، بلکہ اس کا کچھ حصہ خرچ کرنا ہے۔

یہاں حقیقت کی سہولت کا بیان کرتے ہوئے اہل ایمان یا عیب کا ذکر فرمایا گیا، مگر اس کے علاوہ ان کی مدد میں خرچ کرنے کا ایمان کی اوجیت جو سب کو معلوم ہے، کہ وہی اصل اصول اور ساری اعمال کی معتبریت کا دار و مدار ہے، لیکن جب ایمان کے ساتھ اعلیٰ کا بیان کیا گیا کہ تو ان کی فہرست طریقہ اور فرائض و واجبات کی تعداد و خرچہ، ایمان سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اعمال میں سے صرف تو اعلیٰ خفا و اللہ فی مال کے ذکر پر گفتگو کرنے میں کیا راز ہے؟ اس میں خائفانہ طرہ اشارہ ہے کہ جیسے اعمال انسانی پر فرائض واجب ہیں ان کے عقول

یا انسان کی زلت اور بدن سے ہے یا اس کے مال سے، چنانچہ اور ذاتی عبارات میں سب کا ہم قرار ہے، ایمان کا ذکر کرنے پر لکھا گیا تھا، اور مالی عبارات سب کی سب لفظ انفاق میں داخل ہیں، اس لئے درحقیقت یہ تہاد و اعمال کا ذکر نہیں، بلکہ لفظ انفاق و عبارات ان کے ضمن میں آگئے، اور چنانچہ آیت کے یہ معنی ہونے کو متیقن ہو کر کہ چنانچہ ایمان ہی کا اصل ہے اور دل میں ایمان ہی کا اصل ہے جو عہد کا نام ہی اسلام ہے، و گو ایمان آیت میں ایمان کی یہی تعریف کے ساتھ مسلم کے مفہوم کی طرف بھی اشارہ ہو گیا، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس جگہ اس کی یہی وضاحت کر دی جائے کہ ایمان اور اسلام میں کیا فرق ہے؟

ایمان اور اسلام میں فرق

فلت میں ایمان کسی چیز کی دل سے تصدیق کرنے کا نام ہے، اور اسلام طاعت و فرمانبرداری کا، ایمان کا عمل قلب، و اسلام کا عمل قلب اور سب اعضا و اعضاء لیکن مشرک ایمان غیر اسلام کے اور اسلام غیر ایمان کے معتبر نہیں، لیکن اللہ اور اس کے رسول کی محض دل میں تصدیق کر لینا مشرک اس وقت تک معتبر نہیں جب تک زبان سے اس تصدیق کا اظہار اور اطاعت و فرمانبرداری کا اقرار نہ کرے، اسی طرح زبان سے تصدیق کا اظہار و فرمانبرداری اور اقرار اس وقت تک معتبر نہیں جب تک دل میں اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق نہ ہو۔

خلاصہ یہ کہ گفت کے اعتبار سے ایمان اور اسلام ایک مفہوم دیکھنے والی، اور تشریک و حدیث میں اسی مفہوم کی بناء پر ایمان اور اسلام میں فرق کا ذکر بھی ہے، مگر شرعاً ایمان جو دینی اسلام کے اور اسلام جو دنیاوی ایمان کے معتبر نہیں۔

جب اسلام میں لازمی اشتراک و فرمانبرداری کے ساتھ دل میں ایمان نہ ہو تو اس کو قرآن کا اصطلاح میں نفاق کا نام دیا گیا ہے، اور اس کو کھٹکے کھٹکے زیادہ شدہ جرم ٹھہرا دیا۔

إِنَّ الشَّقِيحِينَ فِي الشَّقِيحِينَ | لیکن ماضی جہنم کے سب سے نیچے
الَّذِينَ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ | لیکن یہی ہیں
اسی طرح ایمان میں تصدیق قلب کے ساتھ اگر اقرار و اطاعت نہ ہو تو اس کو بھی مشرک و نفاق

ہے اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے (یعنی ایمان کا جھوٹا دعویٰ کیا کرتے تھے) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ فساد مت کرو زمین میں تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح ہی کرنے والے ہیں (ان کی روشنی روشنی سے جب فتنے فساد واقع ہونے لگے اور کسی غیر خواہنے فحاشی کی کراہی کا بروقی موجب فساد ہو کر رہا ہے اس کو چھوڑ دو تو اس کے جواب میں یہ اپنے آپ کو بھائے مفسد کے مسلح بتاتے ہیں یعنی اپنے فساد ہی کو اصلاح سمجھتے ہیں) یاد رکھو بے شک یہی لوگ مفسد ہیں لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے (یہ تو ان کی جہالت اور غبارت کا بیان ہے، کہ اپنے عیب ہی کو بہتر سمجھتے ہیں) آگے دوسری حیالت کا بیان ہے کہ دوسروں کے بہتر کو یعنی ایمان خالص کو عیب اور حقیر سمجھتے ہیں) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی ایمان لے آؤ جیسا ایمان لاتے ہیں اور لوگ تو کہتے ہیں کہ کیا ہم ایمان لاؤں گے جیسا ایمان لے آؤ؟ میں یہ بیوقوف، یاد رکھو کہ جنگ بھی میں بیوقوف لیکن اس کا علم نہیں رکھتے یہ منافق ایسی کھلی ہوئی بات بظاہر عسریب مسلمانوں کے سامنے کر لیتے ہوں گے جن سے ان کو کوئی اندیشہ نہ تھا، ورنہ مام طور پر تو وہ اپنے گھر کو چھپاتے بھرتے تھے) اور جب ملتے ہیں وہ منافقین ان لوگوں سے جو ایمان لاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب غلو میں پہنچتے ہیں اپنے شریر سرداروں کے پاس تو کہتے ہیں کہ ہم بے شک تمھارے ساتھ ہیں، ہم تو (مسلمانوں سے) صرف استہزاء کیا کرتے ہیں (یعنی ہم مسلمانوں سے بطور تمسخر کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے ہیں ورنہ ہم تو تمھارے ہم مشرب ہیں، آگے ان کے استہزاء کا جواب ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی استہزاء کر رہا ہے ان کے ساتھ اور ڈھیل دیتے چلے جاتے ہیں ان کو کہ وہ اپنی سرکشی میں حیران و سرگرداں ہو رہے ہیں (وہ اللہ کا استہزاء ہی ہو کہ ان کو مہلت دی جا رہی ہے جب وہ خوب سفر میں کامل ہو جاویں اور مجرم سنگین ہو جاوے اس وقت اچانک پکڑ لئے جاویں گے، چونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ فعل ان کے استہزاء کے مقابل میں تھا اس لئے اس کو استہزاء کے عنوان سے تعبیر کر دیا گیا) یہ وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے گمراہی لے لی بجائے ہدایت کے تو نفع بخش نہ ہوئی ان کی یہ تجارت اور نہ یہ ٹھیک طریقہ پر چلے (یعنی ان کو تجارت کا سلیقہ نہ ہوا کہ ہدایت جیسی قیمتی چیز کے بدلے میں گمراہی لے لی) ان کی حالت اس شخص کی حالت کے مشابہ ہو جس نے کہیں آگ جلائی ہو پھر جب روشن کر دیا ہو اس آگ نے اس شخص کے گرد اگر دی سب چیزوں کو ایسی حالت میں سلب کر دیا ہو اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی کو اور چھوڑ دیا ہوا ان کو اندھیروں میں کہ کچھ دیکھتے بھالتے نہ ہوں، تو جس طرح یہ شخص اور اس کے ساتھی روشنی کے بعد اندھیرے میں رہ گئے اسی طرح منافقین حق واضح ہو کر سامنے آ جانے کے بعد گمراہی کے اندھیرے میں جا پھنسے اور جس طرح آگ جلانے

دالوں کی آنکھ، کان، زبان، اندھیرے میں بیکار ہو گئے، اسی طرح گمراہی کے اندھیرے میں ہمیں کر ان کی یہ حالت ہو گئی کہ گمراہ (بہرے میں گھوٹے ہیں، اندھے ہیں سو یہ اب رجوع نہ ہوں گے، رک ان کے حواس حق کو دیکھنے سننے سمجھنے کے قابل نہ رہیں، یہ مثال تو ان منافقین کی تھی جو خوب دل کھول کر کھنڈ پر جمے ہوئے ہیں، کبھی ایمان کا دھیان بھی دل میں نہیں آتا، آگے منافقین کے اس گردہ کی مثال ہے جو فی الواقع تردد میں تھے، کبھی کبھی اسلام کی حقانیت دیکھ کر اس کی طرف مائل ہونے لگتے، پھر جب اغراض نفسانی کا غلبہ ہوتا تو یہ متبطلان بدل جاتا تھا، یا ان منافقوں کی ایسی مثال ہے جیسے انسان کی طرف سے بارش ہو اس میں اندھیری بھی ہو اور برق برق بھی ہو جو لوگ اس بارش میں مل رہے ہیں وہ ٹھونسے لیتے ہیں اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کرکٹ کے سبب اندیشہ موت سے، اور اللہ تعالیٰ احاطہ میں لے ہوئے ہو کافروں کو، برق کی یہ حالت ہو کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ان کی بنائے اس نے لی جہاں ذرا ان کو بجلی کی چمک ہوئی تو اس کی روشنی میں چلنا شروع کر دیا، اور جب ان پر تاریکی ہوئی پھر کھڑے کے کھڑے رہ گئے، اور اگر اللہ تعالیٰ ارادہ کرتے تو ان کے کان اور آنکھ سب سلب کر لیتے بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں (تو جس طرح یہ لوگ کبھی طوفان یا دو باران میں کبھی چلنے سے رہ جاتے ہیں کبھی موقع پا کر آگے چلنے لگتے ہیں یہی حال ان متردد منافقین کا ہے) ۴

معارف مسائل

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سورۃ بقرہ کے شروع میں رابطہ آیات قرآن کریم کا شک و شبہ سے بالاتر ہونا بیان کرنے کے بعد بتائیں آیتوں میں اس کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے حالات کا ذکر کیا گیا ہے، اول پانچ آیتوں میں ماننے والوں کا تذکرہ متقین کے عنوان سے ہے، پھر دو آیتوں میں ایسے ماننے والوں کا ذکر ہے جو کھلے طور پر قرآن کا اعادہ انکار کرتے تھے، ان تیرہ آیتوں میں ایسے منکرین و کفار کا ذکر ہے جو ظاہر میں اپنے آپ کو مؤمن مسلمان کہتے تھے، مگر حقیقت میں کفر میں تھے، ان لوگوں کا نام مشرکین میں منافقین رکھا گیا کہ مذکورہ بالا آیات میں پہلی دو آیتوں میں منافقین کے متعلق فرمایا کہ لوگوں میں لیکن ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے ہیں حالانکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں، بلکہ وہ چالبازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں، اور واقع میں کسی کے ساتھ بھی چالبازی نہیں کرتے بجز اپنی ذات کے، اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے ۴

اس میں ان کے دعویٰ ایمان کو غلط اور جھوٹ قرار دیا گیا، اور یہ کہ ان کا یہ دعویٰ محض فریب ہے

چنانچہ یہ گوشتِ شمالی کو کھانی قریب بیسویں لے سکتا، اور غالباً دو گھنٹہ بھی زیادہ کھینے ہوں گے کہ ہم اندیشہ کو روک سکتے ہیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے ساتھ ان کی یہ ہلا بازی کی کوئی حیثیت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ چال بازی مسترد رائے کر فرما چکا ہے کہ اگر یہ گوشت شمالی کے ساتھ چال بازی کرتے ہیں (قریشی ص ۱۸۸)۔

اس لئے اس کا نتیجہ یہ نکلا گیا کہ بے رے وقت اپنے سوا کہ کسی کے ساتھ چاہا نہیں کر رہی ہے۔
 نیز کہ بعض مسئلوں پر مرکوز فریب سے بلا کر نہیں ہیں، ان کے سوا کہ اور موضوع ہیں جس کی وجہ سے
 پروہو کہ فریب سے غفلت ہوا ہے جس کی کوئی نقصان آئی کو نہیں ہو چکا، البتہ ان کے مرکوز فریب کا وہاں
 دیکھا اور خست میں غور اعلیٰ ہے۔

تیسری آیت میں فرمایا کہ انسان کے دلوں میں بڑا مرض ہے، سو اور بھی بڑھا دیا اللہ نے اُن کے دلوں کو کہ مرض اور باریک بینی کو کہتے ہیں جس سے انسان اپنے اعتدالی مناسبت سے بھل جائے، اور اس کے اعتدالی من عقل پر چڑھ جائے، جس کا آخری نتیجہ بڑھکتا مرض موت ہو رہا ہے۔

فترتِ روح کی اصطلاح میں اُن نفسانِ کیفیات کو بھی مرضِ کما جاگے ہوئے نفسِ انسانی کے کمال میں منتقل نامزد سہی، اور جن کی وجہ سے انسان اپنے انسانی احوال سے غور و پیر تارچا جاتے ہیں کا افری تیز و حالِ موت و طاقت ہے۔

حضرت ہنہیدہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اولیٰ کے امراض غریبہاات نفسانی کے علاج
 یہ ہے اور یہ ہے کہ انسانی کے امراض اخلاقیہ انسانی کے اعتدالی سے پیدا ہوتے ہیں
 اس بات پر کہ انسانی کے اولیٰ میں عقلی مسکن کو مرکز قرار دیا گیا ہے جو روحان و جسمانی دونوں اعتبار سے
 بڑا مضبوط ہے، جو روحانی میں ہر ذوق اور ہر کمال کو اپنے پیہر کر کے والے اپنے والے کے نام سے کہہ
 اس کے احکام سے سرگرم ہیں کہ نام کو اپنے ہی وجود پر انسانی کے لئے جس کے بڑا مضبوط اور مشافہ
 انسانی کے لئے بڑا ترین دارغ ہے، جو دوسرے دنیا کی ذلیل اور غرض کی خاطر اس کو چھوڑ دیتا اور اپنے
 دل کی بات کو ظاہر کر کے کسی بھی جزاوت نہ دیتا، جو دوسری بات ہے جو روحان و جسمانی اعتبار سے
 اور اعتدالی و عقلی میں ہر اس بات پر کہ کمال کو اپنے ہی پیہر کر کے والے اپنے والے کے نام سے کہہ
 اصل حال یہ ہے کہ شہد و دھم کے مسکن میں، جو روحان و جسمانی دونوں اعتبار سے بڑا مضبوط
 اور کمال میں بیچہ ہوتا ہے، جو کمال کو اپنے ہی پیہر کر کے والے اپنے والے کے نام سے کہہ
 کہ روحانی اعتبار سے نہیں کر سکتا، جو جسمانی اعتبار سے کہہ سکتا ہے کہ وہی ان میں بھی نہ جاتے ہیں۔

اور یہ جو فرمایا اگر افسدہ فغانی نے ان کا مرض اور یہی بڑھا دیا، اس کا مطلب یہی ہے کہ مرگ اسلام اور مسلمانوں کی ترقی ہے جیسے ہیں، اور انہ فغانی کو یہ ترقی دے رہا ہے، اور ہر وقت اس کے مشاہدہ

جو کئے رہتے ہیں، اس لئے ان کا یہ مرض بڑھتا ہی رہتا ہے۔

چرخ و گرد با چوبی آئینہ میں متضامین کا یہ مناظرہ ہو رہا ہے کہ فساد کو اصلاح سمجھتے ہو تو بدلتے ہو کہ اصل کیسے تھے۔ فساد کی طرف توجہ کرنے والے رائج کیا کہ فساد کو اصلاح نہ پائی تھی وہیں سے ہوئے۔ وہ کوئی چار دو کھلی اپنے آپ کو منہ نہ دیکھ کر بتا رہیں، بلکہ وہ اس کا اس کام ہے جو کیا جا رہا ہے وہ فساد پر فخر کرنے والے کو منہ نہ دیکھ کر بتا رہیں، بلکہ وہ اس کا اس کام ہے جو کیا جا رہا ہے وہ فساد پر

[illegible]

ماحولیاتی ثابت میں منافقتیں کے اعلان اور درستی مایوسی کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ لوگ
جب مسلمانوں سے ملنے کو کہتے تھے کہ ہم تو من سنا ہیں، اور جب انہی کو کافر لوگوں سے ملنے
کو کہتے تھے کہ ہم تو مشرک ہیں، اور ضروری قوم کے فروغ، اور مسلمانوں کے ساتھ کو بعض
شخص اور امتداد کے لئے، میں کو بہت بٹانے کے لئے ملتے ہیں۔

اٹھویں آیت میں ان کی اس اوجھاڑی گفتگو کا جواب دیا کہ یہ غلو ہے جسے ہم کہہ سلائے ہیں۔
 ہستہ زائر کہ ہیں اور ان کو یہ قوت بتلائے ہیں۔ اس کا تذکرہ حقیقت غلو ہے جو صرف ہمارے ہی
 اور انہی احوال نے اپنے علم پر کرم سے آگے نہیں لے سکتا۔ اگرچہ اس کے اندر ان کا مان کر دینے کا کلمہ
 یہ کہ جس مذہب کے دین سے وہ اور فطرت میں نہ گئے۔ اس میں سنہرے کئی بڑے پتے چلے گئے۔
 یہاں تک کہ ان کا جو درد و رنج ہو، ہر درد و رنج پر نہ گئے۔ انہی احوال کی طرف سے یہ عمل چکر لگایا ہے۔

نوبی آیت میں منافقین کے اس حال کا ذکر ہے کہ انھوں نے اسلام کو بھی قریب سے دیکھ

اس کا ذائقہ بھی چکھا، اور کفر میں تو پہلے سے مستلزم تھے، پھر کفر و اسلام دونوں کو دیکھنے بچنے کے بعد انہوں نے اپنی ذلیل دنیاوی اغراض کی خاطر اسلام کے بدلے کفر ہی کو ترجیح دی، ان کے اس عمل کو مسترآن کریم نے تجارت (بیوپار) کا نام دے کر یہ بتلایا کہ ان لوگوں کو بیوپار کا بھی سلیقہ نہ آیا کہ بہترین قیمتی چیز یعنی ایمان سے کر دہی اور تکلیف دہ چیز میں کفر خرید لیا۔

آخری چار آیتوں میں منافقین کے حال کی دو مثالیں دے کر اس کا قابلِ نفرت ہونا بیان فرمایا گیا، دو مثالیں اس بناء پر دی گئیں کہ منافقین میں دو طرح کے آدمی تھے، ایک وہ جو اپنے کفر میں بالکل پختہ تھے، ایمان کا اظہار صرف دنیوی مصلحت کی وجہ سے کرتے تھے، ایمان و اسلام سے ان کو کوئی واسطہ نہ تھا، دوسرے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر کبھی کبھی سچے مسلمان ہونے کا ارادہ بھی کر لیتے تھے، مگر پھر دنیوی اغراض سامنے آکر ان کو اس ارادہ سے روک دیتی تھیں، اسی طرح وہ ایک تذبذب اور تردد کے حال میں رہتے۔

اسی مضمون کے ضمن میں ان ظالموں کو یہ تنبیہ بھی کر دی گئی کہ وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے احاطہ قدرت سے باہر نہیں، ہر وقت ہر حال میں ہلاک بھی کر سکتے ہیں، اور بینائی و شنوائی کی طاقتیں بھی سلب کر سکتے ہیں۔

یہ تیسری آیتیں منافقین کے حال و مثال پر مشتمل ہیں ان میں بہت سے احکام و مسائل اور اہم ہدایات بھی ہیں۔

۱) کیا کفر و نفاق جہد نبوی کے ساتھ اس معاملہ میں صحیح یہ ہے کہ منافق کے نفاق کو پہچانتا اور اس کو منافق خصوص تھا یا اب بھی موجود ہے؟ مسترآر دینا دو طریقوں سے ہوتا تھا، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی بتلادیا کہ فلاں شخص دل سے مسلمان نہیں منافق ہے، دوسرے یہ کہ اُس کے کسی قول و فعل سے کسی عقیدہ اسلام کے خلاف کوئی بات یا اسلام کی مخالفت کا کوئی عمل ظاہر اور ثابت ہو جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انقطاع وحی کے سبب ان کے پہچاننے کی پہلی صورت قربانی نہ رہی، مگر دوسری صورت اب بھی موجود ہے، جس شخص کے کسی قول و فعل سے اسلامی قلعی عقائد کی مخالفت یا ان پر استہزاء یا تحریف ثابت ہو جائے، مگر وہ اپنے ایمان و اسلام کا مدعی ہے تو وہ منافق سمجھا جائے گا، ایسے منافق کا نام مسترآن کی اصطلاح میں ملحد ہے، **الَّذِينَ يُبَدِّلُونَ دِينَهُمْ** آیتاً تیناً، اور حدیث میں اُس کو زندقہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، مگر چونکہ اس کا کفر و میل سے ثابت اور واضح ہو گیا، اس لئے اس کا حکم سب کفار جیسا ہو گیا، الگ کوئی حکم اس کا نہیں ہے، اسی لئے علماء اہل سنت نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد منافقین کا قضیہ ختم ہو گیا، اب جو مومن نہیں وہ کافر کہلائے گا۔

حضرت امام مالک سے عمدہ شرح بخاری میں نقل کیا گیا ہے کہ بعد زمانہ نبوت کے نفاق کی یہی صورت ہے جس کو پہچانا جاسکتا ہے، اور ایسا کرنے والے کو منافق کہا جاسکتا ہے۔

۲) ایمان و کفر کی حقیقت آیات مذکورہ میں غور کرنے سے ایمان و اسلام کی پوری حقیقت واضح ہو جاتی ہے، اور اس کے بالمقابل کفر کی بھی، کیونکہ ان آیات میں منافقین کی طرف ایمان کا دعویٰ **اٰمَنَّا بِاللّٰهِ** میں، اور قرآن کریم کی طرف سے اُن کے اس دعوے کا غلط ہونا و **مَآ هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ** میں ذکر کیا گیا ہے، یہاں پسند بائیں غور طلب ہیں،

اولیٰ یہ کہ جن منافقین کا حال قرآن کریم میں بیان فرمایا گیا ہے وہ اصل میں یہودی تھے، اور اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر ایمان لانا یہود کے مذہب میں بھی ثابت اور مسلم ہو، اور جو چہیزان کے عقیدہ میں نہیں تھے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کو ماننا اور آپ پر ایمان لانا اس کو انہوں نے اپنے بیان میں ذکر نہیں کیا، بلکہ صرف دو چیزیں ذکر کیں، ایمان باللہ، ایمان باہموم الآخر، جس میں اُن کو جھوٹا نہیں کہا جاسکتا، پھر قرآن کریم میں اُن کو جھوٹا قرار دینا اور اُن کے ایمان کا انکار کرنا کس بنا پر ہے! بات یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنی من مانی صورتوں میں خدا تعالیٰ یا آخرت کا اقرار کر لینا ایمان نہیں یوں تو مشرکین بھی کسی نہ کسی انداز سے اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں اور سب بڑا قادر مطلق مانتے ہیں اور مشرکین ہندوستان تو پر تو کا نام دے کر قیامت کا ایک نمونہ بھی تسلیم کرتے ہیں، مگر قرآن کی نظر میں یہ ایمان نہیں، بلکہ صرف وہ ایمان مستتر ہے جو اس کی بتلانی ہوئی تمام صفات کے ساتھ ہو، اور آخرت پر ایمان وہ معتبر ہے جو قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے حالات و اوصاف کے ساتھ ہو۔

ظاہر ہے کہ یہود اس مسن کے اعتبار سے نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر، کیونکہ ایک طرف تو وہ حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں اور آخرت کے معاملہ میں بھی یہ غلط اعتقاد رکھتے ہیں کہ انبیاء کی اولاد کچھ بھی کرتی رہے وہ بہر حال اللہ تعالیٰ کی محبوب ہوں، اُن سے آخرت میں کوئی باز پرس ہوگی اور کچھ عذاب ہوا بھی تو بہت معزول ہوگا، اس لئے قرآنی اصطلاح کے اعتبار سے اُن کا یہ کہنا کہ ہم اللہ اور روز قیامت پر ایمان لائے ہیں غلط اور جھوٹ ہوا۔

۳) کفر و ایمان کا ضابطہ قرآن کی اصطلاح میں ایمان وہ ہے جس کا ذکر اور سورہ بقرہ کی تیسری آیت میں چکا **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَعْمٰوْا اَسْمٰنَ الْاَوَّلٰی** جس سے معلوم ہوا کہ ایمان کا دعویٰ صحیح یا غلط کے جانچنے کا معیار صحابہ کرام کا ایمان ہے، جو اس کے مطابق نہیں وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ایمان نہیں۔

اگر کوئی شخص مسترآنی عقیدہ کا مفہوم قرآنی تصریح یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح

کے خلاف قرار دے کر یہ کہے کہ میں تو اس عقیدہ کو ماننا ہوں تو یہ ماننا شرعاً معتبر نہیں، جیسا کہ آج کل قادیانی مگر وہ کہتا ہے کہ ہم بھی عقیدہ ختم نبوت کو مانتے ہیں، مگر اس عقیدہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات اور صحابہ کرام کے ایمان سے بالکل مخالفت تخریعت کرتے ہیں، مرزا غلام احمد کی نبوت کیلئے جگہ نکالتے ہیں، قرآن کریم کی اس تصریح کے مطابق وہ اسی کے مستحق ہیں کہ ان کو مَافِیْہُمْ مِّنْ شَیْءٍ کہا جائے، یعنی وہ ہرگز مؤمن نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایمان صحابہ کے خلاف کوئی شخص کس عقیدہ کا نیا مفہوم بنائے، اور اس عقیدہ کا پابند ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو مؤمن مسلمان بتلائے اور مسلمانوں کے نماز و زکوٰۃ میں شریک بھی ہوا مگر جب تک وہ قرآن کے اس بتلائے ہوئے معیار کے مطابق ایمان نہیں لائے گا، اس وقت تک قرآن کی اصطلاح میں مؤمن نہیں کہلائے گا۔

ایک شبہ کا ازالہ | حدیث و فقہ کا یہ مشہور مقولہ کہ ”اہل قبلہ کو کافر نہیں کہا جاسکتا“ اس کا مطلب بھی آیت مذکورہ کے تحت میں یہ متین ہو گیا کہ اہل قبلہ سے مراد صرف وہ لوگ ہیں

جو ضروریات دین میں سے کسی چیز کے منکر نہیں، ورنہ یہ منافقین بھی تو قبلہ کی طرف سب مسلمانوں کی طرح نماز پڑھتے تھے، مگر یہ صرف رد بقبلہ نماز پڑھنا ان کے ایمان کے لئے اس بنا پر کافی نہ ہو کہ ان کا ایمان صحابہ کرام کی طرح تمام ضروریات دین پر نہیں تھا۔

۴۴ جھوٹ لکھ گھنائونی چیز ہے | یہاں منافقین کے قول اَمْسَا بِاللهِ وَبِالْیَوْمِ الْآخِرِ میں غور کیجئے کہ یہ لوگ پرلے درجے کے کافر ہونے کے باوجود اپنی دانت میں جھوٹ بولنے سے اجتناب کرتے ہیں، کیونکہ دعویٰ ایمان کے لئے صرف اللہ اور روز قیامت پر ایمان کا ذکر کرتے ہیں، ایسا ان بارسول کا ذکر اس لئے نہیں کرتے کہ جھوٹ نہ ہو جائے، اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ ایسی گندمی اور گھنائونی چیز ہے کہ کوئی شریف آدمی خواہ کافر فاسق ہو جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتا۔

یہ دوسری بات ہے کہ ان کا دعویٰ ایمان باطل و بالیوم الآخر بھی مشرانی اصطلاح کے خلاف ہونے کی وجہ سے نتیجہ جھوٹ ثابت ہوا۔

۴۵ ایمان وادبائے کے ساتھ ہر اس کو کرنا | آیت مذکورہ میں منافقین کا ایک حال یہ بتلایا ہے یَخَاجِدُونَ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بڑائی کرنا ہے | اللہ یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ چال بازی کرتے ہیں، حالانکہ اگر وہ منافقین میں شاید کوئی بھی ایسا نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کا قصد رکھتا ہو، یا یہ سمجھتا ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کو فریب دے سکتا ہے، بلکہ حقیقت یہ تھی کہ یہ لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین کو دھوکہ دینے کے قصد سے شیع حرکتیں کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آیت مذکورہ میں اس کو اللہ کو دھوکہ دینا مشرور دے کر یہ بتلادیا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے کسی رسول یا دلی کے ساتھ

کوئی بڑا معاملہ کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے کے حکم میں ہے، دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعت شان کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ آپ کی شان میں کوئی گستاخی کرنا ایسا ہی جرم ہے جیسا اللہ جل شانہ کی شان میں گستاخی جرم ہے۔

۴۶ جھوٹ بولنے کا وبال | آیات مذکورہ میں منافقین کے عذاب الیم کی وجہ بتلایا گیا اِنَّکُمْ لَیَکُنْ بِکُمْ مِّنْ اَمْرِ اُنْکُمْ جھوٹ بولنے کو قرار دیا ہے، حالانکہ ان کے کفر و نفاق کا جرم سب سے بڑا تھا، اور دوسرے جرائم مسلمانوں سے حسد ان کے خلاف سازشیں بھی بڑے جرائم تھے، مگر عذاب الیم کا سبب ان کے جھوٹ بولنے کو قرار دیا، اس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ جھوٹ بولنے کی عادت ان کا اصلی جرم تھا، اسی بڑی عادت نے ان کو کفر و نفاق تک پہنچا دیا تھا، اس لئے جرم کی حیثیت اگرچہ کفر و نفاق کی بڑھی ہوئی ہے مگر ان سب خرابیوں کی جبر اور بنیاد جھوٹ بولنا ہے، اسی لئے قرآن کریم نے جھوٹ بولنے کو بہت پرستی کے ساتھ جوڑ کر اس طرح ارشاد فرمایا ہے:

وَابْتَغُوا الْوَسِيلَةَ لِمَا اَنْتُمْ حَافِظُونَ | یعنی جو بہت پرستی کی خواہش ہے اور بچ
وَابْتَغُوا الْقَوْلَ الرَّسُولَ (۳۰:۴۲) | جھوٹ بولنے سے

۴۷ اصلاح و فساد کی تعریف | آیات مذکورہ میں گزر چکا ہے کہ جب کوئی ان منافقین سے یہ کہتا کہ اپنی نفاق اور مصلح و مفید کی پہچان کے ذریعہ زمین میں فساد پھیلاؤ تو وہ بڑے زور اور تاکید سے کہتے تھے اَمْسَا بِاللهِ وَبِالْیَوْمِ الْآخِرِ اس میں لفظ اَمْسَا جو حصراً و انحصار کے لئے بولا جاتا ہے اس کی وجہ سے معنی اس جملہ کے یہ ہیں کہ ہم تو مصلح ہی ہیں، یعنی ہمارے کسی عمل کا فساد سے کوئی واسطہ نہیں، مگر قرآن کریم نے ان کے جواب میں فرمایا اَلَا اَنْتُمْ هُمْ الْمُفْسِدُونَ وَلَکِنْ لَا تَشْعُرُونَ، یعنی بارگاہِ کبریاٰ یہی لوگ مفسد ہی ہیں مگر ان کو اس کا شعور نہیں۔

اس پر دو باتیں معلوم ہوتی ہیں، ایک یہ کہ منافقین کی حرکات حقیقتہً زمین میں فتنہ و فساد پھیلانے کا سبب تھیں، دوسری بات یہ کہ منافقین فتنہ و فساد پھیلانے کی نیت اور قصد سے یہ کام نہ کرتے تھے بلکہ ان کو معلوم بھی نہ تھا کہ اس کا نتیجہ فتنہ و فساد ہے، جیسا کہ مشرانی کی تصریح وَلَکِنْ لَا تَشْعُرُونَ سے معلوم ہوتا ہے۔

وجہ یہ ہو کہ زمین میں فتنہ و فساد جن چیزوں سے پھیلتا ہے ان میں کچھ تو ایسی چیزیں ہیں جن کو ہر شخص فتنہ و فساد سمجھتا ہے، جیسے قتل، غارتگری، چوری، دھوکہ، فریب، اغواء، بدکاری وغیرہ ہر سمجھدار آدمی ان کو فساد سمجھتا ہے، اور ہر شریف آدمی ان سے بچتا ہے، اور کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو اپنی ظاہری سطح کے اعتبار سے کوئی فتنہ و فساد نہیں ہوتیں، مگر ان کی وجہ سے انسانوں کے اخلاق پر باؤ ہوتے ہیں، اور انسانوں کی اصلاحی گراںٹ سائے فتنوں اور فسادوں کے دروازے کھول دیتی

ہے، ان منافقین کا بھی یہی حال تھا کہ چوری، ڈاکہ، بدکاری وغیرہ سے بچتے تھے، اسی لئے بڑی زور سے اپنے مفید ہونے کا انکار اور اصلاح ہونے کا اثبات کیا۔

مگر ففاق اور کینہ و حسد اور اس کے ماتحت دشمنوں سے سازشیں یہ چیزیں انسان کے احسان کو ایسا تباہ کر دیتی ہیں کہ انسان بہت سے حیوانوں کی سطح سے بھی نیچے آ جاتا ہے، اور ایسے کام کرنے پر اُتر آتا ہے جو کبھی کسی پھلے مانس سے متصور نہیں ہوتے، اور جب انسان اپنے انسانی اخلاق کو بھٹکا، تو انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں فساد ہی فساد آ جاتا ہے، فساد بھی ایسا عظیم جو نہ دوزخ سے جانوروں سے متوقع ہے نہ ڈاکوؤں اور چوروں سے، کیونکہ ان کے فساد کو قانون اور حکومت کی طاقت سے روکا جاسکتا ہے، مگر قانون تو انسان ہی جاری کرتے ہیں، جب انسان انسان نہ رہا تو قانون کی جوگت نہ بنے گی اس کا تماشا آج کئی آنکھوں پر شخص ہر جگہ اور ہر وارہ میں دیکھتا ہے، آج دنیا کا تمدن ٹری پڑ رہا ہے، تعلیم و تعلیم کے اداروں کا جال گھاڑوں تک پھیلا ہوا ہے، تہذیب و تہذیب کے الفاظ ہر شخص کی زبان پر ہیں، قانون سازی کی مجلسوں کا بازار گرم ہے، تنفیذ قانون کے بے شمار ادارے اور پولیس کے خرچ سے قائم ہیں دفتری انتظامات کی بھول بھالیاں ہیں، مگر جرائم اور فتنے فساد و زبرد زبرد ہوتے ہی جاتے ہیں، دہر اس کے سرا نہیں کہ کوئی قانون خود کار مشین نہیں ہوتا، بلکہ اس کو انسان چلاتے ہیں، جب انسان اپنی انسانیت کو بھٹکا تو پھر اس فساد کا علاج نہ قانون سے ہو سکتا ہے نہ حکومت اور محکموں کے چکر سے، اسی لئے انسان کے عظیم ترین محسن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام تر توجہ اس پر مرکوز فرمائی ہے کہ انسان کو صحیح معنی میں انسان بنادیں، تو پھر فساد و جبرائیم خود بخود ختم ہو جاتے ہیں، نہ پولیس کی زیادہ ضرورت رہتی ہے نہ عدالتوں کے اس پھیلاؤ کی جو دنیا میں پایا جاتا ہے، اور جب تک دنیا کے جس حصہ میں آپ کی تعلیم و دیانت پر عمل ہوتا رہا دنیا نے وہ امن و امان دیکھا جس کی نظیر نہ پہلے کبھی دیکھی گئی نہ ان تعلیمات کو چھوڑنے کے بعد متوقع ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کی روح ہے اللہ تعالیٰ کا خوف، اور قیامت کے حساب کتاب کی فکر، اس کے بغیر کوئی قانون و دستور اور کوئی محکمہ اور کوئی مدرسہ اور یونیورسٹی انسان کو جبرائیم سے باز رکھنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

آج کی دنیا میں جن لوگوں کے ہاتھ میں ہتھیار کی باگ کردہ جرائم کے اسداد کے لئے نئے نئے انتظام کو تو سوچتے ہیں، مگر اس رُوح انتظام یعنی خوفِ خدا سے نہ صرف غفلت برتتے ہیں بلکہ اس کو فنا کرنے کے اسباب مہیا کرتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ ہمیشہ ہی سامنے آتا رہتا ہے کہ یہ

مرض بڑھتا گیا جوں جوں ردائی

کھلے طور پر فساد مچانے والے چوروں، غارت گردوں کا علاج پہل ہے، مگر ان انسانیت فراموش

انسانوں کا فساد ہمیشہ ہر رنگ اصلاح ہوتا ہے، وہ کوئی دلچسپ لغزب اصلاحی اسکیم بھی سن کر رکھ لیتے ہیں، اور خاص ذاتی اغراض فاسدہ کو اصلاح کا رنگ دے کر [ثُمَّ لَا تَجْنُ مُصْلِحِينَ] کے نعرے لگاتے رہتے ہیں، اسی لئے حق تعالیٰ سب جاننے جہاں فساد سے روکا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا **وَاللّٰهُ يَعْلَمُ السُّفٰہَ مِنَ الْمُصْلِحِ** (۲۲: ۱۲)، یعنی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ مفید کون ہو اور مصلح کون؟ جس میں اشارہ فرمایا کہ فساد و اصلاح کی اصل حقیقت حق تعالیٰ ہی جانتے ہیں جو دلوں کے حال اور نیتوں سے بھی واقف ہیں، اور ہر عمل کے خواص و نتائج کو بھی جانتے ہیں کہ اس کا نتیجہ صلاح ہوگا یا فساد، اس لئے اصلاح کے لئے صرف نیک اصلاح کافی نہیں، بلکہ عمل کا رخ بھی شریعت کے مطابق صحیح ہونا ضروری ہے، بعض اوقات کوئی عمل پوری نیک نیتی اور اصلاح کے قصد سے کیا جاتا ہے مگر اس کا اثر فساد و فتنہ ہوتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اے لوگو! بندگی کرو اپنے رب کی جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے

تَعْلَمُ تَقْوٰنَ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ

جس نے تم پر ہمیز گاہ بن جاؤ، جس نے بنایا واسطے تمہارے زمین کو بھونکا اور آسمان کو

بِنَآءٍ ۚ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الشَّجَرِ رِزْقًا

چھت اور انکار آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے میوے تمہارے نکالے

لَكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اٰنْدَادًا وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

تم کے واسطے سو نہ ٹھہراؤ کسی کو اللہ کے مقابل اور تم تو جانتے ہو

خلاصہ تفسیر

اے لوگو! عبادت اختیار کرو اپنے پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں جب نہیں کہ تم دوزخ سے بچ جاؤ شاہی محاورہ میں عجب نہیں کا لفظ وعدہ کے موقع پر بولا جاتا ہے، وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت اور برسایا آسمان سے پانی، پھر پردہ عدم سے نکالا بذریعہ اس پانی کے پھلوں سے غذا کو تم لوگوں کے واسطے، اب تو مت ٹھہراؤ اللہ پاک کے مقابل اور تم تو جانتے ہو جتنے ہوا یعنی یہ جانتے ہو کہ یہ تمام تصرفات خدا تعالیٰ کے سوا کوئی کرنے والا نہیں، پھر خدا کے مقابل میں دوسری چیزوں کو معبود بنانا کیسے درست ہو سکتا ہے۔

ہو جو کسی کا محتاج نہیں اور سب اس کے محتاج ہیں۔

اس آیت میں تَخْلُقُكُمْ کے ساتھ اَلَّذِي يَنْفَخُ فِي قُبُلِكُمْ کا اضافہ کر کے ایک قویہ بتلا دیا کہ تم اور تمہارے آباء و اجداد یعنی تمام بنی نوع انسان کا خالق وہی پروردگار ہے، دوسرے صرف مِنْ قَبْلِكُمْ کا ذکر فرمایا، مِنْ قَبْلِكُمْ یعنی بعد میں پیدا ہونے والے لوگوں کا ذکر نہیں کیا، اس میں اس کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ امت محمدیہ علی صاحبہا العلوٰۃ والسلام کے بعد کوئی دوسری امت یا دوسری ملت نہیں ہوگی، کیونکہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نہ کوئی نبی مبعوث ہوگا نہ اس کی کوئی حیدر امت ہوگی۔

اس کے بعد اسی آیت کا آخری جملہ ہے لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ یعنی دنیا میں گراہی اور آخرت میں عذابِ نجات پانے کی امید تمہارے لئے صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ توحید کو اختیار کر دو اور شرک سے باز آؤ۔

پھر دوسری آیت میں "رب" کی دوسری صفات کا بیان اس طرح فرمایا گیا ہے: اَلَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْمَاءَ سَائِغًا وَ لَبَنًا وَاَشْرَابًا وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاصْبَحَ مِنْهَا زُرْقًا لَّكُم مِّنْهَا رِزْقٌ حَتّٰى تَاْتُوا بِالنَّاصِيَةِ

یعنی رب وہ ذات ہے جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو فرش، اور آسمان کو چھت اور برساتا آسمان سے پانی، پھر اس پانی کے ذریعہ پردہ عدم سے نکالی پھلوں کی غذا تمہارے لئے۔

پہلی نعمت اس سے پہلے آیت میں اُن انعامات کا ذکر تھا جو انسان کی ذات سے متعلق ہیں، اور اس آیت میں اُن انعامات کا ذکر ہے جو انسان کے گرد و پیش کی چیزیں متعلق ہیں، یعنی پہلی آیت میں "الغنی" اور دوسری میں "آفاق" نعمتوں کا ذکر فرما کر تمام اقسامِ نعمت کا احاطہ فرمایا گیا۔

اُن آفاق نعمتوں میں سے زمین کی پیدائش کا ذکر ہے، اگر اس کو انسان کے لئے فرش بنا دیا، نہ پانی کی طرح نرم ہے، جس پر مسترا نہ ہو سکے، اور نہ لوہے، پتھر کی طرح سخت ہو کہ ہم اسے اپنی ضرورت کے مطابق آسانی سے استعمال نہ کر سکیں، بلکہ نرمی اور سختی کے درمیان ایسا ہونا چاہیے جو عام انسانی ضرورتِ زندگی میں کام دے سکے۔

فِرَاش کے لفظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ زمین گول نہ ہو، کیونکہ زمین کا یہ عظیم الشان کرہ گول ہونے کے باوجود دیکھنے میں ایک سطح نظر آتا ہے، اور مسترآن کا عام طرز یہی ہے کہ ہر چیز کی وہ کیفیت بیان کرتا ہے جس کو ہر دیکھنے والا عالم، جاہل، شہری و دیہاتی سمجھ سکے۔

دوسری نعمت یہ ہے کہ آسمان کو ایک مزین اور نظر فریب چھت بنا دیا، تیسری نعمت یہ ہو کہ آسمان سے پانی برساتا، پانی آسمان سے برساتے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ بادل کا واسطہ درمیان میں ہو

بلکہ محاورات میں ہر ادب سے آنے والی چیز کو آسان سے آنا ہوتے ہیں۔

خود قرآن کریم نے متعدد مقامات میں بادلوں سے پانی برساتے کا ذکر فرمایا ہے، مثلاً ارشاد ہوا: اَنۡزَلْنَا مَآءًۢمِّنۡ سَمٰوٰتِنَاۤ اَنۡزَلْنَا لَکُمۡ مِّنۡہَاۤ اَنْۡۢبَیَآءَۙ لَّعَلَّکُمۡ تَهْتَدُوۡنَ (واقفہ: ۶۹) | تو یا ہم اس کے آنا ہونے والے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَاَنۡزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءًۢمِّنۡۢمَّاۤ اَنۡزَلْنَاۙ لَّعَلَّکُمۡ تَشْكُرُوۡنَ (نبأ: ۱۳۰) | ہم نے آنا پانی مہربان سے ہونے بادلوں سے پانی کا ریحہ۔

چوتھی نعمت اس پانی کے ذریعہ پھل پیدا کرنا اور پھلوں سے انسان کی غذا پیدا کرنا ہے، پروردگار عالم کی چار مذکورہ صفات میں سے پہلی تین باتیں تو ایسی ہیں کہ ان میں انسان کی سعی و عمل تو کیا خود اس کے وجود کو بھی دخل نہیں، بیچارے انسان کا نام و نشان بھی نہ تھا، جب زمین اور آسمان پیدا ہو چکے تھے اور بادل اور بارش اپنا کام کر رہے تھے، ان کے متعلق تو کسی ہر قوتِ جاہل کو بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ کام سوائے حق جل شانہ کے کسی انسان یا بت یا کسی اور مخلوق نے کئے ہوئے ہوں یا زمین سے پھل اور پھلوں سے انسان غذا نکالنے میں کیسی سادہ لوح اور علی نظر رکھنے والے کر یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ انسانی سعی و عمل اور اس کی دانشمندانہ تدبیروں کا نتیجہ ہیں کہ وہ زمین کو نرم کرنے اور کمانے میں، پھر بیج ڈالنے اور جانے میں، پھر اس کی تربیت اور حفاظت میں اپنی محنت خرچ کرتا ہو، لیکن مسترآن کریم نے دوسری آیات میں اس کو بھی صاف کر دیا کہ انسان کی سعی اور محنت کو درخت اُگانے یا پھل بھالنے میں قطعاً کوئی دخل نہیں، بلکہ اس کی ساری تدبیروں اور محنتوں کا حاصل رکاوٹوں کو دور کرنے سے زیادہ کچھ نہیں، یعنی انسان کا کام صرف اتنا ہے کہ پیدا ہونے والے درخت کی راہ سے رکاوٹیں دور کرے اور بس۔

غور کیجئے کہ زمین کا کھودنا، اس میں بیج چلانا، اس میں سے جھاڑ جھنکاؤ کو دور کرنا، اس میں کھاد ڈال کر زمین کو نرم کرنا جو کاشتکاروں کا ابتدائی کام ہے، اس کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ بیج یا محنت کے اندر سے جو نازک کوئل قدرتِ خداوندی سے نکلے گی زمین کی سختی یا کوئی جھاڑ جھنکاؤ اس کی راہ میں حائل نہ ہو جائیں، بیج میں سے کوئل نکالنے اور اس میں پھول پتیاں پیدا کرنے میں اس بیچارے کاشتکار کی محنت کا کیا دخل ہے۔

اس طرح کاشتکار کا دوسرا کام زمین میں بیج ڈالنا، پھر اس کی حفاظت کرنا، پھر جو کوئل نکلے اس کی سردی گرمی اور جانوروں سے حفاظت کرنا ہے، اس کا حاصل اس کے سوا کیا ہو کہ قدرتِ خداوندی سے پیدا ہونے والے کوئلوں کو ضائع ہونے سے بچایا جائے، ان سب کاموں کو کسی نہ

کے کھٹے یا پھلے پھولنے میں بجز دلی مروت کے اور کیا عقل سے؟ ان باتوں سے جتنے والے بچکی اور اس سے کھٹے والے درخت کی غذا تیار ہوتی ہے، اور اس سے وہ پھل پھولتا ہے، لیکن اپنی کاشتکار کا پیدا کیا ہوا نہیں اس میں کسی کاشتکار کا کام صرف اتنا ہے کہ قدرت کے پیدا کئے ہوئے پانی کو قدر ہی کے پیدا کئے ہوئے درخت تک ایک مناسب مقام میں پہنچا دے۔

آپے و پھر دیکھو درخت کی پیدا نشی اور اس کے پھلے پھولنے میں انکی سے آخر تک انسان کی محنت اور نوچر کا اس کے سوا کوئی اثر نہیں کر سکتے والے درخت کے راستے سے دوڑے پٹا دے یا اس کو مٹا دے مٹانے سے پہلے، اپنی دہی و خشک کی پیدا نشی، اس کا بڑھنا اس میں پتے اور شاخیں پھر پھول اور پھل پیدا کرنا سوا میں سوائے خدا تعالیٰ کی قدرت کے اور کسی کا کوئی دخل نہیں۔

اسی مصلحت کو مشروران کچھ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:-

أَلَمْ تَرَ أَنَّا جَعَلْنَاهُ نُحْيِي مَوْتًا وَأَمْ نَحْيِي
قَوْلَهُمْ كَذِبًا أَفَرَأَيْتُمْ إِنْ دَعَاكُمْ بِهِمْ

قرآن کے اس سوال کا جواب انسان کے پاس بجز اس کے اور کیا ہے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی ان سب درختوں کو کھٹانے والے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا کہ جس طرح زمین اور آسمان کی پیدا نشی اور پھول و پھل کے منظم مسلسل کام میں انسانی مسہمت کا کوئی دخل نہیں اس طرح مصلحتی اور درختوں کے پیدا ہونے اور ان سے پھول میل کھٹنے اور ان سے انسان کی غذا تیار ہونے میں بھی اس کا دخل صرف جاننے کا ہے اور حقیقت میں سب کا دار و مدار صرف حق تعالیٰ کی قدرت کا ملکہ اور حکمت ہے۔

غور سے دیکھو اس آیت میں حق تعالیٰ کی ایسی چاندھن کا بیان ہے جو سوائے اس کے اور کسی مخلوق میں پائی نہیں سکتیں اور جب ان دونوں آیتوں سے معلوم ہو گیا کہ انسان کو عدم سے وجود کا اور ہر اس کی خلق و تربی کے سامان زمین اور آسمان دار و مدار ہیں جنہوں نے ذوقیہ پیدا کرنا تو خداست حق میں مشائخ کے اور کسی کا کام نہیں، تو ہر اولیٰ کہہ دو جو رکھنے والے انسان کو اس پر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں درہتا کہ عبادت و اطاعت کے لائق اور سچ میں صرف وہی ذات ہے، اور اس سے بڑا کوئی نکل نہیں کہ انسان کے وجود و دار و اس کے بقا و قیام کے سامان تو اللہ تعالیٰ پیدا کرے، اور غالباً انسان کے وجود کی کشتی پر کھڑا ہے اور دوسری کشتیوں کی بسندگی میں مشغول ہو جاتا ہے، حوالہ دینے سے اس کا تعلق انسان کو نہ ہاں پر فرما دے۔

نعمت وافر وہ عیال مسکین
انعمت از تو میں پیرے کی محسن

اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی ساری مخلوقات کا سرمداس بنے بنا اس کا ساری کائنات اس کی خدمت کرے اور صرف رب کائنات کی خدمت اور عبادت میں مشغول رہے، اور کسی کی طرف نظر نہ کرے، اس کا یہ رنگ جو جانتے

بجز ماہر و اہل و علمین کو چھ کر ہیست
دور میں و آسمان جز و کریم آید نیست

لیکن چنانچہ انسان نے وہی حافیت سے اللہ تعالیٰ ہی کو بظاہر یا غور سے ایک ہی کی بنیادی کے بجائے ستر گروہ و نو فرمایا کی بنیادی کرنا چاہی

ایک در پھول کر ہم جو کئے کا کھنکھ کا نام
ہم نے آواز دی غری کا نہ سوا خاتم

اس فرد کی غلطی سے خاتم والانے کے لئے اس آیت کے آخر میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا
قُلْ قُلُوبُهُمْ مُّغْضًى وَظُلُومٌ
اور جیسے وہ اپنی جہت چمے ہے جان یا کہ کو نیست سے بہت کرنے والا، مصلحتی حیرت اور ہم درہما کے سامنے سامان مبتلا کر کے ایک قتل سے سینہ و ریل، حساس اور عاقل انسان بنانے والا، مصلحتی دہن جس کے لئے زمین اور دوسری ضروریات کے لئے آسمان بنانے والا، آسمان سے اپنی رہنمائی والا، زمین سے پھل اور پھل سے غذا تیار کرنے والا، حق تعالیٰ کے کوئی نہیں تو عبادت و بندگی کا مستحق و سزا کوئی نہ سکتا ہے کہ اس کو خدا کا مقابل یا ہم درہما کر کے شکر یا جانتے، مگر وہ بھی غور کیا جائے کہ اس میں جس اس سے بڑھ کر کوئی نظر اور کوئی ذوق نہیں مگر خدا تعالیٰ کو چھڑ کر غفلت سے دل نہ لگا جانتے اور اسی پر ہر سوا کیا جانتے

آنا ہی مجھ پر دی جو جانتے مگر اندھ
کو نہ نظر انداز کر نہ نظر اس اندھ

خلاصہ یہ کہ ان دونوں آیتوں میں اس چیز کی دعوت دی گئی ہے جو تمام آسمانی ممالکوں کے اور تمام انبیاء کے سب سے افضل و تصدیق دہنی مروت ایک خدا کی عبادت و بندگی میں کام لینا جو تمام ادیان و ملت کی نظر سے ہے جو اللہ کے تمام ممالک و احوال اور اس مطلق و مطلق پر ہر گز اور رکھتا ہے، یہ کہ جس شخص پر یقین کرے کہ تمام عالم کا خالق و مالک اور تمام نظام عالم میں مشغول اور تمام چیزوں پر قادر و صرف ایک ذات ہے، بغیر اس کی مشیت اور ارادے کے کوئی ذوق حرکت کر سکتا ہے، دیکھو تو کسے فی الواقع انتصاف پہنچا سکتا ہے، تو اس کی چوٹی توجہ ہر صیبت و راحت اور بزرگی و فراخی میں صرف ایک ذات کی طرف ہو جائے گی، اور اس کو وہ بصیرت حاصل ہو جائے گی

جس کے ذریعہ وہ اسبابِ ظاہر کی حیثیت کو پہچانیے گا کہ یہ سلسلۂ اسبابِ اوقیقت ایک پڑا ہے جس کے پیچھے دستِ قدرت کار فرما ہے۔

ہر فرد اور جماعت کے لیے اپنے واسلے و امتیاز کی پیمائش اور اس حقیقت کو سمجھنا کہ ہمیں اور انھیں (علوم و طب) کو ہر فرد اور جماعت کے لیے ہی کوئی حقیقت ہے، اور وہ حقیقت ہمارے اور ان کی طاقت، ذہنی میں ہے نہ جسمانی میں، جسے کسب طاعت اور قوتوں کا سحر و جادو اس وقت تک فعال کرے گا جب تک کہ اسے اپنے ذہن میں ہے، جسے نہ پوری اور جسمانی زندگی کے لیے کھینچنے کے لئے بصیرت چاہیے، اور جس نے اس حقیقت کو غیبی سمجھا دیا وہ انہیں کتنا ہی دانشمند، فلسفہ کو کتنا ہی آگاہ کرے گا کہ اس میں اس کی مثال اس کی حقیقت کی ہے جس سے اس کے لیے پیش پیش ہے پوری اور ان کے ہمارے گارڈ کے اندر میں اور جہت میں شرف اور سہز میں، سہز کے کھلنے سے رہی جلتے ہوئے ہے اور شرف جہت میں دکھانے سے وہی طرح جاتی ہے، اور ہر کچھ کو ان جہتوں میں ہی کو کڑا کر کے لگے اور کھینچے کہ وہ جہتوں میں اس حقیقت کی ایک پس کائناتی ہی بنو قدار، ہر ایک طرح اور جہتوں میں اس کو جلاتا اور نور کائنات کا کام ہے، جس طرح دنیا میں جہتیں برہمنی سے کراس جاتی ہیں کو جہتوں میں اس حقیقت میں اور کام اور حقیقت ڈھانچہ رکھ کر رکھ کر دہی کو جلاتا ہے، اور نور کائنات کے ایک اس کی جہتیں میں اس کے عمل سے نور کائنات کے اور میں نے نور کائنات کو اور کچھ کر لیا تو اسے نور کائنات کے اور حقیقت اس کا جلاتا نور کائنات کو اور کائنات کا کام ہے، نور کائنات کے عمل کے چرچوں کا، کابل طاعت اس انہیں کے ہے جو ان کے کائنات پیدا ہو رہی ہے، اس طرح ایک نور کائنات میں سب کچھ ہے، ہر جہت سے کو حقیقت کو کھینچنے ہی نہیں ہے، اور نور کائنات میں نور کائنات کے ہے، نور کائنات کو کڑا کر دے اور نور کائنات کو، اور علوم و طب کا کائنات اور نور کائنات میں کو نہیں، طاقت اور وقت ہر قسم کی بات کے ہے جس نے آگ اور جہت پیدا کئے ہیں اور اس کی طاقت و داعیہ کے خواست و سبب میں اس کی ذہنی اور نور کائنات میں ہے۔

خاک و بار و آب و آتش بشوئیم

باسم و تو مروه، با حق فرزند اند

کسی کا عمل اس کی خجالت اور خجالت کا جتنی سبب ہیں کسی فعل کا تو یہ بیشک نہ ہو مگر ایمان و کفر کے لیے یہ جانتا اور جانتا کا حصول (یعنی جانتا کے لیے یہ جانتا ہے) اگر اس میں خجالت کا سبب ہو تو یہ جانتا کے لیے یہ جانتا ہے۔ مگر اس میں خجالت کے خزانے کے بیان کرنے میں سخت پرہیزگار کے کہ اس میں خجالت کا عمل نہیں بلکہ خجالت کی خجالت ہے۔ مگر اس میں خجالت کے خزانے کے بیان کرنے میں سخت پرہیزگار کے کہ اس میں خجالت کا عمل نہیں بلکہ خجالت کی خجالت ہے۔ مگر اس میں خجالت کے خزانے کے بیان کرنے میں سخت پرہیزگار کے کہ اس میں خجالت کا عمل نہیں بلکہ خجالت کی خجالت ہے۔

عہدہ قومی رہنماؤں اور اہلکاروں کے لئے ہے۔ یہ صرف ایک نظر پر نہیں بلکہ انسان کو صحیح معنی میں انسان بنانے کا واحد ذریعہ ہے جو انسان کی تمام شکستہ حالتیں اور ہر حالت میں اس کے لئے جان بچاؤ، دودھ پھر کر دینا اور اس کا علاج ہے۔ ہمیں عہدہ قومی کا مقصد یہ ہے کہ عناصر کے کون و نوا اور اہلکار کے ساتھ تعلقات صرف ایک سبق کی مشیت کے حامل اور اس کی شکست کے مظاہر ہیں۔

ہر نفسیر کی آواز

مرتبہ دہیں ہیں ہزاروں ہزار

اور وہاں رہے کہ جب یہ عقیدہ ہمیں کے قلب و دماغ پر بچھا جائے اور اس کا حال بن جائے تو وہ دنیا ہی اس کے لئے جنت بن جائے گی، اس لئے چمکارتے قناد اور پر لٹاؤ کی بنیاد ہی بنیہدم اور خاص کر، گو کہ ان کے سامنے یہ سنی ہو گلاست

از تعداد اول خلافت و ششمین دور رسیده

گرداوم دور کعبه کتب اوست

اس مفید و کامیاب ساری دنیا سے بے نیاز و خوف و خطر سے بالاتر زندگی گزارنا ہے،
 اور کامیاب رہنا ہے۔

موند چو برابنه ريزي زودش ۴ چؤالاد هندى ښي پر سرش

امید ویرا کسوتی نیا شد و کس : همین است بنیاد توحید و کس

کلام اللہ جو کلمہ توحید کہلا گیا ہے اس کا یہی مفہوم ہے، مگر یہ ظاہر ہے کہ توحید کا مفہوم انسانی
 اندر اس کے لئے کافی نہیں، بلکہ سچے دل سے اس کا یقین اور یقین کے ساتھ تصدیق و ضروری ہر

کیونکہ تو میرا خدا واحد و یکتا ہو نہ واحد و یکتا
 کلہ لا الہ الا اللہ کے چہ پہنے والے تو آج دنیا میں کروڑوں میں اور اتنے میں کسی نے
 نہیں اتنے نہیں جو ہے، لیکن عام طور پر یہ صرف رانی بیخ خرچ ہے، جو خدا کا رنگ ان میں نہیں
 درخشاں کا بھی وہی حال ہو رہا ہے۔ بڑی بڑی کھانوں کا خدا کوئی بڑی سے بڑی قوت و طاقت ان کا یہ
 کر کے تھی اللہ نے کسی قوم کی حدود کی کثرت کی یا پھر ان کا یہ تھی، ان کو بڑی سے بڑی دولت
 سلطنت ان کے قلوب کو غلبہ کی تپانی طرف جھکا کر تھی، ایک شخص کو دیکھ کر دیکھ کر
 کہہ رہا تھا کہ تم میرے بھائی نہیں جانتے تھے، یہی وہی حکمِ خداوندی، دنیا کے بعد خداوندی
 جو عورت کی نسبت میں دنیا پر چاہتے ان کی طاقت، دولت، اس جیسی توجہ میں مقرر تھی، اللہ تعالیٰ
 یہی ادب سلماں کو یہ دولت نصیب فرما ہے۔

کوئی دلائل معلوم ہوا اسکو دل کا بی بھی پڑا تو کسی آپ کے لئے اس سے استغناء اور عقار گزرمعلوم ہوگا کہ ان دلائل سے بے طرفی منقطع اور اس سے دلچسپی دل کی کوئی قسم ہی نہ ہو اور کسی قوم کو بے طرفی سے کچھ تھے۔ قرآن کریم نے بھی ان کے مشفق بنے لفظ استعمال کیا ہے۔ **مکارم** جو ہیں وہ انھار کا آپ پر قسم کی تعلیم قطعاً بے غریب ہے، وہی کوئی مزا عالم میں ان خاص کی سمیت ہیں وہ کہ یہ معلوم حاصل ہو چکا ہیں کہ ان قرآن عامل ہے، میرے دست کو تو ایک فرقہ اداوارہ، عروہ، مکملہ افتادہ آپ کے لئے مخصوص طور پر ایسے مسائل جو بہت معمولی و خشوع و خوار اور چہرہ پر گہرے رنگ کسی کسی طرح سے تھوکیا پیٹے ہیں آپ تھے وہ بھی دیکھیں، بالکل آبی صاف ہے، وہ کہ پانچام تک بھی دیکھ سکتے تھے، خوب انھیں خاص فرشتہ رحمت تھا جس کے لئے خاص خاص انجکامات کئے جاتے اور مشاہدے متعلقہ ہوتے، اور اس میں ہر شخص مساجت کی کوشش کرتا تھا، آپ کو ہر حقانی کے لئے اسی ذات حافظ الہی تھی کہ ان پیسروں سے بھی وہی بے ذلہ دیکھی کہ فی شریعہ قصیدہ کا دیکھی انھیں جیس میں شریک ہو گئے۔

ان آبی صاف ہونے کے ساتھ کہ آپ سے ہی آپ کی شرافت نفس، احسان و فاضلہ، فہم و فراست کے فیوض اور ۱۴۰ دانات و دانات کے اعلیٰ ترین شاہکار آپ کی جانب مقدس میں ہر وقت مشاہدہ کئے جاتے تھے، میں کاغذ پر لکھا کہ سب کے بڑے بڑے مفہور و دیکھ کر سرور اور آپ کی تعلیم کرتے تھے اور سانسے کہ میں آپ کو ان کے لئے چھپے پکارا جاتا تھا۔

یہ افق صاف چلتی سال تک کہیں اپنی برادری کے سامنے دھتے ہیں، بھی دوسرے ملک کا سفر بھی نہیں کرتے، جس سے یہ خیال پیدا ہو سکے کہ وہاں جا کر علوم حاصل کئے ہوں گے، صرف ملک شام کے دو تھانہ ہی مسو ہوتے، وہ بھی جتنے جتنے چندوں کے لئے ہیں میں اس کا کوئی امکان نہیں۔

اس افق صاف ذات مقدس کی زندگی کے پائیز سال تک میں اپنی برادری میں اس طرح گذر کر کہ دیکھی کسی کتاب یا حق کو یاد کیا، دیکھی کتب میں گئے، دیکھی جہاں میں کوئی نظم قصیدہ بھی تھا، شطرنج چلتی سال کے بعد آئی، ان سال تک یہ یاد رکھ کر آئے گئے کہ ان تمام قرآن ہے جو اپنی نفس تعلیم و بلاغت کے لحاظ سے اور مسو معلوم قرآن کے لحاظ سے غیر معمولی کلام ہے، اور صرف اتنا ہی ہوتا تو میں اس کے مجبور ہوتے میں کسی انصاف پسند کو کیا ضرورت نہ سکتا ہے، مگر یہاں بھی نہیں کچھ کچھ ساری دنیا کو تھوڑی کی پہنچنے دیا کہ کسی کو اس کے کلام آبی ہونے میں شہید ہو تو اس کا کشت بنانا ہے، اب ایک طرف قرآن کی یہ شخص اور پہنچنے اور دوسری طرف مادی دنیا کی مخالفت کا تقبیح ہے

اسلام اور غیر اسلام کو شکست دینے کے لئے اپنی آل باتی اولاد اور ہر مصلحت کو تھوڑے کو تھوڑے مگر کام کرنے کے لئے کوئی جرات نہیں کرتا، قرآن کی ایک جہت ہی صورت کی مثال بنانا ہے، مفسرین کہہ چکے کہ کتاب ہے مثال دے لیں یہی دہوتی، جب بھی آپ کی صفحہ کی زبان سے اس کا جہر و لعل

قرآن اور چوہا چوہا کی تفصیل میں جاتے ہیں کسی فرقہ کریم کے علمز ہونے کے لئے کہ نہیں ہیں کو جہاں وہ چاہی سہو سکتا ہے۔

علمی فرقان کی دوسری وجہ اہل علم فرقان کی ن ساری وہ دیکھئے، یہ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن اور اس کے احکام سادہ و سہل بنائے گئے آئے، لیکن اس کے باوجود اسطوارہ پہنچا کلام خوب ہے، میں کو اور کوئی علم کی آکا تھا یا نہیں مگر فصاحت و بلاغت ان کا فطری ہمنسار اور ہر دانش و صنعت مقناہیں ہیں وہ فرقان کی تیسری وجہ ہے، فرقان ان کو مخاطب کر کے پہنچے کر تیسے کہ اگر قصوں میرے کلام آبی ہو، نہ میں کہ نہیں شہ ہے، فرقان میں ایک سورت کی مثال بنا کر دکھاؤ اور فرقان کی یہ فہمی دیکھیں صرف اپنے نفس میں کسی میں کسی حسیہ اصول اور میں صاف اور سراسر اس کی حد تک ہوتی تو فہم امتیاز کے لئے اس کی نظر پر پیش کرنے سے بڑھ کر عقلی ہر تاجکین مسرتان نے صرف حسی مسرتی ہی کے مشعلی تھوڑے نہیں کی، بالکل عقلی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے میں فری دنیا کو پہنچنے دیا ہو اس جتنے کو قبول کرنے کے لئے افراہم عالم میں سب سے زیادہ مستحق خوب ہی تھے، اگر فی الواقع یہ کلام وہ ہشت ہے، ہر کسی باوقیہ حدت کا کلام نہیں تھا تو جتنا خوب کے لئے کلاما شکیل تھا کہ ایک اسی شخص کے کلام کی مثال لکھنا سے بہتر نہ ہو تو آج بھی کہتے، اور ایک دو نوی یہ کلام ذکر میں فرقان کے ان کو یہ سورت میں دیکھی کو سادی قوم میں کرنا تے، مگر مشرکین کے اس بلند انگ و عوسے اور پھر طرح طرح سے تحریف والے یہ بھی وہی کہ میں فرقان کو دیکھی کہ وہی خاموش ہے، چند سطر یہاں مغلایہ پر چڑھیں پھر کرنا۔

خوب کے سرور اور نے فرقان اور اسلام کے مٹانے اور تہذیب اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو مغلوب کرنے میں جس طرح اپنی اپنی جہت کی کاؤ دو لگایا، وہ بھی مجھے پڑے آدمی سے عقلی نہیں، شریع میں انھیں صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے لئے پڑے، دغا، کج طرح کی آبرو میں دے کر چاکہ دو کھڑ اسلام کو چھوڑ دیں، مگر جب دیکھا کہ ہاں وہ نش نہیں ہے ترشی آبلے، تو خوش دھا پہلے انداز کیا خوب کا سرور و تہذیب، میرے قوم کا تہذیب میں کہ آپ کے اس مانعہ اور عرب کی پوری دولت و حکومت اور بہتر میں حسن و جمال کی فواید کی پیش کش میں اس کام کے لئے کہ آپ اسلام کی تبلیغ چھوڑ دیں، دیکھئے اس کے جواب میں فرقان کی چند آیتیں سننا دینے پر اکتفا فرما، جب یہ تدبیر میں کاگر ذہول تو جگہ کے مقابلہ کے لئے تیار ہو کر قبیل انہجرت اور بعد از ہجرت ہو تو قرآن عرب نے انھیں صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی مقابلہ میں ہر معرکہ لڑی لگائی، جان، مال، اولاد، آبرو، سب کو اس مقابلہ میں خرچ کرنے کے لئے تیار ہونے، یہ سب کچھ کیا، مگر یہ کسی نے ذہول فرقان کے پہنچنے کو قبول کرنا اور حذر سطر مقابلہ پر کھینک کر تیار کیا، ان حالات میں سارے عرب کا اس کے مقابلہ سے شکست خوردہ ہوا اس کی کمال ہی کی شان

نبیوں کو یہ اعلان کلام نہیں بلکہ اعلان کلام ہے جس کے کام یہ اعلان کلام کی تشریح و تفسیر ہے۔
 حلوں کی قدرت سے باہر ہے۔

پھر صحت انتہائی نہیں جو آپ نے اس کے مقابلہ سے سکوت کیا، بلکہ اپنی خاص مجلسوں میں
 سنبھلے اس کے پیشکش ہوئے کلام افراط کیا، اور جہاں میں سے منیت مزاج تھے انھوں نے اس
 اعتدال کا اظہار کیا، پھر ان میں سے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے، اور کچھ اپنی اپنی رسوم کی پابندی کا
 بنی حد منافات کی ضد کی وجہ سے اسلام قبول کرنے سے بازو اور افراط کے محروم رہے، اور کچھ
 کی پہنچ ان واقعات پر شاہد ہے، میں اس میں سے چند واقعات اس جگہ بیان کرتا ہوں جس سے اندازہ
 ہو سکے کہ پھر وہ آپ نے اس کلام کے بے غلط نہ تھے، بلکہ اس کے خلاف اور اس کی مخالفت میں
 کرنے کی اپنی رسوائی کے خیال سے چھوڑ دیا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا چرچا کرتے
 باہر جازا کے دوسرے مقامات میں ہوئے لگے، اور کچھ کاموں کی طرف توجہ نہ کی، اور اس کی فکر نہ کی کہ
 افراط و تفریط سے بچنا چاہیے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام میں سے تو فرطت ہو جائیگی
 اور غالب خیال ہے کہ مسلمان ہو جائیں گے، اس کے اندر وہ کسی نہ سمجھنے کے لئے قریش کے کچھ مجلس
 منعقد کیا، اس اجلاس میں آپ کے بڑے بڑے سردار موجود تھے، ان میں ولید بن مغیرہ بھی سب
 بڑے اور عقل میں ممتاز سمجھے جاتے تھے، سب نے ولید بن مغیرہ کو پیش کی کہ اب افراط لکھنے
 تو گئے ہیں، اور ہم سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ نہیں سمجھتے کہ ہم کہیں؟ انہیں آپ
 کوئی ایسی بات کہیں کہ ہم سب وہی بات کہہ دیں، یا خدا کو جو خود ہمارے ہیایات میں اختلاف
 ہو جائے، ولید بن مغیرہ نے کہا کہ تم ہی کو یہ کہنا چاہئے!

وگرنے کے کہہ جانے خیال میں سب نے کہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ماضی و مستقبل میں
 آپ کا کلام بجا نہ ہو، ولید بن مغیرہ نے کہا کہ تم ایسا بزرگ نہ کہنا، کیونکہ وہ لوگ جب آپ کے پاس
 جاتے تھے، اور آپ سے طاعت و خشوع کرتے تھے، ان کو آپ کا کلام و بیانیہ ماضی و مستقبل میں بجا نہیں
 نہیں ہو جائے گا، کرتے جھوٹ بولے، پھر یہ لوگوں نے کہا کہ اچھا ہم ان کو یہ کہیں کہ وہ ایک شاعر
 ہیں، اور اویس نے اس سے بھی منع کیا، اور کہا کہ جب آپ کا کلام میں ہے، وہ تو شعرو شاعری کے ماہر
 ہیں، انھیں یہ نہیں ہو جائے گا کہ شاعر ہیں اور آپ شاعر ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ سب لوگ صبر و بردبار
 سمجھیں گے، پھر یہ لوگوں نے کہا کہ تو پھر ہم ان کو یہ سننا دے دو کہ انھیں درجہ تہذیب سے ملے
 فیہ کی خبریں دے کر کہیں، اور نہ کہا کہ یہ غلط ہے، بلکہ کہ جب آپ کا کلام میں ہے تو یہ جملہ جانتا
 کہ یہ کلام میں کائنات میں ہے، وہ پھر یہی نہیں سمجھیں گے، اس کے بعد قرآن کے بڑے ہیایات
 بنی مغیرہ نے تاخرات میں ان کو ان افراطی بیانیہ کیا۔

تھوڑا کچھ قسم احقر کوئی شاعر شاعری اور شاعر و شاعرین، ہر ایک واقعہ نہیں،
 خدا کی قسم! اس کلام میں غلط حالات ہے، اور ایک خاص روایت ہے، کہ ایک کسی شاعر
 انھیں دیکھنے کے کلام میں نہیں پاتا۔

پھر ان کی قوم نے دریافت کیا کہ آپ کی بتلائے پھر ہم کیا کریں؟ اور ان کے اپنے ہی لوگوں
 سے کہا کہ ہمیں! اور اویس نے کہا کہ ہمیں خود کرنے کے بعد کچھ جواب دوں گا، پھر میرے سوچنے کے بعد کہا کہ اگر کچھ
 کہتا ہوں تو تم ان کو متاثر نہ کرنا، کہنے جاؤ گے، آپ بیٹے اور میں، یہی میری تفریق ڈال دیتے ہیں۔
 قرآن میں یہ طعن اور مضمون ہو گا، اور اس میں یہی کہنا شروع کیا، مگر خدا کا چارہ کہیں ہو گا، کہ کچھ
 واقعہ انتہائی اس بات سے کہ لوگ آپ سے قرآن سننا اور میرے مسلمان ہو گئے، اور افراط و تفریط
 میں اسلام قبول کیا، اور خاصا نہیں کریں!

اس طرح ایک قریبی سردار لغز بنی حادث نے ایک مرتبہ اپنی قوم کو خطاب کر کے کہا،
 کہ تم قوم قریش، آج کل ایک معیبت میں گرفتار ہو کر اس سے بچنا چاہیے، میں معیبت سے
 سابقہ نہیں ہوں، خدا کی قسم! اصل علیہ وسلم، خدا کی قسم! کہ اب لو جہاں سے اور سب ان کے ساتھ
 و احسان کے فروغ اور اپنی قوم میں ان کو سب سے زیادہ سزا دینے، زیادہ امانت دلو جاتے اور کہتے تھے
 اب جب کہ ان کی سرپرستی سنبھالنے لگے، اور انھوں نے ایک بے مثال کلام اللہ کی طرف سے پہنچا دیا تو
 حرام ان کو جاہور کہنے لگے، خدا کی قسم! جاہور نہیں، ہم نے جاہور لوگوں کو دیکھا اور جانتا ہے، ان کے ساتھ
 سے ہیں اور طریقوں کو سمجھتے ہیں، وہ افراط و تفریط میں۔

اور یہی حرام ان کو کہنے لگے، خدا کی قسم! وہ ان ہی میں نہیں، ہم نے یہیت کا ہون کو دیکھا اور
 ان کے کلام سے، جس میں ان کو ان کے کلام سے کوئی نہایت نہیں۔

اور یہی حرام ان کو شاعر کہنے لگے، خدا کی قسم! وہ شاعر بھی نہیں، ہم نے خود شعرو شاعری کے تہذیب
 فنون کو سیکھا، اچھا ہے، اور جسے بڑے شعراء کے کلام ہیں! وہ ہیں، ان کے کلام سے اس کو کوئی نہایت
 نہیں، پھر یہی حرام ان کو کہنے لگے، خدا کی قسم! وہ ان ہی میں نہیں، ہم نے یہیت سے مجتہدوں کو دیکھا
 بحال، ان کی جو اس میں تھے، ان کے خلاف اور خدا کا کلام سننے میں، یہاں یہ کچھ نہیں، انہیں نے میری قوم میں
 انصاف کے ساتھ ان کے معاملہ میں طرز کردہ، ہر سرسری نگاہ سے کی چیز نہیں، انھیں خاصا نہیں کریں، بلکہ
 حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرا بھائی انہیں ایک مرتبہ منظر لکھا، اس نے وہاں سے کر
 لے جاتا کہ میں ایک شخص کو یہ بتاتا ہے کہ اللہ کا رسول ہے، میں نے یہ چاہا کہ وہاں کے لوگ
 اس کے اپنے میں کیا بات دے سکتے ہیں! بحال نے کہا کہ کوئی ان کو شاعر کہتا ہے، کوئی ان کا جھگڑا کر
 کوئی جاہور کہتا ہے، میرا بھائی انہیں خود خدا کا کلام دیتا، وہ میرے واقعہ آدمی خدا، اس نے لکھتے

کہا کہ یہاں تک میں نے خود کیا تو گویا یہ سب اہل علم ہیں، اُن کا کلام نہ شرع ہے نہ کائنات پر نہ قرآن و کلمات میں بلکہ مجھے تو کلام صادق نظر آتا ہے۔

لہذا فرمایا میں نے یہ کلمات سنا کر، اور سید جہرام میں اگرچہ میرا تئیں وہ نہیں نے اس طرح گذارے کہ سوائے قرآن کے باقی کے میرے ہی نہیں کیا، اُن تمام وہ جس نے مجھے یہ کہہ کر حلیفیت معلوم ہوئی تھی کہ میں نے یہ کلمات نہیں کہے، اُن سے

واپس گئے تو لوگوں نے کہا کہ میں نے تو تم اور اس کے قصداً اور اہل علم کے کلام بہت سے ہیں، اور کلاموں کے کلمات اور جزیئ کے مقالات بہت سے ہیں، مجھ کو اصل علیہ وسلم کے کلام کی مثال میں آج تک نہیں نہیں تھی، مگر سب میں بات مانو، اور آپ کا کلام اگرچہ کچھ کچھ کلام کی

سال میں اُن کی پہلی قوم کے تقریباً ایک ہزار کوئی تھیں جو کہ مسلمان ہو گئے، وہ خاص میں ۱۱۰ ج ۱۱۱ اسلام اور حضرت علیؑ علیہ وسلم کے سب سے پہلے دشمن ابو جہل اور اُن کے شرعی طریقہ میں وہ لوگوں سے چھپ کر قرآن سننا کرتے، اور اس کے عجیب و غریب انداز میں دیکھ کر انکیزہ لگاتے

تھے، مگر جب وہ تم کے کہہ کر لوگوں نے اُن کو کہا کہ جب تم اس کلام کو ایسا بے اختیار کہتے ہو تو اس کو قبول نہیں کرتے، اور اب وہی کہا جا رہا ہے، تمہیں معلوم ہے کہ یہی حدیثات ہیں جنہوں نے

تقریباً میں ہمیشہ سے قاریت اور صحاح و متابعین و صحابہؓ اور جن کا نام آگیا ہے، جڑ بننا چاہتے ہیں، یہی اس کا راز ہے، دیکھ میں اب جبکہ تم اور وہ دونوں برابر بیٹھتے، کلام میں تو اب وہ کہتے کہ ہم ہم ایک ہی چیز ہوتے ہیں، یہ آفاق سے وہی آتی ہے، اب یہ اس میں کیسے اُن کا کلام نہ کرے، میں تو بھی

اس کا استیلاؤ نہ کروں گا، وہ خاص، غلام کلام پر کہہ کر سنا کہ اس دعوے اور چیلنج پر صرف یہی نہیں کہہ کر مجھے جواب دے، ہمارے

مافی الی اور سکتا کیا بلکہ اس کے بے مثل دیکھ کر نظیر ہوئے اور اپنے بھوکا کھیل طرح پر اعتراض بھی کیا ہے، مگر یہی انسان کلام پر تو اس کی کوئی وجہ نہ تھی کہ سارا جواب بلکہ ساری وہ پاس نکال لائے، سے عاجز ہو جائی۔

فخران اور سید فخران کے مقابل میں جان و مال اور اولاد و گھر سب کچھ قرآن کرنے کے لئے تو وہ نیا ہو گئے، مگر اس کے لئے کوئی آگے نہ بڑھا کہ سنا کہ چیلنج کو قبول کرے، وہ سطر اس کے مقابل میں پیش کر دیتا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ اپنے باپ دادا و اہل و عیال کے باوجود صنعت و تجارت سے و تجارت کے اس دہانے تھے، جب انھوں نے قرآن کر سنا کہ یہ بھلا کیوں، وہ حضرت اس کلام کی مثل ہم نہیں دیکھتے تو محسن و حامی اور مددگار کے طور پر کوئی کلام نہیں کرنا چاہتے، نہ عازم، مگر وہ یہ بھی جانتے

تھے کہ ہم نے کوئی سپریم ٹیبل نہیں کر دی، جو ہمے عرب کے قصداً اور اہل علم کے مقابل میں نہیں میں کر رہی تھی، اور خواہ خراہ رسولی ہو، اس نے اپنی قوم نے سکوت میں نہ کیا، اور عزرائیل و عزرائیل کے انھوں نے عاف طور پر امت راہ و سلم میں کیا چٹکے کو دفاعی پہلے بیان ہو چکے ہیں، اسی مسئلہ کا ایک واقعہ یہ کہ عرب کے سربراہ سعد بن زہراء نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ کے سامنے اعتراض کیا کہ

تم نے جو دعویٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کائنات کر کے اپنے لئے دیکھ کر دیکھا اور تمہارے خواب کے میں میں نے اس کا ساتھ کیا، جو کہ وہاں سب سے رسول ہیں، چاہے کچھ نہ ہو، یہی حد کلام وہاں ہے، یہاں تک کلام نہیں ہو سکتا۔

(خاص میں ۱۱۰ ج ۱۱۱)

نبیل علیہ وسلم کا ایک شخص سنی میں بن شیبہ رسولی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ قرآن سننا، اور چند سوالات کئے، میں نے اس کا جواب دیا، حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مخاطب فرمایا تو یہ کسی وقت مسلمان ہو گئے، اور ہماری قوم میں دامن گیسے، تو لوگوں نے کہا،

میں نے تو تم وہاں کے قصداً اور اہل علم کے کلام میں نے، یہاں کے کلمات تھے، کلام ہوا، یہ چیز کے مقالات سننا، اور وہی علیہ وسلم کے کلام کی مثل میں نے

آج تک کہیں نہیں سنا، جب میری بات اور وہاں کا تعلق کرے، انھیں کی طرح، کہتے ہیں کہ ان کو تم کے ایک ہزاروں نے کلمہ کے لئے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف حاصل کیا، مگر تم نے

(خاص میں ۱۱۰ ج ۱۱۱)

یہاں فراموشی صرف ایسے ہی لوگوں سے متعلق نہیں جو آپ کے معاملات سے بے خبر ہیں، بلکہ وہ لوگ جو ہر وقت ہرگز رسولی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں تھے، جو ہر وقت قرآن کے متعلق ان کا بھی حال تھا، مگر اپنی ضد اور حسد کی وجہ سے اس کا اہل و گھر

پر نہ کرتے تھے۔

مگر یہ سب نے قصداً نہیں کر دی، یہی ہوا، اور یہی نقل کیا ہے کہ ایک عربی ابو جہل اور ابو سنان اور اُن کے دشمنین راست کو اپنے اپنے گھروں سے اس لئے نکلے کہ جبکہ رسولی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنیں، ان میں ہر ایک صحابہ، حضور، مگر ایک ایک کی دوسرے کو خبر نہ تھی، اور انھوں نے عذر و عذر

میں چھپ کر قرآن سننے لگے، تو اس میں ایسا کہ جو ہر گز کو ساری راست گذر گئی، جب تک جو گئی تو سب

وہاں ہوتے، اتفاقاً غارت میں مل گئے، اور ہر ایک نے دوسرے کا تعجب نشانہ قوسب آہیں میں ایک دوسرے کو ملاطمت کرنے کے لئے دیکھ کر لے کر تڑپ کرکے، اور کسی نے یہ بھی کہا کہ اسے کوئی ایسا ذکر ہے کیونکہ اگر قوسب کے حامی کو اس کی خبر ہو گئی تو وہ سب ملتان ہو جائیں گے۔

یہ کہہ کر قوسب اپنے اپنے گھر چلے گئے، اگلی رات آنی تو چہرائی میں سے ہر ایک کے دل میں یہ خیال آیا کہ قوسب آئیں، اور چہرائی میں چھپ چھپ کر ہر ایک نے قرآن مستحکم کیا، تاکہ کلمات گزرنے کی اور سچ ہوئے ہی یہ وقت آجی ہوئے، تو پھر کہیں میں ایک دوسرے کو ملاطمت کرنے لگے، اور اس کے قریب پہنچنے اتفاق کیا، مگر تیسری رات آنی تو پھر قرآن کی لذت و ملاطمت نے انہیں چلنے اور سنے پر مجبور کر دیا، پھر پورے اور رات میرزا قاسم شکر کوٹنے لگے، تو پھر راستہ میں اجتماع ہو گیا، قوسب مسکینے کہا کہ آؤ ہمیں میں حادہ کر لیں کہ اتنا ہم ہرگز ایسا ذکر کریں گے جتنا پھر اس حادہ کی پھیل کر گئی، اور سب اپنے اپنے گھروں پہنچ گئے، اس کا غرض یہی تھی کہ قرآن کی تلاوت و مطالعہ، اور چلنے اور سنے کے اس پیچھے چھپ چھپ کر قوسب اس کام کے بارے میں حصار کیا کرتا ہے۔ اُس نے دیکھ کر غفلت میں قوسب کی حفاظت کا اعتراف کیا، تو غافل سے کہہ کر ہذا میری ہی سی دانے سے اس کے بعد وہ ایچ جی کے پاس پہنچا، اور اُس سے بھی یہی سوال کیا کہ تم نے قوسب کے کلام کو کیا پایا!

ایچ جی نے کہا کہ صاف بات یہ ہے کہ ہمارے خاندان اور جوہدہ ملاطمت کے خاندان میں ہمیشہ سے جنگ چلی آئی ہے، قوم کی سیاست و سیاست میں وہ ہمیں ہارنے کے پڑ جاتا ہے، نیز ہمیں ہارنے کے بعد ہمارے ہاں اس وقت کے وزیر پیش کے وزیر قوم پانچا پانچا جاتا ہے تو ہم نے اُس سے جڑ کر کام کر دیا، انہوں نے لوگوں کی ذمہ داریاں اپنے سر لیں تو ہم اس میدان میں بھی ان سے بھی نہیں ہارے، یہاں تک کہ پورا قوسب جاتا ہے کہ ہم، توں خاندان براہر حیثیت کے مالک ہیں۔

ان حالات میں ان کے خاندان سے یہ آواز اٹھی کہ ہمارے میں ایک نئی پیدا ہوا ہے جس پر آسمان سے وحی آتی ہے، اب ظاہر ہے کہ اس کا مقابلہ ہم کیسے کریں، اس نے تو یہ طے کر لیا کہ ہر ہم نہ اور اور طاقت سے ان کا مقابلہ کریں، اور ہرگز ان پر ایمان نہ لائیں گے (خاصاً ص ۹۶ ج ۱) یہ پورے قرآن کا وہ کھلا ہوا پہلو جس کا دشمنوں کو بھی اعتراف کرنا پڑا ہے، یہ تمام واقعات خلاہ جیل مال بن سیدنی نے مختصراً نہیں کہیں میں نقل کئے ہیں۔

تیسری وجہ: ایچ جی نے قوسب کی کہ یہ ہے کہ اس میں قوسب کی اور آئیں، چہرائی کے دانے والے واقعات کی بہت سی خبریں ہیں جو قوسب نے دیکھی، اور یہ کہ اس کے واقعے

چلی آئے جس طرح قرآن نے خبر دی تھی، مثلاً قرآن نے خبر دی کہ قوسب کے غلام میں ایک نیا ملا قوسب آہیں گے، اور دوسری غلوب ہوں گے، لیکن ساتھ ہی یہ خبر دی کہ قوسب کے دانے میں گے کہ پھر وہی ایسی قاسم یہ غلوب آجی گے، کہ اسے سنہ رادوں نے قرآن کی اس طرح حضرت صدیق اکبر سے ایسی کثرت کے مشورہ کی اور پھر شیک قرآن کی خبر کے مطابق، وہی غلوب آئے، قوسب کا پانی بار مانتا پڑی اور دانے والے پورے مال کو اپنے کھیر کے مشورہ کی، اور مال ان کو دیا چلا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب مال کو قبول نہیں منسرا کیا، کیونکہ وہ ایک قسم کا بھڑا تھا، اس طرح اور بہت سے واقعات اور خبریں ہیں جو قوسب کے متعلق قوسب میں دیکھیں اور ان کی سچائی بالکل روز روشن کی طرح واضح ہو سکتی۔

چوتھی وجہ: ایچ جی و ہماز قوسب کی کہ یہ ہے کہ اس میں پہلی آیتوں اور ان کی شرائط اور تاریخی حالات کا ایسا احاطہ نہ کر سکتے کہ آئیں ان کے بڑے بڑے علماء، یہ وہ قوسب ہیں جو پہلی کتابوں کے ماہر ہیں جانتے ہیں ان کو بھی ان شرائط و احوال اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب دیکھی کتاب میں قوسب کا دیکھا دیکھا عالم کی بہت اطمینان، دیکھی کتاب کو نہ لگتا، پھر ہر جہدہ دیکھا ہے آپ کے زمانہ تک تمام اقوام عالم کے تاریخی حالات اور بہت سچ اور بے سواغ اور ان کی مشہور ترین کتب میں کتب کا بیان تمام جہدہ کہ ہر اس کے جس پر سنہ کا یہ کلام اللہ تعالیٰ ہی کا ہو، اور اللہ تعالیٰ نے یہی آپ کو خبر دی ہوئی۔

پانچویں وجہ: پھر ان کے اقرا سے ثابت ہو گیا کہ وہ بات صحیح اور یہی ہے، یہ کام بھی عالم الغیب والا نشانہ ہی کہ سنہ کے کسی ایسے وقت میں نہیں، مثلاً اور اشار قوسب ہے۔

اور اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو خبر دی ہوئی۔
اور اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو خبر دی ہوئی۔
اور اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو خبر دی ہوئی۔

یہ سب باتیں ہیں جو انہوں نے کس سے لکھ نہیں کیا، قرآن کریم نے ہی ان کا انکشاف کیا۔
چھٹی وجہ: پہلی وجہ ایچ جی نے قوسب کی کہ یہ ہے کہ اس میں قوسب کی اور آئیں، چہرائی کے دانے والے واقعات کی بہت سی خبریں ہیں جو قوسب نے دیکھی، اور یہ کہ اس کے واقعے

چند شہادت اور جوابات

بعض لوگوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ بہت کم لوگوں نے قرآن کے مقابلے میں اس میں اور معادلات لکھے تھے مگر وہ غلط طور پر ہیں۔

بہنیں اگر ذرا دیکھیں انصاف سے کام لیا جائے تو اس امکان کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کیونکہ دنیا جتنی ہے کہ جب سے قرآن نازل ہوا، پوری دنیا میں قرآن کے سامنے والے کو اور دیگرین کو فائدہ دیا ہے اور یہ بھی معلوم ہو کر ذرا غلط فہم شاعت جتنے مشرکین قرآن کو حاصل رہے ہیں قرآن کے سامنے دایوں کو کھڑے کر دیں یہ اس کا کوئی ٹکائی نہ کر سکتے ہیں بلکہ قرآن ان کے سامنے ہونے والے اپنے مخالفین کے سامنے کرتا ہے، ان کو جیتلے دیتے ہے، پھر یہی وہاں ہے، اور مخالفین اسلام اس کے مقابلے میں جانا مال اور دوسرے کچھ مشرکین کے سامنے لائے گا وہ ہوں گے، اگر انہوں نے مشرکوں کا پہلے قبول کر کے کوئی چیز مقابلہ کرنے کی ہوتی تو کیسے ممکن تھا کہ وہ ساری دنیا میں شائع ہوئی، اور ہر زمانہ میں مشرکین قرآن مسلمانوں کے مقابلے میں کو جیتلے دیتے ہوئے مسلمانوں کی طرف سے اس پر جرح و دفع میں جیتلے دیتے ہوئے رہیں گے یہ بھی ہو گا۔

اسلام کے قرآن اول میں صرف ایک واقعہ مبارک کتاب علی کا پیش آیا کہ اس نے کچھ پسند ہے حیاتی کے لئے سید سے کلمات کہہ کر یہ کہا تھا کہ وہی آسانی قرآن کی مثل ہے، مگر دنیا جتنی ہو کر ان کلمات کا کیا اثر ہوا، خود اس کی قوم نے اس کے منہ پر مار دیئے، وہ کلمات ایسے شریفانہ غیر مذہب تھے کہ کسی مذہب سوسائٹی میں ان کو بیان نہیں کیا جاسکتا، اور میرا دل چاہیے ہی ہو کہ وہ آج تک کتابوں میں نقل ہونے چلے آئے ہیں، اگر کسی کو لوشنس نہ کوئی اچھا کام مشرکوں کے مقابلے میں پیش کیا جوتا، تو کوئی بد قسمتی کو دنیا کی آج کا جس کو میرا جملہ ادبی اور دینی مشرکوں قرآن اس کو ہرگز پرانی دیکھنے کی کوشش نہ کرے۔

وہ لوگ جو قرآن کے مقابلے پر ہر وقت مینہ بہہ رہتے قرآن کے سامنے کچھ جواب دینا ضروری طرح علی کی باتیں کہیں جن کو مشرکوں میں نقل کر کے جواب دیا گیا، مگر اس کا ایک واقعہ نہیں کر کوئی کام مقابلہ پیش کر کے اس کے قرآنی کلمات پر نہ کادوئی کیا گیا، ایک دوسری نظم بودہ میں وہ ایک کام کیا کرتا تھا اور کہہ کر دانت دافیل پڑھا ہوا تھا، کبھی کسی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا تھا صاحب کے کچھ جاہلوں نے نصیب و عداوت سے یہ شعر کہہ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ قرآنی مخالفین اس نے عطا ہے اس مشرکوں نے ان کا یہ اعتراض نقل کر کے خود جواب دیا کہ جس شخص کی طرف سے کہنے کے نسبت کرتے ہیں وہ خود کو دیتی ہے، اور ان کی بلاغت کو کیا جانے، اور یہ مشرکوں کی کوئی انتہائی خلیفہ کتاب کی سورت خلیل کی آیت غیر ادا دیکھئے،

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا اَمْرَ الْاَشْوَٰقِ (تم نہ ہاتھ نہ کر کے مخالفین اسلام سے نہ چلیے)

آنحضرت ﷺ نے قرآن کی تحقیر کے جواب میں یہ کہا کہ:

قُلْ لِّمَنۡ شَاءَ اَعۡزٰیۡزٌ ۝۱۶۵ (۱۶۵)

کہہ لو کہ میں نے قرآن کی تحقیر کے جواب میں یہ کہا کہ:

قُلْ لِّمَنۡ شَاءَ اَعۡزٰیۡزٌ ۝۱۶۵ (۱۶۵)

لیکن کوئی اس سے بچے کہ میرا کہا نہیں قرآن کے مقابلہ کے لئے سارا ایشیائی چوں کہ اوزار خرچ کیا، جان و مال کی مشرکوں کی دسی داری میں اس کا استعمال کام لھنے پکھنے کی قدرت علی قرآن کی اس تحقیر کے بعد ہم نے اس کی مثل کام بلکہ شرف کا پہلو اس پر سرکریں نہ لیا!

خلاصہ یہ کہ مشرکوں کے اس دعوے کے بعد مخالفین نے کچھ شعر و نثر دسکرت نہیں کیا بلکہ جو کہ ان کے مشرکوں کے مقابلے میں لکھے گئے، انہیں یہ بھی کسی نے دیکھا کہ ہم میں سے لکھا آئے مشرکوں جیسا ظان کام لکھا ہے اس نے قرآن کا یہ دعویٰ بیکار و ماضی اللہ عطا ہے،

بعض صحابہ میں کہ یہ بھی کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبل از نبوت چند روز کے لئے حکاشم شریف نے مجھے، اور اوستہ میں نیزہ، ایک ملاقات کو انی وہ فرات کا کام تھا اس سے آگے چلے حکم کیجئے مگر کوئی ان سے بچے کہ ایک دن کی ایک ملاقات میں اس سے سامنے علم و معارف فصاحت و بلاغت کا اعجاز اخلاقی تربیت، نظام فہمی، نظام حکمت کیسے بکھلے۔

آجکل کے بعض مترجمین نے کہا کہ قرآن کا کلام کی مثل نہ پایا جاساں کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ خدا کا کلام یا سمجھ نہ ہو، جو کہ ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کا بار یافتہ قرآنی نثر ایسی لکھی گئی کہ دوسرے آدمی اس کی نظیر نہ لکھا سکیں۔

مندی شریف کی کتابستان افغانی کی تفسیر کے لفظ کو عام طور پر بے مثل دینے نظیر کتابیں کہا جاتا ہے تو کیا وہ بھی مجوز ہیں!

لیکن اگر ذرا غور کریں تو انہیں معلوم ہوگا کہ مندی افغانی کے پاس سامانی تعلیم تالیف کے متذہبوں کو دھماکتے وقت کہ انہوں نے تعلیم حاصل کی، رسول و رسول ہیں پڑے ہوئے، راقوں جاگے، خود مخالفین کہیں، بڑے بڑے علماء کے سامنے زانوئے ارپ لگائے، سادہ سادگی عقول اور داغ صوفیوں کے جہد میں اگر انہوں نے افغانی یا تریزی یا شبلی کی کوئی اور کوئی زبان میں اور مندی غازی میں اور ملتان انگریزی میں یا تبریزی میں یا کاشانی میں مسکرت میں یا ہر کوئی میں کہ ان کا کلام دوسروں کے کلام سے ناقص ہو گیا تو کوئی تنبیہ کی بات نہیں۔

معموم کی لغویت تو یہ کہ وہ اس سبب متاثر نہ کہے تو شل کے بغیر وجود میں آئے کیا ان

آپ کو ذرا دیکھیں انصاف سے کام لیا جائے تو اس امکان کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کیونکہ دنیا جتنی ہے کہ جب سے قرآن نازل ہوا، پوری دنیا میں قرآن کے سامنے والے کو اور دیگرین کو فائدہ دیا ہے اور یہ بھی معلوم ہو کر ذرا غلط فہم شاعت جتنے مشرکین قرآن کو حاصل رہے ہیں قرآن کے سامنے دایوں کو کھڑے کر دیں یہ اس کا کوئی ٹکائی نہ کر سکتے ہیں بلکہ قرآن ان کے سامنے ہونے والے اپنے مخالفین کے سامنے کرتا ہے، ان کو جیتلے دیتے ہے، پھر یہی وہاں ہے، اور مخالفین اسلام اس کے مقابلے میں جانا مال اور دوسرے کچھ مشرکین کے سامنے لائے گا وہ ہوں گے، اگر انہوں نے مشرکوں کا پہلے قبول کر کے کوئی چیز مقابلہ کرنے کی ہوتی تو کیسے ممکن تھا کہ وہ ساری دنیا میں شائع ہوئی، اور ہر زمانہ میں مشرکین قرآن مسلمانوں کے مقابلے میں کو جیتلے دیتے ہوئے مسلمانوں کی طرف سے اس پر جرح و دفع میں جیتلے دیتے ہوئے رہیں گے یہ بھی ہو گا۔

اسلام کے قرآن اول میں صرف ایک واقعہ مبارک کتاب علی کا پیش آیا کہ اس نے کچھ پسند ہے حیاتی کے لئے سید سے کلمات کہہ کر یہ کہا تھا کہ وہی آسانی قرآن کی مثل ہے، مگر دنیا جتنی ہو کر ان کلمات کا کیا اثر ہوا، خود اس کی قوم نے اس کے منہ پر مار دیئے، وہ کلمات ایسے شریفانہ غیر مذہب تھے کہ کسی مذہب سوسائٹی میں ان کو بیان نہیں کیا جاسکتا، اور میرا دل چاہیے ہی ہو کہ وہ آج تک کتابوں میں نقل ہونے چلے آئے ہیں، اگر کسی کو لوشنس نہ کوئی اچھا کام مشرکوں کے مقابلے میں پیش کیا جوتا، تو کوئی بد قسمتی کو دنیا کی آج کا جس کو میرا جملہ ادبی اور دینی مشرکوں قرآن اس کو ہرگز پرانی دیکھنے کی کوشش نہ کرے۔

وہ لوگ جو قرآن کے مقابلے پر ہر وقت مینہ بہہ رہتے قرآن کے سامنے کچھ جواب دینا ضروری طرح علی کی باتیں کہیں جن کو مشرکوں میں نقل کر کے جواب دیا گیا، مگر اس کا ایک واقعہ نہیں کر کوئی کام مقابلہ پیش کر کے اس کے قرآنی کلمات پر نہ کادوئی کیا گیا، ایک دوسری نظم بودہ میں وہ ایک کام کیا کرتا تھا اور کہہ کر دانت دافیل پڑھا ہوا تھا، کبھی کسی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا تھا صاحب کے کچھ جاہلوں نے نصیب و عداوت سے یہ شعر کہہ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ قرآنی مخالفین اس نے عطا ہے اس مشرکوں نے ان کا یہ اعتراض نقل کر کے خود جواب دیا کہ جس شخص کی طرف سے کہنے کے نسبت کرتے ہیں وہ خود کو دیتی ہے، اور ان کی بلاغت کو کیا جانے، اور یہ مشرکوں کی کوئی انتہائی خلیفہ کتاب کی سورت خلیل کی آیت غیر ادا دیکھئے،

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا اَمْرَ الْاَشْوَٰقِ (تم نہ ہاتھ نہ کر کے مخالفین اسلام سے نہ چلیے)

لیکن اگر ذرا غور کریں تو انہیں معلوم ہوگا کہ مندی افغانی کے پاس سامانی تعلیم تالیف کے متذہبوں کو دھماکتے وقت کہ انہوں نے تعلیم حاصل کی، رسول و رسول ہیں پڑے ہوئے، راقوں جاگے، خود مخالفین کہیں، بڑے بڑے علماء کے سامنے زانوئے ارپ لگائے، سادہ سادگی عقول اور داغ صوفیوں کے جہد میں اگر انہوں نے افغانی یا تریزی یا شبلی کی کوئی اور کوئی زبان میں اور مندی غازی میں اور ملتان انگریزی میں یا تبریزی میں یا کاشانی میں مسکرت میں یا ہر کوئی میں کہ ان کا کلام دوسروں کے کلام سے ناقص ہو گیا تو کوئی تنبیہ کی بات نہیں۔

معموم کی لغویت تو یہ کہ وہ اس سبب متاثر نہ کہے تو شل کے بغیر وجود میں آئے کیا ان

مندی شریف کی کتابستان افغانی کی تفسیر کے لفظ کو عام طور پر بے مثل دینے نظیر کتابیں کہا جاتا ہے تو کیا وہ بھی مجوز ہیں!

لیکن اگر ذرا غور کریں تو انہیں معلوم ہوگا کہ مندی افغانی کے پاس سامانی تعلیم تالیف کے متذہبوں کو دھماکتے وقت کہ انہوں نے تعلیم حاصل کی، رسول و رسول ہیں پڑے ہوئے، راقوں جاگے، خود مخالفین کہیں، بڑے بڑے علماء کے سامنے زانوئے ارپ لگائے، سادہ سادگی عقول اور داغ صوفیوں کے جہد میں اگر انہوں نے افغانی یا تریزی یا شبلی کی کوئی اور کوئی زبان میں اور مندی غازی میں اور ملتان انگریزی میں یا تبریزی میں یا کاشانی میں مسکرت میں یا ہر کوئی میں کہ ان کا کلام دوسروں کے کلام سے ناقص ہو گیا تو کوئی تنبیہ کی بات نہیں۔

معموم کی لغویت تو یہ کہ وہ اس سبب متاثر نہ کہے تو شل کے بغیر وجود میں آئے کیا ان

لوگوں کی باقاعدہ تحصیل علوم، استادوں کے ساتھ طویل ملازمت و محنت، وسیع مطالعہ، مدقوں کی مشاقی ان کی علمی مہارت کے کھلے ہوئے اسباب نہیں ہیں؟ اگر ان کے کلام دوسروں سے مستاز ہوں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہو؟ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ جس نے کبھی کتاب قلم کو ہاتھ نہ لگایا ہو کسی مدرسہ و مکتب میں قدم نہ رکھا ہو، وہ ایسی کتاب دنیا کے سامنے پیش کرے کہ ہزاروں صدی اور لاکھوں فیضی اس پر مشربان ہو جائے کو اپنا سرمایہ فخر سمجھیں، اور ان کو جو کچھ علم و حکمت حاصل ہو کر اس کو بھی آپ ہی کے فیض تعلیم کا اثر مستراریں، اس کے علاوہ سحدی اور فیضی کے کلام کا مثل پیش کرنے کی کسی کو ضرورت بھی کیا تھی؟ کیا انھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا، اور اپنے کلام کے بمثل دے کر نظیر ہونے کو اپنا معجزہ کہا تھا، اور دنیا کو اس کا چیلنج دیا تھا کہ ہمارے کلام کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی جس کے نتیجہ میں لوگ اس کا مقابلہ کرنے اور مثال پیش کرنے کے لئے مجبور ہوتے۔

پھر مشرآن کی صرف نصاحت و بلاغت اور نظم و ترتیب ہی بے مثال نہیں لوگوں کے دل و دماغ پر اس کی تاثیرات عجیبہ اس سے زیادہ بے مثال اور حیرت انگیز ہیں جن کی وجہ سے قوموں کے مزاج بدل گئے، انسانی اخلاق میں ایک کایا پلٹ ہو گئی، عرب کے تند خو، گنوار، حلم و احتیاط اور علم و حکمت کے استاد مانے گئے، ان حیرت انگیز انعتلابی تاثیرات کا اقرار صرف مسلمان نہیں موجودہ زمانے کے سینکڑوں غیر مسلموں نے بھی کیا ہے، یورپ کے مستشرقین کے مقالات اس بارے میں جمع کئے جائیں تو ایک مستقبل کتاب ہو جائے، اور حکیم الامتہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بنام شہادۃ الاقوام علی صدق الاسلام تحریر فرمائی ہے اس جگہ چند حوالے نقل کئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مستاد علی بان نے اپنی کتاب تذکرہ عرب میں صوفیائی سے اس حیرت انگیزی کا اعتراف کیا، ان کے الفاظ کا ترجمہ اردو میں یہ ہے:

”اس پیغمبر اسلام اس نبی انہی کی بھی ایک حیرت انگیز سرگزشت ہے، جس کی آواز نے ایک قوم کو اپنا راجہ جو اس وقت تک کسی ملک گیر کے زیر حکومت نہ آئی تھی رام کیا، اور اس درجہ پر پہنچا دیا کہ اس نے عالم کی بڑی بڑی سلطنتوں کو زیر و زبر کر ڈالا، اور اس وقت بھی وہی نبی انہی کی تہنیک اندر سے لاکھوں ہندوؤں خدا کو کلمہ اسلام پر قائم رکھے ہوئے ہے۔“

مشرودہ دل جس نے قرآن مجید کا ترجمہ اپنی زبان میں کیا ہے لکھتا ہے کہ:

”جتنا بھی ہم اس کتاب (یعنی قرآن) کو الٹ پلٹ کر دیکھیں اسی قدر پہلے مطالعہ میں اس کی نامرغوبی نئے نئے پہلوؤں سے اپنا رنگ جماتی ہے، لیکن فوراً ہمیں محض کریمتی ہے، متحیر و متادبی ہو اور آخر میں ہمہ سے تعلیم کر کر چھوڑتی ہے، اس کا طرز بیان اعتبار اس کے مضامین و اغراض کے،

عقیدت مالی شان اور تہذیب و تمدن اور جہاں اس کے مضامین سخن کی غایت رسالت تک پہنچ جاتے ہیں۔

غرض یہ کتاب ہر زمانہ میں اپنا زور اثر دکھاتی رہے گی، (شہادۃ الاقوام، ص ۱۳)

مصر کے مشہور مصنف احمد فتحی بک زاغلولی نے ۱۹۰۵ء میں مسٹر کونٹ ہنری کی کتاب الاسلام کا ترجمہ عربی میں شائع کیا تھا، اصل کتاب فریچ زبان میں تھی، اس میں مسٹر کونٹ نے قرآن کے متعلق اپنے تاثرات ان الفاظ میں ظاہر کئے ہیں:

”عقل حیران ہے کہ اس قسم کا کلام ایسے شخص کی زبان سے کیونکر نکلے جو بالکل احمق تھا، تمام مشرق نے استرا کر لیا ہے کہ نورانی انسانی لفظ و معنی ہر لحاظ سے اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، یہ وہی کلام ہے جس کی بلند انشاء پر رازسی نے عربی خطاب کو مطمئن کر دیا، ان کو خدا کا معترف بنا پڑا، یہ وہی کلام ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے متعلق اس کے چلے جعفر بن ابی طالب نے جبرائیل کے بادشاہ کے دربار میں پیش تو اس کی آنکھوں سے میاخذہ آنسو جاری ہو گئے، اور ہشت چلا اٹھا کہ یہ کلام اسی سرچشمہ سے نکلا ہے جس سے عیسیٰ علیہ السلام کا کلام نکلا تھا“ (شہادۃ الاقوام، ص ۱۳)

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، جلد ۱۶، ص ۵۹۹ میں ہے:

”قرآن کے مختلف حصوں کے مطالب ایک دوسرے سے بالکل متفاوت ہیں، بہت سی آیات دینی و اخلاقی خیالات پر مشتمل ہیں، مظاہر قدرت، تاریخ، الہامات انبیاء کے ذریعہ اس میں خدا کی عظمت، ہدایتی اور صداقت کی یاد دلاتی گئی ہے، بالخصوص حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے واسطے سے خدا کو واحد اور قادر مطلق ظاہر کیا گیا ہے، رست پرستی اور مخلوق پرستی کو بلا لحاظ ناجائز و مشرور دیا گیا ہے، قرآن کی نسبت یہ بالکل بجا کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا بھر کی موجودہ کتابوں میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔“

انگلستان کے نامور مورخ ڈاکٹر گین اپنی مشہور تصنیف رسلطنت روما کا اخطاطہ و زوال، کی جلد ۱ باب میں لکھتے ہیں:

”قرآن کی نسبت ہر ممالک تک سے لے کر دور یاے گنگا تک نے ان دیکھے کہ یہ پارہائے روم ہے، قانون اساسی ہے، اور صرف اصول مذہب ہی کے لئے نہیں، بلکہ احکام تعزیری کے لئے اور قوانین کے لئے بھی ہے جن پر نظام کا مدار ہے جن سے نوع انسان کی زندگی وابستہ ہو، جن کو حیات انسانی کی ترقی و تہذیب تسمیق سے گہرا تعلق ہو، حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شریعت سب پر مادی ہے، یہ شریعت ایسے دانشمندانہ اصول اور اس قسم کے قانونی انداز پر مرتب ہوئی ہے کہ سامعے جہان میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی“

کہ ایمان بظہر صلیح کے ادا کیا کو اس اشارت کا مستحق نہیں بناتا، اگر صرف ایمان ہی جو شرفِ غلام اور دامن سے پہانے کا سبب ہو، اور مومن کشتی میں بھی بٹکا ہو کسی دیکھی وقت میں وہ جہنم سے نکالا جائے گا، اور جنت میں پہنچے گا، مگر اہل بیت باطل غمات کا بظہر صلیح کے کوئی نسخہ نہیں ہوتا اور دامنِ اہل بیت، قرآن

لَئِنْ اَنْتُمْ لَا تَسْتَجِیْ اَنْ یُعِیْرَ بَمَثَلًا مَا بَعُوْهُ فَمَا فَوْقَ هٰذَا
یہ کلمہ انظر قرآن میں اس بات سے کہ میان کرے کوئی مثال ہماری یا سرچ کرے یا نہ سرچ کرے
فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَعَلِمُوْۤا اَنَّهٗ السَّعۡیُ مِنْ تَحْتِیْہِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِیْنَ
سوء لوگ مومن ہیں وہ جانتے ہیں کہ کوئی مثال نہ ہو ان کے وہ کی طرف اور کوئی
گفہ واقیعہ کون مآذ اَرَادَ اللّٰهُ بِہِذَا مَثَلًا ۚ یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا ۙ
ہیں سو کہتے ہیں کیا مطلب تھا اللہ کا اس مثال سے گوارہ کرنا جو مثال سے ان کے ہرگز نہ ہو
وَالَّذِیْنَ یُہٰدِیْہِمْ بِہٖ کَثِیْرًا ۙ وَمَا یُضِلُّ بِہٖ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ۚ وَالَّذِیْنَ یُفَضِّلُوْنَ
اور ہدایت کرنا ہی اس سے بہتر ہو کر اور گمراہ نہیں کرنا ان کے ہرگز نہ ہو جو قوت ہے خدا
عَمَدَ اللّٰہِ مِنْ بَعْلِیٰ مِثَاقِہِمْ ۚ وَیُطٰعُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖ اَنْ
کے معاہدہ کو معہدہ کرنے کے بعد اور طاع کرنے میں اس چیز کو کہ اللہ نے فرمایا طاعنے
یُوْصَلْ وَیُفِیْضَ ذٰلِکَ فِی الْاَرْضِ ۚ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵﴾
کو اور خدا کرنے میں کلمہ ہیں وہی ہیں قوتے والے۔

خلاصہ تفسیر

دعوتِ مخالفین نے قرآن کے کلام آئی ہوئے پر اعتراض کیا تھا کہ اس میں بہت ہی خیر و ذلیل چیزوں کا ذکر غفلت میں کیا گیا ہے جیسے چھرم، عسکری و غیرہ، اگر خدا کا کلام ہوتا تو ایسی خیر چیزیں کا ذکر اس میں ضرور ہوتا کہ اس کا جواب دیا گیا کہ ان واقعہ اللہ تعالیٰ تو ہمیں شرعاً نے کہ ایمان کر دین کوئی مثال ہمیں خواہ چھرم خواہ اس سے بھی بڑی چیز ہو جو ہم نے نہیں دیکھی ہے لیکن ان سرورِ جگہ ایمان لائے جو ہمیں دیں خواہ کچھ ہی ہو، وہ تو ہی یقین کرے کہ بے شک یہ مثال بہت

ہی ہو سکتی ہے ان کے وہ کی جانب سے اور وہ کلمے وہ لوگ جو کلمہ پہنچے ہیں سو جاسے کہ یہی جو کلمہ وہ لوگ ہی کہتے ہیں کہ کوہ کفسا مطلب ہر کچھ جس کا قصد کیا ہوگا اللہ تعالیٰ نے اس خیر مثال سے گوارہ کرتے ہیں انظر تعالیٰ اس مثال کی وجہ سے بہتر کرنا اور ثابت کرتے ہیں اس کی وجہ سے بہتر کرنا اور گوارہ نہیں کرتے انظر تعالیٰ اس مثال سے کسی کو مگر صرف تا فراموشی کرنے والوں کو جو کہ کوئی نہ ہو کہ اس میں معاہدہ کو اللہ سے کہتے تھے اس کے استحکام کے بعد دینی عمل ازل میں میں سب کی اور اس نے انظر تعالیٰ کے رب ہونے کا اقرار کیا تھا، اور قلعہ کرنے رہتے ہیں ان تعلقات کو کہ حکم دے اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑے کرنا اس میں تمام تعلقات مضر و داخل ہیں خواہ وہ تعلقات ہوں جو زندہ اور زندہ کے درمیان ہیں، جو اس کے او اور خیرا اور بیشتر دلوں کے دویان ہیں، یا دینی اسلام کے دویان ہیں اور جو کلمہ اللہ تعالیٰ کے دویان ہیں، اور خدا کر کے دیتے ہیں دینی ہیں کو مگر وہ شرک و کفر اور دوسروں پر ظلم اور فساد میں جس کو کلمہ کے لازم میں ہے، وہ بھی اس فساد میں شامل ہے، جس میں وہ کلمہ ہیں اپنے خیرا میں پڑنے والے کو دنیا کی راحت اور آخرت کی نعمت سب ہاتھ سے دے دیتے، کیونکہ حاکم کی دینی زندگی میں ہمیشہ تلخ ہی رہتی ہے۔

معارف و مسائل

معارف آیات پہلے فقرات کریم کا یہ دعویٰ مذکور ہے کہ فقرات کریم زبانی آیات میں کسی شک و شبہ کی حقیقت نہیں، اور اگر کسی کو کوئی شک اس کے کلام آتی ہو جسے وہ اس کی جہت سے سورت کی مثل جانکر دکھلانے والا ہے میں ممکن قرآن کا ایک شبہ ذکر کرے اس کا جواب دیا گیا ہے شبہ یہ تھا کہ قرآن کریم میں عسکری اور چھرم خیرا و قور کا ذکر آیا ہے، واللہ تعالیٰ کی اور اس کے کلام کی حکمت کے خلاف ہو اگر یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہو تو اس میں ایسی خیر و کلمہ ہوں گا کہ نہ ہو نا، کیونکہ بڑی لوگ ایسی چیزوں کے ذکر شرع و حیا میں کرتے ہیں۔

جواب یہ دیا گیا کہ جب کسی عقیدہ ذلیل چیز کی مثال دی ہو تو کسی ایسی ہی خیر چیز سے مثال دینا عقیدہ عقل و طاقت ہے، اس ضمن کے لئے کسی خیر مثال دینا چاہیے کہ اگر تا شرع و حیا کے کلمہ مثالی نہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ ایسی چیزوں کے ذکر سے نہیں شرعاً، اللہ ہی بتلویا کہ ایسے اعتدال و شبہات صرف ان لوگوں کو پیدا ہو کر گئے ہیں جن کے غلبہ اور مافوق سے ان کے کلمہ کی وجہ سے کلمہ ہو چکے کہ ملاحضت معقول و محسوس ہوا ایمان والوں کو بھی ایسے شبہات دانستے نہیں ہوتے۔

اس کے بعد اس کی ایک اور حکمت بھی بتلا دی کہ ایسی مثالوں سے لوگوں کا ایک امتحان بھی ہوتا ہے، نظر دنگر کرنے والوں کے لئے یہ مثالیں ہدایت کا سامان پیدا کرتی ہیں، اور بے پڑائی برتنے والوں کے لئے اور زیادہ گمراہی کا سبب بنتی ہیں، اس کے بعد یہ بھی بتلا دیا کہ قرآن کریم کی ان مثالوں سے صرف ایسے سرکش لوگ گمراہ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد کو توڑتے ہیں اور جن تعلقات و روابط کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے یہ لوگ اُن کو توڑتے ہیں جس کا نتیجہ زمین میں فساد پھیلانا ہوتا ہے۔

بَعُوضَةً فَمَا كُوْنُهَا اس لفظ کے معنی یہ ہیں کہ ٹھپڑ ہو یا اس سے بھی زیادہ اس جگہ زیادہ سے مراد یہ ہو کہ حقارت میں زیادہ ہو۔ (منظری)

فَيُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا قرآن اور اس کی مثالوں کے ذریعہ بہت سی مخلوق کو ہدایت کرنا تو ظاہر ہے، مگر اس کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو گمراہ کرنے کا مطلب یہ ہو کہ جس طرح یہ قرآن اس کے ماننے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں کے لئے ذریعہ ہدایت ہے اسی طرح اس کا انکار کرنے والوں اور مخالفت کرنے والوں کے لئے ذریعہ گمراہی بھی ہے۔

وَمَا يُضِلُّ بِهٖ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ۔ فاسقین فسق کے لفظی معنی خسران اور باہر نکل جانے کے ہیں، اصطلاح شرع میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل جانے کو فسق کہتے ہیں، اور اطاعت الہیہ سے نکل جانا کفر و انکار کے ذریعہ بھی ہوتا ہے، اور علیٰ ناسرمانی کے ذریعہ بھی، اس لئے لفظ فاسق کا فرق کے لئے بھی بولا جاتا ہے، قرآن کریم میں بیشتر لفظ فاسقین کا مشرور ہی کے لئے استعمال ہوا ہے، اور مومن گناہگار کو بھی فاسق کہا جاتا ہے، فقہاء کی اصطلاح میں عموماً لفظ فاسق اسی معنی میں استعمال ہوا ہے کہ کسی اصطلاح میں فاسق کو کافر کے بالمقابل اس کی تقسیم قرار دیا گیا ہے، جو شخص کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرے اور پھر اس سے توبہ بھی نہ کرے، یا ضعیفہ گناہ پر اصرار کرے، اس کی عادت بنائے وہ فقہاء کی اصطلاح میں فاسق کہلاتا ہے، (منظری) اور جو شخص یہ فسق کے کام اور گناہ علانیہ جرات کے ساتھ کرتا پھرے اس کو ناجر کہا جاتا ہے۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ قرآن کی ان مثالوں سے بہت سے لوگوں کو ہدایت ہوتی ہے، اور بہت سے لوگوں کے حصہ میں گمراہی آتی ہے، مگر ان مثالوں سے گمراہی صرف انہی لوگوں کا حصہ ہوتا ہے جو فاسق یعنی اطاعت خداوندی سے نکل جانے والے ہیں، اور جن میں کچھ بھی خدا تعالیٰ کا خوف ہوتا ہو وہ تو ہدایت ہی حاصل کرتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَنْفَعُ شَرُوْنَ عَهْدِ اللّٰهِ مِنْ بَعْضِ مِيْثَاقِهٖ۔ عہد اس صورت، حاملہ اور معاہدے کو کہا جاتا ہے جو دو شخصوں کے درمیان طے ہو جائے، اور میثاق ایسے معاہدے کو کہتے ہیں

جو قسم کے ساتھ مضبوط و مستحکم کیا جائے۔

اس آیت میں پہلی آیت کے معنوں کی مزید تشریح ہے اور منکرینِ قرآن کے انجام کا ذکر ہے کہ قرآن کی ان مثالوں سے جن پر مشرکین نے اعتراض کیا ہے صرف وہی لوگ گمراہ ہوتے ہیں جو حق تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری سے سرکشی کرتے ہیں، جس کی دوجہ ہیں:

اول یہ کہ ایسا کرنے والے اُس اذلی معاہدے کو توڑ ڈالتے ہیں جو تمام انسانوں نے اپنے رب سے باندھا تھا، جبکہ تمام انسانوں کی اس عالم میں پیدائش سے پہلے حق تعالیٰ نے تمام پیدا ہونے والے انسانوں کی ارواح کو جمع کر کے ایک سوال فرمایا تھا کہ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ یعنی کیا میں تمہارا رب اور پروردگار نہیں ہوں؟ اُس پر سب نے یک زبان ہو کر کہا تھا بلیٰ قیٰن آپ رب کیوں نہ ہوتے؟ جس میں بڑی تاکید کے ساتھ اس کا استہرا ہے کہ اللہ جل شانہ ہمارے رب اور پروردگار ہیں، اور اس کا لازمی تقاضا یہ ہو کہ ہم اس کی اطاعت سے سربموجہ و نڈر نہ کریں، اس لئے یہ عہد اولیٰ انسان اور اللہ جل شانہ کے درمیان ہو چکا، اب دنیا میں پیدا ہونے کے بعد تمام انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں اسی عہد کی تجدید اور یاد دہانی اور اس پر عمل کی تفصیلات بتلانے کے لئے آئے ہیں، جس نے اس معاہدے ہی کو توڑ ڈالا، اس سے کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی سفید پیر یا آسمانی کتاب سے فائدہ اٹھائے؟

دوسری وجہ یہ کہ ان لوگوں نے اُن تمام تعلقات کو قطع کر ڈالا ہے جن کو جوڑے رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا، ان تعلقات میں وہ تعلق بھی داخل ہو جو بندے اور اللہ کے درمیان ہے، اور وہ تعلق بھی جو انسان کا اپنے ماں باپ اور دوسرے عزیزوں سے ہے، اور وہ تعلق بھی جو ایک انسان کا اپنے پڑوسی اور دوسرے شرمکار کار کے ساتھ ہو، اور وہ تعلق بھی جو عام مسلمانوں یا عام انسانوں کے ساتھ ہے، ان تمام تعلقات کے پورے حقوق ادا کرنے ہی کا نام اسلام، یا شریعت اسلام ہے، اور راہنی میں کوتاہی کرنے سے ساری زمین میں فساد اٹکے، اسی لئے اس چلنے کے بعد فرمایا وَ يُضِلُّوْا فِی الْاَرْضِ، یعنی یہ لوگ زمین میں فساد مچاتے ہیں، آخر آیت میں ان کے انجام بد کا ذکر فرمایا کہ یہ لوگ بڑے خسارے میں ہیں۔

مثال میں کسی خبر و دلیل یا شرمناک | اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْبِبُ مَنْ ثَابِتٌ ہوا کہ کسی مفید معنوں کی توضیح چیز کا ذکر کرنا کوئی عیب نہیں ہے | میں کسی حقیر دلیل یا شرمناک چیز کا ذکر کرنا نہ کوئی عیب گناہ ہو، اور نہ قائل کی عظمت شان کے منافی ہے، قرآن و سنت اور علماء ملت کے اقوال میں بکثرت ایسی مثالیں بھی مذکور ہیں جو عموماً شرمناک سمجھی جاتی ہیں، مگر قرآن و سنت نے اس عربی شرم و حیا کی پردہ کئے بغیر اصل مقصد پر نظر رکھ کر ان مثالوں سے اجتناب گوارا نہیں کیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّكُمْ رُوْتُوْا وَخُذُوْا زِكْرًا مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ ۚ
 جس کا ترجمہ یہ ہے کہ وہ تمام نیکیوں سے محروم ہو جائے۔

تعلقات کے متعلق طریقہ ہدایت کا ذکر ہے کہ اَمْرٌ اَلَدِّیْنِ بِہِ اَنْ یُّقُوْتَ سَلٰمٌ سے معلوم ہوا کہ
 واجب ہو اس کے غلات کر جائیں۔ تعلقات کو قائم رکھنے کا شرط اسلام نے حکم دیا ہے اس کا
 فاعل کما ضروری اور قطع کرنا حرام ہے، خود کیا جائے تو دن و شب تمام ہی ان حدود و تدبیروں کا
 جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی دانتیل کے لئے مقرر کی گئی ہیں، اور اس عالم کا اصلاح و نفاذ انہیں
 تعلقات کو درست رکھنے پر موقوف ہے، اس لئے ان تعلقات سے قطع کرنے کو
 یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّكُمْ رُوْتُوْا وَخُذُوْا زِكْرًا مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ کہہ کر
 احوال کی غفلت دور کر دے، اس میں اشارہ ہے کہ اصل خدا اور نقصان آخرت ہی کا ہے دنیا
 کا شمار کوئی قابلِ فوجہ چیز نہیں۔

اَوَلَمْ یَلْمِزْکُمْ لَمَنۢ یُّبَدِّلُ فِیْ اٰیٰتِہِیْمُ مَوٰجِدَہٗ ۚ سُبُوْحٰنَ سَمِیْعِہٖ ۚ قَرَار دیا ہے جو مذکورہ
 احکام کی غفلت دور کر دے، اس میں اشارہ ہے کہ اصل خدا اور نقصان آخرت ہی کا ہے دنیا
 کا شمار کوئی قابلِ فوجہ چیز نہیں۔

کَیۡفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَکُنْتُمْ اٰمُوۡنًا فَاٰحَیَا کُمْ ثُمَّ تَمُوتُۢمۡ لِمَ تَمُوتُۢمۡ

بہر طبع کا ترجمہ ہے جو جتنے قتال سے غلام کر رہے تھے، پھر چلا تم کو بھرا دیا تم کو

ثُمَّ یُعِیۡدُکُمۡ ثُمَّ اِلَیۡہِ رُوۡحُوۡنَ ۙ ۝۱۰ ہُوَ الَّذِیۡ یُخَلِّیۡ لَکُمۡ مَّآبِیَّ

پھر جلات تم کو کہ پھر اس کی طرف فرماتے جائو گے، وہی جس نے پیدا کیا تم کو رابطہ جو

اَلْاٰرْضِیۡنِ یَّجِیۡعَانِ ثُمَّ اَسْأَلُوۡنِیۡ اِلَیۡ السَّمَآءِ فَوَسُوۡلُہُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ

پھر زمین میں سے سب پھر قسم کیا آسمان کی طرف موصول ہو کر آئی کہ سات آسمان

وہو ۙ یُّخَلِّیۡ شَیۡءًا عَلَیۡہِمْ ۝۱۱

اور خدا افعال پر چڑھے ہو کر رہے۔

خلاصہ تفسیر

ملائیوں کو بتا دیا کہ جو اللہ کے ساتھ ذکر کرے اس کے اسانات کو بھلا دیتے ہیں اور
 خدا کا علم بڑھتا ہے جو اساتذہ کرام پر دلائل واضح قائم ہیں کہ صرف ایک اللہ ہی حق و عبادت پر

مُشٰوَرۃً ۚ کَیۡفَ یَکُنۡ لَّہٗ حَیۡزٌ ۚ ذٰلِکَ الَّذِیۡنَ یُحٰدِثُوْنَ لِقٰدِحِہٖمْ یَوْمَئِذٍ ۚ
 وہیں گے پھر زندہ کریں گے (یعنی قیامت کے دن) ایمان آئے ہیں اس کے جانے ہوا گئے زمین میں
 قیامت میں حساب کتاب کے لئے حاضرین کے ہاؤ گے اور ذات پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تم کو
 فاعل کے لئے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے سب کا حساب وہ فاعل وہ عالم ہے کھالے ہے کا ہوا پہنچے اور
 پہنچے کا باخبات اور روح کو نوا کی پہنچے گا، اس سے معلوم ہوا کہ وہاں کوئی چیز ایسی نہیں جس سے
 انسان کو فائدہ نہ ہو چہ چاہے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر چیز کا ہر قسم سے اس حال میں پہنچے
 فاعل کو فائدہ انسان سے خالی نہیں، مگر ان کا تعلق حقائق کے نزدیک مفروض ہے، پھر فوجہ فرما
 آسمان کی طرف، یعنی اس کی تخلیق و تخیل کی طرف اور درست کر کے بنا دیتے ان کو سات آسمان اور
 وہ تو سب چیزوں کے جاننے والے ہیں ۝

معارف مسائل

ربط آیات | پچھلی آیتوں میں خدا افعال کے وجود و توحید اور رسالت کے
 دلائل و امور و مستقرین و محالین کے خیالات باطلہ کا رد

مذکورہ بالا مذکورہ روایتوں میں اللہ تعالیٰ کے احسانات اور افعال کا ذکر کر کے اس پر اچھا
 خوب کیا گیا ہے کہ اتنے احسانات کے ہوتے ہوئے کیسے یہ ظالم و کفار میں سبوتا ہیں جن میں
 اس پر تفسیر ہو کر اگر فلاں میں خود کرنے کی ذمت گرا جائے کہ تو کم از کم جن کا احسان مانا گیا
 کی تعلیم و اطاعت کرنا تو بر سر شریف انہی کا طبیع اور فطری تقاضا ہے، اس سامنے سے تم اللہ
 کی اطاعت پر آمادہ۔

پہلی آیت میں ان خصوصیتوں کا ذکر ہے جو ہر انسان کی ذات اور نفس کے اندر ہو چکی
 کہ پہلے وہ بے جان ذرات کی صورت میں پیدا ہوا جس میں اللہ تعالیٰ نے زندگی پیدا فرمائی،
 دوسری آیت میں ان عام فطرت کا ذکر ہے جن سے انسان اور تمام مخلوقات فاعل و فاعلی
 ہیں اور وہ انسان کی زندگی اور رہائش کے لئے ضروری ہیں، ان میں پہلے زمین اور اس کی پیداوار کا
 ذکر کیا گیا جس سے انسان کا جسم بھی خلق ہے، پھر آسمانوں کا ذکر کیا گیا جن کے ساتھ زمین کی
 حیات اور پیداوار وابستہ ہے۔

ثُمَّ یُخَلِّیۡ شَیۡءًا عَلَیۡہِمْ ۝۱۱ کہہ کر اللہ کا انکار کرے، ان لوگوں نے اگرچہ اپنا پروردگار
 کا انکار نہیں کیا، مگر رسولی خدا کے انکار کو نہ ان کا انکار قرار دے کر ایسا خطاب
 کیا، ۝ ہے۔

کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو خضار کریں گے اس میں اور خوں ریزیاں کریں گے اور ہم
برایں تسبیح کرتے رہتے ہیں بعد ازاں اور آپ کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں فرشتوں کی یہ گزارش
نہ بطور اعتراض اور نہ اپنا استحقاق جتانے کے لئے، بلکہ فرشتوں کو کسی طرح یہ معلوم
ہو گیا تھا کہ جو نئی مخلوق زمین سے بنائی جائے گی ان میں ایک دہرہ ہر طرح کے لوگ ہونگے، بعض لوگ
اس نیابت کے کام کو اور زیادہ خراب کریں گے، اس لئے نیاز مند انہ عرض کیا کہ ہم سب کے
سب ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں، اور گرد و ملائکہ میں کوئی گناہ کرنے والا بھی نہیں، اس لئے
کوئی نیا علم پڑھانے اور نئی مخلوق پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیلئے ہے، خصوصاً جبکہ اس نئی مخلوق
میں یہ بھی احتمال ہے کہ وہ آپ کی مرضی کے خلاف کام کریں گے جس سے آپ ناخوش ہوں ہم
ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں اور ہماری خدمت آپ کی مرضی کے مطابق ہی ہوگی (حق تعالیٰ نے
ارشاد فرمایا کہ میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے یعنی جو چیز تمہاری نظر میں تخلیق
بنی آدم سے مانع ہے کہ ان میں بعض نسا بھی پھیلا دیں گے وہی چیز درحقیقت ان کی تخلیق کا
اصلی سبب ہے، کیونکہ اجراء احکام و انتظام تو جہی وقوع میں آسکتا ہے جب کوئی اعتدال سے
تجاوہ کرنے والا بھی ہو، یہ مقصود ہم فرمانبرداریوں کے جمع ہونے سے پورا نہیں ہو سکتا،
اور اعتدال سے تجاوہ کر جانے والی ایک مخلوق جنات پہلے سے موجود تھی، اس سے یہ کام کیوں
نہ لیا گیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کام کے لئے نوزوں وہ مخلوق ہو سکتی ہے جن میں شر و فساد کا
عنصر موجود ہو مگر غالب نہ ہو، جنات میں یہ عنصر غالب تھا، اس لئے تخلیق آدم کی تجویز فرمائی،
آگے اسی حکمت الہیہ کی مزید توضیح اس طرح کی گئی کہ نیابت خداوندی کے لئے ایک خاص علم کی
ضرورت ہو، وہ علم ملائکہ کی استعداد سے خارج ہے، اس لئے فرمایا کہ عظیم دیدار اللہ تعالیٰ نے
آدم علیہ السلام کو (ان کو پیدا کر کے) سب چیزوں کے اسماء کا یعنی سب چیزوں کے نام اور ان
کے خواص و آثار سب کا علم آدم کو دیا گیا، پھر وہ چیزیں فرشتوں کے رد برو کر دیں پھر فرمایا
کہ بتلاؤ مجھ کو اسماء ان چیزوں کے (یعنی مع ان کے آثار و خواص کے) اگر تم پہنچے ہو (یعنی اپنے
اس قول میں پہنچے ہو کہ ہم خلافت ارضی کا کام اچھا انجام دے سکیں گے) فرشتوں نے عرض کیا کہ
آپ تو پاک ہیں اس الزام سے کہ آدم علیہ السلام پر اس علم کو ظاہر فرما دیا ہم سے پوشیدہ رکھا
کیونکہ کسی آیت یا روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آدم علیہ السلام کو علم اسماء کی تعلیم فرشتوں سے
لگ کر کے دی گئی، اس سے ظاہر یہ ہے کہ تعلیم تو سب کے سامنے یکساں دی گئی مگر آدم علیہ السلام
کی فطرت میں اس علم کے حاصل کر لینے کی صلاحیت تھی انھوں نے حاصل کر لیا، فرشتوں کی طبیعت
اس کی متحمل نہ تھی ان کو یہ علم حاصل نہ ہوا، مگر ہم کو ہی علم نہیں مگر وہی جو کچھ آپ نے ہم کو علم دیا

بیشک آپ بڑے علم والے ہیں حکمت والے ہیں ذکر جس قدر جس کے لئے مصلحت جانا
اسی قدر علم و فہم اس کو عطا فرمایا، اس سے فرشتوں کا یہ اعتراض تو ثابت
ہو گیا کہ وہ اس کام سے عاجز ہیں جو نائب کے سپرد کرنا ہے، آگے حق تعالیٰ
کو یہ منظور ہوا کہ آدم علیہ السلام میں اس علم خاص کی مناسبت کو فرشتوں کے
سامنے آشکارا فرمادیں، اس لئے احق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے آدم
تم بتلاؤ ان کو ان چیزوں کے اسماء (یعنی مع حالات و خواص کے جب
آدم علیہ السلام نے یہ سب فرشتوں کے رد برو بتلا دیا تو فرشتے اتنا سمجھ گئے
کہ آدم علیہ السلام اس علم کے ماہر ہو گئے ہیں) سو جب بتلا دیے ان کو
آدم علیہ السلام نے ان چیزوں کے اسماء تو حق تعالیٰ نے فرمایا (دیکھو)
میں تم سے نہ کہتا تھا کہ بیشک میں جانتا ہوں تمام پوشیدہ چیزیں
آسمانوں کی اور زمین کی اور جانتا ہوں جس بات کو ظاہر کر دیتے ہو
اور جس کو دل میں رکھتے ہو۔

معارف مسائل

رابط آیات | پچھل آیات میں اللہ جل شانہ کی خاص و عام نعمتوں کا ذکر کر کے
انسان کو ناشکری اور نافرمانی سے بچنے کی ہدایت کی گئی،

اس آیت سے آخر کو تک دس آیتوں میں آدم علیہ السلام کا قصہ بھی اسی سلسلہ میں ذکر فرمایا، ہر
کیونکہ نعمت و اذیت کی ہوتی ہے، ایک معنوی میں محسوس، جیسے کھانا، پینا، روپیہ، مکان، جائیداد
دوسری معنوی، جیسے عزت و آبرو، مسرت، علم، پچھل آیات میں صوری اور ظاہری نعمتوں کا ذکر
تھا، اور ان گیارہ آیتوں میں معنوی نعمتوں کا ذکر ہے، کہ ہم نے تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو
دولت علم دی، اور سجدہ ملائکہ بنانے کی عزت دی، اور تم کو ان کی اولاد میں ہونے کا فخر عطا کیا۔
خلاصہ مضمون آیت کا یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے جب تخلیق آدم اور دنیا میں اس کی خلافت
قائم کرنے کا ارادہ کیا، تو فرشتوں سے بظاہر ان کا امتحان لینے کے لئے اس ارادے کا ذکر فرمایا،
جس میں اشارہ یہ تھا کہ وہ اس معاملے میں اپنی رائے کا اظہار کریں، فرشتوں نے رائے یہ پیش کی
کہ انسانوں میں تو ایسے لوگ بھی ہوں گے جو فساد اور خوں ریزی کریں گے، ان کو زمین کی خلافت اور
انتظام سپرد کرنا سمجھ میں نہیں آتا، اس کام کے لئے تو فرشتے زیادہ انسب معلوم ہوتے ہیں، کہ

نیکی ان کی فطرت ہے، بُرائی کا صدور ہی ان سے ممکن نہیں، وہ مکمل اطاعت گزار ہیں، دنیا کا مستظاہر بھی وہ درست کر سکیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کی رائے کے غلط ہونے کا اظہار اول ایک حاکمانہ طرز سے دیا کہ خلافت ارضی کی حقیقت اور اس کی ضروریات سے ہم واقف نہیں، اس کو میں ہی مکمل طور پر جانتا ہوں۔

پھر دوسرا جواب حکیمانہ انداز سے آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر ترجیح، اور مقام علم میں آدم کے حقوق کا ذکر کر کے دیا گیا، اور بتلایا گیا کہ خلافت ارض کے لئے زمین مخلوقات کے نام اور ان کے خواص و آثار کا جاننا ضروری ہے اور فرشتوں کی استعداد اس کی متعلیٰ نہیں۔

یہاں یہ بات غور طلب ہو کہ حضرت حق جل و علا شانہ کا فرشتوں کی مجلس میں اس واقعہ کا اظہار کس حیثیت سے تھا؟ کیا ان سے مشورہ لینا مقصود تھا؟ یا محض ان کو اطلاع دینا پیش نظر تھا؟ یا فرشتوں کی زبان سے ان کی رائے کا اظہار کرنا اس کا منشاء تھا؟

سویہ بات ظاہر ہے کہ مشورہ کی ضرورت تو وہاں پیش آتی ہے جہاں مسئلہ کے سب پہلو کسی پر روشن نہ ہوں، اور اپنے علم و بصیرت پر مکمل اطمینان نہ ہو، اس لئے دوسرے عقلاء و اہل دانش سے مشورہ کیا جاتا ہے، یا ایسی صورت میں جہاں حقوق و دوسروں کے بھی مساوی ہوں تو ان کی رائے لینے کے لئے مشورہ ہوتا ہے، جیسے دنیا کی عام کونسلوں میں رائج ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ یہاں دونوں صورتیں نہیں ہو سکتیں، اللہ سبحانہ و تعالیٰ خالق کائنات ہیں، ذرہ ذرہ کا علم رکھتے ہیں اور ظاہر و باطن ہر چیز ان کے علم و بصیرت کے سامنے برابر ہے، ان کو کیا ضرورت کہ کسی سے مشورہ لیں!

اسی طرح یہاں یہ بھی نہیں کہ کوئی پارلیمانی حکومت ہو جس میں تمام ارکان کے مساوی حقوق ہیں، اور سب سے مشورہ لینا ضروری ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی سب کے خالق اور مالک ہیں، فرشتے ہوں یا جن و انس سب ان کی مخلوق و مملوک ہیں، کسی کو حق نہیں کہ ان کے کسی فعل کے متعلق سوال بھی کر سکے کہ آپ نے یہ کیوں کیا اور فلاں کام کیوں نہیں کیا، لَیْسَ عَلَیْکُمْ اَلْعَمَلُ وَهُمْ لَیْسَ بِکَافِرٍ (۱۲:۳۳) اللہ تعالیٰ سے اس کے کسی فعل کے متعلق سوال نہیں کیا جاسکتا اور سب ان کے اعمال کا سوال کیا جائے گا۔

بات یہی ہو کہ درحقیقت یہاں مشورہ لینا مقصود نہیں اور نہ اس کی ضرورت، مگر صورت مشورہ کی بنائی گئی، جس میں مخلوق کو مسند مشورہ کی تعلیم کا فائدہ ہو سکتا ہے، جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام سے مشورہ لینے کی ہدایت مشرآن میں فرمائی گئی، حالانکہ آپ تو صاحب وحی ہیں، تمام معاملات اور ان کے تمام پہلو آپ کو بذریعہ وحی بتلائے جاسکتے تھے،

مگر آپ کے ذریعہ مشورہ کی سنت جاری کی اور امت کو سکھانے کے لئے آپ کو بھی مشورے کی تاکید فرمائی گئی۔

غرض فرشتوں کی مجلس میں اس واقعہ کے اظہار سے ایک فائدہ تو تعلیم مشورہ کا حاصل ہوا رکمانی روح البیان، دوسرا فائدہ خود الفاظ مشرآنی کے اشارہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے فرشتے یہ سمجھتے تھے کہ ہم سے زیادہ افضل و اعلم کوئی مخلوق اللہ تعالیٰ پیدا نہیں کریں گے۔

اور تفسیر ابن جریر میں حضرت عبد اللہ بن عباس سے ایک روایت میں اس کی تصریح بھی ہے کہ خلقت آدم علیہ السلام سے پہلے فرشتے آپس میں کہتے تھے کہ اَلَّذِیْ یُخْلِقُ اللّٰهُ خَلْقًا اَکْثَرًا عَلَیْہِ سَآءَ ذَکَ اَعْلَمُ رَبِّیْ اللّٰہُ تعالیٰ کوئی مخلوق ہم سے افضل اور اعلم پیدا فرما دیں گے، حضرت حق جل شانہ کے علم میں تھا کہ ایک ایسی مخلوق بھی پیدا کرنا ہے جو تمام مخلوقات سے زیادہ افضل و اعلم ہوگی، اور جس کو اپنی خلافت و نیابت کا خلعت عطا کیا جائے گا۔

اس لئے فرشتوں کی مجلس میں آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے اور زمین کے نائب بنانے کا ذکر کیا گیا کہ وہ اپنے خیال کا اظہار کریں۔

چنانچہ فرشتوں نے اپنے علم و بصیرت کے مطابق نیاز مندی کے ساتھ رائے کا اظہار کیا کہ جس مخلوق کو آپ خلیفہ زمین بنائے ہیں، اس میں تو شر و فساد کا مادہ بھی ہے، وہ دوسروں کی اصلاح اور زمین میں امن و امان کا انتظام کیسے کر سکتا ہے، جبکہ وہ خود خوئی ریزی کا بھی مرتکب ہو گا، اس کے بجائے آپ کے فرشتوں میں شر و فساد کا کوئی مادہ نہیں، وہ خطا و لغو معصوم ہیں، اور ہر وقت آپ کی تسبیح و تقدیس اور عبارت و اطاعت میں لگے ہوتے ہیں، وہ بظاہر اس خدمت کو اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں۔

غرض اس سے معاذ اللہ حضرت حق جل شانہ کے فعل پر اعتراض نہیں، کیونکہ فرشتے ایسے خیالات و حالات سے معصوم ہیں، بلکہ مقصد محض دریافت کرنا تھا، کہ ایک ایسی معصوم جماعت کے موجود ہوتے ہوئے دوسری غیر معصوم مخلوق پیدا کر کے یہ کام اُس کے حوالے کرنا اور اس کو ترجیح دینا کس حکمت پر مبنی ہے!

چنانچہ اس کے جواب میں پہلے تو حق تعالیٰ نے اجمالی طور پر یہ فرمایا کہ: اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ، یعنی تم خلافت البیہ کی حقیقت اور اس کے لوازم سے واقف نہیں، اس لئے یہ سمجھ لے ہو کہ ایک معصوم مخلوق ہی اس کو انجام دے سکتی ہے، اس کی پوری حقیقت کو ہم ہی جانتے ہیں۔

اس کے بعد فرشتوں کو اس کا کچھ تفصیل علم کرانے کے لئے ایک خاص واقعہ کا اظہار کیا گیا کہ تمام کائنات عالم کے نام اور ان کے خواص و آثار جن کے علم کی صلاحیت صرف آدم علیہ السلام ہی میں ودیعت کی گئی تھی، فرشتوں کی فطرت و جبلت اس کے مناسب نہ تھی، وہ سب آدم علیہ السلام کو سکھائے اور بتلائے گئے تھے، مثلاً دنیا کی نافع و مضر چیزیں اور ان کے خواص و آثار، ہر جان دار اور ہر قوم کے مزاج و طبائع اور ان کے آثار، ان چیزوں کے معلوم کرنے کے لئے طبیعت ملکی متعل نہیں، فرشتہ کیا جائے کہ بھوک کھا ہوتی ہے، پیاس کی تکلیف کیسی ہوتی ہے، نفسانی جذبات کا کیا اثر ہوتا ہے، کسی چیز سے نشہ کس طرح پیدا ہوتا ہے، سانپ اور بھوکا زہر کس بدن پر کیا اثر کرتا ہے۔

غرض زمینی مخلوقات کے نام اور خواص و آثار کی دریافت فرشتوں کے مزاج اور مخصوص طبیعت سے بالکل علیحدہ چیز تھی، یہ علم صرف آدم ہی کو سکھایا جاسکتا تھا، انہیں کو سکھایا گیا، پھر فرشتوں کی کسی تصریح یا اشارہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آدم علیہ السلام کو یہ تعلیم کسی تبتائی میں فرشتوں سے ملنے دی گئی، اس لئے ہو سکتا ہے کہ تعلیم سب کے لئے عام ہی ہو، مگر اس تعلیم سے فائدہ اٹھانا آدم علیہ السلام کی طبیعت میں تھا وہ سیکھ گئے، فرشتوں کی فطرت میں تھا وہ نہ سیکھ سکے، اسی لئے یہاں تعلیم کو آدم کی طرف منسوب کیا گیا، اگرچہ یہ تعلیم فی نفسہ عام تھی، آدم اور ملائکہ دونوں کو شامل تھی، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ظاہری تعلیم کی صورت ہی عمل میں نہ آئی ہو، بلکہ آدم علیہ السلام کی فطرت میں ان چیزوں کا علم ابتدا سے آفرینش سے ودیعت کر دیا گیا ہو، جیسے بچہ ابتداء ولادت میں ماں کا دودھ پینا جانتا ہے، بچے کا بچہ خیرنا جانتا ہو، اس میں کسی ظاہری تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اب رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو سب کچھ ہو، وہ فرشتوں کا مزاج اور طبیعت بدل کر ان کو بھی یہ چیزیں سکھاسکتے تھے، تو ان کو کیوں نہ سکھایا گیا، مگر اس کا ماحول تو یہ ہوا کہ فرشتوں کو ہی انسان کیوں نہ بنادیا، کیونکہ اگر فرشتوں کی جبلت و فطرت کو بدلا جاتا تو پھر وہ فرشتے نہ رہتے، بلکہ انسان ہی ہو جاتے۔

خلاصہ یہ کہ زمینی مخلوقات کے اسماء اور ان کے خواص و آثار کا آدم علیہ السلام کو علم دیا گیا، جو فرشتوں کے بس کا نہیں تھا، اور پھر ان مخلوقات کو فرشتوں کے سامنے کر کے سوال کیا گیا کہ اگر تم اپنے اس خیال میں پتے ہو کہ ہم سے زیادہ کوئی مخلوق اعلم و افضل پیدا نہیں ہوگی، یا یہ کہ زمین کی خلافت و نیابت کے لئے فرشتے بہ نسبت انسان زیادہ موزوں ہیں تو ان چیزوں کے نام اور خواص بتلاؤ جن پر خلیفہ زمین کو حکومت کرنا ہے۔

یہاں سے یہ فائدہ بھی حاصل ہو گیا کہ ماکم کے لئے ضروری ہو کہ اپنی محکوم رعایا کے مزاج و طبائع سے اور ان کے خواص و آثار سے پرآواقت ہو، اس کے بغیر وہ ان پر عدل و انصاف کے ساتھ حکمرانی نہیں کر سکتا، جو شخص یہ نہیں جانتا کہ بھوک سے کیسی اور کتنی تکلیف ہوتی ہے، اگر اس کی عدالت میں کوئی دعویٰ کرے کہ بھوکا رکھنے کے متعلق پیش ہو تو وہ اس کا فیصلہ کیا اور کس طرح کرے گا؟ غرض اسی واقعہ سے حق تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ بتلادیا کہ زمین کی نیابت کے لئے معصوم ہو کر دیکھنا نہیں، بلکہ اس کو دیکھنا ہے کہ وہ زمین کی چیزوں سے پرآواقت ہو، ان کے استعمال کے طریقوں اور ان کے اثرات کو جانتا ہو، اگر تمہارا یہ خیال صحیح ہو کہ فرشتے اس خدمت کے لئے زیادہ موزوں ہیں تو ان چیزوں کے نام اور خواص بتلاؤ۔

فرشتوں کا اظہار رائے چونکہ کسی اعتراض یا فخر و غرور یا اپنا استحقاق جتلانے کے لئے نہیں، بلکہ محض اپنے خیال کا اظہار ایک نیاز مند خادم کی طرح اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے تھا، اس لئے قرآن بول اٹھے، سَبَّحْتَكَ لَا إِلَهَ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا لَا تَلْفُظُ لَفْظًا أَنتَ الْغَلِيمُ الْحَكِيمُ (پاک ہیں آپ، ہم کو علم نہیں، مگر وہی جو آپ نے عطا فرمایا، بے شک آپ بڑے علم و حکمت والے ہیں) جس کا حاصل اپنے خیال سے رجوع اور اس کا امتداد تھا کہ زیادہ اعلم و افضل مخلوق بھی موجود ہے، اور یہ کہ زمین کی نیابت کے لئے وہی موزوں ہیں۔

دوسرا سوال اس جگہ یہ ہو کہ فرشتوں کو اس کی کیسے خبر ہوئی کہ انسان خوں ریزی کرے گا، کیا انہیں علم غیب تھا؟ یا محض اہل اور تخمینہ سے انہوں نے یہ سمجھا تھا؟

اس کا جواب جمہور محققین کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی ان کو انسان کے حالات اور اس کے ہونے والے معاملات بتلا دیئے تھے، جیسا کہ بعض آثار میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے آدم علیہ السلام کو خلیفہ زمین بنانے کا ذکر فرمایا، تو فرشتوں نے اللہ تعالیٰ ہی سے اس خلیفہ کا حال دریافت کیا، اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی نے ان کو بتلایا (روح المعانی) اس سے فرشتوں کو تعجب ہوا کہ جب انسان کا یہ حال ہے کہ وہ فساد و خوں ریزی بھی کرے گا تو اس کو نیابت زمین کے لئے منتخب فرمانا کس حکمت پر مبنی ہے۔

اسی کا ایک جواب تو حضرت حق جل شانہ کی طرف سے آدم علیہ السلام کے علی فوق کا اظہار فرما کر دیا گیا، اور فساد و خوں ریزی سے جو شبہ اس کے استحقاق نیابت پر کیا گیا تھا، اس کا جواب اپنی إِنِّي أَنَا عَلَّمَ مَائِدَ الْفُلُكُونِ میں اجمالاً دیدیا گیا، جس میں اشارہ ہے کہ جس چیز کو تم نیابت و خلافت کے سنانی سمجھ رہے ہو درحقیقت وہ ہی اس کی اہلیت کا بڑا سبب ہے، کیونکہ نیابت زمین کی ضرورت ہی رفع فساد کے لئے ہے، جہاں فساد نہ ہو وہاں خلیفہ اور نائب

بھیجے گی ضرورت ہی نہیں، غرض یہ بتلادیا گیا کہ منشاء الہی یہ ہو کہ جس طرح اس نے ایک ایسی مقدس معصوم مخلوق فرشتے پیدا کر دیے جس سے کسی گناہ خطا کا صدور ہو ہی نہیں سکتا، اور جس طرح اس نے مشیاطین پیدا کر دیئے جن میں نیکی اور بھلائی کی صلاحیت نہیں، اسی طرح ایک ایسی مخلوق بھی پیدا کرنا منشاء حسد اور ہمدی ہے، جس میں خیر و شر نیکی اور بدی کا مخلوط مجموعہ ہو، اور جس میں خیر و شر کے دونوں جذبات ہوں، اور جو جذبات شر کو مغلوب کر کے خیر کے میدان میں آگے بڑھے، اور رضائے خداوندی کا خلعت حاصل کرے۔

واضح لغت خود حق تعالیٰ ہیں | اس قصہ آدم علیہ السلام اور تعلیم اسماء کے واقعہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ زبان اور لغت کے اصل واضح خود حق سبحانہ و تعالیٰ ہیں، پھر اس میں مخلوق کے ہستعالات سے مختلف صورتیں اور مختلف زبانیں پیدا ہو گئیں، امام اشعریؒ نے اسی آیت سے استدلال کر کے اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی کو واضح لغت قرار دیا ہے۔

آدم علیہ السلام کا تفوق فرشتوں پر | اس واقعہ میں شترآن حکیم کے یہ بیخ الفاظ بھی قابل نظر ہیں کہ جب فرشتوں کو خطاب کر کے منبر مایا کہ ان چیزوں کے نام بتلاؤ لفظ **أَمْسِكُونِي** ارشاد فرمایا کہ مجھے بتلاؤ، اور جب آدم علیہ السلام کو اسی چیز کا خطاب ہوا تو لفظ **أَمْسِكْهُمْ** فرمایا گیا، یعنی آدم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ فرشتوں کو یہ اسماء بتلائیں۔

اس طرز بیان کے فرق سے واضح ہو گیا کہ آدم علیہ السلام کو معلم کا درجہ دیا گیا، اور فرشتوں کو طالب علم کا، جس میں آدم علیہ السلام کی فضیلت و تفوق کا ایک اہم صورت سے اظہار کیا گیا، اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فرشتوں کے علوم میں بھی کمی اور زیادتی ہو سکتی ہے کیونکہ جن چیزوں کا ان کو علم نہیں تھا، آدم علیہ السلام کے ذریعہ ان کو بھی ان چیزوں کا ارجاعی طور پر کسی نہ کسی درجہ میں علم دیدیا گیا۔

خلافت ارض کا مسئلہ | زمین کا انتظام اور اس میں خدا کا قانون نافذ کرنے کے لئے اس کی طرف سے کس نائب کا مستتر ہونا، جو ان آیات سے معلوم ہوا، اس سے دستور مملکت کا اہم باب نکل آیا، کہ اقتدار اعلیٰ تمام کائنات اور پوری زمین پر صرف اللہ تعالیٰ کا ہو، جیسا کہ شترآن مجید کی بہت سی آیات اس پر شاہد ہیں: **إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ** (۵۱: ۵۷) اور **لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ** (۱۰: ۳۲) اور **الَّذِي خَلَقَ الْإِنْسَانَ وَالْأَنْعَامَ وَالْأَنْثَىٰ** (۵۴: ۵۴) وغیرہ زمین کے انتظام کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نائب آتے ہیں، جو باذن خداوندی زمین پر سیاست و حکومت اور جنگاں خدا تعالیٰ کی تعلیم و تربیت کا کام کرتے اور احکام الہیہ کو نافذ کرتے ہیں، اس خلیفہ و نائب کا اقتدار بلاد اسطہ خود حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس میں کسی کے کسب عمل کا کوئی دخل

نہیں، اسی لئے پوری اُمت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ نبوت کسی پسند نہیں، جس کو کوئی اپنی سی دھاری سے حاصل کر سکے، بلکہ حق تعالیٰ ہی خود اپنے علم و حکمت کے تقاضے سے خاص خاص افراد کو اس کام کیلئے چن لیتے ہیں، جن کو اپنا نبی و رسول یا خلیفہ و نائب قرار دیتے ہیں، شترآن حکیم نے جگہ جگہ اس کا اظہار فرمایا ہے، ارشاد ہے:

اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ
رُسُلًا وَيُنَازِلُ فِي الْقُرْآنِ
الْبَصِيرَ (۴۵: ۲۲)

اللہ تعالیٰ انتخاب کرتا ہے فرشتوں میں
اپنے رسول کو اور انساؤں میں سے جنگ
اللہ تعالیٰ منتخب والا دیکھنے والا ہے

نیز ارشاد ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً
وَبَرَكَاتٍ (۱۳: ۶)

اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ اپنی رست
کس کو عطا فرمادیں

یہ خلیفہ اللہ بلاد اسطہ حق تعالیٰ سے اس کے احکام معلوم کرتے، اور پھر ان کو دنیا میں نافذ کرتے ہیں، یہ سلسلہ خلافت و نیابت الہیہ کا آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی انداز میں چلتا رہا، یہاں تک کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اس زمین پر اللہ تعالیٰ کے آخری خلیفہ ہو کر ہیبت ہی اہم خصوصیات کے ساتھ تشریف لاتے۔

ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپ سے قبل انبیا خاص خاص قوموں یا ملکوں کی طرف سے مبعوث ہوتے تھے، ان کا حلقہ حکومت و خستیار اپنی قوموں اور ملکوں میں محدود ہوتا تھا، ابراہیم علیہ السلام ایک قوم کی طرف، لوط علیہ السلام دوسری قوم کی طرف مبعوث ہوئے، حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام اور ان کے درمیان آنے والے انبیاء بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے عالم اور اس کی دونوں قوم جنات و انسان کی زمین میں اللہ کے آخری خلیفہ طرف بھیجا گیا، آپ کا اقتدار پوری دنیا کی دونوں قوموں پر جاری ہیں اور آپ کی خصوصیات، فرمایا گیا، شترآن کریم نے آپ کی بخت و نبوت کے عام ہونے کا

اعلان اس آیت میں فرمایا:

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ
إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ
السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ (۲: ۱۵۸)

”آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں اللہ کا رسول
ہوں، تم سب کی طرف اللہ و ذات و رحمت
میں جو ملک آسمانوں اور زمین کا“

اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تمام انبیاء

علیہم السلام پر چھ چیزوں میں خاص فضیلت بخشی گئی ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کو تمام عالم کا نبی و رسول بنا کر بھیجا گیا۔

دوسری خصوصیت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ پچھلے انبیاء کی خلافت دنیا بت جس طرح خاص خاص ملکوں اور قوموں میں محدود ہوتی تھی اسی طرح ایک خاص زمانے کے لئے مخصوص ہوتی تھی، اُس کے بعد دوسرا رسول آجاتا، تو پہلے رسول کی خلافت دنیا بت ختم ہو کر آنے والے رسول کی خلافت قائم ہو جاتی تھی۔

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے خاتم الانبیاء بنا دیا، کہ آپ کی خلافت دنیا قیامت تک قائم رہے گی، اُس کا زمانہ بھی کوئی مخصوص زمانہ نہیں، بلکہ جب تک زمین آسمان قائم اور زمانہ کا وجود ہے وہ بھی قائم ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات و شریعت ایک زمانہ تک محفوظ رہتی اور چلتی تھی، رفتہ رفتہ اُس میں تحریفات ہونے لگتے تھے وہ کالعدم ہو جاتی تھیں، اُس وقت کوئی دوسرا رسول اور دوسری شریعت بھیجی جاتی تھی۔

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ کا دین آپ کی شریعت قیامت تک محفوظ رہے گی، مسترآن مجید جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اس کے الفاظ اور معانی سب چیزوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لی، اور ارشاد فرمایا:

إِنَّا نَحْنُ حَافِظُونَ مَا نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَنَافِظُونَ (۱۱۵)

ہم نے ہی مشرآن نازل فرمایا اور ہم اس کے محافظ ہیں۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ارشادات جن کو حدیث کہا جاتا ہے، اس کی حفاظت کا بھی اللہ تعالیٰ نے ایک خاص انتظام فرما دیا، کہ قیامت تک آپ کی تعلیمات اور ارشادات کو جان سے زیادہ عزیز سمجھنے والی ایک جماعت باقی رہے گی، جو آپ کے علوم و معارف اور آپ کے شرعی احکام صحیح صحیح لوگوں کو پہنچاتی رہے گی، کوئی اس جماعت کو مشائخہ کا اللہ تعالیٰ کی تائید نہیں اُن کے ساتھ رہے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی کتابیں اور صحیفے سب منہ و محرف ہو جاتے، اور بالآخر دنیا سے گم ہو جاتے، یا غلط سلط باقی رہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی کتاب قرآن اور آپ کی بتلائی ہوئی بیانات حدیث سب کی سب اپنے اصل خود خال کے ساتھ قیامت تک موجود محفوظ رہیں گی، اسی لئے اس زمین پر آپ کے بعد نہ کسی نے نبی اور رسول کی ضرورت ہے، نہ کسی اور خلیفہ اللہ کی گنجائش۔

چوتھی خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ پچھلے انبیاء کی خلافت دنیا بت جو محدود زمانے کے لئے ہوتی تھی ہر نبی و رسول کے بعد دوسرا رسول مخاب اللہ مقرر ہوتا اور نیابت کا کام سنبھالتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ خلافت دنیا بت قیامت کے بعد نظام خلافت ہے، اس لئے قیامت تک آپ ہی اس زمین میں خلیفہ اللہ ہیں، آپ کی کائنات کے بعد نظام عالم کیلئے جو نائب ہوگا وہ خلیفہ الرسول اور پیکار نائب ہوگا، صحیح بخاری میں ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا:

كَانَتْ بَيْنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ثَلَاثُ مَنَاسِبٍ
أُولَاُ تَنْبِيَاءٍ كُلَّمَا هَلَكَ مِنْهُمْ
خَلَفَهُ نَبِيٌّ دَلَّاهُ لَا نَبِيَّ
بَعْدِي نَبِيٌّ وَتَسِيكُونُ خُلَفَاءَ
فَيُكَلِّمُونَ

”بنی اسرائیل کی سیاست، اور حکومت اُن کے انبیاء کرتے تھے، ایک نبی فوت ہوتا تو دوسرا نبی آ جاتا تھا، اور خبردار ہو کر میرے بعد کوئی نبی نہیں، اُن میرے خلیفہ ہوں گے اور نبیت ہوں گے۔“

پانچویں خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ آپ کے بعد آپ کی امت کے مجموعے کو اللہ تعالیٰ نے وہ مقام عطا فرمایا جو انبیاء علیہم السلام کا ہوتا ہے، یعنی امت کے مجموعے کو معصوم قرار دیا، کہ آپ کی پوری امت کبھی گمراہی اور غلطی پر جمع نہ ہوگی، یہ پوری امت جس مسئلہ پر اجماع و اتفاق کرے وہ حکم خداوندی کا منظر سمجھا جائے گا، اسی لئے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے بعد اسلام میں ہمیں حجت اجماع امت تسلیم کرنی پڑے گی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

فَنُحْيِيهِ أَتَمَّتْ عَلَى النَّبِيِّ

اس کی مزید تفصیل اُس حدیث سے معلوم ہوتی ہے جس میں یہ ارشاد ہے کہ میری امت میں ہمیشہ ایک جماعت حق پر قائم رہے گی، دنیا کتنی ہی بدل جائے، حق کتنا ہی مضل ہو جائے، مگر ایک جماعت حق کی حمایت ہمیشہ کرتی رہے گی، اور انجام کار وہی غالب رہے گی۔

اس سے ہمیں واضح ہو گیا کہ پوری امت کبھی گمراہی اور غلطی پر جمع نہ ہوگی، اور جب کہ امت کا مجموعہ معصوم قرار دیا گیا تو خلیفہ رسول کا انتخاب بھی اُسی کے سپرد کر دیا گیا، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نیابت زمین اور نظم حکومت کے لئے انتخاب کا طریقہ شروع ہو گیا، یہ امت جسے خلافت کے لئے منتخب کرے وہ خلیفہ رسول کی حیثیت سے نظام عالم کا واحد ذمہ دار ہوگا، اور خلیفہ سارے عالم کا ایک ہی ہو سکتا ہے۔

خلفائے راشدین کے آخری عہد تک یہ سلسلہ خلافت صحیح اصول پر چلتا رہا، اور اسی لئے اُن کے فیصلے صرف دینی اور ہنگامی فیصلوں کی حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ ایک محکم دستاویز

اور ایک درجہ میں امت کے لئے حجت مانے جاتے ہیں، کیونکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان متعلق منبرایا:

عليكم بسنتي وسنة الخلفاء
الراشدين

”میری سنت کو لازم پکڑو اور متابع راہدین کی سنت کو۔“

خلافت راشدہ کے بعد خلافت راشدہ کے بعد کچھ طوائف الملوکی کا آغاز ہوا، مختلف خطوں میں مختلف امیر بنائے گئے، ان میں سے کو بھی خلیفہ کہلانے کا سہ حق نہیں، ہاں کسی ملک یا قوم کا امیر خاص کہا جاسکتا ہے اور جب پوری دنیا کے مسلمانوں کا اجتماع کسی ایک فرد پر متعذر ہو گیا، اور ہر ملک ہر قوم کا ملحدہ علیحدہ امیر بنانے کی رسم چل گئی، تو مسلمانوں نے اس کا تقرر اس اسلامی نظریہ کے تحت جاری رکھا، کہ ملک کے مسلمانوں کی اکثریت جس کو امیر منتخب کرے وہی اس ملک کا امیر اور اول الامر کہلائے، قرآن مجید کے ارشاد: **وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ** (۲۸۱:۳۲) کے عموم سے اس پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔

مغربی جمہوریت اور اسلامی جمہوریت اسی طرز عمل کا ایک نمونہ ہیں، فرق اتنا ہے کہ جمہوری ملکوں کا اسمبلی اور ان کے ممبران شراکت میں مشرق بالکل آزاد و خود مختار ہیں، محض اپنی رائے سے جو چاہیں اچھا یا برا قانون بناتے ہیں، اسلامی اسمبلی اور اس کے ممبران اور منتخب کردہ امیر سب اس اصول و قانون کے پابند ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ان کو ملا ہے، اس اسمبلی یا مجلس شورائی کی ممبری کے لئے بھی کچھ شرائط ہیں، اور جس شخص کو یہ منتخب کریں اس کے لئے بھی کچھ حدود و قیود ہیں، پھر ان کی قانون سازی بھی شرع و سنت کے بیان کردہ اصول کے دائرہ میں ہو سکتی ہے، اس کے خلاف کوئی قانون بنانے کا ان کو اختیار نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو مخاطب کر کے جو ارشاد فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، اس سے دستور مملکت کی چند اہم دفعات پر روشنی پڑتی ہے۔

آیت مذکورہ سے دستور مملکت کی اول: یہ کہ آسمان اور زمین میں اقتدار اعلیٰ اللہ جل مجدہ کا ہے، چند اہم دفعات کا ثبوت دوسرے: یہ کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی تنفیذ کے لئے

اس کا نائب خلیفہ اس کا رسول ہوتا ہے، اور ضمنی طور پر یہ بھی واضح ہو گیا کہ خلافت اہلبیت کا سلسلہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا، تو اب خلافت رسول کا سلسلہ اس کے قائم مقام ہوا، اور اس خلیفہ کا تقرر ملت کے انتخاب کے مشورہ پر پایا۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ

اور جب ہم نے حکم دیا کہ فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب سجدہ میں گر پڑے، مگر شیطان

أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ﴿۳۴﴾

اس نے مانا اور تکبر کیا، اور تمکارہ کافروں میں سے

خلاصہ تفسیر

اور جس وقت حکم دیا ہم نے سب فرشتوں کو اور جنوں کو بھی جیسا کہ بعض روایات میں حضرت ابن عباس رضی عنہما سے منقول ہے، غرض ان سب کو یہ حکم دیا گیا کہ سجدہ میں گر جاؤ آدم کے سامنے، سب سجدہ میں گر پڑے مگر ابلیس کے کہ اس نے کہا مانا اور غرور میں آگیا، اور ہو گیا کافروں میں سے۔

معارف و مسائل

ربط آیات | پچھلے واقعہ میں جب آدم علیہ السلام کی فضیلت فرشتوں پر ظاہر ہو چکی، اور دلائل سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ صلاحیت

خلافت کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے وہ آدم علیہ السلام میں سب مجتمع ہیں، اور ملائکہ کو ان میں سے بعض علوم حاصل ہیں، اور جنوں کو تو بہت ہی کم حصہ ان علوم کا حاصل ہے، جیسا کہ اوپر تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے، اور اس حیثیت خاص سے کہ ملائکہ وحش ہر دو گروہ کے علوم کے یہ جامع ہیں، ان کا شرف ہر دو گروہ پر ظاہر ہو گیا، اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اس مقدمہ کو معاملہ سے بھی ظاہر فرما دیا جائے، اور ملائکہ اور جنوں سے ان کی کوئی خاص تعلیم کرائی جائے، جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ ان دونوں سے کامل اور صادق

آنخبہ خواہاں ہر دو گروہ تو تہنہ داری

کے ہیں، اور آدم علیہ السلام ان علوم خاصہ میں ملائکہ اور جن ہر دو گروہ سے کامل اور دونوں کے علوم و قومی کو جامع ہیں، جیسا کہ مفصل طور پر مذکور ہوا، اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ ان غیر کاملوں سے اس کامل کی کوئی ایسی تعلیم کرائی جائے کہ علم بھی یہ امر ظاہر ہو جائے کہ یہ ان دونوں سے کامل اور جامع ہیں، جب تو یہ دونوں ان کی تعلیم کر رہے ہیں، اور گویا زبان حال کہہ رہے ہیں کہ جو اوصاف ہم میں الگ الگ ہیں وہ ان کے اندر یک جا ہیں، اس لئے جو عمل تعظیمی تجویز فرمایا گیا ہے اس کی حکایت ذکر فرماتے ہیں کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں، سب فرشتوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے سجدے سے انکار کیا، اور غرور میں آگیا۔

سما علیہ السلام چلتا کر بھی تھا اس آیت میں جو بات امراتہ مذکور ہو تو یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو عیدہ کرنے کا حکم فرشتوں کو دیا گیا، مگر آگے جب استخارہ کرنے کے مسئلہ کا ذکر کیا گیا کہ سب فرشتوں نے عیدہ کیا، مگر ابلیس نے نہیں کیا تو اس سے ثابت ہوا کہ عیدہ کرنا کا حکم اس وقت تک تمام ذوی العقول مخلوقات کے لئے عام تھا، جن میں فرشتے اور جنات سب داخل ہیں، مگر حکم میں صرف فرشتوں کے ذکر کیا اس لئے ان کا بھی کیا گیا کہ وہ سب افضل اور بڑے تھے، جب آدم و ہادیسہ السلام کی تعلیم کا حکم ان کو دیا گیا تو جنت کا بدرجہ اولیٰ اس حکم میں شامل ہونا معلوم ہو گیا۔

سما علیہ السلام میں فرشتوں میں اس آیت میں فرشتوں کو حکم دیا گیا، کہ آدم علیہ السلام کو عیدہ کریں اور سورہ ہازنہ تھا اسلام میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت یوسف علیہ السلام کے والدین اور بھائی کو بھی عیدہ کرنے کے بعد یوسف علیہ السلام کو عیدہ کرنا مذکور ہے، فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو عیدہ کرنے کا حکم دیا، مگر یہ کہ فرشتوں کی عبادت شرک و کفر ہے، جس میں احوال کیا نہیں کہ کسی وقت کسی شریعت میں ہاں ہو سکے، اس کے سوا کوئی امکان نہیں کہ وہ اس آیت کے زمانے میں عیدہ سے کبھی دی و دہرہ بڑا ہو جائے، لہٰذا یہ میں سلام وصال، معافیت اور دست پرسی یا تعلیم کے لئے کو کثرت سے جولاہے گا کہ امام چٹا منٹ نے احکام القرآن میں ہیں دستوراً یہ ہے کہ انبیاء و رسلین کی شریعت میں بڑوں کی تعلیم اور عیدہ کے لئے عیدہ صلاح تھا، شریعت محمدیہ میں صلح ہو گیا، اور بڑوں کی تعلیم کے لئے صرف سلام وصال ہو کر اجازت دی گئی، اور کتبہ و عیدہ اور ہیبت غلظت یا عیدہ کو کثرت سے بولنے کو ناجائز قرار دیا گیا۔

توضیح اس کی ہے کہ اصل ذکر شرک اور بدعتی کی عبادت تو اصولی ایمان کے خلاف تھا، نہ کہ کسی بھی شریعت میں جائز نہیں ہو سکتے، لیکن یہ افعال و اعمال ایسے ہیں جو اپنی ذات میں شرک، کفر نہیں، مگر کوئی کی جہالت اور غفلت سے وہ افعال زریعہ حرکت و سرکایں بن گئے ہیں ایسے افعال کو انبیاء و رسلین کی شریعتوں میں مطلقاً منع نہیں کیا، بلکہ ان کو زریعہ شرک بنانے سے روک دیا، جیسے جائزوں کی تصویر بنانا اور کھانا بنانا اپنی ذات میں کفر و شرک نہیں، اس لئے پہلی شریعتوں میں جائز تھا، حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ میں مذکور ہو،

يَقْنُقُونَ لَهُ فَاذْكُرْهُمْ يَوْمَ الْخُرُوبِ وَكَ
تَعْرِينَ بِبَابِكُمْ نَحْمَ

۱۳۱۲۰۰

اسی طرح عیدہ تعلیمی بھی شریعتوں میں جائز تھا، لیکن آخر کار کوئی کی جہالت سے یہی چیزیں شرک و دہت پرچن کا ذریعہ بن گئیں، اور اس واقعہ سے انبیاء علیہم السلام کے دنیا و شریعت

میں تعلیم ہو گئی، اور پھر دوسرے انبیاء اور دوسری شریعتوں نے اس کو مثلاً، شریعت محمدیہ جو کہ دائمی اور دائمی شریعت ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر زور و رسالت اور اس کے شریعت آخری شریعت ہے، اس لئے اس کو کتبہ و تحریر سے بھانپنے کے لئے ہر ایسے سوادخ کو بند کر دیا گیا جہاں سے شرک و دہت پرستی آ سکتی تھی، اسی سلسلہ میں وہ عام چیزیں اس شریعت میں حرام قرار دی گئیں جو کسی زمانے میں شرک و دہت پرستی کا ذریعہ بنی تھیں۔

صور سازی، داس کے استعمال کو اس وجہ سے حرام کیا گیا، تعلیمی اس وجہ سے حرام ہوا ایسے اوقات میں مختار ہونے کے حرام کر دیا گیا، جن میں شرکین اور کفار اپنے معبودوں کی عبادت کیا کرتے تھے، کہ یہ تعلیمی مصلحت کسی وقت شرک کا ذریعہ نہ بن جائے۔

تجسس حکم کی حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آکاؤں کو بچھڑا دیا کہ غلام کو بھولتی اپنا بندہ کہہ کر چارہ اور غلاموں کو بچھڑا دیا کہ غلام کو چارہ دے، میں غلام کی تعلیم منی کے اعتبار سے بندے میں غلام کے اور وہ بچے میں غلام کے اور تربیت کر کے لے کے ہیں، ایسے افعال کا استعمال ممنوع دہرنا چاہئے تھا، مگر محض اس لئے کہ یہ افعال عام شرک ہیں، کسی وقت جہالت سے یہی افعال آکاؤں کی پرستش کا وہان ٹھکر لیا، ان افعال کے استعمال کو روک دیا گیا۔

خلاصہ یہ کہ آدم علیہ السلام کو فرشتوں کا عیدہ اور یوسف علیہ السلام کو ان کے والدین اور بھائیوں کا عیدہ جو شرک ان میں مذکور ہے، عیدہ تعلیمی تھا، جو ان کی شریعت میں سلام، صاف، اور دست پرسی کا ذریعہ رکھنا تھا، اور جائز تھا، شریعت محمدیہ کو کفر و شرک کے شائبہ سے بھی پاک رکھنا تھا، اس لئے اس شریعت میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بصد و علم بھی عیدہ یا کعبہ کرنا جائز نہیں رکھا گیا۔

میں ملنا، لے کر آیا کہ خارج اصل صداوت ہے اس میں جاہلین کے افعال ہیں، کھانا بنانا، شہنا، کھانا، عیدہ، ان میں سے پہلے دلیل کھانا بنانا اور شہنا کرنا کامیابی جو مادہ بھی انسان اپنی ضرورتوں کے لئے کرتا ہے، اور عبادت بھی لازم بن گئے جاتے ہیں، مگر کتبہ اور عیدہ ایسے فعل ہیں جو انسان مانع نہیں کرتا، نہ عبادت ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، اس لئے ان دونوں کو شریعت محمدیہ میں عبادت ہی کا کعبہ دے کر فریاد کے لئے ممنوع کر دیا۔

اب یہاں ایک سوال اُٹھتا ہے کہ عیدہ تعلیمی کا جواز قرآن کی ذکورہ آیات سے ثابت ہو، شریعت محمدیہ میں اس کا ممنوع ہونا اس دلیل سے ثابت ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مؤلفہ مشہورہ سے عیدہ

تعلیمی کا حرام ہونا ثابت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میں غیر اللہ کے لئے تعلیمی کو جائز قرار دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ شوہر کو سجدہ کیا کرے، مگر اس شریعت میں جب تعلیم مطلقاً حرام ہے، اس لئے کسی کو کسی کے لئے جائز نہیں۔

یہ حدیث میں صحابہ کرام کی روایت سے ثابت ہے، اصول حدیث کی معروف کتاب تدریج الراوی میں ہے کہ جس روایت کو دس صحابہ کرام نقل فرمادیں تو وہ حدیث متواتر ہو جاتی ہے جو شریعت کی طرح قطعی ہے، یہاں تو میں صحابہ کرام سے منقول ہے، یہ میں صحابہ کرام کی روایتیں ماسیہ بیان القرآن میں حضرت حکیم الامت عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جمع فرمادی ہیں ضرورت ہو تو وہاں دیکھا جاسکتا ہے۔

مسئلہ :- ابلیس کا کفر محض علی نافرمانی کا نتیجہ نہیں، کیونکہ کسی فرض کو ترک کر دینا اصول شریعت میں فسق و گناہ ہے، کفر نہیں، ابلیس کے کفر کا اصل پس حکم بپائی سے معارضہ اور مقابلہ کرنا ہے کہ آپ نے جس کو سجدہ کرنے کا مجھے حکم دیا ہے وہ اس قابل نہیں کہ میں اس کو سجدہ کروں، یہ معارضہ بلاشبہ کفر ہے۔

مسئلہ :- یہ بات قابل غور ہے کہ ابلیس علم و معرفت میں یہ مقام رکھتا تھا کہ اس کو طائوس الملائکہ کہا جاتا تھا، پھر اس سے یہ حرکت کیسے صادر ہوئی؟ بعض علماء نے فرمایا کہ اس کے کبر کے سبب اللہ تعالیٰ نے اس سے اپنی ہی معرفت اور علم و فہم کی دولت سلب کر لی، اس لئے ایسی جہالت کا کام کر بیٹھا، بعض نے فرمایا کہ جہالت اور خود پسندی نے حقیقت شناسی کے باوجود اس بلا میں مبتلا کر دیا، تفسیر روح المعانی میں اس جگہ ایک شعر نقل کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض اوقات کسی گناہ کے وبال سے تائید حق انسان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے، تو اس کی ہر کوشش اور عمل اس کو گمراہی کی طرف دھکیل دیتا ہے، شعر یہ ہے :-

إِذَا كَفَرْتَ بَيْنَ غَوْنٍ تَوَنُّ اللَّهُ يُلْعَثُ شَيْ
فَأَوَّلُ مَا يَنْجِيَنَّ عَلَيْكَ إِجْتِهَادُكَ

روح المعانی میں اس سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ انسان کا ایمان وہی معتبر ہو جو آخر عمر اور اول منازل آخرت تک ساتھ رہے، مگر وہ ایمان و عمل اور علم و معرفت پر غور نہ ہونا چاہئے اور

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا

اور ہم نے کہا اے آدم رہا کرو اور تیری عورت جنت میں اور کھاؤ اس میں جو چاہو

حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ

جہاں کہیں سے چاہو اور پاس مت جانا اس درخت کے، پھر تم ہر جاؤ گے ظالم

فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوا

پھر بلا دیا ان کو شیطان نے اس جگہ سے پھر نکالا ان کو اس عزت و راحت سے کہ جس میں تھے اور ہم نے کہا تم سب اتر

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَى الْحِينِ

تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہارے واسطے زمین میں ٹھکانا ہو اور نفع اٹھانا ایک وقت تک

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم رہا کرو تم اور تمہاری بیوی جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا طرہ سے آدم علیہ السلام کی پسلی سے کوئی مادہ لے کر بنا دیا تھا، بہشت میں پھر کھاؤ و تولد میں ہے با فراغت جس جگہ سے چاہو اور نزدیک نہ جاتو اس درخت کے ورنہ تم بھی اپنی میں شمار ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھے ہیں، خدا جانے وہ کیا درخت تھا، مگر اس کے کھانے سے منع فرمادیا، اور پھر آقا کو اختیار ہو کہ اپنے گھر کی چیزوں سے غلام کو جس چیز کے برتنے کی چاہے اجازت دیدے، اور جس چیز کو چاہے منع کر دے، پس بعض نے دیدی آدم و حوا کو شیطان نے اس درخت کی وجہ سے سو بر طرف کر کے رہا ان کو اس پیش سے جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا کہ بیچو اترو تم میں سے بعضے بعضوں کے دشمن رہیں گے اور تم کو زمین پر کچھ عرصہ ٹھہرنا ہے اور کام چلانا ایک میعاد معین تک، یعنی وہاں جا کر بھی دوام نہ ملے گا کچھ عرصہ کے بعد وہ گھر بھی چھوڑنا پڑے گا۔

معارف و مسائل

یہ آدم علیہ السلام کے قصہ کا مکمل ہے جس میں بپا کیا گیا کہ جب آدم کی فضیلت اور خلافت ارضی کی مصلحت فرشتوں پر واضح کر دی گئی، انھوں نے تسلیم کر لیا، اور ابلیس اپنے تکبر اور معارضہ کی وجہ سے کائنات پر کرمال دیا گیا، تو آدم علیہ السلام اور ان کی زوجہ حواء کو یہ حکم ملا کہ تم دونوں جنت میں رہو، اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ، مگر ایک معین درخت کے لئے یہ ہدایت کی کہ اس کے پاس نہ جانا، یعنی اس کے کھانے سے مکمل پرہیز کرنا، شیطان جو آدم کی وجہ سے مردود ہوا و عار کھاتے ہوئے تھا اس نے کسی طرح موقع پا کر اور مصلحتیں بتلا کر ان دونوں کو اس درخت کے کھانے پر آمادہ کر دیا، ان کی لغزش کی وجہ سے ان کو بھی جس حکم ملا کہ اب تم زمین پر جا کر رہو، اور یہ بھی بتلا دیا کہ زمین کی رہائش جنت کی طرح بے غل و غش نہ ہوگی، بلکہ وہاں آپس میں اختلافات اور دشمنیاں بھی ہوں گی جس سے زندگی کا لطف پورا نہ رہے گا۔

آیات مذکورہ سے متعلق مسائل واحکام شرعیہ

اَشْكُنْ اَنْتَ وَرَوْحُكَ الْجَنَّةَ میں حضرت آدم و حوا علیہما السلام دونوں کے لئے جنت کو مسکن بنانے کا ارشاد ہے جس کو مختصر لفظوں میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے اَشْكُنَا الْجَنَّةَ یعنی آپ دونوں جنت میں رہیں، جیسا کہ اس کے بعد مَکَلَّا اور لَا تَعْلَمُ تَابِینِ دونوں کو ایک ہی صیغہ میں جمع کیا گیا ہے، مگر یہاں اس کے خلاف اَنْتَ وَرَوْحُكَ کے الفاظ کو اختیار کرنے میں مخاطب صرت حضرت آدم کو قرار دیا اور اپنی سے فرمایا کہ آپ کی زوجہ بھی جنت میں رہے، اس میں دو مسئلوں کی طرف اشارہ ہے۔

مسئلہ اول یہ کہ بیوی کے لئے رہائش کا انتظام شوہر کے ذمہ ہے، دوسرے یہ کہ سکونت میں بیوی شوہر کے تابع ہے، جس مکان میں شوہر رہے اس میں اس کو رہنا چاہئے۔

مسئلہ لفظ اَشْكُنْ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس وقت ان دونوں حضرات کے لئے جنت کا قیام محض عارضی تھا، دائمی قیام جو شان ملکیت کی ہوتی ہے وہ ختمی، کیونکہ لفظ اَشْكُنْ کے معنی یہ ہیں کہ اس مکان میں رہا کرو یہ نہیں فرمایا کہ یہ مکان تمہیں دیا گیا یہ تمہارا مکان ہو، وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ آئندہ ایسے حالات پیش آئیں گے کہ آدم و حوا علیہما السلام کو جنت کا مکان چھوڑنا پڑے گا، نیز جنت کا اتقان ملکیت ایمان اور عمل صالح کر کے معاوضہ میں حاصل ہوتا ہے جو قیامت کے بعد ہوگا، اس سے حضرات فقہاء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو کہے کہ میرے گھر میں رہا کرو یا یہ کہ میرا گھر تمہارا مسکن ہو، اس سے مکان کی ملکیت اور دائمی اتقان اس شخص کو حاصل نہیں ہوتا (قرطبی) فَاَوْفُوا بعهْدِیْ فَاَوْفُوا بعهْدِیْ فَاَوْفُوا بعهْدِیْ یعنی کھاؤ تم دونوں جنت سے با فراغت اس میں بطور مذکور سابق خطا شوہر کے تابع نہیں

اس میں اشارہ اس کی طرف ہو سکتا ہے کہ غذا اور خوراک میں بیوی شوہر کے تابع نہیں، وہ اپنی ضرورت خواہش کے وقت اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرے اور یہ اپنی خواہش کے مطابق برعکس چلنے پھرنے کی آزادی

اَشْكُنْ اَنْتَ وَرَوْحُكَ الْجَنَّةَ لفظ رَوْحُكَ کی کولات میں وسعت و کثرت کی طرف اشارہ ہو کہ انسان کا فطری حق ہے جو چیز جتنی چاہیں کھا سکتے ہیں بجز ایک درخت کے اور کسی چیز میں کاٹاؤ اور مانع نہیں اور لفظ اَشْكُنْ میں مقامات کی وسعت کا بیان ہے کہ پوری جنت میں جہاں چاہیں جس طرح چاہیں کھائیں، کوئی خطا ممنوع نہیں اس میں اشارہ ہے کہ چلنے پھرنے اور مختلف مقامات سے اپنی ضروریات حاصل کرنے کی آزادی انسان کا فطری حق ہے، ایک محدود و معین مقام یا مکان میں اگرچہ ضرورت و خواہش کی سادگی چیسزیں ہٹا کر دی جائیں، مگر وہاں سے باہر جانا ممنوع ہو تو یہ بھی ایک قسم کی قید ہو اس لئے حضرت آدم علیہ السلام کو کھانے پینے کی تمام چیسزیں بکثرت و فراغت عطا کر دینے پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ حَتِّیْ تَشْكُنَا فرما کر ان کو چلنے پھرنے اور ہر جگہ جانے کی آزادی بھی دی گئی۔

سُورَةُ الْاَنْعَامِ کا مسئلہ لَا تَعْلَمُ تَابِینِ اَلْجَنَّةِ یعنی اس درخت کے قریب بھی نہ جاؤ یہ ظاہر ہے کہ اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس درخت یا اس کے پھل کو نہ کھاؤ، مگر احیاء طبعی حکم یہ دیا گیا کہ اس کے قریب بھی نہ جاؤ اس سے اصول فقہ کا مسئلہ سد ذرائع ثابت ہوا، یعنی بعض چیسزیں اپنی ذات میں ناجائز یا ممنوع نہیں ہوتیں، لیکن جب یہ خطرہ ہو کہ ان چیسزوں کے اختیار کرنے سے کسی حرام ناجائز کام میں مبتلا ہو جائے گا تو اس جائز چیز کو بھی روک دیا جاتا ہے، جیسے درخت کے قریب جانا ذریعہ بن سکتا تھا اس کے پھل پھول کھانے کا، اُس ذریعہ کو بھی منع فرما دیا گیا، اسی کا نام اصول فقہ کی اصطلاح میں سَدِ ذَرَائِعِ ہے۔

مسئلہ عصمت انبیاء اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو کسی خاص درخت کے کھانے سے منع فرمایا گیا تھا، اور اس پر بھی تنبیہ کر دیا گیا تھا کہ شیطان تمہارا دشمن ہو، ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں گناہ میں مبتلا کر دے، اس کے باوجود آدم علیہ السلام نے اُس درخت سے کھا لیا جو نظر ہر گناہ ہے، حالانکہ انبیاء علیہم السلام گناہ سے معصوم ہوتے ہیں، تحقیق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت تمام گناہوں سے عقلاً اور نقلاً ثابت ہے، ائمہ اربعہ اور جمہور امت کا اس پر اتفاق ہے، کہ انبیاء علیہم السلام تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم و محفوظ ہوتے ہیں اور بعض لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ صغیر گناہ اُن سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں، جمہور امت کے نزدیک صحیح نہیں (قرطبی)

وجہ یہ ہو کہ انبیاء علیہم السلام کو لوگوں کا مقتدا بنا کر بھیجا جاتا ہے، اگر ان سے بھی کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف خواہ گناہ کبیرہ ہو یا صغیر صادر ہو سکے تو انبیاء کے اقوال و افعال سے امن اٹھ جاتے گا، اور وہ قابل اعتماد نہیں رہیں گے، جب انبیاء ہی پر اعتماد و اطمینان نہ رہے تو دین کہاں ٹھکانا ہے۔

البتہ فسران کریم کی بہت سی آیات میں متعدد انبیاء کے متعلق ایسے واقعات مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہوا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن پر عتاب بھی ہوا، حضرت آدم علیہ السلام کا یہ قصہ بھی اسی میں داخل ہے۔

ایسے واقعات کا حاصل باتفاق اوست یہ ہو کہ کسی غلط فہمی یا خطا و نسیان کی وجہ سے ای کا صدور ہو جائے، کوئی پیغمبر جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف عمل نہیں کرتا، غلطی اجتہادی ہوتی ہے، یا خطا و نسیان کے سبب قابل معافی ہوتی ہے، جس کو اصطلاح شرع میں گناہ نہیں کہا جاسکتا، اور یہ یہود نسیان کی غلطی اُن سے ایسے کاموں میں نہیں ہو سکتی جن کا تعلق تبلیغ و تعلیم اور

تشریح سے ہو، بلکہ ان سے ذاتی افعال اور اعمال میں ایسا ہونسیاں ہو سکتا ہے (تفسیر بحر المحیط)
مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا مقام نہایت بلند ہے، اور بڑوں سے
بھونٹیں غلیبی بھی ہو جائے تو بہت بڑی غلیبی سمجھی جاتی ہے، اس لئے قرآن حکیم میں ایسے واقعات
کو معصیت اور گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس پر عتاب بھی کیا گیا ہے، اگرچہ حقیقت کے اعتباراً
سے وہ گناہ ہی نہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کے اس واقعہ کے متعلق علماء تفسیر نے بہت سی توجیہات لکھی ہیں
ان میں چند یہ ہیں:

اول یہ کہ جس وقت آدم علیہ السلام کو منع کیا گیا تھا، تو ایک خاص درخت کی طرف
اشارہ کر کے منع کیا گیا کہ اس کے قریب نہ جاؤ، اور مراد خاص یہی درخت نہیں تھا، بلکہ اس
کی جنس کے سارے درخت مراد تھے، جیسے حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
ایک مرتبہ ریشمی کپڑا اور ایک ٹکڑا سونے کا ہاتھ میں لیکر ارشاد فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں
میری امت کے مردوں پر حرام ہیں، ظاہر ہے کہ حرمت صرف اُس کپڑے اور سونے کے ساتھ مخصوص نہیں
تھی، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں تھے، بلکہ تمام ریشمی کپڑے اور سونے کا، یہی حکم
ہے، لیکن یہاں کسی کو یہ وہم بھی ہو سکتا ہے کہ مانعت صرف اُس کپڑے اور سونے کے ساتھ وابستہ ہو
جو اُس وقت آپ کے دست مبارک میں تھے، اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کو یہ خیال ہو گیا کہ
جس درخت کی طرف اشارہ کر کے منع کیا گیا تھا مانعت اسی کے ساتھ خاص ہے، شیطان نے یہی
دوسرے اُن کے دل میں مزین اور مستحکم کر دیا، اور کہیں کھا کر یہ یاد کر لیا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، تمہیں کسی
ایسے کام کا مشورہ نہیں دے رہا جو تمہارے لئے ممنوع یا مضر ہو، جس درخت کی مانعت کی گئی ہے وہ
دوسرا ہے، اس درخت کی مانعت نہیں ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ شیطان نے یہ دوسرے دل میں ڈالا ہو کہ اس درخت کی مانعت صرف
آپ کی ابتداء پیدائش کے وقت کے ساتھ مخصوص تھی، جیسے چھوٹے بچوں کو اول عمر میں قوی غذا
سے روکا جاتا ہے، بلکہ غذا دی جاتی ہے، اور قوت پیدا ہو جانے کے بعد ہر غذا کی اجازت ہو جاتی ہے
تو اب آپ قوی ہو چکے ہیں، اس لئے وہ مانعت باقی نہیں رہی۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جس وقت شیطان نے اس درخت کے
کھانے کے منافع بتلائے کہ اس کے کھانے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنت کی نعمتوں میں رہنے
کا اطمینان ہو جائے گا، اُس وقت اُن کو وہ مانعت یاد نہ رہی ہو جو ابتداء آفرینش کے وقت اس
درخت کے متعلق کی گئی تھی، قرآن مجید کی آیت فَتَنِي وَكَفَيْتَنِي لَذَّةَ الْحَمِيمِ (۲۰: ۷۵) میں آدم علیہ السلام

بھول گئے اور ہم نے ان میں پھنسی نہ پائی، یہ اسی احتمال کی تائید کرتی ہے۔

بہر حال اس طرح کے متعدد احتمالات ہو سکتے ہیں، جن کا حاصل یہ ہو کہ جان بوجھ کر انسانی
کا مدد در حضرت آدم علیہ السلام سے نہیں ہوا، بھول ہو گئی، یا اجتہادی لغزش ہو، درحقیقت
گناہ نہیں، مگر آدم علیہ السلام کی شان نبوت اور قرب خداوندی کے مقام عالی کے اعتبار سے
یہ لغزش بھی بڑی سمجھی گئی، اور مشرآن میں اس کو معصیت کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا، اور آدم
علیہ السلام کی توبہ و استغفار کے بعد معاف کرنے کا ذکر فرمایا گیا۔

اور یہ بحث فضول ہے کہ جب شیطان کو جنت سے مردود کر کے نکال دیا گیا تھا تو پھر وہ
آدم علیہ السلام کو بہکانے کے لئے وہاں کس طرح پہنچا؟ کیونکہ شیطان کے بہکانے اور دوسرے
ڈالنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جنت میں داخل ہو کر ہی دوسرے ڈالے، جنات و شیطا طین کو
حق تعالیٰ نے یہ قدرت دی ہے کہ وہ دُور سے بھی دل میں دوسرے ڈال سکتے ہیں، اور اگر داخل ہو کر
بالشأن گفتگو ہی کو تسلیم کیا جائے تو اس کے بھی مختلف احتمالات ہو سکتے ہیں جس کی تحقیق میں
پڑنا ہے فائدہ اور لایعن بحث ہے۔

اسی طرح یہ سوال کہ آدم و حوا علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی منہبہ کر دیا تھا، اِنَّ
الَّذِينَ ظَنُّوا أَنَّهُم مُّلاقُوا رَبِّهِمْ أُولَٰئِكَ هُمُ الَّذِينَ كَانُوا يُصَوَّرُونَ بِطُورٍ غَلِيظٍ مِّنْ دُونِ هَٰذَا
تھیں جنت سے نکلنا پڑے، پھر حضرت آدم علیہ السلام اس کے دھوکے میں کس طرح آ گئے، اس کا جواب
بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنات و شیطا طین کو مختلف شکلوں میں ظاہر ہونے کی قدرت عطا فرمائی
ہے، ممکن ہے کہ وہ کسی ایسی صورت میں سامنے آیا ہو جس کی وجہ سے آدم علیہ السلام یہ نہ پہچان سکے کہ یہ
شیطان ہے۔

فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ

پھر یہ کہ میں آدم نے اپنے رب سے چند باتیں پھر متوجہ ہو گیا اللہ اس پر شک و شبہ ہی سے توبہ قبول کرنا والا

الرَّحِيمُ ﴿۲۰﴾ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي

بہر بار، ہم نے تم کو وہاں سے نکلنے کا حکم دیا، پھر اگر تم کو پہنچے میری طرف سے کوئی

هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۲۱﴾

ہدایت تو جو چلا میری ہدایت پر نہ خوف ہو گا ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ

اور جو لوگ منکر ہوتے اور جھٹلایا ہماری نشانوں کو وہ ہیں دوزخ میں جانے والے وہ

فِي سَاخِلِدُونَ ﴿٢٩﴾

اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

خُلاصۂ تفسیر

بعد ازاں حاصل کر لے آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند الفاظ یعنی معذرت کے کلمات کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی سے حاصل ہو رہے تھے، حضرت آدم علیہ السلام کی غلامت پر اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوئی اور خود ہی معذرت کے الفاظ تلقین فرما دیئے، تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی کہ ان پر زمین پر توبہ قبول کر لے، بیشک وہی ہیں بڑی توبہ قبول کرنے والے بڑے مہربان (اور حضرت حواء کی توبہ کا بیان سورۃ اعراف میں ہے، قَالَ لَا زُنْبًا لَّكُمَا اَلَمْ تَنسَا جِسْمَ مَعْلُوم ہوا کہ وہ بھی توبہ اور قبول توبہ میں آدم علیہ السلام کے ساتھ شریک رہیں، مگر معاف فرمانے کے بعد بھی زمین پر جانے کے حکم کو منسوخ نہیں فرمایا کیونکہ اس میں ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں مضمون تھیں، البتہ اس کا طرز بدل دیا کہ پہلا حکم زمین پر اترنے کا حاکمانہ طور پر بطور مزا تھا، اب بیگم حکیمانہ انداز سے اس طرح ارشاد ہوا فَلَمَّا أَصْبَحُوا نَظَرُوا فِيهَا فَبُغِضُوا (یعنی) ہم نے حکم فرمایا کہ نیچے جاؤ اس پہشت سے سب کے سب، پھر اگر آدے تمھارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت (یعنی احکام شرعیہ بذریعہ وحی) سو جو شخص پر وہی کر چکا میری اس ہدایت کی تونہ کچھ اندیشہ ہو گا ان پر اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے (یعنی ان پر کوئی خوفناک واقعہ نہ پڑے گا اور قیامت کے ہولناک واقعات سے ان کا بھی خوف زدہ ہونا اس کے منافی نہیں، جیسا کہ احادیث صحیحہ میں سب پر ہزل اور خوف کا عام ہونا معلوم ہوتا ہے، حزن وہ کیفیت ہے جو کسی مصرت و مصیبت کے واقع ہو جانے کے بعد قلب میں پیدا ہوتی ہے، اور خوف ہمیشہ قبل وقوع ہوا کرتا ہے، یہاں حق تعالیٰ نے حزن و غم و دونوں کی نفی فرمادی، کیونکہ ان پر کوئی آفت و کلفت واقع نہ ہوگی جس سے حزن یا خوف ہو، آگے ان لوگوں کا حال بیان کیا ہے جو اس ہدایت کی پیروی نہ کریں، فرمایا) اور جو لوگ کفر کریں گے اور تکذیب کریں گے ہمارے احکام کی یہ لوگ ہوں گے دوزخ والے وہ اس میں ہمیشہ کورہیں گے۔

معارف و مسائل

رابطہ آیا پہلی آیات میں شیطانی دستور حضرت آدم کی لغزش اور اس کے نتیجے میں جنت نکلتے اور زمین پر اترنے

کا حکم مذکور تھا، حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے خطاب عتاب کہاں کئے تھے، نہ ایسے سنگدل تھے کہ اس کی بہار کر جاتے، بے چین ہو گئے، اور فوراً ہی معافی کی التجا کرنے لگے، مگر پیغمبرانہ معرفت اور اس کی وجہ سے انتہائی ہیبت سے کوئی بات زبان سے نہ نکلتی تھی، یا اس خوف سے کہ معافی کی التجا کہیں خلافت شان ہو کر مزید عتاب کا سبب نہ بن جائے، زبان خاموش تھی، اللہ رب العزت دونوں کی بات سے واقف اور رحیم و کریم ہیں، یہ حالت دیکھ کر خود ہی معافی کے لئے کچھ کلمات ان کو سکھائیے، اس کا بیان ان آیات میں ہے کہ، آدم علیہ السلام نے حاصل کر لئے اپنے رب سے چند الفاظ، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی، (یعنی ان کی توبہ قبول کر لی، بے شک وہی ہیں بڑے توبہ قبول کرنے والے مہربان) مگر چونکہ روئے زمین پر آنے میں اور بھی ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں مضمون تھیں، مثلاً ان کی نسل سے فرشتوں اور جنات کے درمیان ایک نئی نوع انسان کا وجود ملے آنا اور ان کو ایک طرح کا اختیار دے کر احکام شرعیہ کا مکلف بنانا پھر ان میں خلافت الہیہ قائم کرنا، حدود و احکام شرعیہ نافذ کرنا، تاکہ یہ نئی مخلوق ترقی کر کے اس مقام پر پہنچ سکے جو بہت سے فرشتوں کو بھی نصیب نہیں، اور ان مقاصد کا ذکر تخلیق آدم علیہ السلام سے پہلے ہی کر دیا گیا تھا، اِنِّیْ جَاعِلٌ فِیْہِ اٰیٰتٍ خَافِیَۃٍ۔

اس لئے خطا معاف کرنے کے بعد بھی زمین پر اترنے کا حکم منسوخ نہیں فرمایا، البتہ اس کا طرز بدل دیا کہ پہلا حکم حاکمانہ اور زمین پر اترنا بطور مزا کے تھا، اب یہ ارشاد حکیمانہ اور زمین پر آنا خلافت الہیہ کے اعزاز کے ساتھ ہوا، اس لئے بعد کی آیات میں اُن فَرَاقْنِیْ مِنْصِبِیْ کا بیان ہے جو ایک خلیفہ اللہ ہونے کی حیثیت سے اُن پر عائد کئے گئے تھے، اسی لئے زمین پر اترنے کے حکم کو پھر مکرر بیان کر کے فرمایا کہ، ہم نے حکم فرمایا کہ نیچے جاؤ اس جنت سے سب کے سب پھر اگر آئے تمھارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت، یعنی احکام شرعیہ بذریعہ وحی کے، تو جو شخص پر وہی کر چکا میری اس ہدایت کی، تونہ کچھ اندیشہ ہو گا ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے، یعنی نہ کسی گزشتہ چیز کے فوت ہونے کا غم ہو گا، نہ آئندہ کسی تکلیف کا خطرہ۔

تَلَقَّیْ، تلقی بمعنی میں شوق اور رغبت کے ساتھ کسی کا استقبال کرنا، اور اس کو مستہل کرنا (روح کشات) مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب اُن کو توبہ کے کلمات کی تلقین کی گئی تو آدم علیہ السلام نے اہتمام کے ساتھ اُن کو قبول کیا۔

تَلَقَّیْ، وہ کلمات جو حضرت آدم علیہ السلام کو اِخْرَاضِ توبہ بتلائے گئے کیا تھے، اس میں مغفرت صحابہ سے کئی روایات منقول ہیں، مشہور قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے کہ وہ کلمات وہی ہیں جو مسرآن مجید میں دوسری جگہ منقول ہیں، یعنی رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَافْسَا وَلَیْکُمْ تَغْفِرُ

لَنَادَ كُرْحُمْنًا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَيْرِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (۲۹۰)

تائب، توبہ کے اصل معنی رجوع کرنے کے ہیں، اور جب توبہ کی نسبت بندہ کی طرف کی جاتی ہے تو اس کے معنی تین چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے، اول اپنے کئے ہوئے گناہ کو گناہ سمجھنا اور اس پر نادم و شرمندہ ہونا، دوم اس گناہ کو بالکل چھوڑ دینا، تیسرے آئندہ کے لئے دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عزم و ارادہ کرنا، اگر ان میں چیزوں میں سے ایک کی بھی کمی ہوئی تو وہ توبہ نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ محض زبان سے اللہ توبہ کے الفاظ بول دینا نجات کے لئے کافی نہیں جب تک یہ تینوں چیزیں جمع نہ ہوں، یعنی گزشتہ پر ندامت اور حال میں اس کا ترک، اور مستقبل میں اس کے نہ کرنے کا عزم و ارادہ، ثاب علیہ یہاں توبہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے معنی ہیں توبہ قبول کرنا، بعض سلف سے پوچھا گیا کہ جس شخص سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے وہ کیا کرے تو سنرایا وہی کام کرے جو اس کے پہلے والدین آدم و حوا علیہما السلام نے کیا، کہ اپنے کئے پر ندامت اور آئندہ نہ کرنے کے عزم کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی کے لئے عرض کیا، رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنَّا لَكَاظِمُونَ (۲۹۱) یعنی اے میرے ہائے میں نے اپنے جانوں پر ظلم کر لیا ہے، اگر آپ معاف نہ کریں اور ہم پر جرم نہ کریں تو ہم سخت خسارہ والوں میں داخل ہو جائیں گے، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا، رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي (۲۹۲) یعنی اے میرے ہائے میں نے اپنے جان پر ظلم کر لیا ہے، تو آپ ہی میری مغفرت فرمائیے، اور حضرت یونس علیہ السلام سے جب لغزش ہو گئی تو عرض کیا، لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ (۲۹۳) یعنی اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، آپ ہر برائی سے پاک ہیں، میں ظلم کرنے والوں میں داخل ہو گیا ہوں، (مطلب یہ کہ مجھ پر جرم فرمائیے، قرطبی)

قائدہ: حضرت آدم و حوا سے جو اجتہادی سنسز یا بھول صادر ہوئی ہے، اولاً تو قرآن مجید نے دونوں ہی کی طرف اس کی نسبت کی ہے، فَادْرَأْنِيَا الشَّيْطَانَ عَنْهَا فَآخِرُ سَجَاتِنَا اور زمین پر اترنے کے حکم میں بھی حضرت حوا کو شریک کر کے لفظ اِخْرَجْنَاهَا فرمایا ہے، مگر بعد میں توبہ اور قبول توبہ میں یہ لفظ مفرد صرف آدم علیہ السلام کا ذکر ہے، حضرت حوا کا نہیں، اس مقام کے علاوہ بھی اس سنسز کا ذکر صرف آدم علیہ السلام کی طرف کر کے کیا گیا ہے، تَحْصِي اَدَمُ وَغَيْرُهُ۔

ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ رعایت ہو کہ عورت کو اللہ تعالیٰ نے مشورہ رکھا ہے، اس لئے بطور پروردہ پوشی کے گناہ اور عتاب کے ذکر میں اس کا ذکر صراحتہ نہیں فرمایا، اور ایک حسبِ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا میں دونوں کی توبہ کا ذکر بھی دیا گیا، تاکہ کسی کو شبہ نہ ہے کہ حضرت حوا

کا قصور محاف نہیں ہوا، اس کے علاوہ عورت چونکہ اکثر احوال میں مرد کے تابع ہے، اس لئے اس کے مستقبل ذکر کی ضرورت نہیں بھی گئی۔ (مستطاب)

تائب اور تائب میں فرق (۲۹۱) اور اللہ تعالیٰ کیلئے بھی جیسے اس آیت میں كُذِّبَ الشَّيْطَانُ مِنَ الْجَنَّةِ جب بندہ کے لئے استعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے ہیں گناہ سے اطاعت کی طرف رجوع کرنے والا، اور جب اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے ہیں توبہ قبول کرنے والا، یہ صرف لفظ تائب کا حکم ہی، اسی معنی کا دوسرا لفظ تَائِبٌ ہے، اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لئے جائز نہیں، اگرچہ لغوی معنی کے اعتبار سے وہ بھی غلط نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی شان میں صرف وہی صفات اور انقباض استعمال کرنا جائز ہیں، جن کا ذکر قرآن و سنت میں وارد ہے، باقی دوسرے الفاظ اگرچہ معنی کے اعتبار سے صحیح ہوں، مگر اللہ تعالیٰ کے لئے اس کا استعمال درست نہیں۔

منہ سے توبہ قبول کرنا اختیار (۲۹۲) اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ توبہ قبول کرنے اور گناہ معاف کرنے کا اختیار سوائے خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں، اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو نہیں، یہ تو نصاریٰ اس قاعدے غفلت کی بنا پر سخت فتنہ میں

مستلا ہو گئے، کہ پادریوں اور پیسروں کے پاس جاتے، اور ان کو کچھ ہدیہ دے کر اپنے گناہ معاف کرا لیتے، اور سمجھتے تھے کہ انہوں نے معاف کر دیا تو اللہ کے نزدیک بھی معاف ہو گیا، آج بھی بہت سے نادان مسلمان اس طرح کے غلط اور خام عقیدے رکھتے ہیں، جو سراسر غلط ہیں، کوئی عالم یا مرشد کسی کے گناہ کو معاف نہیں کر سکتا، زیادہ سے زیادہ دعا کر سکتا ہے۔

آدم کا زمین پر اترنا سزا کے طور پر نہیں (۲۹۳) تَحْصِي اَدَمُ وَغَيْرُهُ جنت سے زمین پر اترنے کا حکم بلکہ ایک مقصد کی تکمیل کے لئے تھا، اس سے پہلی آیت میں آپکا ہوا، اس جگہ پھر اس کو مکرر لانے میں غالباً حکمت یہ ہو کہ پہلی آیت میں زمین پر اترانے کا ذکر بطور عتاب اور سزا کے آیا تھا، اسی

اس کے ساتھ انسانوں کی باہمی عداوت کا بھی ذکر کیا گیا، اور یہاں زمین پر اترانے کا ذکر ایک خاص مقصد خلافتِ آدم کی تکمیل کے لئے اعزاز کے ساتھ ہے، اسی لئے اس کے ساتھ ہدایت بھیجے کا ذکر جو خلافتِ آدم کے فرائض منصبی میں سے ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگرچہ زمین پر اترنے کا ابتدائی حکم بطور عتاب اور سزا کے تھا، مگر بعد میں جب خطا معاف کر دی گئی تو دوری مصالح اور حکمتوں کے پیش نظر زمین پر بھیجنے کے حکم کو اس کی حیثیت بدل کر برقرار رکھا گیا، اور اب ان کا نزول زمین کے حاکم اور خلیفہ کی حیثیت سے ہوا، اور یہی حکمت ہے جس کا ذکر تھانیق آدم کے وقت ہی فرشتوں سے کیا جا چکا تھا، کہ زمین کے لئے اُن کو خلیفہ بنانا ہے۔

دعا و غم سے نجات مرتب ہوگا۔
کو نصیب ہوتی ہے جو اللہ کے نوازا ہوگا۔
اس آیت میں آسمانی ہدایات کی پیروی کرنے والوں کے لئے دو

انعام مذکور ہیں، ایک یہ کہ ان پر کوئی خوف نہ ہوگا، دوسرے وہ غمگین نہ ہوں گے۔
خوف، آئندہ پیش آنے والی کسی تکلیف و مصیبت کے اندیشہ کا نام ہے اور حزن کسی مقصد
مراد کے فوت ہو جانے سے پیدا ہونے والے غم کو کہا جاتا ہے، غور کیا جائے تو عیش و راحت کی تمام
انواع و اقسام کا ان دونوں غظوں میں ایسا احاطہ کر دیا گیا ہے کہ آرام و آسائش کا کوئی فرد اور کوئی قسم اس
سے باہر نہیں، پھر ان دونوں غظوں کی تعبیر میں ایک خاص فرق کیا گیا ہے کہ خوف کی نفی تو عام انداز
میں کر دی گئی، مگر حزن کے متعلق یہ نہیں مسترایا کہ لا حزن علیہم، بلکہ بصیغہ فعل لایا گیا، اور
اس کی ضمیر فاعل کو مستند کر کے ذلہم یتحزنون فرمایا گیا، اس میں اشارہ اس طرف ہے
کہ کسی چیز یا مراد کے فوت ہونے کے غم سے آزاد ہونا صرف انہی اولیاء اللہ کا مقام ہے جو اللہ تعالیٰ
کی دی ہوئی ہدایات کی بھل پیروی کر لے والے ہیں، ان کے سوا کوئی انسان اس غم سے نہیں بچ سکتا
خواہ وہ بغتہ اقلیم کا بادشاہ ہو یا دنیا کا بڑے سے بڑا مالدار کیونکہ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہوتا
جس کو اپنی طبیعت اور خواہش کے خلاف کوئی بات پیش نہ آئے اور اس کا غم نہ ہو، جیسا کہ کہا گیا ہے

دریں دنیا کسے بے غم نباشد

وگر باشد بنی آدم نباشد

بخلاف اولیاء اللہ کے کہ وہ اپنی مرضی اور ارادے کو اللہ رب العزت کی مرضی اور ارادے
میں منکر دیتے ہیں، اس لئے ان کو کسی چیز کے فوت ہونے کا غم نہیں ہوتا، مشرآن مجید میں دوسری جگہ
بھی اس کو ظاہر کیا گیا ہے، کہ خاص اہل جنت ہی کا یہ حال ہوگا کہ وہ جنت میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کا ان
پر شکر کریں گے کہ ان سے غم دور کر دیا گیا، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَدْخَبَ عَنَّا الْحَزْنَ (۲: ۲۵) اس سے
معلوم ہوا کہ اس دنیا میں کچھ نہ کچھ غم ہونا ہر انسان کے لئے ناگزیر ہے، مگر اس شخص کے جس نے اپنا
آمل حق تعالیٰ کے ساتھ سمجھ لیا اور مضبوط کر لیا ہو، خواجہ عزیز الحسن مجددیؒ نے خوب فرمایا ہے کہ
جو بچھا ہو غموں سے آپ کا دیوانہ ہو جائے

اس آیت میں اللہ والوں سے خوف و غم کی نفی کرنے سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی کسی
مصلحت یا کسی خواہش و مراد پر ان کو خوف و غم نہ ہوگا، آخرت کی فکر و غم اور اللہ جل شانہ کی
ہیبت و جلال تو ان پر اور سب زیادہ ہوتی ہے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں
یہ آیا ہے کہ آپ اکثر غمگین اور متفکر رہتے تھے، وجہ یہ ہے کہ آپ کا یہ فکر و غم کسی دنیوی نعمت کے
فوت ہونے یا کسی مصیبت کے خطرہ سے نہیں، بلکہ اللہ جل شانہ کی ہیبت و جلال سے اور امت

کے حالات کی وجہ سے تھا۔

نیز اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ دنیا میں جو چیزیں خوفناک سمجھی جاتی ہیں ان سے انبیاء
و اولیاء کو بشری طور پر طبعی خوف نہ ہو، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب لاشعی کا
سانپ بن گیا تو ان کا ڈر جانا قرآن مجید میں مذکور ہے فَادْخُلْ فِيْ نَفْثِہٖ خَیْفَةً مُّؤْتًی (۱۷: ۲۰) کیونکہ یہ
فطری اور طبعی خوف ابتدا بہ حال میں تھا، جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا تَخَفْ تو یہ ڈر بالکل بھل گیا۔
اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ خوف عام انسانوں کی طرح اس
بنیاد پر نہ تھا کہ یہ سانپ ان کو کوئی تکلیف پہنچائے گا، بلکہ اس لئے تھا کہ بنی اسرائیل اس سے کہیں
گراہی میں نہ پڑ جائیں تو یہ خوف ایک قسم کا اخروی خوف تھا۔

آخری آیت ذِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے یہ بتلادیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی
ہدایت کی پیروی نہیں کریں گے ان کا ٹھکانا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم ہوگا، اس سے مراد وہ لوگ
ہیں جو اس ہدایت کو ہدایت سمجھنے اور اس کی پیروی کرنے سے انکار کر دیں یعنی کفار اور مؤمنین جو
ہدایت کو ہدایت ماننے کا اقرار کرتے ہیں وہ عمل کیسے بھی ہو گناہوں اپنے گناہوں کی سزا بھگتتے
کے بعد بالآخر جہنم سے نکال لئے جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

یٰۤاِیُّہَا اِسْرَآءِیْلُ اِذْکُرُوْا النِّعْمَۃَ الَّتِیْ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَوْفُوا

اے بنی اسرائیل یاد کرو میرے وہ احسان جو میں نے تم پر کئے اور تم پورا کرو

بِعَهْدِیْ اَوْفِ بِعَهْدِکُمْ ؕ وَاِیَّآیْ فَاَرْهَبُوْنَ ۝۱۰ وَاٰمِنُوْا بِمَا

میرا اقرار تو میں پورا کروں تمہارا اقرار اور مجھ ہی سے ڈرو، اور امن و اس کتاب

اَنْزَلْتُ مُّصَدِّقًا لِّمَا مَعَّکُمْ وَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ کٰفِرِیْنَ ۝۱۱

کو جو میں نے تماری ہی پہ بجا کر لیا ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے اور تم ہو سب سے اول مشرک اس کے اور

لَا تَشْرَوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ وَاِیَّآیْ فَاَتَّقُوْنَ ۝۱۲ وَلَا تَلْبِسُوْا

نہ میری آیتوں پر مول تمہارا اور مجھ ہی سے بچتے رہو، اور مت ملاؤ

الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَکْمُوْا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۳

سچ میں غلط اور مت چھاؤ سچ کو جان بوجھ کر۔

خلاصہ تفسیر | اے بنی اسرائیل (یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد)

دعا و غم سے نجات مرتب ہوگا۔
کو نصیب ہوتی ہے جو اللہ کے نوازا ہوگا۔
اس آیت میں آسمانی ہدایات کی پیروی کرنے والوں کے لئے دو

انعام مذکور ہیں، ایک یہ کہ ان پر کوئی خوف نہ ہوگا، دوسرے وہ غمگین نہ ہوں گے۔
خوف، آئندہ پیش آنے والی کسی تکلیف و مصیبت کے اندیشہ کا نام ہے اور حزن کسی مقصد
مراد کے فوت ہو جانے سے پیدا ہونے والے غم کو کہا جاتا ہے، غور کیا جائے تو عیش و راحت کی تمام
انواع و اقسام کا ان دونوں غظوں میں ایسا احاطہ کر دیا گیا ہے کہ آرام و آسائش کا کوئی فرد اور کوئی قسم اس
سے باہر نہیں، پھر ان دونوں غظوں کی تعبیر میں ایک خاص فرق کیا گیا ہے کہ خوف کی نفی تو عام انداز
میں کر دی گئی، مگر حزن کے متعلق یہ نہیں مستر یا کہ لا حزن علیہم، بلکہ بصیغہ فعل لایا گیا، اور
اس کی ضمیر فاعل کو مستم کر کے ذلہم یخزقون فرمایا گیا، اس میں اشارہ اس طرف ہے
کہ کسی چیز یا مراد کے فوت ہونے کے غم سے آزاد ہونا صرف انہی اولیاء اللہ کا مقام ہے جو اللہ تعالیٰ
کی دی ہوئی ہدایات کی بھل پیروی کر لے والے ہیں، ان کے سوا کوئی انسان اس غم سے نہیں بچ سکتا
خواہ وہ بغتہ اقلیم کا بادشاہ ہو یا دنیا کا بڑے سے بڑا مالدار کیونکہ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہوتا
جس کو اپنی طبیعت اور خواہش کے خلاف کوئی بات پیش نہ آئے اور اس کا غم نہ ہو، جیسا کہ کہا گیا ہے

دریں دنیا کے بے غم نہ باشد

وگر باشد بن آدم نہ باشد

بخلاف اولیاء اللہ کے کہ وہ اپنی مرضی اور ارادے کو اللہ رب العزت کی مرضی اور ارادے
میں منکر دیتے ہیں، اس لئے ان کو کسی چیز کے فوت ہونے کا غم نہیں ہوتا، مستر آن مجید میں دوسری جگہ
بھی اس کو ظاہر کیا گیا ہے، کہ خاص اہل جنت ہی کا یہ حال ہوگا کہ وہ جنت میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کا ان
پر شکر کریں گے کہ ان سے غم دور کر دیا گیا، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَدْخَبَ عَنَّا الْحَزْنَ (۲: ۲۵) اس سے
معلوم ہوا کہ اس دنیا میں کچھ نہ کچھ غم ہونا ہر انسان کے لئے ناگزیر ہے، بجز اس شخص کے جس نے اپنا
آئین حق تعالیٰ کے ساتھ سمجھ لیا اور مضبوط کر لیا ہو، خواجہ عزیز الحسن مجددؒ نے خوب فرمایا کہ
جو بچھا ہو غموں سے آپ کا دیوانہ ہو جائے

اس آیت میں اللہ والوں سے خوف و غم کی نفی کرنے سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی کسی
مصلحت یا کسی خواہش و مراد پر ان کو خوف و غم نہ ہوگا، آخرت کی فکر و غم اور اللہ جل شانہ کی
ہیبت و جلال تو ان پر اور سب زیادہ ہوتی ہے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں
یہ آیا ہے کہ آپ اکثر غمگین اور متفکر رہتے تھے، وجہ یہ ہے کہ آپ کا یہ فکر و غم کسی دنیوی نعمت کے
فوت ہونے یا کسی مصیبت کے خطرہ سے نہیں، بلکہ اللہ جل شانہ کی ہیبت و جلال سے اور امت

کے حالات کی وجہ سے تھا۔

نیز اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ دنیا میں جو چیزیں خوفناک سمجھی جاتی ہیں ان سے انبیاء
و اولیاء کو بشری طور پر طبعی خوف نہ ہو، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب لاشعی کا
سانپ بن گیا تو ان کا ڈر جانا قرآن مجید میں مذکور ہے فَادْخُلْ فِيْ نَفْثِہٖ خَیْفَۃً مُّؤْمِنٍ (۲: ۲۷) کیونکہ یہ
فطری اور طبعی خوف ابتدا بہ حال میں تھا، جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا تَخَفْ تو یہ ڈر بالکل بھل گیا۔
اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ خوف عام انسانوں کی طرح اس
بنیاد پر نہ تھا کہ یہ سانپ ان کو کوئی تکلیف پہنچائے گا، بلکہ اس لئے تھا کہ بنی اسرائیل اس سے کہیں
گراہی میں نہ پڑ جائیں تو یہ خوف ایک قسم کا اخروی خوف تھا۔

آخری آیت ذَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے یہ بتلادیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی
ہدایت کی پیروی نہیں کریں گے ان کا ٹھکانا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم ہوگا، اس سے مراد وہ لوگ
ہیں جو اس ہدایت کو ہدایت سمجھنے اور اس کی پیروی کرنے سے انکار کر دیں یعنی کفار اور مؤمنین جو
ہدایت کو ہدایت ماننے کا اقرار کرتے ہیں وہ عمل کیسے بھی ہو گناہوں اپنے گناہوں کی سزا بھگتتے
کے بعد بالآخر جہنم سے نکال لئے جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

یٰۤاِیُّہَا اِسْرَآءِیْلُ اِذْکُرُوْا النِّعْمَۃَ الَّتِیْ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَوْفُوا

اے بنی اسرائیل یاد کرو میرے وہ احسان جو میں نے تم پر کئے اور تم پورا کرو

بِعَهْدِیْ اَوْفِ بِعَهْدِکُمْ ؕ وَاِیَّآیْ فَاَرْهَبُوْنَ ۝۱۰ وَاٰمِنُوْا بِمَا

میرا اقرار تو میں پورا کروں تمہارا اقرار اور مجھ ہی سے ڈرو، اور امن و اس کتاب

اَنْزَلْتُ مُّصَدِّقًا لِّمَا مَعَّکُمْ وَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ کٰفِرِیْنَ ۝۱۱

کو جو میں نے تماری ہی پہ بجا کر لیا ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہو اور مت ہو سب سے اول منکر اس کے اور

لَا تَشْرَوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ وَاِیَّآیْ فَاَتَّقُوْنَ ۝۱۲ وَلَا تَلْبِسُوْا

نہ میری آیتوں پر مول تمہارا اور مجھ ہی سے بچتے رہو، اور مت ملاؤ

الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتُکَفِّرُوْا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۳

سچ میں غلط اور مت چھادو سچ کو جان بوجھ کر۔

خلاصہ تفسیر اے بنی اسرائیل (یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد)

یاد کر دیجئے کہ لوگ میرے ان احسانوں کو جو کہتے ہیں میں نے تم پر ان کا حق نعمت سمجھ کر ایمان لانا تمہارا لئے آسان ہو جائے، آگے اس یاد کرنے کی مراد بتلاتے ہیں، اور پورا کر دیجئے میرے عہد کو یعنی تم نے جو توریت میں مجھ سے عہد کیا تھا جس کا بیان شترآن کی اس آیت میں ہے وَقَعْنَا عٰثٰقًا اٰدَمَ بَيْنَکُمَا وَبَیِّنَیْہِمَا اٰیٰتِنَا وَنُفِیْہُمْ اَنْتُمَا عَشَرَ نَاقِیٰۃً (الاب ۱۱: ۵۰) پھر اگر وہ گھامیں تمہارے عہد کو یعنی میں نے جو عہد تم سے کیا تھا ایمان لانے پر جیسا کہ آیت مذکورہ میں لکھا ہے فَاٰتٰیہُمْ مِنْکُمْ مَّا تَدْعُوۡنَہُمْ اور صرف مجھ ہی سے ڈرو راہنے عوام معتقدین سے نہ ڈرو کہ ان کا اعتقاد نہ رہے گا اور ان سے آندنی بند ہو جائے گی، اور ایمان لے آؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے (یعنی شترآن پر) ایسی حالت میں کہ وہ سچ بتلائے والی ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے، یعنی تورات کے کتاب الہی ہونے کی تصدیق کرتی ہے، اور جو اس میں تعریفات کی گئی ہیں وہ خود تورات و انجیل ہونے ہی سے خارج ہیں ان کی تصدیق اس سے لازم نہیں آتی، اور مت ہنو تم پہلے انکار کرنے والے اس شترآن کے (یعنی تمہیں دیکھ کر جو دوسرے لوگ انکار کریں گے) ان سب میں اڈل بانی انکار و کفر کے تم ہو گے اس لئے قیامت تک ان کے کفر و انکار کا وبال تمہارے نامہ اعمال میں ہی درج ہوتا ہے گا، اور مت لو بمقابلہ میرے احکام کے معاد ضہ حقیر اور خاص مجھ ہی کو کہ طور پر ڈرو، (یعنی میرے احکام) چھوڑ کر یا ان کو بدل کر یا چھپا کر عوام الناس سے دنیا سے ذلیل و قلیل کو وصول مت کرو، جیسا کہ ان کی عادت تھی جس کی تصریح آگے آتی ہے وَلَا تَلْمِزُوۡا النِّبِیَّۃَ بِاٰیٰتِہِا اور مخلوط مت کر دو حق کو ناحق کے ساتھ اور پوشیدہ بھی مت کر دو حق کو جس حالت میں کہ تم جانتے بھی ہو (کہ حق کو چھپانا بُری بات ہے)۔

معارف مسائل

رابطہ آیات | سورۃ بقرہ شترآن کے ذکر سے شرودع کی گئی، اور یہ بتلایا گیا کہ شترآن کی ہدایت اگرچہ ساری مخلوق کے لئے عام ہے مگر اس سے نفع صرف مومنین اٹھائیں گے، اس کے بعد ان لوگوں کے مذاہب شدید کا ذکر فرمایا جو اس پر ایمان نہیں لاتے، ان میں ایک طبقہ کھلے کافروں اور منکروں کا تھا، دوسرا منافقین کا، اور تیسرا ان کے کچھ حالات اور غلط کاریوں کے ذکر کیا گیا، اس کے بعد مومنین، مشرکین، منافقین کے تینوں طبقوں کو خطاب کر کے سب کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تاکید کی گئی، اور شترآن مجید کا اہم ذکر کیا، سچے مومنین پر غلبہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ملہ واضح کی گئی تاکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت کی ترغیب اور نافرمانی سے بچنے کی فکر ہو۔

پھر کفار کی درجاعتیں جن کا ذکر اوپر آیا ہے کھلے کافروں متنافی، ان دونوں میں دو طرح کے لوگ تھے، ایک تو بت پرست مشرکین جو محض باپ دادوں کی رسوم کی پیروی کرتے تھے کوئی علم قدیم یا جدید ان کے پاس نہ تھا، عام طور پر ان پڑھ آدمی تھے، جیسے عام اہل مکہ، اسی لئے شترآن میں ان لوگوں کو آمیتیں کہا گیا ہے۔

دوسرے وہ لوگ تھے جو پچھلے انبیاء پر ایمان لاتے، اور پہلی آسمانی کتابوں تورات و انجیل وغیرہ کا علم ان کے پاس تھا، انکے پڑھے لوگ کہلاتے تھے، ان میں بعض حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے، عیسیٰ علیہ السلام پر نہیں، ان کو یہود کہا جاتا تھا، اور بعض عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عیثیت نبی معصوم نہیں مانتے تھے، یہ نصا آرمی کہلاتے تھے، ان دونوں کو شترآن میں اس بنا پر اہل کتاب کہا گیا ہے کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی آسمانی کتاب تورات یا انجیل پر ایمان رکھتے تھے، یہ لوگ لکھے پڑھے اہل علم ہونے کی وجہ سے لوگوں کی نظر میں مسترزاد قابل اعتماد مانے جاتے تھے، ان کی بات ان پر اثر انداز ہوتی تھی، یہ راستے پر آجائیں تو دوسروں کے مسلمان ہونے کی توقع بڑی تھی، مدینہ طیبہ اور اس کے قرب و جوار میں ان لوگوں کی کثرت تھی۔

سورۃ بقرہ جو مکہ مدنی سورت ہے، اس لئے اس میں مشرکین و منافقین کے بیان کے بعد اہل کتاب کو خصوصیت اور اہتمام کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، چالیسویں آیت سے شروع ہو کر ایک سو تین آیات آخر پارہ السجد تک انہی لوگوں سے خطاب ہے، جس میں ان کو مانوس کرنے کے لئے آزل ان کی خاندانی شرافت اور اس سے دنیا میں حاصل ہونے والے اعزاز کا پھر اللہ تعالیٰ کی مسلسل نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے، پھر ان کی بے راہی اور غلط کاری پر متنبہ کیا گیا، اور صحیح راستہ کی طرف دعوت دی گئی، ان میں سے پہلی ساٹھ آیتوں میں اجمالی خطاب ہے، جن میں سے تین میں دعوت ایمان اور چار میں اعمال صالحہ کی تلقین ہے، اس کے بعد بڑی تفصیل سے ان کو خطاب کیا گیا، تفصیل خطاب کے شروع میں اور بالکل ختم پر پھر اہتمام کے لئے یٰۤاٰیُّہِیْۤا شَرٰۤا اٰیٰتِیْہِیْۤا شتر ماکر انھیں الفاظ کا اعادہ کیا گیا ہے جن سے شروع کیا گیا تھا، جیسا کہ کلام کو مؤثر اور قوی بنانے کے لئے ایسا کرنے کا دستور ہے۔

یٰۤاٰیُّہِیْۤا شَرٰۤا اٰیٰتِیْہِیْۤا اسرائیل عبرانی زبانی کا لفظ ہے، اس کے معنی عبد اللہ ہیں، یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا دوسرا نام ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور نبی کے نام متعدد نہیں ہیں، صرف حضرت یعقوب علیہ السلام کے دو نام ہیں، یعقوب اور اسرائیل، شترآن میں اس جگہ ان کو بنی یعقوب کہہ کر خطاب کیا گیا۔

نہیں کیا، بلکہ دوسرے نام اسرائیل کا استعمال کیا، اس میں حکمت یہ ہے کہ خود اپنے لقب اور نام ہی سے ان کو معلوم ہو جائے کہ ہم عیسیٰ یعنی اللہ کی عبارت گزار بندے کی اولاد ہیں، ہمیں بھی ان کے نقش قدم پر چلنا چاہئے، اس آیت میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ:-

اور پورا کرو تم میرے عہد کو، یعنی تم نے جو مجھ سے عہد کیا تھا، تو ریت میں جس کا بیان بقول قتادہؓ و مجاہدؓ اس آیت میں ہے: **وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَءِيلَ وَكُتِبَ عَلَيْهِمُ اسْمُهُمْ إِذْ أَخَذَتْهُمُ إِفْرَاقًا** (سورہ مائدہ: آیت ۱۲) اس میں سب سے اہم مادہ تمام رسولوں پر ایمان لانے کا شامل ہے، جن میں ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خصوصیت سے داخل ہیں نیز نماز، زکوٰۃ، اور صدقات بھی اس عہد میں شامل ہیں، جن کا خلاصہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور آپ کا مکمل اتباع ہے، اسی لئے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس عہد سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے (ابن جریر بسند صحیح)

پورا کروں گے عہد کو، یعنی اسی آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا کہ جو لوگ اس عہد کو پورا کریں گے تو ان کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے، اور جنت میں داخل کیا جائے گا، تو حسب وعدہ ان لوگوں کو جنت کی نعمتوں سے سرفراز کیا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسے بنی اسرائیل تم میرا عہد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا پورا کرو، تو میں اپنا عہد تمہاری مغفرت اور جنت کا پورا کروں گا، اور صرف مجھ سے ہی ڈرو، اور عوام الناس معتقدین سے نہ ڈرو کہ ان کی منشاء کے خلاف کلمہ حق کہیں گے تو وہ معتقد نہ رہیں گے آمدنی بند ہو جائے گی۔

(۱) امت محمدیہ کی ایک خاص فضیلت اور اطاعت کی طرف دعوت دی ہے، اور امت محمدیہ کو جب اسی کام کے لئے دعوت دی تو احسانات و انعامات کے ذکر کے بغیر فرمایا **قَدْ كُفِّرَتْ عَنْكُمْ**، یعنی تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد رکھوں گا، اس میں امت محمدیہ کی خاص فضیلت کی طرف اشارہ ہے، کہ ان کا تعلق محسن و منعم سے بلا واسطہ ہو، یہ محسن کہ پہچان کر احسان کو پہچانتے ہیں، بخلاف دوسری امتوں کے کہ وہ احسانات کے ذریعہ محسن کو پہچانتے ہیں۔

(۲) ایضاً عہد واجب اس آیت سے معلوم ہوا کہ عہد و معاہدے کو پورا کرنا ضروری ہے، اور عہد شکنی حرام ہے، سورہ مائدہ کی پہلی آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ

مضمون آیا ہے: **أَوْ كُفِّرُوا بِالْعُقُودِ** رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عہد شکنی کرنے والوں کو جو سزا آخرت میں ملیگی

اس سے پہلے ہی ایک سزا دی جائے گی کہ خشر کے میدان میں جہاں تمام اولین و آخرین کا اجتماع ہوگا عہد شکنی کرنے والے پر ایک جھنڈا بطور علامت کے لگا دیا جائے گا، اور جیسی بڑی عہد شکنی کی ہے اسی جیسی یہ جھنڈا بلند ہوگا، اس طرح ان کو میدان خشر میں رسوا اور شرمندہ کیا جائے گا (صحیح مسلم عن سعید)

(۳) جو شخص کسی گناہ یا ثواب کا سبب بنتا ہو اس پر **أَوَّلَىٰ كَافِرٍ يَلُمُ**، کافر ہونا خواہ سب سے پہلے ہو یا بعد بھی کرنے والوں کا گناہ یا ثواب کھٹا جاتا ہے

یہ فرمایا کہ پہلے کافر بنو، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ جو شخص اول کفر اختیار کرے گا تو بعد میں اس کو دیکھ کر جو بھی کفر میں مبتلا ہوگا اس کا وبال جو اس شخص پر ٹپے گا، اس پہلے کافر بھی اس کا وبال آئے گا، اس طرح یہ پہلا کافر اپنے کفر کے علاوہ بعد کے لوگوں کے کفر کا سبب بنکر ان سب کے وبال کفر کا بھی ذمہ دار ٹھہرے گا، اور اس کا عذاب چند در چند ہو جائے گا۔

فَأَوَّلَىٰ۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص دنیا میں دوسروں کے لئے کسی گناہ میں مبتلا ہونے کا سبب بنتا ہے تو جتنے آدمی اس کے سبب مبتلائے گناہ ہوں گے ان سب کا گناہ ان لوگوں کو بھی ہوگا اور اس شخص کو بھی، اسی طرح جو شخص دوسروں کے لئے کسی نیکی کا سبب بن جائے تو جتنے آدمی اس کے سبب نیکی عمل کریں گے، اس کا ثواب جیسا ان لوگوں کو ملے گا ایسا ہی اس شخص کے نامہ اعمال میں بھی لکھا جائے گا، شتران مجید کی متعدد آیات اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث میں یہ مضمون بار بار آیا ہے۔

(۴) **وَلَقَدْ كُفِّرُوا بِلَآئِهِمْ**، اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی آیات کے بدلے میں قیمت لینے کی ممانعت کا مطلب وہ ہے جو آیت کے سابق لسانی سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی مرضی اور ان کی اغراض کی خاطر اللہ تعالیٰ کی آیات کا مطلب غلط بتلا کر یا چھپا کر لوگوں سے پیسے لئے جائیں، یہ فعل باجماع امت حرام ہے۔

(۵) تعلیم شتران پر رہا یہ معاملہ کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کی آیات صحیح بتلا کر یا چھپا کر اس کی اجرت لینا کیسا اجرت لینا جائز ہے؟ اس کا تعلق آیت مذکورہ سے نہیں، خود یہ مسئلہ اپنی جگہ قابل غور و بحث ہے

کہ تعلیم شتران پر اجرت و معاوضہ لینا جائز ہے یا نہیں، فقہ اہل سنت کا اس میں اختلاف ہے، امام مالکؒ شافعیؒ و احمد بن حنبلؒ جائز قرار دیتے ہیں، اور امام عظیم ابو حنیفہؒ اور بعض دوسرے متذہب فرماتے ہیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شتران کو زریعہ کسب معاش کا بنانے سے منع فرمایا ہے۔

لیکن متاخرین حنفیہ نے بھی جب ان حالات کا شاہدہ کیا، کہ شتران مجید کے تعلیم کو اسلامی بیت المال سے گزارہ ملا کرتا تھا، اب ہر جگہ اسلامی نظام میں فتور کے سبب ان تعلیم

کو عموماً کچھ نہیں ملتا، یہ اگر اپنے معاش کے لئے کسی محنت مزدوری یا تجارت وغیرہ میں لگ جائیں تو بچوں کو تعلیم مسترآن کا سلسلہ بحیرہ بند ہو جائے گا، کیونکہ وہ دن بھر کا مشغلہ چاہتا ہے، اس لئے تعلیم مسترآن پر تنخواہ لینے کو بضرورت جائز قرار دیا، جیسا کہ صاحب ہدایہ نے فرمایا ہے کہ آجکل اسی پر نشوونما دینا چاہئے، کہ تعلیم مسترآن پر اجرت و تنخواہ لینا جائز ہے، صاحب ہدایہ کے بعد آنے والے دوسرے فقہاء نے بعض ایسے ہی دوسرے وظائف جن پر تعلیم مسترآن کی طرح دین کی بقتا موقوف ہو، مثلاً امامت و اذان اور تعلیم حدیث و فقہ وغیرہ کو تعلیم مسترآن کے ساتھ ملحق کر کے ان کی بھی اجازت دی (رد مختار، شامی)۔

(۱۶) ایصال ثواب کے لئے ختم قرآن پر علامہ شامی نے درمختار کی شرح میں اور اپنے رسالہ شفا بعلیل اجرت لینا یا تعاقب حبانہ نہیں میں بڑی تفصیل اور قوی دلائل کے ساتھ یہ بات واضح کر دی کہ تعلیم مسترآن وغیرہ پر اجرت لینے کو جن متاحسین فقہاء نے جائز مسترآر دیا ہے اس کی علت ایک ایسی دینی ضرورت ہے جس میں غفل آنے سے دین کا پورا نظام بخل ہو جاتا ہے، اس لئے اس کو ایسی ہی ضرورت کے مواقع میں محدود رکھنا ضروری ہے، اس لئے مروجوں کو ایصال ثواب کیلئے ختم مسترآن کرنا یا کوئی دوسرا وظیفہ پڑھوانا اجرت کے ساتھ حرام ہے، کیونکہ اس پر کسی عام دینی ضرورت کا مدار نہیں، اور اجرت لیکر پڑھنا حرام ہوا تو اس طرح پڑھنے والا اور پڑھوانے والا دونوں گناہگار ہوئے، اور جب پڑھنے والے ہی کو کوئی ثواب نہ ملا تو میت کو وہ کیا پہنچائے گا، علامہ شامی نے اس بات پر فقہاء کی بہت سی تصریحات تاج الشریعہ، عینی شرح ہدایہ، حاشیہ خیر الدین بر بحر الرائق وغیرہ سے نقل کی ہیں، اور خیر الدین دہلی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ایصال ثواب کے لئے قبر پر مسترآن پڑھوانا یا اجرت دے کر ختم مسترآن کرنا صحابہ و تابعین اور اسلاف امت سے کہیں منقول نہیں، ان کے بعد مت ہے (شامی، ص ۱۴۴ ج ۱)۔

(۱۷) حق بات کو چھپانا اس میں آیت دَلَّا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ الْوَ سے ثابت ہوا کہ حق بات کو غلط حلقہ ملط کرنا حرام ہے۔ باتوں کے ساتھ گڈمڈ کر کے اس طرح پیش کرنا جس سے مخاطب مغالطہ میں پڑ جائے جائز نہیں، اسی طرح کسی خوت یا طبع کی وجہ سے حق بات کا چھپانا بھی حرام ہے، مسئلہ واضح ہو، اس میں کسی تفصیل کی ضرورت نہیں، امام شریعتی نے اپنی تفسیر میں حق کو چھپانے سے پرہیز کرنے کا ایک واقعہ اور مفصل مکالمہ حضرت ابو حازم تابعی اور خلیفہ سلیمان بن عبد الملک کا نقل کیا ہے، جو بہت سے فوائد کی وجہ سے قابل ذکر ہے۔

حضرت ابو حازم تابعی سلیمان بن عبد الملک کے ساتھ مذکور ہو کر ایک مرتبہ سلیمان بن عبد الملک مدینہ طیبہ میں اور جبہ ذوقیام کیا تو لوگوں سے دریافت کیا کہ مدینہ طیبہ میں اب کوئی ایسا آدمی موجود ہے جس نے

کبھی صحابی کی صحبت پائی ہو؟ لوگوں نے بتلایا، ہاں ابو حازم ایسے شخص ہیں، سلیمان نے اپنا آدمی بھیج کر ان کو بلوایا، جب وہ تشریف لائے تو سلیمان نے کہا کہ اسے ابو حازم یہ کیا ہے مروتی اور بیوفائی ہے؟ ابو حازم نے کہا، آپ کی میری کیا ہے مروتی اور بیوفائی دیکھی ہے؟ سلیمان نے کہا کہ مدینہ کے سب سے ہرور لوگ مجھ سے ملنے آئے، آپ نہیں آئے، ابو حازم نے کہا، امیر المؤمنین میں آپ کو اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں اس سے کہ آپ کوئی ایسی بات کہیں جو واقعہ کے خلاف ہے، آج سے پہلے نہ آپ مجھ سے واقف تھے اور نہ میں نے کبھی آپ کو دیکھا تھا، ایسے حالات میں خود ملاقات کے لئے آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بیوفائی کیسی!

سلیمان نے جواب سنکر ابن شہاب زہریؒ اور حاکم بن حاکم کی طرف التفات کیا، تو امام زہریؒ نے فرمایا کہ ابو حازم نے صحیح منسرایا، آپ نے غلط کی۔

اس کے بعد سلیمان نے زوئے سخن بدل کر کچھ سوالات شروع کئے اور کہا اسے ابو حازم، یہ کیا بات ہے کہ ہم موت سے گھبراتے ہیں؟ آپ نے فرمایا وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی آخرت کو دیران اور دنیا کو آباد کیا ہے، اس لئے آبادی سے دیرانہ میں جانا پسند نہیں۔

سلیمان نے تسلیم کیا، اور پوچھا کہ کل اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کیسے ہوگی؟ منسرایا کہ نیک عمل کرنے والا تو اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح جائے گا جیسا کوئی مسافر سفر سے واپس اپنے گھر والوں کے پاس جاتا ہے، اور بُرے عمل کرنے والا اس طرح پیش ہوگا، جیسا کوئی بھاگتا ہوا غلام بچہ کر آقا کے پاس حاضر کیا جاتا ہے۔

سلیمان یہ سنکر رو پڑے، اور کہنے لگے کاش میں معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے کیا صورت تجویز کر رکھی ہے، ابو حازم نے فرمایا کہ اپنے اعمال کو اللہ کی کتاب پر پیش کر دو تو تیرے گت جائیگا سلیمان نے دریافت کیا کہ مسترآن کی کس آیت سے یہ پتہ لگے گا؟ فرمایا اس آیت سے، اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ (۱۱۳، ۱۱۴) یعنی بلاشبہ نیک عمل کرنے والے جنت کی نعمتوں میں ہیں، اور نافرمان، گناہ شعار و دورخ ہیں۔

سلیمان نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو بڑی ہے، وہ ہزاروں پرگاہی ہے، فرمایا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۵۷) یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت نیک عمل کرنے والوں سے قریب ہے۔

سلیمان نے پوچھا اسے ابو حازم اللہ کے بندوں میں سب سے زیادہ کون عزت والا ہے؟ فرمایا وہ لوگ جو مروت اور عقل سلیم رکھنے والے ہیں۔

پھر پوچھا کہ کونسا عمل افضل ہے؟ تو فرمایا کہ زانض و اجابات کی ادائیگی حرام چیزوں

سے بچنے کے ساتھ۔

پھر دریافت کیا کہ کونسی دعا زیادہ قابل قبول ہے؟ تو فرمایا کہ جس شخص پر احسان کیا گیا اس کی دعا اپنے محسن کے لئے اقرب الی القبول ہے۔

پھر دریافت کیا کہ صدقہ کونسا افضل ہے؟ تو فرمایا کہ مصیبت زدہ سائل کے لئے باوجود اپنے افلاس کے جو کچھ ہو سکے، اس طرح خرچ کرنا کہ اس سے پہلے احسان جتانے اور نہ مال مٹول کر کے ایذا پہنچانے۔

پھر دریافت کیا کہ کلام کونسا افضل ہے؟ تو فرمایا کہ جس شخص سے تم کو خوف ہو یا جس سے تمہاری کوئی حاجت ہو اور امید وابستہ ہو اس کے سامنے بغیر کسی رو رعایت کے حق بات کہہ دینا۔ پھر دریافت کیا کہ کونسا مسلمان سب سے زیادہ ہوشیار ہو؟ فرمایا وہ شخص جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تحت کام کیا ہو، اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دی ہو۔

پھر پوچھا کہ مسلمانوں میں کون شخص احمق ہو؟ فرمایا وہ آدمی جو اپنے کسی بھائی کی اس کے ظلم میں امداد کرے، جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اس نے دوسرے کی دنیا درست کرنے کے لئے اپنا دین بچ دیا، سلیمانؑ نے کہا کہ صحیح منسرایا۔

اس کے بعد سلیمانؑ نے اور واضح الفاظ میں دریافت کیا کہ ہمارے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ ابو حازمؒ نے فرمایا کہ مجھے اس سوال سے معاف رکھیں تو بہتر ہے، سلیمانؑ نے کہا کہ نہیں، آپ ضرور کوئی نصیحت کا کلمہ کہیں۔

ابو حازمؒ نے فرمایا، اے امیر المؤمنین تمہارے آباء و اجداد نے بڑے شمشیر و گول پر تسلط کیا، اور زبردستی ان کی مرضی کے خلاف ان پر حکومت قائم کی، اور بہت سے لوگوں کو قتل کیا، اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے، کاش! آپ کو معلوم ہو تاکہ اب وہ مرنے کے بعد کیا کہتے ہیں، اور ان کو کیا کہا جاتا ہے۔

حاشیہ نشینوں میں سے ایک شخص نے بادشاہ کے مزاج کے خلاف ابو حازمؒ کی اس صاف گوئی کو مستحکم کہا کہ ابو حازمؒ تمہارے یہ بہت بری بات کہیں ہے، ابو حازمؒ نے فرمایا کہ تم غلط کہتے ہو، بڑی بات نہیں کہیں، بلکہ وہ بات کہیں جس کا ہم کو حکم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے علماء سے اس کا عہد لیا ہے کہ حق بات لوگوں کو بتلائیں گے چھپائیں گے نہیں، لَیْسَ لَکُمْ عَلَیْہِمْ کَلِمَۃٌ (۱۱۴:۲) یہی وہ بات ہے جس کے لئے یہ طویل حکایت امام قرطبی نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں درج فرمائی ہے۔

سلیمانؑ نے پھر سوال کیا کہ اچھا اب ہمارے درست ہونے کا کیا طریقہ ہے؟ منسرایا کہ

مختصر چھوڑ دو عزت خستیار کرو، اور حقوق والوں کو ان کے حقوق انصاف کے ساتھ تقسیم کر دو۔ سلیمانؑ نے کہا کہ ابو حازمؒ کیا ہو سکتا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ رہیں، منسرایا، خدا کی پناہ سلیمانؑ نے پوچھا یہ کیوں؟ فرمایا کہ اس لئے کہ مجھے خطرہ یہ ہے کہ میں تمہارے مال و دولت اور عزت و جاہ کی طرف کچھ مائل ہو جاؤں جس کے نتیجے میں مجھے عذاب بھگتنا پڑے۔

پھر سلیمانؑ نے کہا کہ اچھا آپ کی کوئی حاجت ہو تو بتلائیے کہ ہم اس کو پورا کریں؟ فرمایا: ہاں ایک حاجت ہے کہ جہنم سے نجات دلاؤ اور جنت میں داخل کرو، سلیمانؑ نے کہا کہ یہ تو میرے اختیار میں نہیں منسرایا کہ پھر مجھے آپ سے اور کوئی حاجت مطلوب نہیں۔

آخر میں سلیمانؑ نے کہا کہ اچھا میرے لئے دعا کیجئے، تو ابو حازمؒ نے یہ دعا کی، یا اللہ اگر سلیمانؑ آپ کا پسندیدہ ہے تو اس کے لئے دنیا و آخرت کی بہتری کو آسان بنائیے، اور اگر وہ آپ کا دشمن ہو تو اس کے بال بچہ کو اپنی مرضی اور محبوب کاموں کی طرف لے آ۔

سلیمانؑ نے کہا کہ مجھے کچھ وصیت فرمادیں، ارشاد فرمایا کہ مختصر یہ ہے کہ اپنے رب کی غلامی و حبس اس درجہ میں رکھو کہ وہ تمہیں اس مقام پر نہ دیکھے جس سے منع کیا ہے، اور اس مقام سے غیر حاضر نہ پائے جس کی طرف آنے کا اس نے حکم دیا ہے۔

سلیمانؑ نے اس مجلس سے فارغ ہونے کے بعد تنوگیاں بطور ہدیہ کے ابو حازمؒ کے پاس بھیجیں، ابو حازمؒ نے ایک خطا کے ساتھ ان کو واپس کر دیا، خط میں لکھا تھا کہ اگر یہ تنویر بناؤ میرے کلمات کا معاوضہ ہیں تو میرے نزدیک خون اور خنزیر کا گوشت اس سے بہتر ہے، اور اگر اس لئے بھیجاؤ کہ بیت المال میں میرا حق ہے تو مجھ جیسے ہزاروں علماء اور دین کی خدمت کرنے والے ہیں، اگر سب کو آپ نے اتنا ہی دیا ہے تو میں بھی لے سکتا ہوں اور نہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

ابو حازمؒ کے اس ارشاد سے کہ اپنے کلمات نصیحت کا معاوضہ لینے کو خون اور خنزیر کی طرح قرار دیا ہے اس مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ کس طاعت و عبادت کا معاوضہ لینا ان کے نزدیک جائز نہیں۔

وَأَقِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ﴿۲۱۱﴾

اور قائم رکھو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور گھجک نمازیں گھجکے والوں کے ساتھ

أَتَا مَرُوءَ النَّاسِ بِالْبِرِّ وَتَلْسُونَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَسْلُونَ

کیا تم کرتے ہو لوگوں کو نیک کام کا اور بھولتے ہو اپنے آپ کو اور تم تو بڑھتے ہو

الْكِتَابِ مَا أَفْلَا تَعْقِلُونَ ﴿۲۶۱﴾ وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ لِذِكْرِ

کتاب پھر کیوں نہیں سوچتے ہو، اور مدد چاہو صبر سے اور نماز سے اور

إِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ﴿۲۶۲﴾ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّ هُم

البتہ وہ بھاری ہے مگر اپنی عاجزوں پر جن کو خیال ہے کہ وہ دوبرہ ہونے والے

مُتْلَقُونَ بِرَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴿۲۶۳﴾

میں اپنے رب کے اور یہ کہ ان کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اور قائم کرو تم لوگ نماز کو دینے مسلمان ہو کر اور دو زکوٰۃ کو اور عاجزی کرو و عاجزی کرنے والوں کے ساتھ و علماء بنی اسرائیل کے بعض اقارب مسلمان ہو گئے تھے جب ان سے گفتگو ہوتی تو خفیہ طور پر یہ علماء ان سے کہتے تھے کہ بیشک محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول برحق ہیں ہم لوگ تو کسی مصلحت سے مسلمان نہیں ہوتے، مگر تم اس مذہب اسلام کو نہ چھوڑنا، اسی بنا پر حق تعالیٰ نے فرمایا کیا غضب ہو کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو دینے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور آپ کی اطاعت کرنے کو، اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو کتاب کی دین تو ریت کی جس میں جا بجا ایسے عالم بے عمل کی مذمتیں مذکور ہیں تو پھر کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے اور مدد لو دینے اگر تم کو حجت مال و محبت جاہ کی وجہ سے ایمان لانا دشوار معلوم ہوتا ہو تو مدد لو صبر اور نماز سے دینے ایمان لا کر صبر اور نماز کا التزام کرو تو یہ حجت مال و جاہ دل سے نکل جائے گی، اور اگر کوئی کہے کہ خود نماز اور صبر کا التزام بہت دشوار ہے تو میں نے کہ اور بیشک وہ نماز دشوار و فریضہ ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہو ان پر کچھ بھی دشوار نہیں، وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ بیشک غنہ والے ہیں اپنے رب سے اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں وراثت اس کا حساب کتاب بھی دینا ہو گا ان دونوں خیالوں سے رغبت بھی پیدا ہوگی خوف بھی اور یہی دو چیزیں ہر عمل کی مدد ہیں۔

معارف و مسائل

رابط آیات | بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں اور احسانات یاد دلایا کہ ایمان اور عمل صالح

کی طرف دعوت دی ہے، پچھلے تین آیتوں میں ایمان و عقائد سے متعلق ہدایات تھیں، اور ان چار آیتوں میں اعمال صالحہ کی تلقین ہے، اور ان میں جو اعمال سب سے زیادہ اہم ہیں ان کا ذکر ہے، اور اصل مطلب آیات کا یہ ہے کہ ————— اور اگر تم کو حجت مال و جاہ کے غلبہ سے ایمان لانا دشوار معلوم ہوتا ہو تو اس کا علاج یہ ہو کہ صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو، صبر سے محبت مال گھٹ جائے گی، کیونکہ مال اسی درجہ سے مطلوب محبوب ہے کہ وہ ذریعہ ہے لذات و شہوات کے پورا کرنے کا جب ان لذات و شہوات کی مطلق العنانی چھوڑنے پر ہمت باندھ لو گے، تو پھر مال کی تسراوانی کی ضرورت نہیں ہے گی نہ اس کی بھنت ایسی غالب آئے گی کہ اپنے نفع نقصان سے اندھا کر دے، اور نماز سے حجت جاہ کم ہو جائے گی، کیونکہ نماز میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کی پستی اور عاجزی ہی ہے، جب نماز کو صحیح صحیح ادا کرنے کی عادت ہو جائے گی تو حجت جاہ و منصب اور تکبر و عشرہ گئے گا، اصل مادہ فساد جس کے سبب ایمان لانا دشوار تھا یہی مال و جاہ کی بھنت تھی، جب یہ مادہ فساد گھٹ گیا تو ایمان لانا آسان ہو جائے گا۔

اب سمجھئے کہ صبر میں تو صرف غیر ضروری خواہشات اور شہوات کا ترک کرنا ہے، اور نماز میں بہت افعال کا واقع کرنا بھی ہے، اور بہت سی جائز خواہشات کو بھی وقتی طور پر ترک کرنا ہو مثلاً کھانا، پینا، کلام کرنا، چلنا پھرنا، اور دوسری انسانی ضروریات جو شرعاً جائز و مباح ہیں ان کو بھی نماز کے وقت ترک کرنا ہے، اور وہ بھی اوقات کی پابندی کے ساتھ دن رات میں پانچ مرتبہ، اس لئے نماز نام ہو کچھ افعال معینہ کا، اور معینہ اوقات میں تمام ناجائز و جائز چیزوں سے صبر کرنے کا۔

غیر ضروری خواہشات کے ترک کرنے پر انسان بہت باندھ لے تو چند روز کے بعد طبعی تقاضا بھی ختم ہو جاتا ہے، کوئی دشواری نہیں رہتی، لیکن نماز کے اوقات کی پابندی اور اس کے تمام شرائط کی پابندی اور ضروری خواہشات سے بھی ان اوقات میں پرہیز کرنا یہ انسانی طبیعت پر بہت بھاری اور دشوار ہے، اس لئے یہاں پیشہ ہو سکتا ہے کہ ایمان کو آسان بنانے کا جو نسخہ تجویز کیا گیا کہ صبر اور نماز سے کام لو، اس نسخہ کا استعمال خود ایک دشوار چیز ہے خصوصاً نماز کی پابندیوں کا تو اس دشواری کا کیا علاج ہو گا؟ اس کے لئے ارشاد فرمایا، بیشک وہ نماز دشوار ضرور ہے، مگر جن کے قلوب میں خشوع ہو ان پر کچھ بھی دشوار نہیں، اس میں نماز کے آسان کرنے کی ترکیب بتلا دی گئی۔

حاصل یہ ہو کہ نماز میں دشواری کی وجہ اور سبب پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ انسان کا قلب جو مرکب و میدان خیال میں آزاد پھرنے کا، اور سب اعضائے انسانی قلب کے تابع ہیں، اس لئے قلب کا تقاضا یہی ہوتا ہو کہ اس کے سب اعضا، بھی آزاد ہیں، اور منت از سر اس آزادی کے خلاف

ہے، کہ نہ ہنس نہ لو نہ کھاؤ نہ پیو نہ چلو، وغیرہ وغیرہ اس لئے قلب ان تقیدات سے تنگ ہوتا ہے اور اس کے تلمیح اعضائے انسانی بھی اس سے تکلیف محسوس کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہو کہ سبب اس دشواری اور گرائی کا قلب کی حرکت فکر یہ ہے، تو اس کا علاج سکون سے ہونا چاہئے، اس لئے خشوع کو نماز کے آسان ہونے کا ذریعہ بتایا گیا، کیونکہ خشوع کے معنی ہی سکون قلب کے ہیں، اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سکون قلب یعنی خشوع کس طرح حاصل ہو تو یہ بات تجربہ سے ثابت ہو کہ اگر کوئی شخص اپنے قلب کے مختلف افکار و خیالات کو براہ راست نکالنا چاہے تو اس میں کامیابی قریب بحال ہو، بلکہ اس کی تذبذبیں یہ ہو کہ نفس انسانی چونکہ ایک وقت میں دو طرف متوجہ نہیں ہو سکتا، اس لئے اگر اس کو کسی ایک خیال میں محدود و موقوف کر دیا جائے تو دوسرے خیالات اور افکار خود بخود دل سے نکل جائیں گے، اس لئے تلمیح خشوع کے بعد وہ خیال بتلاتے ہیں جس میں مستغرق ہو جانے سے دوسرے خیالات دفع ہوں، اور ان کے دفع ہونے سے حرکت فکر یہ قلب کی منقطع ہو کر سکون حاصل ہو، اور سکون سے نماز میں آسانی ہو کر اس پر مدامت اور پابندی نصیب ہو، اور اس پابندی سے کبر و غرور اور حب جاہ کم ہو، تاکہ ایمان کے رستہ میں جو حاصل ہے وہ دور ہو کر ایمان کا بل ہو جائے، سبحان اللہ کیا مرتب علاج اور مطلب ہے۔

اب اس خیال مذکور کی تلقین و تمہین اس طرح فرمائی: وہ عاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بے شک ملنے والے ہیں اپنے رب، تو اس وقت اس خدمت کا خوب انعام ملے گا، اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں، تو اس وقت اس کا حساب و کتاب بھی دینا ہوگا، ان دونوں خیالوں سے رغبت و ریت یعنی امید اور خوف پیدا ہوں گے، ازل تو ہر خیال محمود میں مستغرق ہو جاتا قلب کو نیک کام پر جادیتا ہو، خصوصاً امید و ہم خیال، اس کو تو خاص طور پر دخل ہے نیک کام میں مستغرق رہنے کے لئے۔

اِقْبِسُوا الصَّلَاةَ صَلَوةً كَ لَفْظِ مَعْنٰی دَعَا کے ہیں، اصطلاح شریع میں وہ خاص عبادت ہے جس کو نماز کہا جاتا ہے، مستقر کریم میں عموماً نماز کی جتنی توجہ تاکید کی گئی ہے لفظ اقامت کے ساتھ آئی ہے، مطلق نماز پڑھنے کا ذکر صرف ایک دو جگہ آیا ہے، اس کو اقامت صَلَوة کی حقیقت کو سمجھنا چاہئے، اقامت کے لفظی معنی سپید ہا کرنے اور ثابت رکھنے کے ہیں، اور عادتاً جو عموماً یاد دہانہ اور سخت وغیرہ سپید ہا کرتا ہوتا ہو وہ قائم رہتا ہے، مگر جانے کا خطرہ کم ہوتا ہے اس لئے اقامت کے معنی قائم اور قائم کرنے کے بھی آتے ہیں۔

مستقران و سنت کی اصطلاح میں اقامت صَلَوة کے معنی نماز کو اس کے وقت میں پابندی کے ساتھ اس کے پورے آداب و شرائط کی رعایت کر کے ادا کرنا ہیں، مطلق نماز پڑھ لینے کا نام اقامت

صلوة نہیں ہے، نماز کے جتنے فضائل اور آثار و برکات قرآن و حدیث میں آئے ہیں وہ سب اقامت صَلَوة کے ساتھ مقید ہیں، مثلاً مستقر کریم میں ہے:

اِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَاۃِ وَالْمُنْكَرِ (۲۵: ۳۶) | عین نماز انسان کو ہر بے حیائی اور ہر بے کام سے روک دیتی ہے

نماز کا یہ اثر اسی وقت ظاہر ہوگا جب کہ نماز کی اقامت اس معنی سے کرے جو ابھی ذکر کئے گئے ہیں اس لئے بہت سے نمازیوں کو بڑا ہیوں اور بے حیائیوں میں مبتلا دیکھ کر اس آیت پر کوئی شبہ نہ کرنا چاہئے، کیونکہ ان لوگوں نے نماز پڑھی تو ہے مگر اس کو قائم نہیں کیا۔

اَقْوَامًا كَذٰبًا لِّذٰلِكَ زَكٰوةٌ كَ لَفْظِ زَكٰوة کے معنی لغت میں دُواتے ہیں، پاک کرنا اور بڑھانا، اصطلاح شریعت میں مال کے اس حصہ کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے جو شریعت کے احکام کے مطابق کسی مال میں نکالا جائے اور اس کے مطابق صرف کیا جائے۔

اگرچہ یہاں خطاب موجودہ بنی اسرائیل کو ہے جس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نماز اور زکوٰۃ اسلام سے پہلے بنی اسرائیل پر فرض تھی، مگر سورہ مائدہ میں ذَلَّلْنَا آتٰنَا اللّٰہُ یُثَبِّتُ اَیْمٰنَکُمْ اَوْ یُزَیِّلَہَا وَ یَقْبِضَ اَیْمٰنَکُمْ اَوْ یُفْشِلَہَا وَ یَقْبِضَ اَیْمٰنَکُمْ اَوْ یُفْشِلَہَا وَ یَقْبِضَ اَیْمٰنَکُمْ اَوْ یُفْشِلَہَا (۱۱۰: ۵) الخ سے ثابت ہو کہ نماز اور زکوٰۃ بنی اسرائیل پر فرض تھی، اگرچہ اس کی کیفیت اور ہیئت وغیرہ میں فرق ہو۔

ذٰلِکَ لَعَلَّکُمْ اَتَّعِیْنُ (تاکید کی ہے)۔ رکوع کے لغوی معنی جھکنے کے ہیں، اور اس معنی کے اعتبار سے یہ لفظ سجدہ پر بھی بولا جاسکتا ہے، کیونکہ وہ بھی جھکنے کا انتہائی درجہ ہے، مگر اصطلاح شریع میں اس خاص جھکنے کو رکوع کہتے ہیں جو نماز میں معروف و مشہور ہے۔

آیت کے معنی یہ ہیں کہ رکوع کر دو رکوع کرنے والوں کے ساتھ: یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ نماز کے تمام ارکان میں سے اس جگہ رکوع کی تخصیص کیوں کی گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں نماز کا ایک جز، بول کر رکوع نماز مراد لی گئی ہے، جیسے قرآن مجید میں ایک جگہ فَتَرٰ اَنَّ الْعَجْرَ مُسْتَرٰکٍ ہری نماز فجر مراد ہے، اور بعض روایات حدیث میں سجدہ کا لفظ بول کر پوری رکعت یا نماز مراد لی گئی ہے، اس لئے مراد آیت کی یہ ہو گئی کہ نماز پڑھنا نماز پڑھنے والوں کے ساتھ، لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ نماز کے بہت سے ارکان میں سے رکوع کی تخصیص میں کیا حکمت ہے؟

جواب یہ ہو کہ یہود کی نماز میں سجدہ وغیرہ تو تھا، مگر رکوع نہیں تھا، رکوع اسلامی نماز کی خصوصیات میں سے ہے، اس لئے راغبین کے لفظ سے انتہائی محکمہ کے نمازی مراد ہوں گے، جن کی نماز میں رکوع بھی ہے، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم بھی امت محمدیہ کے نمازیوں کے ساتھ نماز ادا کرو، یعنی اول ایمان قبول کرو پھر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرو۔

اجاعت نماز کے احکام | نماز کا حکم اور اس کا مندرجہ ہونا تو لفظ "آفَیْہُوْا الصَّلٰوۃَ" سے معلوم ہو چکا تھا، اس جگہ صیغہ التثنیہ کے لفظ سے نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ حکم کس درجہ کا ہے؟ اس میں علماء فقہاء کا اختلاف ہے، ایک جماعت صحابہ و تابعین اور فقہائے امت کی جماعت کو واجب قرار دیتی ہے، اور اس کے چھوڑنے کو سخت گناہ اور بعض صحابہ کرام تو اس نماز ہی کو جائز قرار نہیں دیتے بلکہ غرض شریعی کے بدون جماعت پڑھی جائے، یہ آیت ظاہری الفاظ کے اعتبار سے ان حضرات کی حجت ہے، جو وجوب جماعت کے قائل ہیں۔ اس کے علاوہ چند روایات حدیث سے بھی جماعت کا واجب ہونا سمجھا جاتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ:

لَا صَلَٰوةَ لِبَعْدِ الْمَسْجِدِ إِلَّا فِي الْمَسْجِدِ (رواہ ابو داؤد)

"یعنی مسجد قریب رہنے والے کی نماز صرف مسجد میں جائز ہے۔"

اور مسجد کی نماز سے ظاہر ہے کہ جماعت کی نماز اور ہر تو الفاظ حدیث سے یہ مطلب نکلا کہ مسجد کے قریب رہنے والے کی نماز بغیر جماعت کے جائز نہیں۔

مسجد کے سوا کسی اور جگہ جماعت | اور صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابو ہریرہ منقول ہے کہ ایک نابینا صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے ساتھ کوئی ایسا آدمی نہیں جو مجھے مسجد تک پہنچا دیا اور لیجا کرے، اس لئے اگر آپ اجازت دیں تو میں نماز گھر میں پڑھ لیا کر دوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازل توان کو اجازت دیدی، مگر جب وہ جانے لگے تو سوال کیا کہ کیا اذان کی آواز تمہارے گھر تک پہنچتی ہے؟ انھوں نے عرض کی کہ اذان کی آواز تو میں سنتا ہوں، آپ نے فرمایا پھر تو آپ کو مسجد میں آنا چاہئے، اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ پھر میں آپ کے لئے کوئی گھانٹا اور رخصت نہیں پاتا (آخر جہ ابو داؤد)

اور حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ سَمِعَ الْإِقَامَةَ فَلَمْ يَجِبْ فَلَا صَلَٰوةَ لَهُ إِلَّا مِنْ عُلُوٍّ (صحیحہ القرطبی)

"یعنی جو شخص اذان کی آواز سنتا ہے اور جماعت مسجد میں نہیں آتا تو اس کی نماز نہیں بھٹی مگر یہ کہ اس کو کوئی عذر شرعی ہو۔"

ان احادیث کی بناء پر حضرت عبداللہ بن مسعود اور ابو موسیٰ اشعری وغیرہ حضرات صحابہؓ نے یہ فتویٰ دیا کہ جو شخص مسجد سے اتنا قریب رہتا ہے کہ اذان کی آواز وہاں تک پہنچتی ہے تو اگر وہ بلا غرض کے جماعت میں حاضر نہ ہوا تو اس کی نماز ہی نہیں ہوتی (آواز سننے سے مراد یہ ہے کہ متوسط آواز والے آدمی کی آواز وہاں پہنچ سکتی ہے، اگر مگر الصوت یا غیر معمولی بلند آواز کا اس میں اعتبار نہیں)۔

یہ سب روایات ان حضرات کی دلیل ہیں جو جماعت کو واجب قرار دیتے ہیں، مگر جمہور امت علماء فقہاء صحابہ و تابعین کے نزدیک جماعت سنت مؤکدہ ہے، مگر سنن مؤکدہ میں سنت فخر کی طرح سب سے زیادہ مؤکدہ اور قریب بوجوب ہے، ان سب حضرات نے قرآن کریم کے امر و نہی کو صیغہ التثنیہ کو دوسری آیات اور روایات کی بناء پر تاکید کے لئے قرار دیا ہے۔ اور جن احادیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے قریب رہنے والے کی نماز بغیر جماعت کے ہوتی ہی نہیں، اس کا یہ مطلب قرار دیتے ہیں کہ یہ نماز کامل اور مقبول نہیں، اس معاملے میں حضرت عبداللہ بن مسعود کا بیان بہت واضح اور کافی ہے جس کو امام مسلم نے روایت کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

فقہ الاہل حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ کل (مشرقی) اللہ تعالیٰ سے مسلمان ہونے کی حالت میں ملے تو اس کو چاہئے کہ ان (پانچ) نمازوں کے ادا کرنے کی پابندی اس جگہ کرے جہاں اذان دی جاتی ہے، (یعنی مسجد) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کچھ ہدایت کے طریقے بتلائے ہیں، اور ان پانچ نمازوں کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا انہی سنن حدیثی میں ہے، اور اگر تم نے یہ نمازیں اپنے گھر میں پڑھ لیں، جیسے یہ جماعت سے الگ رہنے والا اپنے گھر میں پڑھ لیتا ہے کسی خاص شخص کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، تو تم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑ بیٹھو گے، اور اگر تم نے اپنے نبی کی سنت کو چھوڑ دیا تو تم گمراہ ہو جاؤ گے (اور جو شخص وضو کرے اور اچھی طرح پاکی حاصل کرے) پھر کسی مسجد کا رخ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم پر نیکی اس کے نامہ اعمال میں درج فرماتے ہیں، اور اس کا ایک درجہ بڑھا دیتے ہیں، اور ایک گناہ معاف کر دیتے ہیں، اور ہم نے اپنے نبی کو ایسا پایا ہے کہ منافق بنی النفاق کے سوا کوئی آدمی جماعت سے الگ نماز نہ پڑھتا تھا، یہاں تک کہ بعض حضرات کو عذر اور بیماری میں بھی دوا آدمیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر مسجد میں لایا جاتا اور صف میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔

اس بیان میں جس طرح باجماعت نماز کی پوری تاکید اور اہمیت و ضرورت کا ذکر ہے اسی کے ساتھ اس کا یہ درجہ بھی بیان فرمادیا کہ وہ سنن ہدی میں سے ہے جس کو فقہاء سنت مؤکدہ کہتے ہیں، چنانچہ اگر کوئی شخص عذر شرعی مثلاً مرض وغیرہ کے بغیر تنہا نماز پڑھ لے، اور جماعت میں شریک نہ ہو تو اس کی نماز تو ہو جائے گی، مگر سنت مؤکدہ کے ترک کی وجہ سے مستحق عتاب ہوگا، اور اگر ترک جماعت کی عادت بنائے تو سخت گنہگار ہے، خصوصاً اگر ایسی صورت ہو جائے کہ مسجد دیران رہے اور لوگ گھروں میں نماز پڑھیں تو یہ شبہ غامض سننا ہے، اور قاضی عیاضؒ نے فرمایا کہ ایسے لوگ اگر سمجھانے سے باز نہ آئیں تو ان سے قتال کیا جائے (قرطبی ۲/۸ ج ۱)

جے مل واعظ کی مذمت | اَنَّا مُرْسِدُونَ النَّاسِ بِالْبَيِّنَاتِ وَنُفَسِّسُكَ اس آیت میں خطا۔ اگرچہ علمائے یہود سے ہے، ان کو ملامت کی جا رہی ہے، کہ وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو یہ تلقین کرتے تھے کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے رہو، اور دین اسلام پر قائم رہو (جو علامت ہو اس بات کی کہ علمائے یہود دین اسلام کو یقینی طور پر حق سمجھتے تھے) مگر خود انسانی خواہشات سے اتنے مغلوب تھے کہ اسلام قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے، لیکن معنی کے اعتبار سے یہ ہر اس شخص کی مذمت ہے جو دوسروں کو تو نیکی اور بھلائی کی ترغیب دے، مگر خود عمل نہ کرے، دوسروں کو خدا سے ڈراتے، مگر خود نہ ڈرے، ایسے شخص کے بارے میں احادیث میں بڑی ہولناک وعیدیں آئی ہیں، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شب معراج میرا گزر کچھ لوگوں پر ہوا جن کے ہونٹ اور زبانیں آگ کی قیچیوں سے کترے جا رہے تھے میں نے جبرئیلؑ سے پوچھا یہ کون ہیں! جبرئیلؑ نے بتایا کہ یہ آپ کی امت کے دنیا دار واعظ ہیں، جو لوگوں کو تو نیکی کا حکم کرتے تھے، مگر اپنی خیر نہ لیتے تھے (ابن کثیر)۔

ابن عساکر نے ذکر کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بعض جنتی بعض دوزخیوں کو آگ میں دیکھ کر پوچھیں گے کہ تم آگ میں کیوں نہ گر بیٹھے گے؟ حالانکہ ہم تو بخدا انہی نیک اعمال کی بدولت جنت میں داخل ہوئے ہیں جو ہم نے تم سے سیکھے تھے، اہل دوزخ کہیں گے: ہم زبان سے کہتے ضرور تھے، لیکن خود عمل نہیں کرتے تھے (ابن کثیر)۔

سبا فاسق واعظ نصیحت نہیں کر سکتا! لیکن مذکورہ بیان سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ بے عمل یا فاسق کے لئے دوسروں کو وعظ و نصیحت کرنا جائز نہیں، اور جو شخص کسی گناہ میں مبتلا ہو وہ دوسروں کو اس گناہ سے باز رہنے کی تلقین نہ کرے، کیونکہ کوئی اچھا عمل الگ نیکی ہے، اور اس اچھے عمل کی تبلیغ دوسری مستقل نیکی ہے، اور ظاہر ہے کہ ایک نیکی کو چھوڑنے سے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دوسری نیکی بھی چھوڑ دی جائے۔ جیسے ایک شخص اگر نماز نہیں پڑھتا تو اس کے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ روزہ بھی ترک کر دے، بالکل اسی طرح اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا تو اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ دوسروں کو نماز پڑھنے کے لئے بھی نہ کہے، اسی طرح کسی ناجائز فعل کا ارتکاب الگ گناہ ہو، اور اپنے زیر اثر لوگوں کو اس ناجائز فعل سے نہ روکنا دوسرا گناہ ہے، اور ایک گناہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرا گناہ بھی ضرور کیا جائے۔ (روح المعانی) چنانچہ امام مالکؒ نے حضرت سعید بن جبیرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر ہر ایک شخص متوجہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دے کہ میں خود گنہگار ہوں، جب گناہوں سے خود پاک ہو جاؤں گا تو لوگوں کو تبلیغ کر دینا، تو تجربہ بیکار کی تبلیغ کرنے والا کوئی بھی باقی نہ رہے گا، کیونکہ ایسا کون ہے جو گناہوں سے پاک ہو! حضرت حسنؓ کا ارشاد ہے کہ شیطان تو بھی چاہتا ہے کہ لوگ اسی غلط خیال میں پڑ کر تبلیغ کا فریضہ

چھوڑ بیٹھیں (قرطبی) بلکہ حضرت سیدہ جحیم الامتؓ تھا تو نبیؐ تو فرمایا کرتے تھے کہ جب مجھے اپنی کسی بری عادت کا علم ہوتا ہے تو میں اس عادت کی مذمت اپنے مواعظ میں خاص طور سے بیان کرتا ہوں تاکہ وعظ کی برکت سے یہ عادت جاتی رہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت اَنَّا مُرْسِدُونَ النَّاسِ بِالْبَيِّنَاتِ وَنُفَسِّسُكَ کا مطلب یہ نہیں ہو کہ بے عمل آدمی کو وعظ کہنا جائز نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ واعظ کو بے عمل نہیں ہونا چاہئے، اور دلوں میں فرق واضح ہے، مگر یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ بے عمل ہونا تو واعظ کیلئے جائز ہو نہ غیر واعظ کیلئے؟ پھر واعظ کی تخصیص کیوں؟ جواب یہ ہے کہ ناجائز تو دونوں کے لئے ہے، مگر واعظ کا جرم غیر واعظ کے جرم کے مقابلے میں زیادہ سنگین اور زیادہ قابل ملامت ہے، کیونکہ واعظ جرم کو جرم سمجھتے ہوئے جان بوجھ کر کرتا ہے، اس کے پاس پست عذر نہیں ہوتا کہ مجھے اس کا جرم ہونا معلوم نہ تھا، برخلاف غیر واعظ کے اور ان پڑھ جاہل کے کہ اس کو خواہ علم حاصل نہ کرنے کا الگ گناہ ہو، لیکن ارتکاب گناہ میں اس کے پاس کسی درجہ میں عذر موجود ہوتا ہے، کہ مجھے معلوم نہ تھا، اس کے علاوہ عالم اور واعظ اگر کوئی حبس کر لیا جائے تو یہ دین کے ساتھ ایک قسم کا امتیاز ہے، چنانچہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جتنا ان پڑھ لوگوں کو معاف کرے گا اتنا علماء کو معاف نہیں کرے گا۔ (نفسیات باریاں) حُتِّ مال اور حُتِّ جاہ، یہ دونوں قلب کی ایسی بیماریاں ہیں جن کے باعث انسان اور ان کا عیال کی دنیاوی زندگی اور آخرتی زندگی بیکار ہو جاتی! اور غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی تاریخ میں اب تک حقیقی انسانیت سوز زلیاں کتنی گئیں اور جو نسا در پاہوئے، ان میں سے اکثر و بیشتر کو اپنی زہریلائیوں نے جہنم دیا تھا۔

حُتِّ مال کے نتائج یہ نکلتے ہیں:

۱۔ کج فہمی اور بغل پیدا ہوتا ہے جس کا ایک قومی نقصان تو یہ ہوتا ہے کہ اس کی دولت قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی، دوسرا نقصان خود اس کی ذات کو پہنچتا ہے، اگر ماسائیرہ میں کوئی ایسے شخص کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔

۲۔ خود غرض پیدا ہوتی ہے جو مال کی ہوس کو پورا کرنے کے لئے اُسے ہشیام میں ملاوٹ، تاپ تول میں کمی، رشوت سستان، صحر و فریب اور دغا بازی کے نت نئے حیلے نبھاتی ہے، وہ اپنی تجوری پہلے سے زیادہ بھرنے کے لئے دوسروں کا خون نچوڑ لینا چاہتا ہے، بالآخر سرمایہ دار اور مزدور کے جھگڑے جہنم لیتے ہیں۔

۳۔ ایسے شخص کو کتنا ہی مال مل جائے لیکن مزید کمانے کی دھن ایسی سوار ہوتی ہے کہ تفریح اور آرام کے وقت بھی یہی بے چینی اُسے کھائے جاتی ہے کہ کسی طرح اپنے سرمایہ میں زیادہ سے زیادہ

اضافہ کر دیں، بالآخر جو مال اس کے آرام و راحت کا ذریعہ بنادہ اس کے لئے وبال جان بن جاتا ہے۔
ہم حق بات خواہ کتنی ہی روشن ہو کر سامنے آجائے، مگر وہ ایسی کسی بات کو ماننے کی ہمت نہیں
کرتا جو اس کی ہوس مال سے متصادم ہو، یہ تمام چیزیں بالآخر پرے معاشرہ کا امن و چین برباد
کر ڈالتی ہیں۔

غور کیا جائے تو قریب قریب یہی حال محبت کا نظر آئے گا، اگر اس کے نتیجہ میں تکبر، خود غرضی
حقائق کی پامالی، ہوس اقتدار اور اس کے لئے خوں ریز لڑائیاں، اور اسی طرح کی بے شمار انسانیت سوز
خرابیاں جنم لیتی ہیں جو بالآخر دنیا کو دوزخ بنا کر چھوڑتی ہیں، ان دونوں بیماریوں کا علاج قرآن کریم نے یہ
تجویز فرمایا: **وَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا دِينَ أَبِي بَكْرٍ** اور مرد و صبر اور نرمی سے، یعنی صبر
اختیار کر، یعنی اپنی لذات و شہوات پر قابو حاصل کر، اس سے سخت مال گھٹ جائے گی، کیونکہ مال
کی محبت اسی لئے پیدا ہوتی ہے کہ مال لذات و شہوات کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے، جب ان لذات و خواہشات
کی اندھا دھند پیروی چھوڑنے پر ہمت، ماندھ لوگے تو شروع میں اگرچہ شاق گذرے گا لیکن رفتہ رفتہ یہ خواہشات
اعتدال پر آجائیں گی، اور اعتدال تمام آدمی عادت بن جائے گا، تو پھر مال کی فراوانی کی ضرورت نہ رہے گی،
اس کی محبت ایسی غالب آئے گی کہ اپنے نفع نقصان سے اندھا کر دے۔

اور نماز سے حسبِ جاہ کم ہو جائے گی، کیونکہ نماز میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کی عاجزی اور پستی
ہے، جب نماز کو صحیح صحیح ادا کرنے کی عادت ہو جائے گی تو ہر وقت اللہ کے سامنے اپنی عاجزی اور پستی
کا تصور رہنے لگے گا جس سے تکبر و غرور راجحہ جا گھٹ جائے گی۔

وَالْأَخْلَاقُ الْخَيْرِيَّةُ، قرآن سنت میں چنانچہ خشوع کی ترغیب کو جو اس کے مراد وہ قلبی سکون و
انکساری ہے جو اللہ کی عظمت اور اس کے سامنے اپنی حقارت کے علم سے پیدا ہوتی ہے، اس کے
نتیجہ میں طاعت آسان ہو جاتی ہے، کبھی اس کے آثار بدن پر بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں کہ وہ باادب
متواضع اور شکستہ قلب نظر آتا ہے، اگر دل میں خوف خدا اور تواضع نہ ہو تو خواہ وہ ظاہر میں کتنا ہی
باادب اور متواضع نظر آئے وہ خشوع کا حامل نہیں۔

بلکہ آثار خشوع کا قصد اظہار کرنا بھی پسند فرماتے ہیں، حضرت عمرؓ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ سر
بھکانے بیٹھا ہے، فرمایا، سر اٹھا، خشوع دل میں ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ بھی نماز کا ارشاد ہے کہ مٹا پٹنے، مٹا کھانے اور سر جھکانے کا نام خشوع
نہیں، خشوع تو یہ ہے کہ تم حق کے معاملہ میں شریعت و ذیل کے ساتھ یکساں سلوک کرو، اور اللہ نے
جو تم پر سنن کیا ہے اسے ادا کرنے میں اللہ کے لئے قناعت کو فایز کر دو۔

حضرت حسنؓ کا ارشاد ہے کہ، حضرت عمرؓ جب بات کرتے تو سنا کر کرتے تھے، جب چلتے تو

تیز چلتے، اور جب مارتے تو دوسرے مارتے تھے، حالانکہ بلاشبہ وہ خشوع رکھنے والے تھے۔
خلاصہ یہ کہ اپنے قصد و نیت سے غاصبین کی سی صورت بنانا شیطان اور نفس کا دھوکہ ہے اور
مذہب ہے، ہاں اگر بے اختیار یہ کیفیت ظاہر ہو جائے تو محذور ہے۔ (قرطبی)

فَاتَّقِ اللَّهَ، خشوع کے ساتھ ایک دوسرا لفظ خشوع بھی ہوتا ہے، قرآن کریم میں بھی
بار بار آیا ہے، یہ دونوں لفظ تفسیراً یکساں معنی ہیں، لیکن خشوع کا لفظ اصل کے اعتبار سے آواز اور لہجہ
کی پستی اور تذلل کے لئے بولا جاتا ہے، جب کہ وہ مصنوعی نہ ہو بلکہ قلبی خوف اور تواضع کا نتیجہ ہو،
قرآن کریم میں جو خشوع لکھا ہے اس کا (آواز میں پستی ہو گئی) اور خشوع کا لفظ بدن کی تواضع اور
انکساری کے لئے ہوتا ہے، مفسرین کا یہ حکم ہے:

فَتَقَلَّبْتُ أَعْيُنَكُمْ لَمَّا خَضِعْتُمْ، آپ ان کی گردنوں میں اس کے ملنے جھک گئیں۔
نماز میں خشوع کی نماز میں خشوع کی تاکید قرآن و سنت میں بار بار آئی ہے، قرآن مجید کا ارشاد ہے:
فَقِي حَيْثُ اور نماز قائم کر کے یاد کرنے کے لئے:
اور نماز ہر جگہ غفلت یا ذکر کرنے کی ضد ہو، جو نماز میں اللہ جل شانہ سے غافل ہے وہ اللہ کو یاد کرنے کا
فریضہ ادا نہیں کر رہا۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے:
وَلَا تَكُن مِّنَ الْكَافِرِينَ اور تو فاقول میں سے نہ ہو۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: نماز تو صرف تمسک اور تواضع ہی ہے، جس کا
ظاہری مطلب یہ ہے کہ جب تمسک اور تواضع دل میں نہ ہو تو وہ نماز نہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جس کی نماز اسے بے حیائی اور ہر ایموں سے بے روک سکے وہ اللہ سے
دوری ہوتا ہے، اور غافل کی نماز بے حیائی سے اور ہر ایموں سے نہیں روکتی، معلوم ہوا کہ غفلت
کے ساتھ نماز پڑھنے والا اللہ سے دور ہی ہوتا جاتا ہے۔

امام غزالیؒ نے مذکورہ آیات و روایات اور دوسرے دلائل پیش کر کے فرمایا کہ اگر ان کا یہ تقاضا
ہو کہ خشوع نماز کے لئے شرط ہو، اور نماز کی صحت اس پر موقوف ہو، پھر فرمایا کہ سفیان ثوری، حسن
بصری اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم کا مذہب یہی تھا کہ خشوع کے بغیر نماز ادا نہیں ہوتی، بلکہ فاسق
لیکن ائمہ اربعہ اور مجاہد و فقہاء نے خشوع کو شرط صلوٰۃ قرار نہیں دیا، بلکہ اسے نماز کی روح قرار
دینے کے باوجود صرف اتنا شرط کیا ہے کہ مجاہد و فقہاء کے وقت قلب کو حاضر کر کے اللہ کے لئے نماز کی

نیت کرے، باقی نماز میں اگر شروع حاصل نہ ہو تو اگرچہ اتنی نماز کا ثواب اُسے نہیں ملے گا جتنے حصہ میں شروع نہیں رہا، لیکن فقہ کی رو سے وہ تارکب صلوٰۃ نہیں کہلائے گا، اور نہ اُس پر تعزیر وغیرہ کے وہ احکام مرتب ہوں گے جو تارکب صلوٰۃ پر لگتے ہیں۔

امام غزالیؒ نے اس کی یہ وجہ بیان فرمائی ہے کہ فقہاء باطنی احوال اور قلبی کیفیات پر حکم نہیں لگاتے، بلکہ وہ تو صرف اعضائے ظاہر کے اعمال پر ظاہری احکام بیان کرتے ہیں، یہ بات کہ فلاں عمل کا ثواب آخرت میں ملے گا یا نہیں، یہ فقہ کی حد سے خارج ہے، تو چونکہ باطنی کیفیات پر حکم لگانا ان کی بحث سے خارج ہے، اور شروع ایک باطنی کیفیت ہے، اس لئے انہوں نے شروع کو پوری نماز میں شرط قرار نہیں دیا، بلکہ شروع کے اولی مرتبہ کو شرط کیا، اور وہ یہ کہ کم از کم تکبیر تحریمہ کے وقت بعض اللہ کی عبادت و تعظیم کی نیت کر لے۔

شروع کو پوری نماز میں شرط قرار نہ دینے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ مستقرآن حکیم کی دوسری آیات میں تشریع احکام کا یہ واضح اصول بتا دیا گیا ہے کہ انسانوں پر کوئی ایسی چیز فرض نہیں کی جاتی جو انکی طاقت و امکان سے باہر ہو، اور پوری نماز میں شروع برقرار رکھنے سے ماسوا چند خاص افراد کے اکثر لوگ عاجز ہوتے ہیں، اس لئے تکلیف بالالطاف سے بچنے کے لئے پوری نماز کی بجائے صرف ابتدا و صلوٰۃ میں شروع کو شرط قرار دیا گیا۔

نماز شروع کے بغیر بھی امام غزالیؒ آخر میں ارشاد فرماتے ہیں کہ شروع کی اس غیر معمولی اہمیت کے باوجود بالکل بے فائدہ نہیں ہیں اللہ سے یہی امید کہ غفلت کے ساتھ نماز پڑھو لایہی بالکل تارکب صلوٰۃ کے درجہ میں نہیں کیونکہ ہر حال اُس نے ادا سے فرض کا اقدام تو کیا ہے، اور تھوڑی سی دیر کے لئے قلب کو اللہ کے لئے فانی بھی کیا کہ کم از کم نیت کے وقت تو صرف اللہ ہی کا در حیان تھا، ایسی نماز کا کم سے کم فائدہ یہ ضرور ہے کہ اس کا نام ناسرمانوں اور بے نمازوں کی فہرست سے نکل گیا۔

مگر دوسری حیثیت سے پتہ چلے گا کہ کہیں غافل کی حالت تارکب سے بھی زیادہ بُری نہ ہو، کیونکہ جو غلام آقا کی خدمت میں حاضر ہو کر آقا سے بے توجہی برتنا اور تحقیر آمیز لہجہ میں کلام کرتا ہے اس کی حالت اُس غلام سے زیادہ شدید ہے جو خدمت میں حاضر ہی نہیں ہوتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ معاملہ ہم درجہ کا ہے، عذاب کا خوف بھی ہے اور بخشش کی امید بھی، اس لئے غفلت و تساہل کو چھوڑنے کے لئے اپنی معذور بہر کو بخشش کرتے رہنا چاہئے، وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اذْكُرُوْا النِّعَمَ الَّتِيْ اٰتٰىكُمْ وَرَآءُكُمْ

اے جنی اسرائیل! یاد کرو میرے احسان جو میں نے تم پر کئے اور اس کو کہ میں نے تم کو بڑائی دی

عَلَى الْعَالَمِيْنَ ۝ وَاَتَقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا

تمام عالم پر ۱۰ اور ڈرو اس دن سے کہ اس دن آنے کوئی شخص کسی کے کچھ بھی اور قبول نہ ہو اس کی

شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ۝

طرف سے سفارش اور نہ لیا جائے اس کی طرف سے بدلہ اور نہ اُن کو مدد پہنچے۔

خلاصہ تفسیر ۱۱ اولاد یعقوب! (علیہ السلام) کی تم لوگ میری اس نعمت کو یاد کرو (تاکہ شکر اور اطاعت کی تحریک ہو) جو میں نے تم کو انعام میں دی تھی، اور اس بات کو (یاد کرو)

کہ میں نے تم کو دھام خاص بڑا دیا (تمام دنیا جہان والوں پر فوقیت دی تھی، اور ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے تم کو ایک بڑے حصہ مخلوق پر فوقیت دی تھی) مثلاً اس زمانہ کے لوگوں پر۔

فاصلہ کا :- اس آیت میں خطاب چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودیوں کو ہے، اور عموماً ایسا ہوتا ہے، کہ باپ دادا پر جو احسان و اکرام کیا جائے اس سے اس کی اولاد بھی فائدہ حاصل کرتی ہے، جس کا عام طور پر شاہد ہوتا رہتا ہے، اس لئے ان کو بھی اس آیت میں مخاطب سمجھا جاسکتا ہے۔

اور دوسرے ایسے دن سے کہ (جس میں) نہ تو کوئی شخص کسی شخص کی طرف سے کچھ مطالبہ ادا کر سکتا ہو، اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہو سکتی ہے، جبکہ خود اس شخص میں ایمان نہ ہو جس کی سفارش کرتا ہے، اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی معاوضہ لیا جاسکتا ہے، اور نہ اُن لوگوں کی طرف داری چل سکے گی۔

فاصلہ ۱۲ :- آیت میں جس یوم کا ذکر ہوا اس سے قیامت کا دن مراد ہو، مطالبہ ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کسی کے ذمہ نماز روزہ کا مطالبہ ہو، اور دوسرا کہہ دے کہ میرا نماز روزہ لے کر اس کا حساب بیاں کر دیا جائے، اور معاوضہ یہ کہ کچھ مال وغیرہ داخل کر کے بچالائے، سو دونوں باتیں نہ ہوں گی، اور بدین ایمان کے سفارش قبول نہ ہونے کو جو فرمایا ہے تو اور آیتوں سے معلوم ہو کہ اس کی صورت یہ ہوگی کہ ایسوں کی خود سفارش ہی نہ ہوگی، جو قبول کی گنجائش ہو، اور طرف داری کی صورت یہ ہوگی کہ کوئی زوردار حمایت کر کے زبردستی محال لائے۔

غرض یہ کہ دنیا میں مدد کرنے کے جتنے طریقے ہوتے ہیں بدین ایمان کے کوئی طریقہ بھی نہ ہوگا۔

وَ اِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اِلٰی فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْكُمْ سُوْعَ الْعَذَابِ يُذَيِّقُوْكُمْ

اور یاد کرو اس وقت کہ جبکہ رانی دی ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے جو کہتے تھے تم کو برا عذاب ذبح کرتے تھے

اَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاءَكُمْ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ

تمہارے بیٹوں کو اور زندہ چھوڑتے تھے تمہاری عورتوں کو اور اس میں آزمائش تھی تمہارے رب کی

عَظِيمٌ ۵۱

طرف سے بڑی

خلاصہ تفسیر | اور چون خاص بڑی باتوں کا حوالہ دیا ہے اب یہاں سے اُن کی تفصیل بیان کرنی شروع کی، پہلا معاملہ تو یہ ہے کہ اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب کہ وہائی دی ہم نے تم لوگوں کے آباء و اجداد کو متعلقین فرعون سے جو فکر میں لگے رہتے تھے تمہاری دل آزاری کے، اگلے کاٹتے تھے تمہاری اولاد و ذرہ کے اور زندہ چھوڑ دیتے تھے تمہاری عورتوں کو (لو کیوں کو کہ زندہ رہ کر بڑی عورتیں ہوجائیں) اور اس واقعہ میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارا ایک بڑا بھاری تمنا تھا۔

فائدہ: کسی نے فرعون سے پیشینگوئی کر دی تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا ایسا پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں تیری سلطنت جاتی رہے گی، اس لئے اس نے نوزائیدہ لڑکوں کو قتل کرنا شروع کر دیا، اور چونکہ لڑکیوں سے کوئی اندیشہ نہ تھا اس لئے اُن سے کچھ تعرض نہیں کیا، دوسرے اس میں اس کا اپنا ایک مطلب بھی تھا کہ اُن عورتوں سے مانا ماری اور خدمت گاری کا کام لیتا تھا، سو یہ عنایت بھی اپنے مطلب کے لئے تھی۔

اور اس واقعہ سے یا تو یہ ذبح و قتل مذکور مراد ہے، اور مصیبت میں صبر کا امتحان ہوتا ہے، اور بارہائی دنیا مراد ہے جو کہ ایک نعمت ہے، اور نعمت میں شکر کا امتحان ہوتا ہے، اور اس نجات دینے کی تفصیل آگے بیان فرمائی۔

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ

اور جب بھاڑ دیا ہم نے تمہاری وجہ سے دریا کو پھرنے کا اور تم کو اور فرعون کے لوگوں کو اور تم

تَنْظُرُونَ ۵۱ وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ

دیکھ رہے تھے اور جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے چالیس رات کا پھر تم نے بنایا

الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهَا وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ۵۱

بجھڑا موسیٰ کے بعد اور تم ظالم تھے

خلاصہ تفسیر | اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب کہ شق کر دیا ہم نے تمہارے (رستہ دینے کی) وجہ سے دریا سے شور کو پھر تم نے (ڈوبنے سے) بچا لیا تم کو اور غرق کر دیا متعلقین فرعون

کو (میں فرعون کے) اور تم (اس کا) معائنہ کر رہے تھے۔

فائدہ: یہ نعمت اس وقت ہو کہ موسیٰ علیہ السلام پیدا ہو کر پیغمبر ہو گئے، اور مدتوں فرعون کو سمجھاتے رہے، جب وہ کسی طرح نہ مانا تو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو خفیہ طور پر لے کر یہاں چلے جاؤ، راستہ میں دریا حائل ہوا، اور اسی وقت پہچے سے فرعون بھی مع لشکر آپہنچا حق تعالیٰ کے حکم سے دریا شق ہو گیا اور بنی اسرائیل کو گزرنے کا راستہ مل گیا، یہ تو بار ہو گئے، فرعون کے پیچھے تک دریا اسی طرح رہا، وہ بھی تعاقب کی غرض سے اس میں گھس گیا، اس وقت سب طرف سے دریا سمٹ کر اپنی سابق حالت پر ہو گیا، اور فرعون اور اس کے ساتھی سب ہاں ہی غرق ہو کر ختم ہو گئے۔

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جبکہ وعدہ کیا تھا ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے رتوریت دینے کا ایک مدت گزرنے پر جس میں دس رات کا اضافہ ہو کر چالیس رات کا زمانہ ہو گیا تھا، پھر تم لوگوں نے دستکش کے لئے تجویز کر لیا گو سالہ کو موسیٰ علیہ السلام کے (جانے کے) بعد اور تم نے اس تجویز میں صریح ظلم پر مکر باندھ رکھی تھی، ذکر ایسی بے جا بات کے قائل ہو گئے تھے۔

فائدہ: یہ نعمت اس وقت ہو جب فرعون کے غرق ہونے کے بعد بنی اسرائیل بقول بعض مصر میں واپس آکر پہنچے گئے، یا بقول بعض کسی اور مقام پر ٹھہر گئے تو موسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل نے عرض کیا کہ اب ہم بالکل مطمئن ہو گئے، اگر کوئی شریعت ہمارے لئے مقرر ہو تو اس کو اپنا دستور العمل بنائیں، موسیٰ علیہ السلام کی عرض پر حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ تم کو وہ طور پر آکر ایک مہینہ ہماری عبادت میں مشغول رہو، ایک کتاب تم کو دیں گے، آپ نے ایسا ہی کیا، اور تورات آپ کو مل گئی، مگر دس روز مزید عبادت میں مشغول رہنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک ماہ روزہ رکھنے کے بعد انظار فرمایا تھا، اللہ تعالیٰ کو روزہ دار کے منہ کا راحہ (جو غلو سے معدہ کی تنجیر سے پیدا ہو جاتا ہے) پسند ہوا اس لئے موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ دس روزے اور رکھیں تاکہ وہ راحہ پھر پیدا ہو جائے، اس طرح یہ چالیس روزے پورے ہو گئے، موسیٰ علیہ السلام تو یہاں رہے، اور وہاں ایک شخص سامری نامی تھا اس نے چاندی یا سونے کا ایک بچھڑے کا قالب بنا کر اس کے اندر وہ مثل جو اس نے جبرئیل علیہ السلام کے گھوڑے کے قدم کے نیچے سے اٹھا کر اپنے پاس محفوظ رکھی ہوئی تھی ڈال دی، اُس بچھڑے میں جان پڑ گئی، اور جب بنی اسرائیل نے اس کی پرستش شروع کر دی۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۵۱

پھر معاف کیا ہم نے تم کو اس پر بھی تاکہ تم احسان مانو۔

خلاصہ تفسیر | پھر بھی ہم نے (تمہاری توبہ کرنے پر) درگزر کیا، تم سے اتنی بڑی بات ہوتی

پچھے اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے۔

فائدہ ۱۰۔ اس توبہ کا بیان کنگے کی تیسری آیت میں مذکور ہے، اللہ تعالیٰ کے اس توقع رکھنے کا مطلب نمونہ اللہ یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کو شک تھا، بلکہ طلبتہ ہو کر یہ درگزر کرنا ایسی چیز ہے کہ دیکھنے والوں کو شکر گزاری کی توقع کا گمان ہو سکتا ہے۔

وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۵۶﴾

اور جب دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق کو تافرق سے جدا کرنا والے احکام تاکہ تم سیدھی راہ پاؤ

خلاصہ تفسیر اور دو زمانہ یاد کرو جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (توریت) دی اور فیصلہ کی چیزیں، اس توقع پر کہ تم راہ چلتے رہو۔

فائدہ ۱۱۔ فیصلہ کی چیز یا قرآن احکام شریعیہ کو کہا جو توریت میں لکھے ہیں (کیونکہ) شرع سے نماز اعتقادی اور عملی خستہ لافات کا فیصلہ ہو جاتا ہے، یا معجزوں کو کہا کہ ان سے سچے، جھوٹے دعویٰ کا فیصلہ ہوتا ہے، یا خود توریت ہی کو کہہ دیا کہ اس میں کتاب ہونے کی صفت بھی ہے اور فیصلہ ہونے کی صفت بھی۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يُقَوْمِ إِنَّا كُنَّا نَمُوتُ وَأَنفُسُكُم مَّا تَتَّخِذُونَ الْعَجَلِ فَوَبُّوا إِلَىٰ بَارِعِكُمْ فَأَقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے اے قوم تم نے نقصان کیا اپنا

بہمیشہ بنا کر سو اب توبہ کر اپنے پیدا کرنے والے کی طرف اور مار ڈالو اپنی اپنی جان

ذِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِعِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ هُوَ

یہ بہتر ہے تمہارے لئے تمہارے خالق کے نزدیک پھر متوجہ ہوا تم پر بیشک وہی ہے

التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۵۷﴾

معاف کرنے والا نہایت مہربان۔

خلاصہ تفسیر اور دو زمانہ یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم بے شک تم نے اپنا بڑا نقصان کیا اس کو سالہ پرستی کی جوڑ سے اسوہ تم اب

اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو پھر بعض آدمی رحمتوں نے گوسالہ پرستی نہیں کی، بعض آدمیوں کو (مغفول) نے

گوسالہ پرستی کی (قتل کرو) یہ (عقل و آراء) تمہارے لئے بہتر ہوگا، تمہارے خالق کے نزدیک، پھر اس عقل و آراء کرنے سے، حق تعالیٰ تمہارے حال پر (اپنی عنایت سے) متوجہ ہوئے، بے شک وہ تو ایسے ہی ہیں کہ توبہ قبول کر لیتے ہیں اور عنایت فرماتے ہیں۔

فائدہ ۱۲۔ یہ اس طریق کا بیان ہے جو ان کی توبہ کے لئے تجویز ہوا، یعنی مجرم لوگ قتل کئے جائیں جیسا ہماری شریعت میں بھی بعض گناہوں کی سزا بارجہ توبہ کے بھی قتل و جان ستانی مقرر ہے، مثلاً قتل عمد کے عوض قتل اور ثبوت زنا بالشہادۃ پر رجم، کہ توبہ سے یہ سزا ساقط نہیں ہوتی، چنانچہ ان لوگوں نے اس پر عمل کیا، جس کی وجہ سے آخرت میں مورد رحمت و عنایت ہو گئے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ لِمُوسَىٰ لَنْ نُؤْمِنَ بِكَ حَتَّىٰ نَرَىٰ اللَّهَ بَهْرَةً فَأَخَذْنَا لَكُمْ

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز یقین مذکر ہی تجھے تیرا جب تک کہ نہ دیکھ لیں اللہ کو سامنے پھر آیا

الصُّبْحَةَ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿۵۸﴾

تم کو۔ بجلی نے اور تم دیکھ رہے تھے

خلاصہ تفسیر اور دو زمانہ یاد کرو جب تم لوگوں نے دیوں کہا کہ اے موسیٰ ہم تمہارے کہنے سے ہرگز نہ مانیں گے (کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے) یہاں تک کہ ہم (خود) اللہ تعالیٰ کو علانیہ

طور پر دیکھ لیں، سو اس گستاخی پر تم پر کوکب بجلی کی آپڑی، اور تم اس بجلی کا آنا، آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

فائدہ ۱۳۔ اس کا قصہ اس طرح ہوا تھا کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور سے توریت لا کر

پیش کی، کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، تو بعض گستاخ لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ خود ہم سے کہہ دے کہ یہ

ہماری کتاب ہے، توبہ شک ہم کو یقین آجائے گا، موسیٰ علیہ السلام نے اذان الہی فرمایا کہ کوہ طور پر چلو

یہ بات بھی ہو جائے گی، بنی اسرائیل نے اس کام کے لئے شتر آدمی منتخب کر کے موسیٰ علیہ السلام کے

ساتھ کوہ طور پر روانہ کئے، وہاں پہنچنے پر اللہ تعالیٰ کا کلام ان لوگوں نے خود سنا، تو اس وقت اور رنگ

لائے کہ ہم کو تو کلام سننے سے قناعت نہیں ہوتی، خدا جانے کون بول رہا ہوگا، اگر خدا کو دیکھ لیں تو

بے شک مان لیں، چونکہ دنیا میں کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی قوت نہیں رکھتا، اس لئے اس گستاخی پر ان پر بجلی آپڑی، اور سب ہلاک ہو گئے، رملکت کے متعلق اگلی آیت میں بیان ہے،

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِ مَوْسَىٰ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۵۹﴾

پھر اٹھا کر آیا ہم نے تم کو مر گئے پچھے تاکہ تم احسان مانو۔

خلاصہ تفسیر

پھر ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے) تم کو زندہ کر اٹھایا تمہارے مرجانے کے بعد اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے۔

فائدہ:۔ موت کے لفظ سے ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس پہل سے مر گئے تھے، اُن کے دوبارہ زندہ کئے جانے کا قصہ یہ ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ بنی اسرائیل میں ہی برگران رہتے ہیں، اب وہ یہ سمجھیں گے کہ میں نے اُن کو کہیں لیا کر کس تدبیر سے ان کا کام تمام کر دیا ہوگا، پھر اس جہت سے محفوظ رکھے، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اُن کو پھر زندہ کر دیا۔

وَلَقَدْ نَاغَلَيْكُمْ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّاءَ وَالسَّلْوَىٰ

اور سایہ کیا ہم نے تم پر ابر کا اور آٹا مَنّ اور سَلْوٰی
کُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ
کھا رہے تھے چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں اور انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہ کیا بلکہ اپنا ہی

يُظْلِمُونَ ﴿۵۷﴾

نقصان کرتے رہے

خلاصہ تفسیر

اور سایہ لگن کیا ہم نے تم پر ابر کو (میدانِ قیہ میں) اور (خزائنِ غیب سے) پہنچایا ہم نے تمہارے پاس ترنجبین اور بھیرس اور مَنّ کو (اجازت دی کہ) کھاؤ غلیں چیزوں سے جو کہ ہم نے تم کو دی ہیں، اور وہ لوگ اس میں بھی خلافِ بات کر رہے (اور اس سے) انہوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا، لیکن اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

فائدہ:۔ دونوں قصے وادیِ قیہ میں واقع ہوئے، وادیِ قیہ کی حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا اصلی وطن ملک شام ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے وقت میں مصر آئے تھے، اور یہاں ہی رہ پڑے، اور ملک شام میں عاتق نامی قوم کا تسلط ہو گیا، فرعون جب غرق ہو گیا اور یہ لوگ مطمئن ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ کا ان کو حکم ہوا کہ عاتق سے چاد کرو اور اپنی اہلِ جگہ کو اُن کے قبضہ سے چھڑالو، بنی اسرائیل اس ارادہ پر مقرر ہوئے، اور اُن کی حدود میں پہنچ کر جب عاتق کے زور و قوت کا حال معلوم ہوا تو جہتِ اُردیشیہ اور چارہ سے صاف انکار کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس انکار کی یہ سزا دی کہ چالیس برس تک ایک میدان میں سرگرداں و پریشان پھرتے رہے، گھر پہنچنا بھی نصیب نہ ہوا۔ یہ میدان کچھ بہت بڑا رقبہ نہ تھا، بلکہ مقرر اور شام کے درمیان پانچ چھ کوس یعنی تقریباً دس میل

کا رقبہ تھا، روایت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے وطن مقرر جانے کے لئے دن بھر سفر کرتے، اور رات کو کسی منزل پر اترتے صبح کو دیکھتے کہ جہاں سے چلے آئے وہیں ہیں، اسی طرح چالیس سال سرگرداں و پریشان اس میدان میں پھرتے رہے، اسی لئے اس میدان کو وادیِ قیہ کہا جاتا ہے، قیہ کے معنی ہیں سرگرداں اور پریشان ہونے کا۔ وادیِ قیہ ایک کھلا میدان تھا، نہ اس میں کوئی عمارت تھی نہ درخت، جس کے نیچے دھوپ اور سردی اور گرمی سے بچا جاسکے، اور نہ یہاں کوئی کھانے پینے کا سامان تھا، نہ پہننے کے لئے لباس، مگر اللہ تعالیٰ نے معجزہ کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اسی میدان میں اُن کی تمام ضروریات کا انتظام فرما دیا، بنی اسرائیل نے دھوپ کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے ایک سفید رقیق ابر کا سایہ کر دیا، اور بھوک کا تقاضا ہوا تو مَنّ و سلوٰی نازل فرما دیا، یعنی درختوں پر ترنجبین جو ایک شیریں چیز بکثرت پیدا کر دی، یہ لوگ اس کو جمع کر لیتے، اس کو مَنّ کہا گیا ہے، اور بھیرس اُن کے پاس جمع ہو جاتیں، اُن سے بھائی نہ تھیں، یہ اُن کو کپڑے دیتے، اور ذبح کر کے کھاتے، اسی کو سلوٰی کہا گیا ہے، یہ لوگ دونوں لطیف چیزوں سے پیٹ بھر لیتے، چونکہ ترنجبین کی کثرت معمول سے زائد تھی، اور بھیرس کا وحشت نہ کرنا یہ بھی معمول کے خلاف ہو، لہذا اس جلیبت سے دونوں چیزیں خزانہ غیب سے نکل کر آ رہی تھیں، اُن کو بانی کی ضرورت پیش آئی تو موسیٰ علیہ السلام کو ایک پتھر پر لکھی مارنے کا حکم دیا گیا اس پتھر سے چٹے پتھر پڑے، جیسا کہ دوسری آیات قرآنی میں مذکور ہے، ان لوگوں نے رات کی اندھیری کا شکوہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے غیب سے ایک روشنی عمودی شکل میں ان کے محلّہ کے درمیان قائم فرما دی، کپڑے میلے ہوئے اور پھٹنے لگے اور لباس کی ضرورت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے بطور اعجاز یہ صورت کر دی کہ اُن کے کپڑے نہ میلے ہوں نہ پھٹیں اور بچوں کے بدن پر جو کپڑے ہیں وہ ان کے بدن کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس مقدار سے بڑھتے رہیں۔ (تفسیر مستطبی)

اور اُن لوگوں کو یہ بھی حکم ہوا تھا کہ بقدر خرچ لے لیا کریں، آئندہ کے لئے جمع کر کے نہ رکھیں مگر ان لوگوں نے حرص کے ماسے اس میں بھی خلاف کیا، تو رکھا ہوا گوشت سڑنا شروع ہو گیا، اسی کو فرمایا ہے کہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ فَبُغِلُوا مِنْهَا حَتَّىٰ شَبَّخُمْ

اور جب ہم نے کہا داخل ہو اس شہر میں اور کھاتے پھرو اس میں جہاں چاہو

رَغَدًا وَأَدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَتَكُمْ

خراغت سے اور داخل ہو دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے اور کہتے جاؤ بخدا تو بخدا کر دے تمہارے گناہوں کو

وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵۸﴾

اور زیادہ بھی دیں گے نیک والوں کو

خلاصہ تفسیر اور وہ زمانہ یاد کرو جب ہم نے حکم کیا کہ تم لوگ اس آبادی کے اندر داخل ہو پھر کھاؤ اس کی چیزوں میں سے جس جگہ تم رغبت کر دے بھلائی سے، اور یہ بھی حکم دیا کہ جب اندر جانے لگو تو دروازہ میں داخل ہونا عاجزی سے، جھکے جھکے اور زبان سے یہ کہتے جانا کہ توبہ ہے (توبہ ہے) ہم معاف کر دیں گے تمہاری (پچھلی) خطائیں تو سب کی، اور مزید برآں اور دیں گے دل سے نیک کام کرنے والوں کو۔

فائدہ بقول شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ فقرہ بھی زمانہ وادی تیرہ کا ہے کہ جب من و سلوی کھاتے کھاتے اُٹھ گئے اور اپنے معمولی کھانے کی درخواست کی جیسا آگے کی چوتھی آیت میں آیا ہے، تو ان کو ایک شہر میں جانے کا حکم ہوا تھا، کہ وہاں کھانے پینے کی اور معمولی چیزیں ملیں گی، سو یہ حکم اس شہر کے اندر جانے کے متعلق ہے، اس میں قولی اور فعلی ادب داخل ہونے کے متعلق بیان کیا گیا، اور اندر جا کر کھانے پینے میں توسیع کی گئی، اس قول پر بہت سے بہت یہ کہا جاسکے گا کہ قصہ کے بیان میں تقدم و تاخير ہو گیا، کہ بعد کا قصہ پہلے بیان ہوا اور پہلے کا بعد میں، تو یہ اشکال اُس وقت ہوتا جب قرآن مجید میں خود قصوں کا بیان کرنا مقصود اصلی ہوتا، اور جب نظر نتائج پر ہے تو اگر ایک قصہ کے اجزاء میں ہر جزو کا نتیجہ جدا ہو، اور اُن نتائج کے کسی اثر کا لحاظ کر کے جزو مقدم کو مؤخر اور جزو مؤخر کو مقدم کر دیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ ہے، اور کوئی اشکال دیگر مفتخرین حضرات نے اس حکم کو اس شہر کے متعلق سمجھا ہے جس پر جہاد کرنے کا حکم ہوا تھا، اور بعد مدت تیرہ کے پھر اس پر جہاد ہوا، اور وہ فتح ہوا، اس وقت یوشع علیہ السلام نبی تھے، یہ حکم ان کی معرفت اس شہر کے بارے میں ہوا تھا۔

قول ازل کی بناء پر پچھلی خطاؤں میں وہ درخواست بھی داخل کر لینا مناسب جزو من و سلوی چھوڑ کر معمولی کھانوں کے متعلق کی گئی تھی، مطلب یہ ہو گا کہ یہ درخواست تھی گوستاخی، لیکن خیر اب اگر اس ادب اور حکم کو بجالائے تو اس کو محاف کر دیں گے، اور ہر قول پر یہ معافی تو سب کہنے والوں کے لئے عام ہوگی، اور جو اخلاص سے اعمال صالحہ کریں گے اُن کا انعام اس کے علاوہ ہے۔

قَبَلُ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنزَلْنَا عَلَىٰ

پھر بدل ڈالا ظالموں نے بات کو خلاص اس کے کہ جو کہہ دی گئی تھی ان سے پھر اُتارا ہم نے

الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿۵۹﴾

ظالموں پر عذاب آسمان سے اُن کی عدول حکمی پر۔

خلاصہ تفسیر اس بدل ڈالا اُن ظالموں نے ایک اور طرح خلاص تھا اس کلمہ کے جس کے کہنے کی اُن سے فرمائش کی گئی تھی، اس پر ہم نے نازل کی ان ظالموں پر ایک سادی آفت اس وجہ سے کہ وہ عدول حکمی کرتے تھے۔

فائدہ ۱۔ یہ آیت آیت سابقہ کا تتمہ ہے، وہ کلمہ خلاص یہ تھا کہ جُطَّةٌ یعنی توبہ کی حسبِ گوارا ہر شخص جُطَّةٌ فی شَعْوَرَةٍ (یعنی غمزداریاں جو کہ) کہنا شروع کیا، وہ آفت ساری طاعون تھا، جو حدیث کی رو سے بے حکموں کے لئے عذاب اور حکمراہوں کے لئے رحمت ہے، اس شرارت کی اُن کو یہ سزا ملی کہ ان میں طاعون پھوٹ پڑا اور بہت سے آدمی فنا ہو گئے، بعضوں نے ہلاک شدگان کی تعداد ستر ہزار تک بتائی ہے۔ (قرطبی)

معارف و مسائل

کلام میں لفظی تغیر و تبدل اس آیت سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس شہر میں جُطَّةٌ کا حکم شریعی یعنی توبہ توبہ کہتے ہوئے داخل ہوں، انھوں نے شرارت سے ان الفاظ کو یہ لکر جُطَّةٌ کہنا اختیار کیا، اس کی وجہ سے اُن پر آسمانی عذاب نازل ہوا، یہ الفاظ کی تبدیلی ایسی تھی کہ جس میں صرف الفاظ ہی نہیں بدلے، بلکہ معنی بھی بالکل الٹ گئے، جُطَّةٌ کے معنی توبہ یعنی من ہوں کو نظر انداز کرنے کے تھے، اور جُطَّةٌ کے معنی گندم کے ہیں، جس کا کلمہ مامور یہاں کوئی تعلق نہیں الفاظ کی ایسی تبدیلی خواہ مسترآن میں ہو یا حدیث میں، یا اور کسی امر الہی میں بلاشبہ اور بالاتفاق حرام ہے، کیونکہ یہ ایک قسم کا ستمنازی یا تحریف ہے، اسی پر یہ عذاب نازل ہوا۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ معنی اور مقصود کو محفوظ رکھتے ہوئے صرف الفاظ کی تبدیلی کا کیا حکم ہے؟ امام قسطلانی نے اپنی تفسیر میں اس کے متعلق فرمایا ہے کہ بعض کلمات اور اقوال میں معنی کی تصریح الفاظ بھی مقصود اور ادب عبارت کے لئے ضروری ہوتے ہیں، ایسے اقوال میں لفظی تبدیلی بھی جائز نہیں، جیسے اذان کے الفاظ مقررہ کے بجائے اسی معنی کے دوسرے الفاظ پڑھنا جائز نہیں، اسی طرح نماز میں جو دعائیں مثلاً سبحانک ایلہم، النجیات، دعائے قنوت، یا تسبیحات رکوع و سجود جن الفاظ سے منقول ہیں انہیں الفاظ میں اور اگر نا ضروری ہے، دوسرے الفاظ میں اگرچہ معنی وہی محفوظ رہیں مگر تبدیلی جائز نہیں، اسی طرح تمام مسترآن کریم کے الفاظ کا یہی حکم ہے، کہ تلاوت قرآن سے جو احکام

متعلق ہیں وہ صرف اپنی الفاظ کے ساتھ ہیں، جو قرآن کریم کے نازل ہوئے ہیں، اگر کوئی ان الفاظ کا ترجمہ دوسرے لفظوں میں کر کے پڑھے جس میں معنی بالکل محفوظ رہیں اس کو اصطلاح شریعت میں تلاوت قرآن نہ کہا جائے گا، اور نہ اس پر وہ ثواب حاصل ہوگا جو قرآن پڑھنے پر مقرر ہے کہ ایک حرف پر دس نیکیاں بھی جاتی ہیں، کیونکہ قرآن صرف معنی کا نام نہیں بلکہ معنی اور الفاظ نازل شدہ کے مجموعہ کو قرآن کہا جاتا ہے۔

آیت مذکورہ میں تَبَدَّلَ الْكَلِمَاتِ لَمْ يَغْيِرْ الْقَوْلَ قَوْلًا لَّهُمْ کے الفاظ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو تو یہ کہنے سے جو الفاظ جملہ کے بتلائے گئے تھے یہ الفاظ بھی ماحول تھے، ان کا بدلنا خود بھی گناہ تھا، پھر تبدیلی ایسی کر دی کہ معنی ہی الٹ گئے، اس لئے عذاب آسمانی کے مستحق ہو گئے۔

لیکن جن اقوال اور کلمات میں اصل مقصود معنی ہی ہیں، الفاظ مقصور نہیں ان میں اگر لفظی تبدیلی ایسی کی جائے کہ معنی پر کوئی اثر نہ پڑے وہ پوری طرح محفوظ رہیں تو جہور محدثین اور فقہاء کے نزدیک یہ تبدیلی جائز ہے، بعض حضرات محدثین حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسی لفظی تبدیلی کو بھی جائز نہیں کہتے، مستشرقین نے امام مالک، شافعی، امام اعظم ابو حنیفہ سے نقل کیا ہے کہ حدیث میں روایت بالمعنی بھی جائز ہے، مگر مشرطیہ ہے کہ روایت کرنے والا عربی زبان کا ماہر اور مواقع خطاب اور جس ماحول میں حدیث وارد ہوئی ہے اس سے پوری طرح واقف ہو، تاکہ اس کی غلطی سے معنی میں فرق نہ آجائے۔

اور ائمہ حدیث کی ایک جماعت جس طرح الفاظ حدیث سے ہیں اسی طرح نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں، کوئی لفظی تغیر و تبدل جائز نہیں رکھتے، محمد بن سیرین، قاسم بن محمد وغیرہ حضرات کا بھی یہی مسلک ہے، یہاں تک کہ ان میں سے بعض حضرات کا قائل یہ ہے کہ اگر راوی حدیث نے کوئی لفظ نقل کرنے میں کوئی لغوی غلطی بھی کی ہے تو اس سے سننے والے کو اس غلطی کے ساتھ روایت کرنا چاہئے اپنی طرف سے تغیر نہ کرے، اس کے ساتھ یہ ظاہر کرنے کے میرے خیال میں صحیح لفظ اس طرح ہے، مگر مجھے روایت اس طرح پہنچی ہے، ان حضرات کا استدلال اس حدیث سے ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ تلقین فرمائی تھی کہ جب سونے کے لئے بستر پر جائے تو یہ دعا پڑھے، اَللّٰهُمَّ بِنِكَاحِكَ الَّذِي بِنِيَّ اَنْزَلْتَ وَبِنِكَاحِكَ الَّذِي اَرْسَلْتَ، اس شخص نے تَبَدَّلَ کی جگہ وَبِنِكَاحِكَ پڑھ دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی ہدایت فرمائی کہ لفظ بِنِكَاحِكَ پڑھا کرے جس سے معلوم ہوا کہ لفظی تبدیلی بھی جائز نہیں۔

اسی طرح ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

نَهَى اللَّهُ امْرَأَتَيْهِ تَتَّبِعُهُمَا كَمَا تَتَّبِعُهُمَا
فَبَدَّلَ امْرَأَتَا بَدَلًا
فَبَدَّلَ امْرَأَتَا بَدَلًا
فَبَدَّلَ امْرَأَتَا بَدَلًا

اس سے بھی ظاہر ہے کہ جن الفاظ سے سننا تھا اپنی لفظوں سے پہنچانا مراد ہے۔
مگر جہور محدثین اور فقہاء کے نزدیک اگرچہ اولیٰ اور افضل تو یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے حدیث کی روایت میں ٹھیک وہی الفاظ نقل کرے جو سنئے ہیں، اپنے قصد سے ان میں تبدیلی نہ کرے، لیکن اگر وہ الفاظ پوری طرح یاد نہیں ہے تو ان کا مفہوم اپنے الفاظ میں نقل کر دینا بھی جائز ہے، اور حدیث بلخبا کما سمعہما کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جو مضمون سننا ہو وہی بعینہ نقل کر دے، اس کے مفہوم میں کوئی منہ رقی نہ آئے، الفاظ کی تبدیلی اس کے منافی نہیں، امام قرطبی نے اس کی تائید میں مسرایا کہ خود ہی حدیث اس کی دلیل ہے کہ الفاظ کی تبدیلی بضرورت جائز ہے، کیونکہ خود اس حدیث کی روایت ہی ہم تک مختلف الفاظ سے پہنچی ہے۔

اور پہلی حدیث میں جو لفظ رسول اللہ کے بجائے نَبِيٍّ ہی پڑھنے کا امر فرمایا، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لفظ نبی میں صفت مدح بہ نسبت رسول کے زیادہ ہے، کیونکہ رسول کا لفظ تو قائل کے معنی میں دوسروں کے لئے بھی بولا جاتا ہے، بخلاف لفظ نبی کے کہ وہ خاص اسی منصب کیلئے استعمال ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے مخصوص بندوں کو بذریعہ وحی خطاب کرنے کا عطا کیا جاتا ہے۔

اور دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے، کہ دعاؤں میں الفاظ منقولہ کا اتباع خواص و آثار کے اعتبار سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، دوسرے الفاظ میں وہ خاصیت نہیں رہتی (قرطبی) اسی کو عامل حضرات جو تعویذ گنڈے کرتے ہیں وہ اس کی بڑی رعایت کرتے ہیں کہ جو الفاظ منقول ہیں ان میں تغیر و تبدل نہ کیا جائے، اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ادعیہ ماثورہ بھی اسی قسم ازل میں داخل ہیں جن میں معنی کے ساتھ الفاظ مخصوصہ کی حفاظت بھی مقصود ہے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

وَإِذْ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ

اور جب ہانی مانگا موسیٰ نے اپنی قوم کے واسطے تو ہم نے کہا مار اپنے عصا کو پتھر پر

فَإِنْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَ نَاقَةً فَلَمَّا ظَنَّ أَنَّهُمْ كَلَّ أُنَاسٌ مِّنْهُمْ

سو بہہ نکلے اس سے بارہ چٹے، پہچان لیا ہر قوم نے اپنا گھاٹ۔

كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝۱۰

کھاؤ اور پو اور پو اللہ کی روزی اور نہ پھر ملک میں فساد بجائے ۔

خلاصہ تفسیر اور وہ زمانہ یاد کرو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی کی دعا مانگی، اپنی قوم کے واسطے، اس پر ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے اس عصا کو فلان پتھر پر مارو اس سے پانی نکل آوے گا، پس (عصا پتھر پر مارنے کی دیر نہیں) فوراً اس سے بارہ چٹے پھوٹ نکلے، (اور بنی اسرائیل کے بھی بارہ ہی خاندان تھے، چنانچہ ہر گھرانے اپنے پانی پینے کا موقع معلوم کر لیا اور ہم نے یہ نصیحت کی کہ کھانے کو کھاؤ اور (پینے کو) پو اللہ تعالیٰ کے رزق سے اور حذر (اعتدال) سے مت بکلو، فساد (رفتنہ) کرتے ہوئے سر زمین میں۔

فائل کا۔ یہ قصہ بھی دادی تہ میں ہوا، وہاں پیاس لگی تو پانی مانگا، موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو ایک خاص پتھر کو صرف عصا مارنے سے قدرت خداوندی سے بارہ چٹے نکل پڑے، اور ان کے بارہ خاندان اس طرح تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ فرزند تھے، ہر ایک کی اولاد کا ایک ایک خاندان تھا، ان کو انتظامی معاملات میں الگ الگ ہی رکھا جاتا تھا، سب کے انسر بھی جدا جدا تھے، اس لئے چٹے بھی بارہ ہی نکلے۔

کھانے سے مراد من و سلوٹی اور پینے سے مراد پانی تھا، اور ناشربانی اور ترک احکام کو فساد و فساد سے تعبیر فرمایا۔

قاصی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسے خوارق (اور معجزات) کا انکار ہیبت بڑی غلطی ہوا، جب بعض پتھروں میں اللہ تعالیٰ نے بیداد قیاس اور خلاف عقل یہ تاثیر رکھی ہے کہ لوہے کو جذب کرتا ہے تو اس پتھر میں اگر یہ تاثیر پیدا کر دی ہو کہ احسن اہل زمین سے پانی کو جذب کر لے اور اس سے پانی نکلنے لگے تو کیا محال ہے۔

ہمارے زمانے کے عقلاء کو اس بیان سے سبق چل کرنا اور فائدہ اٹھانا چاہئے، اور پھر یہ نظریہ محض سطحی فکر والوں کے لئے ہے، ورنہ خود اگر اس پتھر کے اجزاء ہی میں پانی پیدا ہو جائے تو ہمیں کونسا محال لازم آتا ہے، جو حضرات ایسے امور کو محال کہتے ہیں تو اللہ وہ اب تک محال کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھے۔

معارف مسائل

آیت مذکورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے ہتسقا کی دعا نشر مانی،

اللہ تعالیٰ نے پانی کا سامان کر دیا، کہ پتھر پر لائیں مارنے سے چٹے ابل پڑے، اس سے معلوم ہوا کہ ہتسقا کی اصل دعا ہی ہے، شریعت موسویہ میں بھی صرف دعا پر انتقا کیا گیا، جیسا کہ امام اعظم ابو حنیفہ کا ارشاد ہے کہ ہتسقا کی اصل پانی کے لئے دعا کرنا ہے، یہ دعا بھی خاص نماز ہتسقا کی صورت میں کی گئی ہے، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز ہتسقا کے لئے عید گاہ کے میدان میں نشر لینے جانا اور نماز اور خطبہ اور دعا کرنا منقول ہے، اور کہیں ایسا ہی ہوا کہ بغیر کسی خاص نماز کے صرف دعا پر انتقا کیا گیا، جیسا کہ صحیحین میں حضرت انس کی روایت منقول ہے کہ خطبہ جمعہ ہی میں آپ نے دعا فرمائی، اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمادی۔

اور یہ بات سب کے نزدیک مسلم ہے کہ ہتسقا خواہ بصورت نماز کیا جائے، یا صرف دعا کی صورت میں اس کے موثر ہونے کے لئے گناہوں سے توبہ اپنے فقر و مسکنت اور عیوبیت کا اظہار ضروری ہے، گناہوں پر اصرار اور اللہ تعالیٰ کی انسرمانیوں پر قائم رہتے ہوئے تاثیر دعا کے انتظار کا کس کو حق نہیں اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے یوں بھی قبول انسر مائیں، ان کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَمُوسَىٰ لَنْ نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ

اور جب کہا تم نے اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہ کریں گے ایک ہی طرح کے کھانے پر سو دعا مانگ ہمارا خدا

يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا

ایسی درجہ درجہ کھال دے ہمارا واسطے جو اُگتا ہے زمین سے ترکاری اور گلہری اور گیہوں

وَعَدَئِهَا وَبَصِلِهَا قَالِ اتَّسَبُّدُ لَوْنِ الَّذِي هُوَ أَذْنِي بِالْأَنِي

اور مسرور اور پیاد، کہا موسیٰ نے کیا لینا چاہتے ہو وہ چیز جو ادنیٰ ہے اس کے بدلہ میں جو

هُوَ خَيْرٌ لَّاهِطُوا مَصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مِمَّا سَأَلْتُمْ وَصُرِبَتْ عَلَيْهِمُ

بہتر ہے، انہو کسی شہر میں تو تم کو ملے جو مانگتے ہو اور ڈالی گئی ان پر ذلت

الدَّيْلَةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُ وَبَغْضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَلِذَلِكَ بِأَنَّهُمْ

اور محتاجی اور پھر اللہ کا غصہ لے کر یہ اس لئے ہوا کہ

كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيَّاتِ بِغَيْرِ الْحَقِّ

جہیں مانتے تھے احکام خداوندی کو اور خون کرتے تھے پیغمبروں کا ناحق،

كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۖ

کھاؤ اور پو اور پو اللہ کی روزی اور نہ پھر ملک میں فساد بجائے ۔

خلاصہ تفسیر اور وہ زمانہ یاد کرو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی کی دعا مانگی، اپنی قوم کے واسطے، اس پر ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے

اس عصا کو فلان پتھر پر مارو اس سے پانی نکل آوے گا، پس عصا پتھر پر مارنے کی دیر نہیں، فوراً اس سے بارہ چٹے پھوٹ نکلے، اور بنی اسرائیل کے بھی بارہ ہی خاندان تھے، چنانچہ ہر گھرانے اپنے پانی پینے کا موقع معلوم کر لیا اور ہم نے یہ نصیحت کی کہ کھانے کو کھاؤ اور (پینے کو) پو اللہ تعالیٰ کے رزق سے اور حذر (اعتدال) سے مت بکھو، فساد (دفتہ) کرتے ہوئے سر زمین میں۔

فائل کا۔ یہ قصہ بھی دادی تیرہ میں ہوا، وہاں پیاس لگی تو پانی مانگا، موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو ایک خاص پتھر کو صرف عصا مارنے سے قدرت خداوندی سے بارہ چٹے نکل پڑے، اور ان کے بارہ خاندان اس طرح تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ فرزند تھے، ہر ایک کی اولاد کا ایک ایک خاندان تھا، ان کو انتظامی معاملات میں الگ الگ ہی رکھا جاتا تھا، سب کے انسر بھی جدا جدا تھے، اس لئے چٹے بھی بارہ ہی نکلے۔

کھانے سے مراد من و سلوٹی اور پینے سے مراد پانی تھا، اور انسرائی اور ترکب احکام کو تنہا و فساد سے تعبیر فرمایا۔

قاصی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسے خوارق (اور معجزات) کا انکار ہیبت بڑی غلطی ہوا، جب بعض پتھروں میں اللہ تعالیٰ نے بیداد قیاس اور خلاف عقل یہ تاثیر رکھی ہے کہ لوہے کو جذب کرتا ہے تو اس پتھر میں اگر یہ تاثیر پیدا کر دی ہو کہ احسن اہل زمین سے پانی کو جذب کر لے اور اس سے پانی نکلنے لگے تو کیا محال ہے۔

ہمارے زمانے کے عقلاء کو اس بیان سے سبق چل کرنا اور فائدہ اٹھانا چاہئے، اور پھر یہ نظریہ محض سطحی فکر والوں کے لئے ہے، ورنہ خود اگر اس پتھر کے اجزاء ہی میں پانی پیدا ہو جائے تو ہمیں کونسا محال لازم آتا ہے، جو حضرات ایسے امور کو محال کہتے ہیں تو اللہ وہ اب تک محال کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھے۔

معارف مسائل

آیت مذکورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے ہتسقا کی دعا انسرائی،

اللہ تعالیٰ نے پانی کا سامان کر دیا، کہ پتھر پر لاٹھی مارنے سے چٹے ابل پڑے، اس سے معلوم ہوا کہ ہتسقا کی اصل دعا ہی ہے، شریعت موسویہ میں بھی صرف دعا پر انتقا کیا گیا، جیسا کہ امام اعظم ابو حنیفہ کا ارشاد ہے کہ ہتسقا کی اصل پانی کے لئے دعا کرنا ہے، یہ دعا بھی خاص نماز ہتسقا کی صورت میں کی گئی ہے، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز ہتسقا کے لئے عید گاہ کے میدان میں تشریف لے جانا اور نماز اور خطبہ اور دعا کرنا منقول ہے، اور کبھی ایسا ہی ہوا کہ بغیر کسی خاص نماز کے صرف دعا پر انتقا کیا گیا، جیسا کہ صحیحین میں حضرت انس کی روایت منقول ہے کہ خطبہ جمعہ ہی میں آپ نے دعا فرمائی، اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمادی۔

اور یہ بات سب کے نزدیک مسلم ہے کہ ہتسقا خواہ بصورت نماز کیا جائے، یا صرف دعا کی صورت میں اس کے موثر ہونے کے لئے گناہوں سے توبہ اپنے فقر و مسکنت اور عیوبیت کا اظہار ضروری ہے، گناہوں پر اصرار اور اللہ تعالیٰ کی انسرائیوں پر قائم رہتے ہوئے تاثیر دعا کے انتظار کا کس کو حق نہیں اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے یوں بھی قبول انسرائیوں، ان کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ

اور جب کہا تم نے اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہ کریں گے ایک ہی طرح کے کھانے پر سو دعا مانگ رہا کرو اسلئے

يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَآئِهَا وَفُومِهَا

اپنے درجہ کے نکال دے ہمارے واسطے جو اُگتا ہے زمین سے ترکاری اور گلہری اور گیہوں

وَعَدَآئِهَا وَبَصِلِيمَا قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنٰى بِالَّذِي هُوَ

اور مسور اور پیاز، کہا موسیٰ نے کیا لینا چاہتے ہو وہ چیز جو ادنیٰ ہے اس کے بدلہ میں جو

هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ أَهْلِي طَوَامِصًا فَإِنَّ لَكُمْ مِمَّا سَأَلْتُمْ وَصُرِبْتُمْ عَلَيْهِمْ

بہتر ہے، انہو کسی شے میں تو تم کو ملے جو مانگتے ہو اور ڈالی گئی ان پر ذلت

الدِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُ وَبِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَلِذَلِكَ يَأْتِيهِمْ

اور محتاجی اور پھر اللہ کا غصہ لے کر یہ اس لئے ہوا کہ

كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيَّاتِ بِغَيْرِ الْحَقِّ

جہیں مانتے تھے احکام خداوندی کو اور خون کرتے تھے پیغمبروں کا ناحق،

ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿۱۱﴾

یہ اس لئے کہ انہیں مان تھے، اور حد پر نہ رہتے تھے۔

خلاصہ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ اسے موسیٰ (روز کے روز) ہم ایک ہی جسم کے کھانے پر کبھی نہ رہیں گے، (یعنی من و سلویٰ پر) آپ ہمارے واسطے اپنے پیر و گار سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لئے ایسی چیزیں پیدا کریں جو زمین میں اگلا کرتی ہیں، اسگاہ وہاں گلوئی (ہوئی) (گیہوں) (ہو) (مسور رہوئی) (پیاز) (رہوئی) آپ نے فرمایا کیا تم عوض میں لینا چاہتے ہو، (دونوں) درجہ کی چیزوں کو ایسی چیز کے مقابلہ میں جو اعلیٰ درجہ کی ہے، (اچھا اگر نہیں مانتے تو کسی شہر میں (جا کر) اترو (وہاں) البتہ تم کو وہ چیزیں ملیں گی جن کی تم درخواست کرتے ہو اور ایسی ایسی گستاخیوں سے ایک زمانہ میں جا کر نقش کی طرح) (تم مٹی آن پر زلت دے دو سروں کی بجگاہ میں قدر نہ رہی) اور پستی رکھو خود ان کی طبائع میں اول و پسری نہ رہی) اور سخت ہو گئے غضب آگہی کے (اور) یہ (ذلت و غضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ وہ لوگ جاتے تھے احکام الہیہ کے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو (کہ وہ قتل خود ان کے نزدیک بھی) (ناحق) (ہوتا تھا) اور (زیر) یہ (ذلت و غضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ ان لوگوں نے اطاعت نہ کی، اور دائرہ (اطاعت) سے بھل بھل جاتے تھے۔

فائدہ:۔ یہ قصہ بھی وادی تیبہ کا ہے، من و سلویٰ سے انکار ان زکاریوں اور غلوں کی درخواست کی، اس میدان کے داخل حدود میں کوئی شہر آباد تھا، وہاں جا کر رہنے کا حکم ہوا کہ بود و بتو کھا و کماؤ۔

اور منجملہ ذلت و مسکنت کے یہ بھی ہے کہ یہودیوں سے سلطنت قرب قیامت تک کیلئے چھین لی گئی، البتہ بالکل قیامت کے قریب محض لیڈروں کا سا بے ضابطہ تھوڑا زور و شور و جہال یہودی کا کل چالیس دن کے لئے ہو جاتا تھا، اور اس کو کوئی عاقل سلطنت نہیں کہہ سکتا، اور ان کو یہ بات موسیٰ علیہ السلام کی معرفت جتلا دی گئی تھی، کہ اگر بے حکمی کر دے گے تو ہمیشہ دوسری قوموں کے محکوم رہو گے، جیسا کہ سورہ اعراف کی آیت: **وَاِذْ نَادَيْنَا رَبَّكَ لِيُخَلِّقَ عَلَيْنَا مِثْلَ بَنِي إِسْرَءٰلَ** (۱۱۰: ۷) میں مذکور ہے، (موجودہ اسرائیل حکومت کی حیثیت بھی امریکہ اور برطانیہ کے غلام سے زیادہ کچھ نہیں)۔

اور بہت سے پیغمبر مختلف اوقات میں یہودیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، جس کو وہ لوگ بھی دل میں سمجھتے تھے کہ ہمارا یہ فعل ناحق ہے، لیکن غنا و اور ضد نے اندھا بنا کر کھا تھا۔

معارف و مسائل

یہودیوں پر اہل ذلت کا مطلب اور اسرائیل آیات مذکورہ میں یہود کی سزا و نیا میں دائمی ذلت و مسکنت کی موجودہ حکومت سے مشابہ اور اس کا جواب اور دنیا و آخرت میں غضب الہی کو بیان کیا گیا ہے۔

ان کی دائمی ذلت و مسکنت کا مفہوم جو ائمہ تفسیر صاحبہ و تابعین سے منقول ہے، اس کا خلاصہ ابن کثیرؒ کے الفاظ میں یہ ہے کہ لَا يَزَالُ الَّذِينَ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنْ وَجْهِهِمْ اسْتَفْزَافًا عَلَيْهِمُ الصَّغَارُ یعنی وہ کہتے ہی مالدار بھی ہو جائیں ہمیشہ تمام اقوام میں ذلیل و حقیر ہی رہے جائیں گے، جن کے ہاتھ لگیں گے ان کو ذلیل کرے گا، اور ان کی پر غلامی کی علامتیں لگائے گا۔

امام تفسیر ضحاک ابن مزاحمؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ان کی ذلت و مسکنت کا یہ مفہوم نقل کیا ہے کہ ہم اهل القبالات یعنی الجزية، مطلب یہ ہے کہ یہودی ہمیشہ دوسروں کی غلامی میں رہیں گے، ان کو ٹیکس وغیرہ ادا کرتے رہیں، خود ان کو کوئی قوت و اقتدار حاصل نہ ہوگا۔

اس مضمون کی ایک آیت سورہ آل عمران میں ایک زیادتی کے ساتھ اس طرح آئی ہے:

حُيِّتْ عَلَيْهِمُ الذَّلِيلَةُ اِيْمَانًا
تُعْطُوا اِلَّا بِتَحْتِلٍ مِنَ اللَّهِ تَحْتِلٍ
وَقَدْ نَشَأْتُمْ - (۱۱۲: ۳)

تجاویز مٹی ان پر پے قدری جہاں کہیں جائیگے
مگر ان ایک تو ایسے ذریعہ سے جو ان کی طرف
سے ہوا اور ایک ایسے ذریعہ سے جو آدمیوں کی طرف
سے ہو

اللہ تعالیٰ کے ذریعہ کا مطلب تو یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے قانون میں امن دیدیا ہو، جیسے نالغ بچے، عورتیں یا ایسے عبادت گذار جو مسلمانوں سے لڑتے نہیں پھرتے، وہ محفوظ و مامون رہیں گے، اور آدمیوں کے ذریعہ سے مراد معاہدہ صلح ہے، جس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ مسلمانوں سے معاہدہ صلح کا یا حبزیہ دے کر ان کے ملک میں رہنے کا ہو جائے، مگر الفاظ قرآنی میں **مِنَ النَّاسِ** فرمایا ہے **مِنَ الْمُشْرِكِينَ** نہیں، اس لئے یہ صورت بھی محتمل ہے کہ دوسرے غیر مسلموں سے معاہدہ صلح کا کر کے ان کی پشت پناہی میں آجائیں تو مامون رہ سکتے ہیں، پھر یہ ہشتار جہل من اللہ اور جہل من الناس کا اگر بقول کثافت ہشتار متصل قرار دیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ یہودی ہمیشہ ہر جگہ ذلیل و خوار رہیں گے، بجز ان دو صورتوں کے کہ یا تو اللہ کے ہمد کے ذریعہ ان کے بچے جو زمین وغیرہ اس ذلت و خواری سے بھل جائیں یا معاہدہ صلح کے ذریعہ یہ اپنے آپ کو ذلت و خواری سے بچالیں اور جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے معاہدہ صلح کے ذریعہ ذلت و خواری سے نکلنے کی صورت مسلمانوں سے معاہدہ صلح کر کے بھی ہو سکتی ہے، اور یہ ہی احتمال ہے کہ دوسری قوموں سے معاہدہ صلح کا کر کے ان کے

ہمارے ذلت و خواری سے محفوظ رہیں۔

یہ سب تقریریں استثنائے متصل کی تقدیر پر ہے، اور بہت سے حضرات مفسرین نے اس کو استثناء منقطع قرار دیا ہے، تو مطلب یہ ہو گا کہ یہ لوگ اپنی ذلت اور اپنی قومی حیثیت سے تو ذلیل و خواری رہیں، مگر قانونِ آبی کی دست میں آکر ان کے بعض افراد اس سے محفوظ ہو جائیں گے، یاد دہانی کے لوگوں کا ہمارے کر ذلت و خواری پر پردہ ڈال دیں۔

اس طرح سورہ بقرہ کی آیت کی وضاحت سورہ آل عمران کی آیت سے پوری ہو گئی، اور اس سے وہ تمام شبہات بھی دور ہو گئے جو آجکل فلسطین میں یہودیوں کی حکومت قائم ہونے کی بناء پر بہت سے مسلمانوں کو پیش آتے ہیں کہ تران کے قطعی ارشادات سے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہودیوں کی حکومت بھی قائم نہ ہوگی، اور واقعہ یہ پایا جاتا ہے کہ فلسطین میں ان کی حکومت قائم ہو گئی، جواب واضح ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کی موجودہ حکومت کی حقیقت سے جو لوگ باخبر ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ حکومت درحقیقت اسرائیل کی نہیں ہے بلکہ امریکہ اور برطانیہ کی ایک چھائی سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں، یہ اپنی ذاتی طاقت سے ایک مہینہ بھی زندہ نہیں رہ سکتے، یوروپین طاقتوں نے اسلامی ہلاک کر کے رکھنے کے لئے ان کے بیچ میں اسرائیل کا نام دے کر ایک چھاؤنی بنائی ہوئی ہے، اور اسرائیلی ان کی نظروں میں ہیں، ان کے شران بردار غلام سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے، صرف قرآن کریم کے ارشاد و تعجبی حق الثانی کے ہمارے ان کا اپنا وجود قائم ہے، وہ بھی ذلت کے ساتھ، اس لئے موجودہ اسرائیلی حکومت سے قرآن کریم کے کسی ارشاد پر ادنیٰ شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں میں سب سے پہلے یہود ہیں ان کی شریعت، ان کی تہذیب سب سے پہلی ہے، اگر پوری دنیا میں فلسطین کے ایک چھوٹے سے قصبہ پر ان کا تسلط کیسی طرح ہو بھی گیا، تو پوری دنیا کے نقشہ میں یہ حصہ ایک نقطہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے، اس کے بالمقابل نصاریٰ کی سلطنتیں اور مسلمانوں کے قدر تفریق کے باوجود ان کی سلطنتیں بت پرستوں کی سلطنتیں، لائبریلوں کی حکومتیں جو جگہ جگہ مشرق سے مغرب تک پھیل چکی ہیں ان کے مقابلہ میں فلسطین اور وہ بھی آدھا، اور اس پر بھی امریکہ، برطانیہ کے زیر سایہ کوئی تسلط یہودیوں کا ہو جائے تو کیا اس سے پوری قوم یہود پر خدا تعالیٰ کی طرف سے لگائی ہوئی دائمی ذلت کا کوئی جواب بن سکتا ہے!

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّبِيَّانَ

بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابین

مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ

جو ایمان لایا (ان میں سے) اللہ پر اور روزِ قیامت پر اور کام کئے نیک تو ان کے لئے جو ان کا ثواب

عِندَنَا سَيُجِبُ عَنْهُمْ وَلَا يُخَوِّفُ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۶۲﴾

ان کے رب کے پاس، اور ہمیں ان پر کچھ خوف اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

خلاصہ تفسیر

اس مقام پر یہودیوں کی شرارت کا حال معلوم کر کے سامعین کو یا خود یہود کو یہ خیال گذر سکتا ہے کہ ان حالات میں اگر غدر پیش کر کے ایمان لانا بھی چاہیں تو غالباً اللہ کے نزدیک قبول نہ ہو، اس خیال کو دفع کرنے کے لئے اس آیت میں ایک قانون اور ضابطہ مذکور فرمایا کہ، یہ تحقیقی بات ہے کہ مسلمان، یہودی اور نصاریٰ اور فرقہ صابین ان سب میں جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر اور قیامت پر اور کارگزاری اچھی کرے (موافق قانون شریعت) ایسوں کے لئے ان کا حق الخدمت بھی ہے ان کے پروردگار کے پاس (پہنچ کر) اور (وہاں جا کر) کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں ان پر، اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

خائن لا۔ قانون کا حاصل ظاہر ہے کہ ہمارے دربار میں کسی کی تخصیص نہیں جو شخص پوری اطاعت اعتقاد و اعمال میں خستیار کرے گا خواہ وہ پہلے سے کیسا ہی ہو ہمارے ہاں مقبول اور اس کی خدمت مشکور ہے، اور ظاہر ہے کہ نزولِ قرآن کے بعد پوری لگاؤ، اطاعت و محبت یعنی مسلمان ہونے میں منحصر ہو، مطلب یہ ہوا کہ جو مسلمان ہو جائے گا حق نجات اخروی ہوگا، اس میں اس خیال کا جواب ہو گیا، یعنی ان شرارتوں کے بعد بھی اگر مسلمان ہو جائیں تو ہم سب معاف کر دیں گے۔ اور صابین ایک فرقہ تھا جس کے معتقدات اور طرزِ عمل کے بارے میں چونکہ کسی کو پورا پورا نہ چلا اس لئے مختلف اقوال ہیں، واللہ اعلم۔

اور اس قانون میں بظاہر تو مسلمانوں کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ وہ تو مسلمان ہیں ہی لیکن اس سے کلام پاک میں ایک خاص بلاغت اور مضمون میں ایک خاص وقعت پیدا ہو گئی، اسکی ایسی مثال ہے کہ کوئی حاکم یا بادشاہ کسی ایسے ہی موقع پر یوں کہے کہ ہمارا قانون عام ہے کوئی موافق ہو یا مخالف، جو شخص بھی اطاعت کرے گا امور و عنایت ہوگا، اب ظاہر ہے کہ موافق تو اطاعت کر ہی رہا ہے سنا، تو اصل میں مخالفت کو ہے، لیکن اس میں نہکتا ہے کہ ہم کو جو موافقین پر عنایت ہو سو اس کی علت ان سے کوئی ذاتی خصوصیت نہیں، بلکہ ان کی صفت موافقت پر مدار ہے ہمارے عنایت کا، سو اگر مخالفت بھی خستیار کرے تو وہ بھی اس موافق کے برابر ہو جائے گا، اس لئے مخالفت کے ساتھ موافق کو بھی ذکر کر دیا گیا۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا

اور جب یا ہم نے تم سے اقرار اور بلند کیا تھا کہ اوپر کوہ طور کو کہ بکڑو

مَا أَتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ ۖ وَآذِكُمْ كُرُومًا ۚ فِيهِ كَعْلَاكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۶۳﴾

کتاب ہم نے تم کو دی زور سے اور یاد رکھو جو کچھ اس میں ہے تاکہ تم ڈرو۔

خلاصہ تفسیر اور وہ زماں یاد کرو جب ہم نے تم سے قول وشرار کیا کہ قرآن پر عمل کریں گے اور اس قول وشرار لینے کے لئے ہم نے طور پہاڑ کو اٹھا کر تھا کہ اوپر

(محازات میں) معلق کر دیا، (اور اس وقت کہا کہ) (جلدی) قبول کرو جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے (یعنی قرآن) مضبوطی کے ساتھ اور یاد رکھو جو احکام اس (کتاب) میں ہیں جس سے توقع ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔

فائدہ۔۔ جب موسیٰ علیہ السلام کو طور پر تورات عطا ہوئی اور آپ نے واپس تشریف لاکر قوم کوہ دکھائی اور سنائی تو اس میں احکام ذرا سخت تھے، مگر ان لوگوں کی حالت کے مطابق ایسے ہی احکام مناسب تھے، تو ازل تو انھوں نے یہی کہا تھا کہ جب ہم سے اللہ تعالیٰ خود کہہ دیں گے کہ یہ میری کتاب ہو تب مانیں گے، (جس کا قصہ اوپر گزر چکا ہے) غرض وہ ستر آدمی جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر گئے تھے واپس آ کر انھوں نے گواہی دی، مگر اس شہادت میں (اپنی طرف سے) اتنی آمیزش بھی کر دی کہ اللہ تعالیٰ نے آخر میں یہ ستر مادیات کا قصہ کہہ دیا تھا کہ تم سے جس قدر عمل ہو سکے کرنا ہو نہ ہو سکا ہے، تو کچھ تو جہلی شرارت کچھ احکام کی مشقت اور کچھ اس آمیزش کا جیلہ ملا، غرض صاف سماعت ہے کہ وہ کچھ تو اس کتاب پر عمل نہیں ہو سکتا، حق تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ کوہ طور کا ایک پہاڑ اٹھا کر ان کے سروں پر معلق کر دو، کہ یا تو مانو ورنہ ابھی گرا، آخر چار ناچار ماننا پڑا۔

ایک شبہ کا ازالہ یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ دین میں تو اکراہ نہیں ہے، یہاں کیوں اکراہ کیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ اکراہ ایمان لانے پر نہیں، بلکہ اذل اپنی خوشی سے ایمان و اسلام قبول کر لینے اور اس کے خلاف بغاوت کرنے کی وجہ سے ہے، باغیوں کی سزا تمام حکومتوں میں بھی عساکر مخالفت اور دشمن قوموں سے الگ ہوتی ہے، ان کے لئے ہر حکومت میں دُوبی راستے ہوتے ہیں یا اٹھا قبول کریں، یا قتل کئے جائیں، اسی وجہ سے اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے، کفر کی سزا قتل نہیں۔

ثُمَّ تَوَلَّيْنَاكَ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ ۖ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ

پھر تم پھر گئے اس کے بعد سو اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی ہرمانی

لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿۶۴﴾

تو ضرور تم تباہ ہو گئے

خلاصہ تفسیر پھر تم اس قول وشرار کے بعد بھی (اس سے) پھر گئے، سو اگر تم لوگوں پر خدا تعالیٰ کا فضل اور رحم نہ ہوتا تو اس عہد شکنی کا مقتضایاً تو یہ تھا کہ ضرور تم (فوراً) تباہ (اور ہلاک) ہو جاتے، (مگر ہماری عنایت و رحمت عامہ جو کہ حیات مستعار کے ختم ہونے تک جہالت سے رکھی ہے، لیکن کب تک؟ آخر بعد از مرگ و بال اعمال میں مستلزم ہو گئے)

فائدہ۔ حق تعالیٰ کی رحمت عامہ دنیا میں مومن کا فریب پر ہے، جس کا اثر عینیت اور دنیوی راحت ہو، رحمت خاصہ کا بطور آخرت میں ہوگا، جس کا اثر نجات اور قرب خداوندی ہے۔ بظاہر اس آیت کے جزو آخر کے مخاطب وہ یہودی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے، چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانا بھی عہد شکنی میں داخل ہے، اس لئے ان کو بھی عہد شکنوں میں شامل کر کے بطور مثال فرمایا گیا کہ اس پر بھی ہم نے تم پر دنیا میں کوئی عذاب ایسا نازل نہیں کیا جیسا پہلے بے ایمانوں اور عہد شکنوں پر ہوتا رہا، یہ محض خدا کی رحمت ہے۔ اور چونکہ اب از روئے احادیث ایسے عذابوں کا نہ آنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت ہے، اس لئے بعض مفسرین نے فضل و رحمت کی تفسیر بعثت محمدیہ سے کی ہے۔

اس معنوں کی تائید کے لئے گزشتہ بے ایمانوں کا ایک واقعہ اگلی آیت میں بیان ہو رہا ہے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدُوا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ

اور تم خوب جان چکے ہو جنھوں نے کہ تم میں سے زیادتی کی تھی ہفتہ کے دن میں تو ہم نے کہا ان

كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلْنَاهُمْ نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا

سے کہ ہو جاؤ بندر ذلیل، پھر کیا ہم نے اس واقعہ کو عبرت ان لوگوں کیلئے جو وہاں

خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿۶۶﴾

تھے اور جو پیچھے آنے والے تھے اور نصیحت ڈرنیوالوں کی واسطے

خلاصہ تفسیر اور تم جانتے ہی ہو ان لوگوں کا حال جنھوں نے تم میں سے (حدیث شرع سے) تجاوز کیا تھا دربارہ (اس حکم کے) ہفتہ کے دن کے متعلق تھا کہ اس روز

بھل کر شکار کر گیا، سو ہم نے اُن کو دیکھ کر قریٰ تکوینی سے منع کرنے کے لئے، اکبر دیا کہ تم بندہ دلیل بن جاؤ اور چاند وہ بندہ ولی کے طالب میں منع ہو گئے، پھر ہم نے اس کو ایک درواغہ تجریت والا کثیر بنا دیا، اُن لوگوں کے لئے بھی جو اس قوم کے عداوت سے اور اُن لوگوں کے لئے بھی جو مابعد کے زمانے میں آئے ہیں، اور دیندار اس درواغہ کو موجب نصیحت دیکھا، خدا سے اور قریٰ لوگوں کے لئے۔

فَانذَرْنَاهُ۔ یہ واقعہ بھی بنی اسرائیل کا حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں ہوا، بنی اسرائیل کے لئے ہندو کا وہ مقام اور حالت کے لئے مقرر تھا اور یہاں تک شکار بھی اس روز مروج تھا یہ لوگ ہندو کے کسانے آباد تھے اور یہاں تک شوقین تھے، اُس قسم کو زمانہ اور شکار کیا اس پرانہ طرہ کی طرف سے منع صورت کا عذاب نازل ہوا، لیکن ان کے بعد سب مرتکبے۔ اس واقعہ کو دیکھنے اور سننے والے درجہ سب کے لوگ تھے، فرمانبردار اور مشرمان، قویٰ فزاؤں کے لئے قویہ واقعہ انشروالی سے قویہ کرنے والا تھا، اس لئے اس کو نکالی، فرمایا اور نصیحتا ہوا، اُن کو یہ واقعہ فرمانبرداروں پر قائم رکھنے والا تھا اس کو توبہ بخلاف فرمایا۔

معارف و مسائل

دینی معاملات میں کوئی ایسا جلیہ ہوتا اس آیت میں یہودیوں کے ہر اعتدال میں حدود سے تجاوز کا ذکر اس کو بھی شرم پہل پہناتے تھے۔ کر کے اس کو سبب عذاب بتا دیا گیا ہے اور ایت سے ثابت ہوا کہ وہ صاف طور پر حکم شری کی خلاف ورزی نہ تھی، بلکہ ایسے جملے تھے جن سے حکم شری کا ابطال ملتا تھا، انھوں نے ہندو کے ولی چھلی کی قوم میں ایک دور کا ہندو لگا کر دیا، اور یہ دور زمین پر کسی چیز سے ہندو دی، پھر اقوام کے دور اس کو پکڑ کر لیا، تو یہ ایک ایسا جلیہ جس میں حکم شری کا ابطال بلکہ ایک قسم کا پھندا، ہوا، اس لئے ایسا جلیہ کرنے والوں کو بڑھ کر مشن مانتے رہنا، قریٰ کر کے اُن پر عذاب آیا۔

لہذا اس سے اُن قبیلہ جلیوں کی حیرت ثابت نہیں ہوتی، جن میں سے بعض خود رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے شکستہ میں مشغول ایک سیر مردہ کو کھوکھلے میں دیر غلاب، پھر خریدنا شروع کیا، پھر اس سے پہن کا ایک جلیہ خود رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے یہ بتوایا کہ جلیں کا تیار نہ ہونے کا ذکر نبوت کے ذریعہ خرید و فروخت کرنا، مثلاً دیر غلاب کو کھوکھلیں دیر غلاب میں فروخت کر دیا، پھر ان دوروں میں سے ایک سیر مردہ کو خرید لیا، تو یہاں تک حکم شری کی تعمیل مقصود ہوا، ابطال و مقصد کو مذاق ہے، اس طرح بعض دوسرے مسائل میں بھی یہی قیام کے حرام ہے، جیسے کہ بعض

ایسی ہی تہذیبیں بتلائی ہیں، اُن کو یہودیوں کے جلیوں کی طرح گناہوں کا ماحول تھا۔ واقعہ سب سے پہلے یہودی تفسیر شری میں ہے کہ یہود نے ازل ازل اس طرہ سے جلیہ کر کے چھلیاں کھینچیں، پھر ہونے پر تھے عام طور پر شکار کھینچتے تھے، تو ان میں دو تہا جلیوں ہو گئیں، ایک جہالت غلامی، صلیہ کی جلی ہفتوں کے لئے کو تیار کرنے سے روکا، یہ اڑا دئے تو ان سے ہر روزانہ تعلقات قطع کر کے باطل نگاہ ہو گئے، اور بس کے درختے کرنے، ایک میں یہ انشروالی لوگ ہو گئے، دوسرے میں علماء، صلحا، یہ ایک روز ان کو یہ محسوس ہوا کہ جس جلیہ میں یہ انشروالی لوگ تھے، تو یہ لوگ باطل میں تھے، ان کو یہودیوں کا جلیہ تو سب کے سب ہندوؤں کی صورت میں منع ہو گئے تھے، اور شکار قیادہ کے فرما کر ان کے ہر انداز ہندو بنائے گئے تھے، اور ہندو خنزیر کی شکل میں متبدل کر دیے گئے تھے، اور خنزیر ہندو اپنے شریشتہ اور اور قتل والے انسانوں کو پہچانتے تھے، ان کے قریٰ کر دیتے تھے۔

مَسْجِدَ قَوْمِ قَيْسِ بْنِ مَرْيَمَ اس معاملہ میں بیچ بات وہ ہے جو خود رسول کریم صلی علیہ وسلم سے پرچا ہو، جس میں عداوتیں مسلمانوں میں متبادل ہے، مگر بعض لوگوں نے اپنے زمانے کے ہندوؤں اور خنزیروں کے بارے میں آنحضرت صلی علیہ وسلم سے دو لبہ کیا کہ کیا وہی منع مشغول یہودی ہیں، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم میں منع صورت کا عذاب نازل کرتے ہیں تو ان کی قتل بھی ہیں، (مگر ہندو زمین ہلاک ہو کر ختم ہو جائے تھے، پھر) اور پھر فرمایا کہ ہندو اور خنزیر بنائے ہیں، یہ سب میں موجود تھے اور آج بھی ہیں، مگر مشغول ہندو اور خنزیروں سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

اس موقع پر بعض مفسرین نے بھی بخاری کے حوالہ سے ہندوؤں میں نہا کی مزار میں سنگساری کرنے کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، مگر یہ واقعہ بخاری کے نسخوں میں موجود ہے، در واقع بیچ ہذا و شیخ نے اس کی جگہ اس کی تفسیر بیان فرمائی ہے۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُذِخُوا آبَاءَكُمْ بِذُنُوبِهِمْ

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے اللہ فرمایا کہ تم کو ذبح کرو ایک کھانے کا لالہ امتحان تھوڑا، اُن کا اَلْأَعْدَاءُ لِلَّهِ أَنْ أَكُونُوا مِنَ الْجَاهِلِينَ

وہ بڑے کیا قوم سے ہستی کرتا ہے کہا پتا نہ دیا کہ ہوں ہیں جاہلوں میں۔

خلاصہ تفسیر

اور (ذرا نہ ادا کرو) جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم کو ذبح کرو، پتا نہ دیا کہ ہوں ہیں جاہلوں میں۔

معارف و مسائل

فَاتِلًا۔ اس باب میں ان پر جس کے قلم سے اَوَّل قتل نہ کرنا، دوم اخراج یسنی ترک ہوا، تیسرا، اس میں قوم سے کسی کو قید و بند میں گرفتار دیکھیں، خود پر چڑھ کر کے چڑھا دینا، تو ان کو قتل نہ کرنا، چوتھا، اگر کوئی چڑھا دیا اور یسنی نہ کرے، اور وہ بت اس کی ہو تو قتل کرنا، پانچواں، دین میں دوقیم نہیں، اوس و فزح، اور ان میں باہم عداوت دینی تھی، اور کسی میں قتال کی گزشتہ میں اچھائی تھی، اور دین کے گرد و فساد میں یسویوں کی دوقیم تھی، قرینہ اور دینی نصیر آپا نہیں، اوس و دینی نصیر کی باہم دوستی تھی، اور خیر و برائی نصیر میں باہم بیاد تھا، جب اوس سے خیر و برائی نہ ہوئی خود دینی کی بنا پر نہ قتل نہ کرنا، اور نگاہ ہونے، اور بڑے نصیر خیر کی طرہ فدائی کرنے، تو وہاں اوس و خیر و برائی مانے جانتے اور غافل آوارہ ہوتے ان کے دوستوں اور عداوتوں کو کسی یہ مصیبت پیش آئی، اور نگاہ پر نہ کرنا نصیر کے قتل و اخراج میں بڑے نصیر کا بھی ہاتھ ہونا، اور ایسا ہی، بالکس، البتہ یہودی کے دوقیم ہونا میں سے اگر کوئی جنگ میں قید ہو جائے تو یہ عداوت نہ دے دوستوں کو ممال پر لٹائی کر کے اس قیدی کو مار دینے، اور کوئی پرچہ کر لیا کیوں کرتے ہو قیاس کو جواب دینے کو اسیر کرنا، اگر کوئی باہم پر واجب ہو اور اگر کوئی قتل و قتال میں مبین و مدکار بننے پر اعتراض کرنا کہتے کہ اس میں دوستوں کا ساتھ دینے سے عداوت ہے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس کی شکایت فرمائی ہے، اور ان کی جیلا سزا دیں گا یہ وہ جاگ فرمایا کہ اس آیت میں جن مخالف قوموں کی اوصاف کا ذکر ہے اس سے اوس و خیر و برائی مراد ہیں، کہ اوس بنی نصر بنی کی موافقت میں بنی نصر کے مخالف تھے، اور خیر بنی کنعہ کی موافقت میں بنی نصر بنی کے مخالف تھے۔

انکو و مردان و غلام و آزاد، و دلفظ لانے سے اس طرف اشارہ ہو عتائے کو اس میں دوقیم ضائع ہونے میں جسکی اپنی علی تمیل نہ کر کے حق اللہ ضائع کیا، اور دوسرے کو قدام پہنچا کر حق انہماق بھی ضائع کر دیا۔ آجے اس خبر میں کہ یہاں سے ملکیت کے ساتھ سزا سن کر کوئی باہم تصریح بیان فرمایا کہ اور شاد ہے۔

کیا تو اس میں کہہ کر کہ کتاب و قریت آئے، اس را حکام پر سزا بیان کی گئی، ہوا و دین و حکام و ہر بیان نہیں دیکھتے، کوا کیا سزا ہونا چاہئے، اپنے نفس کی جو خیر و کوئی میں سے ایسی حرکت کرے بجز دینی کے، یہی زندگانی میں اور دنیائے قیامت کو بڑے سخت عذاب میں ڈال دینے جاوے گا

اور اللہ تعالیٰ دیکھ، کچھ خبر نہیں ہیں مخالف نے اعمال و زشت ہے۔

فَاتِلًا۔ ہر چند کہ وہ یہودی بن کا قہر میں ذکر ہے، جس اگر ہم علی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنے کی بنا پر کا لڑی تھے، پھر یہاں ان کا ذکر نہیں، بلکہ بعض احکام میں ان کے ذکر کو کفر سے تعبیر فرمایا، یہ حالانکہ جب تک حرام کو حرام کہے، کوئی کافر نہیں ہوتا، اس لیے کہ جواب یہی کہ جو کلام بہت شدید ہوتا ہو اس پر جاوڑاوت شروع میں اس کی شدت کے پیش نظر کفر کا اطلاق کر دیا جائے، ہوا ہم نے عداوت علیہ میں اس کی مثالیں دین رات دیکھتے ہیں، جیسے کہ دلیل حرکت کرنا ہونے کو کہہ دیتے ہیں کہ تو کافر باطل ہے، حالانکہ مخالف چار قبیلہ تھے، اس سے قصہ و شہرت نفرت اور اس کام کی قہارت ظاہر کرتا ہوتا ہے، اور یہی سن میں اس صریح قرآن الصلواتی شعیبۃ اللہ تعالیٰ حق و دین ہے۔

اس مقام پر جن دوسرا نزل کا ذکر ہے ان میں سے پہلی سزائیں دینا میں وقت و رسوا تو اس کا وقوع اس طرح ہوا کہ رسول اللہ علیہ وسلم کے ذمے تین سبائوں کے ساتھ معاہدے کی خلاف ورزی کرنے کے سبب قتل و قید کرنا، اور دینی نصیر ایک شام کی طرف ہزار وقت و غزائی کا لڑنے لگے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ بَنَیْنا أَسْرَارَ الْحَبِیۃِ الَّتِیْ بَا لْاٰخِرَةِ فَلَآ یُخَفِّفُ عَنْہُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنصَرُونَ ﴿۱﴾
 ہونگا ان پر عذاب اور نہ ان کو مدد پہنچے گی۔

خلاصہ تفسیر اور دوسرا نزل کے لئے یہ کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے را حکام کی مخالفت کر کے، و دنیاوی زندگانی کے مزلوں کو لئے لیا ہے، جو بعض اوقات آخرت کے (جہنم) و دنیاوی ملامت ہے، سوز تو دوسرا نزل دینے والے کی طرف سے، ان کی سزائیں دیکھ، و تحفیت دی ملے گی، اور نہ کوئی دیکھیں، و خدا و دوست و دشمن دار، ان کی طرف داری و پیروی کر کے ہائے گا۔

وَلَعَلَّ اٰتِیَاتُ مَوْسٰی الْکِتٰبِ وَ قٰتِلٰنَا مِنْ بَعْلِہٖ بِالرَّسُوْلِ ذِ
 اور یہ شک دی ہم نے موشی کو کتاب اور یہ درجے بھیجے اس کے پیچھے رسول

ہاں، وہ دینی تورہ، قانونِ خدا کا ایسی قسم قبل از خود اپنی کرتے تھے (اور) انھارے دینی مشق کیلئے ہر ایک ایک اپنی کرتے والے ہیں اور ایک کتاب لانے والے ہیں، اے! پھر جب وہ چیز آئیں جس کو وہ دھوب جانتے اور پاتے ہیں تو اس کا صاف اور نکال کر دیتے، سو دین، خدا کی طرف سے مسکنوں پر رک جانے والے ہر ایک شخصِ تعجب کے سبب اٹھا کرے)

فائدہ: دستارِ شریف کو معصیتِ نوازہ فرمایا تو اس کی وجہ یہ کہ کوثر قادری میں حبشیت و عہدیت اور ذلیل و خستہ تھی۔ ان کی کلامی قیاد ظاہر ہو گیا، اس سوراخ کا مانتے نہ والا تو قرآن اور صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں کجی نہیں بخشتا۔ وہ خود قرآن کی تکرذیب لازم آتی ہے۔ لیکن ایک شبہ اس کا جواب اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ حق کو حق کہلاتے تھے تو پھر ان کو مومن کہنا چاہیے۔

قوام کا چرچا ہے۔ ہے کہ ایمان حرت جانتے کا نام نہیں، بلکہ مانتے کا نام ہے۔ اور یہی وہ ہے
 شیطان سبکی نیا دین کوئی جا تلے، مگر جو ماننے کے باوجود انکار کرنے کی وجہ سے اور یہی عنصر میں
 مشیت بڑھ گئی، اسی نے اقلیت میں ان کے کفر کی وجہ کن کا عذاب جلا گیا ہے۔ چنانچہ اس جہاد کا

يُسْمَا الشِّرْكَاءَ أَنْفُسَهُمْ أَنْ يَكْفُرُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ

بڑی چیز کہ وہ جس کے بدلے بچا اصفیوں نے اپنے آپ کو کہ منکر ہوتے اس چیز کے جو اناری اشر

بِغَايَانِ يَنْزِلُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ أَهْلَ بَيْتِهِ وَ

يُعْظِبُ عَلَى غَضَبٍ وَلِلْكَفَرِ مِنْ عَذَابٍ مِثْلُ ①

ختمہ پر غصہ اور کافروں کے واسطے عذاب ہے وگت کا۔

خلاصہ تفصیل

و دہ حالت بہت ہی ابری، جو جس کو چست بنا کر کے (وہ بزم خود) اپنی جانوں کو

[illegible]

فائدہ :- ایک غائب کو فریاد مراد پر ایسا غائب بلائے غائب فرمایا، غزائے کے ساتھ
 بہن کی قید سے بتایا مشغور کو کہ غائب کفاز کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ گناہ گار کو غائب
 اس کو اک کرنے کے لئے بھگوان دولت کے لئے نہیں۔

آج سے کی آیت میں جو ان کا قول نقل کیا ہے اس سے ان کا کفر ثابت ہو رہا ہے، اور حد بھی مندرج ہو رہی ہے۔

مجلس شورای اسلامی - تهران - ۱۳۵۷

وَلَا إِلِيلَ لَهُمْ إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فَاذْكُرُوا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِ

عَلَيْسَ أَوْ يَكْفُرُونَ بِمَا وَرَأَوْا ۚ وَهُوَ الْعَوْمُ مُصَدِّقًا لِّمَا بَعَثَهُمُ

ہم بھراور نہیں جانتے اس کو جو سوا اس کے ہی حالانکہ وہ کتاب لکھا کہ جو قصہ لکھ کر رہی اس کتاب کو

فَلْيَمْلِكُوا بِالِغِيَاثِ وَالْغَرْابِ ۚ

[illegible]

خداوند متعال

میں نے اپنے دوستوں کو بھی بتا دیا کہ میں نے ایک نیا کتاب لکھی ہے اور وہ ان تمام کتابوں میں فخران

(۲) اس سلسلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے انکار کی گمنی ہے (یعنی توراۃ، انجیل و باقی) جن میں دکن ہیں۔

ماسواکتا میں، انہیں (فی نفسہ) حق اور واقعہ، ایمان اور رقی نفسہ حق ہونے کے علاوہ، تصدیق کن حوالی

میں ہیں اس کتاب کی جہان کے پاس ہے زمین تو راقی کی ایک ہی وہ بھی کہنے کو (اچھا حق پھر نہیں قتل
 دلا کرتے تھے اللہ کے حکم کو اس کے پہلے زمانہ میں اگر خدا تبارک و تعالیٰ کے حکم کو

فاصلہ ۱۔ یہود نے جو یہ کہا کہ تم صرف توہم پر ایمان لادیں گے دوسری کتب پر ایمان

کدوئی کے لئے کوئی کالیہ کول مرضی تصور ہے، اور اس کے ساتھ جڑیہ کہا کہ (وَعَلَىٰ) جو ہم پر نازل کی گئی ہے۔
 بعد سے جسے مترشح ہوتا ہے، اس کا مفہوم صاف ہے۔ ہے کہ اور کتاب میں جو کہ ہم پر نازل نہیں کی گئی، اس کا

فول کہ جب اور کنوولی کی حقیقت اور واقعیت میں دلیل قلعی سے ثابت ہے تو پھر اس کا کیا وجہ ہے! اگر اس دلیل میں کوئی کلام تھا تو اس کو پیش کر کے قلعی کر لیتے۔ انکار بعض کی آخر کیا وجہ!

دوسرے اردو کتابیں مثلاً قرآنی تبیہ ج قرآن کا مسند ہے تو اس کے اکار سے تو خود قرآن کی نگہ بپ و انکار لازم آتا ہے۔

تیسرے سے لے کر انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا حرام آسانی کے ساتھ ہی کے لئے منع ہے، پر خدا کے گرد کے لوگوں نے جو کئی بیچوں کو قتل کیا میں کی تعلیم ہی قرآن ہی کے احکام کے ساتھ خاص ہے، اور دشمن کا قتل کرنا بدعت بدعت ہے، اور قرآن و احکام کے ساتھ کفر کرنے کے لئے اس سے قتل خداوندی ہے ایمان کا دعویٰ بھی خلاف غیر ہے، فرماں کسی بھی پہلو سے تمہارا قول و فعل جو مسیح اور دوست ہیں۔

آگے بعض اور وجوہ و دلائل سے ان بیوروہوں کا رد فرمایا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِن

اور اچکا نکھائیے پاس موسیٰ صرغہ صغیرے سے کر پھر بنالیا تم نے پھر اس کے

بَعْدُ ۖ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ﴿٩٥﴾

گئے، چھپے، اور ہم ظالم ہو۔

خلاصہ تفسیر اور حضرت سنی (علیہ السلام) اپنے رسول کے اس صاف صاف و اعلیٰ روح پروردگار کی لائے دگر، اس پر بھی غم و غم کے لگنا کو ضرور، بتایا۔ سنی (علیہ السلام) کے خود پر جانے کے بعد اور ہم اس پر غم و غم کے لئے۔

فائدہ: یہ بات سے دو بار غلط فہمی برپا ہو سکتی ہے پہلے یہ کہ تو قادیانی نہیں، دوسری
 ملحد اسلام کے نبی برحق ہونے پر تو یہ بھی تمہیں اختلاف پیدا ہو سکتا ہے اور یہ کہ تمہیں وہی
 مدعی تفسیر کا حاصل ظاہر ہو کہ تمہیں وہی قادیانی کا کہہ کرے ہو اور دوسری طرح میں مبتلا ہو جسے

موسیٰ علیہ السلام کو بغداد کا قاضی کی مرتبہ تکبذ بھی لازم آئی ہے، گو سالہا کو مسیوہ بنائے کا معاملہ
 اگرچہ ان یہودیوں کے سامنے پیش نہیں آیا تھا، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نزول
 انبیاء کے وقت موجود تھے، مگر چونکہ یہ لوگ اپنے اجداد کے حامی اور طرفدار رہے تھے،

اس لئے فی الجملہ یہ بھی رد میں شامل ہیں۔

اور اس سے یہ بات بھی چلتی ہے کہ حرج کے اسلاف نے مومن علیہ السلام کی گنہ گزینیہ کر کے گنہ گزینہ وہ اگر مومن علیہ السلام کے انکار کے مرتکب ہوں تو جہنم اعلیٰ نہیں۔

وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا

اور جب، مہلے با قرار تھارا اور بلند کیا تھا مہلے اور کعبہ بود کہ پیکر و جو ہم نے

اَتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاَسْمَعُوا اذْ قَالُوا سُبْحٰنَا وَعَصٰیٰنَا وَاَشْرٰى بَا

تم کو دیا زدی سے اور سنو، اسے مستاجم لے اور نہ مانا اور پلائی مٹی اسی سے

فِي فَلَوَيْمَ الْعِجْلِ يَكْفِرْهُمْ قُلْ بِسْمَايَا مُرْكَم بِهِ اِيْمَانُكُمْ

دلوں میں جنت اسی بخیر و بول بسبب ان کے کفر کے کہہ دے کہ بھری ہائیں سکھانا ہر دم کو ان کی تھکاتا

﴿إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ الْإِسْلَامَ﴾

الرحم ایمان والے جو ۔

اور وہ زنا کار کو اسبہ کہے خدا را قول وستر را کیا تھا، اور اس قول و
 قرار لینے کے لئے، اس طرح کہ خدا نے رحمدل کے اور پرکار کیا تھا، اور اس
 وقت ہم دیکھا کہ اللہ تعالیٰ ہم کو سزا دے گا، اور ہم نے اس سزا کو دیکھا کہ

[illegible]

پست پرست قوم کو دیکھ کر جو خواست کی تھی کہ جانشین نے کوئی ایسا ہی مجتہد مہر جو پیر کر دیا جاسے پست فرما دے کہ جو دھجیا یا نہ لے لے ایسا ہی مروجہ کے افعال کو سو یا افعال کو پست کرے جسے یہاں تک تسلیم تھا کہ ایسا نہ ہو کہ دے اور اگر حق پرستوں کو اس سے باہر لایا جائے تو ان سے اس کا جواب دیا جائے۔

یہ نہیں کہ اسلام کے بعد دو ملاحوں کی تعداد کے مقابلے میں، مادہ کی دو اقسام کی تعداد، بیشتر ہو کر وہی اگر وہی بات کہتی ہوئی خود خود اس کو خوب اچھا لے گا جو کہ تم نے جو معیار حق و صداقت قرار دیا تھا اس میں ہی پھر اسے لے کرے۔

وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ عَلَىٰ حَيَاتِهِ ۖ وَفِي الدِّينِ أَشْرَٰؤُا

اور خود مجھے تم کو سب سے زیادہ اور جیسی زندگی ہو اور زیادہ سہی مشرکوں سے بھی

يَوْمَ أَحَدُهُمْ تَوَفَّيْتُمْ أَلَفْتُمْ سِتَّةً ۖ وَمَا تَرَوْهُ بِمُحَرَّجَةٍ مِنْ

ہماریاں ایک ایک انہیں کا عمر اپنے ہزار برس اور ہمیں اس کو بچا جائیگا عذاب سے

الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ ۚ وَاللَّهُ بَصِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۱۱﴾

اس قدر عطا، اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

اور وہ لوگ موت کی تمنا کیا خاک کرتے، آپ ذکر ان کو حیات دونوں کی باتیں

خلاصہ تفسیر اور عالم آدمیوں سے وہی اچھا کر رہی تھے، اور داوروں کا تو کیا ذکر حیات تو یہ

ہو کہ بعض مشرکوں سے بھی زیادہ کر آپ ان کو حیات کا حریف دیکھیں گے، اور ان کی یہ کیفیت ہو

کہ ان میں کا ایک ایک شخص، اس میں جس سے کہ اس کی عمر ہزار برس کی ہو جائے اور وہ بھلا مغرض

مگر اس عمر کو بھی مٹی تو کیا، یہ امر مذاق کے برخلاف نہیں تھا کہ وہ کسی کی عمر جو سات سو سال تک تھی

سب چلی لڑھکیں گے اعلیٰ درجہ پر ان کو عذاب ہونے والا ہے

فانذار۔ اس میں حیات و دنیا کی وجہ سے ذکر کرنا کہ جس کو آپ تو آخرت کے منکر تھے، مگر

بہار اور پیش تو یہ کہ دنیا ہی ہے اس لئے وہ اگر طول عمر کی تمنا کریں تو خدا ان کو عیب نہیں، مگر یہ

تو آخرت کے مخالف اور بڑھ چڑھ کر آخرت کی شہنشاہی کا اپنے ہی کو مستحق کہتے تھے، پھر بھی وہ دنیا میں

بہت کی تمنا کریں کہ یہ حیات و عجب کی بات۔

پس باوجود واقعات آخرت کے طولی عمر کی تمنا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ نعمت اخروی کا اپنے

آپ کو بھی سمجھنے کا دعویٰ دعویٰ ہی ہے، حقیقت یہ ہے اس کو یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ وہاں

بچ کر رہیں گے، انہیں گے گا اس لئے عجب تک بچے ہیں سب تک ہی رہیں گے

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِابْنِ مَرْيَمَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قُلُوبِ بَنِي إِدْرَاسَ

کہ جس نے عداوت کی ہو وہ بنی اسرائیل کے لئے نازل ہوا ہے کہ ان کے لئے عداوت نہ ہو

مُصَلَّىٰ قَالِیْمَیْنِ یَنْبَغِیْ ۚ وَهَدَّیْ ۚ وَتُبْرِیْ لِسُوْا مِیْنِیْ ۚ مَنْ مَّكَّانَ

کہ جہاں تیرا اور اس کا مقام ہے کہ اس کے پہلے پر اور وہاں کے آگے اور جو تیرے ہی سائے پر ایسا ہی اور جو

عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِکَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِیْلَ وَمِیْکَیْلَ فَإِنَّ اللّٰهَ

تو ہی ہوتی، دشمن اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے پیروں کا اور جو جبریل اور میکائیل کو اللہ

عَدُوًّا لِّلْکَافِرِیْنَ ﴿۱۲﴾

دشمن ہے ان کافروں کا۔

ابھلے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پسند کر چرل علیہ السلام کی لائے تھے

خلاصہ تفسیر کہ ان سے تو بنا ہی عداوت ہے، بنا ہی تو یہ واقعات، اہل دار و احکامات، شافعی

ابن کے ذریعے آئے تھے ہیں، ایسا کہ خوب ہی کہ ان کی اور رحمت ان کے مشفق ہے، اگر وہی وہی ایک

تو یہاں لیجئے، اس میں قتالی، ذرا فرما جائے کہ یہی ایک مکمل علیہ السلام، آپ ان سے، یہ کہنے کے جو

شخص چرل سے عداوت ہے، وہاں جاتے ہیں اس کو ان کے دے دیتے ہیں کیا اصل ایک ایک اس میں

تو یہ بعض ہیں، اسو سحریت کے طور پر، انہوں نے پستیر ان ایک آپ کے قلب تک پہنچا دیا کہ

خداوندی ہم سے، ذکر لائے کہ ان کی خصوصیت کیوں لیجی جاتی ہے، اللہ خود قرآن کو دیکھ کر یہاں سے

اس کی طور پر حالت، یہ کہ تعجب کی گزرا ہے کہ نے قبل دانی و اسالی، ان کیوں کی اور نہ ان کی گزرا ہو

وہاں ضروری کی اور نہ ضروری کا سنا ہے ایمان والوں کو اور کافر سادہ کی یہی شان ہوتی ہے،

پس پستیر ان جہاں میں آپ سادہ خود ان کا باطن، ظہور، عیو پر، علیہ السلام کی عداوت سے ان کی

نہ ملنا نہ ملنا، حاکم سے، داب را خودی و ملکہ عداوت چرل کا، اس کا یہ اصول ہے کہ حق تعالیٰ کے

خود ایک خود اللہ تعالیٰ سے عداوت رکھنا، اس کے دوسرے مذاکرے، اس کے رسولوں سے، یا

خود میکائیل سے، ان کی دوستی کا ہر کہ یہاں سے عداوت رکھنا اور جو پڑنے سے عداوت، مکاتیب

سب میں یہ شکر کہ جاتے ہیں، اور ان سب مداروں کا قانون یہ ہے کہ جو کوئی شخص خدا تعالیٰ کا

دشمن ہو تو اللہ تعالیٰ کا دشمن ہو، اور جو اللہ کا دشمن ہو، تو وہ ان سب کا دشمن ہے

ہے کہ اللہ تعالیٰ دشمن ہو کر اپنے کافروں کا۔

وَلَعَنَّا لَئِیْلَ الْبَیِّنَاتِ ۖ اٰیٰتِ بَیِّنَاتٍ ۚ وَمَا یَكْفُرُ بِهَا اِلَّا الْفٰیقُوْنَ ﴿۱۳﴾

اور لعنہ آگے ہی لائے، بے شک اور انکار کر کے، ان کے انکار ہی جو انہیں ہیں

مکتبہ اعلیٰ ہے نہ دوسرے

اور اس میں منہج کی تکمیل کے بعد مآبہ وہ فرشتے آسمان پر چلے گئے ہوں گے، وادعہ مسلم بقیۃ الحان و بیان القرآن

ہر ایک حقیقت | بعد انکس نہنت میں ہر ایسے اثر کو کہ جس میں اس کا سبب ظاہر ہو وہ ناموس خواہ وہ سبب منکوحہ ہو جیسے خاص خاص کلمات کا اثر یا غیر خصوص چیزوں کا ہوا، جیسے جنات و مشیاطین کا اثر یا غیر منہج میں یہ قرینہ خیالہ کا اثر یا عموماً اس کا ہر عہد و عہد سائنس میں جیسے مشاطین کا کہش کو ہے کہ لے جیکہ مشاطین انفرادی سے متاثر ہو، یا ذوالان کا اثر جیکہ وہ وادعہ مطلق ہوں یا جوہر و مستحیات کا اثر۔

اسی لئے مادہ کی اقسام بہت ہیں، مگر عورت، مادہ میں عموماً مادہ اور جسمیوں کو کہا جاتا ہے جن میں جنات و مشیاطین کے عمل کا دخل ہو، یا قوت خیالیہ سر پر، یا کچھ الفاظ و کلمات کا ہر ایک یہ بات مطلقاً بھی ثابت ہے اور تجربہ و مشاہدہ سے بھی، اور قدر میں، مادہ و ظاہر بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ حرورت و کلمات میں بھی ایسا تاثرات ہوتی ہیں، کہیں خاص حرورت یا کلمہ کو کہیں خاص کلمہ کو یا چرے یا لکھے و خطوط سے خاص خاص تاثرات کا مشاہدہ ہوتا ہے، یا ایسی تاثرات جو کہیں انسانی یا جانوروں و حیوانوں یا اس کے بہت سامان چیزوں کے ساتھ کچھ دوسری چیزیں مشابہت کر کے پیدا کی جاتی ہیں جن کو حرورت، عام ہی فرقہ فرما کہا جاتا ہے، اور مادہ میں مشامان کہا جاتا ہے۔

اور اصطلاح قرآن و سنت میں تحریر یا اس طرح کہا جاتا ہے جس میں مشیاطین کو قوت کر کے ان کے مدد حاصل کی گئی ہو، پھر مشیاطین کو اس کرنے کی مختلف عہدوں میں، کہیں ایسے منہج نہت سادہ کہ جاتے ہیں جن میں کفر و مذہب کے کلمات، ہوں اور مشیاطین کی مدد کی گئی ہو یا کہ کتب و غیر کتب کی مدد سے ان کی مدد ہو، جس سے مشیاطین کو قوت حاصل ہوتی ہے۔

بھلا ایسے حال میں کیا کہتے جاتے ہیں، جو مشیاطین کو کہیں یہی مطلق کسی کو اس حق کر کے اس کا غلبہ بہت مال کرنا، یا جناب و نجاست کی حالت میں رہنا، ہمارے سے جہت طلب کرنا، وغیرہ۔

جو تا سرحد اللہ تعالیٰ کے پاک فرشتوں کی مدد، ان اقوال و افعال سے حاصل کی جاتی ہو، جن کو کفر فرشتے پسند کرتے ہیں مثلاً تعویذ، ہمارے، اور پاکیزگی، یا چار و نجاست سے اجتناب، ذکر اللہ اور احوال غیر۔

اسی طرح مشیاطین کی مدد والے اقوال و افعال سے حاصل ہوتی ہے جو مشیاطین کو پسند ہیں، ان کے تصرفات لینے، ہی ان کو اس کا سبب ہو تا ہے جو کہ اس میں دیکھا جاتی اور اللہ کے نام سے دور رہیں، بحیثیت کاموں کے جاری ہوں، عزمین بھی یا ہم جنہیں میں یہ کلام کی ہی قوت فرما ہوتا ہے، یا فی

شعبہ اور لڑنے کے یا فتح والے کے کام یا سرزمین و جزیرہ کو یا جزیرہ یا کما ہے، وادعہ لسانی، بحسبہ کے انعام | امام راغب، اسمانی مقولات القرآن میں لکھتے ہیں کہ ہر ایک مختلف قسمیں ہیں، ایک قسم کو بعض نظر بند ہی اور تحصیل ہوتی ہے، جس کی کوئی حقیقت واقعہ نہیں، جیسے بعض شعبہ یا راجح یا فتح والے سے ایسے کام کہیں ہیں کہ عام لوگوں کی نظار میں اس کو دیکھتے نہ تھے صرف جتنی ہمارا قوت یا غیر منہج میں صرفہ کے ذریعہ کسی کے ذریعہ ہوا یا اثر والا ہے کہ وہ ایک جسم کو

آکھوں سے دیکھتے اور دیکھ کر کہتے ہیں، مگر اس کی کوئی حقیقت واقعہ نہیں ہوتی، کہیں یہ کام مشیاطین کے اثر سے بھی ہو سکتا ہے، کہ اس کی آکھوں اور دماغ پر ایسا اثر والا ہے جس سے وہ ایک فرد کو یا ہر ایک کو حقیقت سمجھنے لگے، قرآن مجید میں سفر منہجی اس طرح کے جس میں کفر کا ذکر ہے، یہی قسم کا کفر تھا، جیسا کہ ارشاد ہے،

تَشْرِيقًا لِّلْغُلُوبِ لِيَأْسَ السَّاسِ (۱۱۶:۱۱۷) | انھوں نے غلوں کی آکھوں پر جادو کر دیا

اور ارشاد ہے: فَخَيَّلُوا إِلَيْهِ فَوْجًا يَبُغِيهِمْ فَخَسِرَ (۱۱۶:۱۱۷) | ان کے لئے فوجیں دکھائی گئیں جن کے مقابلہ میں وہ ہار گیا، لنگاہ بڑھیل کے سانپ اور بے ہوش،

اس میں یہ خیال کے الفاظ سے جملہ دیکھا گیا کہ کسٹیل اور لاشیاں جو ساحروں نے والی تھیں وہ سانپ ہیں، اور انھوں نے کوئی حرکت کی، بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوت متحیرہ سنا کر فرما کر ان کو ڈرے والے سانپ سمجھنے لگی۔

دوسری قسم اس طرح کی تکمیل اور نظر بند ہی ہے جو بعض بات، مشیاطین کے ر ہوتی ہو، جو قرآن کریم کے اس ارشاد سے معلوم ہوتی،

هَلْ أَتَى عَلَى الْغُلُوبِ عَلَى عَشْرٍ تَكُونُ
الْمُتَلَبِّطِينَ مُتَكَلِّفِينَ لَّغُلُوبٍ كَذِبًا
أَفَأَنْتُمْ أَنْتُمْ بَصِيرَتُمْ (۱۱۶:۱۱۷) | تم نہیں دیکھتے کہ ان لوگوں کو کس طرف سے دیکھا جاتا ہے، اور تمہارے ہر بات کو دیکھنے والے سے جادو کر دیا

نیز دوسری جگہ ارشاد ہے،

وَقَالُوا أَتُحِبُّونَ الْغُلُوبَ وَتُحِبُّونَ الْغُلُوبَ (۱۱۶:۱۱۷) | تم ان مشیاطین کو پسند کرتے ہو جن کو تمہاری طرف سے دیکھا جاتا ہے، اور تمہارے ہر بات کو دیکھنے والے سے جادو کر دیا

نیز کہ ہم یہ کہہ کر سمجھ کر دیکھتے ہیں کہ لکھنے کی حقیقت یہی بدل جاتے، جیسے کسی انسان یا جاندار کو چھو کر یا جادو کرنا، امام راغب، اسمانی، اور کچھ سائنس و طبع و حضرات نے اس سے انکار کیا ہے کہ ہر ایک کو دیکھتے ہیں کہ ہر ایک کی حقیقت بدل جاتے، بلکہ ہر ایک کو صرف تحصیل اور نظر بند ہی

ہی جنگ ہو سکتا ہو، مصیبت کا بھی یہی قول ہے، مگر یہ وہاں کی تحقیق ہے، مگر انصاف اعلیٰ میں مذکور عقل بہت متاع ہے نہ شرعی، مثلاً کوئی جسم چتریں بن جائے، ایک نور سے دوسری نور کی طرف منتقل ہو جائے۔

اور فلاسفہ کا جو یہ قول ہے، جو کہ انصاف حقائق نہیں، ان کی محاورہ حقائق سے محال، ممکن، اور اجتہاد کی تحقیق میں کمال میں انصاف عقلاً ممکن نہیں، کو کوئی حال ممکن بن جائے، کوئی ممکن محال بن جائے۔

اور قرآن میں، جن میں غرضی سامعوں کے متذکرہ جو عقلی استدلال سے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر طرح عقلی ہی ہو اس سے نافرمانی نہ ہو، اور بعض حضرات نے جس کے رد میں انصاف حقیقت کے جواز پر حضرت کعب احبار کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جو موطا، امام مالک میں بروایت مختلف پنج حکیم منقول ہے۔

لولا کلمات اقولہ لعلقلنی

ایہود و نصاریٰ

گمراہانہ کے کلام عقلی یا ہی طریقی پر قوت نہ آنے کے ضمن میں بھی یہی ہو سکتا ہے، مگر علامہ زکریا حقیقت کو چھوڑ کر غماز اور دینا بیچ نہیں، اس لئے حقیقی اور ظاہری مطلق اس کا نہیں ہے کہ اگر میں یہ کلمات دروازہ باندھی سے نہ چڑھتا تو یہودی چاروں گرجے گمراہانہ دیتے۔

اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، اول یہ کہ جس کے گرجے اور دین کے گمراہانہ کا مکان پر دوسرے پر کہ یہ کلمات در چڑھا کر گئے تھے ان کی تائید ہے کہ کوئی جادو اثر نہیں کرنا، حضرت کعب جلالت سے جب لوگوں نے یہ چہا کہ ان کلمات کیا تھے تو آپ نے یہ کلمات بتلگئے،

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ
وَعَلِّمْهُ دِيْنَنَا مَا جَاءَ
الْبَشَرِيَّةَ الْاَيُّنَ لَا يَبْدُوْا رُحُوْثُ
تَبَرُّوْا كَمَا جَزُوْا بِاَمْنٍ مِّنَّا اِنَّهٗ
اَلْحَقُّ مِمَّنْ عَلَّمَنَا مَا عَلَّمْتُمْ شَيْخًا
وَعَالِدًا اَعْلَمُ مِنْ شَيْخِنَا عَلَيْنَ
وَبَرَّادٍ وَ زَوْجٍ اَخْرَجَهُ فِى الْمَوَاطِنِ
بَابُ التَّوْبَةِ عِنْدَ النَّوْمِ
غاصد ہے مگر کہ جس کی یہ تائید نہیں ممکن اور قوت میں۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ
وَعَلِّمْهُ دِيْنَنَا مَا جَاءَ
الْبَشَرِيَّةَ الْاَيُّنَ لَا يَبْدُوْا رُحُوْثُ
تَبَرُّوْا كَمَا جَزُوْا بِاَمْنٍ مِّنَّا اِنَّهٗ
اَلْحَقُّ مِمَّنْ عَلَّمَنَا مَا عَلَّمْتُمْ شَيْخًا
وَعَالِدًا اَعْلَمُ مِنْ شَيْخِنَا عَلَيْنَ
وَبَرَّادٍ وَ زَوْجٍ اَخْرَجَهُ فِى الْمَوَاطِنِ
بَابُ التَّوْبَةِ عِنْدَ النَّوْمِ
غاصد ہے مگر کہ جس کی یہ تائید نہیں ممکن اور قوت میں۔

بحرورد مجھے میں فرق | جس طرح انبیاء علیہم السلام کے صحراوات اولیاء کی کرامات سے اپنے دل و اعضاء متعلقہ ہیں آگے میں برعادت نہیں ہو سکتے، اس لئے ان کو خرقی عادت کہا جاتا ہے، بلکہ ہر مسلمان چاہے جسی اپنے دل سے آثار مشاہدہ میں لگے ہیں یا اس لئے بعض جاہلوں کو ان دونوں میں امتداد نہیں ہو چکا ہے، بلکہ اس کی وجہ سے وہ جادو گرد کی تقلید و تکریم کرنے لگتے ہیں، اس لئے دونوں کا فرق بیان کرنا ضروری ہے۔

سویں فرق ایک تو اصل حقیقت کے اعتبار سے، اور ایک ظاہری آثار کے اعتبار سے، حقیقت کا فرق تو کچھ کچھ درجہ اوپر سے جو میں مشاہدہ میں آتی ہیں، وہ ان کے اسباب الگ کرتے ہیں، ان میں فرق صرف اس سبب کے لئے درجہ اوپر دیا جاتا ہے، چنانچہ اسباب ظاہر ہوتے ہیں، اور آثار ان اسباب کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں، اور کوئی تعجب کی چیز نہیں جاتی، لیکن چنانچہ اسباب مخفی ہوں تو وہ تعجب کی چیز ہوتی ہے، اور وہ اس سبب کے لئے کہا جاتا ہے کہ اس کو خرقی عادت سمجھ گئے ہیں، اور ان کے لئے وہ حقیقت نام مادی امور کی طرح کی مشاہدات کے اثر سے ہوتی ہے، ایک خرقہ مشرقی ایسے سے آج کا گمراہ اور ایک سادہ سے اگر کر گیا، تو دیکھنے والے اس کو خرقی عادت کہیں گے، حالانکہ جنات و شیاطین کو ایسے اعمال و افعال کی قوت دی گئی ہے، ان کا ذریعہ معلوم ہر قوم پر کوئی خرقی عادت نہیں رہتا، خلاصہ یہ ہے کہ جس کے لئے وہ نامور آثار اسباب طبیعیہ کے ماتحت ہوتے ہیں، مگر اسباب کے عقلی ہونے کے سبب لوگوں کو مٹا لاطرفی عادت کا ہونا جنات مجبور کے کہ وہ بد واسطہ فعل جن تعالیٰ کا ہونا ہے، اس میں اسباب طبیعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا، حضرت بکر بن عبد اللہ کے لئے تردد کی آگ کوئی تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر آپ اس مطالبہ کے لئے خوشی سے رہ جائے، مگر شمشک بھی اتنی نہ ہو جس سے تخلیق ہوئی، بلکہ جس کے سوا حق مائل ہوا جس کی بات سے اگلی شمشدی ہو گئی۔

آج بھی بعض لوگ بدن پر کہ وہ دانی سے متعال کر کے آگ کے اندر چلے جاتے ہیں، وہ مجبور نہیں بلکہ داناؤں کا اثر ہے، اور ان میں عقلی ہونے سے لوگوں کو مٹا لاطرفی عادت کا ہونا ہے۔ یہ بات کہ مجبور یا داناؤں کا فعل تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، خود قرآن عزیز کی تصریح سے ثابت ہے، اور اشارہ سراجاً،

وَمَا تَسْأَلُهُمْ اِذْ ذُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَخَضِرَةُ
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ
وَعَلِّمْهُ دِيْنَنَا مَا جَاءَ
الْبَشَرِيَّةَ الْاَيُّنَ لَا يَبْدُوْا رُحُوْثُ
تَبَرُّوْا كَمَا جَزُوْا بِاَمْنٍ مِّنَّا اِنَّهٗ
اَلْحَقُّ مِمَّنْ عَلَّمَنَا مَا عَلَّمْتُمْ شَيْخًا
وَعَالِدًا اَعْلَمُ مِنْ شَيْخِنَا عَلَيْنَ
وَبَرَّادٍ وَ زَوْجٍ اَخْرَجَهُ فِى الْمَوَاطِنِ
بَابُ التَّوْبَةِ عِنْدَ النَّوْمِ
غاصد ہے مگر کہ جس کی یہ تائید نہیں ممکن اور قوت میں۔

غاصد ہے مگر کہ جس کی یہ تائید نہیں ممکن اور قوت میں۔

اور شکر کروں گی کفار کے لشکر پر جسکے جو سب کا گھول میں پڑ گئی۔

مخیر اور کسکری کی جھینٹوں کا یسٹری کو مخیر ہلا دیا سلسلہ سبب طبع کے بڑا درست من فغانی کا فعل لیتے، اور جو اس سبب طبع غنیہ کا اثر ہو گا ہے، حقیقت منجھنے کے لئے توکانی کافی ہے۔ مگر یہاں ایک سوال یہ رہ جائے کہ عوام الناس اس سٹری کو کیسے پہچانیں گی کہ کفار ہری صورت و دروں کی ایک سی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ عوام کے پہچانے کے لئے بھی من فغانی نے کئی فرق ظاہر کر دیے ہیں۔

اول یہ کہ مخیر و کرامت ایسے حضرات سے ظاہر ہوتی ہے، جن کا فغول ہمارے پاکیزہ جنگلات و احوال کا سبب بنا رہا کرتے ہیں، اس کے برعکس جاو کا اثر صرف ایسے لوگوں سے ظہور پذیر ہوتا ہے جو گنہگار پاک اللہ کے نام سے اور اس کی عبادت سے دور رہتے ہیں، ہر چیز ہر انسان آنکھوں سے دیکھ کر مخیر و کرامت میں فرق پہچان سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ عامۃ اللہ پر بھی جاو کے ہر شخص میں سے اور نہ توں کا دعویٰ کر کے کوئی جاو کرنا چاہے اس کا جاو وہ نہیں چنتا، ان نبوت کے دعوے کے بغیر کرے تو قبول کیا جائے۔

سہا، ایسا پہچانی جاو، جواب یہ کہ ہر سکتا ہے، وجہ دسی ہے جو اور ہر مشکل علمی کہ ہر دور حقیقت کا اثر ہو سکتا ہے، اس سبب طبع ہی کا اثر ہوتا ہے اور یہاں پہچاننا ہی ایک اثرات سے متاثر

ہوئے ہیں، یہ تاثر شانی نبوت کے خلاف نہیں، بلکہ ان کا ہرکسیاں سے متاثر ہونا، بہاری ہی مسئلہ ہونا اور شعاہ کا اثر ہری اس سبب سے سبب جاتے ہیں، اس طرح جاو کے، بالنی اسباب سے بھی انبیاء علیہم السلام متاثر ہو جیتے ہیں، اور یہ تاثر شانی نبوت کے منافی نہیں۔

دوسری اصل مسئلہ طبع و سلم پر یہ دوں کا جسکر کرنا اور اس کی وجہ سے آپ بعض آثار کا ظاہر ہونا اور خدایہ دسی اس جاو کا پڑ گنا اور اس کا لاؤ کرنا احادیث میں ثابت ہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جسکر متاثر ہو کر خود سٹری میں مذکور آیات پہنچنے کو اپنے جوت بہرہ جوش آتھا، شغل، اور حقاً جسکر فی نقیب، بیضا، مؤمنین ۱۰۴، ۱۰۵، موسیٰ علیہ السلام پر اثرات طاری ہونا اسی جاو پر کیا تاثر تھا۔

حکمر احکام شرعیہ

جیسا کہ پریان ہو چکا ہے، و سٹریان و حدیث کی اصطلاح میں مرمون ایسے عمل کو کہا گیا کہ جن میں کفر و شرک اور فسق و فجور شہاد کر کے جانتے سٹیاں کو راسی کیا گیا ہوا، اور ان سے

مردنی جن ہی ہوں گی ان احادیث سے کچھ عجیب واقعات ظاہر ہوتے ہیں، بحرانی میں کاسٹریان میں ذکر ہے، وہ یہی تھا، و جصاص، اور اسی سر کو قرآن میں کفر قرار دیا ہے، اور انصوٹ نے فرمایا کہ صحیح یہی ہے کہ سلسلہ جسکر کی سبب ان کفر نہیں بلکہ صرف وہ کفر ہے جس میں ایمان بظلمات اقوال و اعمال اختیار ہو گئے ہوں۔ و روح المعانی

اور یہ ظاہر کہ کسٹیاں میں ہر وقت کرنے لگتا ہے عداوت و مخالفت کرنے کے احکام قرآن و حدیث میں بار بار آتے ہیں، اس کے خلاف ان سے دوستی اور ان کو راسی کرنے کی دسکر خود ہی ایک گناہ ہے، پھر و راسی جب ہی ہوتے ہیں جب ان کفر میں سبب ہر جس سے ایمان ہی سبب ہو جاتا ہے، باک اگر کفر و فسق و فجور میں سبب ہوا اور ان فغانی اور فغانی کی مرئیات کے خلاف گناہ و راسی ہے، یہ ہر گناہ ہے، اور اگر جاو کے ذریعے کسی کو باطن نقصان پہنچا تو یہ اور گناہ ہے۔

فرض مسئلہ چ قرآن بہت جسکر ہو گیا ہے وہ کفر فغانی یا کفر کفر عملی سے خالی نہیں ہوتا، اگر سٹیاں میں کفر راسی کرنے کے لئے کچھ، اقوال و اعمال کفر و شرک کے نہایت سارنے تو کفر حقیقی اعتقادی ہو گا، اور اگر کفر و شرک کے اقوال و احوال سے بچ بھی گیا مگر دوسرے گناہوں کا ارتکاب کیا، تو کفر عملی سے خالی نہ رہا، و سٹریان و سٹریاں کی آیات مذکورہ میں جو کفر کہا گیا ہے وہ اسی بہت سارے ہے کہ ہر کفر حقیقی اعتقادی یا کفر عملی سے خالی نہیں ہوتا۔

ظاہر ہے کہ کفر میں کفری عمل کفر حقیقی یا کفر عملی سے ہتفا ضرر و خدو یا کو ایک کی تاثر کو سٹیاں ماننا یا کفر ہو گا، و سٹریان کے راسی نبوت کا دعویٰ کرنا و فخر تو یہ صریحاً کفر ہے، اور جس میں یہ احوال کفر ہوں مگر سٹیاں کا ارتکاب ہو رہا گناہ ہو گا۔ مسئلہ جب یہ معلوم ہو گیا کہ ہر کفر اعتقادی یا عملی سے خالی نہیں تو اس کا بھٹنا اور بھٹنا بھی حرام ہوا، اس پر عمل کرنا بھی حرام ہوا، البتہ اگر سٹیاں سے و فخر کرنا بہت ضرورت کے بعد جائز ہے تو منفقہ لے اجازت دے ہے، و راسی یا کفری

مسئلہ و فخر کرنا، و فخر جو مائل کرتے ہیں ان میں بھی اگر جانتے و سٹیاں میں و سٹیاں جو فخر کرنا بھی حرام ہے، اور اگر ان کا سبب ہری منی معلوم نہ ہوں، اور سٹیاں میں اور جانتے ہتفا کا احوال ہو تو بھی حرام ہے۔

مسئلہ، قرآن و سنت کے سلسلہ ہی جو باطن کے خلاف ایلی نہیں ہو سکر گی ان میں بھی اگر کفر و شرک کا ارتکاب کیا جاتا ہے تو وہ بھی حرام ہیں۔

مسئلہ، اور فغانی مباح اور جاو کراموں سے کام لیا جانا، جو تو اس شرط کے ساتھ جائز ہو کہ

یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔

صرف دو دستور وحی قرآنی ہی پر کلام کیا گیا ہے، اور باقی کتاب کے ساتھ مشرکین کا ذکر مسنون کو قوی اور مؤثر کرنے کے لئے کیا گیا، کہ جس طرح مشرکین اپنے افعال کے شرکار بنیں اس طرح اللہ کو بھی سمجھو۔

مَا تَسْخَرُ مِنْ آيَةٍ أَوْ نَذِيرٍ تَأْتِي بِهَا آيَةٌ مِثْلَهَا ۚ أَمْ أَتَعْلَمُ
 ا حوسر کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا نذرانہ جس میں تو سمجھتے ہیں اس سے پہلے اس کو بارگاہِ کبریا کی کو

سلم نہیں کہ نذر ہر چیز پر قادر ہے، کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے لئے ہے سلف سے آسان
 وَالْأَسْرَفِ وَمَا لَكُمْ مِنْ ذُلٍّ لَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا تَنْصُرُوهُ
 اور تمہیں کی اور نہیں تمہارے واسطے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور مددگار۔

اور قبل قیامت کا واقعہ جب ہوا تو پھر نے اس پر عمل کیا، اور مشرکین بھی
 خلاصہ تفسیر بعض احکام کی منسوخی پر زبانیں دراز کرتے تھے، حق تعالیٰ اُن کی عقلوں
 اور اعراض کا جواب دیتے ہیں کہ ہم کسی آیت کا جو حکم کو قوت نہ دیتے ہیں تو گویا اُن کی
 بازوئیں بائیں ہاتھ سے، یا اس آیت دہی اور گزرتی ہیں سے، اگر کوئی کر دیتے ہیں تو وہ کوئی اور اصل
 کی آیت نہیں جو کہ اس میں بھی مصلحت ہوتی ہے، چنانچہ اہم اس آیت سے پہلے اس آیت ہی کے
 مثل دیکھئے جس کے دوسری جزائے آئے ہیں، (لے مسخر) کیا تجھ کو یہ معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ
 ہر شے پر قدرت رکھتے ہیں، اور اپنے قادر کو مساکین کی رعایت کا شکل دیا اور کیا تجھ کو یہ معلوم
 نہیں کہ حق تعالیٰ اپنے ہی کو کفایت پہنچا سکتا ہے اور دوزخ میں ہے، اور جب ان کی اس
 قدرت و سلطنت میں کوئی شریک نہیں ہے تو ان صلیبوں کی ضرورت کے دوسرا حکم
 وہ ہے جس کوئی مزاحمت کر سکتا ہے، و غرض ہم یہاں کی تجزیہ سے بھی کوئی مانع نہیں، اور اس حکم
 کے جاری کر دینے میں بھی کوئی مانع نہیں، اور یہ بھی سمجھ کر کہو کہ حق تعالیٰ کے سوا کوئی چارو ڈھل
 بھی نہیں اور جس جب وہ بارہیں تو احکام میں مصلحت کی ضرورت رعایت کریں گے، اور جب وہ کار
 میں تو ان احکام پر عمل کرنے کے وقت تمہارے مخالفین کی مزاحمت سے بھی ضرور مخلص رہیں گے
 العتبہ اگر اس طرح سے جڑ کر کوئی قلعہ اغوی ملے والا ہو تو ظاہر عقائد کا مسلط ہو جائے اور بات کر

معارف و مسائل

مَا تَسْخَرُ مِنْ آيَةٍ أَوْ نَذِيرٍ تَأْتِي بِهَا آيَةٌ مِثْلَهَا ۚ أَمْ أَتَعْلَمُ
 جتنے صورتیں ہیں جو سب کو سمجھ کر دیتا ہے، فتح کے منت میں زانی کرنے اور نصیحت کے
 آتے ہیں، اس پر تمام مغیرہ یا نذرانہ کا اتفاق ہے کہ اس آیت میں نصیحت سے ملو کسی حکم کا زائل کرنا
 یعنی منسوخ کرنا ہے، اور اس لئے منسوخ کا کتاب و سنت میں فتح ایک حکم کے بجائے کوئی دوسرا
 حکم جاری کرنے کو کہا جاتا ہے، خواہ وہ دوسرا حکم ہی ہو کہ سابق حکم کا اکل منسوخ کر دیا جائے، یا یہ ہو
 کہ اس کی جگہ دوسرا عمل بنوایا جائے۔

احکام یا آپس میں فتح کی حقیقت اور ان کے حکموں اور اردوں میں کسی حکم کو منسوخ کر کے دوسرا حکم جاری
 کر دینا مشہور و معروف ہے، لیکن انسانوں کے احکام میں فتح کسی اس لئے ہوتا ہے کہ پہلے کسی
 نذر نہیں ہے ایک حکم جاری کر دیا، بعد میں حقیقت معلوم ہوئی تو حکم بدل دیا، کہیں اس لئے ہوتا ہو کہ
 جس وقت یہ حکم جاری کیا گیا اس وقت کے حالات کے مناسب تھا، اور آگے آنے والے واقعات
 و حالات کا اندازہ نہ تھا، جب حالات بدلے تو حکم بھی بدلنا پڑا، یہ دونوں صورتیں احکام خداوندی
 میں نہیں ہوتیں۔

ایک تیسری صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ حکم دینے والے کو ازل ہی سے یہ بھی معلوم تھا کہ حق
 نہیں گئے اور اس وقت پنجم مناسب نہیں، اور دوسرا حکم بتا دیا، یہ جانتے ہیں آج ایک حکم دیا
 اور جب اپنے ملک کے مطابق حالات بدلے تو اپنی مشرور اور سامان کے مطابق حکم بھی بدل دیا، اور اس
 مثال ایسی ہے کہ کوئی کے وجود و حالات کو دیکھ کر کسی کو یہ حکم دیا تو ایک دوا تجویز کرتا ہے، اور وہ جانتا کہ
 کہ دوا داس دوا کے سہیل کرنے کے بعد دوسری کا حال بدلے گا، اس وقت مجھے دوسری دوا
 تجویز کرنا ہوگی، اس سب کچھ جانتے ہوئے وہ پہلے ہی ایک دوا تجویز کرتا ہے جو اس دوا کے مناسب
 دور کے بعد حالات بدلنے پر دوسری دوا تجویز کرتا ہے۔

ماہر حکیم کو اگر یہ بھی کر سکتا ہے کہ پہلے ہی دن اپنے علاج کا نظام کھ کر دے کہ دوزخ
 تک نہ رواں چلائی کر دے، پھر دوزخ نکل دے، پھر ایک ہفتہ نکل دے، پھر مطلق کی طبیعت پر
 بے دوا کا کار بھی ڈالتا ہے، اس میں مسئلہ نہیں کی وجہ سے عمل کا بھی خلوص ہے، اس لئے وہ
 پہلے سے سب تعلقات نہیں چلاتا۔

اللہ جل شانہ کے احکام میں اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں میں صرف یہی قرآنی صورت
 فتح کی ہوتی ہے، اور وہی نہیں ہے، ہرگز نہ دلی نبوت اور ہر نازل ہونے والی کتاب کے پہلے

نیزت اور کتاب کے بہت سے احکام کو منسوخ کر کے نئے احکام جاری کئے، اور اسی طرح ایک ہی بہت اور شریعت میں ایسا ہونا باوجود عرصہ ایک حکم جاری رہا، پھر نشانہ سے محبت خدا وندی اس کو بدل کر دوسرا حکم نافذ کر دیا گیا، صحیح مسلم کی حدیث میں ہے: **قوله من نذرنا خطا لا شافعہ**۔ "میں نہیں کرتی بہت نہیں کرتی نہ نکاح (مصلحت) میں بخلاہ و ذوقہ دل دیکھا ہو قریشی

جہاں پیشینہ است | انہ کو چاہی ہو بدوہی نے اپنی بہالت سے احکام کو اپنے کے کوئی نیا احکام کے کچھ کی پہل دو دنوں میں رد فرمایا کر کے یہ کہ یہ سنی اللہ علیہ وسلم پر تو ان میں دروازہ کی اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی **راہین جہنم راہی کثیر و عیرو**

مسلمانوں میں سے منسوخ و معطلہ کے بعض لوگوں نے شاید ان مخالفین کے منہ سے بچنے کی راہ نکالی کہ احکام کو اپنے میں منسوخ ہونے کا امکان تو ہے، کوئی اور اس امکان کے لئے مانع نہیں، یہی ہے کہ منسوخ میں منسوخ کا وقوع کہیں نہیں ہوا، مذکور کی آیت مانع ہے، منسوخ۔ یہ قول ابوسلمہ اصفہانی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جس پر علماء اہل سنت نے ہمیشہ زور و تکرار فرمایا ہے **تفسیر روح البیان** میں ہے:

وانقضت اھل الشرائع علی
جواز النسخ و وقوعہ و خالفہ
اليھود و غیر العیسویۃ فی جوازہ
وقالوا ینسخ عدا و یزیر مسلمہ
الاصحاب فی وقوعہ فقال انہ و
انہ جاز حقلا لکنہ لیرفع۔

(۱۵۲۳ ص ۱۲۳)

اور امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا:

معنی فقہ الالباب اکیس و
فائدہ حلیۃ لا تستغنی عن
معرفۃ العلماء ولا ینکف الا
الجلۃ الا علیہاء و زعمی مشہور

مشہور ہے اس جگہ ایک واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ دوسرے منسوخ شریعت سے کوئی آدمی و خدا کو بد با تھا، آپ نے فرمایا: **لو انی**

نے کہا کہ وہ خدا و نصیحت کر رہا ہے، کہ نے فرمایا نہیں، یہ کوئی و خدا و نصیحت نہیں کرتا، بلکہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں فلاں بن فلاں ہوں سو بیچارہ! پھر اس شخص کو بولا کہ یہ جہاں کیا حق قرآن و حدیث کے مانع منسوخ احکام کو جانتے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں میں نہیں جانتا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہماری صحبت کھل جاؤ، انہ میں بیان و مطلقہ ہو۔

مشرکوں و منسوخ میں منسوخ کے وقوع کو منع سے متعلق سوال کیا نہیں کرتے ان کے آثار و اقوال پہلے میں کوئی کچھ نہیں ہے، تفسیر ابن جریر میں ہے: **و در مشر و رفرو میں اسانہ کو یہ میر کے ساتھ بھی بہت روایات مذکور ہیں، اور دواپا سے حدیث کا شمار نہیں۔**

اس لئے امت میں پسند پیشہ اتالی رہا ہے، صرف ابوسلمہ اصفہانی اور چند محدثین نے وقوع نسخ کا انکار کیا ہے، جن پر امام رازنی نے تفسیر تحریر میں شرح و ہدایت کے ساتھ رد کیا ہے۔ نیا کے منسوخ میں حدیث و متاخری | چنانچہ کچھ کے مطلقاً منسوخ نہیں ہو سکتے ہیں، اور یہ منسوخ کی جگہ حلیہ میں منسوخ | جس طرح ایک حکم کو ایک دفعہ منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم لائے میں ہے، جیسے بیت المقدس کے بجائے بیت المقدس کو قبلہ بنا دینا، اسی طرح کسی مطلق یا عام حکم میں کسی قید و شرط کا بڑھادیا بھی ایک قسم کی تبدیلی ہے، اسلاف امت نے نسخ کو اسی عام معنی میں استعمال فرمایا ہے، جس میں کسی حکم کی پوری تبدیلی بھی داخل ہے، اور جزوی تبدیلی قید و شرط یا ہستنا، وغیرہ کی بھی اس میں شامل ہے، اسی لئے متقدمین حضرات کے نزدیک قرآنی میں آیات منسوخ یا نسخ کا شمار کرتی ہیں۔

حضرات متاخرین نے صرف اس تبدیلی کا نام نسخ رکھا ہے، جس کی پہلے حکم کے ساتھ کسی طرح تطبیق نہ ہوئے، ظاہر ہے کہ اس اصطلاح کے مطابق آیات منسوخ کی تعداد بہت گھٹ جاتی گی، اسی کا لالہ اثر یہ تھا کہ حقیقت میں نے تقریباً پانچ آیات قرآنی میں نسخ ثابت کیا تھا، جس میں رسولی سی تبدیلی قید و شرط یا ہستنا، وغیرہ کو بھی شامل کیا تھا اور حضرات متاخرین میں سلامہ سیوطی نے صرف میں آیات کو منسوخ منسوخ دوا، ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان میں بھی تطبیق کی صورت پیدا کر کے صرف پانچ آیات کو منسوخ فرمایا ہے، جن میں کوئی تطبیق بغیر تاویل یا تفسیر کے نہیں ہو سکتی، یا اس لحاظ سے منسوخ کر کے احکام میں اصل بقا یا حکم ہے، نسخ غلطی اصل ہوا اس لئے چنانچہ امت کے مولیٰ یہاں ہونے کی کوئی قید نہ ہو سکتی ہے، اس میں بلا ضرورت نسخ کا تصور درست نہیں۔

کیونکہ اس تقلید کی مثالیں ہرگز نہیں ہو سکتا نسخ نسخ اسلام یا قرآن پر کوئی عیب تھا جس کے ازالہ کی کوئی وجہ نہ ہو سکتی تھی، آخری اکثارات حضرت شاہ ولی اللہ کا ہوا،

عَلَىٰ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ وَاقِمْ أَتْمُ الْوَلَاةَ وَأَتْمُ الْوَلَاةَ وَمَا
بِجَهَنَّمَ أَقْوَمُ ۝ ۱۰ اور قائم رکھو نماز اور دینے دو جو زکوٰۃ اور جو کچھ

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَىٰ النَّاسِ إِذْ أَخْرَجَهُمْ مِنْ ذُرِّيَّتِهِمُ الْمَسْجِدَ وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۚ إِنَّ اللَّهَ
آلَمَ بِمَا تَعْمَلُونَ ۚ وَالصَّلَاةَ بِحُلَاةِ يَوْمَئِذٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۚ

بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ ۱۱

جو کچھ تم کرتے ہو سب دیکھتا ہے۔

خلاصہ تفسیر اور ہمیں یہود شب و روز مختلف تدبیروں سے دینی اور غیر خدائی کے چیلے
میں مسلمانوں کو اسلام سے پھیلنے کی کوشش کیا کرتے تھے، اور اوروں

اکاسی کے اپنی اُمت سے باز کرتے تھے، جن عقائد نے مسلمانوں کو اس پر متنبہ فرمایا کہ اپنی
مسابقت میں یہود اُن سے بہتر ہے، دل سے یہ چاہتے ہیں کہ تم کو تمہارے ایمان لانے کے لیے

کافر کو ایمان، اور اوروں کو اپنا کچھ غیر خدائی سے نہیں ایسا کر دو، انہماک کرتے ہیں، بلکہ احسن حد تک
وجہ سے جو کہ تمہاری جانب کسی امر کے سبب پیدا نہیں ہوا، بلکہ انہماک کے ذریعہ ہی ہے

روحانی مانتا ہے، اور یہ بھی نہیں کہ ان کو حق واضح نہ ہو، بلکہ حق واضح ہوئے ہے پھر وہ
ہے، اب اس پر مسلمانوں کو ان پر غصہ کرنے کا حکم تھا، اس نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم پر اب تو

سادہ کر داور دیکھو کہ جب تک حق تعالیٰ اس معاملہ کے متعلق اپنا حکم قرار دے گا، یہودیوں
و اشخاص بتلاؤ کہ ان کی کشتیوں کو کالعدم قرار دینا اللہ تعالیٰ اس عام مبنی مثال و حسیہ سے ہم

بلکہ کرنے والے ہیں، اس پر مسلمانوں کو اپنا ضعف اور ان کی قوت دیکھکر اس قانون کے اجراء
کے متعلق کچھ سوچ سکتا تھا، اس نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم جو یہودیوں کے کہو اللہ تعالیٰ پر چڑھو

دعاؤ وہ معمولی چیز خواہ عجیب ہو، قادیوں اور دوسروں سے موت، آٹھویں یا ہندی سے چڑھے جائے
اور ان پر زکوٰۃ فرض ہے، زکوٰۃ دینے جائز، اور جب وہ قانون آجاتا ہے، ان اعمال صالحہ کے

اس کا بھی اہتمام کر لیا، اور یہ دیکھ کر جب تک چاہا، اس کو دے دے، صرف نماز و روزہ سے کچھ ٹوٹا
ہو گیا ہے، نہیں، بلکہ اگر کچھ کام بھی اپنی بھلائی کے واسطے چاہے کہ وہ حق تعالیٰ

کے پاس دیکھ کر مان کر دے اور پورا ماحول کے واسطے دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے سب کچھ ہوتے
کاموں کی وجہ سے بھال کر دے، ہمارا ان میں کا ایک ذرہ بھی ضائع نہ ہوئے جائے گا،

فائز، اس وقت کی حالت کا بھی متنبہ تھا، پھر حق تعالیٰ نے اس وعدے کو پورا فرمایا

اور حجاب کی آیات نازل ہوئیں، ہمیں کے بعد یہود کے ساتھ بھی وہ قانون برپا کیا، اور انہماک
رہنے کے ساتھ حسبِ حیثیت ان کے شکوے کی نقل و باج و دینا یا جو یہ پر عمل درآمد کیا گیا۔

وَقَالُوا لَن يَذَّلْنَاهُمْ لَدَىٰ ابْنَةِ الْعِزَّةِ ۚ لَا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصْرًا ۚ

اس کہتے ہیں کہ ہرگز نہ ہمارے جنت میں عمر جو یہود کے یہودی یا نصرانی

تِلْكَ أَمَّا يَبْهَمُونَ ۚ قُلْ مَا تَوْابِعُهُمْ إِن لَّمْ يَكُنْ لَّيْلٌ ۚ

یاد رکھیں، انہوں نے انہوں نے کہہ دیے کہ آؤ سند اپنی اگر تم چاہتے ہو،

بَلَىٰ مَن أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ ۚ

کیوں نہیں، میں نے تاج کر دیا، انہوں نے کہہ دیے کہ اگر تم کو اپنی کشتیوں کو اپنی کشتیوں کے

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۚ وَقَالَتِ الْيَهُودُ

اور وہ ڈرتے ہیں کہ پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے، اور یہود تو کہتے ہیں کہ

لَيْسَتِ النَّصْرَةُ عَلَىٰ فُلَانٍ ۚ وَقَالَتِ النَّصْرَةُ لَيْسَتِ الْيَهُودُ

نصرانی نہیں کسی راہ پر اور نصرانی کہتے ہیں کہ یہود نہیں کسی راہ

عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ لَئِنْ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ

ہر اور جو کچھ سب پڑھتے ہیں کتاب اسی طرح کہا دیں وہ کہہ رہے جو جاہل ہیں

مِثْلَ قَوْلِهِمْ قَالَتْ يَتْلُمُ بَنِي إِسْرٰءِيلَ ۚ وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ الْيَهُودُ

انہی کی کسی بات اب اللہ حکم کرے گا ان میں قیامت کے دن جس بات میں

فِيهِ يَحْتَلِفُونَ ۝ ۱۱

جھگڑتے تھے۔

خلاصہ تفسیر اور یہود نصرانیوں کہتے ہیں کہ یہود میں ہرگز کوئی نہ جائے یا کچھ جنت

ان لوگوں کے جو یہود ہیں وہ تو یہود کا قول ہے، ان لوگوں کے جو نصرانی

ہیں وہ نصرانی کا قول ہے، جن تعالٰیٰ ان کی تردید فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ نصرانی

دل بھولے کی باتیں ہیں اور حقیقت کچھ بھی نہیں، کچھ ان سے یہ تو کہتے کہ دیکھو اپنی دلیل کو

اگر تم راس دھوئے میں آجے، پھر دوسروں کو کھانے کو بلانے کی وجہ سے یہی نہیں، اب ہم اس کے خلاف پہلے قیہ دہلی کرتے ہیں کہ، مضر درد و سحر و جادو میں بہت ہی جادو ہے، کہ پھر اس پر دلیل لائے ہیں کہ ہمارا قانون جو قانونی مادی ملزموں کے ملنے والوں کے ہاتھ جھڑک چکا ہے، وہ ہے کہ جو کوئی شخص بھی اپنا جانے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جھکاوے دینا، اعمال و عبادت میں جھڑک نہیں سکا کرے، اور راس کے ساتھ وہ نکلیں بھی ہو کہ سزا کا ہر جادو کی دلیل پر اعتراض کی جہتیں معلومت سے ظاہر مادی نہ ہو، قرآن نے شخص کو اس کی فراہم کردہ کلامی اصول میں ہے پروردگار کے پاس پہنچنے والا دلائل کوئی پروا نیست میں، اس کو کوئی اندیشہ نہ رکھنا، واقعہ پر ملے والا ہے، اور نہ اپنے خوف، داس روز، معلوم ہونے والے ہیں، اور نہ کہ فرشتے ان کو جتنا جہنم میں نہا کر ہے لکھ کر دیکھنے والے، مسئلہ اللہ کا یہ ہر کہ جب یہ قیہ قرآن ہے قرآن صحت پر، وچہ کو کہ یہ بات کسی پر صادق آتی ہے، اس وقت پر ہے کہ کبھی کبھی ان کے منہ سے جو بات ہے جس میں عمل کرنے والا کسی پر طور پر منہ مانتا رہ نہیں سکتا، لہذا یہ دوسرے نصائے شرعیہ مادی وادہ ہوتے، بلکہ کھانا پر عمل کرنا فرمانبردار کی بھی جائز ہے، مادہ پر شاخ ششانیوں کی ہے کہ نبوت و خیریت کو قبول کر لیا، چنانچہ یہی جنت میں داخل ہونے والے شمار ہوتے۔

اور خاصیت کی قید سے منافقین جمل گئے، کہ وہ بھی شرعاً کفار ہیں، داخل اور جہنم جہنم اور ایک اور کچھ یہودی، اور کچھ نصرانی ہیں جو کہ مذہبی مباحثہ کرتے تھے، تو یہ فرقہ بنے عقیدہ کی وادہ نصائے کی دین کو داخل جاتے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور دلیل کے کتاب اللہ کے ساتھ لکھ کر تھے، عفران کا یہی منہ و قصب میں آکر رہی ہو چو کہ اصل پر جان لگائے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت اور نبوت کے کتاب اللہ ہونے کا انکار کرتے تھے، اللہ تعالیٰ اس قصہ کو نقل فرما کر بعد از نبوت کے سراسر اپنے ہر کہ نصائے کا مذہب، جس میں بنیاد پر نظام انیس (دس سرے سے غلط ہے) اور اس طرح نصائے کیجئے تھے کہ یہ وہ مذہب، اسی بنیاد پر قائم ہیں، دین سرے سے غلطی مباحثہ کے یہ فرقہ کے لوگ سالانہ نماز بھی اپنے ہاتھ دھوئے، ان میں ہر نبی کی ذات کو قبول کیا، ان میں ہر نبی کے پیروں میں ہر نبی کیوں سولہ اور نوں کوئی کلامی حقیقت موجود ہے، لہذا فرقہ مذہب کی اصل بنیاد پر مبنی ہونے کے بنا پر قادیان میں مذہب وادہ بات ہے۔

اور ان کتاب کو قرآن ہے دھوئے کرتے ہی تھے، ان کی دیکھا دیکھی شریعت کی بھی جو قرآن پا اور اس طرح سے یہ لوگ وہی ہو کر وصل، اپنے طریق، ان میں ابلی کتاب کا ساقول و سولہ لگے، وہ ان یہود و نصاریٰ مسیحا دین کے بنیاد ہے، ان پر ہم یہی ہیں، اس روایاں سب ان میں ان کی ان اللہ تعالیٰ ان سب کے دوسریاں دہلی، فیصلہ کر دیں، قیامت کے دن ان تمام مشرقیاتی میں ہیں،

وہاں ہم شتم و ستاوت کرتے تھے، اور وہ دہلی فیصلہ پر ہوا کہ ان میں ان کو بہت ہی اور ابلی باطل کو جہنم میں پہنچا، یا جائز تھا، مصلیٰ فیصلہ کی قید اس لئے لگائی کہ کوئی اور بڑی فیصلہ تو عقل و دلیل و قیاس کے ذریعہ دیا جائے گی، ہو چکا ہے۔

معرفت و مسائل

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے باہم شتم و ستاوت اور ایک دوسرے پر زور کا ذکر فرمایا، ان کی تباہی اور اس میں شتم و ستاوت کے مضر اثرات کا بیان، اور اصل حقیقت کا اظہار فرمایا ہے، ان تمام واقعات میں مسلمانوں کے لئے بڑی اہم ہدایات ہیں جن کا بیان آگے آتا ہے۔ یہود و نصاریٰ دونوں نے دین کی اصل حقیقت کو فراموش کر کے مذہب کے نام پر ایک قومیت بنالی تھی اور ان میں سے ہر ایک اپنی ہی قوم کے خلیفہ اور مقبول ہونے، اور اپنے سوا تمام اقوام عالم کے روزی و زرگار ہونے کا معتقد تھا۔ اس ناسد قول کی شتم و ستاوت کا نتیجہ یہ نکلا کہ مضر ترین یہ کہ یہ کام قیاس و دلیل کی حیثیت سے، یہاں اور یہودیت میں ہے، اصل میں صریح میں جہاز بہت ہی ہستی ہے۔

حق تعالیٰ نے ان دونوں قوموں کی چال و چلن و گمراہی کے متعلق فرمایا کہ یہ دونوں قومیں جنت میں جانے کے عمل میں سبب غافل ہیں، انھیں مذہب کے نام کی قومیت کے پیچھے چلے ہوئے ہیں، حقیقت یہ کہ کہ مذہب یہود و نصاریٰ کا، اسلام ان سب کی اصل روح و جذبہ ہے، ان کی ایک یہ کہ نہ وہ دین وادہ ہیں، اس لئے آپ کو خدا کے ہر ذکر کرنے، اس کی اطاعت و منہ وادہ

کام کا عقیدہ و مذہب ہے، یہاں ہے کہ کسی مذہب میں خلیفہ ہی حقیقت دین و مذہب کو فراموش کر کے اپنی بہت ڈال کر یہودی، نصرانی قومیت کو اپنا مقصد بنالیا، ان مذہب سے ان حقیقت کے ان کی ہی دوسری بات یہ ہے کہ جنت میں جانے کے لئے صرف یہ ہیں کہ ان میں کوئی بھی اپنے دین کے خدا کی منہ وادہ اور ان کی قصد خود دست کرے، مگر اطاعت فرمانبردار اور عبادت کے طریقہ اپنے دین و خیال کے مطابق خود کرے، بلکہ یہ ضروری ہے کہ عبادت و اطاعت اور شتم و ستاوت کے طریقہ میں دین متفقہ کرے جو خدا تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعہ بتائے اور ان میں سے ہوں۔ پہلی بات حق تعالیٰ نے اشارۃ الاکہ کے ذریعہ اور دوسری دھوکہ کشی کے ذریعہ واضح کر دی، جو جس سے معلوم ہو چکا کہ جنت، اخروی اور دنیوی جنت کے لئے صرف قصد اطاعت کافی نہیں، بلکہ حق میں بھی ضروری ہے، اور جس میں کمال احسان دہی حکیم طریق ہے جو قرآن و نبوت و رسول خیر الامم صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہو۔

وہ دوستوں کی فرست میں داخل ہے، اس کے برے اعمال کی سزا عموماً دنیا ہی میں آتی جاتی ہے، دنیا کی آخرت کا وہ بھلا ہو جائے، بھلائیوں کا کارکن ہے اس پر باطنی اور دشمنوں کا قانون جاری ہے، دنیا کی ہر ایک سزاؤں سے ان کا پر مذہب بھلا نہیں کیا جاتا، جس کو ایک سخت عذاب میں پکڑا جاتا ہے، رسول کریم ﷺ کو سلم کے سر شاگرد کی وجہ سے طلب کر کر دیا تو میں نے قید خانہ اور کافر کے لئے جہنم ہے؟

دوسری اہم بات مسلمانوں کے مشنرل اور پریشانی اور کٹنگ کی ترقی کو امام کی ہے کہ انہیں حق پر عمل کا ہوا کا خاصہ نکتہ ہے، ایک عمل کرنے سے دوسرے عمل کے خواص حاصل نہیں ہو سکتے، مثلاً تجارت کا خاصہ بر مال میں نفاذی، اور ایک خاصہ ہے بدن کی صحت، اب اگر کوئی شخص تجارت میں نوری دانت لگا کر بیچا کر اور اس کے علاج کی طرف توجہ دے تو شخص تجارت کے سبب وہ بیماری سے نجات نہیں پاسکتا، اس طرح دوا دار کا استعمال کر کے تجارت کا خاصہ بر مال کی برائی عمل نہیں کر سکتا، کفار کی دوسری ترقی اور مال و دولت کی فراوانی ان کے کفر کا نتیجہ نہیں، جیسے مسلمان انصاف و پریشانی اسلام کا نتیجہ نہیں، بلکہ منکھوئے جب آخرت کی فکر چھوڑی اور پوری طرح دنیا کے مال و دولت اور پیش و آرام کی فکر میں لگ گئے، تجارت، صنعت، زراعت اور حکومت سیاست کے مفید راستوں کو پشت کیا، معطر طریقوں سے بچے، تو دنیا میں ترقی حاصل کر لے، اگر وہ بھی ہماری طرح صرف اپنے اپنے مذہب کا نام لے کر چلے جاتے اور دوسری ترقی کے لئے اس کے اصول کے مطابق جدوجہد نہ کرتے تو ان کا کٹنا کر مال و دولت یا حکومت کا مالک نہ بن سکتا، پھر ہم یہ کیسے سمجھیں کہ جہاں اسلام اور وہ بھی صرف نام کا، ہماری ساری فرائض کے دور وازے نکھار دیا، اسلام و باطنی اگر باطنی صحیح اصول پر چلی ہو تو اس کا اصلی خاصہ اور ذخیرہ نجات آخرت اور جنت کی دائمی راستہ ہو، دنیا میں مال و دولت کی فراوانی یا پیش و آرام کی وسعت اس کے نتیجہ میں حاصل ہوتا فردی جیسے جیسے اس کے لئے اس کے مناسب جدوجہد کی جائے۔

اور بات تجربہ سے ثابت ہے، ذکر جہاں ہیں اور جب کوئی مسلمان تجارت و صنعت و حکومت سیاست کے اصولی چکر کو سیکھ کر ان پر عمل پیرا ہو جاتا ہے تو وہ بھی ان دوسری فرائض و نتائج کے خورم نہیں رہتا، جو کیں کا کفر کو عمل ہو رہے ہیں۔

اس سے واضح ہو گیا دنیا میں ہمارا انفس و جہت سیاح اور صاحب و آفات ہمارے اسلام کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک طرف اسلامی اخلاق و اعمال چھوڑنے کا اور دوسری طرف ان ظلم کاموں سے منکر ہونے کا نتیجہ ہے، جس کے عمل میں لانے سے مال و دولت میں فراوانی ہو کر آتی ہے۔

افسوس ہے کہ ہمیں جب پورے مال و مال کے ساتھ اخلاک و اعتقاد پیش کیا تو ہم نے ان سے

صرف ان کا کٹنا اور آخرت سے غفلت اور بے حسی اور بد اخلاقی کو سبب سمجھ کر، لیکن ان کے وہ اعمال نہ سمجھیں جن کی وجہ سے وہ دنیا میں کامیاب نظر آتے ہیں، جس مقصد کے لئے کھڑے ہوں ان کے پیچھے ان کے شک و شبہ، ممانعت، پانی، بات کی پانی اور دنیا میں اثر و رسوخ حاصل کر کے لئے طریقے جو وہ صنعت و اسلامی کی اصلی تعلیمات ہیں، ہم نے ان کو دیکھ کر بھی اس کی نفی ان کے لئے کر نہیں رکھی تو یہ تصور ہمارے اسلام کا ہے یا ہمارا اپنا تصور ہے۔

انہیں مشنرل کی ان بات نے واضح کر دیا کہ اصل سبب اسلام کا نام کا دنیا کی کسی شیخ پر نہیں پہنچا سکتا، جب تک ایمان اور عملی صالح کو حاصل ہو رہے ہیں، دنیا کی بات ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُبْنَى لَهُ كُفْرًا أَسْفَهًا ۚ

اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جس نے مسجدِ نبویؐ کو روک دیا جو اس کا اور

مَسْجِدُي تَحَرَّاهُمَا ۚ وَلَئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهُمَا لِكَفْرِهِمْ ۚ

موسطی کی ان کے اجازت ہے، ایموں کو لائق نہیں کہ داخل ہوں ان میں مگر وہ نے ہر

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۚ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝۱۰

ان کے لئے دنیا میں ذلت اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے اور اللہ بڑا

الْمُنِيرُ ۚ وَالْمَعْرُوفُ ۚ فَآيَةً مَّا كُنَّا لَوْ أَقْنَمُوا وَجْهَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ

مشرق اور مغرب میں سب سے روشن و دانہ ہو، متوجہ ہے اللہ بڑا

وَأَسْمِعُ عَصِيدٌ ۝۱۱

چاہے انتہائی کمزور اور سب سے بڑا مال

خلاصہ تفسیر
دوسرے وقت پر کا حکم دے کے وقت طرح طرح کے اعتراض کر کے کہ مسجدوں کو ان کے دلوں میں شہادت پیدا کرتے تھے، اگر وہ شہادت عام طور پر قلوب میں اُڑ کر تھی تو ان کا نتیجہ انکار و رسالت اور ترک مذہب تھا، اور ترک مذہب سے مسجد کی برائی لازم ہے، تو گویا یہودی اس طرح سے ترک نماز اور ویرانی مساجد خصوصاً مسجد نبویؐ میں بھی کر سکتا تھے، اللہ روم کے بعض مسلمانوں جو نصاریٰ کے اسلام تھے، اور نصاریٰ ان کے افعال کا انکار میں نہ کرتے تھے مگر وہ نصاریٰ مذہب کی زبان میں یہود مشابہہ کر دیتے تھے، عقل و قتال میں ہر اور اس وقت بعض جہلاء کے اعتراض سے مسجد بیت المقدس کی بے حرمتی بھی ہوئی، اور باطنی کی وجہ سے اس میں

وہ دوستوں کی فرست میں داخل ہے، اس کے برے اعمال کی سزا عموماً دنیا ہی میں آتی جاتی ہے، دنیا کی آخرت کا وہ بھلا ہو جائے، بھلائیوں کا کارکن کہ اس پر باطنی اور دشمنوں کا قانون جاری ہے، دنیا کی ہر ایک سزاؤں سے ان کا پر مذہب بھلا نہیں کیا جاتا، جس کو ایک سخت ماسب میں پکڑا جاتا ہے، رسول کریم ﷺ کو سلم کے سر شاگرد کی وجہ سے طلب کر کر دیا تو میں نے قید خانہ اور کافر کے لئے جہنم ہے؟

دوسری اہم بات مسلمانوں کے مشنرل اور پریشانی اور کٹنگ کی ترقی کو امام کی ہے کہ اگر تہذیبی جہل کا بھلا کا خاصہ نہ کہلے، ایک عمل کرنے سے دوسرے عمل کے خواص حاصل نہیں ہو سکتے، مثلاً تجارت کا خاصہ برمال میں نفاذی، اور ایک خاصہ ہے بدن کی صحت، اب اگر کوئی شخص تجارت میں توفیق دات لگا کر یہاں کی اور اس کے علاج کی طرف توجہ دے تو شخص تجارت کے سبب وہ بیماری سے نجات نہیں پاسکتا، اس طرح دوا دار کا استعمال کر کے تجارت کا خاصہ مال کی زیادتی حاصل نہیں کر سکتا، کفار کی دوسری ترقی اور مال و دولت کی فراوانی ان کے کفر کا نتیجہ نہیں، جیسے مسلمان انفس اور بیعتی اسلام کا نتیجہ نہیں، بلکہ مکتول ہے جب آخرت کی فکر چھوڑی اور پوری طرح دنیا کے مال و دولت اور پیش و آرام کی فکر میں لگ گئے، تجارت، صنعت، زراعت اور حکومت سیاست کے مفید راستوں کو پشت پا کر دیا، معطر طریقوں سے بچے، تو دنیا میں ترقی حاصل کر لے، اگر وہ بھی ہماری طرح صرف اپنے اپنے مذہب کا نام لے کر چلے جاتے اور دوسری ترقی کے لئے اس کے اصول کے مطابق جدوجہد نہ کرتے تو ان کا کٹنا کر مال و دولت یا حکومت کا مالک نہ بن سکتا، پھر ہم یہ کیسے سمجھیں کہ جہاں اسلام اور وہ بھی صرف نام کا، ہماری ساری فرائض کے دروازے کھول دیا، اسلام و باطنی اگر باطنی صحیح اصول پر چلی ہو تو اس کا اصلی خاصہ اور ذریعہ نجات آخرت اور جنت کی دائمی دست برد دنیا میں مال و دولت کی فراوانی و پیش و آرام کی دست اس کے نتیجہ میں حاصل ہوتا فردی جیسے جیسے اس کے لئے اس کے مناسب جدوجہد کی جائے۔

اور بات تجربہ سے ثابت ہے، ذکر جہاں ہیں اور جب کوئی مسلمان تجارت و صنعت و حکومت سیاست کے اصولی چکر کو سیکھ کر ان پر عمل پیرا ہو جاتا ہے تو وہ بھی ان دوسری فرائض و نتائج کے غور میں رہتا جو کسی کافر کو حاصل ہو رہے ہیں۔

اس سے واضح ہو گیا دنیا میں ہمارا انفس و جہت سیاح اور صاحب و آفات ہمارے اسلام کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک طرف اسلامی اخلاق و اعمال چھوڑنے کا اور دوسری طرف ان ظلم کاموں سے شرمزور نہ کا نتیجہ ہے جس کے عمل میں لانے سے مال و دولت میں زیادتی ہو کر آتی ہے۔

افسوس ہے کہ ہمیں جب پورے مال و مال کے ساتھ اخلاک و اعتقاد پیش کیا تو ہم نے ان سے

صرف ان کا کٹنا اور آخرت سے غفلت اور بے حسی اور دنیاوی اخلاق کو سبب سمجھ کر، لیکن ان کے وہ اعمال نہ سمجھیں جن کی وجہ سے وہ دنیا میں کامیاب نظر آتے ہیں جس مقصد کے لئے کھڑے ہوں ان کے پیچھے ان کے کھسک بکھسک، ماحول کی پانی، بات کی پانی اور دنیا میں اثر و رسوخ حاصل کر کے لئے طے طریقے جو صرف مسلمان ہی کی اصلی تعلیمات ہیں ہم نے ان کو دیکھ کر بھی اس کی نفی ان کے لئے کر سکتے ہیں، ان کو یہ تصور ہونا چاہئے کہ اسلام کا بے باک دانا تصور ہے۔

ان غرض مشنرل کی ان بات نے واضح کر دیا کہ اصل سبب اسلام کا نام لیا کسی شیخ پر نہیں پڑتا سکتا، جب تک ایمان اور عملی صالحہ کو حاصل ہو رہے ہیں پھر دنیا کا کیا بات ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذِكرَ فِيهَا اسْمُهُ وَ

اور اس سے بڑا ظالم کوئی نہیں ہے تنہا انہی مسجدوں میں کرنا چاہوے وہاں نام اس کا اور

سَمِيَّ نَحْنُ نَخْرُجُهَا أَذْكَرَ لَكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا الْعَاقِلِينَ

سویش کی ان کے اجازت ہے، ایموں کو لائق نہیں کہ داخل ہوں ان میں مگر خود نے ہرگز

لَهُمْ فِي الدِّينِ خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۵﴾

ان کے لئے دنیا میں ذلت اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے اور اللہ بڑا

الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ﴿۱۶﴾ فَآيِسُوا لَوْ أَنَّكُمْ رَجَعْتُمْ إِلَى اللَّهِ

مشرق اور مغرب میں جس ملوک تم کو کرو وہاں ہی متوجہ ہے اللہ بڑا

وَأَسِعَ عَالِمِينَ ﴿۱۷﴾

بے انتہا کاشش کر دے اور سب کے جانکوار

خلاصہ تفسیر
دوسرے وقت قبل کا حکم دے کے وقت طرح طرح کے اعتراض کر کے کہ مسجدوں کو ان کے دلوں میں شہادت پیدا کر دے تھے، اگر وہ شہادت عام طور پر قلوب میں اُڑ کر تھی تو ان کا انجیر انکار و رسالت اور ترک مذہب تھا، اور ترک نماز سے مسجد کی دریافت لازم ہے، تو گویا یہودی اس طرح سے ترک نماز اور ویرانی مساجد خصوصاً مسجد نبویؐ میں بھی کر سکتا تھے، اللہ روم کے بعض مسلمانوں جو نصاریٰ کے اسلام تھے، اور نصاریٰ ان کے افعال کا انکار میں نہ کرتے تھے مگر وہ فعلی ذہنوں کی زمانے میں یہود مشام پر چڑھ گئے تھے، عقل و قتال میں پورا اور اس وقت بعض جہلاء کے اکثر سے مسجد بیت المقدس کی بے حرمتی بھی ہوئی، اور باطنی کی وجہ سے اس میں

خاندان و غیرہ کا جہاں میں نہ ہوا اس طرح ہر نصاریٰ کے اسلاف ترک نماز و زکوٰۃ والی مسجد کے بانی ہوئے، اور نصاریٰ پر ہر عہد میں ان کا نام لایا گیا، اس پر شاہ کا نام ملے جس مقام اور نصاریٰ کو تسلیم ہو تو ان کا گروہ نہ تھا کہ اس میں یہودیوں کی تبدیل ہوئی تھی اور یہ یہود سے جدا تھے۔ اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ سے پہلے جب مکہ منظر میں داخل ہو کر مسجد الحرام کا طواف اور نماز اور امن روانہ چاہی تو مشرکین مکہ نے آپ کو نہ جانے دیا، یہاں تک کہ آپ اس سال وہاں تشریف لے آئے، تو اس طرح یہ مشرکین بھی سب پر اسلام کی ویرانی میں کوٹھن ہوئے، اس بات پر حق تعالیٰ نے عید معلوم سے اس کی قربت اور برائی ظاہر فرمائی، میں اور اس شخص سے زیادہ اور ان کو عالم ہوگا جو خدا تعالیٰ کی عید میں ان میں سے کسی کو بھی حرام دینے کی عیدیت المقدس کی مسجد اور مسجد مسیحی، ان میں ان کا ذکر اور عبادت کئے جانے سے بند کر دے، اور ان رسامہ کے ویرانہ (اور مغل) ہوئے، ان کے بارے میں کوٹھن کر دے، ان کو تو کوٹھن کر دے، یہ بیت (اور دیباک) پر گرائی (رسامہ) میں قدم بھی نہ رکھنا چاہئے تھا، لہذا جب کوٹھن نہ تھی و حرمت اور بیت جانے جب دیباک ہو کر اندر جانے تک کا امتحان نہیں تو اس کی کوٹھن حرمت کا سبب حاصل ہوا، اسی کو نظر فرمایا گیا، ان کو تو کوٹھن میں رہی رسولی نصیب ہوگی، اور ان کا آخرت میں بھی سزا دے عظیم ہوگی۔

دوسرے شیعہ میل قبلہ کے حکم پر اعتراض کیا تھا کہ مسلمان اس جہت سے دوسری جہت کی طرف کیوں پھر گئے، اس کا جواب حق تعالیٰ دیتے ہوئے فرماتے ہیں، میں اور اللہ تعالیٰ کی ملوک میں در سب چیزیں مشرق میں اور مغرب میں (اور وہ اس کا مکان نہیں)

پہلی جہت وہ آنگ ہیں جس جہت کو چاہیں قبلہ مقرر کریں، کیونکہ کثرت تعین قبلہ میں مشقتا ماہ میں کا اتفاق نیست اور آجنا جہاں طالع ہے، اور یہ حکمت ہے جہت سے حاصل ہو سکتی ہے جس کا حکم دینے میں دشواری نہ ہو، ان مابینہ یہودیوں کی ذات نورانیہ میں جہت خاص کے ساتھ مقصد ہوئی فرض وقت کی وجہ سے اسی جہت میں قبلہ معلوم کئے کا انحصار رہا تھا، لیکن وہ ذات ایک کسی جہت کے ساتھ مقصد و محدود نہیں جہاں بات ہے، تو تم لوگ جس طرح میں تمہارا دوسرہ ذی اللہ تعالیٰ کی ذات ایک کا اثر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ درو تمام جہات اور اسطرح کر، عجلہ میں اس طرح کا اساطیر ان کی شان کے لائق ہے، لیکن اگر عجلہ و محدود ہونے کے پھر جہت جہت معلوم تو خصوص اس لئے فرمایا کہ وہ کامل نظر میں، اور کہہ رہے کے مصالح کو خوب جانتے ہیں، چنانچہ ان کے علم میں یہ تعین بعض مصالح سے تھی، اس لئے اس کا حکم دیا

۱۔ اور انی مساجد میں کوٹھن اگر وہ کی دنیا میں تو یہ رسولی ہوئی کہ یہ مساجد میں قریش اور ان کے اسلاف کی رعایا اور باج گزار رہیں، اور مطالب آخرت تو کافر ہوئے کی وجہ سے ظاہر ہے ہی، اور رسولی اسباب میں کوٹھن کے سبب یہ مطالب اور بھی سخت و شدید ہو جاتے تھے، اور ان کی آپت میں ہوا ان چند سترقوں کے حق پر ہوئے کہ ان کوئی دنگوں ہوا تھا اس قصہ سے اس کی تردید کا ایک گود معلوم بھی نہیں آیا، کراہیے ایسے افعال کر کے صاحب حق ہونے کا دعویٰ بڑے مشہم کی بات ہے۔

۲۔ تعین قبلہ کی ایک حکمت بلور مثال اور بیان کی گئی، اس سے بعض مخالفین استدلال کیا یہ اعتراض کہ مسلمان کعبہ پرست ہیں، بالکل احمقانہ۔

جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ عبادت و پرستش تو خدا تعالیٰ کی ہے، لیکن عبادت کے وقت کعبہ کی تلبک کی ضرورت، اور نیز عبادت کی ہیست اجتماع کر کے کسی ایک کعبہ میں تلبک کرنا چاہیے، وہ تو ان میں جبر و شہادہ سے ثابت ہیں، اس لئے اس کی قبولی اور اجتماع ہیست حاصل کرنے کے لئے تعین ہیست شروع ہوئی، لہذا اس اعتراض کو شہد کی کوئی گنجائش نہیں۔

اور اگر اس پر کوئی اپنی برأت کے لئے یہ دعویٰ کرے کہ ہم بھی چوٹی کو سامنے اس قصد و فرض سے رکھتے ہیں، تو اقول قواہی برأت کے دعوے سے مسلمانوں پر مذکورہ اعتراض نہیں کوٹھن، وہ یہود و نصاریٰ کا دوسرا مقام پر مقصور اصل ہے۔

۳۔ عالم مسلمانوں اور عام کافروں کی حالت امتیاز کرنے سے مدہ پرستش کے دعوے میں مسلمانوں کا راستہ مگر نادر و دوروں کا دروازہ گنجائش اور برأت پر نفس کو معلوم ہو سکتا ہے۔

تیسرے، حق تعالیٰ التسلیم کیا جاتا ہے کہ اگر اس دعوے کی سچائی مانا بھی لی جتے پھر بھی اس میں تعین اور تعین کے لئے کسی غیر منقولہ شریعت کا حکم پیش کرنا لازم ہے، اور یہ چیز اہل اسلام کے دوسروں کے پاس مفقود ہے۔

اور ترجمہ تفسیر کے میں ہیں یہاں حکمت کے لئے یہ لفظ مشافہہ کیا گیا، تو اس کی وجہ یہ ہو کہ احکام خداوندی کی کثرت اور بعض اہل انصاف اور انصاف کے ساتھ جس کے او راہک میں نہیں آتے، اس میں سب سے بھی جزا دیں چھوٹیں ہوں گی، ایک دوسرے سمجھ جائے، ان میں انصاف اور وہ رسول کی خلق میں ہو سکتی۔

۴۔ اور یہ جو فرمایا ہے کہ اگر اصریٰ اللہ کا ہے، اور اس طرح یہ جو فرمایا ہے کہ وہ کعبہ پر اور ایسے ہی جو مضامین ہوں ان سب میں زیادہ کم کو ذکر کی جاتے، کیونکہ اس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کا پروردگار کسی بندہ سے ممکن نہیں، اسی طرح اس کی صفات کی حق تعالیٰ سے خارج ہے۔

اجلا ان صبر وایمان لے کرے، اس سے زائد کا انسان تکلف نہیں۔
حقائق کا رکس لشرو دام از حبیبین
کا بچا ہمیشہ ابو بدست است دام ہا

معارف مسائل

ان دو آیتوں میں دو اہم مسئلوں کا بیان ہے اپیل آیت ایک خاص واقعہ کے متعلق تاویل ہوتی ہے۔

واقعہ یہ کہ زمانہ اسلام سے پہلے جب یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر ڈالا تو روم کے نصاریٰ نے اس سے انتقام لینے کی خاطر عراق کے ایک مجوسی بادشاہ کے ساتھ مل کر اپنے بادشاہ طیسوس کی سرکردگی میں شام کے بنی اسرائیل پر حملہ کر کے ان کو قتل و غارت کیا اور ولایت لینے چلا گئے، بہت المقدس میں خلیفہ اس وقت زین العابدینؑ تھے، اس کی حمایت کو خراب و برابن کر دیا، بنی اسرائیل کی قوت و شوکت کو بالکل پامال کر دیا اور حضرت علیؑ نے اس کے بعد کے حکمران کو ایک نیک بہت المقدس اس طرح ویران و مہدم کیا تھا۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بعد میں جب شام و عراق فتح ہوئے تو آپ کے حکم سے بیت المقدس کی دوبارہ تعمیر کرائی گئی، زائد و از نیک بادشاہ شام و بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ میں رہا، پھر ایک عرصہ کے بعد بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گیا اور تقریباً سات سو سال پورے کے عیسائیوں کا اس پر قبضہ رہا، تا آنکہ جمعی مدنی جس میں سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے پھر اس کو فتح کیا۔ وہی نصاریٰ کی اس مستحاضہ حرکت پر کہ تو اس کو کویا یا انور بیت المقدس کو خراب کیا ہے اس کی بے حوقی کی یہ آیت نازل ہوئی۔

یہ قول مفسر العصرؒ ان حضرت علیؑ نے کہا ہے، اور حضرت ابن زیدؒ وغیرہ دو دستہ مفسرین سے آیت کا شان نزول یہ بتلایا ہے کہ جب مشرکین نے رسول کریمؐ کو علیؑ اور علیہ وسلم کو واقعہ مدینہ کے وقت چھ گرام میں داخل ہونے اور ولایت کرنے سے روک دیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ ابھر چرنے پہلے روایت نمودار اور کیا ہے، دوسری کو ترجیح دی ہے۔

صلحہ مفسرین نے اس پر اس بادشاہ کا نام تحت تصریف لکھا ہے، صورت تحت تصریف اس شان نزول میں ہوسکتا کہ اس کا زمانہ حضرت علیؑ علیہ السلام سے بہت پہلے ہے، یہ ممکن ہے کہ بعد میں ہی، اور شکار شاہ کو بیت المقدس لے گئے ہوں ؟ (محمد شفیع)

بہر حال آیت کا شان نزول تو مفسرین کے نزدیک ان دونوں واقعوں میں سے کوئی خاص واقعہ ہے، مگر اس کا بیان عام متعلق صاف ہے اور قانون کے الفاظ میں فرمایا گیا ہے، تاہم جس قدر کہ یہی نصاریٰ و مشرکین وغیرہ کے لئے مخصوص نہ سمجھا جائے بلکہ تمام اقوام عالم کے لئے عام ہے، یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں خاص بیت المقدس کا نام لینے کے بجائے شہادۂ فرما کر تمام مساجد پر اس حکم کو عام کر دیا گیا، اور آیت کا معنوں یہ ہو گیا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی کسی مسجد میں دشمنی کرے اور اس کا شکار کرے تو اس کے یا کوئی ایسا کام کرے جس سے مسجد ویران ہو جائے تو وہ بہت بڑا ظالم ہے۔

مقتضا اللہ کی عظمت کا تقاضی یہ ہے کہ ان میں جو شخص داخل ہو بہت عظمت اور شوق و خضوع کے ساتھ داخل ہو، جیسے کسی شہید و بابا میں داخل ہونے میں۔

اس آیت سے جو چند ضروری مسائل واضح ہوئے ان کی تفصیل یہ ہے،
اولیٰ یہ کہ دنیا کی تمام مساجد آپ صمد کے عمارت سے مادی ہیں، جیسے بیت المقدس، مسجد حرام یا مسجد نبویؐ کی جہ حرمی علیہ السلام، اس طرح دوسری تمام مساجد کے متعلق یہی حکم ہے، اگرچہ ان میں سے مساجد کی خاص بزرگی و عظمت اپنی جگہ مسلم ہے کہ مسجد حرام میں ایک نماز کا سہ ہزار ان بیٹوں مساجد کی خاص بزرگی و عظمت اپنی جگہ مسلم ہے کہ مسجد حرام میں ایک نماز کا سہ ہزار ایک لاکھ نمازوں کے برابر اور مسجد نبویؐ کی بزرگی بیت المقدس میں چار ہزار نمازوں کے برابر ملتا ہے، ان بیٹوں مساجد میں نماز پڑھنے کی خاطر دور دور و ملکوں سے مسافر کے پہنچنا موجب قراۃ علیہم السلام اور باعث برکات ہے، بخلاف دوسری مساجد کے ان بیٹوں کے علاوہ کسی دوسری مسجد میں نماز پڑھنے کو فضائل جان کر اس کے لئے دور سے مسافر کے آنے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ مسجدیں ذکر نماز سے روکنے کی جتنی بھی مروج ہیں وہ سب ناجائز و حرام ہیں ان میں سے ایک صورت تو یہ کہ ان میں سے کسی کو مسجد میں جانے سے یا وہاں نماز و تلاوت سے مبرا کر دیا جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ مسجد میں شور و شب کر کے یا اس کے قریب وجوار میں باجے بجا کر مگوئی کی نماز و ذکر وغیرہ میں خلل ڈالے، یہ بھی ذکر اللہ سے روکنے میں داخل ہے۔

اس طرح اوقات نماز میں جبکہ لوگ اپنی نوافل یا جمعیت و تلاوت وغیرہ میں مشغول ہیں مسجدیں کوئی بدست نہ کرانے وحدت، ذکر یا ایچ کرنے گئے تو یہ بھی مذکور کی نماز کو مسجد میں خلل ڈالنے اور ایک کیفیت سے اگر ائمہ کو روکنے کی ضرورت ہے، اس سے حضرت فقہاء نے اس کو بھی ناجائز قرار دیا ہے، چاہے مسجد عام نمازیوں سے خالی ہو یا اس وقت ذکر و تلاوت چرکا معنا لکھ نہیں

قَوْلِهِ وَتَحَقُّظَ شَهْنَةِ الْحَرَامِ، وَتَحَقُّظَ مَا تَحْتَضِرُ كَوْنَهُ
وَتَحَقُّظَ شَهْنَةِ شَهْنَةِ (۲۰۲)

ترجمہ۔ آئینہ کہ قلیل ہمارے دل و طبیعت کی وجہ سے ہمارا انسان کی طرف مکرر متوجہ ہو جائے گا
وہ شاید فرشتہ و حکم کے آئے ایم پسند نہ ہو رہے ہیں، اس لیے ہم آپ کو اس قیل
کی طرف متوجہ کریں گے جس کو آپ چاہتے ہیں، اس لئے آپ آپنا چہرہ و سامان میں
مہر حرام کی طرف متوجہ نہ کریں کہ آپ کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ تمام امت
کے لئے ہی پاک حکم دیا گیا کہ ہم چاہیں بھی موجود ہیں یہاں تک کہ خود بیت المقدس کے
اندھ بھی ہمارا چہرہ اپنا چہرہ حرام کی طرف متوجہ نہ کرے

الزحل آیت مذکورہ و فِیہ التَّحْقِیْقُ وَ التَّحْقِیْقُ ہے۔ یعنی تحقیق کی ہر سی کیفیت
کو واضح کر دیا کہ اس کا منشا، بیت اللہ یا بیت المقدس کی معاذ اللہ پیشکش نہیں، اور دنیا و دوزخ
مکانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک مخصوص ہے، بلکہ اس کی ذات سامنے عالم برحق اور ہر
سمت میں اس کی قوت یکساں ہے، ہر جہت میں خاص مکان یا سمت کو مخصوص کیا گیا ہے اس میں دوسری
جگہ نہیں ہیں۔

آیت مذکورہ کے اس معنوں کو واضح اور دل لیشیں کرنے میں کہنے کے لئے شاید اختصاریت اللہ
علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو ہی جہت کے ادنیٰ میں سوار ہونے تک بیت المقدس کی طرف متوجہ نہ کرے
خدا اور اگر نہ کہ حکم کے تحت ہی طرح پر جتنے دیے گئے ہمارے قوت پر ہر طرف ہے، اور دوزخ میں اس حکم کو
بیشک کے لئے جاری رکھا، کہ سفر میں کوئی شخص کسی سواری مثلاً اونٹ، گھوڑے وغیرہ پر سوار ہو کر
اس کو اجازت ہے کہ سواری پر بیٹھ ہوئے اشارہ سے غفلت غار نہ دے، اور اس کے لئے قیل کی
طرف متوجہ نہ کرے ضروری نہیں، جس طرف اس کی سواری چل رہی ہے اس طرف متوجہ نہ کر لیا کا کافی ہے
بعض مفسرین نے آیت قَوْلِهِ تَحَقُّظَ شَهْنَةِ الْحَرَامِ کو اس معنی میں تفسیر کیا کہ اگر وہ چلے
مگر اگر وہ ہے کہ صرف اس سواری کا ہے جس پر سوار ہو کر بیٹھ ہوئے قیل کی طرف متوجہ نہ کرنا و شواہد
اور چہرہ سواری میں سوار نہ کر لیا و شواہد میں، پیچھے رہنے، چلنے کا جاد، ہوائی جہاز
ایک دوسرے کے جو حالت حضریں متوجہ قیل کا ہے، اگر غفلت غار نہ بھی ان میں پڑیں مائے قوت و تلبیہ کو
پڑیں جائے وہ اللہ تعالیٰ کی حالت میں رہنے کا یا جہاز کا متوجہ قیل ہے اور غازی کے لئے متعلق ہے جو کہ
وہ بھی قیل متوجہ چاہے، تو اس حالت میں متوجہ نہ کرے،

اس طرح چنانچہ غازی کو سمیت قیل معلوم نہ ہوا، وراثت کی اندھیری و طرہ کی وجہ سے تین
متبعین کو بھی دشوار ہوا کہ وہ قیل کے والا بھی نہ ہو تو وہاں بھی یہی حکم ہے کہ وہ اپنا اندازہ اور قیل

لگا کر اس طرف کو بھی متوجہ نہ کرے کہ اس سمت اس کا قیل شرار ہو جائے گی، خدا اور اگر نہ کہ بعد
المری بھی ثابت ہو جائے کہ اس نے غلط سمت میں خدا راہ کی ہے، تب بھی غلط سمت ہے، عبادہ کی
ضرورت نہیں۔

آیت کے اس بیان اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل اور جہت نیت مذکورہ سے
استنباط قیل کے حکم شرعی کی ہر سی حقیقت واضح ہو گئی۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحٰنَہٗ ؕ بَلْ لَّہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ
اَلْاَرْضِ مِنْ غَیْرِ مَا تُشْرِکُوْنَ اِنَّ اَوَّلَ دُرٍ وَسَبَّحُوْا لَہٗ ہر گز کہ وہ کہتا ہے کہ اس کا

اَلْاَرْضِ مِنْ غَیْرِ مَا تُشْرِکُوْنَ ۝ بَلْ لَّہٗ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ مِنْ ذٰلِکَ

ترجمہ میں سب اس کے کا بعد ہیں، نیا پیدا کرنے والے، آسمان اور زمین کا اور جب

قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُن فَاَیْکُوْنَ ۝

ترجمہ ہے کہ کسی کام کو تو یہی فرما دے تو کہہ کر ہاں وہ ہو جاتا ہے

خلاصہ تفسیر اور میں یہودی حضرت خیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے اور انہی حضرت
حیی علیہ السلام، اور مشرکین عرب ملک کو خدا کی بیٹیاں، چہا مختلف

آیات میں ان اقوال کی تشریح گئی ہے، حق تعالیٰ اس قول کی قناعت اور بطلان کا بیان فرماتے ہیں،
یہی ہادیوں پر غالب و مختلف معنی ہیں، کہتے ہیں کہ خدای تعالیٰ اور وہ کہتا ہے جان اللہ راہاں ہاں ہاں ہاں
کہہ دے کہ تو اور وہ مختلف حکم نہیں، یہ کہہ دے وہ حال سے خالی نہیں، یا تو اور وہ نہیں ہوگی اور یا
جس ہوگی، اگر غفلت میں ہو تب تو نہیں دے دے وہاں جب وہ حق تعالیٰ سے پہلے پاک ہیں، عقل میں
بہت سلی ہیں، اور عقل میں عیسایہ جہاں مذکور کا بھی مدلول ہے، اور اگر ہمیں جو تو اس لئے باطل ہے کہ
حق تعالیٰ کا کوئی ہم نہیں ہیں، یہ کہہ دے صفات کمال اور نام ذات واجبہ سے ہیں وہ اللہ کے ساتھ مشرک
اور غضب اللہ میں مصدوم ہیں اور اللہ کا غنی علی ملزوم کی نفی کی دلیل ہے، اس لئے خیر اللہ ذات واجب
نہ ہوگا اور وہ جب تو میں حقیقت، بلازم حقیقت ہوا ہی کہ حق اللہ اللہ کے ساتھ مشرک میں
مشرک نہ ہوا، لہذا ہمیں یہ بھی باطل ہو گیا، اب صفات کمال صرف حق تعالیٰ ہی کے ساتھ مختص
ہونے کی دلیل مذکور ہوئی ہیں، باطل ہے کہ خاص اللہ تعالیٰ کے ملزوم ہیں جو کہ کسی آسمان اور
زمین میں موجود ذات ہیں، اور وہ مشرک کہ ملزوم ہونے کے ساتھ اللہ کے حکم میں نہیں ہوتا
ہاں میں اس کا تصرف قدرت سے ملتا، عبادہ کو تو یہی نہیں ہلاکتا اگر اس کا مشرک ہے کہ

کون ملک اور میرے پرکھن تعالیٰ موجود رہی، پس اسوقت اور زمین کے اور حصے پر کہ ہوا کی
بھی خدمت میں منظم و منسوب ہے کہ جس قسم کی کام کا مشغلہ پیدا کی کرتا ہے، پیدا کرنا چاہتے ہیں تو
بہن رانی اس بات ہے کہ اس کو آنتا، فرما دیتے ہیں کہ ہوا میں وہ واسطہ ہے جو ہوا کے ذرائع
آفات و اسباب اور صناعتوں اور مینوں کی ضرورت میں پڑے اور یہ چاروں امر بجز حق تعالیٰ کے
کسی میں نہیں پائے جاتے اور یہ مذہبی اور ادوار کے بھی مسلمات سے تھا، انہیں دلیل سے معذور
و انھیں بھی ثابت ہو کر حجت تمام ہو گئی۔

۱۔ خاص خاص کاموں پر خاص خاص ملاک کو معسر کرنا مثلاً لاش اور زن وغیرہ اور
اس طرح اسباب اور مواد اور قوی سے کام لینا یہ سب کسی شک کے بغیر خداوندی چستی
ہو رہا ہے، اس لئے نہیں کہ لوگ انہیں اسباب و قوت کو حاجت و وامان کو استعانت و مدد کے
طلباء ہوں۔

۲۔ بیضاوی نے کہا ہے کہ پہلے مشرق میں اللہ تعالیٰ کو سب اقول ہونے کی وجہ سے باپ
کہا کرتے تھے، باپوں نے ولادت کے سبب سے اس لئے یہ عقیدہ رکھا، ایسا کہ تفرقہ قرار دیا گیا
دین فساد کی صحت سے علیحدہ نظر کے استعمال کی، اہل اہانت نہیں۔

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُعْلِمُهُ اللَّهُ وَآيَاتُنَا آيَةٌ ۖ

اور کہتے ہیں وہ لوگ جو کہ نہیں جانتے کیوں نہیں دانت کہ ہم اسے باپوں میں آیت ہے کہ اس کی آیت

كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ كَشَابَهَتْ

اس طرح کہ چھ ہی ہو، لوگ قرآن سے پہلے تھے انہی کی کسی بات ایک ہے، ہیں دل

فُلُوْهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿۱۸﴾

ان کے لیے جس کے بے بیان کر دی فتاویٰ ان لوگوں کے واسطے جو یقین لاتے ہیں

اور دیکھتے ہیں وہ لوگ جو کہ نہیں دانت کہ ہم اسے باپوں میں آیت ہے کہ اس کی آیت
كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ كَشَابَهَتْ
اس طرح کہ چھ ہی ہو، لوگ قرآن سے پہلے تھے انہی کی کسی بات ایک ہے، ہیں دل
فُلُوْهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿۱۸﴾
ان کے لیے جس کے بے بیان کر دی فتاویٰ ان لوگوں کے واسطے جو یقین لاتے ہیں

خلاصہ تفسیر

اور دیکھتے ہیں وہ لوگ جو کہ نہیں دانت کہ ہم اسے باپوں میں آیت ہے کہ اس کی آیت
كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ كَشَابَهَتْ
اس طرح کہ چھ ہی ہو، لوگ قرآن سے پہلے تھے انہی کی کسی بات ایک ہے، ہیں دل
فُلُوْهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿۱۸﴾
ان کے لیے جس کے بے بیان کر دی فتاویٰ ان لوگوں کے واسطے جو یقین لاتے ہیں

کی دلیل و ثبوت و مسلمات کی آجائے (حق تعالیٰ اور اس بات کا جائز و رسم ہونا چھوٹے ہیں کہ)
اس طرح وہ باہل و توہم ہیں کہ پہلے آئے ہیں، جو اس سے پہلے کو فرستے ہیں، انہی کا سوا اور جائز
قول و رسم معلوم ہو کر یہ قول کوئی اور وقت اور ایک پہلی پہلی نہیں ہو سکتی، ابک و ابک ہے ہم
انہیں اس قول کا منشاء و سبب بیان فرماتے ہیں کہ ان سب واسطے پہلے جاہلوں کے قلبوں
کی نہیں ہیں، باہم ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، اس لئے سب سے پہلے ایک ہی میں پیدا ہوئی، پھر
انہیں اس قول کا جواب دیتے ہیں، اور چونکہ اس قول کا حبس و اقل حاکمیت تھا کہ اپنے کو اس
لحاقت پر ہم پر ملا کر اور انہیں کہنا چاہتے تھے، جو پہلی ہی بدی اہلطان ہے، اس لئے اس
اعتقاد بات کو نظر انداز کر کے صرف دوسرے پر ایک جواب ارشاد ہوتا ہے کہ تم کو ایک دلیل کہنے
پہلے تھے، ہر کہنے کو ثابت کسی دلیل سے (رسالت محمدیہ کے ثبوت میں) صاف صاف بیان کر دی گئی
دگر وہ ان لوگوں کے لئے رتاق رکھتی ہو سکتی ہیں، جو یقین رکھتے ہیں اور اہل ایمان و عاقل کہنا چاہتے ہیں راز
چو کہ حضرت عیسیٰ کو معمر و عمار و دیگر مفسر وہ اس لئے حق طبعی کی نظر سے ان کی عقلیں میں منظور
نہیں، سو انہیوں کی قسمل و تشکی کا کوئی ذمہ دار نہیں۔

فَاذْكُرْ لَهُمْ ذِكْرًا مِّنْ آيَاتِنَا الَّتِي يُؤْمِنُونَ ۚ
اللہ تعالیٰ نے ہاں انہیں ان کو اس لئے کہ اب ذکر کی قسمل اور قوی و لائق کثرت سے قائم کر لیتے تھے
پہلے جو اظہار کرتے جا رہے تھے تو بات نہیں تواد کر کے انہیں اور یہ جاہلوں کی کسی بات کہنا چاہتا
ہذا اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو ہاں منشاء۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۚ وَلَا تُسْئَلُ عَنْ أَصْحَابِ

ہم نے تجھے بالحق بھیجا ہے کہ تو حق بشارت دہی و نذر دہی اور انہیں دوزخ اور جہنم سے

التَّحِيَّاتُ ﴿۱۹﴾
ہم دہتے جانوں گی۔

تفسیر
ابو کہ رسول اگر پہلے اذہلیہ و سلم کی شان و جود علیہ السلام کو تعظیم ہو کہ خدا کو
خدا کے آپ کو اس جہت اور شان کی بدولت و دل میں پیش آتی، اور ان کے ایمان و دین
کی کوئی ضرورت، مجموعی دین کے سبب تک ملوں اور دوزخ و جہنم جاتے، اس لئے اللہ تعالیٰ
آپ کی قسمل کے لئے ارشاد فرماتے ہیں کہ رسول، آپ کے آپ کو ایک چاروں دین و دین و خلق کی
طرف، بھیجا ہے کہ دانت جانوں کو حق خبری سناتے رہتے اور دانت جانوں کو سزا دے۔

معانی تفصیل تھے، اس کو دوبارہ پھر بیان کرتے ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ جب کا معنوی حکم
یعنی قرطبہ کے لئے انعام عام و خاص کا یاد دلانا اور ترہیب کیلئے قیامت کو پہلی نظر کرونا اور
تکبر و غرور و غیبت پر ہونے، اور کو مقصد و غلظت کلمات ہوتے ہیں کا غور و اختصار ان کے
اختصار کی وجہ سے پہل اور آسان ہوتا ہے، اور جو جاہلیت اور انفعالی کے ان کے ذریعے سے
ان کے جزئیات کا مضبوط دیکھنا آسان ہوتا ہے، اور عادات میں یہ طریقہ بھی اعلیٰ درجہ کا سمجھا جاتا
ہے، کو مصلحت اور مطلوب بات کرنے سے پہلے لیکت پہل مصلحت سے اس کی تقریر کر دی جاتی ہے، اس کا
قدر شکر کا تمام تفصیل کے بجائے میں صاف و حد و فکر ہوا اور آخر میں بطور خلاصہ اور نتیجہ تفصیل
اسی پہل مصلحت کا پھر بارہ کر دیا جاتا ہے، مثلاً یہ کہ اگر بڑی مصلحت ہے، اس میں
ایک ضروریہ اور سوا یہ، تمسیر ہے، اس میں معنی کیوں کہ پھر آخر میں کہہ دیا جائے کہ جو حق مجھ پر ہے
مصلحت ہے، اس پر اس آیت **لَا تَتَّبِعُوا الْاَوَّلَیْنَ** کا اضافہ فرمایا گیا ہے۔

اسے اور کا یہ عقوبت علیہ السلام، میری انی حضرت کو یاد کرو جو کا میں نے تم پر روشتاؤں
انعام کیا، اور اس کو بھی یاد کرو کہ میں نے تم کو بہت توکل پر رہت ہو، اس بات کی باتوں میں اوجیت
دی اور تم ڈرو اپنے دن سے، دین و دوزخ میں سے، جس میں کوئی شخص کسی کی طرف سے نہ کوئی
مطلبہ راوی و حاجب اور اگر کے پاسے گا اور نہ کسی کی طرف سے کوئی معاوضہ نہ جائے حق و انجیم
نہل کیا جائے گا اور دوسری کی کوئی سفاکاری نہ کیا جائے، پس مفید ہوگی اور دی کوئی کوئی نہ زور
چاہئے گا۔

وَ اِذْ اَنْتَ اٰیْرٰهُمْ رَبُّہٗ یٰکَلْبُکَ فَاَتَمَعْنَا مَا قَالِ الْاِنِّیْ جَالِدٌ

اور جب آؤنا ابراہیم کو اس کے دوپنے کی باتوں میں پھر اس نے دلواری، رب فرمایا، تم کو روکنا

لِاِنِّیْ اَمَامٌ اَدَّ اَقَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ اَقَالَ لَا یَتَاَلَّ عَصٰی

اسب گون کا پیشوا، اور اور میری اولاد میں سے بھی فرماؤ نہیں پیچے گا میرا مشورہ

الظالمین	ظالموں کو

اور جس وقت امتیاز کیا حضرت ابراہیم کا اسی کے پروردگار نے چند باتوں میں
خلاصہ تفسیر دلانے احکام میں سے اور وہ اسی کو کہنے سے نکالتا ہے، (اس وقت)

حق تعالیٰ نے ان سے، فرمایا کہ میں حکم داس کے صراط میں نبوت دے کر یا اہلکار و گور
کا مقصد و ابتداء کا، انھوں نے عرض کیا اور میری اولاد میں سے بھی کسی کسی کو نبوت دینے،
اور خدا ہو کر داب کی رؤاست منظور ہے، پھر اس کا ضابطہ میں لپچ کر (میرا ور) (میرا ونبوت)
خلاف و روئی قانون کر کے دالوں کو نہ ملے گا، دوسرا ایسے لوگوں کو فساد و جہاں سے، اہلکار
کر کے دالوں میں سے بعض کو نبوت دی جائے گی

معارف مسائل

اس آیت میں حق تعالیٰ نے بعض پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مختلف مقامات اور
ان میں ان کی کالیائی پھر اس کے انعام و صلہ کا بیان ہے، اور پھر جب حضرت حبشیل اللہ نے
ازادہ شفقت اپنی اولاد دے کے لئے بھی اس انعام کی رؤاست کی، و انعام پانے کا ایک ضابطہ
اور مشورہ راوی کیا جس میں حضرت خلیل اللہ کی رؤاست کی منظوری مشروط صورت میں
دی گئی کہ یہ انعام آپ کی رؤیت کو بھی ملے گا، مگر جو لوگ رؤیت میں سے ناسرمان اور
ظالم ہوں گے وہ یہ انعام نہ پائیں گے۔

صاحب خلیل اللہ علیہ السلام
اور میں میں امتیاز
پہاں چند باتیں غور طلب ہیں
اولیٰ یہ کہ امتیاز کسی شخص کی قابلیت معلوم کرنے کے لئے لیا جاتا

ہے، اور اللہ تعالیٰ علیہ السلام میں کسی شخص کا کوئی حال یا کمال ان پر کسی نہیں ہوتا، امتیاز کا مقصد یہ تھا کہ
دوسرے سے کہ امتیاز میں کس مصلحت سے لیا گیا۔

تیسرے یہ کہ کالیائی میں صورت اور کس نوعیت کی رہی۔
چوتھے یہ کہ انعام کیا دیا گیا اور اس کی مشیت کیا ہے۔

پانچویں یہ کہ اس انعام کے لئے جو ضابطہ معتد کیا گیا ہے اس کی کج توضیح و تفسیر۔
اس پانچوں مسالک کے جوابات تفصیل ملاحظہ فرمائیے

پہلی بات کہ امتیاز کا مقصد کیا تھا؟ فقہان کے کہ امتیاز کو دیکھنے کے لئے اس کو مل کر دیا ہے
یہ ہے کہ لیا گیا ہے کہ اس امتیاز کے ضمن خود اللہ جل شانہ ہیں، اور ان کے امتیاز میں سے اس
الطالعہ، و کمالیہ و نبوت کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے، جس کے معنی میں کسی چیز کو آہستہ بہت
درجہ کمال تک پہنچانا۔

مطلب یہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ امتیاز و امتیاز کسی قدر کی پاداش میں یا معلوم
قابلیت کا علم حاصل کرنے کے لئے نہیں، بلکہ خدای تعالیٰ تربیت و رو بہت اس کا منشا ہے، ان

آزمائشوں کے درپے اپنے خلیفہ کی قربت کر کے اس کے درجہ و مقامات تک پہنچا دیتا ہے۔ پھر اس میں منقول کو محترمہ اور قابل کو نہ فرکر کے پورا اور شامل ہوا دیکھ کر (اللہ تعالیٰ کا) جہم و تکبر اس میں ابراہیم علیہ السلام کی جلالت شان کو اور نایاب شہر پایا گیا۔

دوسرا سوال کہ امتحان میں غمازی سے رہا گیا اس کے متعلق فقہان شریعت میں تحریرات و مسلمات کا لفظ آیا ہے۔ اور اس لفظ کی تفسیر و تشریح میں حضرات معارف و تابعین کے مختلف اقوال ہیں، یہی نے اسکا ہم ایچہ میں سے وہی چیزیں شمار کیں، یہی نے میں بتلا دی ہیں، اور کسی نے اور جو کہ وہی دوسری چیزیں بتائیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں کچھ اختلاف نہیں، اور جیسے میں سب کی سب یہی حضرت خلیل اللہ کے مضامین امتحان تھے، البتہ تفسیر میں جریرہ اور این تفسیر کی یہی رائے ہے۔

ارشاد خدائی کے نزدیک علی مرتضیٰ یوں سے زیادہ ہیں معنائیں امتحان چھ کی تفصیل آگے میان ہوگی مابقی کے قابل قدر لفظوں پر کار کی علی غایت تھی ہے امتحانات کی طرح خلقی مساکن اور ان کی تحقیقات نہیں، بلکہ اختلافی قدروں اور عملی ثابت قدر کی جانچ ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ لفظ غزوہ و جلال میں جس چیز کی قیمت ہے وہ علی مرتضیٰ خیال نہیں، بلکہ علی اور اسلاف کی برتری ہے۔

اب ان معنائیں امتحان میں سے چند اہم چیزیں سنئے:

حق تعالیٰ کو منظور تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی غفلت کا خلعت خاص علما و فہما مال ملتے، اس نے ان کو سخت امتحانات سے گزارا گیا، پوری قوم کی کو اپنا خدا مان سب کے سب بدعت پرستی میں مضبوط تھے سب کے عقائد دوسرے مختلف ایک دین ملتیں ان کو حکم کیا گیا، اور اس کی تبلیغ اور قوم کو اس کی طاعت و دعوت لینے کا ہرگز آپ پر ڈال گیا۔ آپ نے بغیر ہر جز و ہمت کے ساتھ یہ عوف و خطر قوم کو خدا سے وعدہ لا طریک لہ کی طوط بولا، بدعت پرستی کی شرانگ و دم کی خرابیاں مختلف عزائمات سے بیان کیں، علی طور پر چونکہ خلافت چاہا گیا، پوری قوم کی قوم کا مادہ جنگ و جدال ہو گیا، بارشاد وقت ضرور اس کی قوم نے آپ کو اس میں ڈال کر دھم دلا دینے کا فیصلہ کر لیا، البتہ کہ خلیفہ نے اپنے سرکار کی رضامندی کے لئے اس سب جوں پر راضی ہو کر اپنے آپ کو اس میں ڈال دینے کے لئے پہلی کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیفہ کو امتحان میں کامیاب پایا اور آپ کو بھروسہ دیا:

فَلَمَّا تَبَيَّنَ الْأَمْرُ لِلنَّبِيِّ فَبَزَّ الْأَمْرُ
فَلَمَّا تَبَيَّنَ الْأَمْرُ لِلنَّبِيِّ فَبَزَّ الْأَمْرُ
فَلَمَّا تَبَيَّنَ الْأَمْرُ لِلنَّبِيِّ فَبَزَّ الْأَمْرُ
فَلَمَّا تَبَيَّنَ الْأَمْرُ لِلنَّبِيِّ فَبَزَّ الْأَمْرُ
فَلَمَّا تَبَيَّنَ الْأَمْرُ لِلنَّبِيِّ فَبَزَّ الْأَمْرُ
فَلَمَّا تَبَيَّنَ الْأَمْرُ لِلنَّبِيِّ فَبَزَّ الْأَمْرُ
فَلَمَّا تَبَيَّنَ الْأَمْرُ لِلنَّبِيِّ فَبَزَّ الْأَمْرُ
فَلَمَّا تَبَيَّنَ الْأَمْرُ لِلنَّبِيِّ فَبَزَّ الْأَمْرُ
فَلَمَّا تَبَيَّنَ الْأَمْرُ لِلنَّبِيِّ فَبَزَّ الْأَمْرُ
فَلَمَّا تَبَيَّنَ الْأَمْرُ لِلنَّبِيِّ فَبَزَّ الْأَمْرُ

کی تسخیر کر کے بھر نہیں دی تھا، اس لئے پوری دنیا میں جہاں کہیں آگ موجود تھی اس پر چلا دیا کہ آگ نے اپنی اپنی جگہ مراگ ٹھنڈی ہو گئی، اور ہر جگہ اس پر وہی آگ موجود تھی کہ ٹھنڈی ہو گئی، فقہان میں لفظ بھڑکنے کے معنی لگتا تھا، اس لئے فرمایا گیا کہ کسی چیز کی ٹھنڈک جدا احتیال سے بڑھ جائے تو وہی بھڑک کر طرح نکلتی، بلکہ ملک ہو جاتی ہے، اگر لفظ اسلام اور شاد ہو کر تو ممکن تھا کہ آگ بھڑک کر طرح ایسی ٹھنڈی ہو جاتی جو بجائے خود ایک غلاب بن جاتی تھی، چہل میں ایک غلاب زور پر رکھا گیا ہے۔

اس امتحان سے خلاص ہو کر دوسرا امتحان یہ لایا گیا کہ اصل وطن کو چھوڑ کر شام کی طوت ہجرت کرنا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رعنا سے خداوندی کی تڑپ میں قوم و وطن کو بھی بھڑکا دیا، اور دین الہی و عیالی ہجرت کر کے شام میں چلے آئے:

آہیں کہ تر استیفاخت جان راج کند
فشر و در و جلال و خاساں راج کند

اب قوم و وطن کو چھوڑ کر ملک شام میں قیام کرنا یہی تھا کہ جس طرح ملا کر لی بی اجروہا شہرنا اور ان کے شیرازہ چپے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ساتھ لے کر یہاں سے بھی کوچ کرنا یا کثیرا ہجرت کرنا امین آئے اور دونوں کو ساتھ لے کر پہلے راستہ میں جہاں کوئی سرسبز جگہ آئی تو حضرت خلیل فرماتے کہ یہاں ٹھہرا لیا جائے، جبریل علیہ السلام فرماتے کہ یہاں کا حکم نہیں، منزل آگے بڑھو جب وہ خشک پہاڑ اور گرم و گسٹان آیا ہے جہاں آگے کسی وقت بیت اللہ کی تعمیر و تعمیر مکہ کی بنی بنانا مقدر تھا، اس جگہ اس میں آپ کو اندھا پایا ہے، اللہ تعالیٰ کے خلیفہ نے اپنے پروردگار کی محبت میں سرور و دین کی اپنی شہل میدان اور بے آب و گیاہ جگہ میں اپنی قوم کو حکم ملتا ہے جس میں یہ امتحان اس پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ملتا ہے کہ اپنی قوم کو یہاں سے چھوڑ دے، اور وہ ملک شام کو لے کر جہاں میں اللہ کا حکم ملے اس کی تعمیل میں اس کی تعمیل میں اس کو کھڑا ہوتا ہے، اور شام کی طوت روانہ ہو جاتا ہے، تعمیل حکم میں اتنی تاخیر بھی گوارا نہیں کی جی کہ یہ اطلاع ہی دینے کے بجائے کہ خدا کا یہ حکم ملا ہے اس نے جہاں چاہا، حضرت اجروہا علیہ السلام جب آپ کو جاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو پکارا کرتے ہیں، مگر آپ جواب نہیں دیتے، پھر پکارا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس قدر دین میدانی میں نہیں چھوڑ کر کہاں جا رہا ہو اس کا بھی جواب نہیں دیتے، وگھر وہی اپنی بھی خلیل اللہ کی بی نہیں سمجھتیں کہ ماریا کیلئے، اور کہنے لگیں کہ کیا آپ کو اللہ تعالیٰ کا کرنے حکم ملا ہے، آپ نے فرمایا کہ ہاں، حضرت اجسرا علیہ السلام کو بھی جب کہ بھلاؤ دہی کا علم ہو گیا، تو قنات امتحان کے ساتھ فرمایا کہ جاتے ہیں

ان کے دل میں بہت چسپ اور عجب کیا کر کیا اور تعالیٰ نے آپ کو یہاں بھی بڑھ چلے جانے کا حکم دیا پھر
تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ملا ہے۔
اس کو سن کر حضرت ابراہیم نے فرمایا کہ میرا بھائی شوق سے جا رہا ہے اس لیے آپ کو یہ حکم دیا کہ
وہ جس میں شائع ہو کر ہے گا۔ ابراہیم علیہ السلام نے حکم خداوندی کی تعمیل میں یہاں سے چل کر گھر پہنچ کر
شکر فرمایا اور اس کی والدہ کا خیال کیا کہ وہ اس کا بھائی تھا جب ماں سترے کے موڑ پر پہنچے یہاں سے حضرت
ابراہیم کو بھیجیں تو علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا فرمائی کہ سورۃ ابراہیم کی آیت نمبر ۲۵
میں اس طرح مذکور ہے ا

وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ
(سورة ابراہیم ۱۱۳)

تو بشارت دے دو ان صابر لوگوں کو جن کو مصیبت آئے تو انہوں نے کہا ہم اللہ کے ہیں اور ہمیں اس کی طرف رجوع ہے۔
جن کی صبر و استقامت ہے۔

پھر وہاں سے واپس آیا
وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ
پہلے وہ صابرین کو بشارت دے گا جن کو مصیبت آئے تو انہوں نے کہا ہم اللہ کے ہیں اور ہمیں اس کی طرف رجوع ہے۔
ان کے دل میں بہت چسپ اور عجب کیا کر کیا اور تعالیٰ نے آپ کو یہاں بھی بڑھ چلے جانے کا حکم دیا پھر
تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ملا ہے۔
اس کو سن کر حضرت ابراہیم نے فرمایا کہ میرا بھائی شوق سے جا رہا ہے اس لیے آپ کو یہ حکم دیا کہ
وہ جس میں شائع ہو کر ہے گا۔ ابراہیم علیہ السلام نے حکم خداوندی کی تعمیل میں یہاں سے چل کر گھر پہنچ کر
شکر فرمایا اور اس کی والدہ کا خیال کیا کہ وہ اس کا بھائی تھا جب ماں سترے کے موڑ پر پہنچے یہاں سے حضرت
ابراہیم کو بھیجیں تو علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا فرمائی کہ سورۃ ابراہیم کی آیت نمبر ۲۵
میں اس طرح مذکور ہے ا

وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ
(سورة ابراہیم ۱۱۳)

تو بشارت دے دو ان صابر لوگوں کو جن کو مصیبت آئے تو انہوں نے کہا ہم اللہ کے ہیں اور ہمیں اس کی طرف رجوع ہے۔
جن کی صبر و استقامت ہے۔

پھر وہاں سے واپس آیا
وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ
پہلے وہ صابرین کو بشارت دے گا جن کو مصیبت آئے تو انہوں نے کہا ہم اللہ کے ہیں اور ہمیں اس کی طرف رجوع ہے۔
ان کے دل میں بہت چسپ اور عجب کیا کر کیا اور تعالیٰ نے آپ کو یہاں بھی بڑھ چلے جانے کا حکم دیا پھر
تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ملا ہے۔
اس کو سن کر حضرت ابراہیم نے فرمایا کہ میرا بھائی شوق سے جا رہا ہے اس لیے آپ کو یہ حکم دیا کہ
وہ جس میں شائع ہو کر ہے گا۔ ابراہیم علیہ السلام نے حکم خداوندی کی تعمیل میں یہاں سے چل کر گھر پہنچ کر
شکر فرمایا اور اس کی والدہ کا خیال کیا کہ وہ اس کا بھائی تھا جب ماں سترے کے موڑ پر پہنچے یہاں سے حضرت
ابراہیم کو بھیجیں تو علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا فرمائی کہ سورۃ ابراہیم کی آیت نمبر ۲۵
میں اس طرح مذکور ہے ا

وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ
(سورة ابراہیم ۱۱۳)

تو بشارت دے دو ان صابر لوگوں کو جن کو مصیبت آئے تو انہوں نے کہا ہم اللہ کے ہیں اور ہمیں اس کی طرف رجوع ہے۔
جن کی صبر و استقامت ہے۔

جو حکم تھا۔ اس میں حق تعالیٰ ہی سے اور اس کا طلبہ کی اس دعا کے اندر نہ کرنا و شرک سے محفوظ رہنا
کا اہتمام۔ یہ ایک خاص ناز ہے جس کو جب بیت اللہ کی عظمت و بزرگی کا حکم پڑھا تو یہی
بھی تھا کہ آئندہ چل کر کوئی ناواقف اس بیت اللہ کی وجہ نہ بنائے اور اس طرح شرک میں
مصبلا ہو جائے۔ اس لیے یہ دعا فرمائی کہ جو میری اولاد کو شرک سے محفوظ رکھا جائے۔
اس کے بعد شریعت اور اس کی والدہ پر شفقت کے پیش نظر یہ دعا فرمائی کہ میں نے
ان کو آپ کے حکم کے مطابق آپ کے محرم گھر کے پاس غلامی قرار دیا ہے لیکن یہ گھر ذرا مست کے
قابل بھی نہیں ہیں ان کو کوئی اپنی قسمت سے مردود یا تنگ نہ کرے۔ اس لیے آپ ہی اپنے
فضل سے ان کو چل کر باقری طحاوی میں ہے۔

یہ دعا کر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے وطن شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور سر
حضرت ابراہیم کا کچھ وقت قراں قریشہ کو پورا دانی کے ساتھ گھر گیا۔ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو
تھے اپنی خدمت ہونے کے بعد غریبی کی پاس سے بے چین اور شریعت اور بچہ کی اس وقت دانی کی تلاش
میں ان کا کشاکش اور کہیں کو مصیبت پر کہیں کو مردہ پر چڑھنا اور ان دونوں کے درمیان دور و دراز
داشت لے کر ان کا حضرت اسماعیل انھوں کے سامنے آجائیں۔ مام مسلمانوں میں معروف ہے اور یہ
میں مقارن کر کے درمیان میں کرنا آجنگہ اس کی یادگار ہے۔

اس وقت کے اقوام حضرت جبریل علیہ السلام کو بشارت دے گا جن کو مصیبت آئے تو انہوں نے کہا ہم اللہ کے ہیں اور ہمیں اس کی طرف رجوع ہے۔
ان کے دل میں بہت چسپ اور عجب کیا کر کیا اور تعالیٰ نے آپ کو یہاں بھی بڑھ چلے جانے کا حکم دیا پھر
تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ملا ہے۔
اس کو سن کر حضرت ابراہیم نے فرمایا کہ میرا بھائی شوق سے جا رہا ہے اس لیے آپ کو یہ حکم دیا کہ
وہ جس میں شائع ہو کر ہے گا۔ ابراہیم علیہ السلام نے حکم خداوندی کی تعمیل میں یہاں سے چل کر گھر پہنچ کر
شکر فرمایا اور اس کی والدہ کا خیال کیا کہ وہ اس کا بھائی تھا جب ماں سترے کے موڑ پر پہنچے یہاں سے حضرت
ابراہیم کو بھیجیں تو علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا فرمائی کہ سورۃ ابراہیم کی آیت نمبر ۲۵
میں اس طرح مذکور ہے ا

وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ
(سورة ابراہیم ۱۱۳)

تو بشارت دے دو ان صابر لوگوں کو جن کو مصیبت آئے تو انہوں نے کہا ہم اللہ کے ہیں اور ہمیں اس کی طرف رجوع ہے۔
جن کی صبر و استقامت ہے۔

اور انھیں کی ملاقات کے لئے مکرر مدعو ہوئے تو کیا کہ انھیں طیارہ اسلام ایک دوریت کے نیچے بیٹے ہوئے تھیں۔ یہاں پہنچے والد اہل کرم کو کچھ کرکھڑے ہوئے ملاقات کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک سلام کا حکم دیا ہے کہ تم اس میں میری مدد کرو گے؟ اُن فرزند نے عرض کیا کہ ہرگز نہیں کر دوں گا۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس ٹیکہ کی طرف اشارہ کیا، جہاں بیت اللہ تھا کہ جسے اس کی تعمیر کا حکم ہوا ہے۔ بیت اللہ کے مدد و دار جو حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو بتلا کر دیئے تھے۔ دونوں بزرگوار اس کام میں لگے تو بیت اللہ کی قدیم بنیادیں بچیں رہیں۔ انہیں چھ دونوں نے تعمیر شروع کر دی۔ اگلے آیت میں اس کا بیان ہے۔ ﴿وَلَا تَزِدْ لَهُ مِثْرًا﴾ الخ اوجہ بین الکھتبات فی التلبیۃ الخ جس میں اس صولت اشارہ ہو کر آیت میں اللہ اصل میں حضرت عبد اللہ علیہ السلام اور انھیں علیہ السلام دو گنا کی حیثیت سے شریک ہیں۔

ابن تمام آیت پر غور کرنے سے دو حقیقت واضح ہو جاتی ہے جو بعض دایاں مدہ دل اور تاجی میں غور ہو کر بیت اللہ پہلے سے دنیا میں موجود تھا کیونکہ تمام آیت میں کہیں بیت اللہ کی جگہ بتلا دینے کا ذکر نہیں اس کو ایک صاف دیکھنے کا ذکر ہے۔ یہ کہیں مذکور نہیں کرنا کوئی نیا تعمیر کرنا ہے اس کی تعمیر کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ کا وجود اس واقعہ سے پہلے موجود تھا کہ خرقہ فرما کر جسے وقت منہم ہو گیا یا اٹھایا گیا تھا۔ صرف بنیادیں موجود تھیں۔ حضرت ابراہیم اور انھیں علیہ السلام کعبہ کے پہلے بنائے تھے۔ بلکہ بنائے بنائے بنیادوں پر پھر تعمیر ان کے اٹھائے ہوئے ہیں۔

ابہا یہ معاملہ کہ پہلی تعمیر کرنے والے اور کس وقت کی اس میں کوئی صحیح اور کوئی رعایت مدہ دل کی مشغولی نہیں۔ اب کتاب کی رعایت میں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب پہلے اس کی تعمیر کو ہم طیارہ اسلام کے اس دنیا میں آئے سے پہلے ہی رشتوں نے کی تھی۔ پھر کو ہم طیارہ اسلام نے اس کی تعمیر فرمائی۔ یہ تعمیر طیارہ نور تک آبادی میں طوفاً نور میں منہم ہوجانے کے بعد سے ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ تک یا ایک ٹیکہ کی صورت میں یا ذاتی، حضرت ابراہیم علیہ السلام طیارہ اسلام لے کر تعمیر فرمائی۔ اس کے بعد اس تعمیر میں شریعت و وحی تو ہمیشہ ہوتی رہی مگر منہم نہیں ہوئی۔ آخر حضرت علی علیہ السلام کی جنگ قبل قرین مکہ نے اس کو منہم کر کے لاسر تعمیر کیا جس کی تعمیر میں حضرت علی علیہ السلام نے بھی خاص شرکت فرمائی۔

احکام و مسائل متعلقہ حرم محترم

۱۔ لفظ نکاح سے معلوم ہوا کہ اگر خدائی نے بیت اللہ کی خاص غنیمت بخشی ہو کر وہ ہمیشہ

مروج مسلمان بنانے کا اور لوگ اور اس کی طرف جاتے اور آتے کے کرنا و مندو ہیں گئے۔ انھیں سر حضرت کاٹنے فرمایا۔ بعضی اس میں صفا و طہارت و قریش انہیں کوئی آدمی اس کی زیارت سے بھی سر نہیں ہوتا کہ گھر پر نہ پہنچے سے زور زبانت و طوات کا شوق لیکر فرماتا ہو اور بعض صلا، نے فرمایا کہ قبلہ کی کی طاعت میں سے ہے کہ وہاں سے لوٹنے کے بعد پھر وہاں جاتے کا شوق دل میں پائے۔ چنانچہ ہم طور پر اس کا مساندہ کیا جاتا ہے کہ پہلے عرب جتنا شوق زیارت بیت اللہ کا ہوتا ہے دوسری طرف کے لئے اس شوق میں اضافہ ہوا ہے۔ اور وہاں جوں بار اور زیارت کرنا کہ جتنا ہے۔ عرب اور بڑبڑنا ہوتا ہے۔

یہ مجاز بیت اللہ کی خصوصیت ہو سکتی ہے۔ اور دنیا کے ہر سے بڑا نذرانہ انسانی ایک دور و دراز دیکھ لینے کے بعد میر ہو جاتا ہے۔ اور باوجود سات مرتبہ کیجئے کے بعد قودیکے کا وہاں میں نہیں آتا۔ اور یہاں تو کوئی خوش منظر مسیحا دو دہائی پہنچا کہ آسان ہے۔ اندواں دنیا کے کار و بار کی کوئی اہمیت نہ اس کے باوجود وہ لوگوں کے دل میں اس کی تپ بہت مشہور ہو کر رہتی ہے۔ ہر اور کو پھر خراج کر کے سنگتراں مٹھیں چیل کر وہاں پہنچنے کے مستحق رہتے ہیں۔

۲۔ لفظ انشاء میں مگر تا میں جاتے اس کے معنی میں ہوا۔ اور لفظ مینسا سے مراد صرف بیت اللہ یعنی خاد کعبہ نہیں بلکہ پورا حرم مملو ہے۔ فرقان کریم میں بیت اللہ اور کعبہ کا لفظ اول کر پورا حرم مراد لینے کے اور یہی شرط ہو سکتی ہے۔ اور شاید ہے۔ ﴿لَقَدْ بَنَى الْكَعْبَةَ﴾ ۱۹۵۔ اس میں لفظ اول کر پورا حرم مراد لیا گیا ہے۔ کیونکہ اس میں ذکر مفسرانی کا ہے اور بیت کعبہ کے لئے مفسرانی نہیں ہوتی۔ اور وہاں مفسرانی کرنا جائز ہے۔ اس لئے معنی آیت کے یہ ہو کر کہ ہم نے حرم مملو کو جہاں سے اس بنا دیا ہے۔ اور جاتے اس بنا دینے سے مراد وہ لوگوں کو یہ حکم دینا کہ حرم محرم کو کام مقل و مثال اور انشاء سے ملے اور طریقے (راہنہ) کی

چنانچہ زما و مالیت میں بھی عرواں کے خدائیں مسلتہ ابراہیم کے ہو کر آئندہ ان کے موقوفے میں ہی یہ بھی حرم مملو ہے۔ اب اور یہاں کا شوق بھی کسی کو نہ لانا و تقام نہیں لینے تھے۔ اور ہاں جنگ و قتال کو بھی حرم میں حرام سمجھتے تھے۔ شریعت اسلام میں بھی یہ حکم اس طرح ذاتی تھا گیا۔ نتیجہ کے وقت صرف چند مٹھوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے اذن جسم میں مثال کرنا کہ جہاں گامی تھا۔ جس وقت پھر ہمیشہ کے لئے حرام کر دیا گیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے خطبہ میں اس کا اعلان فرمادیا (مجھے بتادیا)

ابہا یہ مسئلہ کہ کوئی شخص جسم کے اندر کوئی ایسا جرم کرے جس پر حد و قصاص اسلامی شریعت کی نروسے مانع ہو یا جو حرم اس کو اس میں نہیں دے گا۔ بلکہ اس پر باجماعت

دور و فساد میں جاری کئے جائیں گے۔ را حکام ہفت سو گن جفت میں وقت صرفی کیونکہ
قرآن کریم کا ارشاد ہے :
قَالَ قَتَلْتُمْ نَفْسًا كَاتِبًا قَاتِلُهَا كَانَ عَذَابُهُ كَثُورًا
نفس کو قتل کر دو۔

البتہ یہاں ایک مسئلہ اہل مجتہد میں مختلف فیہ ہو گا وہ یہ کہ کوئی شخص اپنے سرے جرم کے
خروج میں بنا دینے کے ساتھ کیا معاہدہ کیا جائے گا اس میں بعض ائمہ اس پر بھی حرم میں
حدود و قصاص کی سزا نہیں جاری کرنے کا حکم دیتے ہیں اور امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک اس کو
سزا سے چھوڑنا تو یہ ہے کہ اگر گواہی کا تاجرازم کے سوا کسی کے سوا ہے جسے کا معاہدہ کھل جائے گا اور عام
میں فساد برپا ہو جائے گا اور حرم کی زمین کا ٹھکانا بن جائے گا، لیکن احرام جرم کے سبب حرم کے
اندرون میں جا کر کسی کو قتل کیا جائے گا کہ حرم سے باہر پہنچے، دہل سے نکلے کہ بعد از چاروں کی حالت کی۔

۳۔ قَاتِلُهَا وَابْنُ عَمَلٍ غُلَامٌ وَابْنُ عَمَلٍ غُلَامٌ مَسْتَقْبِلٌ اس میں مقام ابراہیم سے مراد وہ تاجر
جو جس پر حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کے قتل کے قدم مبارک کا بطور مجرمہ نشان چڑھا
تھا اور میں کو تعمیر بیت اللہ کے وقت آئے، پتھال کیا تھا مدعی بھلائی،

حضرت اس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے اس پتھر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے
ذبح مبارک کا نقش دیکھا ہے، مگر لوگوں کے کثرت عجز نے اور اسے غفلت سے اسے اب نشان
بنا کر گھمایا ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس سے مقام ابراہیم کی تفسیر میں یہ بھی
منقول ہے کہ پورا حرم مقام ابراہیم ہے، و تحقیق یہ کہ اس سے مراد یہ دو کھوکھلے کے بعد کہ دو
رکتیں ہیں کہ وہ مقام ابراہیم پر چٹے کا ٹھکانا ہے، اس میں کسی کی تعمیل یا جسے حرم میں کسی
جگہ جس پر رکتیں چڑھنے سے بچا جائے گی اس پر اکثر فضیلت ثابت ہے۔

۴۔ آیت مذکورہ میں مقام ابراہیم کو مصلیٰ بنانے کا حکم ہے اس کی صفات یہ خود رسول کی
صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاور اربع میں اپنے قول و عمل سے اس طرح فرمادی کہ آپ طواف کے بعد
مقام ابراہیم کے پاس پہنچے جو بیت اللہ کے سامنے خوشے کے قاصد سے دکھا ہوا ہے وہاں پہنچ کر
یہ آیت تلاوت فرمائی، قَاتِلُهَا وَابْنُ عَمَلٍ غُلَامٌ مَسْتَقْبِلٌ اور یہ مقام ابراہیم کے چوتھے
اس طرح دو رکعت نماز میں کہ مقام ابراہیم کو دہلیا میں دیکھتے ہوئے سر سے اللہ کا استقبال ہو جائے
و جب صلہ اس لئے قیام کرتے ہیں فرمائیے کہ میں شخص کو مقام ابراہیم کے چوتھے جگہ سے ملے اور
کہنے کی قاصد میں بھی جب اس طرح کھڑا ہو کہ مقام ابراہیم میں اس کے سامنے ہے اور بیت اللہ کی
قواسم حکم کی پوری تعمیل ہو جائے گی۔

۵۔ اس آیت سے ثابت ہو کہ طواف کے بعد کی دو رکعتیں واجب ہیں وہ خاص و عام اس
مطلق قاری،

البتہ ان دو رکعتوں کا خاص مقام ابراہیم کے چوتھے اور اگر اس وقت یہاں حرم میں کسی دوسری جگہ
بھی دار کمرے کو کھالی ہوگا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان دو رکعتوں کا بیت اللہ کے دروازے
سے متصل چڑھنا ثابت ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی یہی روایت منقول ہے (وہ جس)
اور مطلق قاری نے کتاب مناسک میں فرمایا ہے کہ یہ دو رکعت طواف تو واجب ہیں اور سنت ہے
یہ کہ مقام ابراہیم کے چوتھے اور ان کا جائیں لیکن اگر کسی وجہ سے وہاں ادا کر سکا تو پھر حرم میں یا اگرچہ
باہر چلاں لیکن جس میں ہو اور اس کے لئے واجب اور اہل بیت سے گناہ، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ
چھوڑا اور اس میں حضرت ام سلمہ کو ایسا ہی اتفاق ہوا کہ ان کو واجب طواف نماز پڑھنے کا وہاں موقع نہ ملا
تو مسجد حرام منکر منکر سے نکلے کے بعد وہاں کی اور بعد از صلا کے بعد وہاں کی رہے اور وہاں کے بعد وہاں کے
نزدیک کوئی دم میں بھی واجب نہیں ہوتا، صرف اہل ملک جو دم کے قائل ہیں وہ اس کے مطلق قاری
۱۔ تِلْكَ رِجَالٌ لَا لِيَهُمْ شَرَفٌ فِي حَيَاتِهِمْ وَلَئِنَّهُمْ يُرْجَوْنَ اس میں بیت اللہ کو چمک کرنے کا حکم ہے جس میں ظاہری غیاسات
اور گندگی سے طہارت بھی داخل ہے اور باطنی غیاسات کو ضرر نہ کرنا اور غلطی و ذلہل مضی و حسد

حرم و ہوا و کجی و غرور و زاریہ و دام و نحو سے پاک بھی شامل ہے، اور اس میں حکم پلہارت کیلئے لفظ تہیۃ
میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ حکم تمام مساجد کے لئے عام ہے، کیونکہ ساری مساجد بیت اللہ جیسا
ہیں کہ ان کو اس سے، تِلْكَ رِجَالٌ لَا لِيَهُمْ شَرَفٌ فِي حَيَاتِهِمْ وَلَئِنَّهُمْ يُرْجَوْنَ ۱۰۴

حضرت زادوئی نے مسجد میں ایک شخص کی آواز سنی، تو فرمایا میں نے خبر نہیں کہ تم کہاں
کھڑے ہو اور قرطبی نے بھی کہہ دیا کہ وہاں حرام چاہئے، اس میں خبر شریفہ والا جگہ نہیں کرنا چاہئے،
مائل ہے کہ اس آیت سے اس طرح بیت اللہ کا تمام ظاہری اور باطنی غیاسات سے پاک کرنا
منزور ہے، اس طرح تمام مساجد کو بھی پاک رکھنا واجب ہے، یعنی مساجد میں داخل ہونے
والوں پر لازم ہے کہ اپنے بدن اور کپڑوں کو بھی تمام غیاسات اور بدوئی کی چیزوں سے پاک صاف
رکھیں اور اپنے رول کو مشترک و لائق اور تمام احسان و زلی، و کجی و حسد، بغض و حسد و دبا و دلیو
کی غیاسات سے پاک کر کے داخل ہوں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ کوئی
شخص چپکے بسن فرود ہوا یا جیسے کہ مسجد میں نہ جائے، اور وہ چپکے چلاں اور دیوانوں کو مسجدوں میں
داخل نہ کرے، سے منکر اس آیت سے غیاسات کا منکر ہونا ہے۔

۲۔ قَاتِلُهَا وَابْنُ عَمَلٍ غُلَامٌ مَسْتَقْبِلٌ قَاتِلُهَا وَابْنُ عَمَلٍ غُلَامٌ مَسْتَقْبِلٌ اس میں غیاسات سے پاک کرنا اور غیاسات سے پاک کرنا
مائل ہونے، اولیٰ یہ کہ بتا بہت اللہ کا مقصد طواف، اعتکاف اور نماز ہے، اور سرے یہ کہ طواف

ساز سے مقدم ہے رکاردی ہیں جس اس آئینہ پر کا مرآت عالم سے جانے والے حاکم کے لئے طرا
بانیت نماز کے افضل ہے جو حق سے کہ بیت اللہ کے اندر نماز علی الاطلاق جائز ہے منسوس ہو
بفضل رحمتا

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ
وَنُحُوسًا مِنْ أَمْنٍ مِنْكُمْ يَا اللَّهُ وَالتَّيْمُ الْآخِرُ قَالَ وَمَنْ

اور جب کہا ابراہیم نے اے میرے رب بنا اس کو جس میں امن کا اور روزی دے اس کے لئے
وَنُحُوسًا مِنْ أَمْنٍ مِنْكُمْ يَا اللَّهُ وَالتَّيْمُ الْآخِرُ قَالَ وَمَنْ

اور ان کو جو ہے جو کہی ان میں سے ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن فرمایا اور
سَقَرًا فَامْتِعْهُ فَلَمَّا تَمَّ أَصْطَرَّ كَأَنَّهُ عَلَىٰ عَذَابٍ وَثِيقٍ

کڑیہ اس کو جس میں تھیں سزاؤں کا مشورے دونوں پھر اس کو جہنم میں ڈال دیا اور جب کہ عذاب میں اور
التَّعْصِيَا ۚ وَلَا يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ

بڑی جگہ سے بڑھ کر اور یاد کر جب اٹھائے تھے ابراہیم بنیادی خانہ کعبہ کی اور
اسْمِئِيلَ ۚ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ التَّيْمُ الْعَلِيمُ ۝ رَبَّنَا

اسمعیل، عاقرت تھے اور دعا دیکھ کر قبول کرے جس کو کہنے والے دعا سے دعا
وَجَعَلْنَا مِثْقَلًا لِّكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُبَارَكَةً لَكَ

جنگ اور کریم کو حکم پر وادارنا اور ہماری اور میں جس کو ایک جماعت فرما کر وادار
وَأَرْأَيْنَا سِكَانًا وَثَبَّ عَلَيْنَا إِبْرَاهِيمُ فَأَتَتْهُ ثَوَابُ ثَلَاثِينَ ۝

اور سیکان کو تھانے کے لئے اور ہم کو سوا کر جیسا کہ فرمایا کہ قبول کرے اور ہر
خلاصہ تفسیر اور اہل وقت میں انکار کے قابل ہے جس وقت ابراہیم علیہ السلام نے
اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے رب دعا دیکھ کر اس کو قبول کر اور دعا
شہر بنا دیکھ اور شہر کیسا اس راہن والے اور اس کے لئے دعا دیکھ اور اس کو قبول کرے جس
حاکمیت کیے راہ میں سب لئے دونوں کو پس کیا کہ خاص ان کو کہتے ہوں جو ان میں انسان

چرا، اور قیامت پر ایمان لگتے سن رہا تھی کو آپ جانیں اسی آسمانی نے ارشاد فرمایا کہ جو
وہی بنا خاص نہیں ہے اس لئے عزت سب کو ان کا مومن کو بھی اور اس شخص کو بھی جو
کافر ہے اور نہ جنت آخرت کے کہ اہل ایمان کے ساتھ خاص ہی سزاؤں واسطیٰ اپنے شخص
وہی کہ کافر ہو انھوں نے روز زمین و آسمان کو تو شب آرام پر نازل کیا لیکن پھر ابراہیم
کشان کشا عذاب و سزا میں مبتلا ہوں گا اور اسی کی جگہ تو بہت بڑی ہے اور اللہ جانے اور
دو وقت میں یاد کرنے کے قابل ہر ایک انھار ہے کہ ابراہیم علیہ السلام میں اس نے خدا کی اور ان کے
ساتھ اسٹیل علیہ السلام میں اور یہی کہتے جاتے تھے کہ اے ہاتھ پر اور دعا دیکھ کر اس کو قبول کرے
قبول فرما کرے بلاشبہ آپ قبول کئے رائے جاتے رائے میں ہماری دعا کھلتے ہیں ہمارے
کو ملے ہیں اے ہاتھ پر اور دعا دیکھ کر قبول کرے کہ ہم کو اپنا اور یاد
میں بنا دیکھ اور ہماری اور ان کے میں ایک ایسی جماعت پیدا کیجئے جو آپ کی میں ہر اور وہی
ہم کو جانے کہ درجہ کے احکام میں بتا دیجئے اور اللہ تعالیٰ ہر ہر ہائی کے ساتھ توجہ دیکھتے اور
لی العیبت آپ ہی ہیں توجہ فرمائے رائے ہر ہائی کرتے جائے

معارف مسائل

حضرت فہیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ کی راہ میں فتر انہاں دیں ، حال وصال
اہل و عیال اور خوار اپنے نفس کی خواہشات کو نظر انداز کر کے تعین احکام ربانی میں مسامت
کے جو کارنامے پیش کئے وہ عجائب و درگاہ میں ہے۔

اس کے ساتھ اہل و عیال پر شفقت و رحمت ایک طبع اور غریب اور غریب کے ساتھ
حکم دانی میں ہے، مذکورہ تصدیقات اس کا منظر ہیں، انھوں نے اپنے اہل و عیال کیلئے دنیا دنیا
کی تمامش و راحت کے لئے وہ مائیں اٹھیں ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہیں دعا و شروع لفظ سب سے کہا ہے جس کے معنی ہیں اے میرے
پائے والے اہل الطاف میں دعا مانگنے کا سلیقہ صحیح ہے کہ غریب الطاف حق تعالیٰ کی رحمت اور
لطفت و کرم کو مستوجب کر لے پر مؤخر و اہل میں پھر سب سے پہلی دعا یہ سن رہی کہ اس میں اہل میدان
کو جس میں آپ کے حکم کے مطابق میں نے اپنے اہل و عیال کو لایا ہے آپ ایک شہر جاری
تاکہ میں کی سکونت میں ان کو وحشت و ہوا و مرز و بات زندگی کا ساقی میرے آجائیں اور میں
سزاؤں میں خنڈ ان کی آیت کے الطاف سے آتی ہے، جس میں اہل الطاف کو لایا ہے کہ ساتھ
کیا ہے، جو عربی زبان کی اصطلاح میں مرقہ کہلاتا ہے، فرق کی وجہ غالباً ہے کہ پہلی دعا جو کائنات

قرآن کے معانی کو سمجھیں تاکہ فسر آئی کریم کے حقیقی انوار و برکات کا مشاہدہ کریں، اور نورانی فسر آئے گا اصل مقصد یہ رہا کہ قرآن کو معاذ اللہ چند منتر کی طرح صرف مجاہد پھونکے بغیر نہ سمجھا جائے، اور بقول اقبال محرم سورۃ یٰسین کو صرف اس کام کے لئے نہ سمجھیں کہ اس کے چڑھنے سے مرنے والے کی جان ہولست سے نکل جاتی ہے۔

خلاصہ حکام یہ کہ اس آیت میں قرآن میں دوسول بیان کرتے ہوئے حکومت آیات کو مستقبل فرض کی حیثیت دے کر اس پر تنبیہ کر دی گئی ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ کی عظمت اور ان کی حفاظت اور ان کو خشک اسب و لہجہ میں چڑھنا پس پروردگار نازل ہوئے ہیں، ایک مستقبل فرض ہوا، اس طرح حکومت آیات کے فرض کے ساتھ تعلیم کتاب کو رہا گاہ فرض قرار دینے سے ایک دور مراہم چھپے ہوئے حکماء کو فسر آئے بغیر کے لئے صرف قرآنی زبان کا بیان لینا کافی نہیں بلکہ تعلیم رسول کی ضرورت ہے جسے کو تمام علوم و فنون میں وہ بات معلوم و مشاہدہ کر سکیں جن کی کتاب کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے محض اس کتاب کی زبان جانتا ہو نہ زبان کا ہر جزو نامی کافی نہیں جب تک کہ اس میں کوئی ماہر مستند اسے حاصل نہ کیا جائے، مثلاً آجکل ڈاکٹری، جو میوہ چشمک اور ایلو چشمک کی کتابیں عوامی زبان پر لکھی ہیں، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ محض ڈاکٹر ہی نہ زبان میں مہارت، پیدا کر لینے اور ڈاکٹری کی کتابوں کا مطالعہ کر لینے سے کوئی شخص ڈاکٹر نہیں بن سکتا، انجینئرنگ کی کتاب میں چڑھنے سے کوئی انجینئر نہیں بن سکتا، بڑے فنون قرآنی بلکہ چھوٹے، معمولی و درود کے خاص کی کتاب مطالعہ کرنا اس سے کچھ ہونے حاصل نہیں ہرگز آج تو ہر صنعت و حرفت پر مینٹکر لیا گیا ہے، اب ہر شخص ہوتی ہیں، تو خود ہر کام سمجھانے کے طریقے بتاتے ہیں، لیکن ان کتابوں کو دیکھ کر مذکور کی درسی کتاب سے نہ باور ہی یا تو بار، اگر محض زبان جان لینا ہی جن کے حاصل کرنے اور اس کی کتاب سمجھنے کے لئے کافی ہوتا تو دنیا کے سب فنون اس شخص کو حاصل ہو جاتے، چنانچہ کتابوں کی زبان جانتا ہے، اب ہر شخص ضرور کہتا ہے کہ رسول فنون اور ان کے سمجھنے کے لئے جب بعض اوقات قرآنی زبان کا نہیں، تعلیم استاد کی ضرورت ہے تو معانی میں فسر آئی جو علم ہر آدمی سے لے کر طبعیات و فلسفہ تک تمام گہرے و قہین علوم پیش کر دے، مگر فسر آئی زبان جانی لینے سے کچھ حاصل ہو سکتے ہیں، اور اگر کسی کو تو ہر شخص قرآنی زبان تک لے نہ معادین قرآن کا، ہر کما جائے تو آج بھی ہر اردو لکھنوی اور لکھنوی عرب مالک میں قرآنی زبان کے ثبوت پر اور اب یہ وہ مرتبہ جسے سفیر فسر آئی ملے جائے، اور وہ بد رسالت میں اور قبول یا قبولت قرآن کے ماہر سمجھ جائے۔

فرض ہے کہ فسر آئی کریم نے ایک طرف تو رسول کے فرض میں حکومت آیات کو ایک

مستقبل فرض متاخر دیا، دوسری طرف تعلیم کتاب کو رہا گاہ فرض متاخر دے کر بتلوا کہ محض حکومت آیات کا کافی لینا نہ فسر آئی کریم کے قرآنی زبان جاننے والوں کے واسطے کافی نہیں بلکہ تعلیم رسول ہی کے ذریعہ فسر آئی کریم کا صحیح علم حاصل ہو سکتا ہے، قرآن کو تعلیمات رسول سے ہوا کر کے خود سمجھنے کی فکر خود فرضی کے ساتھ نہیں، مگر معانی فسر آئی کو بتلانے کے معنی نہ ہوتی تو رسول کو سمجھنے ہی کی کوئی حاجت نہ تھی، اللہ کی کتاب بھی دوسری طرح بھی انسان اور ملک پر پڑھائی جاسکتی تھی، مگر اللہ تعالیٰ تعلیم حکیم نہیں دے رہا تھے، بلکہ یہ کہ معانی فسر آئی کی تعلیم تعلیم کرنے والے دنیا کے درستی علم و فنون سے زیادہ تعلیم استاد کو ضرورت ہے اور یہاں پر امام استاد میں کافی نہیں، بلکہ ان معانی کا استاد صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جس کو حق تعالیٰ نے بڑے ہی شرف و عظمیٰ حاصل ہو، جس کو اسلام کی اصطلاح میں نبی و رسول کہا جاتا ہے، اس لئے قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نمایاں جیسے کا مقصد بتلوا رہا کہ وہ قرآن کریم کے معانی و احکام کی شرح کر کے بیان فرمائیں، اور اشارہ ہے لیکن لئلاں، تاتلوا لہ و لعلہم، یعنی کہنے آپ کو اس لئے سبیل ہے کہ آپ لوگوں کے لئے اللہ کی نازل کردہ کتاب کے مطالب بیان فرمائیں، تعلیم کتاب کے ساتھ آپ کے قرآن میں دوسری چیز تعلیم حکمت بھی دیکھی گئی ہے، اور میں نے اشارہ جلا ہے کہ حکمت کے قرآنی زبان کے اعتبار سے اگر کسی کو سننی ہو سکتے ہیں، لیکن اس آیت میں اشارہ اس کے ہم معنی دوسری آیات میں واضح رہا ہے، اور میں نے تفسیر میں اس آیت کا بھی اشارہ کیا ہے کہ اس طرح فیصلہ تفسیر کے اصول و قواعد جن کا نام سنت قرآن کی تعلیم میں آپ کے قرآن میں نہیں ہیں، اور اعلیٰ سے آخرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما کر انشاء فرماتے ہیں کہ میں تو مقلد بنا کر ہو گیا ہوں، اور یہ ظاہر ہو کر جب آپ کا مقصد جو رسول ہو، تو آپ کی امت کا مقصد جو رسول اور طالب علم ہوا، لازماً ہو گیا، اس لئے ہر مسلمان مرد و عورت، جو تعلیمات اسلامی ہونے کے ایک طالب علم ہونا چاہے جس کو تعلیمات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گہنی ہو، اگر وہ قرآن و سنت کی تعلیم نہیں لے رہا، اور اس میں مہارت کے لئے ہمت، و فرصت نہیں ہے تو کہہ کہ بعد و ضرورت علم حاصل کرنے کی فکر جائے۔

پھر حضرت علیؓ اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآن میں بھی یہ تذکرہ ہے جس کے معنی ہیں، ظاہری و باطنی خواہشات سے پاک کرنا، ظاہری خواہشات سے تو عام مسلمان واقف ہیں، باطنی خواہشات کو تو اکثر حکماء و اشراف و اعیان کو اور اخصا قاصد، و غیر مفسر و صاحب محبت دنیا و آخرت میں اگر ہم علم و طہر قرآن و سنت کی تعلیم میں ان سب چیزوں کا بیان آگیا ہے، لیکن تذکرہ کو آپ کا

اور اہل عت کے ادر کہ نہیں اور سب کچھ جانتے سمجھنے کے بعد بھی حالت یہ ہوتی ہے کہ سے جانتا ہوں تو آپ طاعت و زہد پر طبیعت اور صبر نہیں آتی

محل کی ہمت و قوتیں بھی کٹا کچھ چڑھنے لگتے ہیں اور نہیں ہوتی اس کی صرف ایک ہی تدبیر ہو کہ اللہ والوں کی محبت اور ان سے ہمت کی تربیت حاصل کرنا اس کا نام تزکیہ ہے۔ مشرکین کفر سے بے تزکیہ کو مقاصد رسالت میں ایک مستقل مقصد قرار دے کر تعلیمات اسلام کی نمایاں خصوصیت کو بتا رہا ہے کہ جو کہ حسن تعلیم اور اظہار ہی تہذیب و تہذیب پر قیام اور ہر شے کی کسی بھی صورت سے کامل یا ناقص تشریح پر ضروری بھی جاتی ہے، ہر مذہب و ملت اور ہر سرکاری میں اس کو انسانی ضروریات میں داخل سمجھا جاتا ہے، اس میں مسلم ایک خاص شریعت ہے جو اس میں صحیح اور بحسن تعلیم پیش کی جو انسان کی انفرادی زندگی سے لیکر مائیکر جہاں کی زندگی اور اس سے آگے بڑھ کر سماجی و عقلی زندگی پر عادی اور بہترین نظام کی حامل ہے، جس کی نظیر دوسری اقوام میں نہیں پائی جاتی، اس کے ساتھ تزکیہ و تہذیب اور باطنی طہارت ایک ایسا کام ہے جس کا نام اقام اور سوسائٹیز میں سے بہت سے نفاذ اور کر رکھا ہے، انسانی حیانت و ہندو کا دیکھا اور اس کی تعلیمی ڈگریاں بھی جاتی ہیں، انہیں ڈگریوں کے وزن کے ساتھ انسانیوں کا وزن لکھنا بڑھتا ہے۔ مسلمان نے تعلیم کے ساتھ تزکیہ کا تہذیب کا کر تعلیم کے مصلحت کو دیکھ لیا۔

یہ خوش نصیب حضرات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے زیر تعلیم ہے، تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کا باطنی تزکیہ بھی ہو گیا، اور جو جماعت صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ کی زیر تربیت تیار ہوئی، ایک طرف ان کی عقل و دانش اور دل و جھک کی گہرائی کا یہ عالم تھا کہ ان کی دنیا کے فلسفے اس کے سامنے گر، جو کچھ، خود دوسری طرف ان کے تزکیہ باطن اور تقویٰ مع اللہ اور اعتدال اللہ کا یہ درجہ تھا جو خود قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَتَيْنَاهُمُ الْأَقْلَامَ
فَكَتَبُوا وَتَبَيَّنَ لَهُمْ كَثِيرٌ مِّنْ أَمْرِهِمْ
وَلَمْ يَكُنْ لَهَا بُحْرَةٌ وَتَفَتُّهُمُ
وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۱۲۱)

یہی درجہ ان کو وہیں طوط چلنے سے فتح و فتح پتہ ان کے قدم یعنی نئی تائید و پانی ان کے ساتھ دینی نئی ان کے لیے عقل کا تار سے جو کچھ بھی پر ہم، ملت کے زہنوں کو عیب کھنے ہوئے

یہی وہ اسی تعلیم و تزکیہ کے اعلیٰ نتائج ہیں، آج دنیا میں تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے نصابوں کی تہذیب و تہذیب پر قیام ہو گیا، خود کر نے ہیں، لیکن تعلیم کی روح کو درست کرنے کی طرف عام طور پر توجہ نہیں دی جاتی، اگر مقدس اور مسلم کی جہان کی حالت اور سماجی ذہنیت کو دیکھا جائے اس پر زور دیا جائے، اس کا نتیجہ ہے کہ ہر تزکیہ و تہذیب کے بعد بھی ایسے عقلی انسان پیدا نہیں ہوتے جن کے عہد جہان و دوسروں پر اثر انداز ہوں اور دوسروں کی تربیت کر سکیں۔

یہ ایک کمال ہوئی حقیقت ہے کہ اساتذہ جس میں علم، دین اور اخلاق و کردار کے مالک ہیں ان سے بڑھتے والے طلبہ زیادہ سے زیادہ اچھے جیسے پیدا ہو سکیں گے، اس لئے تعلیم کو مقصد اور بہتر بنانے کے لئے نصابوں کی تدوین و تہذیب سے زیادہ اس نصاب کے پڑھانے والوں کی علمی و عملی جہان کی حالت پر نظر انداز کر دیا ہے۔

یہاں تک رسالت و نبوت کے عین مقاصد کا بیان تھا، آخر میں مختصر طور پر یہ بھی بیان ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو میں اس قدر اہمیت تھی، جس سے ان کو کچھ کچھ اس حد تک پورا فرمایا، آپ کو ان کے پورا کرنے میں کہاں تک کامیابی ہوئی، اس کے لئے اس کا جان لینا کافی ہے، کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ذہنیہ و تہذیب نے جانے سے پہلے پہلے کلام اللہ کی بات کا یہ درجہ ہو گیا تھا کہ تقریباً پورے جزیرہ العرب میں قرآن پڑھا جاتا تھا، ہزاروں اس کے حافظ تھے، سیکڑوں ایسے حضرات تھے جو روزانہ یا ہر روز روزانہ قرآن پڑھ کر لیتے تھے، تعلیم کتاب و حکمت کا یہ مقام تھا کہ

شیخے کا کردہ فرائض اور دست کتب خادہ نہ ملت مست

دنیا کے سامنے فلسفے قرآن کے سامنے ماند ہو چکے تھے، قربیت و انجیل کے تھوڑے بڑے حکایت لفظ نہ ہی چکے تھے، قرآن نے اصول کو عادت و صورت کا سیدھا مانا تھا، تزکیہ کا یہ حال تھا کہ ساری ہر جہان کیوں کے مرکب افراد و تہذیب اخلاق کے مسلم ہیں تھے، ہر انسان کیوں کے مصلحت و صورت مستجاب بلکہ کامیاب صلاح اور جہاں میں تھے جو ہر چیز تھے وہ بھی تھے، فطرت پر تو اب انبار و ہمدردی کے چھنے تھے، تہذیب اور جنگ پر ان کی جگہ نرمی اور صلح ہوئی تھی، ان کی ہر اور اور ان کو ان لوگوں کے سوال کے کا نفاذ تھا۔

القرآن حضرت خلیل اللہ علیہ السلام و اس کے جن مقاصد کے لئے دعا فرمائی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا تھا وہ دنیاوی مقاصد تھے، کہ عہد مبارک میں ان کی نمایاں طور پر کامیاب ہوئے، پھر آپ کے بعد آپ کے حکام کو ان کے لئے تو ان کو مشرق سے مغرب

اور یوسف سے مثال تک ساری دنیا میں مگھلا، فصلی شریطہ و علی آلہ و اصحابہ اسی میں مکمل لکھیا
سچیز بعد میں صلی و صام و قعد و قام۔

وَمَنْ يَرْجُبْ عَنْ يَمَلِهِمْ اَلْاَمِنْ سَفَهًا مُّذَقًا وَلَقَدْ

اور کہو یہ جو چہرے ایمان کے منہ سے مگر وہ جس نے ایمان بنا کر رکھا کہ اور یہ کہ

اَصْطَفَيْنَا فِي الدُّنْيَا وَارْتَا فِي الْآخِرَةِ لَكِنِ الصَّالِحِينَ ﴿۳۴﴾

اس نے ان کو منتخب کیا دنیا میں اور وہ آخرت میں ایسوں میں ہیں

اِذْ قَالَ لَهُ سَابِقَةُ اَسْلِمُوا قَالَتْ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۳۵﴾ وَوَعَدُ

باد کہ جب اس کو کہا اس کے دلچ و کھرباری کر تو فرما کہ جو میرا دین تمام کام کے دور کا گواہ ہو گا وہ

بِمَا اَنْزَاهُمْ بَيْنَهُ وَيَعْقُوبُ يَبْقَى اِنَّ اِلَهَ اَصْطَفَى لَكُمْ

کر گیا اور ہم اپنے بچوں کو اور یوسف بھی کہے بڑے چنگ اشیاء چن کر دیا ہے تم کو

الَّذِينَ فَلَاكُم مِّنْهُنَّ اَلَا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُونَ ﴿۳۶﴾

وہ جو تم کو ہر گز دینا مسکر مسلمان۔

سُفْهَانٌ مَّثَلٌ - سفر میں جہل، و انتصاب نقشہ علی انہ تبع علی قول الفراء

اور شبہ بالفعول علی قول بعض الکوفیہ اس و فعلی بہ اما کنون سفہ متعذر

بنفسہ کشفہ للضعف والکنونہ عن معنی ما یقصدی ای جہل و جو قول الزیجاء ترجمہ فی البیضاء

اسی برہنی برہان سفہ نقضہ کے معنی پہلے ترجمہ کے اعتبار سے وہی جو فلسفہ تفسیر میں لکھے گئے ہیں ثابت کیا

اعتق اور اور دوسری تفسیر میں یہ کہنے کے کہتے ایمان سے کہ اگر وہ ان کی دین کر گیا ہو اپنے نفس سے بھی

جانی ہو یعنی اس کو کفر و ایمان ذات کی بھی خبر ہو کہ یہ کیا ہو

اور مطلب ابراہیم سے قوی و مگر وہ ان کی گواہی ذات ہی سے اعتق ہوا

اور دوسری قسٹ کے تاک کہ کو یہ کہ اعتق نہ کیا جائے جس کی یہ شان ہر کہ اس

کی بدلت ایمان کے راہ ابراہیم علیہ السلام کو عہدہ رسالت کے لئے دینا میں منتخب کیا اور

اس کی بدلت ایمان میں بڑے لائق و گزلیں میں شمار کئے جاتے ہیں دین کے لئے سب ہی

کہہ ہے اور یہ انتخاب عہدہ رسالت کے لئے اس وقت ہوا تھا جب کائنات سے ان کے یہ درود گوار

کئے و لیل و لہام کے فرما کر تم دین حقانی کی اطاعت جست یاد کرو، اظہار نے عرض کر گیا کہ

اطاعت اقتضا کر کہ وہ انہیں کی دہی اس اطاعت کے جستہ کر کے یہ کہ ان کو شرف
نیزت دیا اور خود اس وقت ہو یا بعد چہرے اور اس وقت موصوفہ یہ قاضی دینے کا حکم
کرنے لیا ابراہیم علیہ السلام نے یحییٰ کو اور اس طرح ا یوسف علیہ السلام بھی بلانے پہنچا
کہ جس کا مشورہ تھا کہ میرے بڑے المشافعی نے اس دین واسطہ و اطاعت حق کو کہا کہ
لئے منتخب فرما دے، سو علی دوم مرگ تک اس کو مت چھوڑنا اور ابراہیم علیہ السلام کے اور کسی حالت
پر جان مت ریتا۔

معارف مسائل

ماہذ آیات میں منتخب ابراہیم کے فیاضی اصول اور ان کے اتباع کی تاکید اور انہ انھوں
کی خدائی کا بیان ہے جس میں یہ در نصا کر کے ان کے منتخب ابراہیم کے صلح و عہدوں کی تردید
اور صرف ابراہیم علیہ السلام کے منتخب ابراہیم کے صلح و عہدوں کے ہونا اور یہی اسلام کی حقیقت اور یہ کہ
وہ تمام انبیاء کا مشرک دین ہے، ذکر کیا گیا ہے۔

مذکورہ آیات میں انبیاء علیہم السلام کا اپنی اولاد کی دینی اور روحانی تربیت کی طرف
خاص توجہ اور اہتمام کیا گیا ہے، پہلی آیت میں منتخب ابراہیم کی فضیلت اور اس کی وجہ سے حضرت

ابراہیم علیہ السلام کا دنیا و آخرت میں شرف اور بزرگی بتا کر ان کی نسبت سے انھوں نے کہنے کو
اعتقاد کلام بتوایا ہے، ارشاد ہے، وَمَنْ يَرْجُبْ عَنْ يَمَلِهِمْ اَلْاَمِنْ سَفَهًا مُّذَقًا وَلَقَدْ

یعنی منتخب ابراہیم سے جو مگر وہ انی صحت میں غرض کر سکتا ہے جس میں ذرا عقل نہ ہو تو یہ کہہ کر ملت
میں دین فطرت ہے، کہ علی سلم الفطرا انسان اس سے انکار نہیں کر سکتا، آگے اس کی وجہ بیان

فرمائی کہ اس ملت کا شرف اور فضیلت اس سے ظاہر ہے کہ مشعل شائد نے اسی نسبت کی
وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا میں عزت و بزرگی عطا فرمائی، اور آخرت میں بھی اُنہ کی

عزت و بزرگی کا مشاہدہ ہر ساری دنیا کے کہ کیا کہ مگر وہ یہ صاحب اقتدار و بادشاہ اور اس کی
قوم اس کا یہ بزرگی کے خلاف کفر کی ہوئی اور انہ کے اقتدار کے سامنے عامل ان کے خلاف تھا حال

کرنے، آخر میں آگ کے لپک جیسے انبار میں ان کو کھانا دیا، مگر دنیا کے سامنے عطا مطلوبہ کی
طاقتیں جو قدرت والے کے تابع و فرمان ہیں اس نے سامنے نہ دیکھیں تو تھا کہ میں

ملا دیا، آگ کی گواہی غلیظ کے لئے مغلز کرتا ہوا، اور دنیا کی ساری قومیں ان کو لہا ملنے پہنچا
جو نہیں، دنیا کے سامنے عمن اور کافر میں تک کہ نسبت برست ہیں اس بہت شک کی عزت

کرتے چلے آئے، مشرکین یہی بہت حال اور ابراہیم علیہ السلام، جستہ ہستی کے باوجود حضرت ابراہیم

کرتے چلے آئے، مشرکین یہی بہت حال اور ابراہیم علیہ السلام، جستہ ہستی کے باوجود حضرت ابراہیم

کرتے چلے آئے، مشرکین یہی بہت حال اور ابراہیم علیہ السلام، جستہ ہستی کے باوجود حضرت ابراہیم

کرتے چلے آئے، مشرکین یہی بہت حال اور ابراہیم علیہ السلام، جستہ ہستی کے باوجود حضرت ابراہیم

علیہ السلام کی عزت و عظمت پر جان دیتے تھے، اور انہی کی ملت کے اتباع کا دعویٰ کرتے تھے، اور ملت پر ایسا ہی کے لئے کچھ تیار ان کے عمل میں بھی موجود تھے، حج و عمرہ و قربان بہانہ لواری انہی کے اہلیت حاصلات تھے، اگرچہ جہالت نے ان کو بھی سچ گردا تھا، اور یہی وجہ اس غلو پر کی انعام کا ہے جس کی زد سے خلیل امشکو امام الناس کا خطاب و ایما تھا، (فی حجاز لکھ لکھا میں امانا ماہ)

برہم اور ملت پر ایم علیہ السلام کے اس بڑی غلبہ کے علاوہ اس کی مقبولیت اور غلبت انسانی کے عین مطابق ہونا بھی دنیا کے سامنے آچکا تھا، اور جس میں کچھ بھی عقل و فہم نہیں وہ اس ملت کے سامنے جھک گیا تھا۔

یہ تو براہیم علیہ السلام کے دنیاوی شرف و بزرگی کا ذکر تھا، آخرت کا سامنا جیسا بھی سامنے نہیں، اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام قرآن کی اس آیت نے واضح کر دیا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حق کر دیا میں عزت و فضیلت عطا فرمائی اسی طرح آخرت میں بھی ان کے درجہ جلتیٰ عالیٰ مشرور ہیں۔

ملت ابراہیم کی بنیادی اصول و رسوم میں اہمیت اس کے بعد و مری آیت میں ملت ابراہیم میں ہے وہ صرف اسلام میں مخصوص ہے کے بنیادی اصول جتنا لئے گئے، ارشاد ہوا۔

وَلَوْ كُنَّا فَاعِلِينَ لَفَنَدَمْنَا عَلَىٰ مَا كُنَّا عَمَلِينَ لَوَسَّيْنَا مِنَ الْمَلَكِئَةِ لَوَسَّيْنَا مِنْهُمْ جِبْرِيلًا أَوْ إِبْرَاهِيمَ سَئِئَ مَا كُنَّا فَعَالِينَ
وہاں کے وہ نے کہا طاعت اختیار کرو انھوں نے عرض کیا کہ میں نے طاعت اختیار کر دی وہاں میں کہ اس میں اس میں یہ بہت ہیں قابلِ تکرار ہے کہ انھوں نے طاعت اختیار کیا وہاں بظاہر خطاب ہی کے انداز میں یہ ہونا چاہئے کہ اَلْمَلَكِئَةِ لَقَدْ، لیکن میں نے انکی طاعت اختیار کر لی، اگر حضرت خلیل علیہ السلام نے اس طرح خطاب کر چھوڑ کر لیوں مسموع کیا کہ اَلْمَلَكِئَةِ لَوَسَّيْنَا مِنَ الْمَلَكِئَةِ، لیکن میں نے یہ رد رد گا، ماکم طاعت میں کیا کر لی، ایک تو اس میں دعایت ادب کے ساتھ اور حق میں وہ طاعت کی رو سے، شامل ہو گئی جس کا مقام تھا دوسرو اس کا الجہاد ہو گیا کہ ہم نے طاعت اختیار کر دے کہ ہر انسان نہیں کیا، لکھ میرے لئے اس کا تکرار اگر ہو تھا، کیونکہ وہ سب عالمین میں سارے جہان کا پروردگار ہے، سامنے جہان اور جہان اول تو اس کی طاعت کے سوا کوئی چارہ کا نہیں، اس لئے طاعت نہت ماری اس نے اپنا فرض ادا کر کے اپنا نفع حاصل کیا، اس میں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ملت ابراہیم کا بنیادی اصول اور پوری حقیقت ایک لفظ اسلام میں مندرج ہے، جس کے معنی ہیں طاعت حق، اور جس خلاصہ ابراہیم علیہ السلام کے مذہب مسلک کا، اور یہی حاصل ہے ان امتات کا جس نے تکرار اللہ تعالیٰ کا یہ

خلیل اپنے مقام عالی تک پہنچا ہے، اور امت کا میں طاعت حق ہی وہ چیز جس کے لئے یہ سارا جہان بنا لیا، اور جس کے لئے بنایا، علیہ السلام جیسے گئے، اس میں ان کی ان کی نہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسلام میں تمام بنایا، علیہ السلام کا مشرک دین اور غلط وعت ہے، حضرت آدمؑ کے لئے کرنا تمام بنایا، علیہ السلام کو علم ہو گئے والے دوس اور نبی نے اسی کی طرف دعوت دی، اسی پر اپنی اپنی امت کو چلا، اور قرآن کریم نے واضح الفاظ میں فسر کیا۔

۱۔ اِنَّ الَّذِي يَنْتَظِرُ لِقَاءَ اللَّهِ اَوَّلَ نَفْعٍ ۝۱۱۱ | تو ان کے نزدیک اسلام کچھ ہے
۲۔ وَتَحْتِ قَبْرِ نَبِيِّهِمْ عِزْرًا ۝۱۱۲ | اور حق میں اسلام کے سوا کوئی اور ملکا
قُلْ نَبِيٌّ كُنْتُ مُبَشِّرًا بِرَحْمَةِ رَبِّي ۝۱۱۳ | و مذہب اختیار کرے وہ مقبول نہیں ہے

اور ظاہر ہے کہ جتنے دین و مذہب مختلف بنایا، علیہ السلام لئے ہیں وہ سب اہل اپنے وقت میں اللہ کے نزدیک مقبول تھے، اس لئے ضروری ہے کہ وہ سب دین دین اسلام کی ہیں، اگرچہ نام ان کا کچھ بھی نہ دیا جائے، دین کوئی دین علیہ السلام کہا جائے یا یسویت و نصرانیت وغیرہ، مگر حقیقت سب کی اسلام ہے، جس کا حاصل طاعت حق ہے، البتہ اس کا ایک خصوصیت ملت ابراہیم کا حاصل ہے، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ملت کا نام میں اسلام تجر کیا اور اپنی امت کو بھی امت مسلمہ کا نام دیا، دعا میں عرض کیا،
وَمَا أَرْغَبُ مِنْ دِينٍ ۝۱۱۴ | تمہارے پروردگار کا دین ہے، میں دینوں کو
وَمَا أَرْغَبُ مِنْ دِينٍ ۝۱۱۵ | تمہارے پروردگار کا دین ہے، میں دینوں کو
اور دین سے بھی کچھ جانتا کہ پھر مفسر صاحب روایت ہے

اور لاد کو وصیت کر کے جہت فرمایا،
قُلْ تَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَسَتَحْيَا ۝۱۱۶ | تو پر مسلم ہے کہ کسی مذہب پر جان دینا
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد یہ خصوصی امت پر حضرت ابراہیم کی توجہ کے مطابق امت محمدیہ (صاحبہ السلوٰۃ و السلام) کو حاصل ہوا کہ اس کا نام امت مسلمہ رکھا گیا، اور اس کی ملت بھی ملت اسلام کے نام سے معروف ہوئی، قرآن کریم کا ارشاد ہے،
وَمَا أَرْغَبُ مِنْ دِينٍ ۝۱۱۷ | تمہارے پروردگار کا دین ہے، میں دینوں کو
وَمَا أَرْغَبُ مِنْ دِينٍ ۝۱۱۸ | تمہارے پروردگار کا دین ہے، میں دینوں کو
اور اس میں بھی دین قرآن میں ہے
کچھ کر رہی تھی کہ جس کو ہم ملت ابراہیم میں ہیں، اعلیٰ ہی اس کو مشرکین عرب بھی

میکے پر سب غلط فہمی یا جوئے وغیرہ تھے حقیقت میں سب محمدی ہی آخری و درمیں مصلحت
ابراہیم اور یونین نظریات کے مطابق تھی۔

خلاصہ یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ شاذ کی طرف سے جتنے انبیاء علیہم السلام کثرت لائے
اور جن میں سے بعض صلح نازل ہوئے ان سب کی روح اسلام میں ادا ہوئی ہے وہیں کا
مصلح یہ ہے کہ نفسان خواہشات کے مقابلہ میں شرابی کی اخلاقیات اور افعال ہونی کو جو ہرگز
انتہای بدی کی پابندی۔

انہوں نے کہ کتب اسلام کا نام لینے والے لکھنؤ میں اس حقیقت سے بیگانہ ہو کر
اور وہیں مذہب کے نام پر اپنی خواہشات کا اتباع کرنا چاہتے ہیں، انہیں قرآن و حدیث
کو صرف تو فیسر و تعبیر رکھی معلوم ہوتی ہے جو ان کی خواہش کے مطابق ہو ورنہ یہ کوشش ہوتی
کہ جائز و حرام کو سمجھنے کی بجائے کہ جس طرح اپنے افعال اور اہواء نفسانی کے چوں کا لباس پہنا کر
کہہ دیجئے کہ وہ مذہب کا اتباع نظر آئے، اگرچہ وہ حقیقت میں خاص افعال ہوں اور خواہشات
کی پیروی ہے۔

سورۃ صافات ۱۷۱

چند روز و کھشت و دین مسلمان بنیم

ناقل انسان یہ نہیں جانتا کہ یہ جیل اور ناظمین حقوق کے سامنے قہر کیسے ہیں، مگر ان
کے سامنے جس کا علم لڑوہ قدرہ کو محیط ہے جو لوگوں کے پیچھے ہوئے اور ان سمجھوتہ کو دیکھتا
ہے اس کے آگے بیز خواص اخلاقیات کے کوئی چیز کا رگر نہیں ہے

کار! احسان آدمی جملہ راست

اندر از دیر و حیلہ کے راست

حقیقی اسلام یہ ہے کہ اپنی افعال و خواہشات سے باہل خالی اللہ ہیں جو کہ انسان
کواس کی تلاش ہو کہ حضرت جیل میں شاذ کی وسوسہ کا کام ہے، اور اس کا فریاد میرے لئے کیا ہے
وہ ایک فریاد اور غلام کی طرح گوش برآ ندارد ہے، کہ کس طرف چلے گا اور کس کام کا حکم ہوتا ہے
اور اس کام کا کس انداز سے کیا جائے، جس سے وہ مقبول ہوا اور مالک و داعی جو اس کا کام چاہے
بندگی ہے۔

دوام حقیق و سوسہ اعتراف ہے

ہمشہ در گوش را بہ پیام سر و شاد

اسی جذبہ اخلاقیات و محبت کا کمال انسان کی ترقی کا انہی مقام ہے، جن کو مقام جبریت

کیا جانا ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام علیہ السلام کا خطاب پاتے
ہیں اور سید المرسلین خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کو غیبی مائنا کا خطاب ملتا ہے، اسی حدیث اور
اخلاقیات کے قرینی و روایت پر امت کے ارباب و اقطاب و ابدال کے درجہ و ارتقاء ہوتے ہیں، اور یہی
حقیقی توحید ہے جس کے عمل ہونے پر انسان کی غوث و امید صرف ایک اللہ جل شانہ کے ساتھ
واجب ہے ہر جگہ یہی ہے۔

امید و ہراسش نہ اس قدر کس

ہیں مست بیاو و حیلہ و دس

غرض اسلام کے سن اور حقیقت اخلاقیات حق ہے، اور اس کا راستہ صرف امتیاز
و صل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں منحصر ہے جس کو قرآن کریم نے واضح الفاظ میں اس طرح ارشاد فرمایا

لَا تَمْلِكُ لَكَ دِينُكَ وَلَا دِينُ
نَبِيِّكَ وَلَا دِينُ الْبَنِي
لَكَ دِينُكَ وَلَا دِينُ الْبَنِي
لَكَ دِينُكَ وَلَا دِينُ الْبَنِي
لَكَ دِينُكَ وَلَا دِينُ الْبَنِي

میزرے سب کی قسم دیکھیں ہوں نہیں گئے
ہمک و رنج کو اپنے ظلم و استغناء
میں جو تسلیم نہ کریں اور میرے آگے ہمت کوئی
دل تلخ مریں نہ کریں، اور فیصلہ کر لیں
دل سے تسلیم نہ کریں

تسلیم نہ کرنا

مسئلہ و آیت مذکورہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو وصیت فرمائی،
اور اس سے چھوڑ دیا، وہ یہ تھا کہ اسلام کے سوا اور کسی طاقت اور کسی ملت پر مدد نہ کرنا، مراد اس کی یہ
ہو کہ اپنی زندگی میں اسلام اور اسلامی تعلیمات پر پھل سے عمل کرتے رہو تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارا
سب سے اسلام ہی پر فرما دے، جیسا کہ نبین روایات میں ہے کہ تم اپنی زندگی میں جس حالت کے پند
دجو گے، اسی حالت پر تمہاری موت بھی ہوگی، اور اسی حالت میں عمر میں قائم ہو گے، اللہ جل شانہ
کی طاقت یہی ہے کہ جو بندہ دیکھ کر قصداً کہے، اور اس کے لئے اپنے مفروضہ کے مطابق کو پیش
کرنا ہے وہ اللہ تعالیٰ اس کی تکلیف کو نہیں دیتے ہیں، اور یہی کام اس کے لئے آسان کر دیتے ہیں۔

اس معاملہ میں اُس حدیث سے شبہ نہ کیا جائے جس میں یہ ارشاد ہے کہ بعض آدمی جنت کے
کام اور اہل جنت کے عمل ہمیشہ کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس شخص اور جنت کے درمیان صرف ایک
پتھر کا فیصلہ ہو جاتا ہے، مگر پتھر کی تقدیر غالب آجاتی ہے، اور اپنی دوزخ کے سے کام کرتے لگتا
ہے اور اجماع کار دوزخ میں پاتا ہے، اسی طرح بعض آدمی دوزخ کے کام میں مشغول رہتا ہے،
یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک پتھر کا فیصلہ ہو جاتا ہے، پھر تقدیر غالب آتی
ہے اور آخر عمر میں اہل جنت کے کام کرنے لگتا ہے، اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

آپ (ان پروردگار سے) فرما دیجئے کہ کیا تم لوگ (اب بھی) اس سے جنت کے جانے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں دگر، ہم کو کیا امت میں نہ پیش ہے؟ حالانکہ وہ ہمارا رخصتا و نسب کا، بیاد و مالک، بیاد و سرپرست ہیں تو خدا نے ہمارے لئے یہاں کیا نہیں کیا؟ یہاں کیا ہے؟ ہمیں دعوتوں سے انحصار نہیں ہوتا ہے، عقلی اور ایمانی اور ہم کو ہمارا کیا ہوتا ہے؟ خدا اور ہم کو خدا کیا ہوتا ہے؟ خدا ہر ایک کی طرف سے ہے اور خدا تعالیٰ کو شک ہے کہ ہم نے صرف حق تعالیٰ کو خوشنودی کہتے ہیں، اپنے دین (کو) شریک نہیں کرتے، خاص کر گناہ ہے (مختلف گناہوں پر) سوچو کہ کے علاوہ جس کو ہونے کے علاوہ شریک سے بھی مخلوق ہے جیسا ان کے اقوال و عیامین اور اس طرح ہیں اللہ سے ظاہر ہے اور اس میں ہم کو اللہ تعالیٰ نے ترجیح دی ہے ہمیں کو خجالت نہ ہونے کے کما حقہ، ابابا ابابا میں اپنے حق پر ہونے کے ثابت کرنے کو ہیں، کہ جانتے ہو کہ اگر کسی اور اہل ایمان اور ایمان اور اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ دین و ایمان کا گواہ ہے، ہمیں یہ سب حضرات، ہمیں اللہ تعالیٰ ہے (اور اس سے واسطہ مواظقت و مراقبہ) ایمان پر پورا نیت کرنے سے ہر اس کے جواب میں، اللہ تعالیٰ اللہ علیہ وسلم و ایک اعلیٰ اعتبار سے ہے، کہہ دیجئے کہ ایمان پر ہمارا خدا و اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کو خدا ہی زیادہ و اللہ ہے، اور وہ ان ایسا کہ اسے اسلام پر پورا نیت کرے ہیں، جیسا کہ ان کو ہمارا خدا اور اللہ تعالیٰ ہے، یہاں فرمیں مگر چاہئے ہیں سو اپنے نفس سے زیادہ ظلم کوئی ہوگا جیسا کہ یہاں کا اتفاق کرے جو اس کے پاس تھا جس طرح بھی ہر اور اسے اہل کتاب اللہ تعالیٰ تعالیٰ کے ہونے سے خبر نہیں ہیں اب بھی جب وہ عزت و بزرگوں کی، ایک جہاں امت بھی ہوئے ہیں ان کے موافق جب ہر ہر شخص خدا ان پر پورا نیت نہ ہوا، اب ان بزرگوں کی، ایک جہاں امت بھی ہوئے ہیں ان کے موافق جب ہر ہر شخص خدا ان کے کام ان کا کیا ہوا اور اسے اللہ تعالیٰ کا کام تھا کیا ہوا اور اسے اللہ تعالیٰ کے ہونے کی کچھ بھی تو نہ ہوگی (اور جب خالق مذکور نہ ہوگا تو اس سے تم کو کچھ فتنہ پہنچاؤں گا)

معارف و مسائل

اہل حق کی حقیقت | وَتَحْتَ ثَلَاثَ مِائَةِ مِائَةٍ | اس میں اسے سلوک کی ایک خصوصیت بتائی ہے کہ وہ اس کے لئے خاص ہے، انھیں کے معنی حضرت امیر ہیں جو ہر شے میں کہ انسان اپنے دین میں خاص ہو کہ اللہ کے سوا کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، اور اپنے حق کو خاص اللہ کے لئے کرے، اور اس کے رکھنے والوں کی حد و مشرک کی طرف نظر نہ ہو۔
بعض بزرگوں نے فرمایا کہ انھیں ایک ایسا عمل بھی ہے کہ وہ فرشتے پہنچا سکتے ہیں اور شیطان اور صوفیہ جنہوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک واسطہ ہے۔

سَيَقُولُ السُّفَهَاةُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَهُمْ

اب کہیں گے برفوں وگ کو کس چیز نے، پھر وہ مسلمانوں کو
عَنْ قِبَلِهِمُ الْيَقِيْنَ كَانُوا عَلِيَهَا اَقْلَ لِلّٰهِ النَّفْسُ وَالْمَغْرِبُ
ان کے قبیلے میں یہ دھتے تو کہ اللہ ہی کا ہے مشرق اور مغرب

يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ اِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴﴾

جگہ سے جس کو چاہے سیدھی راہ -

اب کبھی قبلہ نماز میں ہو کہ یا کبھی ترک ہو گیا تو یہ اللہ ہی کے (اب تو
اور برفوں وگ مزدوری ہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو اللہ کے راستہ میں
قبلہ سے رکبیت اللہ تعالیٰ جس طرف چاہے متوجہ ہو کہ اسے جسے اس بات نے اور سرے سے
طرف، چل و آہ و جواب میں افراد کچھ کو سب (میں غلو) مشرق و غرب اور خواہ مغرب
وہ: اللہ ہی کے ملک ہیں اور اللہ تعالیٰ کو مالک و اختیار ہے جس سمت کو چاہے مشرق و غرب
کسی کو منصب و عتد و رافٹ کرنے کا نہیں ہے، اور سیدھا طریق احکام شرعیہ کے اب میں ہیں
افعال ہے، انھیں لیکن کو اس راہ کا اختیار کرنے کی تو ہیں نہیں ہوتی، خواہ غلو و غلو نہ ہو
کرتے ہیں البتہ ان کو خدا ہی اپنے فضل سے بچا ہے، یہ ایسا حال طریق بتا رہے ہیں۔

معارف مسائل

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا اصرار ہے کہ وہ اپنے طریق فکر کے اس کا جواب دے گی، اس
احراز اس جواب سے پہلے قبلہ کی حقیقت اور اس کی تفسیر تاریخ میں ہے، جس سے سوال و جواب کا
بہتر آسان ہو جائے۔
قبلہ کے معنی ہیں حق تعالیٰ، یعنی حق تعالیٰ کا اصرار ہے کہ وہ اپنے طریق فکر کے اس کا جواب دے گی، اس
ہر صراط میں صرف ایک اللہ و اللہ شریک کی طرف ہوتا ہے، اور اس کی ذات پاک مشرق
و مغرب اور شمال و جنوب کی تہذیب اور سنتوں سے ملا ہے، وہ کسی خاص سمت میں نہیں ہے، اس کا
شرط خاص طور پر ہے ہر انسان کو کوئی عبادت کرنے والی خاص شرع کا پابند نہ ہوگا، ہر انسان کو
ہی چاہتا نماز میں اپنا رخ اس طرف کر لیتا، اور ایک ہی کسی وقت ایک طرف اور کسی وقت کسی

طرت نچ کرتا تو وہ بھی بے جا نہ ہوتا۔

لیکن ایک دوسری محنت اہلہ اس کی مقتضی ہوئی کہ تمام عبادت گزاروں کا رخ ایک ہی طرف ہونا چاہئے، اور وہ یہ ہے کہ عبادت کی مختلف قسمیں ہیں، بعض انفرادی ہیں، بعض اجتماعی، ذکر اللہ اور روزہ وغیرہ انفرادی عبادات ہیں جن کو خلوت میں اور انفرادی کے ساتھ ادا کیا جاسکتا ہے، اور نماز اور حج اجتماعی عبادات ہیں جن کو جماعت و اجتماع و اعلان کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے، ان میں عبادت کے ساتھ مسلمانوں کو اجتماعی زندگی کے آداب کا بتلانا اور سکھانا بھی پیش نظر ہے، اور یہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ اجتماعی نظام کا سب سے بڑا بنیادی اصول افراد کثیرہ کی وحدت اور یک جہتی ہے، یہ وحدت عینی زیادہ قوی سے قوی ہوگی اتنا ہی اجتماعی نظام مستحکم اور مضبوط ہوگا، انفرادیت اور تشتت اجتماعی نظام کے لئے سبب قائل ہے، پھر نقطہ وحدت متعین کرنے میں ہر متمدن ہر زمانہ کے لوگوں کی مختلف راہیں رہی ہیں، کسی قوم نے نسل اور نسب کو نقطہ وحدت قرار دیا، کسی نے وطن اور جسر انسانی خصوصیات کو، کسی نے رنگ اور زبان کو۔

لیکن دین الہی اور شرائع انبیاء علیہم السلام نے ان غیر اعتدائی چیزوں کو نقطہ وحدت بنانے کے قابل نہیں سمجھا، اور نہ درحقیقت یہ چیزیں ایسی ہیں جو پورے افراد انسانی کو کسی ایک مرکز پر جمع کر سکیں، بلکہ جتنا غور کیا جائے یہ وحدتیں درحقیقت افراد انسانی کو بہت سی کثرتوں میں تقسیم کر ڈالنے اور آپس میں ٹکراؤ اور اختلافات کے اسباب ہیں۔

دین اسلام نے جو درحقیقت تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ہے وحدت کا اصل نقطہ فکر و خیال اور عقیدہ کی وحدت کو متعارف دیا، اور کرداروں خداؤں کی پرستش میں مٹی ہوئی دنیا کو ایک ذات حق وحدۃ لا شریک لہ کی عبادت اور اطاعت کی دعوت دی جس پر مشرق و مغرب اور ماضی و مستقبل کے تمام افراد انسانی جمع ہو سکتے ہیں، پھر اس حقیقی فکری اور فطری وحدت کو عملی صورت اور قوت دینے کے لئے کچھ ظاہری وحدتیں بھی ساتھ لگائی گئیں، مگر ان ظاہری وحدتوں میں بھی اصول یہ رکھا گیا کہ وہ عملی اور اختیاری ہوں، تاکہ تمام افراد انسانی ان کو اختیار کر کے ایک رشتہ اخوت میں منسلک ہو سکیں، نسب، وطن، زبان، رنگ وغیرہ اختیاری چیزیں نہیں ہیں جو شخص ایک خاندان کے اندر پیدا ہو چکا ہے وہ کسی طرح دوسرے خاندان میں پیدا نہیں ہو سکتا، جو پاکستان میں پیدا ہو چکا وہ انگلستان یا افریقہ میں پیدا نہیں ہو سکتا، جو کالا ہو وہ اپنے اختیار سے گورا، اور جو گورا ہے وہ اپنے اختیار سے کالا نہیں ہو سکتا۔

اب اگر ان چیزوں کو مرکز وحدت بنایا جائے تو انسانیت کا سیکڑوں بلکہ ہزاروں ٹکڑوں اور گروہوں میں تقسیم ہو جانا ناگزیر ہوگا، اس لئے دین اسلام نے ان چیزوں سے تمدنی

مفاہد وابستہ ہیں ان کا برابر احترام رکھتے ہوئے ان کو وحدت انسانی کا مرکز نہیں بننے دیا، کبر و حدتیں افراد انسانی کو مختلف کثرتوں میں بانٹنے والی ہیں، ان خست یاری امور میں اس کی پوری رعایت کی کہ فکری وحدت کے ساتھ عمل اور صورتی وحدت بھی قائم ہو جائے، مگر اس میں بھی اس کا پورا لحاظ رکھا گیا کہ مرکز وحدت ایسی چیزیں بنائی جائیں جن کا اختیار کرنا ہر مرد و عورت سمجھے پڑھے اور ان پڑھ شہری اور دیہاتی امیر و غریب کو یکساں طور پر آسان ہو، وہی وجہ ہے کہ شریعت اسلام نے تمام دنیا کے لوگوں کو لباس اور مسکن کھانے اور پینے کے کسی ایک طریقہ کا پابند نہیں کیا، کہ ہر جگہ کے موسم اور طبائع مختلف اور ان کی ضروریات مختلف ہیں، سب کو ایک ہی طرح کے لباس یا شعار یا یونیفارم کا پابند کر دیا جائے تو بہت سی مشکلات پیش آئیں گی، پھر اگر یہ یونیفارم کم سے کم تجویز کر دیا جائے، تو یہ اعتدال انسانی پر ظلم ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے عمدہ لباس اور عمدہ کپڑوں کی بے حرمتی ہوگی، اور اگر اس سے زائد کسی لباس کا پابند کیا جائے تو غریب مفلس لوگوں کو مشکلات پیش آئیں گی۔

اس لئے شریعت اسلام نے مسلمانوں کا کوئی ایک شعار یا یونیفارم مقرر نہیں کیا، بلکہ مختلف قوموں میں جو طریقے اور ادھار لباس کی رائج تھیں ان سب پر نظر کر کے ان میں سے جو صورتیں اسرار بجا یا نضر وغیرہ یا کسی غیر مسلم قوم کی نقالی پر مبنی تھیں، صرف ان کو ممنوع قرار دے کر باقی چیزوں میں ہر فرد اور ہر قوم کو آزاد اور خود مختار رکھا، مرکز وحدت ایسی چیزوں کو بنایا گیا جو اختیاری بھی ہوں اور آسان اور مستحسبی بھی، ان چیزوں میں جیسے جماعت خانگی صفت نہیں، ایک امام کی فعل و حرکت کی عمل پابندی، حج میں لباس اور مسکن کا اشتراک وغیرہ ہیں۔

اسی طرح ایک اہم چیز سمت قبلہ کی وحدت بھی ہے، کہ اگرچہ الشریعہ شائد کی ذات پاک ہر سمت و جہت سے بالاتر ہے، اس کے لئے مشن جہت یکساں ہیں، لیکن نماز میں اجتماعی صورت اور وحدت پیدا کرنے کے لئے تمام دنیا کے انسانوں کا رخ کسی ایک ہی جہت و سمت کی طرف ہونا ایک بہترین اور آسان اور بے قیمت وحدت کا ذریعہ ہے، جس پر سارے مشرق و مغرب اور جنوب و شمال کے انسان آسانی سے جمع ہو سکتے ہیں، اب وہ ایک سمت و جہت کو لے کر جس کی طرف ساری دنیا کا رخ پھیرا جائے، اس کا فیصلہ اگر انسانوں پر چھوڑا جائے تو یہی ایک سب سے بڑی بنا اختلاف و نزاع بن جاتی ہے، اس لئے ضرور تھا کہ اس کا تعین خود حضرت حق جل و علا شائد کی طرف سے ہوتا، حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں اتارا گیا، تو فرشتوں کے ذریعہ بیت اللہ کعبہ کی بنیاد پہلے ہی رکھ دی گئی تھی، حضرت آدم اور اولاد آدم علیہ السلام کا سب سے پہلا قبلہ یہی بیت اللہ اور خانہ کعبہ بنایا گیا

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي

بَبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُوَ الَّذِي لِلْعَالَمِينَ (۲: ۱۲۵)

سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ مکہ پر جو کہ میں ہر برکت والا، ہدایت والا چاند اور سورج کا گھر

نوح علیہ السلام تک سب کا قبلہ یہی بیت اللہ تھا، طوفانِ نوح علیہ السلام کے وقت پوری دنیا غرق ہو کر تباہ ہو گئی، بیت اللہ کی عمارت بھی منہدم ہو گئی اور ان کے بعد حضرت خلیل اللہ اور اسماعیل علیہما السلام نے دوبارہ بحجیم خداوندی بیت اللہ کی تعمیر کی، اور یہی ان کا اور ان کی امت کا قبلہ رہا، اس کے بعد انبیاء بنی اسرائیل کے لئے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا گیا اور بقول ابو العالیہ انبیاء سابقین جو بیت المقدس میں نماز پڑھتے تھے وہ بھی عمل ایسا کرتے تھے کہ محضرۃ بیت المقدس بھی سامنے رہے اور بیت اللہ بھی۔ (ذکرہ القزلبی)

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر جب نماز فرض کی گئی تو بقول بعض علماء ابتداء آپ کا قبلہ آپ کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ یعنی خانہ کعبہ ہی قرار دیا گیا، مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے اور مدینہ طیبہ میں قیام کرنے کے بعد اور بعض روایات کے اعتبار سے ہجرت مدینہ سے کچھ پہلے آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ آپ بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنائیے، صبح بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ مائدہ میں بیت المقدس کی طرف نماز ادا فرمائی مسجد نبویؐ میں آج تک اس کی علامات موجود ہیں، جہاں کھڑے ہو کر آپ نے بیت المقدس کی طرف نمازیں ادا فرمائی تھیں۔ (قرطبی)

حکم خداوندی کی تعمیل کے لئے تو سیدہ الرسلؐ سزا پا اطااعت تھے، اور حکم خداوندی کے مطابق نمازیں بیت المقدس کی طرف ادا فرما رہے تھے، لیکن آپؐ کی طبعی رغبت اور دلی خواہش یہی تھی کہ آپؐ کا قبلہ پھر وہی آدم علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ قرار دیا جائے، اور چونکہ عادتہ اللہ یہی ہے کہ وہ اپنے مقبول بندوں کی مراد اور خواہش و رغبت کو پورا فرماتے ہیں۔

تو چنان خواہی مندر خواہد چینی

می دہد یزدان مرا در متفتیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ امید تھی کہ آپ کی تمنا پوری کی جائے گی، اور اس لئے انتظار دہی میں آپ بار بار آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھتے تھے، اسی کا بیان قرآن کی اس آیت میں ہے۔

مَنْ تَرَى الْقُلُوبَ وَجْهَكَ فِي
السَّاءِ فَلْيُؤَيِّسْكَ قِبْلَةَ تَرْضَاهَا
قَوْلِي وَجْهَكَ سَطْرُ الْمُسْجِدِ
الْحَرَامِ (١٣١٢)

”ہم دیکھ رہی تھی آپ کا بارگاہِ انسان کی طرف
 نظر اٹھانا، سو ہم آپ کا قبلہ دی بدل دیں گے
 جو آپ کو پسند نہ اس لئے آئندہ آپ نمازیں
 اپنا رخ مسجدِ حرام کی طرف کیا کریں“

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کا اظہار مفسر ماکر اس کو پورا کرنے کا حکم دے رہا گیا ہے کہ آئندہ آپ مسجد حرام کی طرف رخ کیا کریں۔

نماز میں خاص بیت اللہ کا استقبال ضروری نہیں
اس کی سمت کا استقبال بھی پروردگار دنیا کیلئے کافی ہے۔

میں ایک فقہی نکتہ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اس آیت میں
کعبہ یا بیت اللہ کے بجائے لفظ مسجد حرام کا استعمال
فرمایا گیا ہے، جس میں اشارہ ہے کہ بلادِ عیدہ کے رہنے والوں کے لئے یہ ضروری نہیں کہ عین بیت اللہ
کی محاذات پائی جائے، بلکہ سمتِ بیت اللہ کی طرف رُخ کر لینا کافی ہے، ہاں جو شخص مسجد حرام
میں موجود ہے یا کسی شہر ہی پہاڑ پر بیت اللہ کو دیکھ رہا ہے، اس کے لئے خاص بیت اللہ ہی کی
طرف رخ کرنا ضروری ہے، اگر بیت اللہ کی کوئی چیز بھی اُس کے چہرے کے محاذات میں نہ آئی
تو اس کی نماز نہیں ہوتی، بخلاف ان لوگوں کے جن کے سامنے بیت اللہ نہیں کہ ان کے واسطے سمت
بیت اللہ یا سمتِ مسجد حرام کی طرف رُخ کر لینا کافی ہے۔

بہر حال ہجرت مدینہ سے سولہ ستر و چھینے بعد پھر آپ کا اور مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ کو بنایا گیا اس پر جو اور بعض مشرکین و منافقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ پر اعتراض کر لے گئے کہ ان کے دین کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں، ان کا قبلہ بھی روز بروز بدلتا رہتا ہے۔

قرآن کریم نے ان کا یہ اعتراض آیت مذکورہ میں نقل فرمایا، مگر ساتھ ہی عنوان یہ رکھا کہ یوں لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں، اور ان کی بیوقوفی اس جواب سے واضح ہوگئی جو اس کے بعد ذکر فرمایا گیا ہے، ارشاد ہے: **أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ أَلَمْ يَكُنْ لَهُمُ الْآيَاتُ مِنْ قَبْلُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ** ”بھئی آپ فرمادیجئے کہ اللہ ہی کے ہیں مشرق اور مغرب وہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ چلا تا ہے“

اس میں استقبال قبلہ کی حقیقت کو واضح فرمادیا کہ کعبہ اور بیت المقدس کی کوئی خصوصیت
بجز اس کے نہیں کہ حکم ربانی نے ان کو کوئی امتیاز دے کر قبلہ بنا دیا، وہ اگر چاہیں تو ان دونوں کے
ملا وہ کسی تیسری چیز کو بھی قبلہ بنا سکتے ہیں، پھر جب کو قبلہ بنا دیا گیا اس کی طرف رخ کرنے میں
جو کچھ فضیلت اور ثواب ہر اس کی روح حکم حق شانہ کی اطاعت کے سوا کچھ نہیں، جو ان کی کعبہ
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کا بنیادی اصول ہے، اور اسی لئے دوسری آیت میں اور زیادہ
واضح فرمایا کہ :

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ
قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَ
لَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ

(البقرة: ١٧٧)

”اس میں ذاتی کوئی نیکی اور ثواب نہیں کہ ہم مشرق کی طرف رخ کرو یا مغرب کی طرف نیکیں نیکی اللہ پر ایمان لانے اور اس کی اطاعت کرنے میں ہے۔“

اور ایک آیت میں فرمایا

فَاتَّبِعُوا مَا تَوَكَّلُوا فَتَنَّمْ وَحْبُهُ
الشمس (۱۵۱۲)

تین نم اندر کے قرآن کے مطابق جس طرف
میں رخ کرو اللہ تعالیٰ کی توجہ اسی طرف رہے۔

ان آیات نے قبلہ اور استقبال قبلہ کی حقیقت کو بھی واضح فرمادیا کہ اس میں ان مقامات کی کوئی ذاتی خصوصیت نہیں، بلکہ ان میں فضیلت پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ ان کو حق تعالیٰ نے قبلہ بنانے کے لئے خستہ یار فرمایا، اور اس کی طرف رخ کرنے میں ثواب کی وجہ بھی صرف یہی ہے، کہ حکم ربانی کی اطاعت ہے، اور شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قبلہ میں تعمیر و تبدل مندرانے کی یہ بھی حکمت ہو کہ عملی طور سے لوگوں پر یہ واضح ہو جائے کہ قبلہ کوئی بت نہیں جس کی پرستش کی جائے، بلکہ اصل چیز حکم خداوندی ہے وہ بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا آگیا تو اس کی تعمیل کی، پھر جب کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم مل گیا تو اس کی طرف رخ کرنا عبادت ہو گیا، اس کے بعد والی آیت میں خود قرآن کریم نے بھی اس حکمت کی طرف اشارہ کیا جس میں فرمایا ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ تَقِيهَا
إِلَّا لِيُعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعِ الرَّسُولَ
مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقْبَيْهِ (۱۲۳: ۱۲۴)

تین جن قبلہ پر آپ پہلے رہ چکے ہیں اس کو
قبلہ بنا کر تو محض اس بات کو ظاہر کرنے کے
لئے تھا کہ کون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا
اتباع کرتا اور کون کچھ ہٹ جاتا ہے۔

اس حقیقت قبلہ کے بیان سے ان بیوقوف مخالفین کا بھی پورا جواب ہو گیا جو قبلہ کے بارے میں تغیر و تحول کو اصول اسلام کے منافی سمجھتے اور مسلمانوں کو طعن دیتے تھے، آخر میں ارشاد فرمایا:

يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ اس میں بتلادیا ہے کہ سیدھی راہ وہی ہے کہ انسان حکم حق جن شانہ کے لئے کربستہ منتظر رہے، جو حکم مل جائے اس پر بے چون و چرا عمل کرے اور یہ سیدھی راہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔

مسند احمد کی ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل کتاب کو مسلمانوں کے ساتھ سب سے بڑا احمد تین چیزوں پر ہے: ایک یہ کہ ہفتہ میں ایک دن عبادت کے لئے مخصوص کرنے کا حکم ساری امتوں کو ملا تھا، یہودی نے شیجر کا دن مقرر کر لیا، اور نصاریٰ نے اتوار کا، اور حقیقت میں عند اللہ وہ جمعہ کا دن تھا، جو مسلمانوں کے انتخاب میں آیا، دوسرے وہ قبلہ جو تحول کے بعد مسلمانوں کے لئے مقرر کیا گیا، اور کسی امت کو اس کی توفیق نہیں ہوئی، تیسرے امام کے پیچھے آئیں کہ ان کے یہ تینوں خصلتیں صرف مسلمانوں

کو معسر ہو گئیں، اہل کتاب ان سے عذر دے ہیں۔

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَتَكُونُوا

اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امت معتدل تاکہ ہو تم گواہ لوگوں پر اور ہو رسول

الرَّسُولَ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ط

تم پر گواہی دینے والا۔

خلاصہ تفسیر

اور اسے متبعان محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اسی طرح ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنا دی ہے جو درہر پہلو سے (ہدایت اعتدال پر ہے، تاکہ دنیا میں شرف و امتیاز حاصل ہونے کے علاوہ آخرت میں بھی تمہارا بڑا شرف ظاہر ہو کہ) تم ایک بڑے مقدمہ میں جس میں ایک فریق حضرات انبیاء علیہم السلام ہوں گے، اور فریق ثانی ان کی مخالفت قریں ہوں گی ان مخالف لوگوں کے مقابل میں گواہ و تجویز، اور اور آخرت بالائے شرف یہ ہوا کہ تمہارے (قابل شہادت اور معسر ہونے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گواہ ہوں اور اس شہادت سے تمہاری شہادت معتبر ہونے کی تصدیق ہو، پھر تمہاری شہادت سے اس مقدمہ کا حضرات انبیاء علیہم السلام کے حق میں فیصلہ ہو اور مخالفین مجرم شرار پاکر سزا یاب ہوں، اور اس امر کا اعلیٰ درجہ کی عزت ہونا ظاہر ہے)۔

معارف مسائل

امت محمدیہ کا خاص اعتدال | لفظ وسط یعنی اوسط اور اور افضل اشیاء کو وسط کہا جاتا ہے، ترمذی میں بروایت ابو سعید خدری: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لفظ وسط کی تفسیر عدل سے کی گئی ہے، جو بہترین کے معنی میں آیا ہے (قرطبی) اس آیت میں امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی ایک امتیازی فضیلت و خصوصیت کا ذکر ہے، کہ وہ ایک معتدل امت بنائی گئی، اس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ جس طرح ہم نے مسلمانوں کو وہ قبلہ عطا کیا جو سب سے اشراف و افضل ہے، اسی طرح ہم نے امت اسلامیہ کو ایک خاص امتیازی فضیلت یہ عطا کی ہے کہ اس کو ایک معتدل امت بنایا ہے، جس کے نتیجہ میں ان کو میدان حشر میں یہ امتیاز حاصل ہو گا کہ سارے انبیاء علیہم السلام کی امتیں جب اپنے انبیاء کی ہدایت و تبلیغ سے بھڑک جائیں گی، اور ان کو جھٹلا کر یہ کہیں گی کہ ہمارے پاس نہ کوئی کتاب آئی، نہ کسی نبی نے ہمیں کوئی ہدایت کی، اُس وقت امت محمدیہ انبیاء علیہم السلام کی طرف سے گواہی میں پیش

ہوگی اور یہ شہادت دے گی کہ انبیاء علیہم السلام نے ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائی ہوئی ہدایت ان کو پہنچائیں، اور ان کو صحیح راستہ پر لانے کی متعدد و بھرپوری کوشش کی، مدد علی علیہم امتیں امت محمدیہ کی گواہی پر یہ جرح کریں گی کہ اس امت محمدیہ کا تو ہمارے زمانے میں وجود بھی نہ تھا، اس کو ہمارے معاملہ کی کیا خبر، اس کی گواہی ہمارے مقابلہ میں کیسے قبول کی جاسکتی ہے۔

امت محمدیہ اس جرح کا یہ جواب دے گی کہ بے شک ہم اس وقت موجود نہ تھے، مگر ان کے واقعات و حالات کی خبر ہمیں ایک صادق مصدق رسول نے اور اللہ کی کتاب نے دی ہے، جس پر ہم ایمان لائے اور ان کی خبر کو اپنے معائنہ سے زیادہ و قیح اور سچا جانتے ہیں، اس لئے ہم اپنی شہادت میں حق بجانب اور سچے ہیں، اس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیش ہوں گے، اور ان گواہوں کا ترکیہ و توثیق کریں گے کہ بیشک انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیح ہے، اللہ تعالیٰ کی کتاب اور میری تعلیم کے ذریعہ ان کو یہ صحیح حالات معلوم ہوئے۔

محشر کے اس واقعہ کی تفصیل صحیح بخاری، ترمذی، نسائی، اور مسند احمد کی متعدد احادیث میں بخلاف اور مفصلاً مذکور ہے۔

انقرض آیت مذکورہ میں امت محمدیہ کی اعلیٰ فضیلت و شرف کا راز یہ بکلیا گیا ہے کہ یہ امت معتدل امت بنائی گئی ہے، اس لئے یہاں چند باتیں قابل غور ہیں۔

اعتدال امت کی حقیقت، اہمیت (۱) اعتدال کے معنی اور حقیقت کیا ہیں، (۲) وصفت اعتدال کی یہ اہمیت اور اس کی کچھ تفصیل کیوں ہے کہ اس پر مدار فضیلت رکھا گیا (۳) اس امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معتدل ہونے کا واقعات کی روش سے کیا ثبوت ہے، ترتیب لہذا ان تینوں سوالوں کا جواب یہ ہے۔

۱۔ اعتدال کے لفظ معنی ہیں برابر ہونا، یہ لفظ بدل سے مشتق ہے، اس کے معنی بھی برابر کرنے کے ہیں۔

۲۔ وصفت اعتدال کی یہ اہمیت کہ اس کو انسانی شرف و فضیلت کا معیار قرار دیا گیا، ذرا تفصیل طلب ہے، اس کو پہلے ایک محسوس مثال سے دیکھئے، دنیا کے جتنے تے اور پڑاوتے طریقے جسمانی صحت و علاج کے لئے جاری ہیں، طبی یونانی، ویدک، ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک وغیرہ سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ بدن انسانی کی صحت اعتدالی مزاج سے ہے، اور جہاں یہ اعتدال کسی جانب سے خلل پذیر ہو وہی بدن انسانی کا مرض ہے، خصوصاً طبی یونانی کا تو بنیادی اصول ہی مزاج کی پہچان پر موقوف ہے، انسان کا بدن چار خلط خون، بلغم، سودا، صفراء سے مرکب اور انہی چاروں خلط سے پیدا شدہ چار کیفیات انسان کے بدن میں ضروری ہیں، گرمی، ٹھنڈک، خشکی اور ترری، جس وقت تک یہ چاروں کیفیات مزاج انسانی کے مناسب حدود کے اندر معتدل رہتی ہیں وہ بدن انسانی کی صحت مند رہتی

کہلاتی ہے، اور جہاں ان میں سے کوئی کیفیت مزاج انسانی کی مدد سے زیادہ ہو جائے یا گھٹ جائے وہی مرض ہے، اور اگر اس کی اصلاح و علاج نہ کیا جائے، تو ایک حد میں پہنچ کر وہی موت کا پیام ہو جاتا ہے اس محسوس مثال کے بعد اب روحانیت اور اخلاقیات کی طرف آئیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں بھی اعتدال اور بے اعتدالی کا یہی طریقہ جاری ہے، اس کے اعتدال کا نام روحانی صحت اور بے اعتدالی کا نام روحانی اور اخلاقی مرض ہے، اور اس مرض کا اگر علاج کر کے اعتدال پر نہ لایا جائے تو اس کا نتیجہ روحانی موت ہے، اور یہ بھی کسی صاحب بصیرت انسان پر محقق نہیں کہ جو ہر انسانیت جس کی وجہ سے انسان ساری مخلوقات کا حاکم اور مخدوم قرار دیا گیا ہے، وہ اس کا بدن یا بدن کے اجزاء و اخلاط یا ان کی کیفیات حرارت و برودت نہیں، کیونکہ ان اجزاء و کیفیات میں تو دنیا کے سارے جانور بھی انسانیت کے ساتھ شریک بلکہ انسانیت سے زیادہ حصہ رکھتے والے ہیں۔

جو ہر انسانیت جس کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات اور آفت کے کائنات مانا گیا ہے، وہ اس کے گوشت پوست اور حرارت و برودت وغیرہ سے بالاتر کوئی چیز ہے، جو انسان میں کامل اور اکمل طور پر موجود ہے، دوسری مخلوقات کو اس کا وہ درجہ حاصل نہیں، اور اس کا معین کر لینا بھی کوئی باریک اور مشکل کام نہیں، کہ وہ انسان کا روحانی اور اخلاقی کمال ہے، جس نے اس کو محنت و کم کائنات بنایا ہے، مولانا رومی نے خوب فرمایا ہے۔

آدمیت لحم و شحم و پوست نیست

آدمیت جسز رضاے دوست نیست

اور اسی وجہ سے وہ انسان جو اپنے جوہر شرافت و فضیلت کی بے قدری کر کے اس کو ضائع کرتے ہیں ان کے لئے میں فرمایا ہے۔

ایست کہ می بینی حنلاب آدم اند

نیستند آدم حنلاب آدم اند

اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ انسان کا جوہر شرافت اور مدار فضیلت اس کے روحانی اور اخلاقی کالات ہیں، اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ بدن انسانی کی طرح روح انسانی بھی اعتدال و بے اعتدالی کا شکار ہوتی ہے، اور جس طرح بدن انسانی کی صحت، اس کے مزاج اور اخلاط کا اعتدال ہے، اسی طرح روح کی صحت بھی اور اس کے جنس و خلق کا اعتدال ہے، اس لئے انسان کا مل کہلائیگا مستحق صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو جسمانی اعتدال کے ساتھ روحانی اور اخلاقی اعتدال بھی رکھتا ہو، یہ کمال تمام انبیاء علیہم السلام کو خصوصیت کے ساتھ عطا ہوتا ہے، اور ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء علیہم السلام میں بھی سب سے زیادہ یہ کمال حاصل تھا، اس لئے انسانی کامل کے اولین مصداق

آپ ہی ہیں، اور جس طرح جسمانی علاج معالجہ کے لئے ہر زمانہ اور ہر جگہ ہر پستی میں طبیب اور ڈاکٹر اور دواؤں اور آلات کا ایک حکم نظام حق تعالیٰ نے قائم فرمایا ہے، اسی طرح روحانی علاج اور قوموں میں جنسالاتی اعتدال پیدا کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے، ان کے ساتھ آسمانی ہدایات بھیجیں اور بہت ضرورت مادی طاقتیں بھی عطا کی گئیں، جن کے ذریعہ وہ یہ قانون اعتدال دنیا میں نافذ کر سکیں، اسی مضمون کو قرآن کریم نے سورۃ حدید میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

لَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْنَا سُورَةً مِّنَ الْكِتَابِ وَ
أَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِاللُّغَةِ
الَّتِي يَفْقَهُمُ النَّاسُ بِأَنفُسِهِمْ وَأَنزَلْنَا
الْحَدِيدَ يُدْخِلُ بِأَيْدِيهِمْ سُلَاطِنًا
مِّنَّا فِيهِ لِقَاسٌ (۲۵: ۵۷)

یعنی ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں
وہ کر اور ان مادی اُن کے ساتھ کتاب اور
ترانہ تاکہ لوگ مدد و انصاف پر قائم ہو سکیں
اور ہم نے انکار اُن کو اس میں سخت لڑائی ہوا
لوگوں کے کام چلتے ہیں۔

اس میں انبیاء علیہم السلام کے بھیجے اور ان پر کتابیں نازل کرنے کی حکمت یہی بتلائی ہے کہ وہ ان کے ذریعہ لوگوں میں جنسالاتی اور عملی اعتدال پیدا کریں، کتاب، اخلاق، اور روحانی اعتدال پیدا کرنے کے لئے نازل کی گئی، اور ترانہ و معاملات دین میں عملی اعتدال پیدا کرنے کے لئے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ترانہ سے مراد ہر پیغمبر کی شریعت ہو، جس کے ذریعہ اعتدال حقیقی معلوم ہوتا ہے، اور مدد انصاف قائم کیا جاسکتا ہے۔

اس تفصیل سے آپ نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے بھیجے اور ان پر کتابیں نازل کرنے کی اصل غرض و حکمت یہی ہے کہ قوموں کو اخلاقی اور عملی اعتدال پر قائم کیا جائے، اور یہی قوموں کی صحت مندی اور تندرستی ہے۔

انت محمد میں قوم کا اعتدال اس بیان آپ نے یہ بھی معلوم کر لیا ہوگا کہ انت محمدیہ علی ما جاءها الصلوة والسلام کی جو فضیلت آیت مذکورہ میں بتلائی گئی، وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا یعنی ہم نے تمہیں ایک معتدل امت بنایا ہے، یہ بولنے اور سمجھنے میں تو ایک لفظ ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے کسی قوم یا شخص میں جتنے کمالات اس دنیا میں ہو سکتے ہیں ان سب کے لئے حادی اور جامع ہے۔

اس میں امت محمدیہ کو امت وسط یعنی معتدل امت فرما کر یہ بتلادیا کہ انسان کا جو صبر شرافت و فضیلت ان میں بدرجہ کمال موجود ہے، اور جس غرض کیلئے یہ آسمان و زمین کا سارا نظام ہوا اور جس کے لئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں بھیجی گئی ہیں، یہ امت اس میں ساری امتوں سے ممتاز اور افضل ہے۔

قرآن کریم نے اس امت کے متعلق اس خاص وصف فضیلت کا بیان مختلف آیات میں مختلف عنوانات سے کیا ہے، سورۃ اعراف کے آخر میں امت محمدیہ کے لئے ارشاد ہوا:-

وَمِنْ قَبْلُ جَعَلْنَا آيَةً يَسْتَبْشِرُونَ
بِالْحَقِّ وَيَوْمَ يَقُولُ الْكَافِرُ
تَوْبَتِي لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ (۱۸۱: ۷)

یعنی اُن لوگوں میں جن کو ہم نے پیدا کیا ہو
ایک ہی امت ہے جو سچے راہ بتلاتے ہیں اور
اس کے موافق انصاف کرتے ہیں۔

اس میں امت محمدیہ کے اعتدال روحانی و اخلاقی کو واضح فرمایا ہے، کہ وہ اپنے ذاتی مفادات اور خواہشات کو چھوڑ کر آسمانی ہدایت کے مطابق خود بھی چلتے ہیں، اور دوسروں کو بھی چلانے کی کوشش کرتے ہیں، اور کسی معاملہ میں نزاع و اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ بھی اسی بے لاگ آسمانی قانون کے ذریعہ کرتے ہیں، جس میں کسی قوم یا شخص کے ناجائز مفاد کا کوئی خطرہ نہیں۔

اور سورۃ آل عمران میں امت محمدیہ کے اسی اعتدالی مزاج اور اعتدالی روحانی کے آثار کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے:

مُسْلِمِينَ مَخْلُوعِينَ أُمَّةً مِّنْ قَبْلُ
يَلْتَأْسُ قَوْمُكَ يَوْمَئِذٍ بِالتَّغْيِيرِ
وَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْنُزُونَ
بِالْغُيُوبِ (۱۱۰: ۳)

یعنی ہم سب امتوں میں بہتر ہو جو عالم میں
بھی گئی ہو، ہم کو حکم کرتے ہو اپنے کاموں کا اور
منہ کرتے ہو بڑے کاموں سے اور اللہ پرست
لاتے ہو۔

یعنی جس طرح ان کو رسول سب رسولوں میں افضل نصیب ہوئے، کتاب سب کتابوں میں جامع اور اکمل نصیب ہوئی، اسی طرح ان کو قوموں کا ہمتیہ مزاج اور اعتدال بھی اس اعلیٰ پیمانے پر نصیب ہوا کہ وہ سب امتوں میں بہتر امت قرار پائی، اس پر علوم و معارف کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں، ایمان و عمل و تقویٰ کی تمام شاخیں ان کی فشر بائیوں سے سرسبز شاداب ہوں گی، وہ کسی مخصوص ملک و اقلیم میں محصور نہ ہوں گی، بلکہ اس کا دائرہ عمل سارے عالم اور انسانی زندگی کے سارے شعبوں کو محیط ہو گا، اگرچہ اس کا وجود ہی اس لئے ہو گا کہ دوسروں کی خیر خواہی کرے، اور جس طرح ممکن ہو انہیں جنت کے دروازوں پر لاکھڑا کر دے، اُنْخْرِجْتُمُ الْيَتَامَىٰ مِن مَّوَارِثِهِمْ اس کا فرض طرف اشارہ ہے، کہ یہ امت دوسروں کی خیر خواہی اور فائدہ کے لئے بنائی گئی ہے، اس کا فرض منصبی اور قومی نشان یہ ہے کہ لوگوں کو نیک کاموں کی ہدایت کرے، بُرے کاموں سے روکے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اَلْكَفَىٰ بِمُؤْتَمَرِ الْمُشْرِكِينَ كَافِيًا مطلب ہو کہ دین اس کا نام ہے، کہ سب ملانوں کی خیر خواہی کرے، پھر بُرے کاموں میں کفر و شرک

بدعات، رسوم قبیحہ، فسق و فجور اور ہر قسم کی باحسلاقی اور نامعقول باتیں شامل ہیں، اُن سے روکنا بھی کئی طرح ہوگا، کہیں زبان سے کہیں ہاتھ سے، کبھی قلم سے، کبھی تلوار سے، غرض ہر قسم کا چارہ اس میں داخل ہوگا۔ یہ صفت جس قدر معلوم و اہتمام سے امت محمدیہ میں پائی گئی پہلی امتوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

۳۔ اب دوسری بات غور طلب یہ رہ گئی کہ اس امت کے توسط و اعتدال کا واقعہات سے ثبوت کیا ہے، اس کی تفصیل طویل اور تمام امتوں کے اعتقادات، اعمال و اخلاق اور کارناموں کا موازنہ کر کے بتلانے پر موقوف ہے، اس میں سے چند چیزیں بطور مثال ذکر کی جاتی ہیں۔

اعتقاد کی اعتدالی: سب سے پہلے اعتقادی اور نظری اعتدال کو لے لیجئے، تو پہلی امتوں میں ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ اللہ کے رسولوں کو اس کا بیٹا بنا لیا، اور ان کی عبادت اور پرستش کرنے لگے، وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ (۳۰، ۴۱) اور دوسری طرف انہی قوموں کے دوسرے افراد کا یہ عالم بھی مشاہدہ میں آئے گا کہ رسول کے مسلسل معجزات دیکھنے اور برکتوں کے باوجود جب اُن کا رسول ان کو کسی جنگ و جدال کی دعوت دیتا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں خَاذِبٌ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلْ إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ (۵۴، ۵۵) یعنی جیسے آپ اور آپ کا پروردگار وہی مخالفین سے قتال کریں، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں، کہیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ اپنے انبیاء کو خود ان کے ماننے والے طرح طرح کی ایذا میں پہنچاتے ہیں۔

خلافت امت محمدیہ کے وہ ہر ترن ہر زمانے میں ایک طرف تو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ عشق و محبت رکھتے ہیں کہ اس کے آگے اپنی جان و مال اور اولاد و آبرو سب کو قربان کر دیتے ہیں۔

سلام اُس پر کہ جس کے نام پر ہر زبان میں

بڑھا رہے ہیں مگر اسے فردوسی کے قصے میں

اور دوسری طرف یہ اعتدال کہ رسول کو رسول اور خدا کو خدا سمجھتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو با ایں ہمہ کمالات و فضائل غبارِ شہداء و رُسُل ماننے اور کہتے ہیں، وہ آپ کے مدائح و مناقب میں بھی یہ بیان رکھتے ہیں، جو قصیدہ برترہ میں فرمایا ہے

فِي مَا لَا عِشَّةَ النَّصْلَانِي فِي تَيْتَلِيهِ وَالْحُكْمُ بِمَا شِئْتَ مِنْ عَائِدَةٍ احْكُمِ

یعنی اس کلمہ کفر کو تو چھوڑ دو جو نصاریٰ نے اپنے نبی کے مانے میں کہہ دیا، کہ وہ معاذ اللہ خود

خدا با خدا کے بیٹے ہیں، اس کے سوا آپ کی مدح و ثناء میں جو کچھ کہو وہ سب حق و صحیح ہے۔

جس کا خلاصہ کہیں نے ایک مصرع میں اس طرح بیان کر دیا ہے

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

عمل اور عبادت میں اعتدال: اعتقاد کے بعد عمل اور عبادت کا نمبر ہے، اس میں ملاحظہ فرمائیے پہلی امتوں میں ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ اپنی شریعت کے احکام کو چند حکموں کے بدلے فروخت کیا جاتا ہے، ارشتریں نیکر آسانی کتاب میں ترمیم کی جاتی ہے، یا غلط فتویٰ دیئے جاتے ہیں اور طرح طرح کے چیلے پہانے کر کے شرعی احکام کو بدلا جاتا ہے، عبادت سے پیچھا چھڑایا جاتا ہے اور دوسری طرف عبادت خانوں میں آپ کو ایسے لوگ بھی نظر آئیں گے جنہوں نے ترک دنیا کر کے رہبانیت اختیار کر لی، وہ خدا کی دی ہوئی حلال نعمتوں سے بھی اپنے آپ کو محروم رکھتے اور سختیاں جھیلنے ہی کو عبادت و ثواب سمجھتے ہیں۔

امت محمدیہ نے اس کے خلاف ایک طرف رہبانیت کو انسانیت پر ظلم قرار دیا، اور دوسری طرف احکام خدا و رسول پر مرثیے کا جذبہ پیدا کیا، اور قیصر و کسری کے سخت و تاج کے مالک بن کر دنیا کو یہ دکھلا دیا کہ دیانت و سیاست میں یا دین و دنیا میں بر نہیں، مذہب صرف مسجدوں یا خانقاہوں کے گوشوں کے لئے نہیں آیا بلکہ اس کی بھکاری بازاروں اور دفتروں پر بھی ہے، اور وزارتوں اور امارتوں پر ہیں، اس نے بادشاہی میں فیکری اور فیکری میں بادشاہی سمجھائی ہے

چو فقر اندر لباس شاہی آمد

ز تدبیر عیب اللہ آمد

معاشرتی اور تمدنی اعتدال: اس کے بعد معاشرت اور تمدن کو دیکھئے، تو پہلی امتوں میں آپ ایک طرف یہ بے اعتدالی دیکھیں گے کہ انسانی حقوق کی کوئی بردہ نہیں، حق ناخن کی کوئی بحث نہیں، اپنی اغراض کے خلاف جس کو دیکھا اس کو کھل ڈالنا، قتل کر دینا، لوٹ لینا سب بڑا کمال ہے، ایک زمین کی چراگاہ میں کسی دوسرے کا اونٹ گھس گیا، اور وہاں کچھ نقصان کر دیا تو عرب کی مشہور جنگ حرب بنو سہل تیرہ ہزاروں انسانوں کا خون ہوا، عورتوں کو انسانی حقوق دینا تو کہا زندہ رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی، کہیں بچپن ہی میں ان کو زندہ درگور کر دینے کی رسم تھی، کہیں مردہ شوہروں کے ساتھ شتی کر کے جلا ڈالنے کا رواج تھا، اس کے بالمقابل دوسری طرف یہ سفیانہ رحم دلی کہ کپڑے بکھڑوں کی ہتھیا کو حرام سمجھیں، جانوروں کے ذبیحہ کو حرام قرار دیں، خدا کھال کئے ہوئے جانوروں کے گوشت و پوست سے نفع اٹھانے کو ظلم سمجھیں، امت محمدیہ اور اس کی شریعت نے ان سب بے اعتدالیوں کا خاتمہ کیا، ایک طرف انسان کو انسان کے حقوق بتلائے، اور نہ صرف صلح و دوستی کے وقت بلکہ عین میدان جنگ میں مخالفین کے حقوق کی حفاظت سکھائی، عورتوں کو مردوں کی طرح حقوق عطا فرمائے، اور دوسری طرف ہر چیز کی حد مقرر فرمائی، جس سے آگے بڑھنے اور پیچھے رہنے کو جرم قرار دیا، اور اپنے حقوق کے

معاشرہ میں درگزر اور عضو چشم پوشی کا سبق سکھایا، اور دوسروں کے حقوق کا پورا اہتمام کرنے کے آداب سکھلائے۔

اقتصادی اور مالی اعتدال: اس کے بعد دنیا کی ہر قوم و ملت میں سب سے اہم مسئلہ معاشیات اور اقتصادیات کا ہے، اس میں بھی دوسری قوموں اور امتوں میں طرح طرح کی بے اعتدالی نظر آئیں گی، ایک طرف نظام سرمایہ داری ہے جس میں حلال و حرام کی قیود سے اور دوسرے لوگوں کی غرض حالی یا بد حالی سے آنکھیں بند کر کے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کر لینا سب سے بڑی انسانی فضیلت سمجھی جاتی ہے، تو دوسری طرف شخصی اور انفرادی ملکیت ہی کو سب سے جرم قرار دیا جاتا ہے، اور غور کرنے سے دونوں اقتصادی نظاموں کا حاصل مال و دولت کی پرستش اور اس کو مقصد زندگی سمجھنا اور اس کے لئے دوڑ دھوپ ہے۔

امت محمدیہ اور اس کی شریعت نے اس میں بھی اعتدال کی عجیب و غریب صورت پیدا کی، کہ ایک طرف تو دولت کو مقصد زندگی بنانے سے منع فرمایا، اور انسانی عزت و شرافت یا کسی منصب جہد کا مدار اس پر نہیں رکھا، اور دوسری طرف تقسیم دولت کے ایسے پاکیزہ اصول مقرر کئے جن سے کوئی انسان ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے، اور کوئی فرد ساری دولت کو نہ سمیٹ لے، قابل اشتراک چیزوں کو مشترک اور وقف عام رکھا، مخصوص چیزوں میں انفرادی ملکیت کا عمل احترام کیا، حلال مال کی فضیلت اس کے رکھنے اور استعمال کرنے کے صحیح طریقے بتلائے، اس کی تفصیل اس قدر طویل ہے کہ ایک مستقبل بیان کو چاہتی ہے، اس وقت بطور مثال چند نمونے اعتدال اور بے اعتدالی کے پیش کرتے تھے، اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے جس سے آیت مذکورہ کا مضمون واضح ہو گیا، کہ امت محمدیہ ایک معتدل اور بہترین امت بنایا گیا ہے۔

شہادت کے لئے عدل **إِنَّكُمْ كُنْتُمْ أُمَّةً عَقِلًا** یعنی امت محمدیہ کو وسط اور عدل و ثقہ نفع ہونا شرط ہے اس لئے بنایا گیا کہ یہ شہادت دینے کے قابل ہو جائیں، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص عدل نہیں وہ قابل شہادت نہیں، عدل کا ترجمہ ثقہ یعنی قابل اعتماد کیا جاتا ہے اس کی پوری شرائط کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

اجماع کا حجت ہونا: قرطبی نے فرمایا کہ یہ آیت اجماع امت کے حجت ہونے پر ایک دلیل ہو کیونکہ جب اس امت کو اللہ تعالیٰ نے شہداء و شہرار دے کر دوسری امتوں کے بالمقابل انکی بات کو حجت بنادیا، تو ثابت ہوا کہ اس امت کا اجماع حجت ہو، اور عمل اس پر واجب ہے، اس طرح کہ صحابہ کا اجماع تابعین پر اور تابعین کا اجماع تبع تابعین پر حجت ہے۔

اور تفسیر منطوری میں ہے کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ اس امت کے جو افعال و اعمال متفق علیہ ہیں وہ سب محمود و مقبول ہیں، کیونکہ اگر سب کا اتفاق کسی خطا پر تسلیم کیا جائے تو پھر یہ کہنے کے کوئی معنی نہیں رہے کہ یہ امت وسط اور عدل ہے۔

اور امام جصاص نے فرمایا کہ اس آیت میں اس کی دلیل ہے کہ ہر زمانے کے مسلمانوں کا اجماع معتبر ہو، اجماع کا حجت ہونا صرف قرن اول یا کسی خاص زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں، کیونکہ آیت میں پوری امت کو خطاب ہے، اور امت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف وہ نہ تھے جو اس زمانے میں موجود تھے، بلکہ قیامت تک آنے والی نسلیں جو مسلمان ہیں وہ سب آپ کی امت ہیں تو ہر زمانے کے مسلمان شہداء اللہ ہو گئے، جن کا قول حجت ہے، وہ سب کسی خطا اور غلطی پر متفق نہیں ہو سکتے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ

اور نہیں مقرر کیا تھا ہم نے قبلہ کے لئے تو پہلے تھا مگر اس واسطے کہ معلوم کریں کہ کون تابع

الرَّسُولِ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقْبَيْهِ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى

رسول کا اور کون پھر جلتے گا آئے پاؤں اور بے شک یہ بات بھاری ہوئی مگر ان پر

الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ أَيْمَانًا كُفْرًا إِنَّ اللَّهَ

جن کو راہ دکھائی اللہ نے اور اللہ ایسا نہیں کہ ضائع کرے تمہارا ایمان بیشک اللہ

بِالنَّاسِ لَرَوُوفٌ شَرِّ حَلِيمٌ

لوگوں پر بہت شفیق نہایت ہرمان ہے

خلاصہ تفسیر: اور اصل میں تو شریعت محمدیہ کے لئے ہم نے کعبہ ہی قبلہ تجویز کر رکھا تھا (اور جب سمت قبلہ پر آپ (چند روز قادم) رہ چکے ہیں یعنی بیت المقدس) وہ تو محض اس مصلحت کے لئے تھا کہ ہم کو ظاہری طور پر بھی معلوم ہو جاوے کہ اس کے مقرر ہونے سے یا بدلنے سے یہود اور غیر یہود میں سے کون تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اختیار کرتا ہے اور کون پیچھے کو ہٹتا جاتا ہے اور نفرت اور مخالفت کرتا ہے اس امتحان کے لئے اس عاجزی قبلہ کو مقرر کیا تھا، پھر اصلی قبلہ سے اس کو منسوخ کر دیا، اور یہ قبلہ کا بدلنا (مخوف لوگوں پر)

ہوا بڑا ثقیل رہا، مگر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے وسیعے طریق کی ہدایت فرمائی ہے، جس کا بیان اوپر آچکا ہے کہ احکام ایسے کو بے چون و چرا قبول کر لینا ان کو کچھ بھی گراں نہیں ہوا، جیسا پہلے اس کو خدا کا حکم سمجھتے تھے اب اس کو سمجھنے لگے، اور وہ ہم نے جو کہا ہے کہ بیت المقدس قبلہ غیر اصلی تھا، اس سے کوئی شخص یہ دوسرے دلائل سے تو جتنی نمازیں اور ہڑوسی ہیں ان میں ثواب بھی کم ہوا، کیونکہ اصلی قبلہ کی طرف نہ تھیں، سو اس دوسرے کورل میں نہ لانا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے نہیں کہ تمہارے ایمان کے متعلق اعمال مثلاً نماز کے ثواب کو منافع اور ناقص کر دیں اور واقعی اللہ تعالیٰ تو دلیجے لوگوں پر بہت ہی شفیق اور مہربان ہیں تو ایسے شفیق مہربان پر یہ گمان کب ہو سکتا ہے، کیونکہ کسی قبلہ کا اصلی یا غیر اصلی ہونا تو ہم ہی جانتے ہیں، تم نے تو دونوں کو ہمارا حکم سمجھ کر قبول کیا، اس لئے ثواب بھی کسی کا کم نہ ہوگا۔

معارف و مسائل

کعبہ کے قبلہ نماز ہونے کی اس میں صحابہ و تابعین کا اختلاف ہوا کہ ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں ابتدا کب ہوئی جب نماز فرض ہوئی اس وقت قبلہ بیت اللہ تھا، یا بیت المقدس حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول یہ ہے کہ اول ہی سے قبلہ بیت المقدس تھا، جن ہجرت کے بعد ہی سولہ ستروہینہ مکہ باقی رہا، اس کے بعد بیت اللہ کو قبلہ بنانے کے احکام نازل ہو گئے، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مکہ مکرمہ میں یہ رہا، کہ آپؐ حجرا سو اور رکن بیانی کے درمیان نماز پڑھتے تھے، تاکہ بیت اللہ بھی سامنے رہے اور بیت المقدس کا بھی استقبال ہو جائے، مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد یہ ممکن نہ رہا، اس لئے تحویل قبلہ کا اشتیاق پیدا ہوا (ابن کثیر)

اور دوسرے حضرات نے فرمایا کہ جب نماز فرض ہوئی مکہ مکرمہ میں تو مسلمانوں کا ابتدائی قبلہ بیت اللہ ہی تھا، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ و اسمعیل علیہما السلام کا قبلہ بھی بیت اللہ ہی رہا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ میں مقیم رہے، بیت اللہ ہی کی طرف نماز پڑھتے رہے، پھر ہجرت کے بعد آپؐ کا قبلہ بیت المقدس قرار دیدیا گیا، اور مدینہ منورہ میں سولہ ستروہینہ آپؐ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھیں، اس کے بعد پھر آپؐ کا جو پہلا قبلہ تھا یعنی بیت اللہ اس کی طرف نماز میں توجہ کرنے کا حکم آگیا، تفسیر ترمذی میں بحوالہ ابو عمر اس کو واضح القولین قرار دیا ہے، اور حکمت اس کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ مدینہ منورہ میں تشریف لانے کے بعد چونکہ قبائل یہودی سے سابقہ پڑا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مانوس کرنے کے لئے انہی کا قبلہ باذن حق اور ہندی اختیار کر لیا، مگر پھر تجربہ سے ثابت ہوا کہ یہ لوگ اپنی ہیست دیکھ

سے باز آنے والے نہیں تو پھر آپؐ کو اپنے اصل قبلہ یعنی بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا حکم مل گیا، جو آپؐ کو اپنے آباء ابراہیمؑ و اسمعیلؑ کا قبلہ ہونے کی وجہ سے طبعاً محبوب تھا۔

اور قرطبی نے ابو العالیہ ریاحی سے نقل کیا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی مسجد کا قبلہ بھی بیت اللہ کی طرف تھا، اور پھر ابو العالیہ نے نقل کیا ہے کہ ان کا ایک یہودی سے مناظرہ ہو گیا، یہودی نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کا قبلہ صحفہ بیت المقدس تھا، ابو العالیہ نے کہا کہ نہیں، موسیٰ علیہ السلام صحفہ بیت المقدس کے پاس نماز پڑھتے تھے مگر آپؐ کا رخ بیت اللہ ہی کی طرف ہوا تھا، یہودی نے انکار کیا تو ابو العالیہ نے کہا کہ اچھا میرے تمہارے جھگڑنے کا فیصلہ حضرت صالح علیہ السلام کی مسجد کر دے گی، جو بیت المقدس کے نیچے ایک پہاڑ پر ہے، دیکھا گیا تو اس کا قبلہ بیت اللہ کی طرف تھا۔

اور جن حضرات نے پہلا قول اختیار کیا ہے ان کے نزدیک بحکمت یہ تھی کہ مکہ مکرمہ میں تو مشرکین سے ہستیاز اور ان سے مخالفت کا اہتمام کرنا تھا، اس لئے ان کا قبلہ چھوڑ کر بیت المقدس کو قبلہ بنا دیا گیا، پھر ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں یہود و نصاریٰ سے ہستیاز اور ان کی مخالفت کا اہتمام ضرور ہوا تو ان کا قبلہ بدل کر بیت اللہ کو قبلہ بنا دیا گیا، اسی اختلاف اقوال کی بناء پر آیت مذکورہ کی تفسیر میں بھی اختلاف ہو گیا کہ الْقِبْلَةُ الَّتِي كُنْتُمْ عَلَيْهِ تَحْتَمِلُ مَا رَأَيْتُمْ، قول اول کی بناء پر اس سے مراد بیت المقدس ہے، جو آپؐ کا قبلہ اولیٰ تھا، اور قول ثانی کی بناء پر اس سے مراد کعبہ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ یہی آپؐ کا پہلا قبلہ تھا۔

اور مفہوم آیت کا دونوں صورتوں میں یہ ہے کہ ہم نے تحویل قبلہ کو آپؐ کا اتباع کرنے والے مسلمانوں کے لئے ایک امتحان قرار دیا ہے، تاکہ ظاہر طور پر یہی معلوم ہو جائے کہ کون آپؐ کا صحیح فرمانبردار ہے اور کون اپنی رائے کے پیچھے چلتا ہے، چنانچہ تحویل قبلہ کا حکم نازل ہونے کے بعد بعض ضعیف الایمان یا وہ جن کے دلوں میں کچھ ففاق تھا اسلام سے پھر گئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر الزام لگایا کہ یہ تو اپنی قوم کے دین کی طرف پھر گئے۔

بعض احکام متعلقہ

بہن سنت کو قرآن کے ذریعہ جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ قرآن کریم میں کہیں اس کی تصریح بھی مشورہ کیا جاتا ہے نہیں ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبل اور ہجرت یا بعد ہجرت بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، بلکہ اس کا ثبوت صرف احادیث اور سنت نبویہ ہی سے ہے، توجہ چیز سنت کے ذریعہ ثابت ہوئی تھی اس آیت قرآن نے اس کو مشورہ کر کے

آپ کا قبلہ بیت اللہ کو بنا دیا۔

اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حدیث رسول بھی ایک حیثیت سے قرآن ہی ہے، اور یہ کہ کچھ احکام وہ بھی ہیں جو شترآن میں مذکور نہیں، صرف حدیث سے ثابت ہیں، اور قرآن ان کی شرعی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے، کیونکہ اسی آیت کے اخیر میں یہ بھی مذکور ہے کہ جو نمازیں باہر رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف پڑھی گئیں وہ بھی معتبر اور مقبول عند اللہ ہیں۔

خبر واحد جبکہ شترآن قویہ اس کے ثبوت پر موجود، بخاری و مسلم اور تمام معتبر کتب حدیث میں متعدد صحاح کرامؓ ہوں اس سے شترآنی حکم منسوخ سمجھا جکتا ہے کی روایت سے منقول ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تخیل قبلہ کا حکم نازل ہوا اور آپ نے عصر کی نماز جانب بیت اللہ پڑھی، اور بعض روایات میں اس جنگ عصر کے بھانے ظہر مذکور ہے (ابن کثیر) تو بعض صحابہ کرامؓ یہاں سے نماز پڑھ کر باہر گئے، اور دیکھا کہ قبیلہ بنی سہیلہ کے لوگ اپنی مسجد میں حسب سابق بیت المقدس کی طرف نماز پڑھ رہے ہیں تو انھوں نے آواز دے کر کہا کہ اب قبلہ بیت اللہ کی طرف ہو گیا ہے۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بجانب بیت اللہ نماز پڑھ کر آئے ہیں، ان لوگوں نے درمیان نماز ہی اپنا رخ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف پھیر لیا، تو یہ سنت مسلم کی روایت میں ہے کہ اس وقت عمرؓ میں جو پھل صفوں میں تھیں آگے آگئیں اور مرد جو اگلی صفوں میں تھے پیچھے آگئے، اور جب رخ بیت اللہ کی طرف بدلا گیا تو مرد کی صفیں آگے اور عورتوں کی پیچھے ہو گئیں (ابن کثیر)

بنو سلمہ کے لوگوں نے تو ظہر عصر ہی سے تخیل قبلہ کے حکم پر عمل کر لیا، مگر قباہ میں یہ خبر اگلے دن صبح کی نماز میں پہنچی، جیسا کہ بخاری و مسلم میں بڑا بیت ابن عمرؓ مذکور ہے، اہل قباہ نے بھی نماز ہی کے اندر اپنا رخ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف پھیر لیا (ابن کثیر و جصاص)

امام جصاصؒ نے یہ متعدد روایات حدیث نقل کر کے فرمایا:

هذه اخبار صحيحه مستفيضه في يدي	یعنی یہ حدیث اگرچہ اصل سے خبر واحد ہے
اهل العلم قد تلقوه بالقبول فثبت	مگر قرآن قویہ کی وجہ سے اس نے درجہ تراثر کا
في حيز النواتج الموجب للعلم	محل کر لیا ہے، جو علم یقین کا موجب ہوتا ہے

مگر حنفیہ اور ان کے متفق فقہاء جن کا ضابطہ یہ ہے کہ خبر واحد سے کوئی قطعی حکم منسوخ نہیں ہو سکتا، ان پر یہ سوال اب بھی باقی رہتا ہے کہ اس حدیث کی شہرت اور تلقی بالقبول تو بعد میں ہوئی، بنو سلمہ اور اہل قباہ کو تو ابانک ایک ہی آدمی نے خبر دی تھی، اس وقت اس حدیث کو درجہ شہرت تو انرا حاصل نہیں تھا، انھوں نے اس پر کئی عمل کر لیا، جصاصؒ نے فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ ان حضرات اور سب صحابہ کو پہلے سے یہ معلوم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رطبیت یہ ہے کہ آپ کا قبلہ بیت اللہ کو بنا دیا

اور آپ اس کے لئے دعا بھی کر رہے ہیں، اس رغبت و دعا کی وجہ سے ان حضرات کی نظر میں بیت المقدس کا حکم آئندہ باقی نہ رہے گا احتمال ضرور پیدا ہو گیا تھا، اس احتمال کی وجہ سے بقا قبلہ بیت المقدس غلط ہو گیا تھا، اس کے منسوخ کرنے کے لئے پیچہ را حکمانی ہو گئی، ورنہ محض خبر واحد سے کوئی شترآنی قطعی فیصلہ منسوخ ہو جانا منقول نہیں۔

آلہ کبر الصوت کی آواز پر نمازیں | بیچ بخاری باب ما جاء في القبلة میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں نقل و حرکت مفسد نماز نہ ہو بلکہ استدلال | جو قباہ میں تخیل قبلہ کا حکم پہنچے اور ان لوگوں کے بحالت مناسبت بیت اللہ کی طرف پھر جانے کا واقعہ ذکر کیا، اس پر علامہ عینی حنفی نے تحریر فرمایا ہے:

فيه جواز تعليم من ليس في	یعنی اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جو شخص
الصلوة من هو فيها	نماز میں شریک نہیں وہ کسی نماز پڑھنے والے
(عدة القاری، ص ۱۳۸ ج ۳)	کو تعلیم و یقین کر سکتا ہے

نیز علامہ عینی نے دوسری جگہ اس حدیث کے ذیل میں یہ الفاظ لکھے ہیں، وفيه استماع المتعلمي للام من ليس في الصلوة فلا يضر صلواته (الی) ممکن الاستبطله الطحاوی (عدة القاری، ص ۲۲۲ ج ۱)

اور عام فقہاء حنفیہ نے جو حاج صلاۃ کسی شخص کی اقتداء اور اتباع کو مفسد نماز کہا ہے جو عام متون و شروح حنفیہ میں منقول ہے، اس کا منشاء یہ ہے کہ نماز میں غیر اللہ کے امر کا اتباع موجب فساد نماز ہے، لیکن اگر کوئی شخص اتباع امر الہی کا کرے مگر اس اتباع میں کوئی دوسرا شخص واسطہ بن جائے وہ موجب فساد نہیں۔

فقہاء نے جہاں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ کوئی شخص جماعت میں شریک ہونے کے لئے ایسے وقت پہنچے کہ اگلی صفت پوری ہو چکی ہے، اب پھل صفت میں ہنارہ جاتا ہے تو اس کو چاہئے کہ اگلی صفت میں کسی آدمی کو پیچھے کھینچ کر اپنے ساتھ ملا لے، اس میں بھی یہی سوال آتا ہے کہ اس کے کہنے سے جو پیچھے آجائے گارہ نماز میں اتباع امر غیر اللہ کا کرے گا، اس لئے اس کی نماز فاسد ہو جانی چاہئے، لیکن درختار باب الامامة میں اس مسئلہ کے متعلق تحریر فرمایا تم نقل تصحیح عدم الفساد فی مثلہ من حدیث من الصف فتناء خرفہ من شرفہ فلیحذر، اس پر علامہ طحاویؒ نے تحریر فرمایا: لا تغفلوا عن مثل من آمن بالله والین اس صورت میں نماز فاسد نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت اس شخص نے آمناوالے کے حکم کا اتباع نہیں کیا، بلکہ امر الہی کا اتباع کیا ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کو پہنچا ہے، کہ جب ایسی صورت پیش آئے تو اگلی صفت والے کو پیچھے آجانا چاہئے۔

اسی طرح شربلانیؒ نے شرح وہبانیہ میں اس مسئلہ کا ذکر کر کے پہلے فساد نماز کا قول نقل کیا

پھر اس کی تردید کی اس کے الفاظ یہ ہیں۔ (اِذَا قِيْلَ اُصَلِّ فَقَدْ عَلِمَ) (رالی) فسدات صلوٰۃ لانہ امتثل امر غیر اللہ فی الصلوٰۃ لان امتثالہ انما هو لا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلا یضراہ

ان تمام آیات ثابت ہوا کہ اگر کوئی نمازی ایسے شخص کی آواز پر عمل کرے جو اس کی شہادت میں شرکت میں تو اسکی وضو میں ایک ہر کہ خود اس شخص کی دلداری اور اتباع مقصد ہو یہ تو مفسد نماز ہے، لیکن اگر اس نے کوئی حکم شرعی بتلایا اور اس کا اتباع نمازی نے کر لیا تو وہ درحقیقت امر الہی کا اتباع ہے، اس لئے مفسد نماز نہیں ہوگا، اسی لئے طحاوی نے فیصلہ یہ کیا ہے کہ اقوال لوقیل بالتفصیل بین کونہ امتثل امر الشارع فلا یضلی بین کونہ امتثل امر الداخل مراعاة لخالطہ من غلبہ نظر لا مراعاتہ

فتاویٰ لکان حشا و طحاوی علی الدہ، ص ۲۳۶ ج ۱۱

اب مسئلہ زیر بحث یعنی آواز بکبر الصوت کا فیصلہ کر لینا آسان ہو گیا، کیونکہ وہاں اس آواز کے اتباع کا دور دور بھی وہم نہیں ہو سکتا، ظاہر ہے کہ اتباع رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کا ہوتا ہے کہ جب امام رکوع کرے تو رکوع کر دے، جب سجدہ کرے تو سجدہ بھی سجدہ کر دے، اس آواز سے اثر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب امام رکوع میں گیا، یا سجدہ میں جا رہا ہے، اس علم کے بعد اتباع امام کا کرنا کہ نہ کہ اس آواز کے حکم کا، اور اتباع امام ایک حکم الہی ہے، اور یہ کلام اس بنیاد پر ہے کہ آواز بکبر الصوت کی آواز کو عین امام کی آواز نہ مانی جائے بلکہ اس کی نقل و حکایت قرار دیا جائے، اور اہل فن اس کی آواز کو عین آواز امام کہتے ہیں، ان کی تحقیق پر تو کوئی اشکال جواز صلوٰۃ میں نہیں ہے، اس مسئلہ کی تحقیق پر احقر کا ایک مستقل مسئلہ رسالہ بھی شائع شدہ ہے اس کو دیکھ لیا جائے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا اِنْ شَاءَ اللَّهُ، یہاں اگر ایمان سے مراد اس کے معروف معنی سے جائے تو مطلب آیت کا یہ ہے کہ تخیل قبلہ پر جو بعض جو قوت لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ دین سے منحرف ہو گئے اور ان کا ایمان ہی ضائع ہو گیا، اس کا جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والے نہیں، بلکہ وقوف لوگوں کے کہنے پر کان نہ دھریں۔

اور بعض روایات حدیث اور اقوال سلف میں اس جگہ ایمان کی تفسیر نماز سے کی گئی ہے، اور معنی یہ ہیں کہ جو نمازی سابق قبلہ بیت المقدس کی طرف پڑھی گئی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ضائع کرنے والا نہیں، وہ تو صحیح و مقبول ہر جہیں، تخیل قبلہ کے حکم کا پھیلنا نمازوں پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ صحیح بخاری میں بروایت ابن عازب، اور ترمذی میں بروایت ابن عباس منقول ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ بیت المقدس بنا دیا گیا تو لوگوں نے سوال کیا کہ جو مسلمان اس غرض میں انتقال کر گئے جب کہ نماز بیت المقدس کی طرف ہوا کرتی تھی، اور بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا

ان کو نصیب نہیں ہوا ان کا کیا حال ہوگا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں نماز کو ایمان کے لفظ سے تعبیر کر کے واضح کر دیا کہ ان کی نمازیں سب صحیح و مقبول ہو چکی ہیں، ان کے معاملہ میں تخیل قبلہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا

بیشک ہم دیکھتے ہیں بار بار اٹھنا تیرے منہ کا آسمان کی طرف، سو اللہ پھر ہی گئے ہم تجھ کو جس قبلہ کی طرف چاہے

قَوْلٍ وَجْهِكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا

اب پھر منہ اپنا طرف مسجد الحرام کے اور جس جگہ تم ہوا کرو پھر منہ اس کی

وَجْوهَكُمْ شَطْرَهُ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ

طرف، اور جن کو کتاب البتہ جانتے ہیں کہ یہی

الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۚ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴿۲۰۳﴾

بیشک بران کے رب کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو وہ کرتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر آپ جو دل سے کعبہ کے قبلہ ہونے کی خواہش رکھتے ہیں، اور امید دہی میں بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھتے ہیں کہ شاید فرشتہ حکم لے آوے،

آپ کے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں اور چونکہ میں آپ کی خوشی پر راکھ منظور ہوں اس لئے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کو اس قبلہ کی طرف متوجہ کر دیں گے، جو آپ کو پسند ہو (لو پھر ہم حکم ہی دیتے ہیں کہ، اپنے اپنا چہرہ نماز میں مسجد حرام کی طرف کیا کیجئے اور یہ حکم صرف آپ کے لئے مخصوص نہیں بلکہ سب لوگ پیغمبر بھی اور امتی بھی) جہاں کہیں موجود ہو (خواہ دینہ منورہ میں یا اور جگہ، یہاں تک کہ خود بیت المقدس میں بھی) اپنے چہرہ کو اس (مسجد حرام) کی طرف کیا کر دے اور اس قبلہ کے معترف ہونے کے متعلق، یہ اپنی کتاب بھی بالعموم اپنی کتابوں کی پیشگوئی کی وجہ سے کہ نبی آخر الزماں کا قبلہ اس طرح ہوگا، یقیناً جانتے ہیں کہ یہ حکم بالکل ٹھیک ہے (اور ان کے پروردگار ہی کی طرف سے ہے) مگر عناد امانتے نہیں، اور اللہ تعالیٰ ان کی کارروائیوں سے کچھ بے خبر نہیں ہے۔

معارف مسائل

اس آیت کے پہلے جملہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہشتابان کعبہ کا ذکر ہے، اس اشتیاق کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں اور سب میں کوئی تعارض نہیں وہ سب وجوہ ہو سکتی ہیں مثلاً یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نزول وحی اور عطا نبوت سے پہلے اپنی طبیعت و فطرت سے ملتے ابراہیمی کے تالک کام کرتے تھے، اور نزول وحی کے بعد قرآن نے بھی آپ کی شریعت کو ملتے ابراہیمی کے مطابق تشریفات دیا، اور حضرت ابراہیم و حضرت اسمعیل علیہما السلام کا قبلہ بیت اللہ تھا، اس لئے آپ کی دلی خواہش یہی تھی کہ آپ کا اور مسلمانوں کا قبلہ بھی وہی کعبہ بیت اللہ قرار دیا جائے۔ یہ وجہ بھی تھی کہ قبائل عرب بھی چونکہ ملتے ابراہیمی کو کم از کم زبان سے مانستے تھے اور اس کی پیروی کے مدعی تھے، کعبہ کے قبلہ مسلمین ہو جانے سے ان کے اسلام کی طرف مائل ہو جانے کی توقع تھی، اور سابق قبلہ بیت المقدس میں جو موافقت اہل کتاب کی توقع کی جاسکتی تھی وہ سولہ سترہ مہینے کے محل کے بعد منقطع ہو چکی تھی، کیونکہ یہودیہ و عیسائیوں کو اس کی وجہ سے کوئی اسلام سے قرب ہونے کے بجائے بُعد ہی بڑھا تھا۔

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ یعنی کعبہ کو قرار دیا جائے، اور چونکہ معتشرانِ بارگاہِ الہی انبیاء علیہم السلام اپنی کوئی خواہش اور کوئی درخواست حق تعالیٰ کی بارگاہ میں اُس وقت تک پیش نہیں کرتے جب تک اُن کو یہ درخواست پیش کرنے کی اجازت کا علم نہ ہو جائے، اس سے سمجھا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا کرنے کی اجازت پہلے مل چکی تھی، اور آپ اس کی دعا کر رہے تھے اور اس کی قبولیت کے امید دار تھے، اس لئے بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھاتے تھے، کہ شاید کوئی فرشتہ حکم لے کر آجائے، آیت مذکورہ میں اس کیفیت کا بیان مفسر مکر پہلے تو قبولیت دعا کا وعدہ فرمایا، فَلْيَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ یعنی ہم آپ کا رخ اُسی کی طرف پھیر دیں گے جو سمت آپ کو پسند ہو، اس کے فوراً بعد ہی یہ رخ پھیرنے کا حکم بھی نازل فرمایا، فَوَلَّيْنَاكَ الْغَنَىٰ وَفَوَلَّيْنَاكَ الْغَنَىٰ، اس طرز عمل میں ایک خاص لطف تھا، کہ پہلے وعدہ کی خوشی حاصل ہو، پھر ایفاء سے وعدہ کی خوشی تندرست ہو جائے (یہ سب مضمون قرطبی، جصاص، منہجی سے لیا گیا ہے)

مسئلہ استقبال قبلہ | یہ تحقیق پہلے آپ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کے اعتبار سے تو ساری سمتیں اور ساری جہات برابر ہیں، قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ، لیکن مصالح امت کے لئے بقائنا و تحکمت کسی ایک جہت کو تمام دنیا میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے لئے قبلہ بنا کر سب میں ایک دینی وحدت

کا عمل مظاہرہ مقصود تھا، وہ جہت بیت المقدس بھی ہو سکتی تھی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کے مطابق کعبہ کو قبلہ بنانا تجویز کر لیا گیا، اور اسی کا حکم اس آیت میں دیا گیا، اس کا مقتضی یہ تھا کہ اس جگہ قَوْلِي وَجَّهَكَ إِلَى الْمَشْرِقِ اذْ لَئِنْ بَشَّرْتُ اَنْتَ فَرَايَا جَاۡءَا، مگر قرآن حکیم نے غیر اُن بدل کر شَطْرَ الْمَشْرِقِ اَلْمَشْرِقِ کے الفاظ اختیار فرمائے، اس سے کنی اہم مسائل استقبال قبلہ کے بارہ میں واضح ہو گئے۔

اول یہ کہ اگرچہ اصل قبلہ بیت اللہ ہے جس کو کعبہ کہا جاتا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اصل بیت اللہ کا استقبال اسی جگہ تک ہو سکتا ہے جہاں تک بیت اللہ نظر آتا ہے، جو لوگ وہاں سے دور ہیں اور بیت اللہ ان کی نظروں سے غائب ہے اگر ان پر یہ پابندی عائد کی جائے کہ عین بیت اللہ کی طرف رخ کر دو تو اس کی تعمیل بہت دشوار ہو جائے، خاص آلات رحاات کے ذریعہ بھی صبح سمت کا صحیح دور کے شہروں میں مشکل اور غیر یقین ہو جائے، اور شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مدار سہولت و آسانی پر رکھا گیا ہے، اس لئے بجائے بیت اللہ یا کعبہ کے مسجد حرام کا لفظ رکھا گیا جو بہ نسبت بیت اللہ کے بہت زیادہ وسیع رقبہ پر مشتمل ہے، اس کی طرف رخ پھیر لینا دور دور تک لوگوں کے لئے آسان ہے۔

پھر ایک دوسری سہولت لفظ شَطْر اختیار کر کے دیدی گئی، ورنہ اس سے مختصر لفظ اِلَى الْمَشْرِقِ اَلْمَشْرِقِ تھا، اس کو چھوڑ کر شَطْرَ الْمَشْرِقِ اَلْمَشْرِقِ فرمایا گیا، شَطْر و معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک نصف ہے، دوسرے سمت ہے، باتفاق مفسرین اس جگہ شَطْر سے مراد سمت ہے، تو اس لفظ نے یہ بتلادیا کہ بلاد بعیدہ میں یہ بھی ضروری نہیں کہ خاص مسجد حرام ہی کی طرف ہر ایک کا رخ ہو جائے تو نماز درست ہو بلکہ سمت مسجد حرام کافی ہے (بھر محیط)

مثلاً مشرقی ممالک ہندوستان و پاکستان وغیرہ کے لئے جانب مغرب مسجد حرام کی سمت ہے تو مغرب کی جانب رخ کر لینے سے استقبال قبلہ کا فرض ادا ہو جائے گا، اور چونکہ گری، سروی کے موسموں میں سمت مغرب میں بھی اختلاف ہوتا رہتا ہے، اس لئے فقہاء رحمہم اللہ نے اس سمت کو سمت مغرب و قبلہ تشریفات دیا ہے، جو موسم گرماد سرما کی دونوں فصول کے درمیان ہے، اور قواعد ریاضی کے حساب سے یہ صورت ہوگی کہ مغرب ضعیف اور مغرب ہشتا کے درمیان ۳۸ ڈگری تک سمت قبلہ تشریفات دی جائے گی، یعنی ۲۳ ڈگری تک بھی اگر دائیں یا بائیں مائل ہو جائے تو سمت قبلہ فوت نہیں ہوگی، نماز درست ہو جائے گی، ریاضی کی تدبیر اور مشہور کتاب شرح چمنی باب رابع صفحہ ۶۱ میں دونوں مشربین کا فاصلہ بھی ۳۸ ڈگری قرار دیا ہے۔

۱۰ حضرت والد صاحب نے جو اہل فقہ میں فقہاء کا دوسرا قول ذکر کیا ہے کہ ۴۵ درجے دائیں یا بائیں مائل ہونے سے سمت قبلہ فوت نہیں ہوگی۔ محمد تقی

سمت قبلہ معلوم کرنے کے لئے اس سے ان لوگوں کی چہالت بھی واضح ہو گئی جنہوں نے ہندوستان و شرقاً آلات رصدیہ اور حسابیہ پاکستان کی ہیئت سی مسجدوں کی سمت قبلہ میں معمولی سا فرق دو چار ریاضیہ پر مدار نہیں ہے، اور بلاوجہ مسلمانوں میں تفریق و انتشار پیدا کرنا ہے۔

شرعیہ اسلام پر جو تک قیامت تک آنے والی فلسفوں کے لئے اور پوری دنیا کے مالک کے لئے ہے، اس نے احکام شرعیہ کو ہر شعبہ میں اتنا آسان رکھا گیا ہے کہ ہر گاؤں، جنگل، پہاڑ، جزیرہ میں بسنے والے مسلمان اس پر اپنے مشاہدہ سے عمل کر سکیں، کسی مرحلے میں حسابات، ریاضی، یا مہلک وغیرہ آلات کی ضرورت نہ پڑے ۳۸۱ ڈگری تک کی وسیع سمت مغرب اہل مشرق کا قبلہ ہے، اس میں پانچ دس ڈگری کا فرق ہو بھی جائے تو اس سے نمازوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے اس کی اور وضاحت ہو جاتی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں، ما بین المشرق والمغرب قبلۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، یعنی مابین المشرق والمغرب قبلہ ہے، آپ کا یہ ارشاد مدینہ طیبہ والوں کے لئے تھا، کیونکہ ان کا قبلہ مشرق و مغرب کے درمیان جانب جنوب واقع تھا، اس حدیث نے گویا خط لکھ دیا کہ اگر تم کوئی تشریح کر دو کہ مسجد حرام کی سمت کافی البتہ بناؤ مسجد کے وقت اس کی کو شش بہتر ہے کہ ٹھیک بیت اللہ کے رخ سے جتنا قریب ہو سکے وہ کر لیا جائے، صحابہ و تابعین اور سلف صالحین کا طریقہ تو اس دریافت کے لئے سیدھا سادہ یہ تھا کہ جس جگہ صحابہ کرام کی بنائی ہوئی کوئی مسجد ہوئی اس سے اس کے قرب و جوار کی مسجدوں کا رخ سیدھا کر لیا، پھر ان کے قرب و جوار کا ان کے ذریعہ، اسی طرح تمام عالم میں مساجد کا رخ تجویز کیا گیا ہے، اس لئے بلاد بعیدہ میں سمت قبلہ معلوم کرنے کا صحیح طریقہ جو سلف سے چلا آتا ہے یہ ہے کہ جن بلاد میں مساجد قدیمہ موجود ہیں ان کا اتباع کیا جائے، کیونکہ اکثر بلاد میں جو حضرات صحابہ و تابعین نے مساجد کی بنیادیں ڈالی ہیں، اور سمت قبلہ متعین فرمائی ہے، اور پھر انہیں دیکھ کر دوسری بیٹیوں میں سلفین نے اپنی اپنی مساجد بنائی ہیں۔

اس لئے یہ سب مساجد مسلمین سمت قبلہ معلوم کرنے کے لئے کافی و کافی ہیں، ان میں بلاوجہ شبہات فلسفہ کا ناشر ماحول نہیں، بلکہ مذہب اور موجب تثلیل ہی، بلکہ بسا اوقات ان تشریحات میں پڑنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ حضرات صحابہ و تابعین اور عوام المسلمین پر یہ گمانی ہو جاتی ہے، کہ ان کی نمازیں اور قبلہ درست نہیں، حالانکہ یہ باطل محض اور سخت جہالت ہے، انھیں صدی ہجری کے مشہور و معروف عالم ابن رجب خلیج اسی بنا پر سمت قبلہ میں آلات رصدیہ اور دقیقاً ریاضیہ میں پڑنے کو منع فرماتے ہیں، و لفظ

واما علم التیسیر فاذا تعلم منه ما يحتاج الیه للاستہلال ومعرفة القبلة والطریق کان جائزاً عند الجمهور وما نأد علیہ فلا حرج الیہ وهو یغفل عما هو اہم منه وربما اذی التذقیق فیہ الی اساق الفلک بمساریب المسلمین امصالحہم کما وقع فی ذلک کثیر من اہل هذا العلم قد یمازحون وذلک بغضی الی اعتقاد غطاء الصغایہ والتابعین فی صلاواتہم فی کثیر من الامصار وهو باطل وقد انکر الامام احمد الاستدلال بالعین وقال اتسا ورد ما بین المشرق والمغرب قبلۃ فرما یہ حدیث شریف میں (مشرق و المغرب قبلہ کیا ہے، یعنی مشرق و مغرب کے کے درمیان پوری جہت قبلہ ہے)

لیکن علم تیسیر پر اس کو اس قدر محال کرنا جو کہ نزدیک جائز ہے جس سے راہ یابی اور قبلہ اور رستوں کی شناخت ہو سکے، اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں کہ وہ زمین زیادہ کھنڈ امور ضروریہ غافل کر دے گا، اور بعض مرتبہ تحقیقات فلکیہ میں پڑنا عامہ بلاد اسلامیہ میں جو مسلمانوں کی مسجدیں ہیں ان کے متعلق گمانی پیدا کر دینا بڑا اس شخص میں مشغول ہوئیوں کو ہمیشہ اس قسم کے شبہات پیش آتے ہیں اس پر یہ بھی اعتقاد پیدا ہو گا کہ بہت شہروں میں صحابہ و تابعین کی نمازیں غلط طریقہ پر تھیں اور یہ بالکل لغو و باطل ہے، امام احمد نے (سنن) حبشی جس کو ہماری بلاد میں قطب کہتے ہیں سمت قبلہ میں اس سے استدلال کرنے کو منع کیا، اور

اور جن جگہات یا نوآبادیات وغیرہ میں صاحب قدیمہ موجود نہ ہوں وہاں شرعی طریقہ جو سلف صحابہ و تابعین سے ثابت ہے یہ ہو کہ شمس و قمر اور قطب وغیرہ کے مشہور و معروف ذرائع سے اندازہ قائم کر کے سمت قبلہ متعین کر لی جائے، اگر اس میں معمولی انحراف و میلان بھی ہے تو اس کو نظر انداز کیا جاوے کیونکہ حسب تصریح صاحب ذرائع ان بلاد بعیدہ میں تحری اور اندازہ سے قائم کردہ جہت ہی قائم مقام کعبہ کے ہے، اور اسی پر احکام دائر ہیں، جیسے شریعت نے نیند کو قائم مقام خروج بیچ کا قرار دے کر اسی پر نفع و رضو کا حکم کر دیا، یا سفر کو قائم مقام مشقت کا استدلال کر مطلقاً سفر پر رخصتیں مرتب کر دیں، حقیقت مشقت ہر یاد ہو، اسی طرح بلاد بعیدہ میں مشہور و معروف نشانات و علامات کے ذریعہ جو سمت قبلہ تحری و اندازہ سے قائم کی جائے گی وہی شرعاً قائم مقام کعبہ کے ہوگی، علامہ محمد اعظمی رسائل الارکان میں اس مضمون کو بالفاظ ذیل بیان کیا ہے:

والشہد وقطع المسامتۃ علی حسب | اور استقبال قبلہ میں شرط ضروری صرف یہ

ما یبری المصلیٰ و یجی غیر مأمورین
بالمسامتۃ علی ما یحکم بہ الأوامر
المرصدة و لہذا افتوا ان الاخراج
المفسد ان یتجاوز المشرق و
المغارب (رسائل الارکان ص ۵۳)

ہر کہ غازی کی رشتہ اور اندازہ کے موافق کعبہ
کے ساتھ مسامتہ (مجاہزات) واقع ہو جائے
اور ہم اس کے مکلف نہیں کہ وہ درجہ
و مجاہزات کا پیدا کریں جو کالات و مسد یہ
کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ
ملا کا فتویٰ ہے کہ انحراف مفسد و مصلوقہ وہ ہے جس میں مشرق و مغرب کا تفاوت ہو جائے

اس مسئلہ کی محل تشریح اور حسابات کے ذریعہ استخراج قبلہ کے مختلف طریقے اور ان کی شرعی
حیثیت پر مفصل کلام میرے رسالے "سمت قبلہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔

وَلَیِّنُ آتِیَتْ الذِّیْنَ اَوْتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آیَةٍ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ

اور اگر تولا نے اہل کتاب کے پاس ساری نشانیاں تو بھی نہ مانیں گے تیرے قبلہ کو

وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتِهِمْ وَ مَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةِ بَعْضٍ وَلَیِّنِ

اور نہ تیرے ان کا قبلہ اور نہ ان میں ایک دوسرے کا قبلہ اور اگر تو چلا

اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ لَئِنْ اِذَا لَیِّنِ

ان کی خواہشوں پر بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو بیشک تو بھی ہر ان

الظالمین

بے انصافوں میں۔

خلاصہ تفسیر اور راجد ان لوگوں کے سب کچھ سمجھنے کے ان کی ضد کی یہ حالت تھی کہ اگر آپ
راہ (اہل کتاب کے سامنے تمام دنیا بھر کی) دلیلیں جمع کر کے پیش کر دیں
جب بھی آپ کے قبلہ کو قبول نہ کریں اور ان کی موافقت کی امید اس لئے نہ رکھیں چاہے کہ
آپ کا قبلہ بھی منسوخ ہونے والا نہیں، اس لئے آپ بھی ان کے قبلہ کو قبول نہیں کر سکتے، پس
کوئی صورت موافقت کی باقی نہیں رہی، اور جیسا ان اہل کتاب کو آپ سے ضد ہے ان میں باہم
بھی موافقت نہیں کیونکہ ان کا کوئی (فریق) بھی دوسرے (فریق) کے قبلہ کو قبول نہیں کرتا،
مثلاً یہود نے بیت المقدس لے رکھا تھا اور نصاریٰ نے مشرق کی سمت کو قبلہ بنا رکھا تھا، اور

خدا نخواستہ آپ تو کسی طرح ان کے قبلہ منسوخ غیر مشروع کر لے ہی نہیں سکتے، کیونکہ اگر آپ
ان کے (ان) انسانی خیالات کو (مگر وہ اصل میں ہم آسانی رہے ہوں لیکن اب جو منسوخ ہونے
کے ان پر عمل کرنا محض انسانی تعصب ہو، سو اگر آپ ایسے خیالات کو اختیار کر لیں (اور وہ بھی)
آپ کے پاس علم قطعی یعنی وحی (آپ سے پیچھے، تو یقیناً آپ (نعمت اللہ) ظالموں میں شمار ہونے لگیں
جو کہ تارکینِ حکم ہیں، اور آپ کا ظالم ہونا جو بد معصوم ہونے کے محال ہے، اس لئے یہ بھی محال ہے
کہ آپ ان کے خیالات کو جن میں سے ان کا قبلہ بھی ہے قبول کر لیں۔

معارف مسائل

وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتِهِمْ میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب قیامت تک کے لئے آپ کا قبلہ
بیت اللہ ہی رہے گا، اس سے یہود و نصاریٰ کے ان خیالات کا قطع کرنا مقصود تھا کہ مسلمانوں کے
قبلہ کو تو کوئی تسرار نہیں، پہلے بیت اللہ تھا، پھر بیت المقدس ہو گیا، پھر بیت اللہ ہو گیا، اب
بھی ممکن ہے کہ پھر دوبارہ بیت المقدس ہی کو قبلہ بنالیں۔ (بحسب محیط)

وَلَیِّنِ آتِیَتْ الذِّیْنَ اَوْتُوا الْكِتَابَ میں یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بارہ فرض محال کے ہے
جس کے وقوع کا کوئی احتمال نہیں، اور دراصل سننا نا امت محمدیہ کو ہے، اگر اس کی خلافت درزی
ایسی چسپور کہ خود رسول بھی بغرض محال ایسا کریں تو وہ بھی ظالم قرار پائیں۔

الَّذِیْنَ اتَّبَعُوا الْكِتَابَ یَعْرِفُوْنَهُ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَنْبَاءَهُمْ

جن کو ہم نے دی ہے کتاب پہناتے ہیں اس کو جیسے پہناتے ہیں اپنے بیٹوں کو

ذَٰلَکَ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَّکُنَّ مِنَ الْحَقِّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝۱۲۷

اور بیشک ایک فرقہ ان میں سے چھپاتے ہیں حق کو جان کر، حق وہی ہے

مَنْ تَرٰ بِكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُنْکَرِیْنَ ۝۱۲۸

جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہو مشک لانے والا۔

خلاصہ تفسیر

اس سے پہلے آیت میں اہل کتاب کا قبلہ مسلمین کو دل میں حق جاننے اور زبان
سے نہ ماننے کا ذکر تھا، اس آیت میں اپنی اہل کتاب کا صاحب قبلہ یعنی رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح دل میں حق جاننے اور زبان سے نہ ماننے کا بیان ہے
جن لوگوں کو ہم نے کتاب (توراة و انجیل) دی ہے وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو (تورات و انجیل میں آئی ہوئی بشارت کی بناء پر بحیثیت رسالت) ایسا رہے شک و شبہ پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو (ان کی صورت سے) پہچانتے ہیں، رکہ بیٹے کی صورت دیکھ کر کسی شبہ نہیں ہوتا کہ یہ کون شخص ہے، مگر پہچان کر بھی سب مسلمان نہیں ہوتے، بلکہ بعض تو ایسا ہی لے آتے اور بچے ان میں سے (ایسے ہیں کہ اس) امر واقعی کو باوجودیکہ خوب جانتے ہیں (مگر) اختلا کرتے ہیں (حالانکہ) یہ امر واقعی من جانب اللہ (ثابت ہو چکا) ہے سو ایسے امرواقعی ثابت من اللہ میں ہر فرد کو کہا جاسکتا ہے کہ ہرگز شک و شبہ لانے والوں میں شمار نہ ہوتا۔

معارف مسائل

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت رسول پہچاننے کی تشبیہ اپنے بیٹوں کو پہچاننے کے ساتھ دی گئی ہے کہ یہ لوگ جس طرح اپنے بیٹوں کو پوری طرح پہچانتے ہیں، ان میں بھی شبہ و شبہا نہیں ہوتا، اسی طرح تورات و انجیل میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اور آپ کی واضح علامات و نشانات کا ذکر آیا ہے اس کے ذریعہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یقینی طور سے جانتے پہچانتے ہیں، ان کا انکار محض عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے۔

یہاں یہ بات قابل نظر ہو کہ پوری طرح پہچاننے کے لئے بیٹوں کی مثال دی گئی ہو یا باپ کی مثال نہیں دی حالانکہ آدمی اپنے ماں باپ کو بھی عادتاً خوب پہچانتا ہے، وجہ یہ ہے کہ بیٹوں کی پہچان ماں باپ کی پہچان کی نسبت بہت زیادہ ہے، کیونکہ انسان اپنے بیٹوں کو ابتداً پیدائش سے اپنے ہاتھوں میں پالتا ہے، اس کے بدن کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہوتا جو ماں باپ کی نظر سے اوچھل رہا ہو، بخلاف ماں باپ کے کہ ان کے اعضاء مستورہ پر اولاد کی کہیں نظر نہیں ہوتی۔

اس بیان سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ یہاں بیٹوں کو بیٹا ہونے کی حیثیت سے پہچاننا مراد نہیں، کیونکہ اس نسبت تو انسان پر مشتبہ ہو سکتی ہو کہ ممکن ہے کہ بیوی نے خیانت کی ہو اور یہ بیٹا اپنا نہ ہو بلکہ مراد ان کی شکل و صورت وغیرہ کا پہچانا ہو کہ بیشائی الواقع اپنا ہو یا نہ ہو، مگر جس کو بحیثیت بیٹے کے انسان پالتا ہے اس کی شکل و صورت کے پہچاننے میں کسی اشتباہ نہیں ہوتا۔

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّئُهَا فَاسْتَذِقُوا الْخَيْرَاتِ أَيْنَ مَا تَكُونُوا

اور ہر کسی کے واسطے ایک جانب ہر مئی قبلہ کر، مگر تم اس طرف سو مت بہت کرو دیکھو میں جہاں کہیں تم

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِكُلِّ شَيْءٍ فَلْيُذَكِّرُوا ۝۱۵۰

ہم کو کہہ کر اے ایمان والو! بیشک اللہ ہر چیز کو سمجھتا ہے، اور جس جگہ سے

حَيْثُ خَرَجْتَ قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ طَوَافُ

(نکلے سرگھ کر اپنا مسجد حرام کی طرف اور بے شک یہی حق ہے

لَلْحَقِّ مِنْ رَبِّكَ طَوَّافُ مَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝۱۵۱) وَمِنْ حَيْثُ

برہے رب کی طرف سے اور اللہ ہے خبر نہیں تمہارے کاموں سے، اور جہاں سے تو

خَرَجْتَ قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ طَوَّافُ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ

نکلے مگر اپنا مسجد حرام کی طرف، اور جس جگہ تم ہوا کرو مگر

قُولُوا وَجْهَكُمْ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ لِكُلِّ قَوْمٍ نَبَأٌ

اسی کی طرف تاکہ دے لوگوں کو تم سے جھڑنے کا موقع مگر جو

الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي ۚ وَلِأَتِمَّ تَعْمِي

ان میں سے افسانہ ہیں اسرار سے لہنی انکے اعتراضوں سے، نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور اس واسطے کہ کامل

عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝۱۵۲

کروں تم پر نفع اپنا اور تاکہ تم پاؤ راہ سیدھی۔

خلاصہ تفسیر

اور (دوسری حکمت توحید قبلہ میں یہ ہر کہ مادۃ اللہ جاری ہو کہ) ہر مذہب پہلے

نفس کے واسطے ایک ایک قبلہ رہا ہے، جس کی طرف وہ (عبادت میں) متوجہ کرتا

رہا ہے، چونکہ شریعت محمدیہ بھی ایک مستقل دین ہے، اس کا قبلہ بھی ایک خاص ہو گیا، جب حکمت

سب پر ظاہر ہو بھی (سورۃ مسلمانوں) تم (اب اس بحث کو چھوڑ کر اپنے دین کے) نیک کاموں میں آگے

بڑھنے کی کوشش کرو، کیونکہ ایک روز اپنے مالک سے سابقہ پڑنا ہے، چنانچہ تم خواہ کہیں ہو گے

(لیکن) اللہ تعالیٰ تم سب کو اپنے اجلاس میں حاضر کر دے گا (اس وقت نیکوں پر جزا اور اعمال

بد پر سزا ہوگی اور) بالیقین اللہ تعالیٰ ہر امر پر پوری قدرت رکھتے ہیں، اور اس حکمت کا مقتضار بھی

یہی ہے کہ جس طرح حضرت کعبہ کی طرف رخ ہوتا ہے اسی طرح اگر مدینہ سے یا اور کہیں سے (جس جگہ

سے بھی) کہیں سفر میں، آپ باہر جاویں تو (بھی) اپنا چہرہ (رہائیں) مسجد حرام کی طرف رکھ لیجئے،

(غرض حضور و سفر سب حالتوں کا یہی قبلہ ہے) اور یہ (حکم عام قبلہ کا) بالکل حق (اور صحیح) ہے (اور)

منجانب اللہ (ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں سے ذرا بخیر نہیں۔

توحید قبلہ کی تیسری حکمت اور (دیکھ رہا تھا ہے کہ) آپ جس جگہ سے بھی (سفر میں) باہر جاویں (اور

حضرت بدر جہاؤنی (پناہ چہرہ نمازیں) مسجد حرام کی طرف رکھتے، اور اسی طرح سب مسلمان بھی اس میں کہ تم لوگ چنان کہیں (موجود) ہوا پناہ چہرہ نمازیں) اسی (مسجد حرام) کی طرف دیکھا کرو اور اللہ یہ حکم اس لئے مقرر کیا جاتا ہے تاکہ (ان مخالفت) لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں (اس) گفتگو کی مجال نہ ہو، (کہ اگر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وہی نبی موجود آخر الزماں ہوتے تو ان کی علامات میں تو یہ بھی ہے کہ ان کا اصل قبلہ کعبہ ہوگا، اور یہ تو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے ہیں، یہ تیسری جگہ ہے خولی قبلہ کی، ان (مکرمین میں جو راکل ہی) بے انصاف ہیں وہ اب بھی کٹھ جھتی بھالیں گے، کہ یہ کیسے نہیں ہیں جو اتنے نبیوں کے خلاف کعبہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں، لیکن جب ایسے مہل اعترافوں سے دین حق کو کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا، تو ایسے لوگوں سے (ذرا) اندیشہ نہ کرو اور ان کے اعتراضوں کے جواب کی فکر میں مست پڑو اور تمہارے دہرے رہو کہ میرے احکام کی مخالفت نہ ہونے پائے کہ یہی مخالفت البتہ تم کو مضرب ہے، اور (ہم نے ان سب احکام مذکورہ پر عمل کرنے کی توفیق بھی دی) تاکہ تم پر جو کچھ (میرا انعام و اکرام متوجہ) ہے (تم کو آخرت میں داخل بہشت کر کے، اس کی تکمیل کرو دو اور تاکہ (دنیا میں) تم راہِ حق) پر رہیں اسلام پر قائم رہنے والو) میں (رہو جس پر وہ تکمیل نعمت مرثب ہوتی ہے)

معارف مسائل

تحويل قبلہ کی حکمتیں | مذکور آیات میں تحويل قبلہ کیلئے الفاظ قرآنی وَجْهًا شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ میں مرتبہ آئے ہیں اور حَيْثُمَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ دو مرتبہ اس تکرار کی ایک عام وجہ تو یہ ہے کہ تحويل قبلہ کا حکم مخالفین کے لئے تو شور و شب کا ذریعہ تھا ہی اخذ مسلمانوں کے لئے بھی عبادات کا ایک عظیم انقلاب تھا، اگر یہ حکم تاکیدات کے ساتھ جکر اورد لایا جاتا تو قلوب کا اطمینان و سکون آسان نہ ہوتا، اس لئے اس حکم کو بار بار دہرایا گیا، جس میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا کہ یہ تحويل آخری اور قطعی ہے، اب اس کی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔

بیان القرآن کے علامہ تفسیر میں جو تعلیق کی مشورہ کی ہے اور قرطبی بھی اسکی ایک ایسی تفسیر نقل کی ہیں جس سے صحت و بطلان فرمایا کہ پہلی مرتبہ جو حکم آیا قرآن وَجْهًا شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُمَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ یہ حکم حالتِ حضر کا ہے، کہ جب آپ اپنی جگہ معین ہیں تو آپ مسجد حرام کی طرف رخ کیا کریں اور پھر فریضہ امت کو اس کا حکم دیا گیا، اور حَيْثُمَا كُنْتُمْ کا مفہوم اس تقریر پر یہ ہوگا کہ اپنے وطن اور شہر میں جس جگہ بھی ہوں استقبال بیت اللہ ہی کا کرنا ہے، یہ حکم صرف مسجد نبوی کے ساتھ مخصوص نہیں۔

پھر دوسری مرتبہ ہوا اپنی الفاظ کے ساتھ حکم آیا اس سے پہلے میں حَيْثُمَا كُنْتُمْ کے الفاظ نے یہ واضح کر دیا کہ یہ حکم وطن سے نکلنے اور سفر کی حالت کے لئے ہے، اور چونکہ سفر کے حالات بھی مختلف ہوتے ہیں، کبھی چند روز کے لئے کسی بستی میں قیام کیا جاتا ہے، کبھی سفر قطع کر لے گا سلسلہ ہوتا ہے، ان دونوں حالتوں کو عام کر کے لئے تیسری مرتبہ پھر ان الفاظ کے ساتھ وَحَيْثُمَا كُنْتُمْ کا اضافہ کر کے بتلادیا کہ سفر کی کوئی بھی حالت ہو ہر حال میں استقبال مسجد حرام ہی کا کرنا ہے اس تیسری مرتبہ کے اضافہ کے ساتھ تحويل قبلہ کی ایک حکمت کا بھی جوڑ لگا دیا گیا کہ مخالفین کو یہ کہے نہ سکیں کہ نبی آخر الزماں کا قبلہ تو قوراث و انجیل کی تصریحات کے مطابق کعبہ ہونا چاہئے، اور یہ رسول کعبہ کے بجائے بیت المقدس کا استقبال کرتے ہیں۔

وَلَكِنْ وَجْهًا شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ | وَجْهًا شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ جس چیز کی طرف رخ کیا جائے حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ اس سے مراد قبلہ ہوا اور حضرت ابن عباس کی قنوت میں اس جگہ وَجْهًا کی بجائے قبلہ بھی منقول ہے، مراد آیت کی چھوڑ دینے کے نزدیک یہ ہے کہ ہر قوم کا قبلہ جس کی طرف وہ عبادت میں رخ کرتے ہیں مختلف ہو، خواہ منجانب اللہ ان کو ایسا ہی حکم ملا ہے یا انھوں نے خود کوئی جانب مقرر کر لی ہے، ہر حال یہ امر واقعہ ہے کہ مختلف قوموں کے قبلے مختلف ہوتے چلے آئے ہیں، تو اسی حالت میں اگر نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی خاص قبلہ معسر کر دیا گیا تو انکار و تعجب کی کیا بات ہے۔

مذہب مساکین میں فضول بھڑوں | فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ - اس سے پہلے جملہ میں یہ فرمایا تھا کہ مختلف قوموں کے اجتناب کی مسابقت کے مختلف قبلے ہیں، کوئی ایک دوسرے کے قبلہ کو تسلیم نہیں کرتا، اس کو اپنے قبلہ کے حق ہونے پر ان لوگوں سے بحث فضول ہے، اس جملے کا حاصل یہ ہے کہ جب یہ معلوم ہو کہ اس بحث سے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، تو پھر اس فضول بحث کو چھوڑ کر اپنے اصلی کام میں لگ جانا چاہئے، اور وہ کام ہے نیک کاموں میں دوڑ دھوپ اور آگے بڑھنے کی کوشش اور چونکہ فضول بحثوں میں وقت ضائع کرنا اور مسابقت الی الخیرات میں شغلی کرنا عموماً آخرت سے غفلت کے سبب ہوتے ہیں، جس کو اپنی آخرت اور انجام کی فکر و درپیش ہو رہے کبھی فضول بحثوں میں نہیں الجھتا، اپنی منزل طے کرنے کی فکر میں رہتا ہے، اس لئے اگلے جملے میں آخرت کی یاد دلانے کے لئے ارشاد فرمایا، آيَةُ مَا تَكُونُوا بآيَاتِ يَكْفُرُ اللَّهُ جَوِيضًا جس کا مطلب یہ ہے کہ بحثوں میں ارجحیت اور لوگوں کے اعتراضات سے بچنے کی فکر سب چند روزہ دنیا کے لئے ہو اور عنقریب وہ دن آنے والا ہے جس میں اللہ تعالیٰ تمام اقوام عالم کو ایک جگہ جمع کر کے حساب لیں گے، عقلمند کا کام یہ ہے کہ اپنے اوقات اس کی فکر میں صرف کرے۔

ایک نعمت قبلہ کی پھر دوسری نعمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی مبدول فرمائی ہو
ایں ہی نعمت ذکر اللہ بھی ہے، ان سب نعمتوں کا شکر ادا کرو، تاکہ یہ نعمتیں اور زیادہ ہو جائیں
قرآنی نے فرمایا کہ گستاخاں کا کاف یہاں ایسا ہی ہے جیسے سورۃ النفال میں تمنا آخرت کے
اور سورۃ حجر کے آخر میں گستاخاں کا علی المؤمنین آیا ہے۔

قَدْ كُذِّبَتْ يَدُكَ كُذِّبَتْ يَدُكَ كُذِّبَتْ يَدُكَ كُذِّبَتْ يَدُكَ كُذِّبَتْ يَدُكَ كُذِّبَتْ يَدُكَ
یہ ذکر کرنے کو بھی ذکر اس لئے کہا جاتا ہے کہ زبان ترجمان قلب ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ذکر بانی
وہی معتبر ہے جس کے ساتھ دل میں بھی اللہ کی یاد ہو مولانا رحمی نے اس کے متعلق فرمایا ہے
بر زبان تسبیح در دل گاہ تسنیر
ایں چنین تسبیح کے دارد اثر

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اگر کوئی شخص زبان سے ذکر و تسبیح میں مشغول
ہو مگر اس کا دل حاضر نہ ہو اور ذکر میں نہ لگے تو وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں، حضرت ابو عثمانؓ سے کسی
ایسی ہی حالت کی شکایت کی کہ ہم زبان سے ذکر کرتے ہیں، مگر قلوب میں اس کی کوئی حلاوت محسوس
نہیں کرتے، آپ نے فرمایا اس پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر کرو کہ اس نے تمہارے ایک عضو یعنی زبان
کو تو اپنی طاعت میں لگا دیا (تسریطیں)

ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، اور یہی ایک فضیلت ہے کہ نہیں ہو کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا
ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد فرماتے ہیں، ابو عثمانؓ نے یہی کہا کہ میں اس وقت کو جانتا ہوں جس
وقت اللہ تعالیٰ ہمیں یاد فرماتے ہیں، لوگوں نے کہا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے، منبر یا
اس لئے کہ قرآن کریم کے وعدے کے مطابق جب کوئی بندہ مومن اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ
تعالیٰ بھی اسے یاد کرتے ہیں، اس لئے سب کو یہ سمجھ لینا آسان ہے کہ جس وقت ہم اللہ کی یاد میں
مشغول ہوں گے تو اللہ تعالیٰ بھی یاد فرمائیں گے۔

اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم مجھے اطاعت احکام کے ساتھ یاد کرو تو میں تمہیں ثواب
اور مغفرت کے ساتھ یاد کروں گا، حضرت سعید بن جبیرؓ نے ذکر اللہ کی تفسیر ہی طاعت و فرمانبرداری
سے کی ہے وہ فرماتے ہیں:

فمن لم يطيع الله لم يسمع كلامه
كثير صلواته وتبجيحه
یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی
نہ کی اس نے اللہ کو یاد نہیں کیا، اگرچہ ظاہر میں
اس کی نذر اور تسبیح کتنی بھی ہو

ذکر اللہ کی اصل حقیقت قرطبی نے جو احکام القرآن ابن خریز منذاذ ایک حدیث بھی اس مضمون کی تفصیل کی ہے

جس کا ترجمہ یہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، یعنی
اس کے احکام مطاع و حرام کا اتباع کیا اس نے اللہ کو یاد کیا، اگرچہ اس کی نفل، نماز روزہ وغیرہ
کم ہوں، اور جس نے احکام خداوندی کی خلاف ورزی کی اس نے اللہ کو بھلا دیا، اگرچہ (بظاہر)
اس کی نماز، روزہ، تسبیحات وغیرہ زیادہ ہوں۔

حضرت ذوالنون مصریؒ نے فرمایا کہ جو شخص حقیقی طور پر اللہ کو یاد کرتا ہے وہ اس کے مقابلے
میں ساری چیزوں کو بھول جاتا ہے، اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ خود اس کے لئے ساری چیزیں
کی حفاظت کرتے ہیں، اور تمام چیزوں کا عوض اس کو عطا کر دیتے ہیں۔

اور حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ انسان کا کوئی عمل اس کو خدا تعالیٰ کے مذاہب نجات دلانے
میں ذکر اللہ کے برابر نہیں، اور ایک حدیث مذہبی بروایت ابو ہریرہؓ میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں
میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب تک وہ مجھے یاد کرتا ہے، اور میرے ذکر میں اس کے ہوش
ہوتے رہیں، ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، ان کا مختصر خلاصہ احقر نے اپنے رسالہ ذکر اللہ میں جمع کر دیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ

اے مسلمانو! مدد لو صبر اور نماز سے، بیشک اللہ صبر

الصَّبْرِ ۝۵۳

کرنے والوں کے ساتھ ہو

رابطہ، تخیل قبلہ پر جو مخالفین کی طرف سے اعتراض تھا، اس کے دوا کرتے، ایک مذہب اسلام
پر جو اعتراض سے مذہب کی حقانیت میں شبہ پیدا کیا جا کر رہا ہے، اور یہی آیتوں میں اس اعتراض
کا جواب دے کر اس اثر کا دفع کرنا مقصود تھا، دوسرا اثر طہانہ اہل اسلام پر کہ اعتراض سے بالخصوص
جواب دینے کے بعد بھی اس پر بے جا اصرار کرنے سے قلب میں بیخ اور صدمہ پیدا ہوتا ہے، آیت
آئندہ میں تخفیف حزن کا طریقہ کہ صبر و صلوٰۃ ہے، بتلا کر اس دوسرے اثر کو زائل فرماتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر اسے ایمان والو! طبیعتوں میں غم ہٹا کرنے کے واسطے میں صبر اور نماز سے سہارا

ساتھ رہتے ہیں، زار و نماز پڑھنے والوں کے ساتھ تو بدرجہ اولیٰ، وجہ یہ کہ نماز سب سے بڑی عبارت
ہو، جب صبر میں یہ وعدہ ہے تو نماز جو اس سے بڑھ کر ہے اس میں تو بدرجہ اولیٰ یہ بشارت ہوگی۔

ایک نعمت قبلہ کی پھر دوسری نعمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی مبدول فرمائی ہو
ایں ہی نعمت ذکر اللہ بھی ہے، ان سب نعمتوں کا شکر ادا کرو، تاکہ یہ نعمتیں اور زیادہ ہو جائیں
قرآنی نے فرمایا کہ گستاخوں کا کاف یہاں ایسا ہی ہے جیسے سورۃ النفال میں تھا اَنْحَرَجَلْ
اور سورۃ حجر کے آخر میں گستاخوں کا اَعْلٰی الْمُفْسِدِیْنَ آیا ہے۔

قَدْ كُذِّبَتْ اَاْذْ كُذِّبَتْ، ذکر کے اصل معنی یاد کرنے کے ہیں جن کا تعلق قلب سے ہے، زبان
سے ذکر کرنے کو بھی ذکر اس لئے کہا جاتا ہے کہ زبان ترجمان قلب ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ذکر زبانی
وہی معتبر ہے جس کے ساتھ دل میں بھی اللہ کی یاد ہو مولانا رحمی نے اس کے متعلق فرمایا ہے
بر زبان تسبیح در دل گھاؤ منسر
ایں چنین تسبیح کے دارد اثر

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اگر کوئی شخص زبان سے ذکر و تسبیح میں مشغول
ہو مگر اس کا دل حاضر نہ ہو اور ذکر میں نہ لگے تو وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں، حضرت ابو عثمانؓ سے کسی
ایسی ہی حالت کی شکایت کی کہ ہم زبان سے ذکر کرتے ہیں، مگر قلوب میں اس کی کوئی حلاوت محسوس
نہیں کرتے، آپ نے فرمایا اس پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر کرو کہ اس نے تمہارے ایک عضو یعنی زبان
کو تو اپنی طاعت میں لگا لیا (فسترطی)

ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، اور یہی ایک فضیلت ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا
ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد فرماتے ہیں، ابو عثمانؓ ہندیؓ نے کہا کہ میں اس وقت کو جانتا ہوں جس
وقت اللہ تعالیٰ ہمیں یاد فرماتے ہیں، لوگوں نے کہا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے، منبر یا
اس لئے کہ قرآن کریم کے وعدے کے مطابق جب کوئی بندہ مومن اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ
تعالیٰ بھی اسے یاد کرتے ہیں، اس لئے سب کو یہ سمجھ لینا آسان ہے کہ جس وقت ہم اللہ کی یاد میں
مشغول ہوں گے تو اللہ تعالیٰ بھی یاد فرمائیں گے۔

اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم مجھے اطاعت احکام کے ساتھ یاد کرو تو میں تمہیں ثواب
اور مغفرت کے ساتھ یاد کروں گا، حضرت سعید بن جبیرؓ نے ذکر اللہ کی تفسیر ہی طاعت و فرمانبرداری
سے کی ہے وہ فرماتے ہیں:

فمن لم یطیعہ لم یمن کونہ وان
کثر صلواتہ وتبایعہ
یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی
نہ کی اس نے اللہ کو یاد نہیں کیا، اگرچہ ظاہر میں
اس کی نذر اور تسبیح کتنی بھی ہو

ذکر اللہ کی اصل حقیقت قرطبی نے جو احکام القرآن ابن خریز منذاذ ایک حدیث بھی اس مضمون کی تفصیل کی ہے

جس کا ترجمہ یہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، یعنی
اس کے احکام مطاع و حرام کا اتباع کیا اس نے اللہ کو یاد کیا، اگرچہ اس کی نفل، نماز روزہ وغیرہ
کم ہوں، اور جس نے احکام خداوندی کی خلاف ورزی کی اس نے اللہ کو بھلا دیا، اگرچہ (بظاہر)
اس کی نماز، روزہ، تسبیحات وغیرہ زیادہ ہوں۔

حضرت ذوالنون مصریؒ نے فرمایا کہ جو شخص حقیقی طور پر اللہ کو یاد کرتا ہے وہ اس کے مقابلے
میں ساری چیزوں کو بھول جاتا ہے، اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ خود اس کے لئے ساری چیزیں
کی حفاظت کرتے ہیں، اور تمام چیزوں کا عوض اس کو عطا کر دیتے ہیں۔

اور حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ انسان کا کوئی عمل اس کو خدا تعالیٰ کے مذاہب نجات دلانے
میں ذکر اللہ کے برابر نہیں، اور ایک حدیث مذہبی بروایت ابو ہریرہؓ میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں
میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب تک وہ مجھے یاد کرتا ہے، اور میرے ذکر میں اس کے ہوش
ہلتے رہیں، ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، ان کا مختصر خلاصہ احقر نے اپنے رسالہ ذکر اللہ میں جمع کر دیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ

اے مسلمانو! مدد لو صبر اور نماز سے، بیشک اللہ صبر

الصَّبْرِ ۝۵۳

کرنے والوں کے ساتھ ہو

رابطہ، تخیل قبلہ پر جو مخالفین کی طرف سے اعتراض تھا، اس کے دواثر تھے، ایک مذہب اسلام
پر جو اعتراض سے مذہب کی حقانیت میں شبہ پیدا کیا جاتا ہے، اور یہی آیتوں میں اس اعتراض
کا جواب دے کر اس اثر کا دفع کرنا مقصود تھا، دوسرا اثر طہانہ اہل اسلام پر کہ اعتراض سے بالخصوص
جواب دینے کے بعد بھی اس پر بے جا اصرار کرنے سے قلب میں بیخ اور عدم پیدا ہوتا ہے، آیت
آئندہ میں تخفیف حزن کا طریقہ کہ صبر و صلوٰۃ ہے، بتلا کر اس دوسرے اثر کو زائل فرماتے ہیں۔

اے ایمان والو! (طبیعتوں میں غم ہلکا کرنے کے واسطے میں) صبر اور نماز سے سہارا
(اور مدد) حاصل کرو، بلاشبہ حق تعالیٰ (ہر طرح سے) صبر کرنے والوں کے

ساتھ رہتے ہیں، رادر نماز پڑھنے والوں کے ساتھ تو بدرجہ اولیٰ، وجہ یہ کہ نماز سب سے بڑی عبارت
ہو، جب صبر میں یہ وعدہ ہے تو نماز جو اس سے بڑھ کر ہے اس میں تو بدرجہ اولیٰ یہ بشارت ہوگی۔

معارف مسائل

مبرا در نماز ہر شکل کامل | اِسْتَعِيْنُوا بِالصَّلٰوةِ الصَّلٰوةِ، اس آیت میں یہ ہدایت ہے کہ انسان کی اور ہر مخلقت کا علاج میں تمام حوائج و ضروریات کے پورا کرنے اور تمام آفات و مصائب کا علاج کو دور کرنے کا نسخہ اکبر و درجہ سے مرکب ہے، ایک مبرا دوسرے نماز، اور اس نسخہ کے تمام حوائج اور تمام مصائب کے لئے عام ہونے کی طرف قرآن عظیم نے اس طرح سے اشارہ کر دیا ہے کہ اِسْتَعِيْنُوا کو عام سمجھو لے، کوئی خاص چیز ذکر نہیں فرمائی، مگر فلاں کام میں ان دونوں چیزوں سے مدد حاصل کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ ان سے انسان کی ہر ضرورت میں مدد حاصل کی جکتی ہو، تفسیر منظر ہی میں اس عموم کو واضح کر دیا، اب اس درجہ کی نفع کے دونوں اجزاء کو سمجھ لیجئے۔

مبرک اصل حقیقت مبرک اصل معنی اپنی نفس کو روکنے اور اس پر قابو پانے کے ہیں، قرآن و سنت کی اصطلاح میں مبرک کے معنی شے ہیں، ایک اپنے نفس کو حرام و ناجائز چیزوں سے روکنا، دوسرے طاعات و عبادت کی پابندی پر مجبور کرنا، عیسے مصائب و آفات پر صبر کرنا، یعنی جو مصیبت آگئی اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھنا، اور اس کے ثواب کا امیدوار ہونا، اس کے ساتھ اگر تکلیف دہ پریشانی کے اظہار کا کوئی حکم بھی نہیں سے نکل جائے تو وہ صبر کے منافی نہیں۔ (ذکرہ ابن کثیر عن سعید بن جبیر)

یہ تینوں صبر کے فرائض میں داخل ہیں، ہر مسلمان پر یہ پابندی عائد ہے کہ تینوں طرح کے صبر کا پابند ہو، عوام کے نزدیک صرف تیسرے شے کو تو صبر کہا جاتا ہے، دوسرے جو صبر کی اصل اور بنیاد میں عام طور پر ان کو صبر میں داخل ہی نہیں سمجھا جاتا۔

قرآن و حدیث کی اصطلاح میں صابرین انہیں لوگوں کا لقب ہے جو تینوں طرح کے صبر میں ثابت قدم ہوں، بعض روایات میں ہے کہ عرش میں ندا کی جائے گی کہ صابرین کہاں ہیں؟ تو وہ لوگ جو تینوں طرح کے صبر پر قائم رہ کر زندگی سے گزرے ہیں وہ کھڑے ہو جائیں گے، اور ان کو بلا حتما جنت میں داخلہ کی اجازت دی جائے گی، ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا کہ آیت قرآن اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ الْمُتَذَكِّرُونَ اَجْرُهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۱۰۴) سے بھی اس طرف اشارہ ہوتا ہے۔

نماز، دوسرا جز اس نسخہ کا جو تمام انسانی ضروریات کو پورا کرنے اور تمام پریشانیوں اور آفتوں سے نجات دلانے میں اکبر ہے نماز ہے، صبر جو تفسیر ابھی لکھی گئی ہے اس سے معلوم ہو گیا ہے کہ درحقیقت نماز اور تمام عبادات صبر ہی کے جزئیات ہیں، مگر نماز کو جدا گانہ بیان اس لئے کر دیا کہ تمام عبادات میں سے نماز ایک ایسی عبادت ہے جو صبر کا مکمل نمونہ ہے، کیونکہ نماز کی حالت میں نفس کو عبادت و طاعت پر مجبور بھی کیا جاتا ہے، اور تمام معاصی و مکروہات سے

بلکہ بہت سے مباحات سے بھی نفس کو بحالت نماز روکا جاتا ہے، اس لئے صبر جس کے معنی نفس کو اپنے قابو میں رکھ کر تمام طاعات کا پیر و اور تمام معاصی سے مجتنب و بیزار بنانا ہے، نماز اس کی ایک عملی تمثیل ہے۔

اس کے علاوہ نماز کو انسان کی تمام حاجات کے پورا کرنے اور تمام آفتوں و مصیبتوں سے نجات دلانے میں ایک خاص تاثیر بھی ہے، گو اس کی وجہ اور سبب معلوم نہ ہو، جیسے دواؤں میں بہت سی ادویات کو مؤثر بالخاصہ تسلیم کیا جاتا ہے، یعنی کیفیات حرارت و برودت کے حساب سے جیسے کسی خاص مرض کے ازالہ کے لئے بعض دوائیں بالخاصہ مؤثر ہوتی ہیں، جیسے درد گردہ کے لئے فرنگی دانہ کو یا تھ یا مٹھ میں رکھنا، اور بہت سے امراض کے لئے عود صلیب وغیرہ کو گلے میں ڈالنا، مؤثر بالخاصہ ہے، سبب نامعلوم ہے، لوہے کو کھینچنے میں مقناطیس مؤثر بالخاصہ ہے، وجہ معلوم نہیں اس طرح نماز تمام انسانی ضروریات کی کفالت اور تمام معاصی سے نجات دلانے میں مؤثر بالخاصہ ہے، بشرطیکہ نماز کو نماز کی طرح آداب اور خشوع خضوع کے ساتھ پڑھا جائے، ہماری جو نمازیں غیر مؤثر نظر آتی ہیں، اس کا سبب ہمارا قصور ہے کہ نماز کے آداب اور خشوع و خضوع میں کوتاہی ہوتی ہے، درہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب کوئی ہم پیش آتی تو نماز کی طرف رجوع فرماتے تھے، اور اس کی برکت اللہ تعالیٰ اس ہم کو پورا فرمادیتے تھے، حدیث میں ہوا

اِذَا حُزِبَ عَنْ رُفْعِ اِلَى الصَّلٰوةِ

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی ضرورت

پیش آتی تو نماز کی طرف رجوع فرما کرتے تھے،

مبرا در نماز تمام مشکلات و معاصی | اِنَّ اللّٰهَ تَجَّ الصَّابِرِيْنَ، اس کلمہ میں اس کا راز بتلادیا گیا ہے کہ صبر نجات کا سبب اس لئے ہے کہ صبر حل مشکلات اور دفع معاصی کا سبب کیسے بنتا ہے، ارشاد کا حامل اللہ تعالیٰ کی بہت نصیب ہوتا ہے یہ جو کہ صبر کے نتیجہ میں انسان کو حق تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جس شخص کے ساتھ رب العزت کی طاقت ہو اس کا کولسا کام ترک کر سکتا ہے اور کونسی مصیبت اس کو عاجز کر سکتی ہے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ وَلٰكِنْ

اور نہ کہو ان کو جو مارے گئے خدا کی راہ میں کہ مرے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن

لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ وَكُنْتُمْ لَكُمْ بَشِيرٌ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصِ

تم کو خبر نہیں، اور البتہ ہم آزمائیں گے تم کو ٹھوڑے سے ڈر سے اور بھوک سے اور نقصانوں سے

مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالشَّمْرِسِ وَبَنِي الشَّيْطَانِ ۝۱۵۰ الدِّينِ

ان کے اور جانوں کے اور میوؤں کے اور خوش خجری دسے مہر کرنے والوں کو کہ جب

إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝۱۵۱ أُولَٰئِكَ

پہنچے ان کو مصیبت تو کہیں ہم تو اللہ ہی کا مال ہیں اور ہم اس کی طرف لوٹ کر جائیں گے ایسے ہی

عَلَيْهِمْ صَلَواتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝۱۵۲

لوگوں پر عنایتیں ہیں اپنے رب کی اور ہدایت اور وہی ہیں سیدھی راہ پر۔

رابطہ اوپر ایک خاص ناگوار واقعہ میں صبر کی تعلیم اور صابریں کی فضیلت بیان فرمائی تھی آیات آئندہ میں اور بھی بعض واقعات غلامیہ طبع کی تفصیل اور اس میں صبر کی ترغیب اور فضیلت بیان فرماتے ہیں جن میں قتل و قتال مع الکفار کا مضمون مقدم فرماتے ہیں، اور وجہ سے اول بوجہ اعظم ہونے کے کہ اعظم پر صبر کرنے والا اصغر پر بدرجہ اولیٰ صبر کرے گا، دوسرے خاص طور پر مناسب مقام ہونے کی وجہ سے، کیونکہ معترضین مذکورین کے ساتھ یہ معاملہ پیش آتا تھا،

خلاصہ تفسیر اور جو لوگ اللہ کی راہ میں دین کے واسطے قتل کئے جاتے ہیں ان کی ایسی فضیلت ہو کہ ان کی نسبت یوں بھی مست کہو کہ وہ معمولی مُردوں کی طرح

مُردے ہیں، بلکہ وہ لوگ ایک ممتاز حیات کے ساتھ زندہ ہیں، لیکن تم اپنے موجودہ حواس سے (اس حیات کا) اور اک نہیں کر سکتے، اور (دیکھو) ہم مصفیتِ رضا و تسلیم میں جو کہ مقتضایا ایمان کا ہے، تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف سے (جو کہ هجومِ مخالفین یا نزولِ حوادث و شدائد سے پیش آوے) اور کسی قدر فقر و فاقہ سے اور (کسی قدر) مال اور جان اور بھلوں کی کمی سے (مثلاً مویشی مرگنے یا کوئی آدمی مر گیا یا بیمار ہو گیا یا پھل اور کھیتی کی پیداوار تلف ہو گئی، پس تم صبر کرنا) اور جو لوگ ان امتحانوں میں پورے اتر آویں اور مستقل رہیں تو آپ ایسے صابریں کو بشارت سنا دیجئے (جن کی یہ عادت ہے کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ ردل سے سمجھ کر یوں کہتے ہیں کہ ہم تو (مع مال و اولاد و حقیقتہ) اللہ تعالیٰ ہی کی ملک میں (اور مالکِ حقیقی کو اپنی ملک میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار حاصل ہے، اس سے ملوک کا تنگ ہونا کیا معنی) اور ہم سب (دنیا) اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جاسے والے ہیں، سو یہاں کے نقصانوں کا بدلہ وہاں جاکر مل رہے گا، اور جو مضمون بشارت کا ان کو سنایا جائے گا وہ یہ ہے کہ) ان لوگوں پر (جدا جدا) خاص خاص رحمتیں بھی ان کے پروردگار کی طرف سے (مہذول) ہوں گی اور (سب پر بالاشترک) عام رحمت بھی ہوگی، اور یہی لوگ ہیں جن کی حقیقت حال تک (رسائی ہو گئی) کہ حق تعالیٰ کو ہر چیز کا مالک اور نقصان کا تدارک کر دینے والا سمجھ گئے۔

معارف مسائل

شہداء اور انبیاء کی حیات برزخی یہ قسب کو معلوم ہے کہ اسلامی روایات کی روش سے ہر مرنے والے کو اور اس کے درجات میں تفاضل برزخ میں ایک خاص قسم کی حیات ملتی ہے جس سے وہ فہر کے عذاب یا ثواب کو محسوس کرتا ہے، اس میں مومن و کافر یا صالح و فاسق میں کوئی تفریق نہیں، لیکن اس حیات برزخی کے مختلف درجات ہیں ایک درجہ قسب کو عام اور شامل ہے، کچھ مخصوص درجہ انبیاء و صالحین کے لئے مخصوص ہیں، اور ان میں بھی باہمی تفاضل ہے، اس مسئلہ کی تحقیق پر علماء کے مقالات و تحقیقات بے شمار ہیں، لیکن ان میں سے جو بات اقرب الی الکتاب والسنۃ ہے اور شبہات سے پاک ہو، اس کو سیدی حضرت مجتہد الامت تھانویؒ نے بیان القرآن میں واضح فرمایا ہے، اس جگہ اس کو نقل کرنا کافی معلوم ہوا۔

ف: ایسے مقتول کو جو اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے شہید کہتے ہیں، اور اس کی نسبت گو یہ کہنا کہ وہ مر گیا صحیح اور جائز ہے، لیکن اس کی موت کو دوسرے مُردوں کی سی موت سمجھنے کی نہایت کمی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ بعد مرنے کے گو برزخی حیات ہر شخص کی روح کو حاصل ہے، اور اسی سے جزاء و سزا کا اور اک ہوتا ہے، لیکن شہید کو اس حیات میں اور مُردوں سے ایک گونہ امتیاز، جو اور وہ امتیاز یہ ہو کہ اس کی یہ حیات آثار میں اور دُور سے قوی ہے، جیسے انگلیوں کے اگلے پورے اور ایڑی، اگرچہ دونوں میں حیات ہے، اور حیات کے آثار بھی دونوں میں موجود ہیں، لیکن انگلیوں کے پوروں میں حیات کے آثار احساس وغیرہ بہ نسبت ایڑی کے زیادہ ہیں، اسی طرح شہداء میں آثارِ حیات عام مُردوں سے بہت زیادہ ہیں، حتیٰ کہ شہید کی اس حیات کی قوت کا ایک اثر برخلات معمولی مُردوں کے اس کے جسد ظاہری تک بھی پہنچا ہے، کہ اس کا جسم باوجود مجموعہ گوشت و پوست ہونے کے خاک سے متاثر نہیں ہوتا، اور مثل جسمِ زندہ کے صبح سالم رہتا ہے، جیسا کہ احادیث اور مشاہدات شاہد ہیں، پس اس امتیاز کی وجہ سے شہداء کو احیاء کہا گیا، اور انکو دوسرے اموات کے برابر اموات کہنے کی مانعت کی گئی، مگر احکام ظاہرہ میں وہ عام مُردوں کی طرح ہیں، ان کی میراث تقسیم ہوتی ہے، اور ان کی بیویاں دوسروں سے نکاح کر سکتی ہیں، اور یہی حیات ہے جس میں حضراتِ انبیاء علیہم السلام شہداء سے بھی زیادہ امتیاز اور قوت رکھتے ہیں، یہاں تک کہ سلامت جسم کے علاوہ اس حیات برزخی کے کچھ آثار ظاہری احکام پر بھی پڑتے ہیں، مثلاً ان کی میراث تقسیم نہیں ہوتی، ان کی ازواج دوسروں کے نکاح میں نہیں آ سکتیں۔

پس اس حیات میں سب قوی تر انبیاء علیہم السلام ہیں، پھر شہداء پھر اور معمولی مُردے،

البتہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اولیاء و صالحین بھی اس فضیلت میں شہداء کے شریک ہیں، سو جبکہ نفس میں مرنے کو بھی حق شہادت میں داخل سمجھیں گے، اس طور پر وہ بھی شہداء ہو گئے، یا یوں کہا جاوے کہ آیت میں شہداء کی تخصیص عام مسرورن کے اعتبار سے ہے، شہداء کے ہر تہہ و دو سر کو ملکہ صالحین و صدیقین کے اعتبار سے نہیں۔

اور اگر کسی شخص نے کسی شہید کی لاش کو خاک خوردہ پایا ہو تو سمجھ لے کہ ممکن ہے اس کی نیت خالص نہ ہو، جس پر مدار ہے قتل کے شہادت ہونے کا، اور صرف قتل شہادت نہیں ہو اور اگر فحشا ایسا شہید خاک خوردہ پایا جاوے جس کا قتل فی سبیل اللہ اور اس کا جامع شرف و شہادت ہو، بنا دلیل قطعی تو اثر وغیرہ سے ثابت ہو، جس کا شبہ صاحب روح المعانی کو ہو گیا ہے، تو اس کی وجہ میں کہا جاوے گا کہ حدیث میں جس چیز کی تصریح ہے وہ یہ کہ انبیاء و شہداء کے جسم کو زمین نہیں کھائی، یعنی مٹی ان کے جسم کو خراب نہیں کر سکتی، اجزاء ارضیہ مٹی وغیرہ کے علاوہ کسی دوسری چیز سے ان کے جسم کا متاثر ہو کر فنا ہو جانا پھر بھی ممکن ہے، کیونکہ زمین میں اور بھی بہت سی اقسام و افواج کی وحاشیں اور ان کے اجزاء اللہ تعالیٰ نے رکھ دیئے ہیں، اگر ان کی وجہ سے کسی شہید کا جسم متاثر ہو جائے تو اس آیت کے منافی نہیں۔

چنانچہ دو سر کا اجسام مرکبہ مثل اسلحہ و ادویہ و اغذیہ و اغلاط و اجسام بیہلہ مثل آب و آتش و باد کی تاثیر انبیاء علیہم السلام کے اجساد میں بھی ثابت ہے، اور شہداء کی حیات بعد المات انبیاء کی حیات قبل المات سے اتنی نہیں، اور بعض حصہ ارض میں بعض اجزاء غیر ارضیہ بھی شامل ہو جاتے ہیں، جس طرح دو سر کے عناصر میں بھی مختلف عناصر شامل ہو جاتے ہیں، سو اگر ان اجزاء غیر ارضیہ سے ان کے اجساد متاثر ہو جائیں تو اس سے ان احادیث پر اشکال نہیں ہوتا، جن میں حرمت اجساد علی الارض وارد ہے۔

اور ایک جواب یہ ہو کہ امتیاز اجساد شہداء کے لئے یہ کافی ہے کہ دوسری اموات زیادہ مرتبت تک ان کے اجساد خاک سے متاثر نہ ہوں، گو کسی وقت میں ہو جائیں، اور احادیث سے یہی امر مقصود کہا جائے کہ ان کی محفوظیت اجساد کی خارج عادت ہے، اور خرق عادت کی دونوں صورتیں ہیں، حفظ و تبدل اور حفظ طویل، اور چونکہ عالم برزخ حواس یعنی آنکھ، کان، ناک، ہاتھ وغیرہ سے مرکب نہیں ہوتا اس لئے لا تشعرون فرمایا گیا کہ تم ان کی حیات کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔

معنا یہ ہے کہ آسان ف، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہندوں کا امتحان ہوتا ہے، اس کی حقیقت کرنے کی خاص تدبیر آیت وَاِذَا ابْتُلِيَ اِبْرٰہِیْمُ ذَکُوْہُ وَاُخْرِیْمُ ذَکُوْہُ کی تعبیر میں گزر چکی ہے، اور حوادث کے واقع ہونے سے پہلے ان کی خبر دینے میں یہ فائدہ ہوا کہ صبر آسان ہو جاتا ہے، ورنہ دفعہ کوئی صدقہ

پڑنے سے زیادہ پریشانی ہوتی ہے، اور یہ خطاب ساری امت کو ہے تو سب کو کہہ لینا چاہئے کہ دنیا دارالمن ہے، یعنی محنتوں اور تکلیفوں کی جگہ ہے، اس لئے یہاں کے حوادث کو عجیب اور بعید نہ سمجھا جائے تو بے صبری نہ ہوگی، اور چونکہ یہ لوگ نفس عمل صبر میں سبب شریک ہیں، اس لئے اس کا حاصل مشترک تو عام رحمت ہو، جو نفس صبر پر موعود ہے، اور چونکہ مقدار اور شان اور خصوصیت ہر صابر کے صبر کی جدا ہے، اس لئے ان خصوصیات کا حاصل جدا جدا خاص غنائتوں سے ہوگا، جو ان خاص خصوصیات پر موعود ہیں، جیسے دنیا میں مواقع انعام پر دعوت طعام تو عام ہوتی ہے، پھر روپے اور جوڑے ہر ایک کو مل سکتے ہیں، قدر اعلیٰ و الخیریت و الخیریت دینے جاتے ہیں۔

مصیبت میں اتنا کہہ کر بڑھا جائے | صابرین کی طرف نسبت کر کے جو یہ فرمایا ہے کہ وہ مصیبت کے تو تکلیف قلب کا بہترین علاج ہے | وقت ان اللہ وانا لیراجعون کہا کرتے ہیں، حقیقت میں مقصود اس کی تعلیم سے یہ ہو کہ مصیبت دانوں کو ایسا ہنسنا چاہئے، کیونکہ ایسا کہنے میں ثواب بھی بڑا ہے، اور اگر دل سے سمجھ کر یہ الفاظ کہے جائیں تو غم درخ کے دور کرنے اور قلب کو تسلی دینے کے معاملہ میں بھی اکسیر کا حکم رکھتے ہیں۔

اِنَّ الصَّافِیْنَ الْمَرْوۃَ مِنْ شَعَابِرِ اللّٰہِ فَمَنْ حَجَّ الْبَیۡتَ اَوْ اَعَمَّرَ

بے شک صفا اور مروہ نشانیوں میں سے ہیں اللہ کی سوچ کوئی حج کرے بیت اللہ کا یا عمرہ

فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِ اَنْ یَّطُوْفَ بِہِمَا وَاَوْ مَنْ طَوَّعَ خَیْرًا فَاِنَّ اللّٰہَ

تو کچھ گناہ نہیں اس کو کہ طواف کرے ان دونوں میں اور جو کوئی اپنی خوشی سے کرے کچھ نیکی تو اللہ

شَاکِرٌ عَلَیْمٌ ﴿۱۵﴾

قدر دان ہے سب کچھ جانتے والا

رابط آیات متقدمہ میں وَاِذَا ابْتُلِيَ اِبْرٰہِیْمُ ذَکُوْہُ سے درر تک خانہ کعبہ کا فضل ذکر ہوا، جو چہ کے اوّل میں خانہ کعبہ کے جائے عبادت ہونے کا بیان تھا، اور اس کے آگے دعائے ابراہیم کی حکایت تھی کہ انھوں نے یہ درخواست کی تھی کہ ہمیں احکام مناسک سکھلا دیئے جاویں، اور مناسک میں حج و عمرہ بھی داخل ہو، پس بیت اللہ کا مقصد ہونا جیسے اس کے قبلہ نماز بنانے سے ظاہر کیا گیا اسی طرح حج و عمرہ میں بیت اللہ کو مقصد بنا کر اس کی اہمیت کو واضح کیا گیا۔

اب آیت آئندہ میں اس کے مقصد حج و عمرہ بننے کے مطلق ایک مضمون کا بیان ہے، وہ یہ کہ

صفاد مردہ وہ پہاڑیاں مکہ میں ہیں، حج و عمرہ میں کعبہ کا طواف کر کے ان کے درمیان میں دوڑتے چلتے ہیں۔ جس کو سعی کہتے ہیں، چونکہ زمانہ جاہلیت میں بھی یہی جڑی تھی، اور اس وقت صفاد مردہ پر کچھ مورتیاں رکھی تھیں، اس لئے بعض مسلمانوں کو شبہ پڑ گیا کہ شاید یہ رسوم جاہلیت سے ہو، اور موجب گناہ ہو اور بعض جاہلیت میں بھی اس کو گناہ سمجھتے تھے، ان کو یہ شبہ ہو اگر شاید اسلام میں بھی گناہ ہو، اللہ تعالیٰ کو یہ شبہ دفع فرما، مقصود ہے، پس مضمون سابق میں کعبہ کے قبلہ نماز ہونے پر اعتراض کفار کا دفع کرنا مقصود تھا، اور مضمون لاحق میں کعبہ کے مقصد حج و عمرہ ہونے کے متعلق ایک امر یعنی صفا و مردہ کی سعی پر خود مسلمانوں کے شبہ کا ازالہ فرمانا مقصود ہے، یہ وجہ دونوں مضمونوں میں ربط کی ہے۔

خلاصہ تفسیر (صفاد مردہ کی سعی میں کوئی شبہ نہ کر رہا کیونکہ تحقیقاً صفا و مردہ داران کے درمیان میں سعی کرنا منقطع یا دگر (دین) خداوندی ہیں، سو جو شخص حج کرے بیت اللہ کا یا اس کا عمرہ کرے اس پر ذرا بھی گناہ نہیں (جیسا تم کو شبہ ہو گیا) ان دونوں کے درمیان سعی کے محدث طریقہ کے مطابق آمد و رفت کرنے میں (جس کا نام سعی ہے اور گناہ کیا بلکہ ثواب ہوتا ہے) کیونکہ یہ سعی تو شرعاً امر خیر ہے) اور رہا ہے یہاں کا ضابطہ ہو کہ جو شخص خوشی سے کوئی امر خیر کرے تو حق تعالیٰ اس کی بڑی قدر دانی کرتے ہیں اور اس خیر کرنے والے کی نیت و خلوص خوب جانتے ہیں، پس اس ضابطہ کی نوسہ سعی کرنے والے کو بمقدار اخلاص ثواب عنایت ہوگا۔

معارف مسائل

بعض لغات کی تحقیق شعا پر اللہ، شاعر جہ ہے شعیرہ کی، جس کے معنی علامت کے ہیں، شاعر اللہ سے مراد وہ اعمال ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کی علامتیں قرار دیے، حج کے لفظی معنی قصد کرنے کے ہیں، اور اصطلاح قرآن و سنت میں خاص خانہ کعبہ کا قصد کرنے اور وہاں افعال مخصوصہ کے ادا کرنے کو حج کہا جاتا ہے، عمرہ کے لفظی معنی زیارت کے ہیں اور اصطلاح شرع میں مسجد حرام کی حاضری اور طواف سعی کو کہا جاتا ہے۔

صفاد مردہ کے درمیان حج اور عمرہ اور سعی کا طریقہ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، اور یہی امام احمد کے مسدود واجب ہے، نزدیک سنت متجہ ہے، اور مالک اور شافعی کے نزدیک فرض ہے، اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک واجب ہے، کہ ترک سے ایک بکری ذبح کرنا پڑتی ہے۔

آیت مذکورہ کے الفاظ سے شبہ نہ کرنا چاہئے کہ اس آیت میں تو صفا و مردہ کے درمیان سعی کرنے کے متعلق صرف اتنا فرمایا گیا ہے کہ وہ گناہ نہیں، اس سے تو زیادہ سے زیادہ یہ ثابت

ہو اگر سعی باعات میں سے ایک مباح ہے، وجہ یہ ہے کہ اس جگہ عنوان لا یجتناء کا سوال کی مشابہت سے رکھا گیا ہے، سوال اسی کا تھا کہ صفا و مردہ پر بتوں کی عوریں رکھی تھیں اور اہل جاہلیت انہی کی پوجا پاٹ کے لئے صفا و مردہ کے درمیان سعی کرتے تھے، اس لئے یہ عمل حرام ہونا چاہئے، اس کے جواب میں فرمایا کہ اس میں کوئی گناہ نہیں، چونکہ یہ دراصل سنت ابراہیمی ہے کسی کے جاہلانہ عمل سے کوئی گناہ نہیں ہو جاتا، یہ فرمانا اس کے واجب ہونے کے منافی نہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْكِتَابِ وَالْهُدَىٰ مِنْ

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ ہم نے انارے صاف حکم اور ہدایت کی باتیں بعد اس کے

أَعَدَّ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ

کہ ہم ان کو کھول چکے لوگوں کے واسطے کتاب میں ان پر لعنت کرتا ہے اللہ اور لعنت کرتے ہیں

الْعَالَمُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنَّاهُ فِي الْكِتَابِ الْتُوبَ

ان پر لعنت کرنے والے، مگر جنہوں نے توبہ کی اور درست کیا اپنے کلام کو اور بیان کر دیا حق بات کو قرآن کو معاف

عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَابُ الرَّحِيمُ ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا

کرتا ہوں اور میں ہوں پڑا صاف کرنا لا ہدایت ہر ان، بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور مر گئے

وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمُ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ

کافر ہیں انہی پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں اور لوگوں کی

أَجْمَعِينَ ۝ خُلِدَ نِينَ فِيهَا لَا يَخْفَتُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَ

سب کی، ہمیشہ رہیں گے اسی لعنت میں نہ ہٹا ہوگا ان پر ہے عذاب اور

لَهُمْ نِيظَرُونَ ۝

وہ ان کو ہر وقت دیکھ رہے ہیں۔

ربط اور پر بحث قبلہ کے ضمن میں صاحب قبلہ کی نبوت کے متعلق اہل کتاب کی حق پوشی کا مضمون مذکور تھا، اس آیت میں الَّذِينَ أَتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ یعنی فُتُوْنَةُ الی وَرَلَيْكُمُ الْكِتَابُ آئے اس مضمون کی تکمیل کے واسطے حق کو چھپانے والوں کی اور کتمان حق پر اصرار کرنے والوں کی وعید اور توبہ کرنے پر معافی کا وعدہ ارشاد فرماتے ہیں۔

تفسیر خلاصہ

جو لوگ اخفاء کرتے ہیں ان مضامین کا جن کو ہم نے نازل کیا ہے جو کہ (اپنی ذات میں) واضح ہیں اور (دوسروں کے لئے) ہادی ہیں (اور اخفاء بھی) اس (حالت) کے بعد کہ ہم ان (مضامین) کو کتاب (و اہی) توراة و انجیل میں (نازل فرما کر) عام لوگوں پر ظاہر کر چکے ہوں ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت فرماتے ہیں (کہ اپنی رحمت خاصہ سے ان کو بعید کر دیتے ہیں) اور (دوسرے بہتر سے) لعنت کرنے والے بھی (جن کو اس فعل سے نفرت ہی) ان پر لعنت بھیجتے ہیں (کہ ان پر بددعا کرتے ہیں) مگر جو لوگ (ان اخفاء کرنے والوں میں) اپنی اس حرکت سے (توبہ) زمین حق تعالیٰ کے (روبرو گذشتہ سے معذرت) کر لیں اور (جو کچھ ان کے اس فعل سے خرابی ہو گئی تھی) آئندہ کے لئے اس کی اصلاح کر دیں (اور اس اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ ان اخفاء کئے ہوئے مضامین کو عام طور پر) ظاہر کر دیں (تاکہ سب کو اطلاع ہو جائے) اور ان پر لوگوں کو گمراہ کرنے کا بار نہ رہے اور اظہار معتبر عند الشرع یہ ہے کہ اسلام کو قبول کر لیں، کیونکہ اسلام نہ لانے میں نبوت محمدیہ کے متعلق عوام پر بھی حق مخفی رہے گا، وہ یہی سمجھیں گے کہ اگر نبوت حق ہوتی تو یہ کتاب جاسنے والے لوگ کیوں نہ ایمان لاتے، خلاصہ یہ کہ یہ لوگ مسلمان ہو جاویں، تو ایسے لوگوں (کے حال) پر میں (عنایت سے) متوجہ ہو جاتا ہوں (اور ان کی خطا معاف کر دیتا ہوں) اور میری توبہ کثرت عادت ہے توبہ قبول کر لینا، اور مہربانی نشر کرنا (کوئی توبہ کرنے والا ہونا چاہئے) البتہ جو لوگ (ان میں سے) اسلام نہ لادیں، اور اسی حالت غیر اسلام پر مر جاویں ایسے لوگوں پر (وہ) لعنت (مذکورہ) اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں اور آدمیوں کی بھی سب کی (ایسے طور پر برسا کرے گی کہ) وہ ہمیشہ ہمیشہ کو اسی حالت میں رہیں گے (جہنم میں رہیں گے) اور ہمیشہ کے لئے داخل ہوں گے، اور ہمیشہ کا جہنم میں رہنے والا ہمیشہ ہی خدا کی خاص رحمت سے دور بھی رہے گا اور ہمیشہ ملعون رہنا یہی ہو، اور ہمیشگی لعنت کے ساتھ یہ بھی ہے کہ داخل ہونے کے بعد کسی وقت (ان پر) سے (جہنم کا) عذاب ہلکا (بھی) نہ ہونے پاوے گا اور نہ (داخل ہونے کے قبل) ان کو (کسی معاذ تک) ہلکت دی جائے گی (کیونکہ معاذ اس وقت دی جاتی ہے، جب کہ مقدمہ میں گنجائش ہو اور گنجائش نہ ہونے پر ازل ہی پیش میں حکم سزا ہو جاتا ہے)۔

معارف مسائل

علم دین کا اظہار اور پھیلانا واجب | آیت مذکورہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اس کا چھپانا سمجھنا حرام ہے | جو ہدایات و نجات نازل کی گئی ہیں ان کا لوگوں سے چھپانا ناشائستہ

بڑا جرم عظیم ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت کرتے ہیں اور تمام مخلوق لعنت بھیجتی ہے، اس سے چند احکام حاصل ہوئے :-

اول یہ کہ جس علم کے اظہار اور پھیلانے کی ضرورت ہے اس کا چھپانا حرام ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ سَتَلَ عَنْ عِلْمٍ يَكْتُمُهُ كَلَمَةً	یعنی جو شخص دین کے کسی حکم کا علم رکھتا ہو
أَلْجَمَهُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ	اور اس سے وہ حکم دریافت کیا جائے اگر وہ
بَلَا حَاجَ قَبْلِ النَّارِ رَوْاهُ ابُو هُرَيْرَةَ	اس کو چھپا کر قیامت کے روز اس کے منہ میں
وَمِنْ بَيْنِ الْعَاقِبَةِ ابْنُ مَرْثَدَةَ (ازنہ)	اللہ تعالیٰ آگ کا نظام ڈالیں گے۔

حضرات فقہانہ نے فرمایا کہ یہ وعید اس صورت میں ہے جب کہ اس کے سوا کوئی دوسرا آدمی مسئلہ کا بیان کرنے والا وہاں موجود نہ ہو، اور اگر دوسرے علماء بھی موجود ہوں تو گنجائش ہے کہ یہ کہہ دے کہ دوسرے علماء سے دریافت کر لو (قرطبی، جصاص)

دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوئی کہ جس کو خود صحیح علم حاصل نہیں اس کو مسائل و احکام بتانے کی جرأت نہیں کرنا چاہئے۔

تیسری مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ علم کو چھپانے کی یہ سخت وعید انہیں علوم و مسائل سے متعلق ہے، جو قرآن و سنت میں واضح بیان کئے گئے ہیں اور جن کے ظاہر کرنے اور پھیلانے کی ضرورت ہو، باریک اور دقیق مسائل جو عوام نہ سمجھ سکیں بلکہ خطرہ ہو کہ وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے تو ایسے مسائل و احکام کا عوام کے سامنے بیان نہ کرنا ہی بہتر ہے، اور وہ کتاب علم کے حکم میں نہیں ہو آیت مذکورہ میں لفظ مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْأَشْكَالِ سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، ایسے ہی مسائل کے متعلق حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ تم اگر عوام کو ایسی حدیثیں سنائو گے جن کو وہ پوری طرح نہ سمجھ سکیں تو ان کو فتنہ میں مبتلا کر دو گے (قرطبی)

اسی طرح صحیح بخاری میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ عوام لوگوں کے سامنے صرف اتنے ہی علم کا اظہار کر دو جس کو ان کی عقل و فہم برداشت کر سکے، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کریں، کیونکہ جو بات ان کی سمجھ سے باہر ہوگی، ان کے دلوں میں اس سے شبہات و خدشات پیدا ہوں گے، اور ممکن ہے کہ اس سے انکار کر دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عالم کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ مخاطب کے حالات کا اندازہ لگا کر کلام کرے، جس شخص کے غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو اس کے سامنے ایسے مسائل بیان ہی کر دو اسی لئے حضرات فقہاء بہت سے مسائل کے بیان کے بعد کہتے ہیں هَذَا أَمَّا الْغَيْرُ وَلَا يُعْرَى

یعنی یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اہل علم کو خود تو سمجھ لینا چاہئے مگر عوام میں پھیلا نا نہیں چاہئے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَشْتَعُوا أَلْفِكُمَا أَهْلَكَا
فَنُظِّلِمُزْهُمًا وَلَا تَصْحَوْهُمَا فِي
غَيْرِ أَهْلِيهَا فَنُظِّلِمُزْهُمًا

یعنی حکمت کی بات کو اپنے لوگوں سے نہ دو کہ جو اس بات کے اہل ہوں اگر تم نے ایسا کیا تو ان لوگوں پر ظلم ہوگا اور جو اہل نہیں ہیں ان کے

سامنے حکمت کی باتیں نہ رکھو کیونکہ اس صورت میں اس حکمت پر ظلم ہوگا۔

امام قرطبی نے فرمایا کہ اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کس کافر کو جو مسلمانوں کے مقابلہ میں مناظرے کرتا ہو یا کوئی مبتدع گمراہ جو لوگوں کو اپنے غلط خیالات کی طرف دعوت دیتا ہو اس کو علم دین سکھانا اُس وقت تک جائز نہیں جب تک یہ ظن غالب ہو جائے کہ علم سکھانے سے اس کے خیالات درست ہو جائیں گے۔

اس طرح کسی بادشاہ یا حاکم وقت کو ایسے مسائل بتلانا جن کے ذریعہ وہ رعیت پر ظلم کرنے کا راستہ نکال لیں جائز نہیں، اسی طرح عوام کے سامنے احکام دین میں رخصتیں اور جیوں کی صورتیں بلا ضرورت بیان نہ کرنا چاہئے، جس کی وجہ سے وہ احکام دین پر عمل کرنے میں حیلہ چلنے کے مادی بن جائیں (قرطبی)۔

حدیث رسول بھی قرآن مجید بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہو کر انھوں نے فرمایا اگر قرآن کی سے مضحک میں ہے ۱۱۱ یہ آیت نہ ہوتی تو میں تم سے کوئی حدیث بیان نہ کرتا، آیت سے مراد یہی آیت ہے جس میں کمان علم پر لعنت کی وعید شدید مذکور ہے ایسے ہی بعض دوسرے صحابہؓ نے بھی بعض روایات حدیث کے ذکر کرنے کے ساتھ ایسے ہی الفاظ فرمائے کہ اگر قرآن کریم کی یہ آیت کمان علم کے بارے میں نہ ہوتی تو میں یہ حدیث بیان نہ کرتا۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کے نزدیک حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم قرآن ہی کے حکم میں ہے، کیونکہ آیت میں تو کمان کی وعید اُن لوگوں کے لئے آئی ہے جو قرآن میں نازل شدہ ہدایات و بینات کو چھپائیں، اس میں حدیث کا صراحت ذکر نہیں، لیکن صحابہ کرامؓ نے حدیث رسول کو بھی قرآن ہی کے حکم میں سمجھ کر اس کے انکار کرنے کو اس وعید کا سبب سمجھا بعض مٹا ہوں کا وبال ایسا ہوگا کہ ۱۱۲ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَسُولِ اللَّهِ فَكَفَرْنَا بِهٖمْ وَاللَّهُ يَهْدِي الْغَافِلِينَ میں ستر آں کریم نے لعنت کرنے والوں کو اس پر ماری مخلوق لعنت کرتی ہو کہ متعین نہیں کیا کہ کون لوگ لعنت کرتے ہیں، امام تفسیر مجاہدؒ اور مکرّمؒ نے فرمایا کہ اس عدم تعین سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ دنیا کی ہر چیز اور ہر مخلوق ان پر لعنت کرتی ہے، یہاں تک کہ تمام جانور اور وحشرات الارض بھی اُن پر لعنت

کرتے ہیں، کیونکہ ان کی بد اعمالی سے ان سب مخلوقات کو نقصان پہنچتا ہے، حضرت ہر ابن عازبؓ کی حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللّٰہُ یُعَذِّبُہُمْ سے مراد تمام زمین پر چلنے والے جانور ہیں (قرطبی بحوالہ ابن ماجہ باسناد حسن)۔

کسی شخص پر لعنت اس وقت تک جائز ۱۱۳ وَمَا كُنَّا أَهْلًا بِهٖ لَمَّا كَفَرَ لَکُمُ الْکُفْرُ الَّذِیْ فَعَلْتُمْ وَلَکُمُ الْعَذَابُ الَّذِیْ فَعَلْتُمْ وَلَکُمُ الْعَذَابُ الَّذِیْ فَعَلْتُمْ کہ جس کا کفر کے کفر کی حالت میں دوسرے کا تعین نہیں ہوگا اس کے کفر پر لعنت کا تعین ہوگا۔ یہ استنباط کیا ہے کہ جس کافر کے کفر کی حالت میں دوسرے کا تعین نہ ہو اس پر لعنت کرنا جائز نہیں اور چونکہ ہمیں کسی شخص کے خاصہ کا یقینی علم ہونے کا اب کوئی ذریعہ نہیں، اس لئے کسی کافر کا نام لے کر اس پر لعنت کرنا جائز نہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کافروں پر نام لے کر لعنت کی ہے آپ کو ان کی موت علی الکفر کا منجانب اللہ علم ہو گیا تھا، البتہ عام کافروں، ظالموں پر بغیر تعین کے لعنت کرنا درست ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جب لعنت کا معاملہ اتنا شدید ہو کہ کسی کافر پر بھی یا ستر تک جائز نہیں جب تک اس کا یقین نہ ہو جائے کہ اس کی موت کفر ہی پر ہوگی، تو کبھی مسلمان پر یا کسی حال اور پر لعنت کیسے جائز ہو سکتی ہے، اور عوام اس سے بالکل غفلت میں ہیں خصوصاً عورتیں کہ ہاتھ بات پر لعنت کے الفاظ اپنے متعلقین کے متعلق استعمال کرتی رہتی ہیں، اور لعنت صرف لفظ لعنت ہی کے کہنے سے نہیں ہوتی، بلکہ اس کے ہم معنی جو الفاظ ہیں وہ بھی لعنت ہی کے حکم میں ہیں، لعنت کے اصلی معنی خدا تعالیٰ کی رحمت سے دور کرنے کے ہیں، اس لئے کسی کو مردود و رائدہ و رگلا و اندمار وغیرہ کے الفاظ کہنا بھی لعنت ہی کے حکم میں ہے۔

وَالْفُكْمُ وَاللَّعْنَةُ وَالْأَهْوَالُ الرَّجِيمُ ۝۱۱۴

اور مہودم سب کا ایک ہی مہود ہے کوئی مہود نہیں اس کے سوا بڑا مہربان ہے بنایت رحم والا

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالاٰخِلَافِ الْبَیِّنَاتِ وَالنَّهَارِ

بے شک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے بدلنے رہنے میں

وَالْفُلْکِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ

اور کشتیوں میں جو کہنے کر چلتی ہیں دریا میں لوگوں کے کما کی چیزیں اور پانی میں جس کو کہنا اُتارا

اَللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَاحْیَیْہِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِہَا وَ

اللہ نے آسمان سے پھر چلایا اس سے زمین کو اس کے مرچنے چھپنے اور

بَشَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ مِّنْ ذَاتِ نَفْسٍ الرِّيحِ وَالسَّحَابِ الْمُسْتَخَرِ

بھلائے اس میں سب قسم کے جانور اور ہواؤں کے بدلنے میں اور بادلوں میں جو کہ تابعدار ہے

بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا يَبْتَغِي لِقَوْمٍ يُعْقِلُونَ ﴿۲۳﴾

اس کے حکم کا درمیان آسمان و زمین کے۔ بیشک ان سب چیزوں میں نشانیاں ہیں مقلدین کیلئے

رابطہ | مشرکین مرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو اپنے عقیدہ کے خلاف سن تو توجہ ہے کہنے والے کہ ہمیں سائے جہان کا ایک معبود بھی ہو سکتا ہے، اور اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو کوئی دلیل پیش کرنا چاہئے، حق تعالیٰ آگے دلیل بیان فرماتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر | اور (ایسا معبود) جو تم سب کے معبود بننے کا مستحق وہ تو ایک ہی معبود (حق تعالیٰ) ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی رحمن ہے، رحیم ہے،

اور کوئی ان صفات میں کامل نہیں، اور بدین کمال صفات معبودیت کا استحقاق باطل ہو پس جو سب معبود حقیقی کے کوئی اور مستحق عبادت نہ ہوا، بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنائے ہیں

اور بچے بعد و بچہ رات اور دن کے آنے میں اور جہازوں کے چلنے میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں آدمیوں کے نفع کی چیزیں اور اسباب ہلے گرا اور بارش کے) پانی میں جس کو اللہ تم

نے آسمان سے برسا یا، پھر اس (پانی) سے زمین کو تر و تازہ کیا، اس کے خشک ہونے پر پھر پانی اس میں نباتات پیدا کئے، اور ان نباتات سے ہر قسم کے حیوانات اس (زمین) میں پھیلادے

کیونکہ حیوانات کی زندگی اور تولید و تناسل اسی غذائے نبات کی بدولت ہے اور ہواؤں کی (سینیں اور کیفیتیں) بدلنے میں رکھ کر اسے کبھی بچھا کبھی گرم ہے کبھی سرد اور ابر (کے دھنچے)

میں جو زمین و آسمان کے درمیان مقید اور معلق رہتا ہے (ان تمام چیزوں میں) دلائل (توحید کے موجود ہیں) ان لوگوں کے (استدلال کے) لئے جو عقل (سلیم) رکھتے ہیں۔

معارف مسائل

توحید کا وسیع مفہوم | اَدِّ الْفَهْمُ لِلَّهِ وَاجِبٌ۔ اللہ تعالیٰ کی توحید متعدد اور مختلف حیثیتوں سے ثابت ہے۔ مثلاً وہ ایک ہے، یعنی کائنات میں کوئی اس کی نظیر و شبیہ نہیں، نہ کوئی اس کا ہمسرہ برابر ہے، اس لئے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو واحد کہا جائے۔

دوسرے یہ کہ وہ ایک ہر تحقیق عبادت میں یعنی اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ تیسرے یہ کہ وہ ایک یعنی ذی اجزاء نہیں، وہ اجزاء و اعضاء سے پاک ہے، نہ اس کا

تجزیہ و تقسیم ہو سکتی ہے۔

جو تھے یہ کہ وہ ایک ہی یعنی اپنے وجود ازلی ابدی میں ایک ہی، وہ اس وقت بھی موجود تھا، جب کوئی چیز موجود نہ تھی، اور اُس وقت بھی موجود رہی گا جب کوئی چیز موجود نہ ہو گی، اس لئے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو واحد کہا جائے، لفظ واحد میں یہ تمام حقیقتیں توحید کے ملحوظ ہیں (جہاں) اس کے بعد حق تعالیٰ کے داعی حقیقی ہونے پر ٹکونی علامات و دلائل بتلائے گئے ہیں جنکو ہر عالم و جاہل سمجھ سکتا ہے، کہ آسمان و زمین کی تخلیق اور رات دن کے داعی انقلاب اس کی قدرت کاملہ اور توحید کے واضح دلائل ہیں، اگر ان چیزوں کی پیدائش اور بقا میں کسی دوسری ہستی کا کوئی دخل نہیں۔

اسی طرح پانی پر کشتیوں کا چلنا ایک بڑی آیت قدرت ہے، کہ پانی کو حق تعالیٰ نے ایسا جو ہر سال بنا دیا کہ زمین اور سیال ہونے لگا اس کی نیچے پر لاکھوں وزن کے جہاز بڑے بڑے وزن کو لے کر مشرق سے مغرب تک منتقل کر دیتے ہیں، اور ان کو حرکت میں لانے کے لئے ہواؤں کا چلانا اور پھراپنی حکمت کے ساتھ ان کے رخ بدلتے رہنا یہ سب اس کا پتہ دیتے ہیں کہ ان چیزوں کا پیدا کرنا اور چلانے والا کوئی بڑا عظیم و خیر اور بحیم ہے، اگر پانی کا مادہ سیال نہ ہو تو یہ کام نہیں ہو سکتا، اور مادہ سیال بھی ہو تو جب تک ہوائیں نہ چلیں جو ان جہازوں کو حرکت میں لاتی ہیں، جہازوں کا یہی ہی مسافیت ملے کر ناممکن نہیں، قرآن کریم نے اسی مضمون کو فرمایا،

إِن يَشَأْ يُسْكِنِ الرِّيحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِبَ عَلَيْهَا ظُهُورُهُمْ (۲۲: ۲۳)
اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو ہواؤں کو ساکن کر دینا
اور یہ جہاز سمندر کی پشت پر کھڑے کھڑے رہ جائیں۔

یَسَّيْفُ النَّاسِ کے لفظ میں اشارہ کر دیا گیا کہ بحری جہازوں کے ذریعہ ایک ملک کا سامان دوسرے ملک میں درآمد و برآمد کرنے کے ذریعہ عام انسانوں کے بے شمار فائدے ہیں جن کو شمار بھی نہیں کیا جاسکتا، اور یہ فائدے ہر زمانے ہر ملک میں نئی نئی صورتیں پیدا کر دیتے ہیں۔

اسی طرح آسمان سے پانی کو قطرہ قطرہ کر کے اس طرح نازل کرنا کہ اس سے کسی چیز کو نقصان نہ پہنچے، اگر سیلاب کی طرح آتا تو کوئی آدمی جانور، سامان کچھ نہ رہتا، پھر پانی برسنے کے بعد اس کا زمین پر محفوظ رکھنا، انسان کے بس کا نہیں، اگر کہہ دیا جاتا کہ چھ مہینہ کے پانی کا کوڑا اپنا اپنا ہر شخص رکھ لے، تو ہر شخص اس کے رکھنے کا کیا انتظام کرتا، اور کسی طرح رکھ بھی لیتا تو اس کو سڑنے اور خراب ہو جانے سے کیسے بچاتا، قدرت نے یہ سب انتظامات خود فرمادیے

ارشاد فرمایا:

كَأَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ عَلَاةٌ يَخْتَفُونَ
تَلْعَلْ يُرَوْنَ ۝ (۱۸: ۱۲)

تین ہم نے ہی پانی کو زمین کے اندر ٹھہرا دیا،
اگرچہ ہم اس کی بھی قدرت تھی کہ بارش کا
برسنے کے بعد بہہ کر ختم ہو جاتا۔

مگر قدرت نے پانی کو اہل زمین انسان اور جانوروں کے لئے کہیں کھلے طور پر تالابوں اور
حوضوں میں جمع کر دیا، کہیں پہاڑوں کی زمین میں پھیلی ہوئی دھوئیں کے ذریعہ زمین کے اندر تار دیا اور
پھر ایک غیر محسوس پائپ لائن ساری زمین میں بچا دی، ہر شخص جہاں چاہے کھود کر پانی نکال لیتا ہے
اور اسی پانی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ بحر منجمد بنا کر برت کی صورت میں پہاڑوں کے اوپر لا دیا جو
سڑنے اور خراب ہونے سے بھی محفوظ ہے، اور آہستہ آہستہ پھیل کر زمین کے اندر قدرتِ ربی
پائپ لائن کے ذریعہ پورے عالم میں پہنچتا ہے، غرض آیت مذکورہ میں قدرتِ کاملہ کے چند مظاہر
کا بیان کر کے توحید کو ثابت کیا گیا، علماء مفسرین نے ان تمام چیزوں پر تفصیلی بحث کی ہے،
دیکھتے جہاں، قلبی وغیرہ۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ

اور بعض لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اللہ کے برابر اوروں کو ان کی محبت ایسے رکھتے ہیں جیسے

كُتِبَ اللَّهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدَّ حُبًّا لِلَّهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ

محبت اللہ کی اور ایمان والوں کو ان سے زیادہ تر ہے محبت اللہ کی، اور اگر دیکھ لیں یہ

ظَلَمُوا أَذْ يَبْرُونَ الْعَذَابَ إِنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَإِنَّ اللَّهَ

ظالم اس وقت کو جبکہ دیکھیں گے عذاب کی قوت ساری اللہ ہی کے لئے ہے اور یہ کہ اللہ

شَدِيدُ الْعَذَابِ ۝

کا عذاب سخت ہے۔

رابطہ | ادھر کی آیات میں توحید کا اثبات تھا، آگے مشرکین کی غلطی اور وعید کا بیان فرماتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر | اور ایک آدمی وہ (بھی) ہیں جو علاوہ خدا تعالیٰ کے اوروں کو بھی شریک

(غدا) تشرار دیتے ہیں (اور ان کو اپنا کارساز سمجھتے ہیں اور) ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت
اللہ سے رکھنا ضروری ہے، (یہ حالت تو مشرکین کی ہے) اور جو مومن ہیں ان کو (صرف) اللہ تعالیٰ
کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے، (کہو) کہ اگر کسی مشرک کو یہ ثابت ہو جاوے کہ میرے معبود سے
مجھ پر کوئی ضرر چڑے گا تو فوراً محبت منقطع ہو جاوے، اور مومن باوجود اس کے کہ نافع و ضار
حق تعالیٰ ہی کو اعتقاد کرتا ہے، لیکن پھر بھی محبت درمیان اس کی باقی رہتی ہے، (و نیز اکثر مشرکین
مصیبت شدیدہ کے وقت اپنے شرکاء کو چھوڑ دیتے ہیں، اور مومنین من حیث الایمان
مصیبت میں بھی خدا کو نہ چھوڑتے تھے، اور محاورات میں ایسے قضایا باعتبار حالت غالبہ کے
بھی صادق ہوتے ہیں) اور کیا خوب ہوتا اگر یہ ظالم (مشرکین) جب (دنیا میں) کسی مصیبت
کو دیکھتے تو اس کے وقوع میں غور کر کے یہ سمجھ لیا کرتے کہ سب قوت حق تعالیٰ ہی کو ہے
اور (دوسرے سب اس کے سامنے عاجز ہیں، چنانچہ اس مصیبت کو نہ کوئی روک سکا نہ الٹ سکا
اور نہ ایسے وقت میں اود کوئی یاد رہا) اور اس مصیبت کی شدت میں غور کر کے یہ سمجھ لیا کرتے
کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب (آخرت میں) کہارا ہوا ہے اور بھی سخت ہوگا، (تو اس طرح غور کرنے
سے تراشیدہ معبودوں کا عجز اور حق تعالیٰ کی قدرت و عظمت منکشف ہو کر توحید و ایمان اختیار
کر لیتے)

إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوْا الْعَذَابَ

جب کہ ہزار ہو جاویں گے وہ کہ جن کی پیروی کی تھی ان سے جو کہ ان کے پیرو ہوتے تھے اور دیکھیں گے عذاب

وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ۝ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّا

اور منقطع ہو جاویں گے ان کے سب علاقے، اور کہیں گے یہ دیکھا ہوا جو ہم کو دنیا کی طرف

كُرِّهَ فَتَنَّا بِهِنَّ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا كَذَلِكَ يَرْتَمِيمُ اللَّهُ

لوٹ جانا بل جانا تو ہم ہمیں ہزار ہو جانے لگے جیسے یہ ہم سے ہزار ہو گئے، اسی طرح یہ دکھائے گا اللہ

أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ۝

ان کو ان کے کام حسرت دلائے گا اور وہ ہرگز نکلنے والے نہیں نار سے۔

رابطہ | ادھر عذابِ آخرت کو سخت فرمایا ہے آگے اس سخن کی کیفیت کا بیان فرماتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

(وہ سخت عذاب کی اس وقت معلوم ہوگی) جب کہ ان مشرکین میں سے (وہ لوگ) لوگ جن کے کہنے پر دوسرے (عوام) چلتے تھے، ان (عام) لوگوں سے صاف الگ ہو جائیں گے جو ان کے کہنے پر پڑے تھے اور سب (عوام و عوام) عذاب کا مشاہدہ کر لیں گے اور باہم ان میں جو تعلقات تھے وہ ایک تاج تھا اور سراسر متبوع تھا وغیرہ وغیرہ) اس وقت سب قطع ہو جائیں گے (جیسے دنیا میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ جرم میں سب شریک و متفق ہوتے ہیں اور نتیجہ معذرت کے وقت سب الگ الگ پچھا چاہتے ہیں، حتیٰ کہ باہدگر مشناخت تک کے منکر ہو جاتے ہیں) اور (جب) یہ تاج لوگ (مقبولین کی بطوطا پٹی دیکھیں گے تو بڑے جھجھکادیں گے، اور تو کچھ نہ ہوئے مگر جھک کر ایوں کہنے لگیں گے کسی طرح ہم سب کو (دنیا میں) بس ذرا ایک دفعہ جانا مل جاوے تو ہم بھی ان سے (امثالہ) تو لیں کہ اگر یہ پھر ہم کو اپنے تاج ہونے کی ترغیب دیں تو ہم بھی ان سے صاف (محکما) جواب دے کر) الگ ہو جائیں جیسا یہ ہم سے (اس وقت) صاف الگ ہو بیٹھے (اور کہیں کہ جناب آپ وہی ہیں کہ عین موقع پر بے رخی کی تھی اب ہم سے کیا غرض، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان تجویزوں اور سوچ بچاروں سے کیا ہاتھ آوے گا فقط) اللہ تعالیٰ یوں ہی (اکی) بد اعمال کو خالی اراک (کے پیرائے میں) کر کے ان کو دکھلا دیں گے اور ان (تابعین و متبوعین سب) کو درخش سے نکلا کس نصیبت ہوگا (کیونکہ شرک کی سزا خود فی النار ہے)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُلُوعَ

اے لوگو! کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے حلال پاکیزہ اور پیروی نہ کرو شیطان

الطَّيِّبِينَ إِنَّكُمْ لَكُمْ عَنْهُمْ بِالشُّوَرِ وَالْفَحْشَاءِ

کی بیشک وہ تمہارا دشمن ہے صریحاً وہ توہیں حکم کرے گا تم کو کہ بڑے کام اور جیانی کرو

وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۱۶۹﴾

اور جھوٹ لگاؤ اللہ پر وہ باتیں جن کو تم نہیں جانتے۔

خلاصہ تفسیر

(بعض مشرکین جنوں کے نام جانور چھوڑتے تھے، اور ان سے منتفع ہونے کو باعث) ان کی تعلیم کے حرام سمجھتے تھے اور اپنے اس فعل کو حکم الہی اور موجب رضائے حق و وسیلہ تقرب الی اللہ بواسلہ شفاعت ان بتوں کے سمجھتے تھے، حق تعالیٰ اس باب میں خطاب فرماتے ہیں کہ) اے لوگو! جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے (شرعی، حلال

پاک چیزوں کی نسبت اجازت ہو کر ان کو کھاؤ (برقو) اور ان میں سے کسی حلال چیز سے یہ کچھ کر پرہیز کرنا کہ اس سے اللہ راضی ہوگا یہ سب شیطانی خیالات ہیں تم شیطان کے قدم قدم مت چلو، فی الواقع وہ (شیطان) تمہارا صریح دشمن ہے وہ اپنے اپنے خیالات و خیالات سے تم کو خسران ابدی میں گرفتار کر رکھا ہے اور دشمن ہونے کی وجہ سے) وہ تم کو انہیں باتوں کی تعلیم کرے گا جو کہ (مشرعاً) بُری اور گندی ہیں، اور یہ (بھی) تعلیم کرے گا کہ اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاؤ جن کی تم سند بھی نہیں رکھتے (مثلاً یہی کہ ہم کو خدا تعالیٰ کا اس طرح حکم ہے)۔

معارف و مسائل

حلّ اللغات

حَلَّالٌ طَيِّبٌ، لفظ حَلَّال کے اصل معنی گرہ کھولنے کے ہیں، جو چیز انسان کے لئے حلال کر دی گئی ہو یا ایک گرہ کھول دی گئی اور پابندی ہٹا دی گئی، حضرت سہل بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ نجات تین چیزوں میں منحصر ہے، حلال کھانا، فراغت ادا کرنا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کرنا، اور لفظ طیب کے معنی ہیں پاکیزہ جس میں شرعی حلال ہونا بھی داخل ہو اور طبعی مرغوب ہونا بھی۔

خُطُوعٌ، خطوہ کی جمع ہے، اتنی مقدار کو خطوہ کہتے ہیں جو دونوں قدموں کے درمیان کا فاصلہ ہے، خلوۃ شیطان سے مراد شیطانی اعمال و افعال ہیں۔

الشُّوَرُ الْفَحْشَاءُ، سورہ وہ چیز جس کو دیکھ کر عقلمند شریف آدمی کو دکھ ہو، فحشاء، بے حیائی کا کام، بعض حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ سورہ سے مراد مطلق معصیت اور فحشاء سے مراد کبر و جفا ہے، اِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ شَيْطَانُكُمْ بِالسُّوَرِ وَالْفَحْشَاءِ، ایسا ہے جیسا حضرت عبد اللہ بن مسعود کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدم کے بیٹے کے قلب میں ایک شیطانی الہام داخل ہوتا ہے اور دوسرا فرشتہ کی طرف سے، شیطانی دوسرے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بڑے کام کرنے کے فوائد اور مصالح سامنے آتی ہیں، اور حق کو جھٹلانے کی راہیں کھلتی ہیں، اور الہام فرشتہ کا اثر خیر اور نیکی پر انعام و فلاح کا وعدہ اور حق کی تصدیق پر قلب کا مطمئن ہونا ہوتا ہے۔

مسئلہ: ساند وغیرہ جو بتوں کے نام پر پھوڑ دیئے جاتے ہیں، یا اور کوئی جانور عرفاء، بکرا وغیرہ کسی بزرگ یا اور کسی غیر اللہ کے نام زد کر دیا جاتا ہے، اس کا حرام ہونا بھی چار آیتوں کے بعد وَمَا أَهْلَ بِهِ بِغَيْرِ اللَّهِ کے تحت آنے والا ہے، اس آیت يَا أَيُّهَا النَّاسُ میں ایسے جانور کے حرام ہونے کی نفی کرنا منظور نہیں، جیسا کہ بعضوں کو شبہ ہو گیا بلکہ مقدس اس فعل کی حرمت و ممانعت ہے کہ

غیر اللہ کے تقرب کے لئے جانوروں کو چھوڑ دینا اور اس عمل کو موجب برکت و تقرب سمجھنا، اور ان جانوروں کو اپنے اوپر حسرام کر لینے کا معاہدہ کر لینا اس کو دائمی سمجھنا یہ سب افعال ناجائز اور انکار کرنا گناہ ہے۔

تو حاصل مطلب آیت کا یہ ہو کہ جن جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے حلال بنایا ہے ان کو بہتوں کے نام کر کے حرام نہ بناؤ، بلکہ اپنی حالت پر چھوڑ کر کھاؤ پیو، اور اگر ایسی حرکت چہالت سے ہو جائے تو اصلاح نیست کے ساتھ تجدید ایمان اور توبہ کر کے اس حرمت کو ختم کرو اس طرح ان جانوروں کو تعلیقاً حرام قرار دینا تو گناہ ہوا، مگر غیر اللہ کے نام پر کر دینے سے یہ مردار اور بغض کے حکم میں ہو گیا، نجاست کی وجہ سے حرمت ثابت ہو گئی۔

مسئلہ: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص نے چہالت یا عقلیت سے کسی جانور کو کسی غیر اللہ کے ساتھ نامزد کر کے چھوڑ دیا تو اس کی توبہ یہی ہے کہ اپنے اس خیال حرمت سے رجوع کرے اور اس فعل سے توبہ کرے، تو پھر اس کا گوشت حلال ہو جائے گا، واللہ اعلم۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا آَلْفَيْنَا

اور جب کوئی ان سے کہے کہ کتابعداری کرو اس حکم کی چونکہ نازل فرمایا اللہ نے تو کہتے ہیں ہرگز نہیں ہم تو باعداری

عَلَيْهِ آبَاءُ نَا وَلَا وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِسْرَاقًا أَوْ بَنَاتٍ

کرچہ انکی جس پر بچا ہم نے اپنے باپے ادوں کو بھلا اگرچہ ان کے باپا بے نہ کہتے ہرگز نہیں اور نہ جانتے ہوں سیدھی راہ،

وَمِثْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَفَرُوا بِالَّذِي يَتَّبِعُونَ بِمَا لَا يَمَعُ إِلَّا دُعَاءٌ

اور مثال ان کافروں کی ایسی ہر جیسے کافروں کوئی شخص ایسی چیز کو جو کچھ نہ تھے سوائے پکارنے

وَنِدَاءٌ مُّذْمُومٌ عَلَيْهِمْ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿١٤﴾

اور پکارنے کے بہرے گئے اندھے ہیں سورہ کچھ نہیں سمجھتے۔

خلاصہ تفسیر اور جب کوئی ان (مشرک) لوگوں سے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم (اپنے پیغمبر

کے پاس) بھیجا ہے اس پر چلو تو جواب میں کہتے ہیں (کہ نہیں) بلکہ ہم تو اسی (طریقہ) پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے (کیونکہ وہ لوگ اس طریقہ کے اختصار کرنے میں مامور من اللہ تھے، حق تعالیٰ ان پر تو فرماتے ہیں) کیا وہ حالت میں یہ لوگ اپنے باپ دادا ہی کے طریقہ پر چلیں گے)

اگرچہ ان کا باپ دادا (دین کی) نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ کسی آسمانی کتاب کی ہدایت رکھتے ہوں، وَمِثْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَفَرُوا بِالَّذِي يَتَّبِعُونَ، اور ان کافروں کی کیفیت (دافنی میں) اس (جانور) کی کیفیت کے مثل ہے (جس کا ذکر اس مثال میں کیا جاتا ہے) کہ ایک شخص ہے وہ ایسے (جانور) کے پیچھے چلا رہا ہے، جو بجز بلائے اور پکارنے کے کوئی (پرہیز) بات نہیں سنتا (اسی طرح) یہ کفار (بھی) ظاہری بات چیت تو سنتے ہیں، لیکن کام کی بات باطل، بہرے میں (مگر) سنا ہی نہیں (گوشے میں) کہ کبھی ایسی بات زبان ہی پر نہیں آتی (اندھے ہیں) کہ جو نفع نقصان نظری نہیں آتا (سو) جب سارے ہی جو اس شخص میں تو (سمجھتے) سمجھاتے (کچھ نہیں)۔

معارف مسائل

اس آیت سے جس طرح باپ دادوں کی اندس تقلید و اتباع کی مذمت ثابت ہوئی اسی طرح جائز تقلید و اتباع کے شرائط اور ایک ضابطہ بھی معلوم ہو گیا، جس کی طرف دو غفلتوں میں اشارہ فرمایا ہے لَا يَعْقِلُونَ اور لَا يَعْقِلُونَ، کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ ان آباء و اجداد کی تقلید و اتباع کو اس لئے منع کیا گیا ہے کہ انھیں عقل تھی نہ ہدایت، ہدایت سے مراد وہ احکام ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صریح طور پر نازل کئے گئے، اور عقل سے مراد وہ جو بذریعہ اجتہاد و تفویض شرعیہ سے مستنبط کئے گئے۔

تو وہ جن کے اتباع و تقلید کے حکم جواز کی یہ ہے کہ نہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے احکام ہیں اور نہ اس کی صلاحیت کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان سے احکام نکال سکیں، اس میں اشارہ پایا گیا کہ جن عالم کے متعلق یہ ایلینان ہو جائے کہ اس کے پاس مشرک و منست کاظم ہو اور اس کو درجہ اجتہاد بھی حاصل ہے کہ جو احکام صراحتہ قرآن و سنت میں نہ ہوں ان کو تفویض قرآن و سنت سے بذریعہ قیاس نکال سکتا ہے، تو ایسے عالم مجتہد کی تقلید و اتباع جائز ہے، نہ اس لئے کہ اس کا حکم ماننا اور اس کا اتباع کرنا ہے، بلکہ اس لئے کہ حکم اللہ کا ماننا اور اسی کا اتباع کرنا ہے، مگر چونکہ ہم براہ راست اللہ کے حکم سے واقف نہیں ہو سکتے، اس لئے کسی عالم مجتہد کا اتباع کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل ہو سکے۔

جاہلانہ تقلید اور اند مجتہدین اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ مطلق تقلیداً منہ مجتہدین کے خلاف کی تقلید میں فرق اس طرح کی آیات پڑھ دیتے ہیں وہ خود ان آیات کے صیح مدلول سے واقف نہیں۔

امام مشرطی نے اسی آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اس آیت میں تقلید آباء کے منوع ہونے

کا جو ذکر اس سے مراد باطل عقائد و اعمال میں آباء و اجداد کی تقلید کرنا ہے، عقائد صحیحہ و اعمال صالحہ میں تقلید اس میں داخل نہیں، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کلام میں ان دونوں چیزوں کی وضاحت سورہ یوسف میں اس طرح آئی ہے:

إِنِّي نَزَّيْتُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِلَّةً تَقْوِيَّةً لَّا يَدْعُو إِلَى الْيَتِيمِ وَلَا إِلَى الظُّلُمِ ۚ إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ ۚ قَدْ جَعَلْنَا لَكُمُ الْيَتِيمَ هَدًى وَابْتَدَأْتُ بِمِلَّةِ آبَائِي لِيُتِلَّ هَدًى ۖ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (۲۸-۳۰: ۱۲)

میر نے ان لوگوں کی ملت و مذہب کو چھوڑ دیا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، اور جو آخرت کے منکر ہیں، اور میں نے اتباع کیا اپنے آباء پر ایمان اس کی اور یعقوب کا۔

اس میں پوری وضاحت سے ثابت ہو گیا کہ آباء کی تقلید باطل میں حرام ہے، حتیٰ میں جائز بلکہ مستحسن ہے۔

امام سترطین نے اسی آیت کے ذیل میں ائمہ مجتہدین کی تقلید کے متعلق بھی مسائل و احکام بیان کئے ہیں اور فرمایا ہے،

تعلق قوم بحد و الآیة فی ذم التعلیل والی، و هذا فی الباطل صحیح اما التعلیل فی الحق فاصل من اصول الدین و عصمة من عصم المسانین یلجاء الیها الجاهل المقصر عن درک النظر (قوطلی ص ۱۸۳-۱۸۴)

کچھ لوگوں نے اس آیت کو تقلید کی بدست میں پیش کیا ہے اور یہ باطل کے معاملہ میں تو صحیح ہے، لیکن حق کے معاملہ میں تقلید سے اس کا کوئی تعلق نہیں، حتیٰ میں تقلید کرنا تو دین کے اصول میں سے ایک مستقل بنیاد ہے، اور مسلمانوں کے دین کی حفاظت کا بہت بڑا ذریعہ ہے کہ جو شخص اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتا وہ دین کے معاملہ سے تقلید ہی پر اعتماد کرتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا

اے ایمان والو! کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو روزی دی ہم نے تم کو اور شکر کرو اللہ کا

لِلَّهِ إِن كُنْتُمْ إِتَايَاهُ تَعْبُدُونَ ﴿۱۳۱﴾ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ

اگر تم اسی کے بندے ہو، اس نے تم پر بھی حرام کیا ہے مرنے والا جانور اور

الدَّمَ وَلَحْمَ الْخَيْزِرِ وَمَا آهَلَ بِهِ غَيْرُ اللَّهِ فَمَن اضْطُرَّ غَيْرَ

پرو اور مرگشت سور کا اور جس جانور پر ناک پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا پھر کوئی بے اختیار ہو جائے

بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۳۲﴾

نہ تو نافرمان نہ گناہ گزارا تو اس پر کچھ گناہ نہیں بیشک اللہ بڑا بخشنے والا نہایت مہربان

خلاصہ تفسیر

اور پر اہل طہیات کے معاملہ میں مشرکین کی غلطی بتلا کر ان کی اصلاح اس غلطی میں مشرکین کی موافقت ذکر کرنے لگیں اس کے ضمن میں اہل ایمان کو اپنے انعامات کا ذکر اور اس پر ادا سے شکر کی تعلیم بھی ہے۔

لئے ایمان والو! (ہماری طرف سے تم کو اجازت ہو کہ) جو شرع کی رو سے پاک چیزیں ہم نے تم کو مرحمت فرمائی ہیں ان میں سے (جو چاہو) کھاؤ (دروغہ) اور (اس اجازت کے ساتھ) پیو (جو کہ) حق تعالیٰ کی شکر گزاری کرو، (زبان سے بھی ہاتھ پاؤں سے خدمت و طاعت بجالا کر بھی اور دل سے ان نعمتوں کو منجانب اللہ سمجھ کر بھی) اگر تم خاص ان کے ساتھ غلامی کا تعلق رکھتے ہو (اور یہ تعلق ہو نامسلم اور ظاہری پس و پیش شکر بھی ثابت ہے)۔

رابطہ اور تو اس کا بیان تھا کہ حلال کو حرام مت کرو، آگے یہ مذکور ہوتا ہے کہ حرام کو حلال مت سمجھو، جیسا کہ مشرکین اس میں مبتلا تھے، مثلاً مردار جانور اور ایسے جانور جن کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، مشرکین ان کو کھایا کرتے تھے، اس سے منع کیا گیا، اسی کے ضمن میں یہ بھی بتلا دیا کہ اللہ کے نزدیک فلاں فلاں جانور حرام ہیں، ان کے سوا دوسرے جانور دن کو اپنی طرف سے حرام قرار دینا غلطی ہے، اس سے بچنے والوں کی تائید ہو گئی۔

اللہ تعالیٰ نے تم پر صرف (ان چیزوں کو) حرام کیا ہے اور ان چیزوں کو حرام نہیں کیا جن کو تم اپنی طرف سے حرام کر رہے ہو، جیسا کہ گذرا یعنی (مردار جانور) کو (جو باوجود واجب الذبح ہونے کے بلا ذبح شرعی مر جاوے) اور خون کو (جو بہتا ہو) اور قتر پر کے گوشت کو (اسی طرح اس کے سب اجزاء کو بھی) اور ایسے جانور کو جو (بقصد تقرب) غیر اللہ کے نام پر ذبح کر دیا گیا ہو (ان سب کو بیشک حرام کیا ہے) پھر بھی (اس میں اتنی آسانی رکھی ہے کہ) جو شخص (جو کسے بہت ہی) بیتاب ہو جائے، بشرطیکہ نہ قور کھانے میں) طالب لذت ہو، اور نہ (قدر ضرورت و حاجت سے) تجاوز کرنے والا ہو تو (اس حالت میں ان چیزوں سے کھانے میں بھی) اس شخص پر کچھ گناہ نہیں ہوتا، واقعی اللہ تعالیٰ پس بڑے غفور رحیم کہ ایسے وقت میں یہ رحمت مقرر فرمائی کہ گناہ کی چیز میں بھی گناہ (اثم) نہ دیا)

معارف و مسائل

حلال کھانے کی برکت اور آیات مذکورہ میں جیسے حرام کھانے کی ممانعت کی گئی ہے اسی طرح حرام کھانے کی نغوت حلال طیب چیزوں کے کھانے اور اس پر شکر گزار ہونے کی ترغیب بھی ہے، کیونکہ جس طرح حرام کھانے سے اخلاقِ رذیلہ پیدا ہوتے ہیں، عبادت کا ذوق جاگرتا ہے، دعا قبول نہیں ہوتی، اسی طرح حلال کھانے سے ایک نور پیدا ہوتا ہے، اخلاقِ رذیلہ سے نفرت، اخلاقِ فاضلہ کی رغبت پیدا ہوتی ہے، عبادت میں دل لگتا ہے، گناہ سے دل گھبراتا ہے، دعا قبول ہوتی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے سب رسولوں کو یہ ہدایت فرمائی ہے،

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَلَا تَمْشُوا فِي الْأَرْضِ فَرِحًا وَلَا كَانًا ۚ (۵۱:۳۳)

اور نیک عمل کرو

اس میں اشارہ ہے کہ نیک عمل کرنے میں رزقِ حلال کو بڑا دخل ہے، اسی طرح قبولِ دعا میں حلال کھانا معین اور حرام مانع قبول ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہت سے لوگ طویل سفر پریشان حال اللہ کے سامنے دعا کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں، اور یارب یارب کہتے ہیں، مگر کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس ان کا حرام، غذا ان کی حرام، ان حالات میں ان کی دعا کہاں قبول ہو سکتی ہے (صحیح مسلم، ترمذی، از ابن کثیر)

إِنَّمَا حَرَّمَ مُكْرًا ۖ لَّيْسَ فِيهِ مَأْكُلٌ وَلَا شَرَابٌ ۚ (۱۷۳:۲)

اس لئے آیت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف وہ چیزیں حرام کی ہیں، جن کا آگے ذکر کیا جاتا ہے، اس کے سوا کچھ حرام نہیں، اس آیت میں تو لفظ اِنَّمَا سے اس کی طرف اشارہ ہوا، اور دوسری آیت میں اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ یہ بھی آیا ہے، قُلْ لَا أَجِدُ فِتْنَةً أَوْذَىٰ بِإِيٍّ مُّخْتَرًا عَلَىٰ طَائِفَةٍ مِّنْهُمْ ۚ (۱۷۵:۲)

اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ اعلان کر دیں کہ میری وحی میں مجسّر ان چند چیزوں کے جن کا ذکر آگے کیا گیا ہے، اور کوئی چیز حرام نہیں۔

مگر اس پر اشکال یہ ہو کہ دوسری آیات قرآنہ اور احادیث نبویہ سے ان چند چیزوں کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں کی حرمت ثابت ہے، تو یہ حصر اور حرمت نامہ ہی کی نفی کیسے درست ہوگی؟

جواب یہ ہو کہ یہاں مطلق حلال و حرام کا بیان نہیں، بلکہ ان مخصوص جانوروں کی حالت و حرمت کا بیان ہے جن کے بارے میں مشرکین مگر اپنے مشرکانہ عقائد کی غلطیاں کیا کرتے تھے، پھل آیت میں اس کی وضاحت آچکی ہے کہ بہت سے حلال جانوروں کو مشرکین حرام سمجھ لیتے

تھے، یا اپنے اور پر حرام کر لیتے تھے، اس کی مخالفت کی گئی تھی، اس کے بالمقابل یہاں یہ بتلایا گیا کہ اللہ کے نزدیک فلاں فلاں جانور حرام ہیں جن سے تم جتناب نہیں کرتے، اور جو اللہ کے نزدیک حلال ہیں ان سے پرہیز کرتے ہو، اس لئے اس جگہ حصر مطلق نہیں، بلکہ اضافی ہے مشرکانہ عقائد کے بالمقابل۔

آگے اس آیت میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے، وہ چار چیزیں یہ ہیں: مینہ (مردار)، خون، لحم خنزیر، وہ جانور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، پھر چاروں چیزوں کی مزید تشریحات خود قرآن کریم کی دوسری آیات اور احادیث صحیحہ میں آئی ہیں جن کو ملائے کے بعد ان چاروں چیزوں کے احکام حسب ذیل ہیں، ان کو کسی قدر تفصیل سے لکھا جاتا ہے۔

مینہ جس کو ارد میں مردار کہتے ہیں، اس سے مراد وہ جانور ہے جس کے حلال ہونے کے لئے از روئے شرع ذبح کرنا ضروری ہے، مگر وہ بغیر ذبح کے خود بخود مر جائے، یا گلا گھونٹ کر یا کسی دوسری طرح چوٹ مار کر مار دیا جائے تو وہ مردار اور حرام ہے، لیکن خود قرآن کریم کی دوسری آیت اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ (۹۶:۵) سے معلوم ہوا کہ دریائی جانور کے لئے ذبح کرنا شرط نہیں، وہ بلا ذبح بھی جائز ہے، اس بناء پر احادیث صحیحہ میں مچھلی اور مڈھی کو مینہ کے مستثنیٰ قرار دے کر حلال کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہمارے لئے دو مردار حلال کر دیئے گئے، ایک مچھلی دوسرے مڈھی، اور دو خون حلال کر دیئے گئے، جگر اور طحال (ابن کثیر از احمد، ابن ماجہ، دارقطنی)

معلوم ہوا کہ جانوروں میں سے مچھلی اور مڈھی بغیر ذبح کے حلال ہیں، خواہ وہ خود مر جائیں یا کسی کے مارنے سے مر جائیں، البتہ جو مچھلی سڑ جانے کی وجہ سے خود پانی کے اوپر آ جائے وہ حرام ہے (رحماص)

اسی طرح وہ شکاری جانور جو قابو میں نہیں کہ ذبح کر لیا جائے اور اس کو بھی بسم اللہ پڑھ کر تیردغیر و دھار دار چیز سے زخم لگا دیں تو بغیر ذبح کے حلال ہو جاتا ہے، مطلقاً زخمی ہو جانا کافی نہیں، کسی آلہ جارح تیز دھار سے زخمی ہونا شرط ہے۔

مسئلہ: ہندو کی گولی سے شکار ہندو کی گولی سے شکار

تو وہ ایسا ہے جیسے پتھر یا لٹھی مارنے سے مر جائے، جس کو قرآن کریم کی دوسری آیت میں مَوْثُودٌ کہا گیا ہے، اور حرام قرار دیا ہے، ہاں مرنے سے پہلے اس کو ذبح کر لیا جائے تو حلال ہو جائیگا۔

مسئلہ: آجکل ہندو کی ایک گولی نوکدار بنائی گئی ہے، اس کے متعلق بعض ماہر کا خیال ہے کہ تیر کے حکم میں ہے، مگر جمہور علماء کے نزدیک یہ بھی تیر کی طرح آلہ جارح نہیں

بلکہ غارتگری جس سے بارود کی طاقت کے ذریعہ گوشت پھٹ جاتا ہے، در نہ خود اس میں کوئی دھار نہیں جس سے جانور زخمی ہو جائے اس لئے ایسی گولی کا شکار بھی بغیر رنج کے جائز نہیں۔
مسئلہ: آیت مذکورہ میں مطلقاً میتہ کو حرام قرار دیا ہے، اس لئے جس طرح اس کا گوشت کھانا حرام ہے اس کی خرید و فروخت بھی حرام ہے، یہی حکم تمام نجاسات کا ہے کہ جیسے ان کا استعمال حرام ہے اُن کی خرید و فروخت اور ان سے نفع اٹھانا بھی حرام ہے۔ یہاں تک مردار جانور یا ناپاک کوئی چیز یا اختیار خود جانور کو کھلانا بھی جائز نہیں، ہاں ایسی جگہ رکھ دے جہاں سے کوئی کتابی خود کھالے، یہ جائز ہے، مگر خود اٹھا کر ان کو کھلانا جائز نہیں۔
 (جصاص، قربلی وغیرہ)

مسئلہ: اس آیت میں میتہ کے حرام ہونے کا حکم عام معلوم ہوتا ہے، جس میں میتہ کے تمام اجزاء شامل ہیں، لیکن دوسری آیت میں اس کی تشریح علی غلظہ قطعہ کے الفاظ کر دی گئی ہے جس سے معلوم ہوا کہ مردار جانور کے وہ اجزاء حرام ہیں جو کھانے کے قابل ہیں، اس لئے مردار جانور کی ہڈی، بال جو کھانے کی چیز نہیں وہ پاک ہیں، اور ان کا استعمال جائز ہے، آیت قرآن کریم میں اَصْنُوا فَنَافَعَهَا وَابْرَأْهَا وَأَشْرَاهَا آثَانًا وَمَتَاعًا لِلْحَيٰۤیِیْنَ (۸۰: ۱۶) میں اُن جانوروں کے بالوں کو مطلقاً جائز الا منتفع قرار دیا ہے ذبیحہ کی شرط نہیں (جصاص)۔ کھال پر چونکہ خون وغیرہ کی نجاست لگی ہوتی ہے اس لئے وہ دباغت سے پہلے حرام ہے، مگر دباغت دینے کے بعد حلال اور جائز ہے، احادیث صحیحہ میں اس کی مزید تصریح موجود ہے (جصاص)۔
مسئلہ: مردار جانور کی چربی اور اس سے بنائی ہوئی چیزیں بھی حرام ہیں، ان کا استعمال کسی طرح سے جائز نہیں، اور خرید و فروخت بھی حرام ہے۔

مسئلہ: یورپ وغیرہ سے آئی ہوئی چیزیں مابون وغیرہ جن میں چربی استعمال ہوتی ہے، ان سے پرہیز کرنا احتیاط ہے، مگر مردار کی چربی ہونے کا علم یقینی نہ ہونے کی وجہ سے گنجائش ہے، نیز اس وجہ سے بھی کہ بعض صحابہ کرام ابن عمر، ابوسعید خدری، ابو موسیٰ اشعری نے مردار کی چربی کا صرف کھانے میں استعمال حرام قرار دیا ہے، خارجی استعمال کی اجازت دی ہے، اس لئے اس کی خرید و فروخت کو بھی جائز رکھا ہے۔ (جصاص)

مسئلہ: دودھ کا بغیر پلانے میں ایک چیز استعمال کی جاتی ہے، جس کو عربی زبان میں اَنْفَر کہا جاتا ہے، یہ جانور کے پیٹ سے نکالی جاتی ہے، اس کو دودھ میں شامل کرنے سے دودھ جم جاتا ہے۔ اب اگر یہ جانور اللہ کے نام پر ذبح کیا ہو تو اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں، مذبح جانور کا گوشت چربی وغیرہ سب حلال ہیں، لیکن غیر مذبح جانور کے پیٹ سے لیا جائے تو اس

میں فقہاء کا اختلاف ہے، امام عظیم ابو حنیفہ اور امام مالک اس کو پاک قرار دیتے ہیں، لیکن صاحبین امام ابو یوسف و محمد اور ثوری وغیرہ اس کو ناپاک کہتے ہیں۔ (جصاص، قربلی)
 یورپ اور روس کے غیر اسلامی ملکوں سے جو بغیر بنا ہوا آتا ہے اس میں غیر مذبح جانور کا انفر استعمال ہونے کا احتمال غالب ہے، اس لئے جمہور فقہاء کے قول پر اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔ امام عظیم اور امام مالک کے قول پر گنجائش ہے، ہاں یورپ سے آئے ہوئے بعض غیر ایسے بھی ہیں جن میں خنزیر کی چربی استعمال ہوتی ہے، اور ذبح پر لکھا ہوا ہوتا ہے، وہ قطعاً حرام اور نجس ہیں۔

خون کے مسئلہ: دوسری چیز جو آیت مذکورہ میں حرام قرار دی گئی ہے وہ خون ہے لفظ دم بمعنی خون شامل اس آیت میں اگرچہ مطلق ہے، مگر سورۃ انعام کی آیت میں اس کے ساتھ مَشْفُوْحٌ یعنی بہنے والا ہونے کی شرط ہے، اَوْ ذَمًا مَشْفُوْحًا (۱۴۰: ۱۵) اس لئے باتفاق فقہاء خون منجھ جیسے گردہ، تلی وغیرہ وہ حلال اور پاک ہیں۔

مسئلہ: جب کہ حرام صرف بہنے والا خون ہے تو جو خون ذبح کے بعد گوشت میں لگا رہ جاتا ہے وہ پاک ہے، فقہاء و صحابہ و تابعین اور امت کا اس پر اتفاق ہے، اسی طرح بھرا، مکھی، مکمل وغیرہ کا خون بھی ناپاک نہیں، لیکن زیادہ ہو جائے تو اس کو بھی دھونا چاہئے (جصاص)۔
مسئلہ: جس طرح خون کا کھانا پینا حرام ہے، اسی طرح اس کا خارجی استعمال بھی حرام ہے، اور جس طرح تمام نجاسات کی خرید و فروخت بھی اور اس سے نفع اٹھانا حرام ہے، اسی طرح خون کی خرید و فروخت بھی حرام ہے، اس سے حاصل کی ہوئی آمدنی بھی حرام ہے، کیونکہ الفاظ قرآنی میں مطلقاً دم کو حرام فرمایا ہے، جس میں اس کے استعمال کی تمام صورتیں شامل ہیں۔

مریض کو دوسرے کا خون: تحقیق اس مسئلہ کی یہ کہ انسان کا خون انسان کا جز ہے، اور جب بدل دینے کا مسئلہ سے نکال لیا جائے تو وہ نجس بھی ہے، اس کا اصل تعاضل تو یہی ہے کہ ایک انسان کا خون دوسرے کے بدن میں داخل کرنا اور وجہ سے حرام ہوا، اول اس لئے کہ اعضاء انسانی کا احترام واجب ہے، اور یہ اس احترام کے منافی ہے، دوسرے اس لئے کہ خون نجاست غلیظہ ہے اور نجس چیزوں کا استعمال ناجائز ہے۔

لیکن اضطراری حالات اور عام معالجات میں شریعت اسلام کی دی ہوئی ہولتوں میں غور کرنے سے امور ذیل ثابت ہوتے ہیں۔
 اول یہ کہ خون اگرچہ جزء انسانی ہے، مگر اس کو کسی دوسرے انسان کے بدن میں منتقل

کرنے کے لئے اعضاء انسانی میں کاٹ چھانٹ اور آپریشن کی ضرورت پیش نہیں آتی، بجائے
کے ذریعہ خون نکالا اور دوسرے کے بدن میں ڈالا جاتا ہے، اس لئے اس کی مثال دودھ کی سی
ہو گئی جو بدن انسانی سے بغیر کسی کاٹ چھانٹ کے نکلتا اور دوسرا انسان کا جز بنتا ہے اور
شریعت اسلام نے بچہ کی ضرورت کے پیش نظر انسانی دودھ ہی کو اس کی غذا قرار دیا ہے،
اور ماں پر اپنے بچوں کو دودھ پلانا واجب کیا، جب تک وہ بچوں کے باپ کے نکاح میں رہے
طلاق کے بعد ماں کو دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، بچوں کا رزق ہیا کرنا باپ کی
ذمہ داری ہے، وہ کسی دوسری عورت سے دودھ پلاوے، یا ان کی ماں ہی کو معاوضہ دے کر
اس سے دودھ پلاوے، قرآن کریم میں اس کی واضح تصریح موجود ہے:

فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَالْوَدَّعْنَ
أُجُورَهُنَّ ۚ (۶۵: ۶۶)

خلاصہ یہ ہے کہ دودھ جز انسانی ہونے کے باوجود بوجہ ضرورت اس کے استعمال کی
اجازت بچوں کے لئے دی گئی ہے، اور علاج کے طور پر بڑوں کے لئے بھی، جیسا کہ عالمگیری
میں ہے:

وَلَا يَأْتِي بَأْسَ أَنْ يَنْعَطَ الرَّجُلُ
يَلْبَسَ الْمَرْأَةَ دُبُرًا ۖ لِذَلِكَ مَا
(عالمگیری، ص ۳)

اور مفتی ابن تہامہ میں اس مسئلہ کی مزید تفصیل مذکور ہے (مغنی کتاب البیہودۃ ص ۶۱۲)
اگر خون کو دودھ پر قیاس کیا جائے تو کچھ بعید از قیاس نہیں، کیونکہ دودھ بھی خون
کی بدلی ہوئی صورت ہے، اور جز انسانی ہونے میں مشترک ہے، فرق صرف یہ ہے کہ دودھ
پاک ہو اور خون ناپاک، توحیدیت کی پہلی وجہ یعنی جز انسانی ہونا تو یہاں وجہ ممانعت نہ
رہی، صرف نجاست کا معاملہ رہ گیا، علاج دروازے کے معاملہ میں بعض فقہاء نے خون کے
استعمال کی بھی اجازت دی ہے۔

اس لئے انسان کا خون دوسرے کے بدن میں منتقل کرنے کا شرعی حکم یہ معلوم ہوتا ہے
کہ عام حالات میں تو جائز نہیں، مگر علاج و دوا کے طور پر اس کا استعمال اضطراری
حالت میں بلاشبہ جائز ہے، اضطراری حالت سے مراد یہ ہے کہ مریض کی جان کا خطرہ ہو اور کوئی
دوسری دوا اس کی جان بچانے کے لئے مؤثر یا موجود نہ ہو، اور خون دینے سے اس کی جان بچے گا
غالب ہوا ان مشروطوں کے ساتھ خون دینا تو اس نفس بشری کی مدد سے جائز ہے، جس میں غصہ

کے لئے مردار جانور کھا کر جان بچانے کی اجازت صراحت مذکور ہے، اور اگر اضطراری حالت نہ ہو
یاد دہری دوا میں بھی کام کر سکتی ہوں تو ایسی حالت میں مسئلہ مختلف تھا ہے، بعض فقہاء کے
نزدیک جائز ہے، بعض ناجائز کہتے ہیں، جس کی تفصیل کتب فقہ بحث تداوی بالمحرم میں مذکور
ہو، واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم، اس کا ایک مستقل رسالہ بھی اس موضوع پر شائع ہو گیا ہے، جس کا نام ہے
معائنۃ انسان کی پیوندکاری، اس کو ملاحظہ فرمایا جائے۔

محرم خنزیر

تیسری چیز جو اس آیت میں حرام کی گئی ہے وہ لحم خنزیر ہے، آیت میں حرمہ
خنزیر کے ساتھ لحم کی قید مذکور ہے، امام شریعت نے فرمایا کہ اس لئے فقہاء
لحم یعنی گوشت کی تخصیص نہیں، بلکہ اس کے تمام اجزاء ہڈی، کھال، بال، چٹھے سب ہی باجماع
حرام ہیں، لیکن لفظ لحم بڑھا کر اشارہ اس طرف ہے کہ خنزیر دوسرے حرام جانوروں کی طرح
نہیں ہے، کہ وہ ذبح کرنے سے پاک ہو سکتے ہیں، اگرچہ کھانا حرام ہی ہے، کیونکہ خنزیر کا گوشت
ذبح کرنے سے بھی پاک نہیں ہوتا، کہ وہ نجس العین بھی ہے حرام بھی، صرف جڑا سنے کے لئے اس
کے بال کا استعمال حدیث میں جائز قرار دیا ہے (جصاص، قرطبی)

مَا أَهْلَ بِهِ لَعْنَةُ اللَّهِ

جو نعتی چیز جس کو آیت میں حرام قرار دیا گیا ہے وہ جانور ہے جو
کی تین صورتیں
غیر اللہ کے لئے نامزد کر دیا گیا ہو، جس کی تین صورتیں متعارف ہیں
اول یہ کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لئے ذبح کیا جائے، اور بوقت ذبح اسی غیر اللہ
کا نام لیا جائے، یہ صورت باتفاق و باجماع ائمہ حرام ہے، اور یہ جانور میت ہے، اس کے
کسی جسٹ سے انتفاع جائز نہیں، کیونکہ یہ صورت آیت مَا أَهْلَ بِهِ لَعْنَةُ اللَّهِ کا مدلول صریح ہے
جس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کو تقرب الی غیر اللہ کے لئے ذبح کیا جائے، یعنی اس کا
خون بہانے سے تقرب الی غیر اللہ مقصود ہو، لیکن بوقت ذبح اس پر نام اللہ ہی کا لیا جائے
جیسے بہت سے نادان مسلمان بزرگوں پیروں کے نام پر ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے
بکرے، مرغے وغیرہ ذبح کرتے ہیں، لیکن ذبح کے وقت اس پر نام اللہ ہی کا پکارتے ہیں، یہ
صورت بھی باتفاق فقہاء حرام اور مذہب مردار ہے۔

مگر تخریج دلیل میں کچھ اختلاف ہے، بعض حضرات مفسرین رفتار نے اس کو بھی
نااہل پر بغیر اللہ کا مدلول صریح قرار دیا ہے، جیسا کہ حاشی بیضاوی میں ہے:

فَكُلْ مَا تَدْعِي عَلَيْهِ وَيُعْبَدُ ۖ لَوْلَا اللَّهُ لَفَنَ
اللَّهُ فَهُوَ حَرَامٌ وَإِنْ دُعِيَ

ہر وہ جانور جس کو غیر اللہ کے نام کر دیا گیا
وہ حرام ہے، اگرچہ بوقت ذبح اللہ ہی کا

بِاسْمِ اللَّهِ تَعَالَى حَيْثُ أَتَجَمَّ
الْعُلَمَاءُ لَوْ أَنَّ مُسْلِمًا ذَبَحَ
ذَبِيحَةً وَفَصَدَّ بِهَا بَعْضَ
الْقُرْبَى إِلَى غَيْرِ اللَّهِ صَارَ
مُرْتَدًّا وَذَبِيحَتُهُ ذَبِيحَةُ مُرْتَدٍّ

نیز در مختار کتاب الفہام میں ہے:

ذِكْرُ يَعْقُوبَ وَهُوَ إِسْمَاعِيلُ يُحْيِي
مَوَاتِدَ قَوْمِ الْعِظَمَاءِ يُحْيِي
لِأَنَّهُ أَهْلٌ بِهِ لَعَنَ اللَّهُ ذِكْرُ
ذِكْرُ اسْمِ اللَّهِ وَآقَرُهُ الشَّيْءُ

نام لیا ہوا اس لئے کہ علماء فقہاء کا اتفاق ہے کہ کسی جانور کو غیر اشد کے قریب کے لئے اگر کوئی مسلمان ذبح کرے تو وہ مرتد ہو جاوے گا، اور اس کا ذبیحہ مرتد کا ذبیحہ کہلاتے گا۔

”کبھی امیر پڑے کے آٹھ پچانوڑ ذبح کیا
تو وہ حرام ہو گا، کیونکہ وہ ماہ اہل بہ نثر
اللہ میں داخل ہے، اگرچہ بوقت ذبح
اللہ ہی کا نام لیا ہو۔ اور شامی نے

اور بعض حضرات نے اس صورت کو غائب پر بغیر اللہ کا مدلول صرف تو نہیں کیا بلکہ وہ بحیثیت عربیت تکلف کے خالی نہیں، مگر بوجہ اشتراک علت یعنی تقرب الی غیر اللہ کی نیست کے اس کو بھی غائب پر بغیر اللہ کے ساتھ ملحق کر کے حرام قرار دیا ہے، احقر کے نزدیک یہی درجہ احط اور اسلم ہے۔

نیز اس صورت کی حرمت کے لئے ایک مستقل آیت بھی دلیل ہے، یعنی وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ نُصْبُہٗ اُنَّ تَمَامٌ حِیْزُوْنَ کو کہا جاتا ہے، جن کی باطل طور پر پرستش کی جاتی ہے، یعنی یہ ہیں کہ وہ جانور جسکو مہجودات باطلہ کے لئے ذبح کیا گیا ہے، اس سے پہلے وَمَا اُھِلَّ بِہٖ لِخَیْرِ الشَّعْرِ کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مَا اُھِلَّ کا مدلول صریح تو وہی جانور ہے جس پر بوقت ذبح غیر اللہ کا نام لیا گیا، اور ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ (۳۵) کے المقابل آیا ہے، جن میں غیر اللہ کے نام لینے کا ذکر نہیں، صرف ہوں وغیرہ کی خوشنودی کی نیت سے ذبح کرنا اور ہر اس میں وہ جانور بھی داخل ہیں جن کو ذبح تو کیا گیا ہے غیر اللہ کے تقرب کے لئے مگر بوقت ذبح

عقدہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر محض ذبح کے عمل سے کسی بڑے کی تعظیم مقصود ہو تو یہ حرام ہے، لیکن اگر قصد بہانی کرنا ہو اور اس بہانی کیلئے جانور ذبح کیا جائے، یعنی اس کا گوشت بہان کو کھلانا مقصود ہو، محض ذبح کے عمل سے تعظیم مقصود نہ ہو تو یہ سنت ضیافت ہے اور جواز ہے اور دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ دوسری صورت میں عزیزی کیلئے گوشت حاصل ہوتا ہے اور پہلی صورت میں تعظیم کی علامت کے طور پر جانور کو ذبح کرنا مقصود ہوتا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کا گوشت کھایا جائے یا نہیں، چنانچہ دیکھنا میں آگے ہی وضاحت کی گئی ہے: ولو ذبح للضعیف لایحرم لافہ سنۃ الخلیل راکم الضیف اکرام اللہ تعالیٰ. والقادق أنه إن قد مہا لیا کل منہا کان الذبح للذہ والمنفوع للضعیف أو للولیہ أو للرحیم مہا لیا کل منہا بل یدفعہا للذہ یا کان للتعظیم غیر اللہ تعظیم علامہ شافعیؒ نے اس کی شرح میں مزید تشریح فرمادی ہے (رد المحتار ص ۳۰۹ و ۳۱۰) ۱۶۵ محمد اقبال شاہی ۳۰۹ و ۳۱۰

اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے۔ (افادہ شہین عظیم الامت)

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے، اُن کی عبارت یہ ہے:

وَجَزَّ عَادَةُ الْعَرَبِ بِالْقِيَاحِ
يَأْسِرُ الْمُقْصُودَ بِالنَّيْجَةِ وَطَبَّ
ذَلِكَ فِي إِسْتِعْمَالِهِمْ حَتَّى غَبَرَ
بِهِ عَنِ النِّيَّةِ الَّتِي هِيَ عِلَّةُ
التَّخَرُّجِ (تفسير قرآن ص ٢٥٨)

عرب کی مارت تھی کہ جس پہلے زوج کرنا مقصود
ہو تا زوج کر چکے وقت اس کا نام بلند آواز سے
پکارتے اور یہ واقع ان میں عام تھا یہاں تک کہ
اس آیت میں تقرب الیٰ ہذا اللہ کو جو کہ محل طہت
غریم ہوا جل کے لفظ سے تعبیر کر دیا ۔

امام مسلمان نے اپنی اس تحقیق کی بنیاد صحابہ کرامؓ میں سے دو حضرات حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے فتاویٰ پر رکھی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں فرزدق شاعر کے رباب غالب نے ایک اونٹ مار بیچ
 کیا تھا، جس پر کسی غیر اللہ کا نام لینے کا کوئی ذکر نہیں، مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کو بھی
 مَآکِلٌ یَغْذِرُ اللہُ بِہِمْ میں داخل قرار دے کر حرام فرمایا، اور سب صحابہ کرام نے اس کو قبول
 کیا، اسی طرح امام مسلم کے شیخ یحییٰ بن یحییٰ کی سند سے صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک طویل حدیث
 نقل کی، جس کے آخر میں ہے کہ ایک عورت نے حضرت صدیقہ سے سوال کیا کہ اُمّ المؤمنین! یہاں
 ہمارے کچھ رضاعی رشتہ دار بھی لوگوں میں سے ہیں، اور ان کے یہاں تو روز روز کوئی نہ کوئی تہوار
 ہوتا رہتا ہے، یہ اپنے تہواروں کے دن کچھ ہدیہ تحفہ ہمارے پاس بھی بھیج دیتے ہیں، ہم اس کو کھائیں
 یا نہیں؟ اس پر صدیقہ عائشہ نے فرمایا:

آمَنَّاؤُ بِحَقِّ الْيَوْمِ فَلَا
 تَأْكُلُوهُ وَلَكِنْ كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِمْ
 (تفسیر طبری ص ۲۰۰ ج ۲)

سچو جانور اس عید کے دن کے لئے زبحہ کیا گیا
 وہ نہ کھاؤ، لیکن اُن کے درختوں کے پھل
 وغیرہ کھا سکتے ہو

سچو جانور اس عید کے دن کے لئے زچ کیا گیا
وہ نہ کاڑا، لیکن اُن کے درختوں کے پھل
درغیر کھا سکے۔ ہو۔

الغرض یہ صورت ثانیہ جس میں نیست تو تقرب الی غیر اللہ کی ہو مگر ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جائے، اول تو اشتراک علت یعنی نیست تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے مَا أَهْلًا بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ کے حکم میں ہو، دوسرے آیت وَمَا ذُيِّقَ عَلَى النُّصُبِ کا بھی مدلول ہے کہ یہ بھی حرام ہے۔

تیسری صورت یہ ہو کہ کسی جانور کو کان کاٹ کر یا کوئی دوسری ملامت لگا کر تقرب الی غیر اللہ اور تعظیم غیر اللہ کے لئے چھوڑ دیا جائے، نہ اس سے کام لیں اور نہ اس کے ذبح کرنے کا قصد ہو، بلکہ اس کے ذبح کرنے کو حرام جانیں، یہ جانور مَا أَهْلًا بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ اور مَا ذُيِّقَ عَلَى النُّصُبِ دونوں میں داخل نہیں، بلکہ اس قسم کے جانور کو بحیرہ یا سائبہ وغیرہ کہا جاتا ہو، اور حکم ان کا یہ ہو کہ یہ فعل تو بنصِ شرع حرام ہے، جیسا کہ آیت مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ بَهِيمٍ

—

وَلَا تَسْكَبُ عَلَيْهِ (۴۳:۵) میں انشاء اللہ تعالیٰ آئے گا۔

مگر ان کے اس حرام عمل سے اور اس جانور کو حرام سمجھنے کے عقیدہ سے یہ جانور حرام نہیں ہو جاتا بلکہ اس کو حرام سمجھنے میں تو ان کے عقیدہ باطلہ کی تائید و تقویت ہوتی ہے، اس لئے یہ جانور عام جانوروں کی طرح حلال ہے۔

مگر شرعی اصول کے مطابق یہ جانور اپنے مالک کی ملک سے خارج نہیں ہوا، اسی کا ملوک ہے، اگرچہ وہ اپنے غلط عقیدہ سے یہ سمجھتا ہے کہ میری ملک سے نکل کر غیر اللہ کے لئے وقف ہو گیا، مگر شرعاً اس کا یہ عقیدہ باطل ہے، وہ جانور بدستور اس کی ملک میں ہے۔ اب اگر وہ شخص خود اس جانور کو کسی کے ہاتھ فروخت کر دے یا ہبہ کر دے تو اس کے لئے یہ جانور حلال ہے، جیسا بکثرت ہندو اپنے دیوتاؤں کے نام پر لگانے وغیرہ اپنے نزدیک وقف کر کے چڑھتے ہیں، ہندو کچھ لڑکچڑکے بننا چاہتے ہیں جو چاہیں کریں، یہ ہندوؤں کے بھاری اُن کو مسلمانوں کے ہاتھ بھی فروخت کر دیتے ہیں۔

یہ اسی طرح بعض جاہل مسلمان بھی بعض مزارات پر ایسا ہی عمل کرتے ہیں، کہ بکرا، بامرغا چھوڑ دیتے ہیں، اور مزارات کے تجارین کو خستیاں دیتے ہیں وہ ان کو فروخت کر دیتے ہیں، تو جو لوگ ان جانوروں کو اُن لوگوں سے خرید لیں جن کو اصل مالک نے اختیار دیا ہے ان کے لئے ان خریدنا اور ذبح کر کے کھانا اور فروخت کرنا حلال ہے۔

نذر غیر اللہ کا مسئلہ یہاں ایک چوتھی صورت اور ہے جس کا تعلق حیوانات کے علاوہ دوسری چیزوں سے ہے، مثلاً مٹھائی کھانا وغیرہ جن کو غیر اللہ کے نام پر نذر (منّت) کے طور سے، ہندو لوگ بتوں پر اور جاہل مسلمان بزرگوں کے مزار پر چڑھاتے ہیں، حضرات فقہار نے اس کو بھی اشتراکِ قلت یعنی تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے مٹا ڈھلایا، یہ یَعْبُدُونَ اللہ کے حکم میں سترار دے کر حرام کہا ہے، اور اس کے کھانے پینے، دوسروں کو کھلانے اور بچے خریدنے سب کو حرام کہا ہے، کتب فقہ بحر الرائق وغیرہ میں اس کی تفصیلات مذکور ہیں، یہ مسئلہ قیاسی ہے جس کو نص شرعی متعلقہ حیوانات پر قیاس کیا گیا ہے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

اضطرار و مجبوری کے احکام آیت مذکورہ میں چار چیزوں کو حرام قرار دینے کے بعد ایک حکم ہشتمی مذکور ہے فَتَمِنَ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاطِلٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِشْرَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ عَفُوٌّ رَحِيمٌ اس حکم میں اتنی آسانی کر دی گئی ہے کہ جو شخص بھوک سے بہت ہی بیتاب ہو جائے، بشرطیکہ نہ تو کھانے میں طالب لذت ہو اور نہ قد بضرورت سے تہجد کرنے والا ہو تو اس حالت میں اُن حرام چیزوں کو کھالینے سے بھی

اس شخص کو کوئی گناہ نہیں ہوتا، بے شک اللہ تعالیٰ میں بڑے غفور رحیم۔ اس میں مضطر کے لئے جان بچانے کے واسطے دو شرطوں کے ساتھ ان حرام چیزوں کے کھالینے سے بھی گناہ اشتداد یا گیا ہے۔

مضطر، شرعی اصطلاح میں اس شخص کو کہا جاتا ہے، جس کی جان خطرہ میں ہو، معمولی تکلیف یا ضرورت سے مضطر نہیں کہا جاسکتا، تو جو شخص بھوک سے ایسی حالت پر پہنچ گیا کہ اگر کچھ نہ کھائے تو جان جاتی ہے گی، اس کے لئے دو شرطوں کے ساتھ یہ حرام چیزیں کھالینے کی گنجائش دی گئی ہے، ایک شرط یہ ہے کہ مقصود جان بچانا ہو کھانے کی لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو، دوسری شرط یہ ہے کہ صرف اتنی مقدار کھائے جو جان بچانے کے لئے کافی ہو، پیٹ بھر کر کھانا یا قدر ضرورت سے زائد کھانا اس وقت بھی حرام ہے۔

اہم قاعدہ یہاں قرآن عزیز نے اضطرار کی حالت میں بھی حرام چیزوں کے کھالے کو حلال نہیں منسرمایا، بلکہ لَا إِشْرَ عَلَيْهِ فرمایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں تو اب بھی اپنی جگہ حرام ہی ہیں، مگر اس کھانے والے سے بوجہ اضطرار کے استعمال حرام کا گناہ معاف کر دیا گیا، حلال ہو جانے اور گناہ معاف کر دینے میں بڑا فرق ہے، اگر اضطراری حالت میں ان چیزوں کو حلال کر دینا مقصود ہوتا تو حرمت سے صرف ہستثناء کر دینا کافی ہوتا، مگر یہاں صرف ہستثناء پر اکتفا کر دینے کے بجائے لَا إِشْرَ عَلَيْهِ کا اضافہ فرما کر اس نکتہ کی طرف اشارہ کر دیا کہ حرام تو اپنی جگہ حرام ہی ہے، اور اس کا استعمال گناہ ہے، مگر مضطر سے یہ گناہ معاف کر دیا گیا۔

حالت اضطرار میں دوا کے آیت مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جس شخص کی جان خطرہ میں ہو وہ حرام چیزوں کا استعمال جان بچانے کے لئے بطور دوا کے حرام چیزوں کو استعمال کر سکتا ہے، مگر آیت مذکورہ ہی کے اشارہ سے اس میں چند شرطیں معلوم ہوتی ہیں،

اول یہ کہ حالت اضطرار کی ہو، خطرہ جان جانے کا ہو، معمولی تکلیف و بیماری کا حکم نہیں ہے، دوسرے یہ کہ بجز حرام چیز کے اور کوئی چیز علاج و دوا کے لئے مؤثر نہ ہو یا موجود نہ ہو، جیسے شدید بھوک کی حالت میں ہستثناء اُسی وقت ہی جب کہ کوئی دوسری حلال غذا موجود و مقدور نہ ہو، تیسرے یہ کہ اس حرام کے استعمال کرنے سے جان بچ جانا یقینی ہو جیسے بھوک سے مضطر کے لئے ایک دو قلم حرام گوشت کا کھالینا عادتاً اس کی جان بچانے کا یقینی سامان ہے، اگر کوئی دوا ایسی ہے کہ اس کا استعمال مفید تو معلوم ہوتا ہے مگر اس سے شفاء یقینی نہیں تو اس دوا حرام کا استعمال آیت مذکورہ کے ہستثنائی حکم میں داخل نہ کر جائز نہیں ہو گا، اس کے ساتھ مزید دو شرطیں آیت قرآنی میں منصوص ہیں، کہ اس کے

استعمال سے لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو اور قدر ضرورت سے زائد استعمال نہ کرے۔

آیت مذکورہ کی تصریح اور اشارات سے جو قیود و شرائط حاصل ہوئے ان شرائط کے ساتھ ہر حرام و ناپاک دوا کا استعمال خواہ کھانے پینے میں ہو یا خارجی استعمال میں باقائے فقہاء امت جائز ہے، ان شرائط کا خلاصہ پانچ چیزیں ہیں۔

(۱) حالت اضطرار کی ہو یعنی جان کا خطرہ ہو (۲) دوسری کوئی حلال دوا کارگر نہ ہو یا موجود نہ ہو (۳) اس دوا سے مرض کا ازالہ عاۃً یقینی ہو (۴) اس کے استعمال سے لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو (۵) قدر ضرورت سے زائد اس کو استعمال نہ کیا جائے۔

بغیر اضطراری حالت میں عام علاج و اضطراری حالت کا مسئلہ تو شرائط مذکورہ کے ساتھ نص قرآن دوا کے لئے حرام چیز کا استعمال سے ثابت اور احجامی حکم ہے، لیکن عام بیماریوں میں بھی کسی ناپاک یا حرام دوا کا استعمال جائز ہے یا نہیں، اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے، اکثر فقہاء نے فرمایا کہ بغیر اضطرار اور ان تمام شرائط کے جو اد پر مذکور ہوئیں حرام دوا کا استعمال جائز نہیں، کیونکہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لئے حرام میں شفاء نہیں رکھی (بخاری شریف)"

بعض دوسرے فقہاء نے ایک خاص واقعہ حدیث سے استدلال کر کے جائز قرار دیا، وہ واقعہ عروبتین کا ہے، جو تمام کتب حدیث میں مذکور ہے، کہ کچھ گاؤں والے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ادویات کا دودھ اور پشیا استعمال کرنے کی اجازت دی جس سے ان کو شفاء ہو گئی۔

مگر اس واقعہ میں متعدد احتمالات ہیں جن سے حرام چیز کا استعمال مشکوک ہو جاتا ہو، اس لئے اصل حکم تو یہی ہے کہ عام بیماریوں میں جہنگ شرائط اضطرار مذکورہ موجود نہ ہوں حرام دوا کا استعمال جائز نہیں۔

لیکن فقہاء متاخرین نے موجودہ زمانے میں حرام و ناپاک دواؤں کی کثرت اور ابتلا عام اور عوام کے ضعف پر نظر کر کے اس شرط کے ساتھ اجازت دی ہے کہ کوئی دوسری حلال اور پاک دوا اس مرض کے لئے کارگر نہ ہو یا موجود نہ ہو۔

کما فی الدار المختار قبیل فصلی لبر

ترغیبات میں فصل ہر سے پہلے مذکور

اختلاف فی التداوی بالبحر و

ظاہر المنہب المنہب کما فی

حرام چیزوں کو بطور دوا استعمال کرنے میں اختلاف ہے، اور ظاہر مذہب میں اس

رضاع البحر و لکن نقل المصنف
ثُمَّ وَهَمْنَا مِنَ الْعَادَى قَبِيل
بِرْخَصٍ إِذَا عَلِمَ فِيهِ الشِّفَاءُ
وَلَمْ يَعْلَمْ دَاخِلًا أَوْ خَارِجًا
فِي الْخَمْرِ لِلْعَطْشَانِ وَعَلَيْهِ
الْفَتْوَى، وَمِثْلُهُ فِي الْعَالِ الْكَبِيرَةِ
ص ۳۵۵ ج ۵

کی مانعت آتی ہے، جیسا کہ بحر الرائق کتاب
الرضاع میں مذکور ہے، لیکن مصنف تنویر
نے اس جگہ رضاع میں بھی اور یہاں بھی
حادی قدسی سے نقل کیا ہے کہ بعض علما
نے فرمایا دوا و علاج کے لئے حرام چیزوں
کا استعمال اس شرط سے جائز ہے کہ اس
دوا کے استعمال سے شفاء ہو جانا عاۃً
یعنی ہو، اور کوئی حلال دوا اس کا بدل نہ ہو سکے، جیسا کہ یہاں سے کہ لئے شراب کا گھونٹ
پینے کی اجازت دی گئی ہے۔

مسئلہ: تفصیل مذکور سے ان تمام انگریزی دواؤں کا حکم معلوم ہو گیا جو روپ
وغیرہ سے آتی ہیں، جن میں شراب وغیرہ نجس اشیا کا ہونا معلوم و یقینی ہو، اور جن دواؤں میں
حرام و نجس اجزاء کا وجود مشکوک ہو ان کے استعمال میں اور زیادہ گنجائش ہے، اور احتیاط
بہر حال احتیاط ہے، خصوصاً جبکہ کوئی شدید ضرورت بھی نہ ہو و اللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَسْتُرُونَ

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ نازل کی اللہ نے کتاب اور لپتے ہیں اس پر

بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا

تھوڑا سا مال وہ نہیں بھرتے اپنے پیٹ میں مگر آگ اور نہ بات

يَكَلِمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ

کریگا ان سے اللہ قیامت کے دن اور نہ پاک کرے گا ان کو اور ان کے لئے ہے

الْأَلِيمُ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اسْتَرَوْا الصَّلَاةَ بِالْهَدْيِ وَالْعَلَا

عذاب دردناک، یہی ہیں جنہوں نے خریدنا گمراہی کو بدلے ہدایت کے اور عذاب

بِالْمَغْفِرَةِ ۖ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَلَ

بدلے بخشش کے، مگر کس قدر صبر کر رہے ہیں دوزخ پر، یہ اس واسطے کہ اللہ نے نازل فرمایا

پ

استعمال سے لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو اور قدر ضرورت سے زائد استعمال نہ کرے۔
آیت مذکورہ کی تصریح اور اشارات سے جو قیود و شرائط حاصل ہوئے ان شرائط کے ساتھ
ہر حرام و ناپاک دوا کا استعمال خواہ کھانے پینے میں ہو یا خارجی استعمال میں باقائے فقہاء امت
جائز ہے، ان شرائط کا خلاصہ پانچ چیزیں ہیں۔

(۱) حالت اضطرار کی ہو یعنی جان کا خطرہ ہو (۲) دوسری کوئی حلال دوا کارگر نہ ہو
یا موجود نہ ہو (۳) اس دوا سے مرض کا ازالہ عاۓہ یقینی ہو (۴) اس کے استعمال سے لذت
حاصل کرنا مقصود نہ ہو (۵) قدر ضرورت سے زائد اس کو استعمال نہ کیا جائے۔

بغیر اضطراری حالت میں عام علاج و اضطراری حالت کا مسئلہ تو شرائط مذکورہ کے ساتھ نص قرآن
دوا کے لئے حرام چیز کا استعمال سے ثابت اور احب عامی حکم ہے، لیکن عام بیماریوں میں بھی کسی
ناپاک یا حرام دوا کا استعمال جائز ہے یا نہیں، اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے، اکثر
فقہاء نے فرمایا کہ بغیر اضطرار اور ان تمام شرائط کے جو اد پر مذکور ہو میں حرام دوا کا استعمال جائز
نہیں، کیونکہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان
کے لئے حرام میں شفاء نہیں رکھی (بخاری شریف)"

بعض دوسرے فقہاء نے ایک خاص واقعہ حدیث سے استدلال کر کے جائز قرار دیا،
وہ واقعہ عریشی کا ہے، جو تمام کتب حدیث میں مذکور ہے، کہ کچھ گاؤں والے لوگ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے، آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ادویات کا دودھ اور پشیا استعمال کرنے کی اجازت دی جس سے
ان کو شفاء ہو گئی۔

مگر اس واقعہ میں متعدد احتمالات ہیں جن سے حرام چیز کا استعمال مشکوک ہو جاتا ہو،
اس لئے اصل حکم تو یہی ہے کہ عام بیماریوں میں جہنگ شرائط اضطرار مذکورہ موجود نہ ہوں حرام
دوا کا استعمال جائز نہیں۔

لیکن فقہاء متاخرین نے موجودہ زمانے میں حرام و ناپاک دواؤں کی کثرت اور ابتلا
عام اور عوام کے ضعف پر نظر کر کے اس شرط کے ساتھ اجازت دی ہے کہ کوئی دوسری
حلال اور پاک دوا اس مرض کے لئے کارگر نہ ہو یا موجود نہ ہو۔

کما فی الدار المختار قبیل فصلی لبر | ترجمہ میں فصل ہر سے پہلے مذکور ہو
اختلاف فی التداوی بالمحرم و | حرام چیزوں کو بطور دوا استعمال کرنے
ظاہر المنہب المنہب کما فی | میں اختلاف ہے، اور ظاہر مذہب میں اس

رضاع البحر و لکن نقل المصنف
ثم و ههنا عن العادی قيل
بیرخص اذا عليم فيه الشفاء
ولم تعلم داء اخر كما رخص
فی الخمر للعطشان وعليه
الفتوى، ومثله فی العالم الكبير
ص ۳۵۵

کی مانعت آتی ہے، جیسا کہ جو لرائق کتاب
الرضاع میں مذکور ہے، لیکن مصنف تنویر
نے اس جگہ رضاع میں بھی اور یہاں بھی
حادی قدسی سے نقل کیا ہے کہ بعض علما
نے فرمایا دوا و علاج کے لئے حرام چیزوں
کا استعمال اس شرط سے جائز ہے کہ اس
دوا کے استعمال سے شفاء ہو جانا عاۓہ
یعنی ہو، اور کوئی حلال دوا اس کا بدل نہ ہو سکے، جیسا کہ یہاں سے کے لئے شراب کا گھونٹ
پینے کی اجازت دی گئی ہے۔

مسئلہ: تفصیل مذکور سے ان تمام انگریزی دواؤں کا حکم معلوم ہو گیا جو روپ
وغیرہ سے آتی ہیں، جن میں شراب وغیرہ نجس اشیا کا ہونا معلوم و یقینی ہو، اور جن دواؤں میں
حرام و نجس اجزاء کا وجود مشکوک ہو ان کے استعمال میں اور زیادہ گنجائش ہے، اور احتیاط
بہر حال احتیاط ہے، خصوصاً جبکہ کوئی شدید ضرورت بھی نہ ہو و اللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَسْتُرُونَ

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ نازل کی اللہ نے کتاب اور لپتے ہیں اس پر

بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَكُونُ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارُ وَلَا

تھوڑا سا مال وہ نہیں بھرتے اپنے پیٹ میں مگر آگ اور نہ بات

يَكَلِمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ

کرے گا ان سے اللہ قیامت کے دن اور نہ پاک کرے گا ان کو اور ان کے لئے ہے

أَلِيمٌ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اسْتَرَوْا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَلَىٰ

عذاب دردناک، یہی ہیں جنہوں نے خریدنا گمراہی کو بدلے ہدایت کے اور عذاب

بِالْمَغْفِرَةِ ۖ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَلَ

بدلے بخشش کے، مگر کس قدر صبر کر رہے ہیں دوزخ پر، یہ اس واسطے کہ اللہ نے نازل فرمایا

الْكِتَابَ بِالْحَقِّ، وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ

کتاب بھی ، اور جنہوں نے اختلاف ڈالا کتاب میں وہ بے شک ضد میں

بَعِيدٌ ﴿۱۷۱﴾

دور جا پڑے

خلاصہ تفسیر ربط آیات | اس سے پہلی آیات میں ان حرام چیزوں کا ذکر تھا جو محسوسات میں سے ہیں، اگلی آیات میں ایسے تمام کاموں کا ذکر جو محسوس نہیں بلکہ باطنی اور ظاہری اعمالِ شمر ہیں، مثلاً علمائے یہود میں یہ مرض تھا کہ عوام سے رشوت لیکر ان کے مطلب کے موافق غلط فتوے دیدیتے تھے، اور توراتیت کی آیات میں تعریف کر کے ان کے مطلب کے موافق بناتے تھے، اس میں امتیاز مجاہد کے علماء کو بھی تنبیہ ہو کہ وہ ایسے اعمال سے اجتناب کریں، کسی نفسانی غرض سے احکامِ حق کے اظہار میں کوتاہی نہ کریں۔

دینِ فروشی کی سزا | اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیمن ہوئی کتاب (کے مفاد) کا اخلاء کرتے ہیں اور اس (خیانت) کے معاوضہ میں دنیا کی (منازع قلیل وصول کرتے ہیں ایسے لوگ اور کچھ نہیں اپنے پیٹ میں آگ (کے انگائے) بھر رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان سے نہ توفیق میں (لطف کے ساتھ) کلام کریں گے اور نہ (عناہ معاف کر کے) ان کی صفائی کریں گے، اور ان کو سزائے دردناک ہوگی، یہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں تو ہدایت چھوڑ کر ضلالت اختیار کی اور آخرت میں (مغفرت چھوڑ کر عذاب (سربریا) سوزش) آتش کی ہمت کو، دوزخ میں جانے کے لئے کیے باہمت ہیں (اور) یہ (ساری مذکورہ سزائیں (ان کو) اس وجہ سے ہیں کہ حق تعالیٰ نے (اس) کتاب کو ٹھیک ٹھیک بھیجا تھا، اور جو لوگ (ایسی ٹھیک ٹھیک بھیجی ہوئی کتاب میں بے راہی (اختیار) کریں، وہ ظاہر ہے کہ بڑی دور (دوراز) کی خلاف (ورزی) میں مبتلا ہوں گے (اور ایسی خلاف ورزی پر ضرور ایسی ہی سخت سزاؤں کا استحقاق ہوگا)۔

معارف مسائل

مسئلہ: آیات مذکورہ سے معلوم ہوا کہ جو شخص مال کے لالچ سے حکیم شرعی کو بدل دے، وہ جو یہ مال حرام کھاتا ہے گویا اپنے پیٹ میں جہنم کے انگائے بھر رہا ہے، کیونکہ اس عمل کا انجام یہی ہے، اور بعض محقق علماء نے فرمایا کہ مالی حرام درحقیقت جہنم کی آگ ہی

اگرچہ اس کا آگ ہونا دنیا میں محسوس نہیں ہوتا، مگر مرنے کے بعد اس کا یہ عمل آگ کی شکل میں سامنے آجائے گا۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ

نیکي کچھ یہی نہیں کہ تمہارا اپنا مشرق کی طرف یا مغرب کی

وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ

لیکن بڑی نیک تو یہ ہے کہ جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور

وَالنَّبِيِّنَ، وَآلَى الْمَالِ عَلَى حَبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ

سب کتابوں پر اور یتیموں پر اور غنیمت کی محبت پر رشتہ داروں کو اور یتیموں کو

وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ، وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ

محتاجوں کو اور مسکینوں کو اور مانگنے والوں کو اور گردنیں پھرنے میں اور قائم رکھے

الصَّلَاةَ وَآلَى الزَّكَاةَ، وَالْمُؤْتُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا

نماز اور دیا کرے زکوٰۃ، اور پورا کرنے والے اپنے اقرار کو جب عہد کریں،

وَالصَّادِقِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ

اور صبر کرنے والے سختی میں اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت بھی لوگ

الَّذِينَ صَدَقُوا، وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿۱۷۲﴾

ہیں سچے اور یہی ہیں پرہیزگار

ربط از بیان بستران | شروع سورت سے یہاں تک تقریباً نصف سورۃ بقرہ،

زیادہ دوسرے سخن منکرین کی طرف تھا، کیونکہ سب اول قرآن

کی حقانیت کا اثبات کیا، اس ضمن میں اس کے ماننے والے اور نہ ماننے والے فسقوں کا ذکر

کیا، پھر توحید و رسالت کو ثابت کیا، پھر اولادِ ابراہیم علیہ السلام پر افعامات و احسانات کو

ایوانِ نبی (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیان فرمایا، وہاں سے قبلہ کی بحث چلی، اور اس کو بیان کر کے صفحہ

دومہ کی بحث پر ختم کیا۔

پھر توحید کے اثبات کے بعد شرک کے اصول و فروع کا ابطال کیا، اور یہاں تک پہنچا

بیان ہوا، اور ان سب مضامین میں ظاہر ہے کہ منکرین کو زیادہ تنبیہ دی، اور غمنا کوئی خطاب مسلمانوں کو ہر جانا اور بات ہو۔

اب آیات آئندہ میں کہ بقیہ تقریباً سورۃ بقرہ کا نصف ہے، زیادہ تر مقصود مسلمانوں کو بعض اصول و فروع کی تعلیم کرنا ہے، مگر غمنا غیر مسلمین کو بھی کوئی خطاب ہو جاوے، اور غمنا ختم سورۃ تک چلا گیا ہے جس کو شروع کیا گیا ہے ایک مجمل عنوان ہے، لفظ پر کبھی الباء۔ عربی زبان میں مطلق تفسیر کے معنی میں ہے، جو تمام ظاہری اور باطنی طاعات و خیرات کو جامع ہے، اور اول آیات میں الفاظ جامعہ سے کلی اور اصولی تعلیم دی گئی ہے، مثلاً ایمان بالکتاب و ایثار مال و دقا، عہد و صبر، ایمان و غیرہ، جس میں شرعی تمام احکام کے بنیادی اصول آگئے، کیوں کہ شریعت کے کل احکام کا حاصل تین چیزیں ہیں، عقائد، اعمال، اخلاق، باقی تمام جزئیات انہیں کلیات کے تحت میں داخل ہیں، اور اس آیت میں ان تینوں قسم کے بڑے بڑے شعبے آگئے۔

آگئے اس پر کی تفصیل چلی ہے، جس میں سے بہت سے احکام باقتضائے وقت و مقام مثل قصاص و وصیت و روزہ و جہاد و حج و انفاق و حیض و ایلاء و یتیم و یتیم و نکاح و عدت و قہر و عمارت و کربلاء و انفاق فی سبیل اللہ، و بعض معاملات بیع و شراء، و شہادت بقدر ضرورت بیان نہ کرنا، و عہد و رحمت و مغفرت پر ختم فرمادیا، سبحان اللہ! کیا بلیغ تر قریب ہو پس چونکہ ان مضامین کا حاصل پر کا بیان ہے اجمالاً و تفصیلاً، اس لئے اگر اس مجموعہ کا لقب ابواب الیٰز رکھا جاوے تو نہایت زیادہ ہے، واللہ اعلم۔

خلاصہ تفسیر

ابواب الیٰز کہ سارا کمال اسی میں نہیں آگیا، کہ ہم اپنا منہ مشرق کو کر لو یا مغرب کو کر لو، لیکن اصل کمال قرآن ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر یقین رکھے، اور (اسی طرح) قیامت کے دن (آئے) پر (بھی) اور فرشتوں پر (بھی) کہ وہ اللہ کے فرمانبردار بندے ہیں، اور سے بنے ہیں، گناہ سے معصوم ہیں، کھانے پینے اور انسانی شہوات سے پاک ہیں، اور (سب) کتب (سماویہ) پر (بھی) اور (سب) پیغمبروں پر (بھی) اور (وہ شخص) مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں (اپنے عاجتہ) رشتہ داروں کو اور (نادار) یتیموں کو (یعنی جن بچوں کو ان کا باپ نابالغ چھوڑ کر گیا ہو) اور (دوسرے غریب) محتاجوں کو (بھی) اور (بے خرچ) مسافروں کو اور (لا چاری میں) سوال کرنے والوں کو اور (قیدی اور غلاموں کی) اگر دن چھڑانے میں (بھی) مال خرچ کرتا ہو) اور (وہ شخص) نماز کی پابندی

(بھی) رکھتا ہو اور (مقررہ) نزلت بھی ادا کرتا ہو اور جو شخص اس رکاز عقائد و اعمال کے ساتھ اپنے خلاق بھی رکھتے ہوں کہ اپنے عہد دل کو پورا کرنے والے ہوں جب (کسی امر جائز کا) عہد کر لیں اور اس صفت کو خصوصیت کے ساتھ کہوں گا کہ وہ لوگ (ان مواقع میں) مستقل (مزاج) رہنے والے ہوں (ایک تو) تنگدستی میں اور (دوسرے) بیماری میں اور (تیسرے) معرکہ (قتال) (کفار) میں (یعنی پریشان اور کم ہمت نہ ہوں) یہ لوگ ہیں جو سچے کمال کے ساتھ موصوف ہیں، اور یہی لوگ ہیں جو (سچے) متقی (رہے) جاسکتے ہیں (غرض اصل مقاصد کمال و کمال کے یہ ہیں نماز و کسی سمت کو نہ کرنا اپنی کالات مذکورہ میں ایک کمال خاص یعنی اقامت صلوٰۃ کے قواعد اور شرائط میں سے ہو، اور اس کے حق میں میں بھی حسن آگیا، ورنہ اگر نماز نہ ہوتی تو کسی خاص سمت کو نہ کرنا بھی عبادت نہ ہوتا،

معارف مسائل

جب مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کر دیا گیا تو یہود و نصاریٰ اور مشرکین جو اسلام اور مسلمانوں میں جب جوئی کی فکر میں رہتے تھے ان میں بڑا شور و غضب ہوا اور طرح طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام پر اعتراضات کا سلسلہ جاری کر دیا، جس کے جوابات پچھلی آیات میں بڑی توضیح و تفصیل کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں۔

ان آیات میں ایک خاص انداز سے اس بحث کو ختم کر دیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ تم نے سارا دین صرف اس بات میں منحصر کر دیا ہے کہ نماز میں انسان کا رخ مغرب کی طرف ہو یا مشرق کی مراد اس سے مطلق چہات اور سمتیں ہیں، یعنی تم نے صرف سمت و جهت کو دین کا مقصد بنالیا، اور ساری بحثیں اسی میں دائر ہو گئیں، گویا شریعت کا کوئی اور حکم ہی نہیں ہے۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس آیت کا خطاب یہود و نصاریٰ اور مسلمان سب کیلئے ہو، اور مراد یہ ہو کہ اصل پر اور ثواب اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ہے وہ جس طرف رخ کرنے کا حکم دیں، وہی ثواب و صواب ہو جائے، اپنی ذات کے اعتبار سے مشرق و مغرب یا کوئی جانب و جهت نہ کوئی اہمیت رکھتی ہے، نہ ثواب، بلکہ ثواب دراصل اطاعت کا ہے، جس جانب کا بھی حکم ہو جائے، جب تک بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم تھا وہ ثواب تھا، اور جب بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا ارشاد ہوا تو اب وہی ثواب ہے۔

جیسا کہ بسلسلہ ربط آیات بیان ہو چکا ہے، کہ اس آیت سے سورۃ بقرہ کا ایک نیا باب شروع ہوا، جو جس میں مسلمانوں کے لئے تعلیمات و ہدایات اصل ہیں، مخالفین

کے جوابات ضمنی۔ اسی لئے اس آیت کو احکام اسلام کی ایک نہایت جامع آیت کہا گیا ہے۔ اس کے بعد بعترہ کے ختم تک تقریباً اسی آیت کی مزید تشریحات ہیں۔ اس آیت میں اصولی طور سے تمام احکام شرعیہ، اعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاق کا اجمالی ذکر آ گیا ہے۔

پہلی چیز اعتقادات ہیں، اس کا ذکر مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ میں مفصل آ گیا۔ دوسری چیز اعمال یعنی عبادات اور معاملات ہیں، ان میں سے عبادات کا ذکر وَالَّذِي آتَى الزَّكَاةَ تک آ گیا، پھر معاملات کا ذکر وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ بِحَقِّ صَدَقَاتِهِمْ سے کیا گیا، پھر اخلاق کا ذکر وَالصَّابِرِينَ سے کیا گیا، آخر میں بتلادیا کہ سچے مومن وہی لوگ ہیں جو ان تمام احکام کی پیروی مکمل کریں اور انہی کو تقویٰ شعار کہا جاسکتا ہے۔

ان احکام کے بیان کرنے میں بہت سے لمبے اشارات ہیں، مثلاً مال کو حشر چ کرنے میں غلے حبثہ کی قید لگا دی، جس میں تین احتمال ہیں، ایک یہ کہ حبثہ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ مال خرچ کرنے میں کوئی نفسانی غرض نام و نمود کی شامل نہ ہو، بلکہ اخلاص کامل کے ساتھ صرف اللہ جل شانہ کے ساتھ محبت اس حشر چ کرنے کا داعیہ ہو۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ ضمیر مال کی طرف راجع ہو تو مراد یہ ہوگی کہ اللہ کی راہ میں وہ مال خرچ کرنا موجب ثواب ہو جو انسان کو محبوب ہو، بیکار چیزیں جو پھینکنے کی تھیں ان کو دے کر صدقہ کا نام کرنا کوئی صدقہ نہیں، اگرچہ پھینکنے کی نسبت سے بہتر یہی ہے کہ کسی کے کام آئے، تو اس کو دیدے۔

تیسرا احتمال یہ ہے کہ لفظ آتَى میں جو اس کا مصدر آیتا۔ مفہوم ہوتا ہے اس کی طرف ضمیر راجع ہو اور معنی یہ ہوں کہ وہ اپنے خرچ کرنے پر دل سے راضی ہو یہ نہ ہو کہ حشر چ تو کر رہا ہے مگر اندر سے دل دکھ رہا ہے۔

امام جصاصؒ نے فرمایا کہ ممکن ہے کہ تینوں ہی چیزیں مراد میں داخل ہوں، پھر اس جگہ مال کے خرچ کرنے کی دو صورتیں مقدم بیان کر دیں، جو زکوٰۃ کے علاوہ ہیں، زکوٰۃ کا ذکر اس کے بعد کیا، شاید تقدیم کی وجہ یہ ہو کہ عام طور سے ان حقوق میں غفلت اور کوتاہی برتی جاتی ہے، صرف زکوٰۃ ادا کر دینے کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔

مسئلہ: اسی سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ مالی فرض صرف زکوٰۃ سے پر نہیں ہوتا ہے، زکوٰۃ کے علاوہ بھی بہت جگہ پر مال خرچ کرنا فرض و واجب ہوتا ہے (جصاص قرطبی)

جیسے رشتہ داروں پر خرچ کرنا کہ جب وہ کمانے سے معذور ہوں تو نفقہ ادا کرنا واجب ہوتا ہے، کوئی مسکین غریب مر رہا ہے اور آپ اپنی زکوٰۃ ادا کر چکے ہیں، مگر اس وقت مال خرچ کر کے اس کی جان بچانا فرض ہے۔

اسی طرح ضرورت کی جگہ مسجد بنانا یا دینی تعلیم کے لئے مدارس و مکاتب بنانا یہ سب فرائض مالی میں داخل ہیں، فرق اتنا ہے کہ زکوٰۃ کا ایک خاص قانون ہے اس کے مطابق ہر مال میں زکوٰۃ کا ادا کرنا ضروری ہے، اور یہ دوسرے مصارف ضرورت و حاجت پر یوقوف ہیں، جہاں ضرورت ہو خرچ کرنا فرض ہو جائے گا جہاں نہ ہو فرض نہیں ہوگا۔

جن لوگوں پر مال خرچ کرنا ہے، مثلاً زوی القربی، مساکین، مسافر، سوال کرنے والے

فائدا

فقیران سب کو تو ایک انداز سے بیان فرمایا، پھر وَالَّذِينَ آمَنُوا میں، حرف فی بڑھا کر اشارہ کر دیا کہ ملوک غلاموں کو مال کا مالک بنانا مقصود نہیں، بلکہ ان کے مالک سے خرید کر ان کے آزاد کرنے پر خرچ کیا جائے، اس کے بعد وَالَّذِينَ آمَنُوا کا ذکر بھی

اسی طریق پر آیا، جیسے دوسری چیزوں کا ذکر ہے، آگے معاملات کا باب بیان کرنا تھا اس میں اسلوب (طریق) بدل کر بجائے صیغہ ماضی استعمال کرنے کے وَالَّذِينَ آمَنُوا صیغہ اسم فاعل استعمال کیا، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اس میں ایثار و عہد کی عادت رائج ہو چکی، اتفاقی طور پر کوئی معاہدہ پورا کر دے تو یہ ہر کافر ناجہر بھی کہیں نہ کہیں کرتا ہے، اس کا اعتبار نہیں اسی طرح معاملات کے باب میں صرف ایثار کا ذکر کیا گیا، کیونکہ اگر غور کیا جائے تو تمام معاملات بیع و شراء، اجارہ، شرکت سب ہی کی روح ایثار معاہدہ ہے۔

اسی طرح آگے اخلاق یعنی اعمال باطنہ کا ذکر کرنا تھا، ان میں سے صرف صبر کو بیان کیا گیا، کیونکہ صبر کے معنی ہیں نفس کو قابو میں رکھنے اور ہزیموں سے بچانے کے، اگر غور کیا جاوے تو تمام اعمال باطنہ کی اصل روح صبریہ ہے، اسی کے ذریعہ اخلاق فاضلہ حاصل کئے جاسکتے ہیں، اور اسی کے ذریعہ اخلاق رذیلہ سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

ایک اور تغیر اسلوب بیان میں یہاں یہ کیا گیا کہ پہلے وَالَّذِينَ آمَنُوا ذکر کیا تھا یہاں وَالصَّابِرِينَ نہیں بلکہ وَالصَّابِرِينَ فرمایا، حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ نصب علی المدح ہے، جس کی مراد ہے کہ اس جگہ لفظ مدح مقدر ہو اور صابرین اس کا مفعول ہو، یعنی ان سب نیکو کار لوگوں میں خصوصیت سے قابل مدح صابرین ہیں، کیونکہ صبر ہی ایک ایسا ملکہ اور ایسی قوت ہے جس سے تمام اعمال مذکورہ میں مدد ملی جاسکتی ہے، اس طرح آیت مذکورہ میں دین کے تمام شعبوں کے اہم اصول بھی آ گئے ہیں، اور لمبے اشارات سے ہر ایک کی اہمیت کا درجہ بھی معلوم ہو گیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ ۚ الْحُرُّ

اے ایمان دار فرض ہوا تم پر قصاص، برابری کرنا مقتولوں میں، آزاد کے بدلے

بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ ۚ الْأَنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ

آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت پھر جسکو معاف کیا جائے اس کے بھائی کی طرف

فَاتَّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَأَدَّاءُ الْيَمِينِ ۚ بِإِحْسَانٍ ۚ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ

کچھ بھی توابعاری کرنی چاہئے موافق دستور کے اور ادا کرنا چاہئے اس کو غول کے ساتھ یہ آسانی ہوئی

مِّن تَرَبُّكُم ۚ وَرَحْمَةٌ مِّن رَّبِّكَ ۚ فَمَنْ عُدَّيْ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ

تہا کہ رب کی طرف سے اور ہر بانی پھر جو زیادتی کرے اس فیصلہ کے بعد تو اس کے لئے ہر عذاب

أَلِيمٌ ۚ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَوةٌ ۚ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ

درذناک، اور تمہارا واسطہ قصاص میں بڑی زندگی ہے اے عقلمندو! تاکہ تم

تَتَّقُونَ ﴿۱۷۹﴾

بچتے رہو۔

رابط آیات اور خلاصہ تفسیر

اس سے پہلے آیات کی تفسیر میں آپ معلوم کر چکے ہیں کہ ان آیات میں اجمالی طور پر نیک اور غول کے اصول بتلا دیئے گئے ہیں، آگے اُن کی جزئی تفصیلات آئیں گی جن کو اب آج ہر کہا جاسکتا ہے، آگے انہی ابواب الہر کے کچھ احکام جزئیہ کا بیان ہوتا ہے، جو ضرورت اور حالات و واقعات کے تابع بیان ہوئے ہیں۔

اے ایمان دارو تم پر (قانون) قصاص فرض کیا جاتا ہے، مقتولین

حکم اول قصاص (بقتل عمد) کے بارے میں (یعنی ہر) آزاد آدمی کو قتل کیا جائے ہر

(دوسرے) آزاد آدمی کے عوض میں اور (اسی طرح ہر) غلام (دوسرے ہر) غلام کے عوض

میں اور (اسی طرح ہر) عورت (دوسری ہر) عورت کے عوض میں (گویہ قاتلین بڑے

درجہ کے اور مقتولین چھوٹے درجہ کے ہوں، جب بھی سب برابر قصاص لیا جائے گا، یعنی قاتل کو

سزائیں قتل کیا جائے گا، ہاں جس (قاتل) کو اس کے فریق (معتدوم) کی طرف سے کچھ معافی

ہو جاوے (مگر پوری معاف نہ ہو) تو اس سے سزا سے قتل سے تو بڑی ہو گیا، لیکن دیت یعنی خونیہا کے طور پر ایک معین مقدار سے مال بذمہ قاتل واجب ہو جاوے گا، تو اس وقت فریقین کے ذمہ ان دو امر کی رعایت ضروری ہے، مدعی یعنی وارث مقتول کے ذمہ تو (معتول طور پر) اس مال کا مطالبہ کرنا کہ اس کو زیادہ تنگ نہ کرے) اور (مدعا علیہ یعنی قاتل کے ذمہ) خوبی کے ساتھ (اس مال کا) اس (مدعی) کے پاس پہنچا دینا کہ مقدار میں کمی نہ کرے، اور خواہ مخواہ ٹالے نہیں) یہ (قانون دیت و عفو) تمہارے پروردگار کی طرف سے (سزائیں) تخفیف پر اور (شاہانہ) رحم ہے (ورنہ بجز سزا سے قتل کے کوئی گنجائش ہی نہ ہوتی) پھر جو شخص اس (قانون) کے (مقرر ہوئے) بعد تعدی کا مرتکب ہو (مثلاً کسی پر جمع کیا یا اشتباہ میں دعویٰ قتل کا کر دے یا معاف کر کے پھر قتل کی پیروی کرے) تو اس شخص کو رخصت (میں) بڑا دردناک عذاب ہو گا، اور فہم لوگو اس قانون، قصاص میں تمہاری جانوں کا بڑا بگاڑ ہو (کیونکہ اس قانون کے خوف سے ارتکاب قتل سے ڈریں گے، تو کسی جانیں بچیں گی)، ہم امید کرتے ہیں کہ تم لوگ (ایسے قانون امن کی خلاف ورزی سے) پرہیز رکھو گے۔

معارف مسائل

قصاص کے لغوی معنی ممانئت کے ہیں، مراد یہ ہے کہ جتنا ظلم کسی نے کسی پر کیا اتنا ہی بدلہ لینا دوسرے کے لئے جائز ہے، اس سے زیادتی کرنا جائز نہیں، قرآن مجید کی آیت میں عنقریب اسی سورت میں اس کی زیادہ وضاحت اس طرح آئی ہے، فَاَعْتَدْ لِّوَاغِدِكَ بِبِئْسَلِ مَا اُعْتَدَىٰ عَلَیْكَ، اور سورۃ نمل کی آخری آیات میں وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَا قِبُوا بِبِئْسَلِ مَا عُو قِبْتُمْ، اسی مضمون کے لئے آیا ہے۔

اس لئے اصطلاح شرع میں قصاص کہا جاتا ہے قتل کرنے اور زخم لگانے کی اس سزا کو جس میں سادات اور ممانئت کی رعایت کی گئی ہو۔

مسئلہ: قتل عمدہ کہ ارادہ کر کے کسی کو آہنی ہتھیار سے یا ایسی چیز سے جس سے گوشت پرست کٹ کر خون بہہ سکے قتل کیا جائے، قصاص یعنی جان کے بدلے جان لینا، ایسے ہی قتل کے جرم کے ساتھ مخصوص ہے۔

مسئلہ: ایسے قتل میں جیسے آزاد آدمی آزاد کے عوض میں قتل کیا جاتا ہو ایسے ہی غلام کے عوض میں بھی غلام، اور جس طرح عورت کے عوض میں عورت ماری جاتی ہے، اسی طرح مرد کی عورت کے مقابلہ میں قتل کیا جاتا ہے۔

آیت میں آزاد کے مقابل آزاد اور عورت کے مقابل عورت کا جو ذکر آیا ہے یہ اس خاص واقعہ کی بناء پر ہے جس میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

ابن کثیرؒ نے باسناد ابن ابی حاتم نقل کیا ہے کہ زمانہ اسلام سے کچھ پہلے دو عرب قبیلوں میں جنگ ہو گئی، طرفین کے بہت سے آدمی آزاد اور غلام مرد اور عورتیں قتل ہو گئے، ابھی ان کے معاملہ کا تصفیہ ہونے نہیں پایا تھا کہ زمانہ اسلام شروع ہو گیا، اور یہ دونوں قبیلے اسلام میں داخل ہو گئے، اسلام لانے کے بعد اپنے اپنے مقتولوں کا قصاص لینے کی گفتگو شروع ہوئی، تو ایک قبیلہ جو قوت و شوکت والا تھا، اس نے کہا کہ ہم اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک ہمارے غلام کے بدلے میں تمہارا آزاد آدمی اور عورت کے بدلے میں مرد قتل نہ کیا جائے۔

ان کے جابلانہ اور ظالمانہ مطالبہ کی تردید کرنے کیلئے آیت نازل ہوئی **أَلَمْ يَكُنْ لِلْغُلَامِ نَفْسٌ كَمَا لِلنَّسَاءِ وَاللَّذَّائِفِ وَاللَّذَّائِفِ** **قانون اور قصاص کے مسائل**

غلام کے بدلے آزاد کو اور عورت کے بدلے مرد کو قتل کیا جائے اگرچہ وہ قاتل نہ ہو، اسلام نے اپنا عادلانہ قانون یہ نافذ کر دیا کہ جس نے قتل کیا ہے وہی قصاص میں قتل کیا جائے، اگر عورت قاتل ہے تو کسی بے گناہ مرد کو اس کے بدلے میں قتل کرنا اسی طرح قاتل اگر غلام ہے تو اس کے بدلے میں کسی بے گناہ آزاد کو قتل کرنا ظلم عظیم ہے، جو اسلام میں قطعاً برداشت نہیں کیا جاسکتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیت کا حاصل اس کے سوا نہیں کہ جس نے قتل کیا ہے وہی قصاص میں قتل کیا جائے گا، عورت ہو یا غلام، قاتل عورت اور غلام کے بجائے بے گناہ مرد یا آزاد کو قتل کرنا جائز نہیں۔

آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عورت کوئی مرد قتل کرے یا غلام کو کوئی آزاد قتل کر دے تو اس سے قصص نہیں لیا جائے گا، مشرآن مجید کی اسی آیت کے شروع میں **أَلْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ** اس عموم کی واضح دلیل ہے، اور دوسری آیات میں اس سے بھی زیادہ وضاحت ہے، مثلاً **أَلْقِصَاصُ بِالْغُلَامِ** وغیرہ۔

مسئلہ: اگر قاتل عہد میں قاتل کو پوری معافی دیدی جائے، مثلاً مقتول کے وارث صرف اس کے دوست تھے، اور ان دونوں نے اپنا حق معاف کر دیا، تو قاتل پر کوئی مطالبہ نہیں رہا، اور اگر پوری معافی نہ ہو مثلاً صورت مذکورہ میں دو بیٹوں میں سے ایک نے معاف کیا دوسرے نے معاف نہیں کیا، تو مزائے قصاص سے تو قاتل بری ہو گیا، لیکن معاف

ذکر کرنے والے کو نصف دیت (خونیا) دلایا جاوے گا، اور دیت یعنی خوں بہا شریعت میں سوانٹ یا ہزار دینار یا دس ہزار درہم ہوتے ہیں، اور درہم آجکل کے مردہ و زن کے اعتبار سے تقریباً ساڑھے تین ماشہ چاندی کا ہوتا ہے، تو پوری دیت دو ہزار نو سو سولہ تولے ۸ ماشہ چاندی ہوگی، یعنی ۳۶ سیر ۲۶ تولے ۸ ماشے۔

مسئلہ: جس طرح ناقص معافی سے مال واجب ہو جاتا ہے اسی طرح اگر باہم کسی قدر مال پر مصالحت ہو جائے تب بھی قصاص ساقط ہو کر مال واجب ہو جاتا ہے، لیکن اس میں کچھ شرائط ہیں جو کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

مسئلہ: مقتول کے جتنے شرعی وارث ہیں وہی قصاص اور دیت کے مالک بقدر اپنے حصہ میراث کے ہوں گے، اگر دیت یعنی خوں بہا لیا گیا تو مال ان وارثوں میں بھٹا وراثت تقسیم ہوگا، اور قصاص کا فیصلہ ہو تو قصاص کا حق بھی سب میں مشترک ہوگا، مگر چونکہ قصاص ناقابل تقسیم ہے، اس لئے کوئی اولیٰ درجہ کا حق رکھنے والا بھی اپنا حق قصاص معاف کر دیا تو دوسرے وارثوں کا حق قصاص بھی معاف ہو جائے گا، ہاں انکو دیت (خونیا) کی رقم حسب حصہ ملے گی۔

مسئلہ: قصاص لینے کا حق اگرچہ اولیاء مقتول کا ہے، مگر باجماع امت ان کو اپنا یہ حق خود وصول کرنے کا اختیار نہیں، کہ خود ہی قاتل کو مار ڈالیں بلکہ اس حق کے حاصل کرنے کے لئے حکم سلطان مسلم یا اس کے کسی نائب کا ضروری ہے، کیونکہ قصاص کسی صورت میں واجب ہوتا ہے کس میں نہیں اس کی جسزنیات بھی رقیق ہیں جن کو ہر شخص معلوم نہیں کر سکتا، اس کے علاوہ اولیاء مقتول اپنے غصہ میں مغلوب ہو کر کوئی زیادتی بھی کر سکتے ہیں، اس لئے باتفاق علماء امت حق قصاص حاصل کرنے کے لئے اسلامی حکومت کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے (قرطبی)

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا

فرض کیا گیا تم پر جب حاضر ہو کسی کو تم میں موت بشرطیکہ چھوٹے کچھ مال

الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۚ حَقًّا عَلَى

دیت کرنا ان باپ کے واسطے اور رشتہ داروں کے لئے انصاف کے ساتھ یہ حکم لازم ہے

الْمُتَّقِينَ ۚ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَكَ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى

پرہیزگاروں پر، پھر جو کوئی بدل ڈالے وصیت کو بعد اس کے کہ جو سن چکا تو اس کا گناہ اپنی پر

الَّذِينَ يَبْدِلُونَهُ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۸۸﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مَثْوًى

ہے جنہوں نے اس کو بدلا بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے ۔ پھر جو کوئی خوف کرے وصیت کرنے

جَنَافًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بِنَهْيِهِمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ

والے سے طرفداری کا پائناہ کا پھراں میں ! ہم صلح کرائے تو اس پر کچھ گناہ نہیں بیشک اللہ

غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۸۹﴾

بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہو

رَبِطَ آيَاتٍ وَخُلَاصَةٌ تَفْسِير

حکم دوم از ابواب البر وصیت ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے کرنے کا حکم دیا جائے خواہ زندگی میں یا بعد الموت ، لیکن عورت میں اس کام کو کہا جاتا ہے جس کے کرنے کا حکم بعد الموت ہو۔

خیر، لفظ خیر کے بہت سے معانی میں سے ایک معنی مال کے بھی آتے ہیں، جیسے قرآن میں ہے، وَقَدْ أَنْذَرْتُ الْخَيْرَ لَشَدِيدٍ (۸۱:۱۰) اس جگہ باتفاق مفسرین خیر سے مراد مال ہے۔

شروع اسلام میں جب تک میراث کے حقے شرع سے مقرر نہ ہوئے تھے، عجم تھا کہ ترکہ کے ایک ثلث میں مرنے والا اپنے والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے لئے جتنا جتنا مناسب سمجھے وصیت کر دے، اتنا تو ان لوگوں کو حق تھا، باقی جو کچھ رہتا وہ سب اولاد کا حق ہوتا تھا، اس آیت میں یہ حکم مذکور ہو رہا ہے۔

تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب کسی کو (آثار سے) موت نزدیک معلوم ہونے لگے بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو تو (اپنے) والدین اور (دیگر) اقارب کے لئے معقول طور پر (کہ مجموعہ ایک ثلث سے زیادہ نہ ہو) کچھ بٹلا جائے (اس کا نام وصیت ہی) جن کو خدا کا خوف ہے ان کے ذمہ یہ ضروری دیکھا جاتا ہے، پھر (جن لوگوں نے اس وصیت

کو سنا ہر ان میں سے) جو شخص (یعنی) ان لینے کے بعد اس (کے مضمون) کو تبدیل کرے گا اور باہمی تقسیم و فیصلہ کے وقت غلط اظہار دے گا، اور اس کے موافق فیصلہ ہونے سے کسی کا حق تلف ہو جاوے گا تو اس (حق تلفی) کا گناہ انہیں لوگوں کو ہوگا جو اس (مضمون) کو تبدیل کریں گے (حاکم عدالت یا ثالث کو یا مرنے والے کو گناہ نہ ہوگا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ تو قیسنہ سننے جانتے ہیں (تو تبدیل کرنے والے کے اظہار بھی سنتے ہیں اور حاکم کا بے خبر اور احمق نہ ہونا بھی جانتے ہیں) ہاں ایک طرح کی

تبدیل کی اہمات بھی ہے وہ یہ کہ جس شخص کو وصیت کرنے والے کی جانب سے وصیت کے بارے میں کسی غلطی کی یا (تصدیقاً قانون وصیت کے کسی دفعہ کی خلاف ورزی کے) کسی جرم کے ارتکاب کی تحقیق ہوئی ہو اور اس بے ضابطہ وصیت کی وجہ سے اس میت کے پسماندہ مستحقان ترکہ و مستحقان مال وصیت میں نزاع کا خطرہ یا وقوع معلوم ہو، پھر یہ شخص ان میں باہم مصالحت کر لے (مگر وہ مصالحت اس مضمون وصیت کے خلاف ہو جو ظاہراً تبدیل وصیت ہو) تو اس شخص پر کوئی بار گناہ نہیں ہے (اور) واقعی اللہ تعالیٰ تو (خود گناہوں کے) معاف فرمانے والے ہیں اور دیکھنا کہ پرہیزگار مرنے والے ہیں اور اس شخص نے ترکہ کو گناہ نہیں کیا کیونکہ وصیت میں تبدیلی اصلاح کے لئے کی ہو، تو اس پر کیوں نہ رحمت ہوگی)

مَعَارِفُ مَسَائِل

اس آیت میں جو وصیت کرنا اس مرنے والے پر فرض کیا ہو جو کچھ مال چھوڑ کر رہا ہو اس حکم کے عین جسز ہیں، ایک یہ کہ مرنے والے کے ترکہ میں اولاد کے سوا کسی دوسرے وارث کے حقے مقرر نہیں ہیں، ان کے حصوں کا تعین مرنے والے کی وصیت کی بنیاد پر ہوگا۔ دوسرے یہ کہ ایسے اقارب کے لئے وصیت کرنا مرنے والے پر فرض ہے۔ تیسرے یہ کہ ایک تہائی مال سے زیادہ کی وصیت جائز نہیں۔

ان تین احکام میں سے پہلا حکم تراکض صوابہ و تابعین کے نزدیک آیت میراث سے منسوخ ہو گیا، ابن کثیر نے تصحیح حاکم وغیرہ حضرت عبداللہ بن عباس سے نقل کیا ہے کہ اس حکم کو آیت میراث نے منسوخ کر دیا، یعنی وَلِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا (۴:۴) اور حضرت عبداللہ بن عباس کی ایک دوسری روایت میں اس کی یہ تفصیل ہے کہ آیت میراث نے ان لوگوں کی وصیت کو منسوخ کر دیا جن کا میراث میں حصہ مقرر ہو، دوسرے رشتہ دار جن کا میراث میں حصہ نہیں، ان کے لئے حکم وصیت اب بھی باقی ہے (جصاص، قرطبی) یہی باطل است یہ ظاہر ہے کہ جن رشتہ داروں کا میراث میں کوئی حصہ مقرر نہیں، ان کے لئے میت پر وصیت کرنا کوئی فرض و لازم نہیں، اس لئے فرضیت وصیت ان کے حق میں بھی منسوخ ہی ہوگی (جصاص، قرطبی) یعنی بشرط ضرورت صرف مستحب رہ جائے گی۔

دوسرا حکم وصیت کا فرض ہونا یہ بھی باطل است منسوخ ہے، اور نسخ اس کا وہ شد متواتر ہے جس کا اعلان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع

کے خطبہ میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہ کے سامنے فرمایا۔

إِنَّ اللَّهَ أَعْطَىٰ لِكُلِّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ
فَلَا وَصِيَّةَ لَوَاسِثٍ، اُخْرَجَ
الْمَرْمِزِيُّ وَقَالَ هَذَا حَدِيثٌ
حَسَنٌ صَحِيحٌ

اللہ تعالیٰ نے ہر ایک حق والے کو اس کا
حق خود دیا یا ہو، اس لئے اب کسی وارث
کے لئے وصیت جائز نہیں۔

اسی حدیث میں بروایت ابن عباسؓ یہ الفاظ بھی منقول ہیں:
لَا وَصِيَّةَ لَوَاسِثٍ إِلَّا أَنْ
تُحْيِيَنَّهَا أَوْ رِثَتَهُ
(جصاص)

کس وارث کے لئے وصیت اس وقت
تک جائز نہیں جب تک باقی سب وارث
اجازت نہ دیدیں۔

اس لئے ماہل اس حدیث کا یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے وارثوں کے حصے خود مسترد
فرمادیئے ہیں، اس لئے اسے وصیت کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ وارث کے حق میں وصیت
کرنے کی اجازت بھی نہیں، ہاں اگر دوسرے ورثہ اس وصیت کی اجازت دیدیں تو جائز ہے
امام جصاص نے فرمایا کہ یہ حدیث ایک جماعت صحابہؓ سے منقول ہے، اور فقہاء
امت نے باتفاق اس کو قبول کیا ہے، اس لئے بحکم متواتر ہے، جس سے آیت شریفہ کا
نسخ جائز ہے۔

اور امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ بات علماء امت میں متفق علیہ ہے کہ جب کوئی حکم
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی یقیناً طور پر معلوم ہو جائے جیسے خبر متواتر، مشہور وغیرہ
میں ہوتا ہے، تو وہ بالکل بحکم قرآن ہے، اور وہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کا فرمان ہے،
اس لئے اپنی حدیث سے کسی آیت قرآن کا منسوخ ہو جانا کوئی محل شبہ نہیں، پھر مندرجہ
کہ اگرچہ یہ حدیث ہم تک خبر واحد ہی کے طریق پر پہنچی ہو مگر اس کے ساتھ حجۃ الوداع کے
سب سے بڑے اجتماع میں ایک لاکھ سے زائد صحابہؓ کے سامنے اس کا اعلان فرمانا اور اس پر اجماع صحابہؓ
اور اجماع امت نے یہ واضح کر دیا کہ یہ حدیث ان حضرات کے نزدیک قطعی الثبوت ہے،
ورنہ شک و شبہ کی گنجائش ہوتے ہوئے اس کی وجہ سے آیت قرآن کے حکم کو چھوڑ کر اس پر
اجماع نہ کرتے۔

تیسرا حکم، وصیت ایک ہتھالی
مال سے زیادہ کی جائز نہیں

باتفاق امت اب بھی باقی ہے، ہاں وارثوں کی اجازت
سے ایک ہتھالی سے زائد کی بلکہ پورے مال کی بھی وصیت
جائز اور قابل قبول ہے۔

تفصیل مذکور سے یہ واضح ہو چکا کہ اب جن رشتہ داروں کے حصے قرآن کریم نے
مسئلہ: خود مسترد کر دیئے ہیں ان کے لئے اب وصیت واجب نہیں، بلکہ ہر وارث
اجازت دوسرے وارثوں کے جائز بھی نہیں، البتہ جو رشتہ دار شرعی وارث نہیں ان کے لئے
وصیت کرنے کی اجازت ایک ہتھالی مال تک ہے۔

مسئلہ: اس آیت میں ذکر ایک خاص وصیت کا تھا، جو مرنے والا اپنے متروک
مال کے متعلق کرتا تھا، جو منسوخ ہو گیا، لیکن جس شخص کے ذمے دوسرے لوگوں کے حقوق واجب
ہوں یا اس کے پاس کسی کی امانت رکھی ہو اس پر ان تمام چیزوں کی ادائیگی کے لئے وصیت
واجب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ جس شخص کے ذمہ کچھ لوگوں
کے حقوق ہوں اس پر تین راتیں ایسی نہ گزرنی چاہئیں کہ اس کی وصیت لکھی ہوئی اس کے
پاس موجود نہ ہو۔

مسئلہ: آدمی کو جو ایک ہتھالی مال میں وصیت کرنے کا حق دیا گیا ہے اپنی زندگی
میں اس کو یہ بھی حق رہتا ہے کہ اس وصیت میں کچھ تبدیلی کر دے یا بالکل ختم کر دے (جصاص)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى

اے ایمان والو فرض کیا گیا تم پر روزہ جیسے فرض کیا گیا تھا تم سے

الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۸۳﴾ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ

انہوں پر تاکہ تم پر ہمیں شکر ہو جاوے، چند روز ہیں گنتی کے

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ

پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا مسافر تو ان پر ان کی گنتی ہے اور دنوں سے

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ

اور جن کو طاقت ہے روزہ کی ان کے ذمہ بدلہ ہے ایک فقیر کا کھانا، پھر جو کون خوشی سے کرے

خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ

نیکی تو اچھا ہو اس کے واسطے اور روزہ رکھو تو بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم

تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۴﴾

سمجھ رکھتے ہو۔

خلاصہ تفسیر

حکمِ صومِ صوم اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے (امتوں کے) لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، اس طرح پر کہ تم روزہ کی بدولت رفتہ رفتہ تقویٰ بن جاؤ (کیونکہ روزہ رکھنے سے عادت پڑے گی نفس کو اس کے متعدد تقاضوں سے روکنے کی اور اسی عادت کی پختگی بنیاد کو تقویٰ کی سو) تھوڑے دنوں روزہ رکھ لیا کرو (ان تھوڑے دنوں سے مراد رمضان ہی، جیسا اگلی آیت میں آتا ہے) پھر اس میں بھی اتنی آسانی ہے کہ جو شخص تم میں (ایسا) پیار ہو (جس کو روزہ رکھنا مشکل یا مضر ہو) یا (شرعی) سفر میں ہو تو اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہو، اور بجائے رمضان کے (دوسرا ایام کالاتناہی) شمار کر کے ان میں روزہ رکھنا اس پر واجب ہے، اور دوسری آسانی جو بعد میں منسوخ ہو گئی یہ کہ جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہوں (اور پھر روزہ رکھنے کو دل نہ چاہو تو) ان کے ذمہ صرف روزے کا (فدیہ یعنی بدلہ) ہے کہ وہ ایک غریب کا کھانا (کھلا دینا یا دیدینا) ہے، اور جو شخص خوش سے (زیادہ) خیر (خیرات) کرے (کہ زیادہ فدیہ دیدے) تو یہ اس شخص کے لئے اور بہتر ہے اور (جو ہم نے آسانی کے لئے ان حالتوں میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت دیدی ہو، لیکن) تمھارا روزہ رکھنا اس حالت میں بھی (زیادہ بہتر ہے) اگر تم کچھ روزے کی فضیلت کی، خبر رکھتے ہو۔

معارف و مسائل

صوم کے لفظی معنی امساک یعنی رکنے اور بچنے کے ہیں، اور اصطلاح شرع میں کھانے پینے اور عورت سے مباشرت کرنے سے رکنے اور باز رہنے کا نام صوم ہے، بشرطیکہ وہ طلبہ صوم کا صانع سے لے کر غریب آفتاب تک مسلسل رُک رہا ہو، اور نیت روزہ کی بھی ہو، اس لئے اگر غریب آفتاب کے ایک منٹ پہلے بھی کچھ کھانی لیا تو روزہ نہیں ہوا، اسی طرح اگر ان تمام چیزوں سے پرہیز تو پورے دن پوری احتیاط سے کیا، مگر نیت روزہ کی نہیں کی تو بھی روزہ نہیں ہوا۔

صوم یعنی روزہ ان عبادات میں سے ہے جن کو اسلام کے عہد اور شمار قرار دیا گیا ہو، اس کے فضائل بے شمار ہیں، جن کے تفصیلی بیان کا یہ موقع نہیں۔

پچھلی امتوں میں روزہ کا حکم روزے کی فرضیت کا حکم مسلمانوں کو ایک خاص مثال سے دیا گیا ہے، حکم کے ساتھ یہ بھی ذکر فرمایا کہ یہ روزے کی

فرضیت کچھ تھا جسے ساتھ خاص نہیں، پچھلی امتوں پر بھی روزے فرض کئے گئے تھے، اس سے روزے کی خاص اہمیت بھی معلوم ہوتی، اور مسلمانوں کی دلچسپی کا بھی انتظام کیا گیا کہ روزہ اگرچہ مشقت کی چیز ہو، مگر یہ مشقت تم سے پہلے بھی سب لوگ اٹھاتے آئے ہیں، طبعی بات یہ کہ مشقت میں بہت سے لوگ مبتلا ہوں تو وہ بالکل معلوم ہونے لگتی ہے (روح المعانی) قرآن کریم کے الفاظ **الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ قُلُوبُهُمْ** عام ہیں، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک کی تمام شریعتوں اور امتوں کو شامل ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح نماز کی عبادت سے کوئی شریعت اور کوئی امت خالی نہیں رہی اسی طرح روزہ بھی ہر شریعت میں فرض رہا ہے۔

جن حضرات نے فرمایا ہے کہ **مَنْ قَبِلَ كَفَّ** سے اس جگہ نصاریٰ مراد ہیں وہ بطور ایک مثال کے ہو، اس سے دوسری امتوں کی نفی نہیں ہوتی (روح)

آیت میں صرف اتنا بتلایا گیا ہے کہ روزے جس طرح مسلمانوں پر فرض کئے گئے پچھلی امتوں میں بھی فرض کئے گئے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پچھلی امتوں کے روزے تمام حالات و صفات میں مسلمانوں ہی کے روزوں کے برابر ہوں، مثلاً روزوں کی تعداد، روزوں کے ارتقا کی تحدید، اور یہ کہ کن ایام میں رکھے جائیں، ان امور میں اختلاف ہو سکتا ہے، چنانچہ واقعہ بھی ایسا ہی ہوا، کہ تعداد میں بھی کمی بیشی ہوتی رہی، اور روزے کے ایام اور اوقات میں منسرق ہوتا رہا ہے (روح)

تَعْلَمُ تَعْلَمُ میں اشارہ ہے کہ تقویٰ کی قوت حاصل کرنے میں روزہ کو بڑا دخل ہے، کیونکہ روزہ سے اپنی خواہشات کو قابو میں رکھنے کا ایک مکہ پیدا ہوتا ہے، وہی تقویٰ کی بنیاد ہے۔

مريض کا روزہ **فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا** مریض سے مراد وہ مریض ہے جس کو روزہ رکھنے سے ناقابل برداشت تکلیف پہنچے، یا مرض بڑھ جانے کا قری اندیشہ ہو، بعد کی آیت **وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ بِكُمُ الْمَالَ** میں اس طرف اشارہ موجود ہے، مہجور فقہاء امت کا یہی مسلک ہے۔

مسافر کا روزہ **أَوْ عَلَى سَفَرٍ** یہاں لفظ مسافر کے بجائے علی سفر کا لفظ اختیار فرما کر کئی اہم مسائل کی طرف اشارہ فرمادیا:

اول یہ کہ مطلقاً لغوی سفر یعنی اپنے گھر اور وطن سے باہر نکل جانا روزہ میں رخصت سفر کے لئے کافی نہیں، بلکہ سفر کچھ طویل ہونا چاہئے، کیونکہ لفظ **سَفَرٍ** کا مفہوم یہ ہے کہ

وہ سفر پر سوار ہو جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ گھر سے دس یا پانچ میل چلے جانا مراد نہیں، مگر یہ تحدید کہ سفر کتنا طویل ہو قرآن کے الفاظ میں مذکور نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور صحابہ کے تعامل سے امام اعظم ابو حنیفہؒ اور بہت سے فقہاء نے اس کی مقدار تین سہاروں یعنی وہ مسافت جسکو پیادہ سفر کرنے والا آسانی تین روز میں طے کر سکے، قرار دی ہے، اور ان کے فقہاء نے میلوں کے حساب سے اڑتالیس میل لکھے ہیں۔

دوسرا مسئلہ اسی لفظ علی سقی سے یہ نکلا کہ وطن سے نکل جانے والا مسافر اسی وقت تک رخصت سفر کا مستحق ہے جب تک اس کے سفر کا سلسلہ جاری ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ آرام کرنے یا کچھ کام کر کے کے لئے کسی جگہ ٹھہر جانا مطلقاً اس کے سلسلہ سفر کو ختم نہیں کر دیتا، جب تک کوئی معتد بہ مقدار قیام نہ ہو، اور اسی معتد بہ قیام کی مدت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ثابت ہوئی کہ پندرہ دن ہیں، جو شخص کسی ایک مقام پر پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرے تو وہ علی سقی نہیں کہلاتا، اس لئے وہ رخصت سفر کا بھی مستحق نہیں۔ مسئلہ: اسی سے یہ بھی نکل آیا کہ کوئی شخص پندرہ دن کے قیام کی نیت ایک جگہ نہیں بلکہ متفرق مقامات شہروں اور بستیوں میں کرے تو وہ بدستور مسافر کے حکم میں رہ کر رخصت سفر کا مستحق رہے گا، کیونکہ وہ علی سقی کی حالت میں ہے۔

روزہ کی قضا **قَوْلُهُ يَوْمَ آيَاتٍ أُخْرَى** یعنی مریض و مسافر کو اپنے فوت شدہ روزوں کی گنتی کے مطابق دوسرے دنوں میں روزے رکھنا واجب ہے اس میں بتلانا تو یہ منظور تھا کہ مریض یا سفر کی مجبوری سے جو روزے چھوڑے گئے ہیں ان کی قضا مان لوگوں پر واجب ہے جس کے لئے **قَوْلُهُ الْقَضَاءُ** کا مختصر جملہ بھی کافی تھا، مگر اس کے بجائے **قَوْلُهُ يَوْمَ آيَاتٍ أُخْرَى** سے مراد اشارہ کر دیا گیا کہ مریض و مسافر پر فوت شدہ روزوں کی قضا صرف اس صورت میں واجب ہوگی، جب کہ مریض صحت کے بعد اور مسافر معتیم ہونے کے بعد اتنے دنوں کی ہمت پائے، جنہیں قضا کر سکے، تو اگر کوئی شخص اتنے دن کے پہلے ہی مر گیا تو اس پر قضا یا وصیت فدیہ لازم نہیں ہوگی۔

مسئلہ: **قَوْلُهُ يَوْمَ آيَاتٍ أُخْرَى** میں چونکہ اس کی کوئی قید نہیں کہ ترتیب وار رکھو یا غیر مسلسل رکھے، بلکہ عام اختیاری ہے، اس لئے اگر کوئی شخص جس کے رمضان کے ابتدائی دس روزے قضا ہو گئے ہوں وہ دسویں یا نویں روزے کی قضا پہلے کرے اور ابتدائی روزوں کی قضا بعد میں تو اس میں بھی مضائقہ نہیں، اسی طرح متفرق کر کے قضا روزے رکھے، تو یہ بھی جائز ہے، کیوں کہ **قَوْلُهُ يَوْمَ آيَاتٍ أُخْرَى** میں اس کی گنجائش ہے۔

روزہ کا فدیہ

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ اس آیت کے بے شکست معنی وہی ہیں جو خلاصہ تفسیر میں بتلائے گئے ہیں، مگر جو لوگ مریض یا مسافر کی طرح روزہ رکھنے سے مجبور نہیں بلکہ روزے کی طاقت تو رکھتے ہیں، مگر کسی وجہ سے دل نہیں چاہتا تو ان کے لئے بھی یہ گنجائش ہے کہ وہ روزے کے بجائے روزے کا فدیہ بصورت صدقہ ادا کر دیں، اسکے ساتھ اتنا فرما دیا **وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ**، یعنی تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ روزہ ہی رکھو۔ یہ حکم شروع اسلام میں تھا جب لوگوں کو روزے کا خوگر کرنا مقصود تھا، اس کے بعد جو آیت آنے والی ہے یعنی **مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ**، اس سے یہ حکم عام لوگوں کے حق میں منسوخ کر دیا گیا، صرف ایسے لوگوں کے حق میں اب بھی باجماع امت باقی رہ گیا جو بہت بوڑھے ہوں (جصاص) یا ایسے بیمار ہوں کہ اب صحت کی امید ہی نہیں رہی، جو ہر صحابہ و تابعین کا یہی قول ہے (جصاص، منظری)۔

یحییٰ بخاری و مسلم و ابوداؤد، نسائی، ترمذی، طبرانی وغیرہ تمام ائمہ حدیث نے حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت **وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ** نازل ہوئی تو ہمیں خستیاں دیدیا گیا تھا کہ جس کا جی چاہے روزے رکھے جس کا جی چاہے ہر روزے کا فدیہ دیدے، پھر جب دوسری آیت **مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ** نازل ہوئی تو یہ اختیار ختم ہو کر طاقت والوں پر صرف روزہ ہی رکھنا لازم ہو گیا۔

مسند احمد میں حضرت معاذ بن جبلؓ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ نماز کے معاملات میں بھی ابتدائے اسلام میں تین تغیرات ہوئے اور روزے کے معاملہ میں بھی تین تبدیلیاں ہوئیں، روزے کی تین تبدیلیاں یہ ہیں کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو ہر مہینہ میں تین روزی اور ایک روزہ یوم عاشوراء یعنی دسویں محرم کا رکھتے تھے، پھر رمضان کی فرضیت نازل ہو گئی، گنیمت **عَلَيْكُمْ الْيَقِيَامُ** تو حکم یہ تھا کہ ہر شخص کو خستیاں ہو کہ روزہ رکھے یا فدیہ دیدے، اور روزہ رکھنا بہتر اور افضل ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت **مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ** نازل فرمادی، اس آیت نے متندرست قوی کے لئے یہ اختیار ختم کر کے صرف روزہ رکھنا لازم کر دیا، مگر بہت بوڑھے آدمی کے لئے یہ حکم باقی رہا کہ وہ چاہے تو فدیہ ادا کر دے۔

یہ تو دو تبدیلیاں ہوئیں، تیسری تبدیلی یہ ہوئی کہ شروع میں افطار کے بعد کھانے پینے اور اپنی خواہش پورا کرنے کی اجازت صرف اس وقت تک تھی جب تک آدمی سوئے نہیں، جب سو گیا تو دوسرا روزہ شروع ہو گیا، کھانا پینا وغیرہ ممنوع ہو گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے آیت

أَجِنَ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ الَّذِي نَازَلَ مِنْهُ مَا كَرِهَ آسَانِي عِلَّا فَرَادَى كَرِهَ دَلَّ عَلَى صَحِّحِ
صَادِقِ تَمَكُّنًا بِمَا وَغَيْرِهِ سَبَّ جَائِزٍ هِيَ، سَوَكْرَ أَتْلُفَتِ كَيْ بَعْدَ سَحَرِي كَهَانِي كُوسُنَتِ فِتْرَارِ
وَيَدِيَا لِيَا، صَحِّحِ بَخَارِي، سَلَمُ، الْبُودَاؤُ دَمِي هَبِي اسْ مَضْمُونِ كِي احَادِيثِ آتِي هِي (ابن كثير)

ایک روزہ کا فدیہ نصف صاع گندم یا اس کی قیمت ہے، نصف
فدیہ کی مقدار اور
متعلقہ مسائل

کو مالکانہ طور پر دیدینا ایک روزہ کا فدیہ ہے، بشرطیکہ کسی مجتہد مدرسہ کی خدمت کے معاوضہ میں ہو۔
مسئلہ: ایک روزہ کے فدیہ کو دو آدمیوں میں تقسیم کرنا یا چند روزوں کے فدیہ کو
ایک ہی شخص کو ایک تاریخ میں دینا درست نہیں، جیسا کہ شامی نے بحوالہ بجزاز قنیہ نقل کیا ہے
اور بیان اہل تہران میں اس کو نقل کیا گیا ہے، مگر حضرت نے امداد الفتاویٰ میں فتویٰ اس پر نقل
کیا ہے کہ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں، شامی نے بھی فتویٰ اس پر نقل کیا ہے، البتہ امداد الفتاویٰ
میں ہے کہ احتیاطاً اس میں ہے کہ کسی روزوں کا فدیہ ایک تاریخ میں ایک کو نہ دے، لیکن دیدینے
میں گنجائش بھی ہے، یہ فتویٰ مورخہ ۱۶ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۳ھ امداد الفتاویٰ جلد دوم صفحہ ۱۵۰ میں منقول ہے
مسئلہ: اگر کسی کو فدیہ ادا کرنے کی بھی وسعت نہ ہو تو وہ فقط استغفار کرے اور
دل میں نیت رکھے کہ جب ہو سکے گا ادا کروں گا (بیان القرآن)

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَ

ہینہ رمضان کا ہے جس میں نازل ہوا قرآن ہدایت ہے واسطہ لوگوں کے

بَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ فَمَن شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ

اور دلیل روشن راہ پلنے کی اور حق کو باطل سے مجید کرنے کی سو جو کوئی پائے تم میں سے اس ہینہ کو

فَلْيَصُمْهُ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ

تو ضرور فستے رکھے اس کے اور جو کوئی ہو بیمار یا مسافر تو اس کی گنتی پوری کرتی چاہئے اور

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلَا يُكَلِّمُ الْعِدَّةَ

اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں چاہتا تم پر دشواری اور اس واسطے کہ تم پوری کرو گنتی

وَلِيُكَلِّمُوا اللَّهَ عَلَى مَا هَدَىٰكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۵﴾

اور تاکہ بڑائی کرو اللہ کی اس بات پر کہ تم کو ہدایت کی اور تاکہ تم احسان مانو۔

خلاصہ تفسیر اور ربط آیات

تعیین ایام صیام
اد پر ارشاد ہوا تھا کہ تھوڑے روزہ رکھ لیا کرو، آگے ان تھوڑے دنوں
کا بیان ہے۔

دو تھوڑے ایام جن میں روزے کا حکم ہوا ہے، ماہ رمضان جس میں رابسی برکت ہے کہ اس
کے ایک خاص حصہ یعنی شب قدر میں، قرآن مجید (لوح محفوظ سے آسان دنیا پر) بھیجا گیا ہے،
جس کا ایک (وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے ذریعہ) ہدایت ہے، اور (دوسرا وصف یہ ہے کہ
ہدایت کے طریقے بتلانے میں اس کا جزو جزو) واضح الدلالة ہے، اور ان دونوں وصفوں میں

مجموعہ ان کتب (ساویہ) کے (ہے) جو کہ انہی دو وصفوں سے موصوف ہیں یعنی ذریعہ) ہدایت
(بھی) ہیں اور (وضوح دلالت کی وجہ سے حق و باطل کے درمیان) فیصلہ کرنے والی (بھی) ہیں،
سو جو شخص اس ماہ میں موجود ہو اس کو ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہئے (اور وہ فدیہ کی اجازت جو
اد پر مذکور تھی منسوخ و موقوف ہوئی) اور (مریض اور مسافر کے لئے جو اد پر قانون تھا وہ البتہ
اب بھی اسی طرح باقی ہے کہ) جو شخص (بیمار ہو) جس میں روزہ رکھنا مشکل یا مضرب ہو) یا

(شرعی) سفر میں ہو تو (اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے اور بجائے ایام رمضان
کے) (دوسرے ایام کا) (انتخاب) شمار (کر کے ان میں روزہ رکھنا) اس پر واجب ہے، اللہ تعالیٰ
کو تمہارے ساتھ (احکام میں) آسانی (کی رعایت) کرنا منظور ہے (اس لئے ایسے احکام مستور
کئے جن کو تم آسانی سے بجالا سکو، چنانچہ سفر اور مرض میں کیسا آسان قانون مقرر کر دیا، اور تمہارے

ساتھ احکام و قوانین مقرر کرنے میں) دشواری منظور نہیں (کہ سخت احکام بخوبی کر دیتے) اور
یہ احکام مذکورہ ہم نے خاص خاص مصلحتوں سے مقرر کئے، چنانچہ اولاً روزہ ادا رکھنے کا اور
کبھی شرعی عذر سے وہ جاوے تو دوسرے ایام میں قضا کرنے کا حکم تو اس لئے کیا، تاکہ تم لوگ
(ایام ادا یا قضا کی) شمار کی تکمیل کر لیا کرو، (تاکہ قراب میں کمی نہ رہے) اور (خود قضا رکھنے کا
حکم اس لئے کیا، تاکہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی بزرگی اور ثناء) بیان کیا کرو اس پر کہ تم کو (ایک

ایسا) طریقہ بتلادیا (جس سے تم برکات و منکرات صیام سے محروم نہ رہو، ورنہ اگر قضا
واجب نہ ہوتی تو کون اتنے روزے رکھ کر قراب حاصل کرتا، اور (عذر سے خاص رمضان
میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت اس لئے دیدی) تاکہ تم لوگ (اس نعمت آسانی پر اللہ تعالیٰ کا) شکر

اد کیا کرو (ورنہ اگر یہ اجازت نہ ہوتی تو سخت مشقت ہو جاتی)

معارف و مسائل

اس آیت میں پچھلی جمل آیت کا بیان بھی ہے اور ماہ رمضان کی اعلیٰ فضیلت کا ذکر بھی بیان اس لئے کہ پچھلی آیات میں آیاتاً مَعْفُودٌ ذُو سَبْتٍ کا لفظ بھل ہو جس کی شرح اس آیت نے کر دی کہ وہ پورے ماہ رمضان کے ایام ہیں، اور فضیلت یہ بیان کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ کو اپنی وحی اور آسمانی کتابیں نازل کرنے کے لئے منتخب کر رکھا ہے، چنانچہ قرآن بھی اسی ماہ میں نازل ہوا، مسند احمد میں حضرت دائرہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے رمضان کی پہلی تاریخ میں نازل ہوئے، اور تورات چھ رمضان میں، انجیل تیرہ رمضان اور قرآن چوبیس رمضان میں نازل ہوا، اور حضرت جابرؓ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ زبور بارہ رمضان میں، انجیل اٹھارہ رمضان میں نازل ہوئی (ابن کثیر)

حدیث مذکور میں پچھلی کتابوں کا نزول جس تاریخ میں ذکر کیا گیا ہے اسی تاریخ میں وہ کتابیں پوری کی پوری انبیاء پر نازل کر دی گئی ہیں، قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ رمضان کی ایک رات میں پورا کا پورا لوح محفوظ سے سا بن دیا پر نازل کر دیا گیا، مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا نزول تینیس سال میں رفتہ رفتہ ہوا۔

رمضان کی وہ رات جس میں مشرآن نازل ہوا قرآن ہی کی تصریح کے مطابق شقیہ تھی اِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ، مذکور الصدر حدیث میں اس کو ۲۳ رمضان کی شب بتلایا ہے، اور حضرت حسنؓ کے نزدیک چوبیسویں شب شب قدر ہوتی ہے، اس طرح یہ حدیث آیت قرآن کے مطابق ہو جاتی ہے، اور اگر یہ مطابقت نہ تسلیم کی جائے تو بہر حال قرآن کریم کی تصریح سب پر مقدم ہے جو رات بھی شب قدر ہو وہی اس کی مراد ہوگی۔

مَنْ شَهِدَ مِنْكُمْ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔ اس ایک جملہ میں روزے کے متعلق بہت سے احکام و مسائل کی طرف اشارات ہیں، لفظ شَهِدَ شہود سے بنا ہے، جس کے معنی حضور یعنی حاضر و موجود ہونے کے ہیں، اور اللہ ہی عربی لغت میں ہیبت کے معنی میں آتا ہے، مراد اس سے ہیبت رمضان کا ہے، جس کا ذکر اوپر آیا ہے، اس لئے معنی اس جملے کے یہ ہو گئے کہ تم میں سے جو شخص ماہ رمضان میں حاضر یعنی موجود ہو اس پر لازم ہے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے،

روزہ کے بجائے فدیہ دینے کا عام اختیار جو اس سے پہلی آیت میں مذکور ہے اس جملے نے ملحوظ کر کے روزہ ہی رکھنا لازم کر دیا ہے۔

ماہ رمضان میں حاضر و موجود ہونے کا مفہوم یہی ہے کہ وہ ماہ رمضان کو ایسی حالت میں پائے کہ اس میں روزہ رکھنے کی صلاحیت موجود ہو یعنی مسلمان، عاقل، بالغ، مقیم، حیض و نفاس سے پاک ہو۔

اسی لئے جس شخص کا پورا رمضان ایسی حالت میں گذر گیا کہ اس میں روزہ رکھنے کی مطلق صلاحیت ہی نہیں جیسے کافر، نابالغ، مجنون، توہید لوگ اس حکم کے مخاطب ہی نہیں، اس لئے ان پر گزشتہ رمضان کے روزے فرض ہی نہیں ہوئے، اور جن میں صلاحیت ذاتی طور پر موجود ہو مگر کسی وقت عذر کی وجہ سے مجبور ہو گئے، جیسے حیض و نفاس والی عورت یا مریض اور مسافر، قرآنوں نے ایک چثیت سے ماہ رمضان بحالت صلاحیت پایا، اس لئے حکم آیت کا ان کے حق میں ثابت ہو گیا، مگر وقتی عذر کے سبب اس وقت روزہ معاف ہے، الہتہ بعد میں قضاء لازم ہے، جیسا کہ اس کے بعد تفصیل آئے گی۔

مسئلہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ رمضان کے روزے فرض ہونے کے لئے ماہ رمضان کا بحالت صلاحیت پالینا شرط ہے، اس لئے جس نے پورا رمضان پایا اس پر پورے رمضان کے روزے فرض ہو گئے، جس نے کچھ کم پایا اس پر اتنے ہی دن کے روزے فرض ہو کر جتنے دن رمضان کے پائے، اس لئے وسط رمضان میں جو کافر مسلمان ہوا یا نابالغ بالغ ہوا اس پر صرف آٹھ کے روزے لازم ہوں گے، گزشتہ ایام رمضان کی قضاء لازم نہ ہوگی، البتہ مجنون مسلمان اور بالغ ہونے کے اعتبار سے ذاتی صلاحیت رکھتا ہے، وہ اگر رمضان کے کسی حصہ میں ہوش میں آجائے تو گزشتہ ایام رمضان کی قضاء بھی اس پر لازم ہو جائے گی، اسی طرح حیض و نفاس والی عورت، وسط رمضان میں پاک ہو جائے یا مریض تندرست ہو جائے یا مسافر مقیم ہو جائے تو گزشتہ ایام کی قضاء لازم ہوگی۔

مسئلہ: ماہ رمضان کا پالینا شرعاً عین طریقوں سے ثابت ہوتا ہے، ایک یہ کہ خود رمضان کا چاند دیکھ لے، دوسرے یہ کہ کسی معتبر شہادت سے چاند دیکھنا ثابت ہو جائے، اور جب یہ دونوں صورتیں نہ پائی جائیں تو شعبان کے تیس روز پورے کرنے کے بعد ماہ رمضان شروع ہو جائے گا۔

مسئلہ: شعبان کی انیسویں تاریخ کی شام کو اگر ابرو وغیرہ کے سبب چاند نظر نہ آئے اور کوئی شرعی شہادت بھی چاند دیکھنے کی نہ پہونچے تو اگلے روز یوم الشک کہلاتا ہے، کیونکہ

اُس میں یہ بھی احتمال ہے کہ حقیقت چاند ہو گیا ہو، مگر مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے نظر نہ آیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہو کہ آج چاند ہی مطلع پر نہ آیا ہو، اُس روز میں چونکہ شہر یعنی رمضان کا پالینا صادق نہیں آتا، اس لئے اُس دن کا روزہ رکھنا واجب نہیں بلکہ مکروہ ہے، حدیث میں اس کی مانعت آئی ہے تاکہ فرض اور نفل میں اختلاط اور استہباس نہ پیدا ہو جائے (رجصاص)

مسئلہ: جن ملکوں میں رات دن کئی کئی مہینوں کے طویل ہوتے ہیں وہاں شہر یعنی رمضان کا پالینا بظاہر صادق نہیں آتا، اس کا معنی یہ ہے کہ اُن پر روزے فرض نہیں ہوں، فقہائے حنفیہ میں سے حلوئی اور قبائی وغیرہ نے نماز کے متعلق قرآسی پر فتویٰ دیا ہے کہ ان لوگوں پر اپنے ہی دن رات کے اعتبار سے نماز کا حکم عائد ہو گا، مثلاً جس ملک میں مغرب کے فوراً بعد صبح صادق ہوجاتی ہے وہاں نماز عشاء فرض ہی نہیں دشائی، اس کا معنی یہ ہو کہ جہاں چھ مہینے کا دن ہو وہاں چھ مہینے میں صرف پانچ نمازیں ہوں گی اور رمضان وہاں آئے گا ہی نہیں، اس لئے روزے بھی فرض نہ ہوں گے، حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے امداد الفتاویٰ میں روزے کے متعلق اسی قول کو اختیار فرمایا ہے۔

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مُتْرِكًا أَوْ عَلَى شَيْءٍ قَدْ أَتَاهُ الْحُجْرُ، اس میں مریض اور مسافر کو رخصت دی گئی ہے کہ وہ اُس وقت روزہ نہ رکھیں، تندرستی ہونے پر اور سفر ختم ہونے پر اتنے دنوں کی قضاء کر لیں، یہ حکم اگرچہ پچھلی آیت میں بھی آچکا تھا، مگر جب اس آیت میں روزہ کے بجائے ذبیہ دینے کا اختیار منسوخ کیا گیا ہے تو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید مریض اور مسافر کی رخصت بھی منسوخ ہو گئی ہو اس لئے دوبارہ اس کا اعادہ کر دیا گیا۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۚ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ

اور جب تجھ سے بد چھیں میرے بندے مجھ کو میں تو قریب ہوں قبول کرتا ہوں دعا مانگنے والے کی دعا

إِذَا دَعَا ۚ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿۸۶﴾

جب مجھ سے دعا مانگے تو چاہئے کہ وہ حکم مانیں میرا اور یقین لائیں مجھ پر تاکہ ایک راہ پر آئیں۔

خلاصہ تفسیر مع ربط آیات

پچھلے تین آیتوں میں روزہ اور رمضان کے احکام اور فضائل کا ذکر تھا، اور اس کے

بعد بھی ایک طویل آیت میں روزہ اور اعتکاف کے احکام کی تفصیل ہو، درمیان کی اس مختصر آیت میں بندوں کے حال پر حق تعالیٰ کی خاص عنایت، ان کی دعائیں سننے اور قبول کرنے کا ذکر و نشر اور اطاعت احکام کی ترغیب دی گئی ہے، کیونکہ روزہ کی عبادت میں رخصتوں اور سہولتوں کے باوجود کسی قدر مشقت ہے، اس کو سہل کرنے کے لئے اپنی مخصوص عنایت کا ذکر فرمایا کہ میں اپنے بندوں سے قریب ہی ہوں جب بھی وہ دعا مانگتے ہیں میں اُن کی دعائیں قبول کرتا ہوں اور ان کی حاجات کو پورا کر دیتا ہوں۔

ان حالات میں بندوں کو بھی چاہئے کہ میرے احکام کی تعمیل میں کچھ مشقت بھی ہو تو برداشت کریں، اور امام ابن کثیرؒ نے اس درمیان جملہ ترغیب و دعا کی یہ حکمت بتلائی ہے کہ اس آیت نے اشارہ کر دیا کہ روزہ کے بعد دعا قبول ہوتی ہے، اس کو دعا کا خاص اہتمام کرنا چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّمَا شَرَعْتُ فِطْرًا دَعَا ۖ
مُسْتَجَابَةً (ابوداؤد طحاوی)

یعنی روزہ افطار کرنے کے وقت روزہ کی دعا مقبول ہے۔

بروایت عبد اللہ بن عمرؓ

اسی لئے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ افطار کے وقت سب گھر والوں کو جمع کر کے دعا کیا کرتے تھے تفسیر آیت کی یہ ہے:

اور ولے محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں کہ میں ان سے قریب ہوں یا دور (تو میری طرف سے اُن سے فرما دیجئے کہ) میں قریب ہی ہوں اور یا استثناء نامناسب درخواست کے منظور کر لیتا ہوں (ہر عرضی درخواست کرنے والے کی جب کہ وہ میرے حضور میں درخواست ہے، سو جس طرح میں اُن کی عرض عرض کو منظور کر لیتا ہوں) ان کو چاہئے کہ میرے احکام کو (بجا آوری کے ساتھ) قبول کیا کریں اور چونکہ ان احکام میں کوئی حکم نامناسب نہیں اس لئے اس میں استثناء ممکن نہیں) اور مجھ پر یقین رکھیں (یعنی میری ہستی پر بھی میرے حاکم ہونے پر بھی میرے حکم ہونے پر اور رحمت و مصالح پر بھی اس طرح) امید ہو کہ وہ لوگ رشد و فلاح حاصل کر سکیں گے۔

مسئلہ: اس آیت میں (إِنِّي قَرِيبٌ) فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ دعا مانگنا آسان اور خفیہ کرنا چاہئے، دعا میں آواز بلند کرنا پسند نہیں، ابن کثیرؒ نے آیت کا شان نزول بھی ذکر کیا ہے کہ کبھی گاؤں والے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ہمارا رب اگر ہم سے قریب ہو تو ہم دعا آہستہ آواز سے مانگا کریں، اور وہ تو بلند آواز سے پکارا کریں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

أَحِلَّ لَكُمْ كَيْلَ الصَّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ

حلال ہوا تم کو روزہ کی رات میں بے حجاب ہونا اپنی عورتوں سے وہ پوشاک ہیں تمہاری

وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ مَا عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ

اور تم پوشاک ہو ان کی اللہ کو معلوم ہو کہ تم خیانت کرتے تھے اپنی جانوں سے

فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مِمَّا كَتَبَ

سرمحلت کیا تم کو اور درگزر کی تم سے پھر ملو اپنی عورتوں سے اور طلب کرو اس کو جو لکھ دیا ہو

اللَّهُ لَكُمْ مِمَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ وَأَشْرُ بُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ

اللہ نے تمہارے لئے اور کھار اور بزد جب تک کہ صاف نظر آئے تم کو دھاری صبح کی جدا دھاری

مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتُمُوا الصَّيَامَ إِلَى الْبَلِّ

سیاہ سے پھر پورا کرو روزہ کو رات تک

وَلَا بَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ

اور نہ ملو عورتوں سے جب تک کہ تم اعتکاف کرو مسجدوں میں یہ حدیں باندھیں ہوئی ہیں اللہ کی

فَلَا تَقْرَبُوهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ

سو ان کے نزدیک نہ جاؤ اس طرح بیان فرماتا ہو اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے واسطے تاکہ وہ بچے رہیں

خلاصہ تفسیر

حکم چہارم، رمضان کی راتوں میں جماع اس آیت میں روزہ کے بقیہ احکام کی کچھ تفسیر مذکور ہے

تم لوگوں کے واسطے روزہ کی شب میں اپنی بیویوں

سے مشغول ہونا حلال کر دیا گیا اور پہلے جو اس سے مانعت تھی وہ موقوف کی گئی (کیونکہ بوجہ قرب و اتصال

کے وہ تمہارے (بھائے) اور بھینچے بھرنے (کے) ہیں اور تم ان کے (بھائے) اور بھینچے بھرنے (کے) ہو، اللہ تعالیٰ

کو اس کی خبر تھی کہ تم (اس علم انہی میں) خیانت (کر) گئے گناہ میں اپنے کو مبتلا کر رہے تھے (مگر) خیر (جب

تم معذرت سے پیش آئے تو) اللہ تعالیٰ نے تم پر عنایت فرمائی اور تم سے گناہ کو دھو دیا، سو

رجب اجازت ہو گئی تو اب ان سے ملو ملاؤ اور جو (قانون اجازت) تمہارے لئے تجویز کر دیا ہو

(بے تکلف) اس کا سامان کرو اور (جس طرح شب صیام میں بی بی سے ہمبستری کی اجازت ہو

اسی طرح یہ بھی اجازت ہو کہ تمام رات میں جب چاہو) کھاؤ (بھی) اور پیو (بھی) اس وقت تک

کہ تم کو سفید خط صبح (صادق کی روشنی) کا متمیز ہو جاوے سیاہ خط سے (یعنی رات کی تاریکی سے)

تو پھر صبح صادق سے رات (آگے) تک روزہ کو پورا کیا کرو۔

صبح کی سفیدی کا سفید خط رات کی تاریکی کے سیاہ خط سے متمیز ہو جانے سے مراد یہ ہے

کہ صبح صادق یقینی طور سے ثابت ہو جائے۔

حکم پنجم اعتکاف اور ان بیبیوں (کے بدن) سے اپنا بدن بھی (دشوہت کے ساتھ) مت ملنے

دو جس زمانے میں کہ تم لوگ اعتکاف والے ہو (جو کہ) مسجدوں میں

(ہوا کرتا ہے) یہ سب احکام مذکورہ خداوندی ضابطے ہیں، سو ان (ضابطوں) سے (کلنا تو کیسا)

نکلنے کے نزدیک بھی مت ہونا (اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ احکام بیان کئے ہیں) اسی طرح

اللہ تعالیٰ اپنے (اور) احکام (بھی) لوگوں (کے) واسطے بیان فرمایا کرتے ہیں، اس

امید پر کہ وہ لوگ احکام پر مطلع ہو کر ان احکام کے خلاف کرنے سے پرہیز رکھیں۔

معارف و مسائل

أَحِلَّ لَكُمْ کے لفظ سے معلوم ہوا کہ جو چیز اس آیت کے ذریعہ حلال کی گئی ہے وہ

اس سے پہلے حرام تھی، صبح بخاری وغیرہ میں بروایت براہ بن عازب مذکور ہے کہ ابتداء میں

جب رمضان کے روزے فرض کئے گئے تو انظار کے بعد کھانے پینے اور بیبیوں کے ساتھ

اختلاط کی صرف اس وقت تک اجازت تھی جب تک سو نہ جائے، سو جانے کے بعد یہ سب

چیزیں حرام ہو جاتی تھیں، بعض صحابہ کرام کو اس میں مشکلات پیش آئیں، قیس بن صرمہ انصاری

دن بھر مزدوری کر کے انظار کے وقت گھر پہنچے تو گھر میں کھانے کے لئے کچھ نہ تھا، بیوی نے

کہا کہ میں کہیں سے کچھ انتظام کر کے لاتی ہوں جب وہ واپس آئی تو دن بھر کے بھوکے بچوں کی وجہ سے

ان کی آنکھ لگ گئی، اب بیدار ہوئے تو کھانا حرام ہو چکا تھا، اگلے دن اسی طرح روزہ رکھا،

دو پہر کو ضعف سے بیہوش ہو گئے، (ابن کثیر) اسی طرح بعض صحابہ شہرے کے بعد اپنی بیبیوں

کے ساتھ اختلاط میں مبتلا ہو کر پریشان ہوئے، ان واقعات کے بعد یہ آیت نازل ہوئی

جس میں پہلا حکم منسوخ کر کے غروب آفتاب کے بعد سے طلوع صبح صادق تک پوری رات

میں کھانے پینے اور مباشرت کی اجازت دیدی گئی، اگرچہ ذکر اٹھنے کے بعد ہو، بلکہ سو کر اٹھنے

کے بعد آخر شب میں حسری کھانا سنت قرار دیا گیا، جس کا ذکر روایات حدیث میں واضح ہے، اس آیت میں اسی حکم کا بیان کیا گیا ہے۔

روزے کے لغظی معنی اگرچہ عام ہیں، ایک مرد بی بی سے اپنی خواہش پورا کرنے کے لئے جو کچھ کرنا چاہتا ہے وہ سب اس میں شامل ہے لیکن اتفاقاً سنت اس جگہ اس سے مراد چھوٹے شربت احکام شرعیہ کے لئے اس آیت نے جس حکم کو منسوخ کیا ہے، یعنی سو جانے کے بعد کھانے، پینے وغیرہ کی حرمت کو، یہ حکم قرآن میں کہیں مذکور نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے صحابہ کرام اس حکم پر عمل کرتے تھے، ان کا وہ احادیث، اس آیت کے حکم الہی قرار دیکر منسوخ کیا اس آیت میں پہلے حکم کو حکم الہی قرار دیا گیا، اور پھر آسانی کے لئے اس کو منسوخ کیا گیا، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سنت سے ثابت شدہ بعض احکام کو قرآن کے ذریعہ بھی منسوخ کیا جاسکتا ہے۔ (جصاص وغیرہ)

سحری کھانے کا آخری وقت

تحقیق یتبیین نکھڑ الحقیظ الکتب میں اس آیت میں رات کی تاریکی کو سیاہ خط اور صبح کی روشنی کو سفید خط کی مثال سے بتلا کر روزہ شروع ہونے اور کھانا پینا حرام ہو جانے کا صحیح وقت متعین فرما دیا، اور اس میں الزام و تفریط کے احتمالات کو ختم کرنے کے لئے تحقیق یتبیین کا لفظ بڑھا دیا جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ نہ تو وہی مزاج لوگوں کی طرح صبح صادق سے کچھ پہلے ہی کھانے پینے وغیرہ کو حرام سمجھو، اور نہ ایسی بے فکری اختیار کر دو کہ صبح کی روشنی کا یقین ہو جانے کے بعد جو کھانا پیتے رہو، بلکہ کھانے پینے اور روزہ کے درمیان حد فاصل صبح صادق کا یقین ہے، اس یقین سے پہلے کھانے پینے کو حرام سمجھنا درست نہیں، اور یقین کے بعد کھانے پینے میں مشغول رہنا بھی حرام اور روزے کے لئے مفسد ہے، اگرچہ ایک ہی منٹ کے لئے ہو، حسری کھانے میں وسعت اور گنجائش صرف اسی وقت تک ہے جب تک صبح صادق کا یقین نہ ہو، بعض صحابہ کرام کے ایسے واقعات کو بعض کہنے والوں نے اس طرح بیان کیا کہ سحری کھاتے ہوئے صبح ہو گئی اور وہ بے پردائی سے کھاتے رہے، یہ اسی پر مبنی تھا کہ صبح کا یقین نہیں ہوا تھا اس لئے کہنے والوں کی جلد بازی سے متاثر نہیں ہوئے۔

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت بلالؓ کی اذان تمہیں سحری کھانے سے مانع نہ ہونی چاہئے، کیونکہ وہ رات سے اذان دیدیتے ہیں، اس لئے تم بلالؓ کی اذان سن کر بھی اُس وقت تک کھاتے پیتے رہو جب تک اہل اتم بکھڑا کی اذان نہ سنو، کیونکہ وہ ٹھیک طلوع صبح صادق پر اذان دیتے ہیں (بخاری و مسلم)

اس حدیث کے اتمام نقل کرنے سے بعض معاصرین کو یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ اذان فجر کے بعد بھی کچھ دیر کھایا پیا جائے تو معتاقہ نہیں، اور جس شخص کی آنکھ دیر میں کھلی کہ صبح کی اذان ہو رہی تھی اس کے لئے جائز کر دیا کہ وہ جلدی جلدی کچھ کھالے، حالانکہ اسی حدیث میں واضح طور پر بتلادیا گیا ہے کہ اذان ابن ام بکتوم جو ٹھیک طلوع فجر کے ساتھ ہوتی تھی اس پر کھانے سے رک جانا ضروری ہے، اس کے علاوہ قرآن کریم نے خود جو حد بندی فرمادی ہے وہ طلوع صبح کا یقین پر اس کے بعد ایک منٹ کے لئے بھی کھانے پینے کی اجازت دینا نص قرآن کی خلاف ورزی ہے، صحابہ کرامؓ اور اسلاف امت سے جو افطار و سحری مسابقت کی روایات منقول ہیں ان سب کا عمل نص قرآن کے مطابق ہی ہو سکتا ہے کہ یقین صبح صادق سے پہلے زیادہ احتیاطی تنگی اختیار نہ کی جائے، امام ابن کثیرؒ نے بھی ان روایات کو اسی بات پر محمول فرمایا ہے، ورنہ نص قرآن کی صریح مخالفت کو کون مسلمان برداشت کر سکتا ہے، اور صحابہ کرامؓ سے تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا خصوصاً جبکہ قرآن کریم نے (اسی آیت کے اخیر میں) تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ کے ساتھ فلا تغربا فرما کر خاص احتیاط کی تاکید بھی فرمادی ہے۔

مسئلہ: یہ سب کلام ان لوگوں کے بارے میں ہے جو ایسے مقام پر ہیں جہاں سے صبح صادق کو چشم خود دیکھ کر یقین حاصل کر سکتے ہیں، اور مطلع بھی صاف ہے، اور وہ صبح صادق کی ابتدائی روشنی کی پہچان بھی رکھتے ہیں، تو ان کو لازم ہے کہ براہ راست افق کو دیکھ کر عمل کریں، اور جہاں یہ صورت نہ ہو مثلاً کھلا ہوا افق سامنے نہیں یا مطلع صاف نہیں، یا اس کو صبح صادق کی پہچان نہیں، اس لئے وہ دوسرے آثار و علامات یا ریاضی حسابات کے ذریعہ وقت کا تعین کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کے لئے کچھ وقت ایسا لگے گا کہ صبح صادق کا ہو جانا مشکوک ہو یقین نہ ہو، ایسے لوگوں کو مشکوک حالت میں کیا کرنا چاہئے، اس کے متعلق امام جصاصؒ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس حالت میں اصل تو یہی ہے کہ کھانے پینے پر اقدام نہ کرے، لیکن مشکوک حالت میں صبح صادق کا یقین ہونے سے پہلے پہلے کسی نے کچھ کھالی لیا تو گناہگار نہیں ہوگا، لیکن اگر بعد میں تحقیق سے یہ ثابت ہو گیا کہ اُس وقت صبح ہو چکی تھی تو قضاء اس کے ذمہ لازم ہے، جیسے شروع رمضان میں چاند نظر نہ آیا اور لوگوں نے روزہ نہیں رکھا، مگر بعد میں شہادت سے ۲۹ کا چاند ثابت ہو گیا، تو جن لوگوں نے اس دن کو شعبان کی تیسویں تاریخ سمجھ کر روزہ نہیں رکھا تھا، وہ گناہگار تو نہیں ہوئے، مگر اس روزے کی قضاء اُن پر باقائ لازم ہے، اسی طرح بادل کے دن میں غروب کے گمان پر روزہ افطار کر لیا، بعد میں آفتاب نکل آیا، تو یہ شخص گناہگار تو نہیں مگر قضاء اس پر واجب ہے۔

امام جصاصؒ کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جس شخص کی آنکھ دیر میں کھلی اور عام طور پر صبح کی اذان ہوئی تھی جس سے صبح ہونے کا یقین لازمی ہے، وہ جان بوجھ کر اس وقت کچھ کھائے گا تو وہ گناہگار بھی ہوگا اور قضاء بھی اس پر لازم ہوگی، اور مشکوک حالت میں کھائے گا تو گناہ ساقط ہو جائے گا، مگر قضاء ساقط نہ ہوگی، اور کسی نہ کسی درجہ میں کراہت بھی ہوگی۔

اعتکاف اور اعتکاف کے لغوی معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں، اور اصطلاح قرآن و سنت اس کے مسائل میں خاص شرائط کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنے اور قیام کرنے کا نام اعتکاف ہے۔ لغظ فی المساجد کے عموم سے ثابت ہوا کہ اعتکاف ہر مسجد میں ہو سکتا ہے، حضرات فقہاء نے جو یہ شرط بیان کی ہو کہ اعتکاف صرف اس مسجد میں ہو سکتا ہے جس میں جماعت ہوتی ہو غیر آبا و جد جہاں جماعت نہ ہوتی ہو اس میں اعتکاف درست نہیں، یہ شرط درحقیقت مسجد کے مفہوم ہی سے مستفاد ہے، کیونکہ مساجد کے بنانے کا اصل مقصد جماعت کی نماز ہے، ورنہ تنہا نماز تو ہر جگہ دکان مکان وغیرہ میں ہو سکتی ہے۔

مسئلہ: روزے کی رات میں کھانا، پینا، بی بی سے مباشرت سب کا حلال ہونا اور پر بیان ہوا ہے، حالت اعتکاف میں کھانے پینے کا تو وہی حکم ہو جو سب کے لئے ہے، مگر مباشرت نساء کے معاملہ میں الگ ہے، کہ وہ رات میں بھی جائز نہیں اس لئے اس آیت میں اسی کا حکم بتایا گیا ہے۔

مسئلہ: اعتکاف کے دو سکر مسائل کہ اس کے ساتھ روزہ شرط ہے، اور یہ کہ اعتکاف میں مسجد بھٹکنا بغیر حاجت طبعی یا شرعی کے جائز نہیں، کچھ اسی لفظ اعتکاف سے مستفاد ہیں کچھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے۔

آخر آیت میں یَلْقَىٰ حَذْرُ اللَّهِ فَلَا تَغْزُوا بَیْهَا، فرما کر اشارہ کر دیا کہ روزے میں کھانے پینے اور مباشرت کی جو ممانعت ہے یہ اللہ کے حدود ہیں، ان کے قریب بھی مت جاؤ، کیونکہ قریب جانے سے حد شکنی کا احتمال ہے، اسی لئے روزہ کی حالت میں کلی کرنے میں مبالغہ کرنا مکروہ ہے، جس سے پانی اندر جانے کا خطرہ ہو، منہ کے اندر کوئی دوا استعمال کرنا مکروہ ہے، بی بی سے بوس کنا مکروہ ہے، اسی طرح سحری کھانے میں احتیاطاً وقت ختم ہونے سے دو چار منٹ پہلے ختم کرنا اور افطار میں دو تین منٹ مؤخر کرنا، بہتر ہے، اس میں بے پروائی اور ہل انگاری اس ارشاد پر خدا زیدی کے خلاف ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدُّوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ

اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں باطل اور نہ پہنچاؤ ان حکاموں تک کہ

لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۵﴾

کھا جاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کر کے (باطل)، اور تم کو معلوم ہے۔

ربط آیات خلاصہ تفسیر

پچھلی آیتوں میں روزے کے احکام مذکور تھے، جس میں حلال چیزوں کے استعمال کو ایک معین زمانے میں اور معین وقت میں حرام کر دیا گیا ہے، اس کے بعد مال حرام حاصل کرنے اور اس کے استعمال کرنے کی ممانعت اسی مناسبت سے ذکر کی گئی کہ عبارت صوم کا اصل منشاء یہی ہے کہ انسان کچھ عرصے حلال چیزوں سے بھی صبر کا خوگر ہو جائے گا، تو حرام چیزوں سے بچنا آسان ہو جائے گا، نیز یہ مناسبت بھی ہو کہ جب روزہ ختم ہوا فطار کے لئے مالی حلال ہٹا کر تا چاہئے، جس نے دن بھر روزہ رکھا شام کو مال حرام سے افطار کیا اس کا روزہ اللہ کے نزدیک قبول نہیں۔

حکم ششم، مال حرام سے بچنا اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق مت کھاؤ اور ان (کے جھوٹے مقدمہ) کو حکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ (اس کے ذریعہ سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریق گناہ (یعنی ظلم) کے کھا جاؤ، جبکہ تم کو (اپنے جھوٹ اور ظلم کا) علم بھی ہو۔

معارف و مسائل

اس آیت میں حرام طریقوں سے مال حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی ممانعت ہے، جس طرح اس سے پہلے اسی سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۶۸ میں حلال طریقہ پر حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی اجازت کا بیان گزر چکا ہے، جس میں ارشاد ہے:

۱۔ میں اسے لوگوں کا دوزخ میں سے ہے جو چیزیں حلال اور حلال ہیں اور شیطان کے قدم پر چلے گا کیونکہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ

امام جصاصؒ کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جس شخص کی آنکھ دیر میں کھلی اور عام طور پر صبح کی اذان ہوئی تھی جس سے صبح ہونے کا یقین لازمی ہے، وہ جان بوجھ کر اس وقت کچھ کھائے گا تو وہ گناہگار بھی ہوگا اور قضاء بھی اس پر لازم ہوگی، اور مشکوک حالت میں کھائے گا تو گناہ ساقط ہو جائے گا، مگر قضاء ساقط نہ ہوگی، اور کسی نہ کسی درجہ میں کراہت بھی ہوگی۔

اعتکاف اور اعتکاف کے لغوی معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں، اور اصطلاح قرآن و سنت اس کے مسائل میں خاص شرائط کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنے اور قیام کرنے کا نام اعتکاف ہے۔ لغظ فی المساجد کے عموم سے ثابت ہوا کہ اعتکاف ہر مسجد میں ہو سکتا ہے، حضرات فقہاء نے جو یہ شرط بیان کی ہو کہ اعتکاف صرف اس مسجد میں ہو سکتا ہے جس میں جماعت ہوتی ہو غیر آبا مسجد جہاں جماعت نہ ہوتی ہو اس میں اعتکاف درست نہیں، یہ شرط درحقیقت مسجد کے مفہوم ہی سے مستفاد ہے، کیونکہ مساجد کے بنانے کا اصل مقصد جماعت کی نماز ہے، ورنہ تنہا نماز تو ہر جگہ دکان مکان وغیرہ میں ہو سکتی ہے۔

مسئلہ: روزے کی رات میں کھانا، پینا، بی بی سے مباشرت سب کا حلال ہونا اور پر بیان ہوا ہے، حالت اعتکاف میں کھانے پینے کا تو وہی حکم ہو جو سب کے لئے ہے، مگر مباشرت نساء کے معاملہ میں الگ ہے، کہ وہ رات میں بھی جائز نہیں اس لئے اس آیت میں اسی کا حکم بتایا گیا ہے۔

مسئلہ: اعتکاف کے دو سکر مسائل کہ اس کے ساتھ روزہ شرط ہے، اور یہ کہ اعتکاف میں مسجد بھٹکنا بغیر حاجت طبعی یا شرعی کے جائز نہیں، کچھ اسی لفظ اعتکاف سے مستفاد ہیں کچھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے۔

آخر آیت میں یَلْقَیْکُمْ ذُو اللّٰہِ فَلَآ تَقْرَءُوْہَا، فرما کر اشارہ کر دیا کہ روزے میں کھانے پینے اور مباشرت کی جو ممانعت ہے یہ اللہ کے حدود ہیں، ان کے قریب بھی مت جاؤ، کیونکہ قریب جانے سے حد شکنی کا احتمال ہے، اسی لئے روزہ کی حالت میں کلی کرنے میں مبالغہ کرنا مکروہ ہے، جس سے پانی اندر جانے کا خطرہ ہو، منہ کے اندر کوئی دوا استعمال کرنا مکروہ ہے، بی بی سے بوس کنا مکروہ ہے، اسی طرح سحری کھانے میں احتیاطاً وقت ختم ہونے سے دو چار منٹ پہلے ختم کرنا اور افطار میں دو تین منٹ مؤخر کرنا، بہتر ہے، اس میں بے پروائی اور ہل انگاری اس ارشاد خدا ربی کے خلاف ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدُّوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ

اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق اور نہ پہنچاؤ ان حکاموں تک کہ

لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۵﴾

کھا جاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کر کے (ناحق)، اور تم کو معلوم ہے۔

ربط آیات خلاصہ تفسیر

پچھلی آیتوں میں روزے کے احکام مذکور تھے، جس میں حلال چیزوں کے استعمال کو ایک معین زمانے میں اور معین وقت میں حرام کر دیا گیا ہے، اس کے بعد مال حرام حاصل کرنے اور اس کے استعمال کرنے کی ممانعت اسی مناسبت سے ذکر کی گئی کہ عبارت صوم کا اصل منشاء یہی ہے کہ انسان کچھ عرصے حلال چیزوں سے بھی صبر کا خوگر ہو جائے گا، تو حرام چیزوں سے بچنا آسان ہو جائے گا، نیز یہ مناسبت بھی ہو کہ جب روزہ ختم ہوا فطار کے لئے مالی حلال ہٹا کر تا چاہئے، جس نے دن بھر روزہ رکھا شام کو مال حرام سے افطار کیا اس کا روزہ اللہ کے نزدیک قبول نہیں۔

حکم ششم، مال حرام سے بچنا اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق مت کھاؤ اور ان (کے جھوٹے مقدمہ) کو حکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ (اس کے ذریعہ سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریق گناہ (یعنی ظلم) کے کھا جاؤ، جبکہ تم کو (اپنے جھوٹ اور ظلم کا) علم بھی ہو۔

معارف و مسائل

اس آیت میں حرام طریقوں سے مال حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی ممانعت ہے، جس طرح اس سے پہلے اسی سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۶۸ میں حلال طریقہ پر حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی اجازت کا بیان گزر چکا ہے، جس میں ارشاد ہے:

۱۔ میں اسے لوگوں کا دوزخ میں سے ہے جو چیزیں حلال اور حلال ہیں اور شیطان کے قدم پر چلے گا کیونکہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ

اور سورۃ نمل آیت ۱۴ میں ارشاد فرمایا۔

كُلُّوْا مِنْ ثَمَرِهِۦٓ اِذَا ثَمَرَتْ لَكُمْ اَنْۢشُۡرُۤهُۥ حَلٰلًا
مِّمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ اِنَّكُمْ لَشٰكِرُوْنَ ۝

یعنی کھاؤ جو روزی دی تم کو اللہ تعالیٰ نے
ملاں اور پاک اور شکر کر اللہ کے احسان
کا اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو۔

کسب مال کے اچھے برے ذرائع
اور اچھائی بُرائی کا معیار

جس طرح مال کی ضرورت اور مدار زندگی ہونے پر
ساری دنیا اور اس کی ہر قوم و ملت کا اتفاق ہے،
اسی طرح اس پر بھی اتفاق ہے کہ اس کی تحصیل کے

کچھ ذرائع پسندیدہ اور جائز ہیں، کچھ ناپسند اور منوع ہیں، چوری، ڈاکہ، دھوکہ، فریب کو ساری ہی
دنیا بُرا سمجھتی ہے، لیکن ان ذرائع کے جائز یا ناجائز ہونے کا کوئی صحیح معیار عام طور پر لوگوں کے ہاتھ میں
نہیں، اور ہر بھی نہیں سکتا، کیونکہ اس کا تعلق پوری دنیا کے انسانوں کی صلاح و فلاح سے ہے اور
پورا عالم انسانیت اس سے متاثر ہوتا ہے، اس کا صحیح اور معقول معیار صرف وہی ہو سکتا ہے جو
رب العالمین کی طرف سے بذریعہ وحی بھیجا گیا ہو، ورنہ اگر خود انسان اس کا معیار بنانے کا اختیار ہو
تو جو لوگ اس کا قانون بناتیں گے وہ اپنی قوم یا اپنے وطن یا اپنی ملت کے بارے میں جو کچھ سوچیں گے
وہ عام عادت کے مطابق اس سے مختلف ہوگا جو دوسری قومیں اور وطنوں کے متعلق سوچا جائے گا۔
اور بین الاقوامی کانفرنسوں کی صورت میں پوری دنیا کی نمائندگی کی جائے تو نتیجہ یہ شاید ہو کہ وہ بھی
ساری مخلوق کو مطمئن کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتی، جس کا نتیجہ یہ ہو کہ یہ قانونی نا انصافی انجام کار
جنگ و جدل اور فساد کی صورت اختیار کرے گی۔

اسلامی نظام معاش ہی شریعت اسلام نے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا جو قانون بنایا، اگر وہ حشر و وحی الہی
دنیا میں قائم کر سکتا ہو، اسے ہی اس کے مستفاد اور وہی ایک ایسا معقول فطری و جمیع قانونی جو ہر قوم و ملت
اور ہر ملک و وطن میں چل سکتا ہے، اور اس میں عامہ کا ضامن ہو سکتا ہے، کیونکہ اس قانون الہی میں قابل
اشتراک چیزوں کو مشترک اور وقف عام رکھا گیا ہے، جس میں تمام انسان مساوی حق رکھتے ہیں جیسے
ہوا پانی، خورد و گھاس، آگ کی حرارت اور غیر ملوک جنگلات اور غیر آباد زمینیں جی جنگلات کی پیداوار
وغیرہ کہ ان میں سب انسانوں کا مشترک حق ہے، کسی کو ان پر مالکانہ قبضہ جائز نہیں اور جن چیزوں
کے اشتراک میں انسانی معاشرت میں خلل پیدا ہوتا ہے، یا نزاع و جدل کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں
ان میں انفرادی ملکیت کا قانون جاری فرمایا گیا، کسی زمین یا اس کی پیداوار پر ابتدائی ملکیت
کا قانون جُدا ہے، اور پھر انتقال ملکیت کا جُدا اس قانون کی ہر دفعہ میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ کوئی
انسان ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے، بشرطیکہ وہ اپنی جدوجہد ان کی تحصیل میں خرچ کرے،

اور کوئی انسان دوسروں کے حقوق غصب کر کے یا دوسروں کو نقصان پہنچا کر سرمایہ کو جمع و دافرا میں
مقیب نہ کرے، انتقال ملکیت خواہ بعد الموت وراثت کے قانون الہی کے مطابق ہو، یا پھر بیع و شرا
وغیرہ کے ذریعہ فریقین کی رضامندی سے ہو، مزدوری ہو یا کسی مال کا معاوضہ دونوں میں اس کو
ضروری قرار دیا گیا کہ معاملہ میں کوئی دھوکہ، فریب، یا تلبیس نہ ہو، اور کوئی ایسا ابہام اور اجمال
نہ رہے جس کی وجہ سے باہمی منازعت کی فوجت آئے۔

یہ اس کی بھی رعایت رکھی گئی ہے کہ فریقین جو رضامندی دے رہے ہیں وہ حقیقی رضامندی
ہو، کسی انسان پر دباؤ ڈال کر کوئی رضامندی نہ لی گئی ہو، شریعت اسلام میں جتنے معاملات ہل یا
فاسد اور گناہ کہلاتے ہیں ان سب کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ ان میں وجوہ مذکور ہیں کسی وجہ سے
خلل ہوتا ہے، کہیں دھوکہ فریب ہوتا ہے، کہیں نامعلوم چیز یا نامعلوم عمل کا معاوضہ ہوتا ہے،
کہیں کسی کا حق غصب ہوتا ہے، کہیں کسی کو نقصان پہنچا کر اپنا نفع کیا جاتا ہے، کہیں حقوق عامہ
میں ناجائز تصرف ہوتا ہے، سود، قمار وغیرہ کو حرام قرار دینے کی اہم وجہ یہ ہے کہ وہ حقوق عامہ
کے لئے مضرب ہیں، ان کے نتیجے میں چند افراد پلتے بڑھتے ہیں، اور پوری ملت مفلس ہوتی ہے،
ایسے معاملات فریقین کی رضامندی سے بھی اس لئے حلال نہیں کہ وہ پوری ملت کے خلاف
ایک جرم ہے، آیت مذکورہ ان تمام ناجائز صورتوں پر مادی ہے، ارشاد ہے، وَلَا تَكُنْ مِنَ الْاَخْسَارِ
بِئْسَ تَكْنُفٌ لِّلْبَاطِلِ، یعنی نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق پر، اس میں ایک بات تو یہ قابل
غور ہو کہ قرآن کریم کے الفاظ میں آمْنًا اَلْكُفْمُ آیا ہے جس کے اصلی معنی ہیں اپنے اموال جس
میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا کہ تم جو کہیں دوسرے کے مال میں ناجائز تصرف کرتے ہو تو یہ غور
کر دو کہ دوسرے شخص کو بھی اپنے مال سے ایسی ہی محبت اور تعلق ہوگا جیسا تمہیں اپنے مال
سے ہے، اگر وہ تمہارے مال میں ایسا ناجائز تصرف کرتا تو تمہیں جو دکھ پہنچاؤں گا اس کا اس وقت بھی
ایسا ہی احساس کرو کہ گویا وہ تمہارا مال ہو۔

اس کے علاوہ اشارہ اس طرف بھی ہو سکتا ہے کہ جب ایک شخص دوسرے کے مال میں
کوئی ناجائز تصرف کرتا ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ اگر یہ رسم چل پڑی تو دوسرے اس کے
مال میں ایسا ہی تصرف کریں گے، اس حیثیت سے کسی شخص کے مال میں ناجائز تصرف و حقیقت
اپنے مال میں ناجائز تصرف کے لئے راستہ ہموار کرنا ہے، غور کیجئے اسشیاء ضرورت میں ملاؤ
کی رسم چل جائے، کوئی گھی میں تیل یا چربی ملا کر تاد پیسے حاصل کرے، تو اس کو جب دودھ خریدنے
کی ضرورت پڑے گی دودھ والا اس میں پانی ملا کر دے گا، مسالہ کی ضرورت ہوگی اس میں ملاؤ
ہوگی، دوا کی ضرورت ہوگی اس میں بھی یہی منظر سامنے آئے گا، تو جتنے پیسے ایک شخص نے ملاؤ

کر کے زائد حاصل کرنے، دوسرا آدمی وہ ہے اس کی جیب نکال لیتا ہے، اسی طرح دوسرے کے پیسے تیسرا نکال لیتا ہوا یہ بیوقوف اپنی جگہ بیسیوں کی زیادتی شمار کر کے خوش ہوتا ہے، مگر انجام نہیں دیکھتا کہ اس کے پاس کیا رہا، تو جو کوئی دوسرے کے مال کو غلط طریقے سے حاصل کرتا ہے درحقیقت وہ اپنے مال کے ناجائز تصرف کا دروازہ کھولتا ہے۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ اس ارشاد خداوندی کے الفاظ عام ہیں کہ باطل اور ناجائز طریق سے کسی کا مال نہ کھاؤ، اس میں کسی کا مال غصب کر لینا بھی داخل ہو، چوری اور ڈاکہ بھی جن میں دوسرے پر ظلم کر کے جبراً مال چھین لیا جاتا ہے، اور سود، قمار، رشوت اور تمام مروج فاسدہ اور معاملات فاسدہ بھی جو از روئے شرع جائز نہیں، اگرچہ منکرین کی رضا مندی بھی تحقق ہوا جھوٹ بول کر یا جھوٹی قسم کھا کر کوئی مال حاصل کر لینا یا ایسی کمائی جس کو شریعت اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے، اگرچہ اپنی جان کی خدمت ہی سے حاصل کی گئی ہو وہ سب حرام اور باطل ہیں، اور قرآن کے الفاظ میں اگرچہ صراحت کھانے کی ممانعت مذکور ہو، لیکن مراد اس جگہ صرف کھانا ہی نہیں بلکہ مطلقاً استعمال کرنا ہو، خواہ کھانی کو باپس کر دیا دوسرے طریقے کے ہستال سے، مگر محاورات میں ان سبب کے ہستالوں کو کھالینا ہی بولا جاتا ہے، کہ فلاں آدمی فلاں کا مال کھا گیا، اگرچہ وہ مال کھانے پر لائق نہ ہو۔

شان نزول آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے، واقعہ یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام میں سے دو صحابہ کا آپس میں ایک زمین پر جھگڑا ہوا، معتزہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہوا، مدعی کے پاس گولہ نہ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شرعی ضابطہ کے مطابق مدعا علیہ کو حلف کر کے کا حکم دیا، وہ حلف پر آمادہ ہو گیا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور نصیحت ان کو یہ آیت سنائی: **إِنَّ أَوْلَىٰ بَيْنَ بَنِي إِسْرَءِيلَ يَمْلِكُونَ يَعْطُونَكَ اللَّهُ وَآيَاتُهُمْ كَسَمَاءِ زَاوِيَةٍ**، جس میں قسم کھا کر کوئی مال حاصل کرنے پر وعید مذکور ہے، صحابی نے جب یہ آیت سنی تو قسم کھانے کو ترک کر دیا اور زمین مدعی کے حوالہ کر دی۔ (روح المعانی)

اس واقعہ میں یہ آیت نازل ہوئی، جس میں ناجائز طریق پر کسی کا مال کھانے یا حاصل کرنے کو حرام قرار دیا ہے، اور اس کے آخر میں خاص طور پر جھوٹا مقدمہ بنانے اور جھوٹی قسم کھانے اور جھوٹی شہادت دینے اور دلولے کی سخت ممانعت اور اس پر وعید آئی ہے، ارشاد ہے: **وَلَا تَكُونُوا يَحْتَبِئِينَ إِلَى الْحُكَّامِ لِيَأْتُوا بِكُمْ بَعْضُ الْأُمُورِ**، تاکہ ان کے ذریعہ تم لوگوں کے اموال کا کوئی حصہ کھا جاؤ بطریق گناہ جب کہ تم جانتے بھی ہو کہ اس میں تمہارا کوئی حق نہیں، تم جھوٹا مقدمہ بنا رہے ہو، **وَلَا تَكُونُوا يَحْتَبِئُونَ** سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی معاملہ کی بناء پر اس چیسز کو اپنا حق سمجھتا ہے، وہ اگر عدالت میں

دعویٰ دائر کر کے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے تو وہ اس وعید میں داخل نہیں، اسی جیسے ایک واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ وَأَشْتَرُ تَغْتَابُونَ
إِلَىٰ وَتَقُولُ بَعْضُكُمْ لَأَن يَكُونَتْ
الْأَعْيُنُ بِحُجَّتِهِمْ مِنْ تَغْيِصٍ فَأَقْبَضُوا
لَهُ عَلَىٰ رُءُوسِهِمْ مَا أَشْتَرُ مِنْهُ فَمَنْ
فَضَّلَ لِنَفْسِهِ لَهْ بِئْسَ مِثْقَالِ خِيَرَةٍ
فَلَا يَأْخُذُ بِهِ قَائِلُهَا أَفْطَمَ لَهُ
يَقْلَعُهُ مِنَ النَّارِ (رواه البخاری
ومسلم عن ام سلمة)

”یہ میں ایک انسان ہوں اور تم میرے پاس اپنے مقدمات لاتے ہو، اس میں یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے معاملہ کو زبان رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کرے، اور میں اسی سے مطمئن ہو کر اس کے حق میں فیصلہ کر دوں تو زیادہ کچھ حقیقت حال تو مجھ کو معاملہ کو خود معلوم ہوتی ہے، اگر فی الواقع وہ اس کا حق نہیں ہوتا اس کو لینا نہیں چاہئے، کیونکہ اس صورت میں جو کچھ میں اس کو دوں گا وہ جہنم کا ایک قطعہ ہوگا۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں واضح فرمادیا کہ اگر امام یا قاضی یا امام المسلمین کسی معاملہ کی وجہ سے کوئی فیصلہ کرے جس میں ایک کا حق دوسرے کو ناجائز طور پر مل رہا ہو، تو اس عدالتی فیصلہ کی وجہ سے وہ اس کے لئے حلال نہیں ہو جاتا، اور جس کے لئے حلال ہو اس کے لئے حرام نہیں ہو جاتا، الغرض عدالت کا فیصلہ کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال نہیں بناتا، اگر کوئی شخص جھوٹ فریب یا جھوٹی شہادت یا جھوٹی قسم کے ذریعہ کسی کا مال بذریعہ عدالت لے لے، تو اس کا وبال اس کی گردن پر رہے گا اس کو چاہئے کہ آخرت کے حساب کتاب اور عظیم و خیر کی عدالت میں پیشی کا خیال کر کے اس کو چھوڑ دے۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جن معاملات میں کوئی عقد یا فیخ ہوتا ہو اور جن میں قاضی یا جج کو بھی شرعاً اختیارات حاصل ہوتے ہیں، ایسے معاملات میں اگر جھوٹی قسم یا جھوٹی شہادت کی بناء پر بھی کوئی فیصلہ قاضی نے صادر کر دیا تو شرعاً وہ عقد یا فیخ صحیح ہو جائے گا، اور حلال و حرام کے احکام اس پر عائد ہو جائیں گے، اگرچہ جھوٹ بولنے اور جھوٹی شہادت دلولے کا وبال اس کی گردن پر رہے گا۔

مال حلال کی برکات
اور حرام کی نحوست
حرام سے بچنے اور حلال کے حاصل کرنے کے لئے قرآن کریم نے مختلف مقامات میں مختلف عنوانات سے تاکیدیں فرمائی ہیں، ایک آیت میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ انسان کے اعمال و اخلاق اپنا بہت بڑا دخل حلال کھانے کو ہے، اگر اس کا کھانا پینا حلال نہیں تو اس سے اخلاق حمیدہ اور

اعمال صالحہ کا صدور شکل ہوا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ مَنَعُوا آلَكُمْ الْخَبِيثَاتِ
وَأَعَمَّتُوا أَصْلَابَهُنَّ لِي لَا يَمَازُجَنَّ بَيْنَهُنَّ
الْمُؤْمِنُونَ وَالْكَافِرُونَ (۵۱: ۲۳)

”یعنی اے گروہ انبیاءِ حلال اور پاک چیزیں
کھاؤ، اور نیک عمل کرو، میں تمہارے اعمال
کی حقیقت سے واقف ہوں“

اس آیت میں حلال کھانے کے ساتھ عمل صالح کا حکم دینا اشارہ کر دیا ہے کہ اعمالِ صالحہ کا صدور وجہ ہی ہو سکتا ہے جبکہ انسان کا کھانا پینا حلال ہو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں یہ بھی واضح فرما دیا کہ اس آیت میں اگرچہ خطاب انبیاء علیہم السلام کر ہے، مگر یہ حکم کچھ انھیں کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ سب مسلمان اس کے مامور ہیں، اس حدیث کے آخر میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ حرام مال کھانے والے کی دعا قبول نہیں ہوتی، بہت سے آدمی عبادت وغیرہ میں مشقت اٹھاتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ دعا کے لئے پھیلاتے ہیں، اور یارب یارب پکارتے ہیں، مگر کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس ان کا حرام ہے تو ان کی یہ دعا کہاں قبول ہو سکتی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ایک بہت بڑا حصہ اسی کام کے لئے وقف رہا ہے کہ امت کو حرام سے بچانے اور حلال کے استعمال کرنے کی ہدایتیں دیں۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے حلال کھایا اور سنت کے مطابق عمل کیا اور لوگ اس کی ایذاؤں سے محفوظ رہے وہ جنت میں جائے گا، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آجکل تو یہ حالات آپ کی امت میں عام ہیں، بیشتر مسلمان ان کے پابند ہیں، آپ نے فرمایا: ہاں! آئندہ بھی ہر زمانہ میں ایسے لوگ رہیں گے جو ان احکام کے پابند ہوں گے یہ حدیث ترمذی نے روایت کی ہے، اور اس کو صحیح فرمایا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے فرمایا کہ چار خصلتیں ایسی ہیں جب وہ تمہارے اندر موجود ہوں تو پھر دنیا میں کچھ بھی حاصل نہ ہو تو تمہارے لئے کافی ہیں، وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ ایک امانت کی حفاظت، دوسرے سچ بولنا، تیسرے حسن خلق، چوتھے کھانے میں حلال کا اہتمام۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ میرے لئے یہ دعا فرما دیجئے کہ میں مستبول الدعاء ہو جاؤں جو دعا کیا کروں قبول ہو کرے، آپ نے فرمایا اے سعد اپنا کھانا حلال اور پاک بنا، لو، تنجیب الدعوات ہو جائے گا، اور قسم ہو اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے بندہ جب اپنے پیٹ میں حرام لقمہ ڈالتا ہے تو

چالیس روز تک اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، اور جس شخص کا گوشت حرام مال سے بنا ہو اس گوشت کے لئے تو جہنم کی آگ ہی لائق ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ قسم ہو اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ کوئی بندہ اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوتا جب تک اس کا قلب اور زبانِ مسلم نہ ہو جائے، اور جب تک اس کے پڑوسی اس کی ایذاؤں سے محفوظ نہ ہو جائیں، اور جب کوئی بندہ مالِ حرام کما تکے پھر اس کو صدقہ کرتا ہے تو وہ قبول نہیں ہوتا، اور اگر اس میں سے خرچ کرتا ہے تو برکت نہیں ہوتی، اور اگر اس کو اپنے وارثوں کے لئے چھوڑ جاتا ہے تو وہ جہنم کی طرف جانے کے لئے اس کا توشہ ہوتا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ بڑی چیز سے بڑے عمل کو نہیں پسند دھوئے، ہاں اچھے عمل سے بڑے عمل کو دھو دیتے ہیں۔

مشرقی ہر انسان کا پنج ہم سناؤ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَا تَزَالُ قَدْ مَا خَلَقَ يَوْمَ آفِيَا مَسِيحًا
خَلَقَ يَسْأَلُ عَنْ أَمْرِهِ عَنْ عَمْرٍو فَيَسْأَلُ
مَا كُنَّا نَعْمُ وَنَحْنُ مُشْتَابِهٌ فَيَسْأَلُ أَبْلَاكَ
وَعَنْ تَالِيَةِ بَنِي أُمَيَّةَ الْكُتَيْبَةَ وَفَيَسْأَلُ
أَنْفَعَهُ وَعَنْ عِلْمِهِ مَاذَا عَمِلَ
فَيَسْأَلُ (البيهقي، ترويض)

”قیامت کے روز عموماً کوئی بندہ اپنی
جگہ سے سرک نہ سکے گا، جب تک اس سے پکار
سواروں کا جواب نہ لیا جائے، ایک یہ کہ اس نے
اپنی عمر کس کام میں فنا کی اور سرے یہ کہ اپنی
ہوائی کس شغل میں برباد کی، تیسرے یہ کہ اپنا
مال کہاں سے کمایا، اور کہاں خرچ کیا، اور چوتھے
یہ کہ اپنے علم پر کہاں تک عمل کیا۔“

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ خطبہ دیا، جس میں فرمایا کہ اے جماعتِ مہاجرین، پانچ خصلتیں ہیں جن کے متعلق فیس اللہ تعالیٰ ہے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ تمہارے اندر پیدا ہو جائیں، ایک یہ کہ جب کسی قوم میں بے حیائی پھیلنے لگے تو ان پر طاعون اور وبا پڑے اور ایسے نئے نئے امراض مسلط کر دیئے جاتے ہیں جو ان کے آباء و اجداد نے کئے بھی نہ تھے، اور دوسرے یہ کہ جب کسی قوم میں ناپ تول کے اندر کمی کرنے کا مرض پیدا ہو جائے تو ان پر قحط اور گرانی اور مشقت و محنت اور حکام کے مظالم مسلط کر دیئے جاتے ہیں، اور تیسرے یہ کہ جب کوئی قوم زکوٰۃ ادا نہ کرے تو بارش بند کر دی جاتی ہے، اور چوتھے یہ کہ جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے عہد کو توڑ ڈالے تو اللہ تعالیٰ ان پر انجس دشمن مسلط فرما دیتے ہیں، جو ان کے مال بغیر کسی حق کے چھین لیتا ہے، اور پانچویں یہ کہ جب کسی قوم کے اربابِ اقامت دار کتاب اللہ کے قانون پر فیصلہ نہ کریں، اور اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام ان کے دل کو نہ لگیں تو

عہ معنی روایات میں ہاں لکھا ہے اس میں مال کے دو سوالوں کا ایک ایک اشارہ ہے

اللہ تعالیٰ ان کے آپس میں منافرت اور لڑائی جھگڑے ڈال دینے میں مدد دیتا ہے، روایت ابن ماجہ اور بیہقی وغیرہ نقل کی ہے، اور حاکم نے اس کو صحیح علی شرط مسلم فرمایا ہے۔
اللہ تعالیٰ ہم کو اور سب مسلمانوں کو ان آفات سے محفوظ رہنے کی توفیق کامل عطا فرمائیں
وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْآهْلِ كُلِّ مَوْاقِفٍ لِلنَّاسِ وَالْحَبِجِّ مَا لَيْسَ

تجھ سے پوچھتے ہیں حال تھے چاند کا کہہ دے کہ میادقات مقررہ ہیں لوگوں کو واسطے اور حج کے واسطے اور

الْبُرْيَانِ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْدِّينَ مِنَ الْتَقَىٰ وَ

بیک نہیں کہ گھروں میں آؤ ان کی پشت کی طرف سے اور لیکن بیک یہ کہ جو کوئی ڈرے اللہ سے اور

أَتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا سَاءَ ثَقُوَاللَّهِ لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ ﴿۱۹﴾

گھروں میں آؤ دروازوں سے اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم اپنی مراد کو پہنچو،

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُوكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ

اور لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو لڑتے ہیں تم سے اور کسی پر زیادتی مت کرو بیشک

اللَّهُ لَا يَحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿۲۰﴾ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَ

اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے زیادتی کرنے والوں کو، اور ارڈالو ان کو جس جگہ پاؤ اور

أَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجَكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ

نکال دو ان کو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا اور دین سے بچنا نمارڈالنے سے بھی زیادہ سخت ہو

وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ

اور نہ لڑو ان سے مسجد الحرام کے پاس جب تک کہ وہ نہ لڑیں تم سے اس جگہ پھر اگر وہ

فَاتِلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ﴿۲۱﴾

خود ہی لڑیں تم سے تو ان کو مار دو یہی ہے سزا کا فسروں کی۔

رَبُّ آيَاتٍ آتِ لَيْسَ الْبِرُّ بِمَا رُفِعَ كَيْدُكَ بِيَدِ اللَّهِ بَعْدَ آخِرِ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ تَمَّ

ابواب البر کا بیان ہو گا، جو اہم احکام شرعیہ پر مشتمل ہیں، ان میں پہلا حکم قصاص کا دوسرا وصیت کا، تیسرا اور چوتھا صوم اور اس کے متعلق مسائل کا، پانچواں اعتکاف کا، چھٹا مال حرام سے بچنے کا تھا، مذکورہ صدر در آیتوں میں حج اور جہاد کے احکام و مسائل کا بیان ہے، اور حج کے حکم سے پہلے یہ بتلایا گیا کہ روزہ اور حج وغیرہ میں قمری مہینوں اور دنوں کا اعتبار ہو گا۔

لغاست: اہلہ، ہلال کی جمع ہے، قمری مہینہ کی ابتدائی چند راتوں کے چاند کو ہلال کہا جاتا ہے، مواقیت، ایقات کی جمع ہے، جس کے معنی مطلق وقت یا منہیات وقت کے آتے ہیں (ذوقی)

خلاصہ تفسیر

حکم ہفتم، اعتبار حساب (یعنی آدمی، آپ سے ان) چاندوں کے (ہر مہینہ گھٹنے بڑھنے کی)

حالت را اور اس میں جو فائدہ ہے اس فائدہ کی تحقیقات کرتے ہیں

قمری درج و غیرہ آپ فرما دیجئے کہ فائدہ اس کا یہ ہو کہ وہ چاند اپنے اس گھٹنے اور

بڑھنے کے اعتبار سے لڑ دیا یا سہولت (آلہ مشناخت اوقات ہیں لوگوں کے اختیاری معاملات

مثل عدت و مطالبہ حقوق کے لئے اور (غیر اختیاری عبادات مثل) حج (و زکوٰۃ و روزہ وغیرہ)

کے لئے۔

حکم ہشتم، اصلاح رسم جاہلیت (بعض لوگ قبل اسلام کے اگر حج کا احرام باندھنے کے بعد کسی

ضرورت سے گھر جانا چاہتے تھے، تو دروازہ سے جانا ممنوع

جانتے تھے، اس لئے پشت کی دیوار میں نقب دے کر اس میں سے اندر جاتے تھے، اور اس عمل

کو فضیلت سمجھتے تھے، حق تعالیٰ اس کے متعلق بعد ذکر حج کے ارشاد فرماتے ہیں) اور اس میں

کوئی فضیلت نہیں کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا کرو، ہاں لیکن فضیلت یہ ہو کہ کوئی

شخص حرام (چیسروں) سے بچے اور (چونکہ گھروں میں دروازہ کی طرف سے آنا حرام نہیں ہے

اس لئے اس سے بچنا بھی ضروری نہیں، سو اگر آنا چاہو تو) گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ،

اور (اصل الاصول تو یہ ہو کہ) خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو (اس سے البتہ) امید ہے کہ تم راہیں

میں کامیاب ہو۔

حکم نہم، قتال کفار (رذی فعدہ سلسلہ ہجری میں حضور صل اللہ علیہ وسلم اولے عمرہ کے

قصد سے مکہ معظمہ تشریف لے چلے آئے اس وقت تک مکہ معظمہ مشرکین

کے قبضہ اور حکومت میں تھا، ان لوگوں نے حضور صل اللہ علیہ اور آپ کے ہمراہیوں کو مکہ

کے اندر نہ جانے دیا اور عمرہ رہ گیا، آخر بڑی گفتگو کے بعد یہ معاہدہ قرار پایا کہ سال آئندہ

مُنْجِسَةً لِّغَيْرِ مُبْتَلًى لِّتَبَيَّنَ الْفَاسِقُونَ
وَلَا تُجَنَّبُ عَنْهُ الْمَسْكِينُ وَالْفُقَرَاءُ
وَالَّذِينَ يَتَّبِعُوا الْحَدَّ الَّذِي أَمَرَ اللَّهُ بِهِمْ
وَالَّذِينَ يَتَّبِعُوا الْحَدَّ الَّذِي أَمَرَ اللَّهُ بِهِمْ

اسی میری آیت سے اگرچہ یہ ثابت ہوا کہ سال اور مہینوں وغیرہ کا حساب آفتاب سے بھی لگایا جاسکتا ہے رکما ذکر فی روح المعانی

لیکن چاند کے معاملہ میں جو الفاظ قرآن کریم نے استعمال کئے ان سے واضح اشارہ اس طرف نکلتا ہے کہ شریعت اسلام میں حساب چاند ہی کا متعلق ہے، خصوصاً ان عبادات میں جن کا تعلق کسی خاص چیز سے ہے، جیسے روزہ رمضان، حج کے چھینے، حج کے ایام، محرم، شہر برأت وغیرہ جو احکام متعلق ہیں وہ سب رویت ہلال سے متعلق کئے گئے ہیں کیونکہ اس آیت میں بھی مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ قَالُوجِجَ فَرَاکَرِتِلَادِیَا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حساب چاند ہی کا معتبر ہے، اگرچہ یہ حساب آفتاب سے بھی معلوم ہو سکتا ہے۔

شریعت اسلام نے چاند کے حساب کو اس لئے اختیار فرمایا کہ اس کو ہر آنکھوں والا فہم بردیکھ کر معلوم کر سکتا ہے، عالم جاہل، دیہاتی، جزیروں، پہاڑوں کے رہنے والے جنگلی سب کو اس کا علم آسان ہے، بخلاف شمسی حساب کے کہ وہ آلات رصدیہ اور قواعد ریاضیہ پر موقوف ہے جس کو ہر شخص آسانی سے معلوم نہیں کر سکتا، پھر عبادات کے معاملہ میں تو قمری حساب کو بطور فرض متعین کر دیا، اور عام معاملات تجارت وغیرہ میں بھی اسی کو پسند کیا، جو عبادت اسلامی کا رواج اور ایک طرح کا اسلامی شعار ہو، اگرچہ شمسی حساب کو بھی ناجائز قرار نہیں دیا، بشرط یہ ہے کہ اس کا رواج اتنا عام نہ ہو جائے کہ لوگ قمری حساب کو بالکل بھلا دیں، کیونکہ ایسا کرنے میں عبادات، روزہ، حج وغیرہ میں غلط لازم آتا ہے، جیسا اس زمانے میں عام دفتروں اور کاروباری اداروں بلکہ نجی اور شخصی مکاتبات میں بھی شمسی حساب کا ایسا رواج ہو گیا ہے کہ بہت سے لوگوں کو اسلامی مہینے بھی پورے یاد نہیں ہیں، یہ شرعی حیثیت کے علاوہ غیرت قومی و ملی کا بھی دیوالیہ پن ہے، اگر دفتری معاملات میں جن کا تعلق غیر مسلموں سے بھی ہے ان میں صرف شمسی حساب رکھیں، باقی نجی خط و کتابت اور روزمرہ کی ضروریات میں قمری اسلامی تاریخوں کا استعمال کریں تو اس میں فرض کفایہ کی ادائیگی کا ثواب بھی ہوگا، اور اپنا قومی شعار بھی محفوظ رہے گا۔

مسئلہ: لَکِنَ الَّذِیْ رَانَ نَاوُ الْکِیْتُوْتِ مِّنْ ظُلُمٍ هَآ، اس آیت سے یہ مسئلہ بھی محل آیا کہ جس چیز کو شریعت اسلام نے ضروری یا عبادت نہ سمجھا ہو اس کو اپنی طرف سے ضروری اور عبادت سمجھ لینا جائز نہیں، اسی طرح جو چیز شرعاً جائز ہو اس کو گناہ سمجھنا بھی گناہ ہے، ان

لوگوں نے ایسا ہی کر رکھا تھا کہ گھر کے دروازوں سے داخل ہونا جو شرعاً جائز تھا اس کو گناہ قرار دیا، اور مکان کی پشت سے دیوار توڑ کر آجوشرما ضروری نہیں تھا اس کو ضروری سمجھا، اسی پر ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی، بدعات کے ناجائز ہونے کی بڑی وجہ یہی ہے کہ غیر ضروری چیزوں کو فرض و واجب کی طرح ضروری سمجھ لیا جاتا ہے، یا بعض جائز چیزوں کو حرام دیا جائز قرار دیا جاتا ہے، اس آیت سے ایسا کرنے کی ممانعت واضح طور پر ثابت ہو گئی جس سے ہزاروں اعمال کا حکم معلوم ہو گیا۔

حکم نہم جہاد و قتال

اس پر ساری امت کا اتفاق ہے کہ ہجرت مدینہ سے پہلے کفار کے ساتھ جہاد و قتال ممنوع تھا، اس وقت کی تمام آیات قرآنی میں مسلمانوں کو کفار کی ایذاؤں پر صبر اور عفو و درگزر کی ہدایت ملتی، ہجرت مدینہ کے بعد سے پہلے اس آیت میں قتال کفار کا حکم آیا، وَقَالِ الرَّسُولُ بَنُو آدَمَ لَا فِرَآءَ بَیْنَنَا وَبَیْنَهُمْ حَتَّى تَخْرُجُوا مِنَ الدِّیْنِ وَتَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ (۲۹:۱۲۲) مگر اگر حضرات صحابہ و تابعین کے نزدیک پہلی آیت سورۃ بقرہ کی آیت مذکورہ ہی ہو اور صدیق اکبر نے جس کو پہلی فرمایا ہے وہ بھی ابتدائی آیتوں میں ہونے کے سبب پہلی ہی جاسکتی ہے۔

اس آیت میں حکم یہ ہو کہ مسلمان صرف ان کافروں سے قتال کریں جو ان کے مقابلہ پر قتال کے لئے آویں، اس سے مراد یہ ہے کہ عورتیں، بچے، بہت بوڑھے اور اپنے مذہب ہی شغل میں دنیا سے یکسو ہو کر گئے ہوئے عبادت گزار ماہب، پادری وغیرہ اور ایسے ہی اپاہج و معذور لوگ یا وہ لوگ جو کافروں کے یہاں محنت مزدوری کا کام کرتے ہیں ان کے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوتے ایسے لوگوں کو جہاد میں قتل کرنا جائز نہیں، کیونکہ حکم آیت کا صرف ان لوگوں سے قتال کرنے کا ہو، جو مسلمانوں کے مقابلہ میں قتال کریں، اور مذکورہ قسم کے سب افراد قتال کرنے والے نہیں اس لئے فقہاء رحمہم اللہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر کوئی عورت یا بوڑھا یا مذہبی آدمی وغیرہ کفار کی طرف سے قتال میں شریک ہوں یا مسلمانوں کے بالمقابل جنگ میں ان کی مدد کسی طرح سے کر رہے ہوں ان کا قتل جائز ہے، کیونکہ وہ آذِیْنَ یَنْتَظِرُونَ بَقَاَیَکُمْ مِّنْ ظُلُمٍ هَآ (منظہری، قرطبی، جصاص)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات جو مجاہدین اسلام کو بوقت جہاد دی جاتی تھیں، ان میں اس حکم کی واضح تشریحات مذکور ہیں، صحیح بخاری و مسلم میں ہر روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک حدیث میں ہے:

تَعْلٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم
وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِ النِّسَاءِ وَالْیَتٰمٰی

تین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں
اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا ہے۔

اور ابو داؤد میں بروایت ابن عباسؓ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ
ہدایات منقول ہیں، تم اللہ کے نام پر اور رسول اللہ کی ملت پر جہاد کے لئے جاؤ، کسی بڑے ضعیف
کو اور چھوٹے بچے کو یا کسی عورت کو قتل نہ کرو (منظری)

حضرت صدیق اکبرؓ نے جب یزید بن ابی سفیانؓ کو ملک شام بھیجا تو ان کو یہی ہدایت دی،
اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ عبادت گزار اور راہبوں کو اور کافروں کی مزدوری کرنے والوں کو
بھی قتل نہ کریں، جبکہ وہ قتال میں حصہ نہ لیں (قرطبی)

آیت کے آخر میں قَوْلًا تَعْتَدُوا کا بھی جہور مغسّرین کے نزدیک یہی مطلب ہے کہ
قتال میں حد سے تجاوز نہ کرو کہ عورتوں بچوں وغیرہ کو قتل کرنے لگو۔

وَأَقْتُلُوا الْمُکْفِرِیْنَ لَیْسَ لَہُمْ جَزَآءٌ سِوَ الْقَتْلِ وَذَٰلِکُمْ جَزَآءُ الْفَاسِقِیْنَ خلاصہ تفسیر
میں بیان ہو چکا کہ یہ آیت واقعہ حدیبیہ کے بعد اس وقت نازل ہوئی ہے، جب صلح حدیبیہ
کی شرط کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کے ساتھ اس عمرہ کی قضاء کے
لئے سفر کا ارادہ کیا، جس سے اس سے پہلے سال میں کفار مکہ نے روک دیا تھا، صحابہ کرامؓ کو اس
سفر کے وقت یہ خیال ہو رہا تھا کہ کفار کی صلح اور معاہدہ کا کچھ بھروسہ نہیں، اگر وہ لوگ اس سال
بھی آمادہ پیکار ہو گئے تو ہمیں کیا کرنا چاہئے، اس پر آیت مذکورہ کے الفاظ نے ان کو اجازت
دیدئی کہ اگر وہ قتال کرنے لگیں تو ہمیں بھی اجازت ہے، کہ جہاں پاؤں کو قتل کرو، اور اگر قدرت
میں ہو تو جس طرح انھوں نے مسلمانوں کو مکہ مکرمہ سے نکال دیا تھا، تم بھی ان کو مکہ سے نکال دو۔

اور پوری مکی زندگی میں جو مسلمانوں کو کفار کے ساتھ مقابلہ سے روکا ہوا تھا، اور ہمیشہ
عفو و رگزر کی تلقین ہوتی رہی تھی، اس لئے صحابہ کرامؓ کو اس آیت کے نازل ہونے سے یہی
خیال تھا کہ کسی کافر کو قتل کرنا بڑا اور ممنوع ہے، اس خیال کے ازالہ کے لئے فرمایا وَالْفِتْنَةُ
أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ، یعنی یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ کسی کو قتل کرنا سخت بڑا کام ہے، مگر کفار مکہ کا
اپنے کفر و شرک پر چل رہا تھا اور مسلمانوں کو اوائے عبادت حج و عمرہ سے روکنا اس سے زیادہ سخت
و شدید ہے، اس سے بچنے کے لئے ان کو قتل کرنے کی اجازت دیدی گئی ہے، آیت میں لفظ فتنہ
سے کفر و شرک اور مسلمانوں کو اوائے عبادت سے روکنا ہی مراد ہے (جصاص قرطبی وغیرہ)

البتہ اس آیت کے عموم سے جو یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ کفار جہاں کہیں ہوں ان کا قتل کرنا جائز
ہے، اس عموم کی ایک تخصیص آیت کے اگلے جملے میں اس طرح کردی گئی وَلَا تَقْتُلُوا ہُمْ عِنْدَ

النَّسْرِ الْحَرَامِ حَتّٰی تَقْتُلُوْا کُفْرًا فِیْہِ، یعنی مسجد حرام کے آس پاس جس سے مراد پورا حرم مکہ ہے
اس میں تم ان لوگوں سے اس وقت تک قتال نہ کرو جب تک وہ خود قتال کی ابتداء نہ کریں۔

مسئلہ: حرم مکہ میں انسان کیا کس شکاری جانور کو بھی قتل کرنا جائز نہیں، لیکن اس
آیت سے معلوم ہوا کہ اگر حرم محترم میں کوئی آدمی دوسرے کو قتل کرنے لگے تو اس کو بھی مدافعت
میں قتال کرنا جائز ہے، اس پر جہور فقہاء کا اتفاق ہے۔

مسئلہ: اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ابتداء جہاد قتال کی ممانعت صرف مسجد
حرام کے آس پاس حرم مکہ کے ساتھ مخصوص ہے، دوسرے مقامات میں جیسے دفاعی جہاد ضروری
ہو اسی طرح ابتدائی جہاد قتال بھی درست ہے۔

فَإِنْ اَنْتُمْ اَوْ اِنْ اَللّٰهُ عَفُوٌّ رَّحِیْمٌ ۝۱۱ وَ قَتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ

پھر اگر وہ باز آئیں تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہو، اور لاواں سے یہاں تک کہ

فِتْنَتُهُ وَ یَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ فَإِنْ اَنْتُمْ اَوْ اَلَا عُدَّ وَاِنْ اَلَا عُدَّ

نہ باقی رہے فساد اور حکم رہو خدا تعالیٰ کا پھر اگر وہ باز آئیں تو کسی پر زیادتی نہیں مگر

الظَّالِمِیْنَ ۝۱۲ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّہْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَتُ قِصَاصٌ

ظالموں پر، حرمت والا مہینہ بدلہ (مقابلہ) حرمت والے مہینہ کے اور ادبے کفر میں بدلہ ہے،

فَمَنْ اَعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاَعْتَدُوْا عَلَیْہِ بِمِثْلِ مَا اَعْتَدٰی عَلَیْکُمْ

پھر جس نے تم پر زیادتی کی تم اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے زیادتی کی تم پر

وَ اتَّقُوا اللّٰہَ وَ اعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ السَّاقِیْنَ ۝۱۳ وَ اَلْفِقْرُ اِنِّیْ

اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو کہ اللہ ساتھ ہو پرہیزگاروں کے، اور خرچ کرو اللہ

سَبِّیْلَ اللّٰہِ وَ لَا تَلْقُوا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی الْاَیْمٰنِ وَ اَحْسِنُوْا ۝۱۴

کی راہ میں اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں، اور نیکی کرو

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝۱۵

بیشک اللہ دوست رکھتا ہو نیکی کرنے والوں کو

خلاصہ تفسیر

پھر اگر بعد شروع قتال کے بھی وہ لوگ (یعنی مشرکین مکہ اپنے کفر سے) باز نہ آجائیں

اور اسلام قبول کر لیں، تو ان کا اسلام بے قدر نہ سمجھا جاوے گا بلکہ اللہ تعالیٰ ان کے گزشتہ کفر کو بخش دے گا اور مغفرت کے علاوہ بے شمار نعمتیں دے کر ان پر ہر باری رکھے، فرادہ گئے اور اگر وہ لوگ اسلام نہ لائیں تو اگرچہ دوسرے کفار کے لئے اسلامی قانون یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب پر رہتے ہوئے بھی اگر اسلامی حکومت کی اطاعت اور جزیہ دینے کا اقرار کر لیں تو ان کا قتل جائز نہیں رہتا، بلکہ ان کے حقوق کی حفاظت اسلامی حکومت پر لازم ہو جاتی ہے، مگر یہ خاص کفار چنانکہ اہل عرب ہیں، ان کے لئے قانون جزیہ نہیں، بلکہ ان کے لئے صرف دو راستے ہیں، یا قتل اس واسطے، ان کے ساتھ اس حد تک لڑو کہ ان میں فساد عقیدہ (یعنی شرک) نہ رہے اور ان کا (دین و خالص) الشریعہ کا ہو جائے اور کسی کا دین و مذہب کا خالص اللہ کے لئے ہو جانا معروف ہے، قبول اسلام پر، تو حاصل یہ ہوا کہ شرک چھوڑ کر اسلام اختیار کر لیں، اور اگر وہ لوگ (کفر سے) باز آجائیں (جس کا ذکر ابھی ہوا بھی ہے) تو آخرت میں مغفرت و رحمت کے مستحق ہونے کے ساتھ دنیا میں ان کے لئے ستم کو یہ قانون بتلایا جاتا ہے کہ سزا کی سختی کسی پر نہیں ہو کر لی، بجز بے انصافی کرنے والوں کے (جو براہ بے انصافی خدائی احسانات کو قبول کر کفر و شرک کرنے لگیں اور جب یہ لوگ اسلام لے آئے تو بے انصاف نہ ہے، لہذا ان پر سزا سے قتل کی سختی نہ رہی اور مسلمانوں کو جو یہ خیال ہے کہ کفار مکہ اگر اپنے عہد پر قائم نہ رہے تو شہر حرام یعنی ذی قعدہ میں ان سے لڑنا پڑے گا، سو اس سے بھی بے فکر رہو کیونکہ حرمت والاہینہ (تم کو قتال کفار سے مانع ہو سکتا ہے) بعض (اس کے کہ اس) حرمت والے مہینہ کے (سبب وہ بھی تم سے قتال نہ کریں) اور (جو یہ ہے کہ) یہ حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں (سو جو تمہارے ساتھ ان حرمتوں کی رعایت کرے تو تم بھی رعایت رکھو اور) جو تم پر ایسی حرمتوں کی رعایت نہ کرے (نویادتی کرے) تو تم بھی اس پر زیادتی کرو، جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے اور ان سب احکام مذکورہ کے برتاؤ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو کہ کسی امر میں حد قانونی سے تجاوز نہ ہونے پاورے، اور یقین کر لو کہ اللہ تعالیٰ اپنی عنایت و رحمت سے، ان ڈرے والوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔

حکم دہم انفاق فی الجہاد اور ستم لوگ دہان کے ساتھ مال بھی خرچ کیا کرو اللہ کی راہ میں جہاد میں اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو کہ ایسے مواقع میں جان و مال خرچ کرنے سے جین یا بخل کرنے لگو، جس کا نتیجہ تمہارا ضعیف اور محالیت کا قوی ہو جانا ہے، جو کہ عین تباہی ہے (اور رجو) کام (کرد) اچھی طرح کیا کرو مثلاً اس فتح پر خرچ کرنا بادل کھول کر خوشی سے اچھی نیت کی تشاخرچ کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں اچھی طرح

کام کر لے والوں کو۔

معارف مسائل

مسئلہ جاری میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے قانون کے مطابق فوت شدہ عمرہ ادا کرنے کے لئے یہ بیعت صحابہ مکہ کے سفر کا ارادہ کیا تو صحابہ کرام جانتے تھے کہ ان کفار کے معاہدوں اور صلح کا کچھ اعتبار نہیں ممکن ہو کہ وہ جنگ کرنے لگیں، تو اس جنگ میں صحابہ کے لئے ایک اشکال تو یہ تھا کہ حرم مکہ میں جنگ کی توہت آئے گی، جو اسلام میں ناجائز ہو، اس کا جواب پچھل آیت میں درج کیا گیا کہ حرم مکہ کی حرمت مسلمانوں پر ضرور لازم ہے، لیکن اگر کفار حد و حرم میں ہی مسلمانوں سے جنگ کرنے لگیں تو ان کو بھی مدافعت میں جنگ کرنا جائز ہو دوسرا اشکال یہ تھا کہ یہ مہینہ ذیقعدہ کا ہے جو ان چار مہینوں میں سے ہے، جن کو اشہر حرم کہا جاتا ہے اور ان میں کسی سے کسی جگہ جنگ کرنا جائز نہیں، تو اگر مشرکین مکہ نے ہمارے خلاف جنگ شروع کر دی تو ہم اس مہینے میں دفاعی جنگ کیسے کر سکتے ہیں، اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، کہ جیسے حرم مکہ کی حرمت سے حالت دفاع مستثنیٰ ہے، اسی طرح اگر اشہر حرم میں کافر ہم سے قتال کرنے لگیں تو ہم کو بھی ان سے دفاعی جنگ کرنا جائز ہے۔

مسئلہ: اشہر حرم چار مہینے ہیں، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم یہ تین ماہ تو مسلسل ہیں، چوتھا مہینہ رجب کا ہے، اسلام سے پہلے بھی ان چار مہینوں میں جنگ کو حرام سمجھا جاتا تھا، اور مشرکین مکہ بھی اس کے پابند تھے، ابتداء اسلام میں بھی سلسلہ جاری تک یہی قانون نافذ تھا، اسی لئے صحابہ کرام کو اشکال پیش آیا، اس کے بعد یہ حرمت قتال منسوخ کر کے عام قتال کی اجازت باجماع آ دیدی گئی، مگر افضل اب بھی یہی ہے کہ ان چار مہینوں میں ابتداء بالقتال نہ کی جائے، صرف مدافعت کی ضرورت سے قتال کیا جائے، اس لحاظ سے یہ کہنا بھی فی الجملہ درست ہو کہ اشہر حرم کی حرمت منسوخ نہیں باقی ہے، جیسے حرم مکہ میں قتال کی اجازت بغیر ضرورت مدافعت دینے سے حرم مکہ کی حرمت منسوخ نہیں ہوئی، بلکہ صرف ایک استثنائی صورت پر عمل ہوا۔

دسواں حکم جہاد کے لئے مال خرچ کرنا

وَأَقِمْ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ، اس میں مسلمانوں پر لازم کیا گیا ہے کہ جہاد کے لئے بقدر ضرورت اپنے اموال بھی اللہ کی راہ میں خرچ کریں، اس سے فقہاء نے یہ حکم بھی نکالا ہے کہ مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض کے علاوہ بھی دوسرے حقوق فرض ہیں، مگر وہ نہ دیکھی ہیں اور نہ ان کے لئے کوئی نصاب اور مقدار

الْحَيِّجَّ وَمَا تَفَعَّلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمُهُ اللَّهُ وَتَزَوَّدُوا فَإِنْ خَيْرٌ

جائز کے زمانے میں اور جو کچھ تم کرتے ہو نیکی اللہ اس کو جانتا ہے اور زاد راہ لے لیا کرو بیشک بہتر

الزَّادِ الْقَوِيُّ وَاتَّقُوا يَا وَلِيَّ الْأَلْبَابِ ۝ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ

فَانْتَهَ زَادُكُمْ كَابْتِنَا بِسُؤَالٍ مِنْهُ اور مجھ سے ڈرتے رہو اسے عقائد، کچھ گناہ نہیں تم پر کہ

أَنْ تَبْتَغُوا أَفْضَلًا مِنْ رَبِّكُمْ فَاذَّاءَ أَفْضَلُمْ مِنْ عَرَفْتُمْ فَاذَّكُرُوا

تلاش کرو فضل اپنے رب کا پھر جب ملوات کے لئے لو تو عرفات سے تم یاد کرو

اللَّهُ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۝ وَادْكُرُوا هَذَا بَلَدَكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ

اللہ کو نزدیک مشعر الحرام کے اور اس کو یاد کرو جس طرح تم کو سکھایا اور بیشک تم تھے

مِنْ قَبْلِهِ لَيْسَ الضَّالِّينَ ۝ ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ

اس سے پہلے نادان ، پھر ملوات کے لئے پھر جہاں سے سب لوگ پھریں،

وَأَسْتَغْفِرُوا لِلَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَفُوٌّ رَحِيمٌ ۝ فَاذَّاقْضِيكُمْ

اور مغفرت چاہو اللہ سے بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے ہر جان، پھر جب پوئے کر چکو

مَنَّا يَسْكُنُكُمْ فَاذَّكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ وَاشْدُّوا كُرْهًا

اپنے حج کے کام کو یاد کرو اللہ کو جیسے تم یاد کرتے تھے اپنے باپ دادوں کو بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ

پھر کئی آدمی تو کہتا ہے اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں اور اس کے لئے آخرت میں کچھ

مِنْ خَلْقٍ ۝ وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً

حصہ نہیں، اور کوئی ان میں کہتا ہے اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں خوبی اور

وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ أُولَئِكَ لَهُمْ صِيبٌ

آخرت میں خوبی اور بچاؤ ہم کو دوزخ کے عذاب سے، انہی لوگوں کے واسطے حصہ ہے

مِمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ وَادْكُرُوا اللَّهَ فِي آيَاتِهِ

اپنی کتاب سے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے، اور یاد کرو اللہ کو نعمتی کے چند

مَعْدُودَاتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا أَثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ

دنوں میں پھر جو کوئی جلدی چلا گیا وہی دن میں تو اس پر گناہ نہیں اور جو کوئی رو گیا

فَلَا أَثْمَ عَلَيْهِ لَيْسَ الْاَثْمُ وَاللَّهُ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ لَكُمْ لَيْسَ

تو اس پر بھی کچھ گناہ نہیں جو کہڑتا کہ اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جانی لو بیشک تم سب

تَحْشَرُونَ ۝

اسی کے پاس جمع ہونگے۔

خلاصہ تفسیر

گیارہواں حکم متعلق حج و عمرہ

اور رجب حج یا عمرہ کرنا ہر تو اس، حج اور عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے راضی کرنے کے واسطے

پورا پورا اور کیا کر دے اعمال و آداب بھی سب بجا لاؤ اور نیت بھی خالص ثواب ہی کی ہو پھر

اگر دس دشمن کی جانب سے یا کسی مرض کے سبب سے حج و عمرہ کے پورا کرنے سے روک دیا جائے

تو اس حالت میں یہ حکم ہے کہ قربانی کا جانور جو کچھ میسر ہو روزی کرے اور حج و عمرہ کی جو وضع

اختیار کر رکھی تھی موقوف کرے اس کو احرام کھولنا کہتے ہیں جس کا طریقہ شرع میں سر منڈی

ہو، اور بال کشا دینے کا بھی یہی اثر ہے، اور یہ نہیں کہ فوراً رک ٹوک کے ساتھ ہی تم کو احرام

کھولنا درست ہو جائے، بلکہ اپنے سروں کو احرام کھولنے کی غرض سے، اس وقت تک مت

منڈاؤ جب تک کہ (رو) قربانی کا جانور جس کے ذبح کا اس حالت میں حکم تھا، اپنے موقع

پر نہ پہنچ جائے اور وہ موقع حرم ہے کہ اس قربانی کا جانور عدد و حرم ہی میں ذبح کیا جاسکتا کہ

وہاں اگر خود نہ جائے، تو کسی کے ہاتھ بھیج کر ذبح کرایا جائے جب جانور ذبح ہو جائے اس وقت

احرام کھولنا جائز ہوگا، البتہ اگر کوئی تم میں سے رکھے، بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ زخم یا درد

یا جو دوا وغیرہ کی تکلیف ہو اور اس بیماری یا تکلیف کی وجہ سے پہلے ہی سر منڈانے کی ضرورت

پڑے (تو اس کو اجازت ہے کہ وہ سر منڈا کر) قدیم (یعنی اس کا شرعی بدلہ) دیدے (یعنی خواہ مخواہ)

دو تھے سے یا چھ مسکینوں کو فی مسکین صدقہ فطر کے برابر یعنی نصف صاع گیہوں (غیر است

د کے طور پر) دیدیتے سے یا (ایک بکری) ذبح کر دینے سے پھر جب تم امن کی حالت میں ہو (خواہ

فہلے ہی سے کوئی خوف و مزاحمت پیش نہیں آیا، یا ہو کر جاندار) تو اس صورت میں حج و عمرہ

کے متعلق قربانی کرنا ہر ایک کے ذمہ نہیں ہو بلکہ خاص (جو شخص عمرو سے اس کچ کے ساتھ ملا کر ملتفق ہوا) یعنی ایسا ہج میں عمرو بھی کیا ہو) تو نقطہ اس پر واجب ہے کہ جو کچھ قربانی میسر ہو (ذبح کرے اور جس نے صرف عمرو کیا ہو یا صرف حج کیا ہو اس پر حج یا عمرہ کے متعلق کوئی قربانی نہیں) پھر (ایام حج میں حج و عمرہ کو جمع کرنے والوں میں سے) جس شخص کو قربانی کا جانور میسر نہ ہو (مثلاً غریب ہے) تو اس کے ذمہ بجائے قربانی کے (تین دن کے روزے ہیں (ایام حج میں رکھ کر آخر ان ایام کا نوین تاریخ ذی الحجہ ہو) اور سات (دن کے روزے) ہیں، جبکہ حج سے ٹھکانے لوٹنے کا وقت آجائے (یعنی حج کر چکے خواہ لوٹنا ہو یا کہ وہیں رہنا ہو) یہ پورے دس (دن کے روزے) ہو گئے اور یہ بھی یاد رکھو کہ ابھی حج و عمرہ کے ملانے کا حکم ہوا ہے (یہ ملانا ہر ایک کو درست نہیں بلکہ خاص) اس شخص کے لئے (درست) ہے جس کے اہل (و عیال) مسجد حرام (یعنی کعبہ) کے قریب (نواح) میں نہ رہتے ہوں (یعنی حدود حرم مکہ میں ان کا وطن نہ ہو) اور ان سب احکام کی بجا آوری میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو کہ کسی امر میں خلافت نہ ہو جائے) اور (خوب) جان لو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ریبا کی اور مخالفت کرنے والوں کو سزائے سخت دیتے ہیں۔

(زمانہ افعال) حج و کذا (چند مہینے ہیں جو مشہور) معلوم ہیں (ایک مثال) و سر ازی تعدہ (تیسرا دس تاریخیں ذی الحجہ کی) سو جو شخص ان (ایام) میں (اپنے ذمہ) حج مقرر کر لے (حج کا احرام باندھ لے) تو پھر (اس شخص کو) نہ کوئی غش بات (جائز ہے اور نہ کوئی بے حکمی (درست) ہے) اور نہ کسی قسم کا نزاع (و تکرار) زیبا ہے، بلکہ اس کو چاہئے کہ ہر وقت نیک ہی کاموں میں لگائے (اور جو نیک کام کرو گے خدا تعالیٰ کو اس کی اطلاع ہوتی ہے) سو اس کا ثمرہ تم کو عنایت ہوگا) اور (جب حج کو جانے لگو تو) خرچ ضرور (ساتھ) لے لیا کرو، سب سے بڑی بات (اور خوبی) خرچ میں لگا داری (یہ) بھار ہٹا ہے اور اے ذی عقل لوگو! ان احکام کی تعمیل میں) مجھ سے ڈرتے رہو (اور کسی حکم کے خلاف مت کرو)۔

(اور اگر حج میں کچھ اسباب تجارت ہر اہلجانا مصلحت بھوتے) تم کو اس میں ذرا بھی غناہ نہیں کہ (حج میں) معاش کی تلاش کرو جو (تھامی قسمت میں) تمہارے پروردگار کی طرف سے (دھی) ہے، پھر جب تم لوگ عرفات میں ٹھہر کر وہاں سے واپس آئے لگو تو مشعر حرام کے پاس (یعنی مزدلفہ میں) اگر شب کو وہاں قیام کر کے) خدا تعالیٰ کی یاد کرو اور یاد کرنے کے طریقہ میں اپنی رائے کو دخل مت دو، بلکہ اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو (اللہ تعالیٰ نے) بتلا رکھا ہے، اور حقیقت میں قبل اس (بتلانے) کے تم محض ہی نادانقت تھے، پھر اس میں اور بھی بات یاد رکھو کہ جیسا قریش نے دستور رکھا رکھا تھا کہ تمام حجاج تو عرفات میں ہو کر پھر وہاں سے مزدلفہ کو آتے تھے اور یہ مزدلفہ ہی

میں رہ جاتے تھے، عرفات نہ جاتے تھے، یہ جائز نہیں، بلکہ تم سب کو (خواہ قریش ہوں یا غیر قریش) ضروری ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ، جہاں اور لوگ جا کر وہاں سے واپس آتے ہیں اور (احکام حج میں قربانی رسوں پر عمل کرنے سے) خدا تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو، لیسنا اللہ تعالیٰ معاف کر دے اور ہر بانی فرمادیں گے۔

(جائزیت میں بعضوں کی توبہ عادت تھی کہ حج سے فایز ہو کر مٹی میں جمع ہو کر اپنے آباد و اجداد کے مفارقت و فصال بیان کیا کرتے، حق تعالیٰ بجائے اس بیہودہ شغل کے اپنے ذکر کی تعلیم کے لئے فرماتے ہیں کہ) پھر جب تم اپنے اعمال حج پر سے کر چکا کرو تو حق تعالیٰ کا (شکر و عظمت کے ساتھ) ذکر کیا کرو جس طرح تم اپنے آباء (و اجداد) کا ذکر کیا کرتے ہو بلکہ یہ ذکر اس سے (بہتر) ہے، بڑھ کر ہو (نا چاہئے اور بعضوں کی عادت تھی کہ حج میں ذکر تو اللہ تعالیٰ ہی کا کرتے تھے لیکن چونکہ آخرت کے قائل نہ تھے، لہذا تا ستر ذکر ان کا صرف دنیا کے لئے دعا مانگنا ہوتا تھا، حق تعالیٰ صرف دنیا طلبی کی مذمت بیان فرما کر بجائے اس کے خیر و ارباب طلب کرنے کی ترغیب دینے کے لئے (فرماتے ہیں) سو بیٹھے آدمی (جو کہ کافر ہیں) ایسے ہیں جو (دعا میں یوں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو (جو کچھ دیتا ہو) دنیا میں دیدیجئے (و یوں) سوان کو جو کچھ ملنا ہو گا دنیا ہی میں مل رہے گا، اور اسی شخص کو آخرت میں (جو انکار آخرت کے) کوئی حصہ نہ ملے گا، اور بیٹھے آدمی (جو کہ مومن ہیں) ایسے ہیں جو (دعا میں یوں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجئے، اور آخرت میں بھی بہتری دیدیجئے، اور ہم کو عذاب و دوزخ سے بچائیے (سو یہ لوگ اور ہر کے لوگوں کی طرح بے بہرہ نہیں بلکہ) ایسے لوگوں کو (دو دنوں جہان میں) بڑا حصہ ملے گا، بدولت ان کے اس عمل (یعنی طلب خیر و ارباب) کے اور اللہ تعالیٰ جلدی ہی حساب لینے والے ہیں (کیونکہ قیامت میں حساب ہوگا، اور قیامت نزدیک آتی جاتی ہے) جب حساب جلدی ہونے والا ہے تو وہاں کی بہتری کو مت بھولو، اور (مٹی میں خاص طریقہ سے بھی) اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، کئی روز تک (وہ خاص طریقہ کنکریوں کا خاص تین پتھروں پر مارنا ہے، اور وہ کئی روز دسویں گیارہویں یا چوبیس تاریخیں ذی الحجہ کی ہیں، یا تیرہویں بھی کہ ان میں کنکریاں ماری جاتی ہیں، پھر جو شخص کنکریاں مار کر دسویں تاریخ کے بعد) دو دن میں (مکہ واپس آنے میں) تعیل کرے اس پر بھی کچھ غناہ نہیں اور جو شخص (ان) دو دن میں (واپس مکہ میں) تاخیر کرے (یعنی بارہویں کو نہ آئے، بلکہ تیرہویں کو آؤی) اس پر بھی کچھ غناہ نہیں (اور یہ سب باتیں) اس شخص کے واسطے (ہیں) جو (خدا سے) ڈرتے (اور نہ ڈرنے والے کو غناہ ثواب ہی سے غرض نہیں) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور خوب یقین رکھو کہ تم سب کو خدا ہی کے پاس جمع ہونا ہے۔

معارف و مسائل

احکام حج و عمرہ | ابراہیم بن کثیر کے بیان کا سلسلہ نصف سورۃ بقرہ سے چل رہا ہے ان میں گیارہ ہواں حکم حج کا ہے، حج کا تعلق چوکہ مکہ مکرمہ اور بیت اللہ یعنی کعبہ سے ہے اس لئے اس کے متعلق کچھ مسائل قرآن کے بیان میں ضمنی طور پر سورۃ بقرہ کی آیات ۱۲۵ سے ۱۲۸ تک **وَلَا جَعَلْنَا الْكِبَيتَ تَحَايَةً** سے شروع ہو کر **وَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَحْلُوا وَلَا يَحْلُوا لَكُمْ** تک ذکر میں آگئے ہیں، پھر بحث قبلہ کے ختم پر ایک آیت ۱۵۸ **إِنِّي الْغَفَّارُ الْكَرِيمُ** میں مغفروہ کے درمیان سعی کرنے کا حکم بھی ضمنی طور پر بیان ہو چکا ہے، اب آیت نمبر ۹۶ سے آیت نمبر ۲۰ تک **أَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ** سے شروع ہو کر **فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ** تک آٹھ آیات مسلسل حج و عمرہ کے احکام و مسائل سے متعلق ہیں۔

حج باجماع امت اسلام کے ارکان میں سے ایک رکن اور فرائض اسلام میں سے ایک اہم فرض ہے جس کی تاکید و اہمیت قرآن کریم کی بہت سی آیات اور بے شمار احادیث صحیحہ میں وارد ہوئی ہے۔ ہجر کے قول کے مطابق حج کی فرضیت ہجرت کے تیسرے یعنی غزوہ احد کے سال میں سورۃ آل عمران کی اس آیت سے ہوتی ہے: **وَذِيْقُوا مَلَأَ النَّاسِ حُجَّ الْكِبَيتِ** (آیت دہن کش) اسی آیت میں فرضیت حج کی شرائط کا بیان اور باوجود قدرت ہونے کے حج نہ کرنے پر سخت وعید مذکور ہے۔ مذکورہ صدر آٹھ آیتوں میں سے پہلی آیت **أَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ**، باتفاق مفسرین قصہ عدیہ میں نازل ہوئی، جو سترہ برس واقع ہوا ہے، اسی سے یہ معلوم ہو گیا کہ اس آیت کا مقصد حج کی فرضیت بتلانا نہیں بلکہ پہلے بتلائی جا چکی ہے بلکہ اس جگہ حج و عمرہ کے کچھ خاص احکام بتلانا مقصود ہے۔ عمرو کا حکم اور چونکہ سورۃ آل عمران جس میں حج کا فرض ہونا مذکور ہے اس میں صرف حج ہی کا ذکر ہے عمرہ کا نہیں، اور یہ آیت جس میں عمرہ کا ذکر ہوا اس میں اصل وجوب و فرضیت کا بیان نہیں بلکہ ذکر اس کا ہے کہ جب کوئی شخص حج یا عمرہ کو بذریعہ احرام شروع کرے تو اس کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے، جیسا عام نقلی نماز اور روزہ کا بھی حکم یہی ہے کہ شروع کرنے سے واجب ہو جاتے ہیں، اس لئے اس آیت سے یہ مسئلہ معلوم نہیں ہوتا کہ عمرہ واجب ہو یا نہیں، صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شروع کرے تو اس کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

ابن کثیر نے بحوالہ ترمذی، احمد، بیہقی حضرت عمار بن زید سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ عمرہ واجب ہے، آپ نے فرمایا واجب تو نہیں، لیکن کر لو تو بہتر و افضل ہے، وقال الترمذی هذا حدیث حسن صحیح، اس وجہ سے امام اعظم ابو حنیفہ،

مالک وغیرہ کے نزدیک عمرہ واجب نہیں، سنت ہی آیت مذکورہ میں جب یہ بیان ہوا کہ حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیں تو ان کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے، تو اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر احرام باندھنے کے بعد کوئی مجبوری پیش آجائے، حج و عمرہ ادا نہ کر سکیں تو کیا کریں، اس کا بیان بعد کے جملہ میں **وَأَن تَحْلُوا** سے فرمایا۔

احرام کے بعد کوئی مجبوری پیش آجائے | یہ آیت چونکہ واقعہ عدیہ میں نازل ہوئی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام حج و عمرہ کا احرام باندھا ہوا تھا، اٹھارہ گھنٹہ کے بعد مکہ میں داخل ہوئے اور عمرہ ادا کرنے سے روک دیا، اس پر یہ حکم نازل ہوا کہ احرام کا منہ سے ایک قربانی دینا ہے، بکری، گائے، اونٹ وغیرہ کی جو آسان ہو، قربانی دے کر احرام کھول دیں، مگر ساتھ ہی اگلے جملے **وَلَا تَحْلُوا** سے بھی بتلادیا کہ احرام کھولنا جس کی شرعی صورت سر کے بال منڈوانا یا کٹوانا ہے اس وقت تک جائز نہیں، جب تک تحريم کی قربانی اپنے موقع پر پہنچ کر ذبح نہ ہو جائے۔

موقع پر پہنچنے سے مراد امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک یہ ہے کہ حسد و حریم میں پہنچ کر ذبح کی جائے، خود نہ کر سکیں تو کسی دوسرے سے کرا دیں، اس آیت میں مجبوری کی یہ صورت کہ کوئی دشمن حائل ہو جائے صراحۃً مذکور ہے، امام اعظم ابو حنیفہ اور بعض دوسرے ائمہ نے بیماری وغیرہ کی مجبوری کو بھی اس میں با شتر اک علت داخل قرار دیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل بیان سے یہ امر بھی ثابت ہو گیا کہ مجبوری کی حالت میں قربانی دے کر احرام کھول دینا جائز ہے مگر بعد میں قضاء کرنا واجب ہے، جیسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے اگلے سال عمرہ کی قضا کی ہے اس آیت میں سر منڈانے کو احرام کھولنے کی علامت قرار دیا گیا، جس سے ثابت ہوا کہ احرام میں سر منڈانا یا بال کٹوانا منوع ہے، اس کی مناسبت سے اگلا حکم یہ بتلایا گیا کہ جو شخص حج و عمرہ کے افعال ادا کرنے سے توجہ نہ کرے، مگر حالت احرام میں کوئی مجبوری سر کے بال منڈانے یا کٹوانے کی پیش آجائے تو وہ کیا کرے۔

حالت احرام میں بال منڈالے | **فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ** سے مراد امام اعظم ابو حنیفہ میں ارشاد فرمایا کہ اگر کسی بیماری کے سبب سر یا بدن کے کسی دوسرے حصہ کے بال منڈانے کی مجبوری ہو یا سر میں بخود ہی پیدا ہو کر تکلیف دے رہی ہو تو ایسی صورت میں بال منڈانا بعد ضرورت جائز ہے، مگر اس کا ذیہ اور بدلہ یہ ہے کہ روزے رکھے، یا صدقہ دے یا قربانی کرے، قربانی کے لئے تو حد و حریم کی جگہ متعین ہے، روزے اور صدقہ کے لئے کوئی جگہ متعین نہیں، ہر جگہ ادا کر سکتا ہے، قرآن کے الفاظ میں صیام کا کوئی عدد اور صدقہ کی کوئی مقدار مذکور

نہیں ہی مگر حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن عجرہ صحابی کی ایسی ہی حالت میں یہ فرمایا کہ تین روزے رکھیں یا چھ مسکینوں کو آدھا صاع گندم کا بطور صدقہ دیدیں (صحیح بخاری) آدھا صاع ہمارے انٹی تولہ کے سیر کے حساب سے تقریباً پونے دو سیر گندم ہوتے ہیں، اُن کی قیمت صدقہ کر دینا بھی کافی ہے۔

حج کے مہینوں میں حج و عمرہ کو اسلام سے پہلے عربیہ جاہلیت کا خیال تھا کہ جب حج کے مہینے شروع ہو جائیں یعنی ماہ شوال شروع ہو جائے تو ان ایام میں حج و عمرہ کا جمع کرنا سخت گناہ ہے، اس آیت کے آخری حصے میں ان کے اس خیال کی اصلاح اس طرح کر دی گئی کہ حدیث میقات کے اندر رہنے والوں کے لئے تو حج و عمرہ دونوں کو اشہر حج میں جمع کرنا ممنوع رکھا گیا، کیونکہ ان کو اشہر حج کے دوبارہ عمرہ کے لئے سفر کرنا مشکل نہیں، لیکن حدیث میقات کے باہر سے آنے والوں کے لئے جمع کرنے کو جائز قرار دیا، کہ دور دراز سے عمرہ کے لئے مستقل سفر کرنا ان کے لئے آسان نہیں میقات وہ عین مقامات ہیں جو اطراف عالم سے مکہ میں آنے والوں کے ہر راستہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین ہیں کہ جب بقصد مکہ آنے والا مسافر یہاں پہنچے تو یہاں سے حج یا عمرہ کی نیت سے احرام باندھنا لازم ہے بغیر احرام کے یہاں سے لگے بڑھنا جرم و گناہ ہے، وَلَنْ تَكُنْ أَهْلَهُ تَحَاضُّرِ الْقَمْعِ لِحَرَامِہِ کا یہی مفہوم ہے، کہ جس شخص کے اہل و عیال مسجد حرام کے قرب و جوار یعنی حدود میقات کے اندر نہیں رہتے، مقصد یہ ہے کہ اس کا وطن حدود میقات کے اندر نہیں ہے اس کیلئے حج و عمرہ کو اشہر حج میں جمع کرنا جائز ہے۔

البتہ جو لوگ حج و عمرہ کو اشہر حج میں جمع کریں اُن پر واجب ہے کہ دونوں عبادتوں کو جمع کرنے کا شکر ادا کریں اور یہ ہو کہ جس کو قربانی دینے کی قدرت ہو وہ ایک قربانی دے دے، بکری، گائے، اونٹ جو اس کے لئے آسان ہو، لیکن جس شخص کی مالی حیثیت قربانی ادا کرنے کے قابل نہیں اس پر دس روزے اس طرح واجب ہیں کہ تین روزے تو ایام حج کے اندر ہی رکھے یعنی نویں ذی الحجہ تک پورے کر دے، باقی سات روزے حج سے خارج ہو کر جہاں چاہے اور جب چاہے رکھے، وہیں مکہ مکرمہ میں رہ کر پورے کرے یا گھر واپس آکر، اختیاری ہے، اگر کوئی شخص تین روزے ایام حج میں نہ رکھ سکا تو پھر ایام البقیۃ اور اکابر صحابہؓ کے نزدیک اس کے لئے قربانی کرنا ہی متعین ہے، جب قدرت ہو کسی کے ذریعہ حرم میں قربانی کرائے (جصاص)

تمتع و ستران اشہر حج میں حج کے ساتھ عمرہ کو جمع کرنے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ میقات سے ہی حج اور عمرہ دونوں کا احرام ایک ساتھ باندھ لے اس کو اصطلاح حدیث میں قرآن کہا گیا ہے اس کا احرام حج کے احرام کے ساتھ کھلتا ہے، آخر ایام

حج تک اس کو احرام ہی کی حالت میں رہنا پڑتا ہے، دوسرے یہ کہ میقات سے صرف عمرہ کا احرام باندھ لے اور مکہ مکرمہ پہنچ کر عمرہ کے افعال ادا کر کے احرام کھول دے، پھر آٹھویں تاریخ ذی الحجہ کو منیٰ جانے کے وقت حج کا احرام حرم شریف کے اندر ہی باندھ لے، اس کو اصطلاح میں تمتع کہا جاتا ہے، اور لغتی معنی کے اعتبار سے لفظ تمتع دونوں صورتوں پر حاوی ہے، کیونکہ اس کے معنی ہیں حج و عمرہ کو جمع کر کے نفع اٹھانا اور وہ دونوں صورتوں میں برابر ہے، قرآن کی آیت مذکورہ میں قَعْنَ قَمْعِ اسی عام معنی میں ہے۔

احکام حج و عمرہ میں خلافت و رزی آخر آیت میں اذل تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا جس کے معنی ہیں اور کوتاہی موجب عذاب ہے اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی سے ڈرنے اور بچنے کے، اس کے بعد فرمایا: وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَنَّٰی الْوَعَابِ، یعنی جو شخص جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا عذاب سخت ہے، آجکل حج و عمرہ کو جانے والے بکثرت اس سے غافل ہیں، اذل تو حج و عمرہ کے احکام معلوم کرنے ہی کی پوری کوشش نہیں کرتے، پھر معلوم بھی ہو تو بکثرت ان کے مطابق عمل نہیں کرتے، غلط کاموں اور ساختیوں کی بے پروائی سے بہت سے واجبات تک چھوٹ جاتے ہیں، اور آداب و سنن کا تو کہنا کیا، اللہ تعالیٰ سب کو اصلاح عمل کی توفیق عطا فرمادیں۔

احکام حج کی آئمہ آیتوں میں سے آئینہ اشہر حج، اشہر حج کی جمع ہے جس کے معنی ہیں دوسری آیت اور اس کے مساں مہینہ، پھل آیت میں بتلایا گیا تھا کہ جو کوئی حج یا عمرہ کا احرام باندھ لے، تو اس پر لازم آتا ہے کہ اس کے احکام پورے ادا کرے، ان دونوں میں عمرہ کے لئے تو کوئی تاریخ اور مہینہ معین نہیں، سال بھر میں جب چاہیں کر سکتے ہیں، لیکن حج کے لئے مہینہ اور اس کے افعال و اعمال کے لئے خاص تاریخیں اور اوقات مقرر ہیں، اس لئے اس آیت کے شروع میں یہ بتلادیا کہ حج کا معاملہ عمرہ کی طرح نہیں ہے، اس کے لئے کچھ مہینے مقرر ہیں، جو معروف و مشہور ہیں، جاہلیت عرب کے لیکر زمانہ اسلام تک یہی مہینے حج کے مقرر رہے ہیں، وہ مہینے شوال ذیقعدہ اور دس روز ذی الحجہ کے ہیں، جیسا کہ حدیث میں بروایت ابو امامہؓ و ابن عمرؓ منقول ہے (منظری) شوال سے حج کے مہینے شروع ہونے کا حاصل یہ ہے کہ اس سے پہلے حج کا احرام باندھنا جائز نہیں، بعض ائمہ کے نزدیک تو قبل شوال کے احرام سے حج کی ادائیگی ہی نہیں ہو سکتی، امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس احرام سے حج تو ادا ہو جائے گا مگر مکروہ ہوگا (منظری)

فَمَنْ فَرَّغَ مِنْ الْحَجِّ فَلَا تَرْجِعْ وَلَا تَسُوِّغْ لِي فِي الْحَجِّ، اس میں حج کا احرام باندھنے والے کے لئے کچھ منفی آداب و احکام کا بیان ہے، جن سے حالت احرام میں

ہر چیز کو لازم و واجب ہو، وہ تین چیزیں ہیں: رفت، فسق، جدال۔

رفت ایک لفظ جامع ہے جس میں عورت سے مباشرت اور اس کے مقدمات یہاں تک کہ زبان سے عورت کے ساتھ اس کی کھلی گفتگو بھی داخل ہے، تحریم کو حالت احرام میں یہ سب چیزیں حرام ہیں، تعریض و کنایہ کا مضائقہ نہیں۔

فسق کے لفظی معنی خروج کے ہیں، اصطلاح قرآن میں عدول بھی اور ناسرمانی کو فسق کہا جاتا ہے، جو اپنے عام معنی کے اعتبار سے سب گناہوں کو شامل ہے، اسی لئے بعض حضرات نے اس جگہ عام معنی ہی مراد لئے ہیں، مگر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس جگہ فسق کی تفسیر مخطورات احرام سے فرمائی ہے، یعنی وہ کام جو حالت احرام میں ممنوع و ناجائز ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اس مقام کے مناسب یہی تفسیر ہے، کیونکہ عام گناہوں کی مانعت احرام کے ساتھ خاص نہیں ہر حال میں حرام ہیں۔

وہ چیزیں جو اصل سے گناہ نہیں مگر احرام کی وجہ سے ناجائز ہو جاتی ہیں چھ چیزیں ہیں: اول عورت کے ساتھ مباشرت اور اس کے تمام متعلقات یہاں تک کہ کھلی گفتگو بھی، دوسرے بڑی جانوروں کا شکار، خود کرنا یا شکاری کو بتلانا، تیسرے بال یا ناخن کٹوانا، چوتھے خوشبو کا استعمال یہ چار چیزیں تو مرد و عورت دونوں کے لئے حالت احرام میں ناجائز ہیں، باقی دو چیزیں مردوں کے ساتھ خاص ہیں، یعنی پٹے پٹے کپڑے پہننا، اور سر اور چہرے کو ڈھانپنا، امام اعظم ابوحنیفہؒ و مالکؒ کے نزدیک چہرہ کو ڈھانپنا حالت احرام میں عورت کے لئے بھی ناجائز ہے، اس لئے یہ بھی مشترک مخطورات احرام میں شامل ہے۔

ان چھ چیزوں میں پہلی یعنی عورت سے مباشرت وغیرہ اگرچہ فسق میں داخل ہے لیکن اس کو فسق سے پہلے الگ کر کے لفظ رفت سے اس لئے بتلادیا کہ احرام میں اس سے اجتناب سبک زیادہ اہم ہے، کیونکہ دوسرے مخطورات احرام کا تو کوئی بدل اور کفارہ بھی ہو جاتا ہے، اور مباشرت کی بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ اگر ان میں کوئی مسببلا ہو جائے تو حج ہی فاسد ہو جاتا ہے اس کا کوئی کفارہ بھی نہیں ہو سکتا، مثلاً وقوف عرفات سے پہلے بی بی سے صحبت کر لی، تو حج فاسد ہو گیا، اور اس کا جبرانہ بھی گناہ سے یا اونٹ کی قربانی سے دینا پڑے گا، اور اگلے سال پھر حج کرنا پڑے گا، اس مزید اہمیت کی بنا پر اس کو خلافت ذق کے لفظ سے مستقلاً بیان فرمادیا۔

جدال کے معنی ایک دوسرے کو پھپھانڈنے کی کوشش کے ہیں، اس لئے سخت قسم کے جھگڑنے کو جدال کہا جاتا ہے، یہ لفظ بھی بہت عام ہے، اور بعض حضرات مفسرین نے عام ہی معنی مراد لئے ہیں، اور بعض حضرات نے مقام حج و احرام کی مناسبت سے اس جگہ جدال کے معنی یہ

لئے ہیں، کہ جاہلیت عرب کے لوگ مقام وقوف میں اختلاف رکھتے تھے، کچھ لوگ عرفات میں وقوف کرنا ضروری سمجھتے تھے جیسا کہ حقیقت ہے، اور کچھ مزدلفہ میں وقوف ضروری کہتے تھے، عرفات میں جانے کو ضروری نہیں سمجھتے تھے، اور اسی کو موقع ابراہیم علیہ السلام قرار دیتے تھے، اسی طرح اوقات حج کے معاملہ میں بھی اختلاف تھا، کچھ لوگ ذی الحجہ میں حج کرتے تھے، اور کچھ ذیقعدہ ہی میں کر لیتے تھے، اور پھر ان معاملات میں باہمی نزاعات اور جھگڑے ہوتے تھے، ایک دوسرے کو گمراہ کہتا تھا، قرآن کریم نے لآجذک الیٰ فرما کر ان جھگڑوں کا خاتمہ فرمایا، اور جو بات حق تھی کہ وقوف فرض عرفات میں اور پھر وقوف واجب مزدلفہ میں کیا جائے، اور حج صرف ذی الحجہ کے ایام میں کیا جائے، اس کا اعلان کر کے اس کے خلاف جھگڑا کرنے کو ممنوع کر دیا۔

اس تفسیر و تقریر کے لحاظ سے اس آیت میں صرف مخطورات احرام کا بیان ہوا اگرچہ فی نفسہ جائز ہیں، مگر احرام کی وجہ سے ممنوع کر دی گئی ہیں، جیسے نماز روزہ کی حالت میں کھانا پینا، کلام کرنا وغیرہ جائز چیزیں کہ منع کر دیا گیا ہے۔

اور بعض حضرات نے اس جگہ فسق و جدال کو عام معنی میں لیکر مقصد یہ تشریح کیا کہ اگرچہ فسق و گناہ اسی طرح اہم جدال و غلات ہر جگہ ہر حال میں مذموم و گناہ ہے، لیکن حالت احرام میں اس کا گناہ اور زیادہ شدید ہو جاتا ہے، مبارک ایام اور مقدس سرزمین میں جہاں صرف اللہ کے لئے عبادت کے واسطے آتے ہیں، اور لبتیک لبیک پکار رہے ہیں، احرام کا لباس ان کو ہر وقت اس کی یاد دہانی کر رہا ہے کہ تم اس وقت عبادت میں ہو، ایسی حالت میں فسق و فجور اور نزاع و جدال انتہائی بیاہنی اور اشد ترین گناہ ہو جاتا ہے۔

اس عام معنی کے اعتبار سے اس جگہ رفت، فسق، جدال سے روکنے اور ان کی حرمت کو یقین کرنے میں ایک حکمت یہ بھی ہر صحت ہے کہ مقام حج اور زمانہ حج کے حالات ایسے ہیں کہ ان میں انسان کو ان تمیزوں چیزوں میں ابتلا کے مواقع بہت پیش آتے ہیں، حالت احرام میں اکثر اپنے اہل و عیال سے ایک طویل مدت تک علیحدہ رہنا پڑتا ہے، اور پھر مطاف و منیٰ، عروقات، مزدلفہ منیٰ کے اجتماعات میں کتنی بھی احتیاط برتی جائے عورتوں مردوں کا اختلاط ہو ہی جاتا ہے، ایسی حالت میں نفس پر قابو پانا آسان نہیں، اس لئے سب سے پہلے رفت کی حرمت کا بیان فرمادیا، اسی طرح اس عظیم الشان اجتماع میں چوری وغیرہ دوسرے گناہوں کے مواقع بھی بے شمار پیش آتے ہیں، اس لئے لآفسق کی ہدایت فرمادی، اسی طرح سفر حج میں اول سے آخر تک بے شمار مواقع اس کے بھی پیش آتے ہیں کہ رقاء سفر اور دوسرے لوگوں سے جگہ کی تنگی اور دوسرے اسباب کی بنا پر جھگڑا والی ہو جائے، اس لئے لآجذک الیٰ کا حکم دیا گیا۔

بلاغت قرآن

اس آیت کَلَّا مَنَعَتْ ذَٰلِكَ فَسُوۡیَ ۚ کے الفاظ نفی کے الفاظ ہیں کہ یہ سب چیزیں حج میں نہیں ہیں، حالانکہ مقصود ان چیزوں سے نفی اور مانعت کرنا ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ لَا تَسْخَرُوا۟ وَلَا تَفْسَحُوا۟ وَلَا تَجَادِلُوا۟ کہا جاتا، مگر یہاں نفی کی جگہ نفی کے الفاظ رکھ کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ ان افعال کی حج میں کوئی گنجائش اور تھوپی نہیں۔

وَمَا تَقْلَعُوا۟ مِنْ خُبْرٍ يَعْلَمُ اللّٰهُ ۚ محظورات و ممنوعات احرام بیان فرمانے کے بعد آخر میں اس جملے میں یہ ہدایت دی گئی کہ حج کے مبارک ایام اور مقدس مقامات میں تو صرف یہ نہیں کہ محظورات اور گناہوں سے بچو، بلکہ غیبت جان کر عبادت و ذکر اللہ اور نیک کاموں میں لگے رہو، اتم جو بھی نیک کام کر دے وہ اللہ کے علم میں ہو اور تمہیں اس پر بڑے انعامات ملیں گے۔

وَتَذَرُونَ فِيۤهَا مَوَٰظِعَ الذَّكْوٰی ۚ اس میں ان لوگوں کی اصلاح ہے جو حج و عمرہ کے لئے بے سروسامانی کے ساتھ محل بکھڑے ہوتے ہیں، اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ہم اللہ پر توکل کرتے ہیں، پھر راستہ میں بھیک مانگنا پڑتی ہے، یا خود بھی بھیک اٹھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی پریشان کرتے ہیں، ان کی ہدایت کے لئے حکم ہوا کہ سفر حج کے لئے ضروریات سفر ساتھ لینا چاہئے، یہ توکل کے منافی نہیں، بلکہ توکل کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اسباب و مسائل کو اپنے معتد و ر کے مطابق حاصل اور جمع کرے، پھر اللہ پر توکل کرے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے توکل کی یہی تفسیر منقول ہے بالکل ترک اسباب کا نام توکل رکھنا جانتا ہے۔

سفر حج میں تجارت یا لیسہا ہر گناہ نہیں کہ تم سفر حج میں تجارت یا مزدوری کے ذریعے کچھ روزی کماؤ اور اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق حاصل کرو، واقعہ نزول اس آیت کا یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب نے جس طرح تمام عبادات و معاملات کو مع کر کے طرح طرح کی بیہودہ رسمیں ان میں شامل کر دی تھیں، اور عبادات کو بھی کھیل تماشہ بنا دیا تھا، اسی طرح افعال حج میں بھی طرح طرح کی بیہودگیاں کرتے تھے، مٹی کے عظیم جہتار میں ان کے خاص خاص بازار لگتے تھے، نمائش ہوتی تھی، تجارتوں کے فروغ کے ذرائع لگائے جاتے تھے، اسلام آیا، اور حج مسلمانوں پر فرض کیا گیا تو ان تمام بیہودہ رسموں کا قلع قمع کیا گیا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر مست جانے والے تھے، اب ان کو یہ خیال ہوا کہ ایام حج میں تجارت کرنا یا مزدوری کر کے کچھ کما لینا یہ بھی جاہلیت کی پیداوار ہے، شاید اسلام میں اس کی مطلقاً حرمت و مانعت ہو جائے، یہاں تک کہ ایک صاحب حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے

پاس آئے، اوندیہ سوال کیا کہ ہمارا پیشہ پہلے سے یہ ہے کہ ہم اونٹ کرایہ پر چلاتے ہیں، کچھ لوگ پہلے سے اونٹ حج کے لئے کرایہ پر لے جاتے ہیں۔ ہم ان کے ساتھ جاتے ہیں اور حج کرتے ہیں، کیا ہمارا حج نہیں ہوگا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، اور آپؐ وہی سوال کیا تھا، جو تم مجھ سے کر رہے ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس وقت کوئی جواب نہ دیا، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوا۟ اَنْفُسَکُمْ ۚ اُس وقت آپؐ نے اس شخص کو بلوایا اور فرمایا کہ ہاں تمہارا حج صحیح ہے۔

الغرض اس آیت نے یہ واضح کر دیا کہ اگر کوئی شخص دوران حج میں کوئی بیع و شہارہ یا مزدوری کرے جس سے کچھ نفع ہو جائے تو اس میں کوئی گناہ نہیں، ہاں کفار عرب نے جو حج کو تجارت کی منسلک اور نمائش گاہ بنا لیا تھا اس کی اصلاح تشرآن کے دو نظروں سے کر دی گئی، ایک تو یہ کہ جو کچھ کمائیں اس کو اللہ تعالیٰ کا فضل اور عطا سمجھ کر حاصل کریں، شکر گزار ہوں، محض سرمایہ سیٹھا مقصد نہ ہو، فَضْلًا مِّنْ تَرٰہُمْ یُکْمَلُوۡنَ ۚ اسی کی طرف اشارہ ہے، دوسرے لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ کے لفظ نے یہ بتلادیا کہ اس کمائی میں تم پر کوئی گناہ نہیں، جس میں ایک اشارہ اس طرف ہے کہ اگر اس سے بھی اجتناب کیا جائے تو بہتر ہے، کیونکہ اخلاص کا مل میں فرق آتا ہے، اور حقیقت مسئلہ کی یہ ہے کہ اس کا مدار اصل نیت پر ہے، اگر کسی شخص کی نیت اصل میں دنیوی نفع تجارت یا مزدوری ہے اور ضمنی طور پر حج کا بھی قصد کر لیا، یا نفع تجارت اور قصد حج دونوں مساوی صورت میں ہیں تب تو یہ اخلاص کے خلاف ہوگا، حج کا ثواب اس سے کم ہو جائیگا اور ہرکاتب حج جیسی مہل ہوتی چیز وہ حاصل نہ ہوں گی، اور اگر اصل نیت حج کی ہے اسی کے حقوق میں نکلا ہے، لیکن مصارف حج میں یا گھر کی ضروریات میں تنگی ہو، اس کو پورا کرنے کے لئے کوئی معمولی تجارت یا مزدوری کر لی یہ اخلاص کے بالکل منافی نہیں، ہاں اس میں بھی بہتر یہ ہے کہ خاص ان پانچ ایام میں جن میں حج کے افعال ادا ہوتے ہیں، ان میں کوئی مشغلہ تجارت و مزدوری کا نہ رکھے، بلکہ ان ایام کو خالص عبادت و ذکر میں گزارے، اسی وجہ سے بعض علماء نے خاص ان ایام میں تجارت و مزدوری کو منوع بھی فرمایا ہے۔

وفات میں وقت اور اس کے بعد اسی آیت میں ارشاد ہے، فَاِذَا اَقَضْتُمْ مِّنْ عَمَلٰکُمْ ۚ فَاذْكُرُوا۟ اللّٰهَ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوۡا اللّٰهَ الَّذِیْۤ اَخْرَجَکُمْ مِّنْ اَرْضِکُمْ ۚ اِس کے بعد مزدور کا وقت قرآن کُتِبَ عَلَیْہِمْ قَبْلَہٗ لَیْسَ عَلَیْہِمْ جُنَاحٌ مِّنْ عَمَلٍ ۚ یعنی پھر جب تم وفات سے واپس آنے لگو تو شہر حرام کے پاس خدا تعالیٰ کی یاد کرو، اور اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو بتلادیا ہے، اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے بتلانے سے پہلے تم محض ہی نادان تھے، اس میں بتلایا گیا ہے کہ وفات

سے واپسی میں رات کو مزدلفہ میں قیام اور اس کا خاص ذکر واجب ہیں۔

عرفات، لفظ جامع ہے، اور ایک خاص میدان کا نام ہے جس کے حدود اور بجز معروف و مشہور ہیں، یہ میدان حرم سے خارج واقع ہوا ہے، حجاج کو اس میں پہنچنا اور زوالی آفتاب مغرب تک یہاں قیام کرنا حج کا اہم ترین فرض ہے جس کے فوت ہونے کا کوئی کفارہ اور ذبیہ نہیں ہو سکتا۔

عرفات کو عرفات کہنے کی بہت سی درجہ بتلائی جاتی ہیں، ان میں واضح یہ ہے کہ اس میدان میں انسان اپنے رب کی معرفت اور بذریعہ عبادت و ذکر اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتا ہے، نیز مشرق و مغرب کے مسلمانوں کو آپس میں تعارف کا ایک موقع ملتا ہے، ارشاد قرآنی میں اس کی تاکید فرمائی ہے کہ عرفہ کے دن بعد مغرب عرفات سے واپس آتے ہوئے مشعر حرام کے پاس ٹھہرنا چاہئے، مشعر حرام ایک پہاڑ کا نام ہے، جو مزدلفہ میں واقع ہے، مشعر کے معنی شمار اور علامت کے ہیں اور حرام بمعنی محترم و مقدس کے ہے، معنی یہ ہیں کہ پہاڑ شمار اسلام کے اظہار کے لئے ایک مقدس مقام ہے، اس کے آس پاس کے میدان کو مزدلفہ کہتے ہیں، اس میدان میں رات گزارنا اور مغرب و عشاء و دونوں نمازوں کو ایک وقت میں مزدلفہ میں پڑھنا واجب ہے، مشعر حرام کے پاس اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا، اگرچہ ہر طرح کے ذکر اللہ کو شامل ہے، مگر خصوصیت دونوں نمازوں کو ایک وقت میں مغرب کو عشاء کے ساتھ ادا کرنا اس جگہ کی مخصوص عبادت ہے۔ آیت کے جملہ **وَ اذْکُرُوا اللّٰهَ کَمَا هُوَ سَیِّدٌ** میں شاید اس کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی یاد اور ذکر کے لئے جو طریقہ بتلایا ہے اسی طرح اس کو یاد کرو اپنی راستے اور قیاس کو اس میں دخل نہ کیونکہ راستے اور قیاس کا مقتضی تو یہ تھا کہ مغرب کی نماز مغرب کے وقت میں پڑھی جاتی، عشاء کی عشاء کے وقت میں، لیکن اس روز اس مقام پر حق تعالیٰ کو یہی پسند ہوا کہ مغرب کی نماز مؤخر کی جائے، اس کو عشاء کے ساتھ پڑھا جائے، ارشاد قرآنی **وَ اذْکُرُوا اللّٰهَ کَمَا هُوَ سَیِّدٌ** ایک اور بھی اصولی مسئلہ نکل آیا، کہ ذکر اللہ اور عبادت میں آدمی خود مختار نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو جس طرح چاہے یاد کرے، اور جس طرح چاہے اس کی عبادت کرے، بلکہ ذکر اللہ اور ہر عبادت کے خاص آداب ہیں، ان کے موافق ادا کرنا ہی عبادت ہے، اس کے خلاف کرنا جائز نہیں، اور اس میں کمی بیشی یا مقدم مؤخر کرنا خواہ اس میں ذکر اللہ کی کچھ زیادتی بھی ہو وہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، لہذا عبادت اور صدقہ و خیرات وغیرہ میں جو لوگ بلا دلیل شرعی اپنی طرف کچھ خصوصیت اور اضافے کر لیتے ہیں اور ان کی پابندی کو ضروری سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ضروری قرار نہیں دیا اور ان افعال کے نہ کرنے والوں کو خطا وار سمجھتے ہیں

اس آیت نے ان کی غلطی کو واضح کر دیا کہ وہ اپنی جاہلیت کی سی عبادت ہے، کہ اپنی راستے و قیاس سے عبادت کی صورتیں گھڑ رکھی نہیں، اور چند رسول کا نام عبادت رکھ لیا تھا۔

اس کے بعد میری آیت میں ارشاد ہے، **ثُمَّ اِذْکُرُوا اللّٰهَ اَحَاقَ النَّاسِ وَاسْتَعِذُوا بِاللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَفُوٌّ رَّحِیْمٌ** یعنی پھر تم سب کو ضروری ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ جہاں اور لوگ جا کر واپس آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو **اَللّٰهُ تَعَالٰی مَعَاتِ کَرِیْمٌ** اور مہربانی فرما دیں گے۔

اس جگہ کا شان نزول یہ ہے کہ قریش عرب جو بیت اللہ کے محافظ و مجاور تھے اور سائے عرب میں ان کا اقتدار مسلم تھا، اور ان کی ایک ممتاز حیثیت تھی، زمانہ جاہلیت میں وہ اپنی امتیاز شان بنانے کے لئے یہ حرکت کرتے تھے، اور سب لوگ تو عرفات کو جاتے اور وہاں وقوف کر کے واپس آتے تھے، یہ لوگ راستہ میں مزدلفہ کے اندر ہی ٹھہر جاتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم چونکہ بیت اللہ اور حرم کے مجاور ہیں، اس لئے حدود حرم سے باہر جانا ہمارے لئے مناسب نہیں، مزدلفہ حدود حرم کے اندر ہے، اور عرفات سے خارج ہے، یہ پہاڑ کے مزدلفہ ہی میں قیام کر لیتے، اور وہیں سے واپس آ جاتا کرتے تھے، اور درحقیقت وجہ اس جیلہ پہاڑ کی اپنا فخر و غرور اور عام لوگوں سے ممتاز ہو کر رہنا تھا، حق تعالیٰ نے ان کی غلط کاری واضح فرمادی، اور ان کو حکم دیا کہ تم بھی وہیں جاؤ جہاں سب لوگ جاتے ہیں، یعنی عرفات میں اور پھر وہیں سے سب کے ساتھ واپس آؤ۔ ازل تو عام انسانوں سے اپنے آپ کو ممتاز کر کے رکھنا خود ایک شکریہ فعل ہے، جس سے ہمیشہ ہی پرہیز لازم ہے، خصوصاً حج کے ایام میں جہاں لباس حرام اور پھر قیام و مقام کی ایک کچھ کے ذریعہ اسی کا سبق دینا ہے کہ انسان سب برابر ہیں، امیر و غریب یا عالم و جاہل یا بڑے چھوٹے کا یہاں کوئی امتیاز نہیں، حالت احرام میں یہ امتیاز ہی شان بنانا اور بھی زیادہ جرم ہے۔

انسان مساوات کا ذریعہ بہت | اس ارشاد قرآنی سے اصول معاشرت کی ایک اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسانوں کی بہتری عمل صورت | قیام و مقام میں بڑوں کو چاہئے کہ چھوٹوں سے الگ ممتاز ہو کر نہ رہیں بلکہ مل جل کر رہیں، کہ اس میں باہمی اخوت و ہمدردی اور محبت و تعلق پیدا ہوتا ہے، اور امیر و غریب کی تعزین ملتی ہے، مزدور و سرمایہ دار کی جنگ ختم ہو جاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں اس کو خوب واضح کر کے ارشاد فرمایا، کہ کسی عربی کو بھی ہر باگروے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں، فضیلت کا مسدود تقویٰ اور اطاعت خداوندی پر ہے، اسی لئے جو لوگ ان کے خلاف مزدلفہ میں قیام کر کے اپنی ممتاز حیثیت بنانا چاہتے تھے، ان کے اس فعل کو گناہ قرار دے کر ان پر لازم کیا کہ اپنے اس گناہ سے توبہ استغفار کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی خطائیں

معارف فراویں اور اپنی رحمت فراویں۔

رسوم جاہلیت کی اصلاح بتائی میں | ہر نئی پانچویں اور چھٹی آیات میں چند رسوم جاہلیت کی اصلاح کی گئی
نفل و اجتماعات کی ممانعت | ہر ایک تو یہ کہ عرب زمانہ جاہلیت میں عرفات و مزدلفہ اور طواف
و قربانی سے فارغ ہو کر جب مٹی میں قیام کرتے تھے قرآن کی مجلسیں صرف اس کام کے لئے ہوتی
تھیں کہ مشاعرے منعقد کریں، اور ان میں اپنے مفاخر اور اپنے آباء و اجداد کے مفاخر اور کارناموں
کا بیان کریں، ان کی مجلسیں ذکر اللہ سے یکسر خالی ہوتی تھیں، ان مبارک ایام کو ایسی اغوار و نفل
چیسڑوں میں ضائع کرتے تھے، اس لئے ارشاد ہوا کہ جب تم اپنے افعال احرام کو پورا کر چکو اور
مٹی میں قیام کرو، تو وہاں رہ کر اللہ تعالیٰ کو یاد کرو، اپنے آباء و اجداد کو یاد کرنا اور مخصوص
ان کے جھوٹے مفاخر اور کارناموں کو بیان کرنا چھوڑ دو، جتنا تم ان کو یاد کرتے ہو اس کی جگہ
بلکہ اس سے زیادہ خدا تعالیٰ کو یاد کرو، اور ذکر اللہ میں مشغول رہو، قرآن کی اس آیت نے عرب کی
ایک جاہلانہ رسم کو مٹا کر مسلمانوں کو یہ ہدایت کی کہ یہ ایام اور یہ مقام عبادت اور ذکر اللہ
کے لئے مخصوص ہیں، ان میں ذکر اللہ و عبادت کے جو فضائل و برکات ہیں وہ پھر ساتھ نہ آئیں گے
ان کو غلبت جانتا جاتے۔

علامہ ازہری ج ایک ایسی عبادت ہے جو عموماً سفر طویل کی مشقت، اہل و عیال کی مفارقت
کاروبار کو ترک کرنے اور ہزاروں روپے اور بہت سادقت خرچ کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہو
اس میں حوادث کا پیش آجانا کچھ بعید نہیں کہ آدمی باوجود کوشش کے اپنے مقصد ج
میں کامیاب نہ ہو سکے، جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تمام موانع ہٹا کر آپ کے مقصد میں
کامیاب فرمایا اور ذرائع ج پورے ہو گئے، تو یہ مقام شکر ہے، جس کا اقتضایہ یہ ہے کہ اور
زیادہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہو، ان اوقات کو نفل و اجتماعات اور نفل کام یا کلام میں
ضائع نہ کرو، اہل جاہلیت ان اوقات میں اپنے آباء و اجداد کے ذکر کرتے تھے، جن کا کوئی نفع
دین و دنیا میں نہ تھا، تم اس کی جگہ اللہ کا ذکر کرو جو نور ہی نور اور نفع ہی نفع ہے، دنیا کے لئے
بھی آخرت کے لئے بھی، اب کل اگرچہ مسلمانوں میں وہ رسم جاہلیت تو نہیں رہی، کہ مشاعرے
قائم کریں اور آباء و اجداد کے ذکر کریں، لیکن آج بھی ہزاروں مسلمان ہیں جو ان ایام کو نفل
اجتماعات میں نفل و دعوتوں اور تفریحات میں صرف کرتے ہیں، یہ آیت ان کی تنبیہ کے لئے
کافی ہے۔

بعض حضرات مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کو ایسا یاد کرو جیسے
بچپن میں اپنے باپ کو یاد کرتے ہیں کہ ان کا سب پہلا اور سب سے زیادہ کلام یا آیت یا آیت ہوتا ہو

تم اب بالغ ہو، جوان ہو، مائل ہو، یا آیت یا آیت کی جگہ یا آیت یا آیت کو اختیار کرو، اور اس پر نظر ڈالو
کہ بچپن میں اپنے باپ کو اس لئے پکارتا ہے کہ وہ اپنے تمام کاموں میں اپنے آپ کو باپ کا محتاج سمجھتا ہے،
انسان اگر ذرا غور کرے تو وہ ہر وقت ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا محتاج اس سے زیادہ ہے، جیسا بچہ اپنے
باپ کا محتاج ہے، نیز بعض اوقات کچھ لوگ اپنے باپ کا ذکر نثر بھی کیا کرتے ہیں، جیسے اہل جاہلیت
کرتے تھے تو اس آیت نے یہ بھی ہدایت کر دی کہ خود عزت کے لئے بھی ذکر اللہ سے زیادہ کوئی چیز
مؤثر نہیں (روح البیان)

ایک اور رسم جاہلیت کی اصلاح دین | جس طرح جاہلیت کی یہ رسم بیہودہ تھی کہ ان مبارک ایام کو اپنے باپ
دنیا کی طلب میں اسلامی اعتدال | دادوں کے تذکروں اور مشاعروں میں گزاریں، اسی طرح کچھ
لوگوں کی یہ عادت تھی کہ اگرچہ ایام حج میں مشغول تو ذکر اللہ اور دعاؤں ہی کا رکھتے تھے، مگر ان کی
تمام دعائیں صرف دنیوی حاجات اور دنیا کی راحت و عزت یا دولت کے لئے ہوتی تھیں آخرت
کی طرف کوئی دھیان نہ ہوتا تھا، ان کی اصلاح کے لئے اس آیت کے آخر میں فرمایا کہ بعض لوگ
وہ ہیں جو حج میں دعا بھی مانگتے ہیں تو صرف دنیا کی بھلائی مانگتے ہیں، آخرت کی فکر نہیں کرتے،
ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، کیونکہ ان کے اس طرز عمل سے معلوم ہوا کہ سر لختہ حج بھی
انہوں نے محض دنیا اور دنیا میں فخر و جاہت حاصل کرنے کے لئے کیا ہے، اللہ تعالیٰ
کو راضی کرنا اور آخرت میں نجات حاصل کرنا ان کے پیش نظر ہی نہیں۔

اس جگہ یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ صرف دنیاوی دعا مانگنے والوں کا ذکر اس آیت میں
اس طرح کیا گیا ہے کہ وہ کہتے رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا اس کے ساتھ حَسَنَةً کا لفظ مذکور نہیں
جس میں اشارہ اس کی طرف ہو کہ وہ دنیا کے لئے بھی حسنہ کے طلبگار نہیں، بلکہ اغراض دنیویہ میں
ایسے مست و سرشار ہیں کہ ان کی طلب یہ رہ گئی ہے کہ اپنی خواہش کسی طرح پوری ہو، خواہ وہ
بھی ہو یا بُری اور اچھے طریقہ سے حاصل ہو یا بُرے راستہ سے، لوگ ان کو اچھا کہیں یا بُرا۔

اس آیت میں ان مسلمانوں کے لئے بھی بڑی تنبیہ ہے جو موسم حج اور مقامات مقدسہ
میں بھی دعاؤں میں اپنی اغراض دنیویہ ہی کو ترجیح دیتے ہیں، اور بیشتر اوقات انہیں کے لئے
صرف کرتے ہیں، اور اگر ہلکے حالات کا جائزہ لیا جائے تو ثابت ہوگا کہ بہت سے دو تہند لوگ
یہاں بھی جو دعاؤں اور دعائیں کرتے ہیں یا بزرگوں سے کراتے ہیں ان میں بکثرت لوگ ایسے
ہیں کہ ان کی غرض ان تمام دعاؤں سے بھی صرف دولت کی ترقی و تجارت میں برکت
اغراض دنیویہ میں کامیابی ہوتی ہے وہ بہت سے دعاؤں اور فرائض پڑھ کر یہ بھی سمجھ گئے ہیں
کہ ہم بہت عبادت گزار ہیں، لیکن وہ حقیقت میں ایک طرح کی دنیا پرستی ہوتی ہے، بہت حضرات

زندہ بزرگوں سے اور وفات یافتہ اولیاء اللہ سے بڑا تعلق رکھتے ہیں لیکن اس تعلق کا بھی بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی دعا یا تعویذ سے ہمارے کام نکلیں گے، دنیا کی آفات دور ہوں گی، مال میں برکت ہوگی، ایسے لوگوں کے لئے بھی اس آیت میں خاص ہدایت ہو، معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے جو علیم وخبیر ہے، ہر شخص کو اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہئے، کہ وظائف و نوافل اور دعا و درود سے اور حج و زیارت سے اس کی نیت کیا ہے۔ اس آیت کے آخری حصہ میں کم نصیب محروم القسمہ لوگوں کا تذکرہ کرنے کے بعد حق تعالیٰ نے نیک اور مقبول بندوں کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

اور منہ سے کہے کہ یقول ربنا ایتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة و قنا عذاب النار۔ یعنی ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے دنیا کی بھلائی اور بہتری بھی مانگتے ہیں اور آخرت کی بہتری بھی اور عذاب جہنم سے بچاؤ مانگتے ہیں۔

اس میں لفظ حسنہ تمام ظاہری اور باطنی خوبیوں اور بھلائیوں کو شامل ہے، مثلاً دنیا کی حسنہ میں بدن کی صحت، اہل و عیال کی صحت، رزق حلال میں وسعت و برکت و فیوی سب ضروریات کا پورا ہونا اعمال صالحہ، احسان، محمودہ علم نافع، عزت و وجاہت، عقائد کی درستی، صراطِ مستقیم کی ہدایت، عبادات میں اخلاص کامل سب داخل ہیں، اور آخرت کی حسنہ میں جنت اور اس کی بے شمار اور لازوال نعمتیں اور حق تعالیٰ کی رضا اور اس کا دیدار سب چہیزیں شامل ہیں۔

الغرض یہ دعاء ایک ایسی جامع ہے کہ اس میں انسان کے تمام دنیوی اور دینی مقاصد آجاتے ہیں، دنیا و آخرت دونوں جہان میں راحت و سکون میسر آتا ہے، آخر میں خاص طور پر جہنم کی آگ سے پناہ کا بھی ذکر ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت یہ دعاء مانگا کرتے تھے رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ، اور حالت طواف میں حضورِ میث کے ساتھ یہ دعاء مننون ہے، اس آیت میں ان جاہل درویشوں کی بھی اصلاح کی گئی ہے جو صرف آخرت ہی کی دعاء مانگتے کو عبادت جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں دنیا کی کوئی پروا نہیں ہے، کیونکہ درحقیقت یہ ان کا دغری غلط اور خیال خام ہو، انسان اپنے رجو اور بقا اور عبادت و طاعت سب میں ضروریات دنیوی کا محتاج ہے، وہ نہ ہوں تو دین کا بھی کوئی کام کرنا مشکل ہے، اسی لئے انبیاء علیہم السلام کی سنت یہ ہے کہ جس طرح وہ آخرت کی بھلائی اور بہتری اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں اسی طرح دنیا کی بھلائی اور آسائش بھی طلب کرتے ہیں، جو شخص دنیوی حاجات کے لئے دعاء مانگنے کو نہ بددہ بزرگی کے خلاف سمجھے وہ مقام انبیاء سے بے خبر اور جاہل ہے، ہاں صرف دنیوی حاجات ہی کو مقصد زندگی نہ بنائے،

اس سے زیادہ آخرت کی فکر کرے اور اس کے لئے دعا مانگے۔

آیت کے آخر میں اسی دوسرے طبقہ کا جو کہ اپنی دعاؤں میں دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی چاہتا ہو، انجام ذکر کیا گیا ہے کہ ان کے اس صحیح اور نیک عمل اور دعاؤں کا نتیجہ ان کو دنیا و آخرت میں ملے گا۔ اس کے بعد ارشاد ہے **وَاللّٰهُ سَبِيْكَ الْفِتْسَابِ**، یعنی اللہ جلد حساب لینے والا ہے، کیونکہ اس کا علم محیط اور قدرت کاملہ کے لئے ساری مخلوقات کے ایک ایک فرد اور پھر اس کی عمر بھر کے اعمال کا حساب لینے میں اُن آلات و ذرائع کی ضرورت نہیں جن کا انسان محتاج ہے، اس لئے وہ بہت جلد ساری مخلوقات کا حساب لے لیں گے، اور اُن پر جزا و سزا مرتب فرمائیں گے۔

اور ذکر اللہ کی تائید کی طرف متوجہ کر کے ان کے مقصد حج کی تکمیل اور آئندہ زندگی کو درست رکھنے

کی ہدایت اس طرح فرمائی گئی ہے، **وَلَا تَكُنُوا مِنَ الَّذِينَ فِي أَنْفُسِهِمْ مَنَّاتٌ**، یعنی اللہ کو یاد کرو کہ غنہ کی چند دنوں میں ان چند دنوں سے مراد ایام تشریق ہیں جن میں ہر غنا کے بعد تکبیر کہنا واجب ہے۔ آگے ایک مسئلہ کی وضاحت کی گئی کہ منیٰ میں قیام اور ہجرات پر کنکریاں مارنا کب تک ضروری ہے، اس میں اہل جاہلیت کا اختلاف رہا کرتا تھا، بعض لوگ تیسرے دن یا پانچویں دن تک منیٰ میں قیام اور ہجرات پر درمی کرنے کو ضروری سمجھتے تھے، اس سے پہلے بارہویں کو واپس آجانے کو ناجائز اور ایسا کرنے والوں کو گنہگار کہا کرتے تھے، اس طرح دوسرے لوگ بارہویں یا پانچ کو چلنا ضروری سمجھتے، اور تیسرے دن تک ٹھہرنے کو غناہ جانتے تھے، اس آیت میں ان دونوں کی اصلاح آئی **طَرَحَ كِي گئی، اَكَمَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا أَثْمَ عَلَيْهِ، وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا أَثْمَ عَلَيْهِ،** یعنی جو شخص عید کے بعد صرف دو دن منیٰ میں قیام کر کے واپس آجائے، اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، اور جو تیسرے دن تک مؤخر کرے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، یہ دونوں فرق جو ایک دوسرے کو گنہگار کہتے ہیں غلو اور غلطی میں مبتلا ہیں۔

صحیح یہ ہے کہ تہاج کو دونوں صورتوں میں اختیار ہے جس پر چاہیں عمل کریں، ہاں افضل اولیٰ
یہی ہے کہ تیسرے دن تک ٹھہریں، فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو شخص دوسرے دن غروب آفتاب کے
پہلے مٹی سے چلا آیا اس پر تیسرے دن کی ری واجب نہیں، لیکن اگر آفتاب مٹی میں غروب ہو گیا
پھر تیسرے دن کی ری کر لے سے پہلے وہاں سے واپس آ جانا جائز نہیں رہتا، البتہ تیسرے دن کی ری
میں یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ وہ زوال آفتاب کے پہلے صبح کے بعد بھی ہو سکتی ہے۔

مٹی سے داپس کا اور اس میں حجاج کو اختصار دیئے کا ذکر فرمانے کے بعد جو کچھ کیا گیا کہ دوسرے دن داپس آجائے تو کچھ گناہ نہیں اور تیسرے دن داپس آجائے تو کچھ گناہ نہیں یہ سب اس شخص

کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور اس کے احکام کی پابندی کرنے والا ہے، کیونکہ وحیقت جی اسی کا ہے، جیسا قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہے، **إِنَّمَا يَتَّقِ اللَّهَ مِنَ الْمُنْعِقِينَ (۲۰۳) یعنی اللہ تعالیٰ عبادت انہی کی قبول کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اور اطاعت شعائر بندے ہیں:** اور جو شخص جی سے پہلے بھی گناہوں میں ملوث تھا، اور جی کے اندر بھی بے پردائی سے کام لیتا رہا، جی کے بعد بھی گناہوں سے پرہیز نہ کیا تو اس کو اس کا جی کوئی فائدہ نہ دے گا، اگرچہ اس کا جی فرض ادا ہو گیا، ترک جی کا جرم نہیں رہا۔

آخر میں ارشاد فرمایا **وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ** - یعنی ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے اور یقین کر دو کہ تم سب اللہ کے پاس جمع ہونے والے ہو، وہ تمہارے کھیلے ہوئے اور چھپے ہوئے اعمال کا حساب لیں گے، اور ان پر جزا و سزا دیں گے، احکام جی جو ادھر کی آیات میں بیان کئے گئے ہیں یہ جملہ درحقیقت ان سب کی روح ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ جس ایام جی میں جب کہ اعمال جی میں مشغول ہو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرو، احکام جی میں کوئی کوتاہی نہ کرو اور بعد میں بھی اپنے جی پر معسرور نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور گناہوں سے اجتناب کرو، کیونکہ دوزخ اعمال کے وقت انسان کے گناہ اس کے نیک اعمال کو کھٹا جائیں گے، نیک اعمال کا اثر اور دوزخ ظاہر نہ ہونے دیں گے، عبادت جی کے متعلق حدیث میں ہے کہ جب انسان جی سے فانی ہو کر آتا ہے تو اپنے سابقہ گناہوں سے ایسا پاک صاف ہو جاتا ہے جیسے وہ ماں کے پیٹ سے آج پیدا ہوا ہے، اس لئے خاص طور سے حجاج کو آئندہ کے لئے تقاضی کی ہدایت کی گئی کہ پچھلے گناہوں سے پاک ہو چکے ہو، آگے احتیاط رکھو، تو دنیا و آخرت کی بھلائی تمہارے لئے ہے، ورنہ جو شخص جی کے بعد پھر گناہوں میں مبتلا ہو گیا تو پچھلے گناہوں کی معافی اس کو کوئی خاص کام نہ آوے گی، بلکہ علمائے فرمایا ہے کہ جی مقبول کی علامت یہ ہے کہ اپنے جی سے اس طرح واپس آئے کہ اس کا دل دنیا کی محنت سے فانی اور آخرت کی طرف راغب ہو، ایسے شخص کا جی مقبول اور گناہ معاف ہیں، اور دعا اس کی مقبول ہے، ورنہ جی میں جگہ جگہ انسان اللہ تعالیٰ سے اطاعت فراموشی کا معاہدہ اس کے بیت کے سامنے کرتا ہے، اگرچہ کر لے والے اس کا دھیان نہیں تو اس معاہدہ کے پورا کرنے کا آئندہ اہتمام میسر آ سکتا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں جی سے واپس آیا تو اتفاقاً میرے دل میں ایک گناہ کا دوسرا پیدا ہوا، مجھے غیب سے ایک آواز آئی کہ کیا کرنے جی نہیں کیا؟ کیا کرنے جی نہیں کیا؟ یہ آواز میرے اور اس گناہ کے درمیان ایک دیوار بن گئی، اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ فرما دیا۔
ایک ترک بزرگ جو مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کے مريد تھے ان کا حال یہ تھا کہ ہمیشہ اپنے سر پر

ایک نور کا شادہ کیا کرتے تھے، وہ جی کر گئے اور فانی ہو کر داپس آئے تو یہ کیفیت بھلے بڑھنے کے بالکل سلب ہو گئی، اپنے مرشد مولانا جامی سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے فرمایا کہ جی سے پہلے تمہارا اندر تواضع و انکسار تھا، اپنے آپ کو گھنگار سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے الحاج و زاری کرتے تھے، جی کے بعد تم اپنے آپ کو نیک اور بزرگ سمجھنے لگے، اس لئے یہ جی ہی تمہارے لئے غرور کا سبب بن گیا، اسی وجہ سے یہ کیفیت زائل ہو گئی۔

احکام جی کے ختم پر تعمی کی تاکید میں ایک راز یہ بھی ہے کہ جی ایک بڑی عبادت ہو، اس کے اوکرنے کے بعد شیطان عموماً انسان کے دل میں اپنی بڑائی اور بزرگی کا خیال ڈالتا ہے، جو اس کے تمام عمل کو بیکار کر دینے والا ہے، اس لئے خاتمہ کلام میں فرمایا کہ جس طرح جی سے پہلے اور جی کے اندر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اس کی اطاعت لازم ہے اسی طرح جی کے بعد اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور گناہوں سے پرہیز کا اہتمام کرتے رہو کہ کہیں یہ کی کرائی عبادت ضائع نہ ہو جائے۔ **وَقِنَا غَمًّا مِّنَ الْقَوْلِ وَالْفَعْلِ وَالنِّيَةِ**۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُعْجِبُ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهَدُ اللَّهُ

اور دیکھنا آدمی وہ ہے کہ پسند آتی ہو تجھ کو اس کی بات دنیا کی زندگی میں کاموں میں اور گولہ کرتا ہو

عَلَىٰ مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَكْدُ الْخَصَمِ ۚ وَإِذَا اتَّوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ

اللہ کو اپنے دل کی بات پر اور وہ سخت جھگڑا رہے اور جب پھرے پھرے پاس سے تو دوڑتا پھرے ملک

لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفُسَادَ ۚ

میں تاکہ اس میں خرابی ڈالے اور تباہ کرے کھیتیاں اور جانیں اور اللہ ناپسند کرتا ہے فساد کو

وَلَا إِقْبَلَ لَهُ اتِّقَ اللَّهُ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ ۚ

اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈر تو آدہ کرے اس کو غرور گناہ پر سوکانی ہے اس کو دوزخ

وَلَبِئْسَ الْبِهْلَاءُ ۚ وَمِنَ النَّاسِ مَن يُشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتٍ

اور بے شک برا ٹھکانا ہو، اور لوگوں میں ایک شخص وہ ہو کہ بیچتا ہے اپنی جان کو اللہ کی رضا جوئی

اللَّهُ رُفُوتٌ بِالْعِبَادِ ۚ

میں، اور اللہ نہایت ہرمان ہے اپنے بندوں پر

کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور اس کے احکام کی پابندی کرنے والا ہے، کیونکہ وحیقت جی اسی کا ہے، جیسا قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہے، **إِنَّمَا يَتَّقِ اللَّهَ مِنَ الْمُنْعِقِينَ (۳۰) یعنی اللہ تعالیٰ عبادت انہی کی قبول کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اور اطاعت شعائر بندے ہیں** اور جو شخص جج سے پہلے بھی گناہوں میں ملوث تھا، اور جج کے اندر بھی بے پردائی سے کام لیتا رہا جج کے بعد بھی گناہوں سے پرہیز نہ کیا تو اس کو اس کا جج کوئی فائدہ نہ دے گا، اگرچہ اس کا جج فرض ادا ہو گیا، ترک جج کا جرم نہیں رہا۔

آخر میں ارشاد فرمایا **وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ** - یعنی ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے اور یقین کر دو کہ تم سب اللہ کے پاس جمع ہونے والے ہو، وہ تمہارے کھیلے ہوئے اور چھپے ہوئے اعمال کا حساب لیں گے، اور ان پر جزا و سزا دیں گے، احکام جج جواد پر کی آیات میں بیان کئے گئے ہیں یہ جملہ درحقیقت ان سب کی روح ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ جس ایام جج میں جب کہ اعمال جج میں مشغول ہو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرو، احکام جج میں کوئی کوتاہی نہ کرو اور بعد میں بھی اپنے جج پر معسرور نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور گناہوں سے اجتناب کرو، کیونکہ دوزخ اعمال کے وقت انسان کے گناہ اس کے نیک اعمال کو کھٹا جائیں گے نیک اعمال کا اثر اور دوزخ ظاہر نہ ہونے دیں گے، عبادت جج کے متعلق حدیث میں ہے کہ جب انسان جج سے فایغ ہو کر آتا ہے تو اپنے سابقہ گناہوں سے ایسا پاک صاف ہو جاتا ہے جیسے وہ ماں کے پیٹ سے آج پیدا ہوا ہے، اس لئے خاص طور سے حجاج کو آئندہ کے لئے تقاضی کی ہدایت کی گئی کہ پچھلے گناہوں سے پاک ہو چکے ہو، آگے احتیاط رکھو، تو دنیا و آخرت کی بھلائی تمہارے لئے ہو، ورنہ جو شخص جج کے بعد پھر گناہوں میں مبتلا ہو گیا تو پچھلے گناہوں کی معافی اس کو کوئی خاص کام نہ آوے گی، بلکہ علمائے فرمایا ہے کہ جج مقبول کی علامت یہ ہے کہ اپنے جج سے اس طرح واپس آئے کہ اس کا دل دنیا کی محنت سے فایغ اور آخرت کی طرف راغب ہو، ایسے شخص کا جج مقبول اور گناہ معاف ہیں، اور دعا اس کی مقبول ہے، ورنہ جج میں جگہ جگہ انسان اللہ تعالیٰ سے اطاعت فراموشی کا معاہدہ اس کے بیت کے سامنے کرتا ہے، اگر جج کر لے والے اس کا دھیان رکھیں تو اس معاہدہ کے پورا کرنے کا آئندہ اہتمام میسر آ سکتا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں جج سے واپس آیا تو اتفاقاً میرے دل میں ایک گناہ کا دوسرا پیدا ہوا، مجھے غیب سے ایک آواز آئی کہ کیا کرنے جج نہیں کیا؟ کیا کرنے جج نہیں کیا؟ یہ آواز میرے اور اس گناہ کے درمیان ایک دیوار بن گئی، اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ فرما دیا۔
ایک ترک بزرگ جو مولانا جی رحمت اللہ علیہ کے مرید تھے ان کا حال یہ تھا کہ ہمیشہ اپنے سر پر

ایک نور کا شادہ کیا کرتے تھے، وہ جج کر گئے اور فایغ ہو کر واپس آئے تو یہ کیفیت بھلے بڑھنے کے بالکل سلب ہو گئی، اپنے مرشد مولانا جی سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے فرمایا کہ جج سے پہلے تمہارا اندر تواضع و انکسار تھا، اپنے آپ کو گھنگار سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے الحاح و زاری کرتے تھے، جج کے بعد تم اپنے آپ کو نیک اور بزرگ سمجھنے لگے، اس لئے یہ جج ہی تمہارے لئے غرور کا سبب بن گیا، اسی وجہ سے یہ کیفیت زائل ہو گئی۔

احکام جج کے ختم پر تعمی کی تاکید میں ایک راز یہ بھی ہے کہ جج ایک بڑی عبادت ہو، اس کے اوکرنے کے بعد شیطان عموماً انسان کے دل میں اپنی بڑائی اور بزرگی کا خیال ڈالتا ہے، جو اس کے تمام عمل کو بیکار کر دینے والا ہے، اس لئے خاتمہ کلام میں فرمایا کہ جس طرح جج سے پہلے اور جج کے اندر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اس کی اطاعت لازم ہے اسی طرح جج کے بعد اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور گناہوں سے پرہیز کا اہتمام کرتے رہو کہ کہیں یہ کی کرائی عبادت ضائع نہ ہو جائے۔ **وَقِنَا غَمًّا عَنَّا وَتَضَعُ مِنَ الْقَوْلِ وَالْفَعْلِ وَالنَّيَةِ**۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُ قَوْلَهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ يَشْهَدُ اللَّهُ

اور دیکھنا آدمی وہ ہے کہ پسند آتی ہو تجھ کو اس کی بات دنیا کی زندگیوں کے کاموں میں اور گمراہ کرتا ہو

عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَكْدُ الْخَصِمِ (۳۱) وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ

اللہ کو اپنے دل کی بات پر اور وہ سخت جھگڑا رہے اور جب پھرے پھرے پاس سے تو دوڑتا پھرے ملک

لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفُسَادَ (۳۲)

میں تاکہ اس میں خرابی ڈالے اور تباہ کرے کھیتیاں اور جانیں اور اللہ ناپسند کرتا ہے فساد کو

وَلَا إِقْبَلَ لَهُ اتِّقَ اللَّهُ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ (۳۳)

اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈر تو آدہ کرے اس کو غرور گناہ پر سوکانی ہے اس کو دوزخ

وَلَبِئْسَ الْبِهْلَاءُ (۳۴) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتٍ

اور بے شک برا ٹھکانا ہو، اور لوگوں میں ایک شخص وہ ہو کہ بیچتا ہے اپنی جان کو اللہ کی رضا جوئی

اللَّهُ وَ اللَّهُ رُكُوفٌ بِالْعِبَادِ (۳۵)

میں، اور اللہ نہایت ہرمان ہے اپنے بندوں پر

ربط آیات اوپر کی آیتوں میں دمار لگنے والے آدمیوں کی دو قسمیں ٹھہرائی گئیں، ایک کافر کفر مستکر آخرت ہو، اس نے صرف دنیا مانگ لیا ہے، دوسرا مؤمن کہ معتقد آخرت ہو، دنیا کی بھلائی کے ساتھ آخرت کی بھلائی بھی مانگتا ہے، اب اہل آیت میں اسی طرح کی تقسیم نفاق و اخلاص کے اعتبار سے فرماتے ہیں کہ بعض منافق ہوتے ہیں اور بعض مخلصین۔

خلاصہ تفسیر اگر کوئی شخص تھا افسوس بن ستر بن، بڑا فصیح و بلیغ، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر نہیں کھاکھا کر دعویٰ اسلام کیا کرتا اور مجلس سے اٹھ کر جاتا تو فساد و شرارت و ایذا رسائی خلق میں لگ جاتا، اس منافق کے باب میں فرماتے ہیں (اور بعض آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اس کی گفتگو جو شخص و نبی غرض سے ہوتی ہے، دیکھنا اسلام سے مسلمانوں کی طرح قربے غصہ و عصبیت کے ساتھ رہوں گا، اس کی نصاحت و بلاغت کی وجہ سے) مزہ دار معلوم ہوتی ہے، اور وہ اپنا اعتبار بڑھانے کو، اللہ تعالیٰ کو گمراہ بناتا ہے اپنے دل کی سچائی پر، حالانکہ وہ بالکل جھوٹا ہے، کیونکہ واقع میں، وہ (آپ کی) مخالفت میں رہنا ہی ہے، اور جس طرح آپ کا مخالف ہو اس طرح اور مسلمانوں کو بھی ایذا پہنچاتا ہو چنانچہ جب (آپ کی مجلس) پہنچے پھرتا ہے تو اس کو ڈر و صوب میں پھرتا رہتا ہے کہ شہر میں (کوئی) نساد کرے اور (کسی کی) کھیت اور مویشی کو تلف کرے، (چنانچہ ایک مسلمان کا اس طرح نقصان کر دیا، اور اللہ تعالیٰ نساد کی باتوں کو پسند نہیں فرماتے، اور اس مخالفت و ایذا کے ساتھ مغرور اس درجہ ہو کہ جب اس سے کوئی کہتا ہے خدا سے ڈر تو رادہ لیاؤ، آمادہ کر دیتا ہے اس کو غرور گمراہ پر، سو ایسے شخص کی کافی سزا ہے جہنم، اور وہ بڑا اٹھکتا ہے، اور بعض آدمی ایسے بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے بدلہ میں اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کے حال پر نہایت مہربان ہیں۔

معارف و مسائل

آیت کا آخری حصہ جس میں مؤمن و مخلص کا یہ حال بیان کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کی بھی بازی لگا دیتا ہے، یہ ان مخلص صحابہ کرام کی شان میں نازل ہوئی ہو جنہوں نے بے مثال شہداء بنائے اللہ کی راہ میں پیش کی ہیں، مستدرک حاکم، ابن جریر، مسند ابن ابی حاتم وغیرہ میں بسند صحیح منقول ہے کہ یہ آیت حضرت حبیب رومی رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ میں نازل ہوئی ہو کہ جب وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کے لئے روانہ ہوئے تو راستہ میں کفار قریش کی ایک جماعت

نے راستہ روک لیا یہ دیکھ کر حضرت حبیب رومی اپنی سواری سے اتر کر کھڑے ہو گئے، اور ان کے ترکش میں جتنے تیرھے سب کمال لئے، اور قریش کی اس جماعت سے خطاب کیا کہ اے قسبیلہ قریش تم سب بچے ہو کہ میں تیرا اندازی میں تم سب سے زیادہ ماہر ہوں، میرا تیر کبھی خطا نہیں کرتا، اور اب میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ تم میرے پاس اس وقت تک نہ پہنچ سکو گے جب تک میرے ترکش میں ایک تیر بھی باقی ہے، اور تیروں کے بعد میں تلوار سے کام لوں گا جب تک مجھ میں دم رہے گا، پھر جو تم چاہو کر لینا، اور اگر تم رفع کا سودا چاہتے ہو تو میں نہیں اپنے مال کا پتہ دیتا ہوں جو مکہ مکرمہ میں رکھا ہے، تم وہ مال لے لو، اور میرا سستہ چھوڑ دو، اس پر قریش کی جماعت راضی ہو گئی، اور حضرت حبیب رومی نے صبح سلم انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر واقعہ سنایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے فرمایا

رَبِّيعَ النَّبِيِّ اَبَا بَكْرٍ رَّبِّيعَ النَّبِيِّ

تمہارا یہ بابر رفع بخش رہا، تمہاری بی بی نفع بخش

اَبَا بَكْرٍ

دیکھا

اس واقعہ میں آیت مذکورہ کے نزول نے اس کلام کی تصدیق کر دی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا تھا۔

اور بعض حضرات مفسرین نے کچھ دوسرے صحابہ کرام کے ایسے ہی واقعات کو آیت کا نشانہ نزول بتلایا ہے (منطری)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ

لے ایمان والو داخل برجائز اسلام میں پورے اور ملت چلو قدموں پر

الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۖ فَإِنْ تَرَكْتُمُ مِّنْ بَعْدِ مَا

شیطان کے بیشک وہ تمہارا صریح دشمن ہے، پھر اگر تم بچنے لگو بعد اس کے کہ پہنچ چکے

جَاءَ تَكْمَلُ الْبَيْتِ فَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۖ هَلْ

تم کو صحت حکم تو جان رکھو کہ بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا، کیا وہ

يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلُلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ

اس کی راہ دیکھتے ہیں کہ آدھے ان پر اللہ ابر کے ساتھاؤں میں اور فرشتے

وَقُضِيَ الْأَمْرُ إِلَى اللَّهِ تَرْجِعُ الْأُمُورُ ۖ

اور طے ہو جائے قضا اور اللہ ہی کی طرف لوٹیں گے سب کام

رابط آیات

اور پھر غلصہ کی مدح تھی، بعض اوقات اس اخلاص میں غلطی سے نظر اور انفرط ہوا کہ اس سے متجاوز ہوتی ہے، اس کو بدعت کہتے ہیں، چنانچہ حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ جو پہلے علماء یہودیہ تھے، اور اس مذہب میں ہفتہ کار و روز معظم تھا، اور اونٹ کا گوشت حرام تھا، ان صاحبوں کو بعد اسلام کے یہ خیال ہوا کہ شریعت موسوی میں ہفتہ کی تعظیم واجب تھی، اور شریعت محمدیہ میں اس کی تعظیم واجب نہیں، اسی طرح شریعت موسویہ میں اونٹ کا گوشت کھانا حرام تھا اور شریعت محمدیہ میں اس کا کھانا فرض نہیں، سو اگر ہم بدستور ہفتہ کی تعظیم کرتے رہیں اور اونٹ کا گوشت باوجود حلال اعتقاد رکھنے کے صرف عملاً ترک کر دیں تو شریعت موسویہ کی بھی رعایت ہو جائے اور شریعت محمدیہ کے بھی خلاف نہ ہوگا، اور اس میں خدا تعالیٰ کی زیادہ اطاعت اور دین کی زیادہ رعایت معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خیال کی اصلاح آیت آئندہ میں بھی قدر اہتمام سے فرماتے ہیں، ہمیں کا حاصل یہ ہو کہ اسلام کامل فرض ہے اور اس کا کامل ہونا جب ہے کہ جو امر اسلام میں قابل رعایت نہ ہو اس کی رعایت دین ہونے کی حیثیت سے نہ کی جائے، اور ایسے امر کو دین سمجھنا ایک شیطانی لغزش ہے، اور یہ نسبت ظاہری معاصی کے اس کا عذاب زیادہ سخت ہونے کا خطرہ ہے۔

خلاصہ تفسیر

لے ایمان والو اسلام میں پورے پورے داخل ہو رہے نہیں کہ کچھ یہودیت کی بھی رسمہ کر دو اور داپے خیالات میں پڑ کر شیطان کے قدم بقدم مت چلو، واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہو رہا کہ ایسی ہی پڑھا دیتا ہے کہ ظاہر میں تو سرا سر دین معلوم ہو اور فی الحقیقت بالکل دین کے خلاف، پھر اگر تم بعد اس کے کہ تم کو واضح دلائل (احکام و شرائع اسلام کی) پہنچ چکی ہیں، پھر بھی مراکتبہم سے نفرت کرنے لگو تو یقین رکھو کہ حق تعالیٰ (بڑے) زبردست ہیں (سخت سزا دینے اور کچھ دنوں تک سزا دینے تو اس سے دھوکہ مت کھانا کیونکہ وہ) حکمت والے (بھی) ہیں کسی حکمت و مصلحت سے کہیں سزا میں دیر بھی کر دیتے ہیں معلوم ہوتا ہے، یہ لوگ (جو کہ بعد وضوح دلائل حق کے کج راہی اختیار کرتے ہیں) صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ حق تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں ان کے پاس (سزا دینے کے لئے) آویں اور سارا قصہ ہی ختم ہو جاوے (یعنی کیا اس وقت امر حق قبول کریں گے جس وقت کا قبول کرنا مقبول بھی نہ ہوگا، اور یہ سائے جزا و سزا کے) مقدمات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کئے جاویں گے رکونی دوسرا صاحب اختیار نہ ہوگا، سو ایسے زبردست کے ساتھ مخالفت کرنے کا انجام بجز خرابی کے کیا ہو سکتا ہے۔

معارف و مسائل

اَذْكُرُوا فِي الْيَوْمِ كَذَلِكَ، سلم بالکسر بافتح دو معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک صلح دوسری اسلام، اس جگہ جمہور صحابہ و تابعین کے نزدیک اسلام مراد ہے (ابن کثیر) لفظ کاذبہ - جمیعاً اور عامۃ کے معنی میں آتا ہے، یہ لفظ اس جگہ ترکیب میں قائل واقع ہوا ہے جس میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ ضمیر اذکروا کا قائل مسترار دیا جائے، دوسرے یہ کہ سلم بمعنی اسلام کا قائل ہو، پہلی صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ تم پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ، یعنی تمہاریساتے ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان، دل اور دماغ سب کا سب دائرۃ اسلام و اطاعت اہلہ کے اندر داخل ہونا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ ہاتھ پاؤں سے تو احکام اسلام بجا لاد کر ہو مگر دل و دماغ اس پر مطیع نہیں یا دل و دماغ سے تو اس پر مطیع ہو مگر ہاتھ پاؤں اور اعضاء و جوارح کا عمل اس سے باہر ہے۔

اور دوسری صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ تم داخل ہو جاؤ مکمل اور پورے اسلام میں، یعنی ایسا نہ ہو کہ اسلام کے بعض احکام کو تو قبول کر دو بعض میں پس و پیش ہے، اور چونکہ اسلام نام ہے اس مکمل نظام حیات کا جو قرآن و سنت میں بیان ہوا ہے خواہ اس کا تعلق عقائد و عبادات سے ہو، یا معاملات و معاشرت سے، حکومت و سیاست سے اس کا تعلق ہو یا تجارت و صنعت وغیرہ سے اسلام کا جو مکمل نظام حیات ہر تم سب اس پورے نظام میں داخل ہو جاؤ۔

خلاصہ دونوں صورتوں کا قریب قریب یہی ہے کہ احکام اسلام خواہ وہ کسی شعبہ زندگی سے متعلق ہوں اور اعضاء ظاہری سے متعلق ہوں یا قلب اور باطن سے ان کا تعلق ہو، جب تک ان تمام احکام کو بچے دل سے قبول نہ کر دو گے مسلمان کہلانے کے مستحق نہیں ہو گے۔

اس آیت کا شان نزول جو اوپر بیان ہوا ہے اس کا بھی حاصل یہی ہے کہ صرف اسلام ہی کی تعلیمات تمہارا مصلح نظر ہونا چاہئے، اس کو پورا پورا اختیار کر لو تو وہ تمہیں سائے خواہب و ملل سے بے نیاز کر دے گا۔

تنبیہ ۱۔ اس میں آن لوگوں کے لئے بڑی تنبیہ ہے جنہوں نے اسلام کو صرف مسجد اور عبادت کے ساتھ مخصوص کر رکھا ہے، معاملات اور معاشرت کے احکام کو گو با دین کا جزو ہی نہیں سمجھتے، اصطلاحی دینداروں میں یہ غفلت عام ہے، حقوق و معاملات اور خصوصاً حقوق معاشرت سے بالکل بیگانہ ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام کو وہ اسلام کے احکام ہی نہیں سمجھتے، نہ ان کے معلوم کرنے یا سمجھنے کا اہتمام کرتے ہیں نہ ان پر عمل کرنے کا، نعوذ باللہ ہم ازکم محقر سالہ آداب معاشرت حضرت سیدی حکیم الامت کا ہر مسلمان مرد و عورت کو ضرور پڑھ لینا چاہئے۔

اور یہ واقعہ اللہ تعالیٰ اور فرشتے بادل کے ساتھ ان میں ان کے پاس آجائیں قیامت میں پہلے آئے گا، اور اللہ تعالیٰ کا اس طرح آنا مشابہات میں سے ہے جس کے متعلق جہور صحابہؓ و تابعینؓ اور اسلاف امت کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے معنوں کے حق و صحیح ہونے کا اعتقاد یقین رکھے، اور کیفیت کہ کس طرح یہ کام ہوگا اس کی دریافت کی فکر میں نہ پڑے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات اور تمام صفات کی حقیقت اور کیفیت کا معلوم کرنا انسان کی عقل سے بالاتر ہے یہ بھی اسی میں داخل ہے۔

سَلِّ بَنِي إِسْرَءِيلَ كَمَا آتَيْنَاهُمْ مِّنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ وَمَنْ يُبَدِّلْ

یوحنا بن اسرائیل سے کس قدر عنایت کہ ہم نے انکو نشانیاں کھلی ہوئی، اور جو کوئی بدل ڈالے

نِعْمَةً اَللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُۥ فَاِنَّ اِلٰهَ شَدِيْدَ الْعِقَابِ ۝

اللہ کی نعمت بعد اس کے کہ پہنچا چکی ہو وہ نعمت اس کو تو اللہ کا عذاب سخت ہے،

زَيْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ

فریفتہ کیا کہ کافروں کو دنیا کی زندگی پر اور ہنسے ہیں ایمان والوں

اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ اٰتَقَوْا فَرَقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاللّٰهُ يَزْنِۦ

سے اور جو پرہیزگار ہیں وہ ان کافروں کے بالاتر ہوں گے قیامت کے دن اور اللہ روزی

مَنْ يَّشَآءُ مِّنۡ غَيْرِ حِسَابٍ ۝

دیتا ہے جسکو چاہے بے شمار

رابط آیات | اوپر فرمایا تھا کہ بعد دلائل واضعہ آجانے کے حق کی مخالفت کرنا موجب سزا ہے،

پہلی آیت میں اس کی دلیل بیان فرماتے ہیں کہ جیسے بعض بنی اسرائیل کو ایسی ہی مخالفت

پر سزا دی گئی: خلاصہ تفسیر | آپ (علیہ السلام) بنی اسرائیل سے (دُعا) پوچھے (تو یہی) ہم نے ان کو (یعنی اُن کے

بزرگوں کو) کتنی واضح دلیل دی تھیں مگر ان لوگوں نے بجائے اس کے کہ

اس سے ہدایت حاصل کرتے اور الٹی گرا ہی پر کمر باندھی پھر دیکھو سزائیں بھی جگتیں ہنسا تو اذلی،

چاہتے تو یہ تھا کہ اس کو قبول کرتے، مگر انکار کیا، آخر کوہ طور گرانے کی ان کو دھکی دی گئی، اور مثلاً

حق تعالیٰ کا کلام سنا، چاہو تھا سزا انھوں پر رکھتے مگر شہادت نکالنے آخر پہلی سے ہلاک ہوئے اور مثلاً

درایم شکاف کر کے فرعون سے نجات دی گئی، احسان ماننے مگر گوسالہ پرستی شروع کی، جس پر

سزائے قتل دی گئی، اور مثلاً حق و سلوی نازل ہوا شکر کرنا چاہئے تھا، مانا شرمانی کی وہ سڑنے لگا، اور اس سے نفرت ظاہر کی تو وہ موقوف ہو گیا، اور کھیتی کی مصیبت سر پر پڑی، اور مثلاً انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ ان میں جاری رہا، غیبت سمجھنے ان کو قتل کرنا شروع کر دیا، جس پر یہ سزا دی گئی کہ ان سے حکومت و سلطنت چھین لی گئی، اعلیٰ ہندو بہت سے معاملات اسی سورۃ الفرقان کے شروع میں بھی مذکور ہو چکے ہیں، اور دہارا قانون ہی یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی (ایسی بڑی) نعمت (دلائل و اضمح) کو بدلتا ہے، اس کے پاس پہنچنے کے بعد (یعنی بہاتے اس کے کہ اس سے ہدایت حاصل کرے اور اٹا گمراہ بنائے) تو یقیناً حق تعالیٰ (ایسے شخص کو) سخت سزا دیتے ہیں۔

دوسری آیت میں مخالفت حق کی اصل علت اکثر یہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ دنیا کی محبت ہو جس کے آثار میں سے اہل دین کو حقیر سمجھنا بھی ہے، کیونکہ جب دنیا کا غلبہ ہوتا ہے دین کی طلب نہیں رہتی، بلکہ دین کو اپنی دنیوی اغراض کے خلاف دیکھ کر ترک کر بیٹھتا ہے، اور دوسرے طالبان دین پر ہنسنا ہی، چنانچہ بعض رؤسائے بنی اسرائیل اور چہلے مشرکین غریب مسلمانوں کے ساتھ ہاتھ بڑھائے پیش آیا کرتے تھے، ان لوگوں کا بیان فرماتے ہیں کہ دنیوی معاشی کفار کو آراستہ پہر پہر معلوم ہوتی ہے اور (اسی وجہ سے) ان مسلمانوں سے تمسخر کرتے ہیں حالانکہ یہ (مسلمان) جو کفر و شرک سے بچتے ہیں ان کافروں سے اعلیٰ درجہ رک حالت، میں ہوں گے قیامت کے روز کیونکہ کفار جہنم میں ہوں گے اور مسلمان جنت میں) اور (آدمی کو محض معاشی وسعت پر مغرور نہ ہونا چاہئے، کیونکہ روزی تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے انداز (یعنی بکثرت) دیدیتے ہیں پس اس کا مدار قسمت پر ہے نہ کمال اور مقبولیت پر، سو یہ ضرور نہیں کہ جو روزی میں بڑا ہو وہ اللہ کے نزدیک بڑا معزز ہو اور بڑی عزت ہی جو اللہ کے نزدیک معتبر ہو پھر محض اس کے اوپر اپنے کو معزز اور دوسرے کو ذلیل سمجھا جو قوی ہے)۔

معارف و مسائل

دنیا کے مال و دولت اور عزت و جاہ پر مغرور ہونے اور غریب لوگوں کا استہزاء کرنے کی حقیقت قیامت کے روز انھوں کے سامنے آجائے گی۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص کسی مومن مرد یا عورت کو اس کے فقر و فاقہ کی وجہ سے ذلیل و حقیر سمجھتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو اولین و آخرین کے مجمع میں دوا اور ذلیل کریں گے، اور جو شخص کسی مسلمان مرد یا عورت پر بہتان باندھتا ہے اور کوئی ایسا جب اس کی طرف غصوب کرتا ہے جو اس میں نہیں ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو آگ

کے ایک اونچے ٹیلہ پر کھڑا کریں گے جب تک کہ وہ خود اپنی تکذیب نہ کرے۔

(ذکر الحدیث القریبی)

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَ

تھے سب ایک دین پر پھر بھیجے اللہ نے پیغمبر خوش خبری سنانے والے اور

مُنْذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيُحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ

ڈرانے والے اور اناری اُن کے ساتھ کتاب بھی کہ فیصلہ کرے لوگوں میں جس پر

فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ

میں وہ جھگڑا کریں، اور نہیں جھگڑا اولا کتاب میں مگر انہی لوگوں نے جن کو کتاب ملی تھی اس

مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا

کے بعد کہ ان کو پہنچ چکے صاف حکم آپس کی ضد سے بھرا ہوا ہدایت کی اللہ نے ایمان والوں کو

لَمَّا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِآيَاتِهِ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى

اسی ہی بات کی جس میں وہ جھگڑا کر رہے تھے اپنے حکم سے اور اللہ بتلاتا ہے جسکو چاہے

صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۱۳﴾

سیدھا راستہ۔

ربط آیات

اور یہ دین حق سے اختلاف کرنے کی ملتِ حُکْمِ دُنیا کو بتایا ہے، آگے اسی مضمون کی تائید فرماتے ہیں کہ مذمت سے ہیں قصہ چلا آ رہا ہے کہ ہم دلائل واضح دین حق پر قائم کرتے ہیں، اور طالبانِ دُنیا اپنی دنیوی اغراض کے سبب اس سے خلاف کرتے رہے۔

خلاصہ تفسیر

راہِ راستہ میں (سب آدمی ایک ہی طریق پر تھے) کیونکہ اول دُنیا میں حضرت آدم علیہ السلام صبح اپنی بی بی کے تشریف لائے اور جو اولاد ہوتی تھی ان کو

دین حق کی تعلیم فرماتے رہے اور وہ ان کی تعلیم پر عمل کرتے رہے، ایک مدت اسی حالت میں گزر گئی، پھر اختلافِ طبائع سے اغراض میں اختلاف ہوا شروع ہوا حتیٰ کہ ایک عرصہ کے بعد

اعمال و عقائد میں اختلاف کی نسبت آگئی، پھر اس اختلاف کے رفع کرنے کو اللہ تعالیٰ نے (مختلف) پیغمبروں کو بھیجا جو کہ (حق ماننے والوں کو) خوشی دے دے، سناتے تھے اور (نہ ماننے والوں کو) مذہاب سے ڈراتے تھے، اور ان پیغمبروں کی ہر جمعی جماعت کے ساتھ (آسانی) کتابیں بھی

تھیں اور ہر نازل فرمائیں اور ان پیغمبروں کا بھیجنا اور کتابوں کا نازل فرمانا، اس غرض سے تھا کہ

اللہ تعالیٰ راہِ رسل و کتب کے ذریعہ سے اختلاف کرنے والے لوگوں میں ان کے امور اختلافیہ

(مذہبی) میں فیصلہ فرمادیں کیونکہ رسل و کتب امر واقعی کا اظہار کر دیتے ہیں اور امر واقعی کے متین

ہونے سے ظاہر ہے کہ غیر واقعی کا غلط ہو جانا معلوم ہو جاتا ہے، اور یہی فیصلہ ہی، اور ان پیغمبروں کے

ساتھ کتاب اللہ آنے سے چاہئے تھا کہ اس کتاب کو قبول کرتے، اور اس پر مدار رکھ کر اپنے سب

اختلافات مٹا دیتے، مگر بعضوں نے خود اس کتاب ہی کو نہ مانا، اور خود اسی میں اختلاف کرنا شروع

کر دیا، اور اس کتاب میں (یہ) اختلاف اور کسی نے نہیں کیا، مگر صرف ان لوگوں نے جن کو اول

وہ کتاب ملی تھی یعنی اہل علم و اہل فہم نے کہ اول مخاطب وہی لوگ ہوتے ہیں، دوسرے عوام اُن کے

ساتھ لگ لیا کرتے ہیں، اور اختلافات بھی کیسے وقت کیا، بعد اس کے کہ ان کے پاس دلائل واضح

پہنچ چکے تھے، لیکن ان کے ذہن نشین ہو چکے تھے، اور اختلاف کیا کس وجہ سے صرف، یا بھی

ضدِ اضدی کی وجہ سے اور اصل وجہ ضدِ اضدی کی حُکْمِ دُنیا ہوتی ہے، حُکْمِ مال ہو یا حُکْمِ جاہ، پس

مدارِ ملت مخالفت حق کا وہی حُکْمِ دُنیا ٹھہری اور یہی مضمون تھا سابق میں، پھر یہ اختلاف کفار کا

کبھی اہل ایمان کو مضرت نہیں ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ایمان والوں کو وہ امر حق جس میں اختلاف نہیں

اختلاف کیا کرتے تھے بفضلہ تعالیٰ (رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانے کی بدولت) بتلادیا اور اللہ

تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اسی کو راہِ راست بتلا دیتے ہیں۔

معارف و مسائل

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کسی زمانہ میں تمام انسان ایک ہی مذہب و ملت اور

عقیدہ و خیال پر تھے جو ملت حق اور دینِ فطرت تھی، پھر انہیں مزاج و ذوق اور رائے فکر کے اختلاف کیسے مختلف خیالات

و عقائد پیدا ہو گئے، جن میں یہ بہت سی از کرنا دشوار تھا کہ ان میں حق کونسا ہے اور باطل کونسا، حق کو

واضح کرنے اور صحیح راہِ حق بتلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام بھیجے، اور ان پر کتابیں

اور وحی نازل فرمائی، انبیاء علیہم السلام کی جدوجہد اور تبلیغ و اصلاح کے بعد انسان دو گروہوں

میں منقسم ہو گئے، ایک وہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایات کو قبول کیا اور انبیاء علیہم السلام

کے متبع ہو گئے، جن کو مومن کہا جاتا ہے، دوسرے وہ جنہوں نے آسانی ہدایات اور انبیاء علیہم السلام کو جھٹلایا، ان کی بات نہ مانی، یہ لوگ کافر کہلاتے ہیں، اس آیت کے پہلے جملہ میں ارشاد ہے: كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً، امامِ راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں فرمایا ہے کہ لفظ "أُمَّة"

عرب لغت کے اعتبار سے ہر ایسی جماعت کو کہا جاتا ہے جس میں کسی وجہ سے رابطہ و اتحاد اور وحدت

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ اوپر کے جملہ میں تمام انسانوں کا امتب واحد اور ملت واحد ہونا بیان کیا تھا، اور اس جملہ میں اس پر تفسیر سراج کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ ہم نے انبیاء اور کتاہیں سمجھی تاکہ اختلاف کا فیصلہ کیا جائے، ان دونوں جملوں میں بظاہر جڑ نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ انبیاء اور کتابوں کے بھیجنے کی ملت لوگوں کا اختلاف ہے، اور اختلاف اس وقت تھا نہیں مگر جواب بالکل واضح ہے کہ مراد آیت مذکورہ کی یہ ہے کہ ابتداء عالم میں تمام انسان ایک ہی عقیدہ حق کے قائل اور پابند تھے، پھر رفتہ رفتہ اختلافات پیدا ہو گئے، اختلافات پیدا ہونے کے بعد انبیاء علیہم السلام اور کتاہیں بھیجنے کی ضرورت پیش آئی۔

اب ایک بات رہ جاتی ہے کہ اور صرف امت واحدہ ہونے کا ذکر کیا گیا، اختلاف پیدا ہونے کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا، جو لوگ قرآن کریم کے اسلوب حکیم پر کچھ نظر رکھتے ہیں، ان کے لئے اس کا جواب مشکل نہیں کہ قرآن کریم احوالِ ماضیہ کے بیان میں قصہ کہانی یا تالیف کی کتابوں کے سائے قصہ کو کہیں نقل نہیں کرتا، بلکہ درمیان سے وہ حصہ حذف کر دیتا ہے جو اس سیاقِ کلام سے خود بخود سمجھا جاسکے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں جو قیدی رہا ہو کر آیا اور خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے لئے اس نے بادشاہ سے کہا کہ مجھے یوسف علیہ السلام کے پاس بھیج دو تو قرآن میں اس قیدی کی تجویزِ نقل کرنے کے بعد بات یہاں سے شروع ہوتی ہے :
يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ اس کا ذکر نہیں کیا کہ بادشاہ نے اس کی تجویز کو پسند کیا، اور اس کو حیل خانہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس بھیجا، وہ وہاں پہنچ کر ان سے مخاطب ہوا، کیونکہ پچھلے اور اگلے جلول کے ملانے سے یہ ساری باتیں خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہیں۔

اسی طرح اس آیت میں وحدتِ ملت کے بعد اختلاف واقع ہونے کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے، لہذا یہاں اختلافات کا وقوع تو ساری دنیا جانتی ہے، ہر وقت مشاہدہ میں آتا ہے، ضرورت اس امر کے انبار کی تھی کہ ان اختلافات کثیرہ سے پہلے ایک زمانہ ایسا بھی گذر چکا ہے جس میں ساری انسان ایک ہی مذہب و ملت اور ایک ہی دین حق کے پیرو تھے، اسی کو بیان فرمایا، پھر جو اختلاف دنیا میں پھیلے ہوئے اور سب کے مشاہدہ میں آتے ہیں ان کے وقوع کا بیان کرنے کی ضرورت تھی، ان یہ بتلایا گیا کہ ان اختلافات میں راوح حق کی ہدایت اور رہنمائی کا سامان حق تعالیٰ نے کیا فرمایا، اس کے متعلق ارشاد ہوا فَجَعَلْنَا الذِّبْنَ یعنی حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا جو دین حق کا اتباع کرنے والوں کو دائمی آرام و راحت کی غرض خبری اور اس سے اعراض کرنے والوں کو عذابِ جہنم کی وعید سنادیں، اور ان کے ساتھ اپنی وحی اور کتابیں بھیجی جو مختلف مقامات و خیالات میں سے صیح اور حق کو واضح کر کے بتلا دیں، اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ انبیاء

—

رسول اور آسمانی کتابوں کے کھلے ہوئے فیصلوں کے بعد بھی یہ دنیا دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی، کچھ لوگوں نے ان ہدایات واضحہ کو قبول نہ کیا، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ قبول نہ کرنے والے اولیٰ وہی لوگ ہوئے جن کے پاس یہ انبیاء اور آیات الہیہ بھی گئی تھیں، یعنی اہل کتاب یہود و نصاریٰ، اور اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ آسمانی کتابوں میں کوئی استنباط یا التباس کی گنجائش نہ تھی، مگر ان کی سمجھ میں نہ آئے یا غلط فہمی کا شکار ہو جاتیں، بلکہ حقیقت یہ تھی کہ جاننے اور سمجھنے کے باوجود ان لوگوں نے محض ضد اور ہٹ دھرمی سے انکار کیا۔

اور دوسرے اگر وہ ہوا جن کو اللہ تعالیٰ نے راہ ہدایت پر لگا دیا اور جس نے انبیاء و رسول اور آسمانی کتابوں کے فیصلے ٹھنڈے دل سے تسلیم کئے، انہیں دونوں گروہوں کا بیان قرآن کریم نے سورۃ تغابن میں اس طرح فرمایا ہے :

خَلَقَكُمْ مِمَّنْ كَانُوا زُرَّ
بَنُكُمْ كُرَّ مِنْ د (۲:۶۳)

تین اللہ تعالیٰ نے تم کو پیدا کیا پھر تم میں سے کچھ
کافر و منکر ہو گئے کہ ان میں تو سلم ۵

فَلَمَّا مَنَّ اللَّهُ عَلَى النَّاسِ بِنُوحٍ وَأَوَّلِي آلِهِ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَذَكَرَ إِلَهُهُمْ إِنَّهُمْ عَلَىٰ رُءُوسِهِمْ لَا يَنظُرُونَ
 حق پر قائم تھے، پھر اختلاف طہالک سے اغراض میں اختلاف ہونا شروع ہوا، ایک عرصہ کے بعد
 اعمال و عقائد میں اختلاف کی نوہٹ اٹھی، یہاں تک کہ حق و باطل میں القباس ہونے لگا، تو اللہ
 تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام اور اپنی کتہا میں راہِ حق کی ہدایت کرنے کے لئے اور اسی دینِ حق پر
 دوبارہ قائم ہو جانے کے لئے بھیجی جس پر سب انسان پہلے قائم تھے، لیکن ان سب ہدایات و نسخہ
 اور آیاتِ نبیات کے ہوتے ہوئے کچھ لوگوں نے مانا اور کچھ لوگوں نے ضد اور عناد سے انکار و انحراف
 کی راہ اختیار کر لی۔

مسائل

مسئلہ : اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں، اول یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو بہت سے انبیاء اور کتابیں دنیا میں بھیجیں یہ سب اس واسطے تھیں کہ یہ لوگ جو دین حق کی ملت واحدہ کو چھوڑ کر مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں پھر ان کو اسی ملت واحدہ پر قائم کر دیں، انبیاء کا یہ سلسلہ یوں ہی چلتا آتا کہ جب لوگ اس راہ حق سے ہٹ گئے تو ان کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے کوئی نئی بھیجا، اور کتاب اتاری کہ اس کے موافق چلیں، پھر کبھی پہلے خود دوسرا نبی اور کتاب اللہ تعالیٰ نے اسی راہ حق پر قائم کرنے کے لئے بھیج دیا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے تندرستی ایک ہو اور بیماریاں بے شمار، جب ایک مرض پیدا ہوا تو اس کے موافق دوا اور پرہیز مقرر فرمایا، جب دوسرا مرض پیدا ہوا تو دوسری دوا

اور پرہیز اس کے موافق بتلایا، اب آخر میں ایسا جامع نسخہ تجویز فرمایا جو ساری بہاریوں سے بچنے میں اس وقت تک کے لئے کامیاب ثابت ہو جب تک اس عالم کو باقی رکھنا منظور ہو، یہ مکمل اور جامع نسخہ، ایک جامع اصول علاج سب پچھلے نسخوں کے قائم مقام اور آئندہ سے بے نیاز کر لے والا ہو، اور وہ نسخہ جامع اسلام ہے، جس کے لئے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید گئے، اور کئی کتابوں میں تحریر ہو کر جو پچھلے انبیاء تک تعلیمات ضائع اور گم ہو جانے کا سلسلہ ادھر سے چلا آیا تھا جس کے سبب نبی اور نبی کتاب کی ضرورت پیش آتی تھی، اس کا یہ انتظام فرمادیا گیا کہ قرآن کریم کے تحریر سے محفوظ رہنے کا وہ خود حق تعالیٰ نے لے لیا اور قرآن کریم کی تعلیمات کو قیامت تک ان کی اصلی صورت میں قائم اور باقی رکھنے کے لئے اللہ جل شانہ نے امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں تاقیامت ایک ایسی جامع قائم رکھنے کا وعدہ فرمایا جو ہمیشہ دین حق پر قائم رہ کر کتاب و سنت کی صحیح تعلیم مسلمانوں میں مشائع کرتی رہے گی، کسی کی مخالفت و عداوت اُن پر اثر انداز نہ ہوگی، اس لئے اس کے بعد دروازہ نبوت اور دہلی کا بند ہو جانا ناگزیر امر تھا، آخر ختم نبوت کا اعلان کر دیا گیا۔

خلاصہ یہ ہو کہ مختلف زمانوں میں مختلف انبیاء اور ان کی مختلف کتابیں آنے سے کوئی اس دور میں نہ بڑ جائے کہ انبیاء اور کتابیں لوگوں کو مختلف فرقوں میں تقسیم کرنے اور افتراق پیدا کرنے کے لئے نازل کی گئی ہیں، بلکہ منشاء ان سب انبیاء اور کتابوں کا یہ ہے کہ جس طرح پہلے سارے انسان ایک ہی دین حق کے پیرو ہو کر ملت واحدہ تھے، اسی طرح پھر اُسی دین حق پر سب جمع ہو جائیں۔

مسئلہ: دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مذہب کی بناء پر قومیت کی تقسیم مسلم و غیر مسلم کا در قوی نظریہ عین منشاء قرآنی کے مطابق ہے، آیت **فَبَنَیْکُمْ کُفْرًا وَبَنَیْکُمْ تَقْوًیًا** اس پر شاہد ہوا اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو گیا کہ اسلام میں اس در قوی نظریے کی اصل بنیاد و حقیقت صحیح متحدہ قومیت پیدا کرنے پر ہے جو ابتداء آفرینش میں قائم تھی، جس کی بنیاد وطنیت پر نہ تھی بلکہ عقیدہ حق اور دین حق کی پیروی پر تھی، ارشاد قرآنی **لَا تَجِدُ اُمَّةً ذَاتَ اِلَٰهٍ غَیْرِ اللّٰهِ** بتلایا کہ ابتداء عالم میں اعتقاد صحیح اور دین حق کی پیروی کے اعتبار سے ایک صحیح اور حقیقی وحدت قوی قائم تھی، بعد میں لوگوں نے اختلافات پیدا کئے، انبیاء نے لوگوں کو اسی اصل وحدت کی طرف بلایا، جنہوں نے ان کی دعوت کو قبول نہ کیا، وہ اس متحدہ قومیت سے کٹ گئے اور جدا گانہ قوم قرار دیئے گئے۔

مسئلہ: تیسری بات اس آیت سے یہ معلوم ہوئی کہ ازل سے سنت اللہ ہی جاری ہے کہ بُرے لوگ ہر نبی مبعوث کے خلاف اور ہر کتاب الہی سے اختلاف کو پسند کرتے رہے اور ان کے مقابلہ و مخالفت میں پورا زور و خرچ کرنے کے لئے آمادہ رہے ہیں، تو اب اہل ایمان کو ان کی بدسلوکی اور فساد سے تشدد نہ ہونا چاہئے، جس طرح کفار نے اپنے بڑوں کا طریقہ کفر و عداوت اور انبیاء کی مخالفت

کا اختیار کیا، اسی طرح مومنین صالحین کو چاہئے کہ وہ اپنے بزرگوں کا یعنی انبیاء علیہم السلام کا وظیفہ اختیار کریں، کہ اُن لوگوں کی ایذاؤں اور مخالفتوں پر صبر کریں، اور محنت و موعظت اور نرمی کے ساتھ ان کو دین حق کی طرف بلائے رہیں، اور شاید اس مناسبت سے اہل آیت میں مسلمانوں کو مصائب و آفات، ہر عمل اور صبر کی تلقین کی گئی ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ

کہ تم کو یہ خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ تم پر نہیں گزرے حالات اُن

الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاسَاءُ وَالضَّرَآءُ وَ

لوگوں کے جیسے جو تم سے پہلے کہ پہنچی ان کو سختی اور تکلیف اور

رَزَزُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ اٰمَنُوْا مَعَهُ مَتٰی

بھڑ بھڑائے گئے یہاں تک کہ کہنے لگا رسول اور جو اُس کے ساتھ ایمان لائے کب آوے گی

نَصْرُ اللّٰهِ اَلَا اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ

اللہ کی مدد، سن رکھو اللہ کی مدد قریب ہے۔

رَبِّطْ آيَاتِ اور ہر کی آیت میں کفار کا ہمیشہ سے انبیاء و مومنین کے ساتھ اختلاف اور مخالفت کرتے رہنا مذکور تھا، جس میں ایک گونہ مسلمانوں کو اس طور پر تسلی دینا بھی

مقصود تھا جن کو سہ تنہا کفار سے ایذا ہوتی تھی، کہ یہ خلاف تمہارے ساتھ نیا نہیں ہے ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، آگے ان کفار مخالفین سے انبیاء و مومنین کو انواع الفواعل کی ایذائیں اور شکار پیچھے کی حکایت بیان فرماتے ہیں، اور اس سے بھی مسلمانوں کو تسلی دلاتے ہیں کہ تم کو بھی کفار سے جو ایذائیں پہنچتی ہیں اُن پر صبر کرنا چاہئے، کیونکہ کامل راحت تو آخرت کی محنت ہی اٹھانے سے ہے۔

خُلَاصَةُ تَفْسِيرِ دوسری بات سنو گویا تمہارا یہ خیال ہو کہ جنت میں (بے مشقت) جاد جاسی ہو گے، حالانکہ ابھی کچھ مشقت تو اٹھانی ہی نہیں، کیونکہ تم کو ہنوز ان

مسلمان لوگوں کا سا لحاظ واقعہ پیش نہیں آیا جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں، ان پر مخالفین کے سبب ایسی ایسی سختی واقع ہوئی اور (مصائب سے) ان کو یہاں تک جنبشیں

ہوئیں کہ اس زمانہ کے پیغمبر تک اور جو ان کے ہمراہ اہل ایمان تھے (بے قرار ہو کر) بول اٹھے کہ اللہ تعالیٰ کی امداد و موعود کب ہوگی (جس پر ان کو جواب سے تسلی کی گئی کہ) یاد رکھو بیشک اللہ تعالیٰ کی امداد و بہت (نزدیک رہنے والی) ہے۔

معارف و مسائل

اس آیت میں چند باتیں قابل غور ہیں:

اول یہ کہ اس آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بغیر مشقت و محنت کے اور بغیر مصائب و آفات میں مستلا ہوئے کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا، حالانکہ ارشادات قرآنی اور ارشادات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ بہت سے گنہگار محض اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مغفرت سے جنت میں داخل ہوں گے، ان پر کوئی مشقت بھی نہ ہوگی، وجہ یہ ہے کہ مشقت و محنت کے درجات مختلف ہیں، اولیٰ درجہ نفس و شیطان سے مزاحمت کر کے یا دین حق کے مخالفین کے ساتھ مخالفت کر کے اپنے عقائد کا درست کرنا ہے، اور یہ ہر مؤمن کو حاصل ہے، آگے اوسط اور اعلیٰ درجات ہیں، جس درجہ کی محنت و مشقت ہوگی اسی درجہ کا دخول جنت ہوگا اس طرح محنت و مشقت سے خالی کوئی نہ رہا، ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَشَقُّ النَّاسِ بَلَاءَ الْأَشْيَاءِ

لَقَدْ أَلَامَهُمْ مَا لَا مِثْلَ

سب سے زیادہ سخت بلائیں اور تعیشیں انبیاء علیہم السلام کو پہنچتی ہیں، ان کے بعد جو ان کے قریب تر ہیں۔

صحیح

دوسری بات یہاں قابل نظر یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے ساتھیوں کا یہ عرض کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کب آئے گی کسی شک و شبہ کی وجہ سے نہ تھا جو ان کی شان کے خلاف ہے بلکہ اس سوال کا منشا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ روکا وعدہ فرمایا ہے، مگر اس کا وقت اور مقام متعین نہیں سنرایا، اس لئے حالت خطر میں ایسے الفاظ عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ مدد جلد بھیج جائے، اور ایسی دعا کرنا تو مکمل یا منصب نبوت کے منافی نہیں، بلکہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کی الحاج و زاری کو پسند فرماتے ہیں، اس لئے انبیاء اور صلحاء امت اس کے سبب زیادہ مستحق ہیں۔

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلْ مَا أَنفَقْتُ مِنْ خَيْرٍ قَلِيلًا

تجھ سے پوچھنے ہیں کیا چیز خرچ کریں کہہ دو کہ جو کچھ خرچ کرو مال سوا ماں باپ کے لئے

وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ وَالْمَلَائِكَةِ قَائِمِينَ وَمَا

اور قرابت والوں کے اور بیہوشوں کے اور محتاجوں کے اور مسافروں کے اور جو کچھ

تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ (۲۱۵)

کرو گے تم بھلائی سودہ ہے شک اللہ کو خوب معلوم ہے۔

خلاصہ تفسیر

بارہواں حکم صدقہ کے مصارف

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ثواب کے واسطے کیا چیز خرچ کیا کریں (اور کس موقع پر صرف کیا کریں) آپ فرمادیجئے کہ جو مال تم کو صرف کرنا ہو سو اس کی تعیین تو تمہاری ہمت پر ہے، مگر ہاں موقع ہم بتلائے دیتے ہیں کہ ماں باپ کا حق ہے اور قرابت داروں اور بے باپ کے بچوں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا اور جو سائیک کام کرو گے (خواہ براہ خدا میں خرچ کرنا ہو یا اور کچھ ہو) سوائے اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے (وہ اس پر ثواب دیں گے)۔

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیتوں میں مجموعی حیثیت سے یہ مضمون بہت تاکید کے ساتھ بیان ہوا ہے، کہ کفر و نفاق کو چھوڑو اور اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ، حکم الہی کے مقابل میں کسی کی بات مت سنو، اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جان اور مال خرچ کیا کرو، اور ہر طرح کی شدت اور تکلیف پر تحمل کرو، اب یہاں سے اسی حالت و فریاد و راری اور اللہ کی راہ میں جان و مال خرچ کرنے کے متعلق کچھ جزئیات کی تفصیل بیان ہوتی ہے جو کہ مال اور جان اور دیگر معاملات میں نکاح و طلاق وغیرہ کے متعلق ہیں، اور اوپر سے جو سلسلہ احکام ابواب البر کا جاری ہے اس میں داخل ہیں اور ان جزئیات کا بیان بھی ایک خاص نوعیت رکھتا ہے کہ اکثر ان میں سے وہ ہیں جن کے متعلق صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، ان کے استفتاء اور سوالات کا جواب براہ راست عرش رحمت سے براہ راست رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دیا گیا، اس کو اگر یوں سمجھا جائے کہ حق تعالیٰ نے خود فتویٰ دیا تو یہ بھی صحیح ہے اور قرآن کریم کی آیت قُلِ اللَّهُ يُفَقِّهُ فِيمَا يَشَاءُ میں صراحت حق تعالیٰ نے فتویٰ دینے کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے اس لئے اس نسبت میں کوئی استبعاد بھی نہیں۔

اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ قاضی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں جو آپ کو بذریعہ وحی تلقین کئے گئے ہیں، بہر حال اس رکن میں جو احکام شرعیہ صحابہ کرامؓ کے چند سوالات کے جواب میں بیان ہوئے ہیں وہ ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں، پورے قرآن میں اس طرح سوال و جواب کے انداز سے خاص احکام تقریباً سترہ جگہ میں آئے ہیں، جن میں سے سات تو اسی جگہ سورۃ بقرہ میں

میں ایک سورہ مائدہ میں ایک سورہ انفال میں یہ نو سوالات تو صحابہ کرام کی طرف سے ہیں، سورہ اعراف میں دو اور سورہ بنی اسرائیل، سورہ کہف، سورہ لقہ، سورہ نازعات میں ایک ایک یہ کل چھ سوال کفار کی طرف سے ہیں، جن کا جواب قرآن میں جواب کے عنوان سے دیا گیا ہے۔

مفسر العشر آن حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی جماعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے بہتر نہیں دیکھی کہ دین کے ساتھ انتہائی شغف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی محبت و تعلق کے باوجود انھوں نے سوالات بہت کم کئے کل تیرہ مسائل میں سوال کیا ہے، جن کا جواب قرآن میں دیا گیا ہے، کیونکہ یہ حضرات سمجھتے تھے کہ سوال ذکر کرتے تھے (قرطبی) متذکرہ بالا آیات میں سے پہلی آیت میں صحابہ کرام کا استفادہ یعنی سوال ان الفاظ سے نقل فرمایا گیا ہے يَسْأَلُونَكَ مَاذَا أُعْطُوا، یعنی لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، یہی سوال اس رکوع میں تین آیتوں کے بعد پھر اپنی الفاظ کے ساتھ دہرایا گیا، وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا أُعْطُوا، لیکن اس ایک ہی سوال کا جواب آیت متذکرہ میں کچھ اور دیا گیا ہے، اور تین آیتوں کے بعد آنے والے سوال کا جواب اور ہے۔

اس لئے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ایک ہی سوال کے دو مختلف جواب کس حکمت پر دیئے ہیں یہ حکمت اُن حالات و واقعات میں غور کرنے سے واضح ہو جاتی ہے جن میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں مثلاً آیت متذکرہ کا شان نزول یہ ہے کہ عربین جو حج نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا کہ مَا شَيْئٌ مِنْ أَمْوَالِنَا آتَيْنَا لَكَ فَكُفَّهَا (اگرچہ ابن المنذر منطری) یعنی ہم اپنے اموال تمہارے کیا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں؟ اور ابن جریر کی روایت کے موافق یہ سوال تنہا عمرو ابن جوہر کا نہیں تھا، بلکہ عام مسلمانوں کا سوال تھا، اس سوال کے دو جزو ہیں، ایک یہ کہ مال میں سے کیا اور کتنا خرچ کریں، دوسرے یہ کہ اس کا مصرف کیا ہو کہ کن لوگوں کو دیں۔

اور دوسری آیت جو دو آیتوں کے بعد اس سوال پر مشتمل ہے اس کا شان نزول ہر روایت ابن ابی حاتمؒ یہ ہے کہ جب قرآن میں مسلمانوں کو اس کا حکم دیا گیا کہ اپنے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کریں، تو چند صحابہ کرامؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ اتفاقاً نبیل اللہ کا جو حکم ہمیں ملا ہے ہم اس کی وضاحت چاہتے ہیں کہ کیا مال اور کوئی چیز اللہ کی راہ میں خرچ کیا کریں، اس سوال میں صرف ایک ہی جزء ہے، یعنی کیا خرچ کریں، اس طرح ان دونوں سوالوں کی نوعیت کچھ مختلف ہو گئی کہ پہلے سوال میں کیا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں، کا سوال تھا، اور دوسرے میں صرف کیا خرچ کریں کا سوال ہے، اور پہلے سوال کے جواب میں جو کچھ قرآن میں ارشاد فرمایا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال کے دوسرے جزء کو یعنی کہاں

خرچ کریں زیادہ اہمیت دے کر اس کا جواب تو صریح طور پر دیا گیا، اور پہلے جز یعنی کیا خرچ کریا
کا جواب ضمنی طور پر دیدینا کافی سمجھا گیا، اب الفاظِ شترآئی میں دونوں اجزاء پر نظر فرمائیں،
پہلے جز یعنی کہاں خرچ کریں کے متسلل ارشاد ہو کر مَا أَفْعَلْتُمْ قَوْمَ تَحِيٍّ قَالُوا لَإِنَّا مِنكُمْ وَهَؤُلَاءِ
وَالْبَاقِيْنَ وَالْمُتَكِبِّينَ فِي السَّبِيلِ۔ یعنی جو کچھ بھی تم کو اللہ کے لئے خرچ کرنا ہو اس کے لئے تم
ماں باپ اور رشتہ دار اور بے باپ کے بچے اور مساکین اور مسافر ہیں۔

اور دوسرے جز یعنی کیا خرچ کریں کا جواب ضمنی طور پر ان الفاظ سے دیا گیا وَمَا تَنْفَعُكُمْ اَنْ تَخْلُوَ مِنْ خَلِيْقٍ اَنْ اَنْتُمْ عَلَيْهِمْ سَلِيْمٌ یعنی تم جو کچھ بھلائی کرو گے اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہو، اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر کوئی تحدید اور پابندی نہیں کہ مال کی اتنی ہی مقدار صرف کرو، بلکہ کچھ بھی اپنی استطاعت کے موافق خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ کے پاس اس کا اجر و ثواب پاؤ گے۔

انفرض پہلی آیت میں شاید سوال کرنے والوں کے پیش نظر زیادہ اہمیت اسی سوال کی ہو کہ ہم جو مال خرچ کریں، اس کا مصروف کیا ہو کہاں خرچ کریں، اسی لئے اس کے جواب میں اہمیت کے ساتھ مصارف بیان فرمائے گئے، اور کیا خرچ کریں اس سوال کا جواب ضمنی طور پر دینا کافی سمجھا گیا، اور بعد دلی آیت میں سوال صرف اتنا ہی تھا کہ ہم کیا چیز اور کیا مال خرچ کریں، اس لئے اس کا جواب ارشاد ہوا ائیل انفقوا، یعنی آپ فرمادیں کہ جو کچھ بچے اپنی ضروریات سے وہ خرچ کیا کریں، ان دونوں آیتوں سے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں مال خرچ کرنے کے متعلق چند ہدایات مسائل معلوم ہوئے۔

مسئلہ: اول یہ کہ دونوں آیتیں زکوٰۃ فرض کے متعلق نہیں، کیونکہ زکوٰۃ فرض کے لئے تو نصاب مال بھی مسترر ہوا اور اس میں جتنی مقدار خرچ کرنا فرض ہے، وہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پر رسی طرح متعین و مقرر فرمادی گئی ہے، ان دونوں آیتوں میں نہ بھی نصاب مال کی قید ہے، نہ خرچ کرنے کی مقدار بتلائی گئی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں آیتیں صدقات نافلہ کے متعلق ہیں، اس سے یہ شبہ بھی رفع ہو گیا کہ پہلی آیت میں خرچ کا مقرر الدین کو بھی مسترر دیا گیا ہے، حالانکہ مال باپ کو زکوٰۃ دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق جائز نہیں، کیونکہ ان آیتوں کا تعلق فریضہ زکوٰۃ سے ہے ہی نہیں۔

مسئلہ: دوسری ہدایت اس آیت سے یہ حاصل ہوتی کہ ماں باپ اور دوسرے اہل
استرار کو جو کچھ بطور ہدیہ دیا یا کھلایا جاتا ہے اگر اس میں بھی اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانے کی نیت ہو تو
وہ بھی موجب اجر و ثواب اور اتفاقاً فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔

مسئلہ: ہمیری ہدایت یہ حاصل ہوئی کہ نفل صدقات میں اس کی رعایت ضروری ہے، کہ جو مال اپنی ضروریات سے زائد ہو وہی خرچ کیا جائے، اپنے اہل و عیال کو تنگ میں ڈال کر اور ان کے حقوق کو تلف کر کے خرچ کرنا ثواب نہیں، اسی طرح جس کے ذمہ کسی کا قرض ہے قرض خواہ کو ادا نہ کرے اور نفل صدقات و خیرات میں اڑائے یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نہیں، پھر ضروریات سے زائد مال کے خرچ کرنے کا جو ارشاد اس آیت میں ہے اس کو حضرت ابوذر غفاریؓ اور بعض دیگر حضرات نے بحکم و جہول مسترار دیا، کہ اپنی ضروریات سے زائد مال زکوٰۃ اور تمام حقوق ادا کر لے کے بعد بھی اپنی ملک میں جمع رکھنا جائز نہیں ضروریات سے زائد جو کچھ ہے سب کا صدقہ کر دینا واجب ہے، مگر جمہور صحابہؓ و تابعینؓ اور ائمہ دینؓ اس پر ہیں کہ ارشاد و تشریحی کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہو وہ ضروریات سے زائد ہونا چاہئے، یہ نہیں کہ ضرورت سے زائد جو کچھ ہو اس کو صدقہ کر دینا ضروری یا واجب ہے، صحابہ کرامؓ کے تعامل سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهُ لَكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا

فرض ہوئی تم پر لڑائی اور وہ بری لگتی ہے تم کو اور شاید کہ بُری لگے تم کو

شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ

ایک چیز اور وہ بہتر ہو تمھارے حق میں اور شاید تم کو چل لگے ایک چیز اور وہ بُری ہو تمھارے حق میں

وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۲۱۸﴾ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ

اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے، تم سے پوچھتے ہیں مہینہ حرام کو

الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ

اس میں لڑنا کیسا، کبہ سے اس میں لڑائی بڑا گناہ ہے، اور روکنا اللہ کی راہ سے

اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ

اور اس کو نہ ماننا اور مسجد الحرام سے روکنا اور نکال دینا اس کے لوگوں کو وہاں سے

أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ

اس سے بھی زیادہ گناہ ہے اللہ کے نزدیک اور لوگوں کو دین سے بھلا ناقل سے بھی بڑھ کر ہے اور کفار تو ہمیشہ تم سے

يَقَاتِلُوكُمْ مَعْشَىٰ يَوْمِكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا وَمَنْ

لڑتے ہیں تم سے یہاں تک کہ تم کو پھر دین تمھارے دین سے اگر قابل پاویں اور جو کوئی

یٰۤاَیُّهَا

يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ قِمَتٌ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ

پھر تم میں سے اپنے دین سے پھر مر جادے حالت کفر ہی میں تو ایسوں کے منافع ہوتے

أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ

عمل دنیا اور آخرت میں، اور وہ لوگ رہنے والے ہیں دوزخ میں وہ اس میں

فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۱۹﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا

ہمیشہ رہیں گے، بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور لڑے

فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ وَاللَّهُ غَفُورٌ

اللہ کی راہ میں وہ امید دار ہیں اللہ کی رحمت کے اور اللہ بخشنے والا

رَحِيمٌ ﴿۲۲۰﴾

مہربان ہے۔

خلاصہ تفسیر

تیرہواں حکم فرضیت جہاد جہاد کرنا تم پر فرض کیا گیا ہے اور وہ تم کو ملے گا اگر ان (معلوم ہوتا)

ہو، اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی بات کو گراں سمجھو اور (واقع میں) وہ

تمھارے حق میں خیر (اور مصلحت) ہو اور یہ (ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور (واقع میں) وہ

تمھارے حق میں (باعث) خرابی (کا) ہو اور (ہر شے کی حقیقت حال کو) اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، اور تم

(پورا پورا) نہیں جانتے (مجھے) بڑے کا فیصلہ اپنی خواہش کی بنیاد پر نہ کر دو کچھ اللہ کا حکم ہو جائے، اسی

کو اجمالا مصلحت سمجھ کر اس پر کاربند رہا کرو)

چودھواں حکم تحقیق قتال در شہر حرام (حضرت علیؓ علیہ السلام کے چند صحابہؓ کا ایک سفر میں

اتفاق سے کفار کے ساتھ مقابلہ ہو گیا، ایک کافر

ان کے ہاتھ سے مارا گیا، اور جس روز یہ قصہ ہوا جب کی پہلی تاریخ تھی، مگر صحابہؓ اس کو جادوی الاخریٰ

کی تیسری سمجھتے تھے، اور در جب اشہر حرم میں سے ہے کفار نے اس واقعہ پر طعن کیا کہ مسلمانوں نے

شہر حرام کی حرمت کا بھی خیال نہیں کیا، مسلمانوں کو اس کی فکر ہوئی اور حضرت علیؓ علیہ السلام سے

پوچھا اور بعض روایات میں ہے کہ خود بعض کفار تشریف لے گئے بھی حاضر ہو کر اعتراضا سوال کیا، اس کا جواب ارشاد ہوتا ہے)۔

لوگ آپ سے شہر حرام میں قتال کرنے کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ اس میں خاص طور پر (یعنی عدل) قتال کرنا جرم عظیم ہے مگر مسلمانوں سے یہ نفل بالقصد صادر نہیں ہوا، بلکہ تاریخ کی تحقیق نہ ہونے کے بسبب نفل سے ایسا ہو گیا یہ تو تحقیقی جواب ہے، اور الزامی جواب یہ ہے کہ کفار و مشرکین کا تو کسی طرح مذہبی نہیں مسلمانوں پر اعتراض کرنے کا، کیونکہ اگرچہ شہر حرام میں لڑنا جرم عظیم ہے، لیکن ان کفار کی جو حرکتیں ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ (دین) سے (لوگوں کو) روک ٹوک کر زارین مسلمان ہونے پر تکلیفیں پہنچانا کہ ڈر کے مارے لوگ مسلمان نہ ہوں، اور اللہ تعالیٰ کے حق کو گناہ اور مسجد حرام (یعنی کعبہ) کے ساتھ کفر کرنا کہ وہاں بہت سے بیت رکھ چھوڑے تھے، اور بچائے خدا کی عبادت کے ان کی عبادت اور طواف کرتے تھے، اور جو لوگ مسجد حرام کے اہل تھے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دس کرمو منین) ان کو (تنگ اور پریشان کر کے) اس (مسجد حرام) سے خارج (ہونے پر مجبور) کر دینا جس سے فوجت ہجرت یعنی ترک وطن کی پہنچی، سو یہ حرکتیں شہر حرام میں قتال کرنے سے بھی زیادہ جرم عظیم ہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک (کیونکہ یہ حرکتیں دین حق کے اندر فتنہ پروازی کرنا ہے) اور ایسی فتنہ پروازی کرنا اس (قتل خاص) سے (جو مسلمانوں سے صادر ہوا) بدرجہا (قباحت میں) بڑھ کر ہے (کیونکہ اس قتل سے دین حق کو تو کوئی مضرت نہیں پہنچی بہت سے بہت اگر کوئی جان کر کرے، خود ہی گنہگار ہوگا اور ان حرکتوں سے تو دین حق کو ضرر پہنچا ہے کہ اس کی ترقی رکتی ہے) اور یہ کفار تمھارے ساتھ ہمیشہ جنگ و جدال کا سلسلہ جاری ہی رکھیں گے، اس غرض سے کہ اگر (عدا نہ کرے) قابو پا دیں تو تم کو تمھارے دین (اسلام) سے پھیر دیں (ان کے اس نفل سے دین کی مراحت ظاہر ہے)۔

انجمل ارتداد اور جو شخص تم میں سے اپنے دین (اسلام) سے پھر جائے، پھر کافر ہی ہونے کی حالت میں مرجائے تو ایسے لوگوں کے (نیک) اعمال دنیا اور آخرت میں سب غارت ہو جاتے ہیں (اور) یہ لوگ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

شہر حرام میں قتال کرنے کے بارے میں مسلمانوں کو جواب مذکور سن کر گناہ نہ ہونے کا تو اطمینان ہو گیا تھا، مگر اس خیال سے دل شکستہ تھے کہ ثواب تو ہوا ہی نہ ہوگا، آگے اس میں تسلی کی گئی۔

وعدۃ ثوابک اخلاص نیت حقیقتہً جو لوگ ایمان لائے ہوں اور جن لوگوں نے ماہ خدا میں جو ہو کر تھے ہیں، اور تم لوگوں میں یہ صفات علی سبیل منع الخلو موجود ہیں، چنانچہ ایمان اور ہجرت تو ظاہر ہے، رہا اس جہاد خاص میں شبہ ہو سکتا ہے، سو چونکہ تمھاری نیت تو جہاد ہی کی تھی، لہذا ہمارے نزدیک وہ بھی جہاد ہی میں شمار ہے، پھر ان صفات کے ہوتے ہوئے تم کیوں نا امید

ہوتے ہو، اور اللہ تعالیٰ (اس نفل کو) معاف کر دیں گے اور ایمان و جہاد و ہجرت کی وجہ سے تم پر رحمت کریں گے۔

معارف و مسائل

بعض احکام جہاد مسئلہ: مذکورہ صدر آیات میں سے پہلی آیت میں جہاد کے فرض ہونے کا حکم ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے کَتَبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالَ، یعنی تم پر جہاد فرض کیا گیا، ان الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاد ہر ملک ہر حالت میں فرض ہے، بعض آیات قرآن اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فریضہ منسبینین کے طور پر ہر مسلمان پر عائد نہیں، بلکہ فرض کفایہ ہے کہ مسلمان کی ایک جماعت اس فرض کو ادا کرے تو باقی مسلمان سبکدوش بھی جاتے ہیں گے، ہاں کسی زمانہ یا کسی ملک میں کوئی جماعت بھی فریضہ جہاد ادا کرنے والی نہ ہے تو سب مسلمان ترک فرض کے گنہگار ہو جائیں گے، حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اَلْجِهَادُ مِمَّا جِئَ اِلَیْهِ یَوْمَیْنِ اَقْبَیَا مَتَّحَ کَا یہ مطلب ہو کہ قیامت تک ایسی جماعت کا موجود نہ ضروری ہے جو فریضہ جہاد ادا کرتی ہے، قرآن مجید کی دوسری آیت میں ارشاد ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَعَلَّکُمْ تُحْشَرُوْنَ
اِنْ کُنْتُمْ لَا تَقُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یُؤْتِی

اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَعَلَّکُمْ تُحْشَرُوْنَ
اِنْ کُنْتُمْ لَا تَقُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یُؤْتِی

اس میں لیے لوگوں سے جو کسی عذر کے سبب یا کسی دوسری دینی خدمت میں مشغول ہو کر جہاد میں شریک نہ ہوں ان سے بھی بھلائی کا وعدہ مذکور ہے، ظاہر ہے کہ اگر جہاد ہر فرد مسلم پر فرض میں ہوتا تو اس کے چھوڑنے والوں سے وعدہ بخشی یعنی بھلائی کا وعدہ ہونے کی صورت تھی، اسی طرح ایک دوسری آیت میں ہے:

اَلَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَکَ الْکِتٰبَ یَاۤاَبُوْا بَکْرَہُ یَاۤاَبُوْا سَافَرِہُ
اَلَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَکَ الْکِتٰبَ یَاۤاَبُوْا بَکْرَہُ یَاۤاَبُوْا سَافَرِہُ

اَلَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَکَ الْکِتٰبَ یَاۤاَبُوْا بَکْرَہُ یَاۤاَبُوْا سَافَرِہُ
اَلَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَکَ الْکِتٰبَ یَاۤاَبُوْا بَکْرَہُ یَاۤاَبُوْا سَافَرِہُ

اس میں خود قرآن کریم نے یہ تقسیم علی پیش فرمائی کہ کچھ مسلمان جہاد کا کام کریں اور کچھ تعلیم دین میں مشغول رہیں، اور یہ جی ہو سکتا ہے جبکہ جہاد فرض عین نہ ہو بلکہ فرض کفایہ ہو۔ نیز صحیح بخاری و مسلم کی حدیث ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شرکت جہاد کی اجازت چاہی تو آپ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تمھارے ماں باپ زندہ ہیں

اس نے عرض کیا کہ ہاں زندہ ہیں آپ نے فرمایا کہ پھر جادو، ماں باپ کی خدمت کر کے جہاد کا ثواب حاصل کرو۔ اس سے بھی یہ معلوم ہوا کہ جہاد فرض کفایہ ہے، جب مسلمانوں کی ایک جماعت فریضہ جہاد کو قائم کئے ہوئے ہو تو باقی مسلمان دوسری خدمتوں اور کاموں میں لگ سکتے ہیں، ہاں اگر کسی وقت امام المسلمین ضرورت سمجھ کر بغیر عام کا حکم دے اور سب مسلمانوں کو شرکت جہاد کی دعوت دے تو پھر جہاد سب پر فرض عین ہو جاتا ہے، قرآن حکم یہ ہے سورۃ توبہ میں ارشاد فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّا لَكُمُ إِقْرَءٌ
لَكُمْ مِنَ اللَّهِ فِي سَبِيلِهِ
إِنَّا قَالُوكُمْ. (۳۸: ۱۹)

”اے مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو تم نہیں بن جاتے ہو؟“

اس آیت میں اسی بغیر عام کا حکم مذکور ہے، اسی طرح اگر خدا نخواستہ کسی وقت کفار کسی اسلامی ملک پر حملہ آور ہوں اور ممانعت کرنے والی جماعت ان کی ممانعت پوری طرح قادر اور کافی نہ ہو تو اس وقت بھی یہ فریضہ اس جماعت سے متعدی ہو کر پاس والے سب مسلمانوں پر عائد ہو جاتا ہے اور اگر وہ بھی عاجز ہوں تو ان کے پاس والے مسلمانوں پر یہاں تک کہ پوری دنیا کے ہر ہر فرد مسلم پر ایسے وقت جہاد فرض عین ہو جاتا ہے، قرآن مجید کی مذکورہ بالا تمام آیات کے مطالعہ سے مجبور فقہاء و محدثین نے یہ حکم قرار دیا ہے کہ عام حالات میں جہاد فرض کفایہ ہے۔

مسئلہ: اسی لئے جب تک جہاد فرض کفایہ ہوا و لا دیکو بغیر ماں باپ کی اجازت کے جہاد میں جانا جائز نہیں۔

مسئلہ: جن شخص کے ذمہ کسی کا قرض ہو اس کے لئے جب تک قرض ادا نہ کر دے اس فرض کفایہ میں حصہ لینا درست نہیں، ہاں اگر کسی وقت بغیر عام کے سبب یا کفار کے نزعہ بے پشت جہاد سب پر فرض عین ہو جائے تو اس وقت نہ والدین کی اجازت شرط ہے نہ شوہر کی اور نہ شتر خواہ کی، اس آیت کے آخر میں جہاد کی ترغیب کے لئے ارشاد فرمایا ہے کہ جہاد اگرچہ طبعی طور پر تمہیں بھاری معلوم ہو، لیکن خوب یاد رکھو کہ انسانی بصیرت و دانشمندی اور تدبیر و محنت عواقب و نتائج کے بارے میں بکثرت فیمل ہوتی ہے، کسی مفید کو مضریا مضی کو مفید سمجھ لینا بڑے سے بڑے ہوشیاری و عقلمندی سے بھی مستبعد نہیں، ہر انسان اگر اپنی عمر میں پیش آنے والے نتائج پر نظر ڈالے تو اپنی ہی زندگی میں اس کو بہت سے واقعات ایسے نظر آئیں گے کہ وہ کسی چیز کو نہایت مفید سمجھ کر حاصل کر رہے ہوتے، اور انجام کار یہ معلوم ہوا کہ وہ انتہائی مضرتیں یا کسی چیز کو نہایت مضرت سمجھ کر اس سے چھیننا کر رہے ہوتے، اور انجام کار یہ معلوم ہوا کہ وہ نہایت مفید تھی، انسانی عقل و تدبیر کی رسوائی اس معاملہ میں بکثرت مشاہدہ میں آتی رہتی ہے۔

خوبش را در دم در سوالی خویش

اس لئے فرمایا کہ جہاد قتال میں اگرچہ بظاہر مال اور جان کا نقصان نظر آتا ہے، لیکن جب حقائق سامنے آئیں گے تو کھلے گا کہ یہ نقصان ہرگز نقصان نہ تھا بلکہ سرسرفیع اور دائمی راحت کسا مان تھا۔ آیات مذکورہ میں سے دوسری آیت اس پر شاہد ہے کہ اشہر حرم اشہر حرم میں قتال کا حکم، یعنی چار جیسے رجب، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم میں قتال حرام ہوا اسی طرح قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں پوری تصریح کے ساتھ اشہر حرم میں قتال کی ممانعت آتی ہے، مثلاً وَمِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرْمٌ لِّذَٰلِكَ الذِّیْنِ الْفَاقِقِیْمُ اور حجۃ الوداع کے معروف و مشہور خطبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مِنْهَا اربعۃ حریم ثلاث متوالیات و رجب مضمر۔

ان آیات و روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ چار مہینوں میں قتال حرام ہے، اور یہ حرمت ہمیشہ کے لئے ہے۔

اور امام تفسیر عطاء بن ابی رباح قسم کھا کر فرماتے تھے کہ یہ حکم ہمیشہ کے لئے باقی ہے، اور بھی متعدد حضرات تابعین اس حکم کو ثابت غیر منسوخ قرار دیتے ہیں مگر مجبور فقہاء کے نزدیک اور بقول جصاص عام فقہاء اصحاب کے مسلک پر یہ حکم منسوخ ہے، اب کسی مہینہ میں قتال ممنوع نہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اس کا ناسخ کوئی آیت ہے، اس میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں یعنی نے فرمایا کہ آیت کریمہ قَاتِلُوا الْمُشْرِکِیْنَ کَافًۢہ (۲۱۶: ۹) اس کی ناسخ ہے، اور اکثر حضرات نے آیت قَاتِلُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَتَّیْ تَکُوۡنَ اُخْرٰی تَمُوۡهُمُ (۵: ۹) کو ناسخ قرار دیا ہے، اور لفظ حیث کو اس جنگ زمانے کے معنی میں لیا ہے، کہ مشرکین کو جس مہینہ اور جس زمانے میں پاؤ قتل کرو اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس حکم کا ناسخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل ہے کہ خود آپ نے طائف کا محاصرہ اشہر حرم میں فرمایا، اور حضرت عامر اشعری کو اشہر حرم ہی میں اوطاس کے جہاد کے لئے بھیجا، اسی بناء پر عامہ فقہاء اس حکم کو منسوخ قرار دیتے ہیں، جصاص نے فرمایا وہ قول فقہاء الامصار۔ روح المعانی نے اسی آیت کے تحت میں اور بیضاوی نے سورۃ برأت کے پہلے رکوع کی تفسیر میں اشہر حرم میں حرمت قتال کے منسوخ ہونے پر اجماع اقت نقل کیا ہے، بیان القرآن، مگر تفسیر مظہری میں مذکورہ تمام دلائل کا جواب یہ دیا ہے کہ اشہر حرم کی حرمت کی تصریح خود اس آیت میں موجود ہے، جس کو آیت السیف کہا جاتا ہے، یعنی اِنَّ عِدَّةَ الشُّحُوۡرِ حُرْمٌ لِّذَٰلِكَ الذِّیْنِ اَشْهَرُ شُحُوۡرًا فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ یَوْمَ تَخْلَقُ السُّلُوۡسِیَّۃُ قَالَا مَضٰی وَفُتٰہَا اَرْبَعَةٌ حُرْمٌ (۲۱۶: ۹) یہ آیت قتال میں سب سے آخر میں نازل ہوئی ہے، اور خطبہ حجۃ الوداع جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف اتنی روز پہلے ہوا ہے اس میں بھی اشہر حرم کی حرمت کی تصریح موجود ہے، اس لئے آیات

متذکرہ کو اس کا نسخہ نہیں کہا جاسکتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ طاقت و ذوالقعدہ میں نہیں، شوال میں ہوتا ہے اس لئے اس کو بھی نسخہ نہیں کہہ سکتے، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اشہر حرم میں قتال کی حرمت مطلقہ جو مذکورہ آیات سے معلوم ہوتی ہے، اس میں سے وہ صورت مستثنیٰ کر دی گئی ہے کہ خود کفار ان ہینوں میں مسلمانوں سے قتال کرنے لگیں تو جوابی حملہ اور دفاع مسلمانوں کے لئے بھی جائز ہے، اتنے حصہ کو منسوخ کہا جاسکتا ہے جس کی تصریح اس آیت میں ہے، **الْأَشْهُرُ الْحُرَامُ** بالشہر الحرام الآیہ - (۱۹۴:۲)

توحید صریح ہو کہ ابتداء قتال تو ان ہینوں میں ہمیشہ کے لئے حرام ہے، مگر جب کفار ان ہینوں میں حملہ آور ہوں تو مدافعت قتال کی مسلمانوں کو بھی اجازت ہے، جیسا کہ امام جصاص نے بروایت حضرت جابر بن عبد اللہ نقل کیا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شہر حرام میں اس وقت تک قتال نہ کرتے تھے جب تک قتال کی ابتداء کفار کی طرف سے نہ ہو جاتے۔

انجام ارتداد آیت مذکورہ **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ** کے آخر میں مسلمان ہونے کے بعد کفر و ارتداد اختیار کرنے کا یہ حکم ذکر فرمایا ہے کہ **يَحْتِلُّ أَحَدُهُمُ فِي الدِّينِ** وَالْآخِرَةِ یعنی ان لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت میں سب غارت ہو جائیں گے۔

مسئلہ دنیا میں اعمال کا ضائع ہونا یہ ہو کہ اس کی بی بی نکاح سے بچل جاتی ہے، اگر اس کا کوئی مورث مسلمان مرے اس شخص کو میراث کا حصہ نہیں ملتا، حالیت اسلام میں نماز، روزہ جو کچھ کیا تھا سب کا عدم ہو جاتا ہے، مرنے کے بعد جنازے کی نماز نہیں پڑھی جاتی مسلمانوں کے مقابر میں دفن نہیں ہوتا۔

اور آخرت میں ضائع ہونا یہ ہے کہ عبادات میں ثواب نہیں ملتا، ابدال آباد کے لئے دوزخ میں داخل ہوتا ہے۔

مسئلہ اگر یہ شخص پھر مسلمان ہو جائے تو آخرت میں دوزخ سے بچے اور دنیا میں آئندہ کے لئے احکام اسلام کا جاری ہونا تو یقینی ہے، لیکن دنیا میں اگر حج کر چکا تو بشرط وسعت دوبارہ اس کا فرض ہونا نہ ہونا اور آخرت میں پچھلے نماز روزہ کے ثواب کا عود کرنا اس میں اختلاف ہے، امام ابو حنیفہ دوبارہ حج کو فرض کہتے ہیں، اور گزشتہ نماز روزہ پر ثواب ملنے کے قائل نہیں اور امام شافعی دونوں امر میں اختلاف کرتے ہیں۔

مسئلہ لیکن جو کافر اصلی ہو اور اس حالت میں کوئی نیک کام کر لے اس کا ثواب ملتا رہتا ہے، اگر کبھی اسلام لے آیا سب پر ثواب ملتا ہے، اور اگر کفر پر مگر تو سب بیکار جاتا ہے، حدیث میں اسلقت علی ما اسلفت من خیر اسی معنی میں وارد ہے۔

مسئلہ، فحش مرتد کی حالت کا فرائض سے بدتر ہے، اسی واسطے کافر اصلی سے جہاد قبول ہو سکتا ہے، اور مرتد اگر اسلام دلا دے اگر مرد ہے قتل کر دیا جاتا ہے، اگر عورت ہو تو دوام عیس کی سزا دی جاتی ہے، کیونکہ اس سے اسلام کی امانت ہوتی ہے، سرکاری امانت اسی سزا کے لائق ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا آثَمُ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ

تجھ سے پوچھتے ہیں علم مشرب کا اور مچھڑے کا کہ لے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور فائدہ

لِلنَّاسِ وَآثَمُهُمَا أَكْبَرُ مِمَّنْ نَّفَعُهُمَا

بہن لوگوں کو اور ان کا گناہ بہت بڑا ہے ان کے فائدے سے۔

خلاصہ تفسیر

پندرہواں حکم لوگ آپ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں، آپ فرمادیں کہ ان دونوں چیزوں کے ہستیاں ہیں گناہ کی بڑی بڑی بائیں بھی رسید ہو جاتی ہیں اور لوگوں کو روک بیٹھے، فائدے بھی ہیں اور (گناہ کی بائیں ان فائدوں سے زیادہ بڑی ہوتی ہیں اس لئے دونوں قابل ترک ہیں)

معارف و مسائل

صحابہ کرامؓ کے سوالات اور ان کے جوابات کا جو سلسلہ اس سورت میں بیان ہو رہا ہے، اس میں یہ آیت بھی ہے، اس میں شراب اور مچھڑے کے متعلق صحابہ کرامؓ کا سوال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ہوا یہ دونوں مسئلے نہایت اہم ہیں، اس لئے کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان کی پوری حقیقت اور احکام سنئے۔

حُرمت شراب اور اس کے متعلقہ اعمال

ابتداء اسلام میں عام رسوم جاہلیت کی طرح شراب خوری بھی عام تھی، جب رسول کریم صلی اللہ

متذکرہ کو اس کا نسخہ نہیں کہا جاسکتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ طاقت و ذوالقعدہ میں نہیں، شوال میں ہوتا ہے اس لئے اس کو بھی نسخہ نہیں کہہ سکتے، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اشہر حرم میں قتال کی حرمت مطلقہ جو مذکورہ آیات سے معلوم ہوتی ہے، اس میں سے وہ صورت مستثنیٰ کر دی گئی ہے کہ خود کفار ان ہینوں میں مسلمانوں سے قتال کرنے لگیں تو جوابی حملہ اور دفاع مسلمانوں کے لئے بھی جائز ہے، اتنے حصہ کو منسوخ کہا جاسکتا ہے جس کی تصریح اس آیت میں ہے، **الْأَشْهُرُ الْحُرَامُ بِالْأَشْهُرِ الْحُرَامِ** الآیہ - (۱۹۴:۲)

توحید صریح ہو کہ ابتداء قتال تو ان ہینوں میں ہمیشہ کے لئے حرام ہے، مگر جب کفار ان ہینوں میں حملہ آور ہوں تو مدافعت قتال کی مسلمانوں کو بھی اجازت ہے، جیسا کہ امام جصاص نے بروایت حضرت جابر بن عبد اللہ نقل کیا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شہر حرام میں اس وقت تک قتال نہ کرتے تھے جب تک قتال کی ابتداء کفار کی طرف سے نہ ہو جاتے۔

انجام ارتداد آیت مذکورہ **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ** کے آخر میں مسلمان ہونے کے بعد کفر و ارتداد اختیار کرنے کا یہ حکم ذکر فرمایا ہے کہ **يَحْتِلُّ أَحَدُهُمُ فِي الْإِيمَانِ** وَالْآخِرَةِ یعنی ان لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت میں سب غارت ہو جائیں گے۔

مسئلہ دنیا میں اعمال کا ضائع ہونا یہ ہو کہ اس کی بنی بنی نکاح سے بھل جاتی ہے، اگر اس کا کوئی مورث مسلمان مرے اس شخص کو میراث کا حصہ نہیں ملتا، حالیت اسلام میں نماز، روزہ جو کچھ کیا تھا سب کا عدم ہو جاتا ہے، مرنے کے بعد جنازے کی نماز نہیں پڑھی جاتی مسلمانوں کے مقابر میں دفن نہیں ہوتا۔

اور آخرت میں ضائع ہونا یہ ہے کہ عبادات میں ثواب نہیں ملتا، ابدال آباد کے لئے روزخ میں داخل ہوتا ہے۔

مسئلہ اگر یہ شخص پھر مسلمان ہو جائے تو آخرت میں روزخ سے بچے اور دنیا میں آئندہ کے لئے احکام اسلام کا جاری ہونا تو یقینی ہے، لیکن دنیا میں اگر کچھ کر چکا تو بشرط وسعت دوبارہ اس کا فرض ہونا نہ ہونا اور آخرت میں پچھلے نماز روزہ کے ثواب کا عود کرنا اس میں اختلاف ہے، امام ابو حنیفہ دوبارہ حج کو فرض کہتے ہیں، اور گزشتہ نماز روزہ پر ثواب ملنے کے قائل نہیں اور امام شافعی دونوں امر میں اختلاف کرتے ہیں۔

مسئلہ لیکن جو کافر اصلی ہو اور اس حالت میں کوئی نیک کام کر لے اس کا ثواب ملتا رہتا ہے، اگر کبھی اسلام لے آیا سب پر ثواب ملتا ہے، اور اگر کفر پر مگر تو سب بیکار جاتا ہے، حدیث میں اسلقت علی ما اسلفت من خیر اسی معنی میں وارد ہے۔

مسئلہ، فحش مرتد کی حالت کا فرائض سے بدتر ہے، اسی واسطے کافر اصلی سے جہاد قبول ہو سکتا ہے، اور مرتد اگر اسلام دلا دے اگر مرد ہے قتل کر دیا جاتا ہے، اگر عورت ہو تو دوام حبس کی سزا دی جاتی ہے، کیونکہ اس سے اسلام کی امانت ہوتی ہے، سرکاری امانت اسی سزا کے لائق ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا آثَمُ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ

تجھ سے پوچھتے ہیں علم مشرب کا اور مچھڑے کا کہہ دے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور فائدہ

لِلنَّاسِ وَآثَمُھُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِھُمَا

بہن لوگوں کو اور ان کا گناہ بہت بڑا ہے ان کے فائدے سے۔

خلاصہ تفسیر

پندرہواں حکم لوگ آپ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں، آپ فرمادیں کہ ان دونوں چیزوں کے ہستیاں ہیں گناہ کی بڑی بڑی بائیں بھی رسید ہو جاتی ہیں اور لوگوں کو روک بیٹھے، فائدے بھی ہیں اور (روزہ) گناہ کی بائیں ان فائدوں سے زیادہ بڑی ہوتی ہیں اس لئے دونوں قابل ترک ہیں۔

معارف و مسائل

صحابہ کرامؓ کے سوالات اور ان کے جوابات کا جو سلسلہ اس سورت میں بیان ہو رہا ہے، اس میں یہ آیت بھی ہے، اس میں شراب اور مچھڑے کے متعلق صحابہ کرامؓ کا سوال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ہوا یہ دونوں مسئلے نہایت اہم ہیں، اس لئے کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان کی پوری حقیقت اور احکام سنئے۔

حُرمت شراب اور اس کے متعلقہ اعمال

ابتداء اسلام میں عام رسوم جاہلیت کی طرح شراب خوری بھی عام تھی، جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو اہل مدینہ میں بھی شراب اور قمار یعنی جو کھیلے کا رواج تھا، عام لوگ تو ان دونوں چیزوں کے صرف ظاہری فوائد کو دیکھ کر ان پر فریفتہ تھے، ان کے اندر جو بہت مفاسد اور خرابیاں ہیں ان کی طرف نظر نہیں تھی، لیکن عادیۃ اللہ یہ بھی ہے کہ ہر قوم اور ہر خطہ میں کچھ عقل والے بھی ہوتے ہیں، جو طبیعت پر عقل کو غالب رکھتے ہیں، کوئی طبیعت خواہش اگر عقل کے خلاف ہو تو وہ اس خواہش کے پاس نہیں جاتے، اس معاملہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام تو بہت ہی بلند تھا کہ جو چیز کسی وقت حرام ہونے والی تھی آپ کی طبیعت اس سے پہلے ہی نفرت کرتی تھی، صحابہ کرام میں بھی کچھ ایسے حضرات تھے جنہوں نے حلال ہونے کے زمانے میں بھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا، مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد چند حضرات صحابہ کو ان کے مفاسد کا زیادہ احساس ہوا حضرت فاروق اعظم اور معاذ بن جبل اور چند انصاری صحابہ اسی احساس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ شراب اور قمار انسان کی عقل کو بھی حشراب کرتے ہیں، اور مال بھی برباد کرتے ہیں، ان کے بارے میں آپ کا کیا ارشاد ہے، اس سوال کے جواب میں آیت مذکورہ نازل ہوئی یہ پہلی آیت ہے جس میں شراب اور جوئے سے مسلمانوں کو روکنے کا ابتدائی قدم اٹھایا گیا۔

اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ شراب اور جوئے میں اگرچہ لوگوں کے کچھ ظاہری فوائد ضرور ہیں لیکن ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو ان کے منافع اور فوائد سے بڑی ہوتی ہیں، اور گناہ کی باتوں سے وہ چیزیں مراد ہیں جو کسی گناہ کا سبب بن جائیں، مثلاً شراب میں سبکے بڑی خرابی یہ ہے کہ عقل و ہوش زائل ہو جاتا ہے جو تمام کمالات اور شرف انسانی کا اصل اصول ہے، کیونکہ عقل ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسانوں کو بڑے کاموں سے روکتی ہے، جب وہ نہ رہی تو ہر بڑے کام کے لئے راستہ ہموار ہو گیا۔

اس آیت میں صاف طور پر شراب کو حرام تو نہیں کہا گیا، مگر اس کی خرابیاں اور مفاسد بیان کر دیئے گئے، کہ شراب کی وجہ سے انسان بہت سے گناہوں اور خرابیوں میں مبتلا ہو سکتا ہے، مگر اس کے ترک کرنے کے لئے ایک قسم کا مشورہ دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بعض صحابہ کرام تو اس مشورہ ہی کو قبول کر کے اسی وقت شراب کو چھوڑ بیٹھے، اور بعض نے یہ خیال کیا کہ اس آیت نے شراب کو حرام تو کیا نہیں بلکہ مفاسد دینی کا سبب بننے کی وجہ سے اس کو سبب گناہ قرار دیا ہے۔ ہم اس کا اہتمام کریں گے کہ وہ مفاسد واقع نہ ہوں، تو پھر شراب میں کوئی حرج نہیں اس لئے پیتے رہے، یہاں تک کہ ایک روز یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام میں سے چند اپنے دوستوں کی دعوت کی، کھانے کے بعد

حسب دستور شراب پی گئی، اسی حال میں نماز مغرب کا وقت آ گیا، سب نماز کے لئے کھڑے ہو گئے، تو ایک صاحب کو امامت کے لئے آگے بڑھایا، انہوں نے نشہ کی حالت میں جو تلاوت شروع کی تو سورۃ قل یا یٰٰہٰی الخمر بنوں کو غلط پڑھا، اس پر شراب سے روکنے کے لئے دو سرا قدم اٹھایا گیا اور یہ آیت نازل ہوئی۔

یٰٰہٰی الَّذِیْنَ اٰمَنُوا لَا تَقْرَءُوا
الْصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سٰکَنٰوْنَ (۲۲۱)

تین ایسے ایمان والوں کی حالت میں
نماز کے پاس نہ جاؤ۔

اس میں خاص اوقات نماز کے اندر شراب کو قطعی طور پر حرام کر دیا گیا، باقی اوقات میں اجازت رہی جن حضرات صحابہ نے پہلی آیت نازل ہونے کے وقت شراب کو چھوڑا تھا اسی آیت کے نازل ہونے کے وقت شراب کو طلاقاً ترک کر دیا کہ جو چیز انسان کو نماز سے روکے اس میں کوئی خیر نہیں ہو سکتی، جب نشہ کی حالت میں نماز کی ممانعت ہو گئی تو ایسی چیز کے پاس نہ جانا چاہئے جو انسان کو نماز سے محروم کر دے، مگر چونکہ علاوہ اوقات نماز کے شراب کی حرمت مطلقاً پر اب بھی نازل نہیں ہوئی تھی، اس لئے کچھ حضرات اب بھی اوقات نماز کے علاوہ دوسرے اوقات میں پیتے رہے، یہاں تک کہ ایک اور واقعہ پیش آیا، عبید بن مالک نے چند صحابہ کرام کی دعوت کی، جن میں سعد بن ابی وقاص بھی تھے، کھانے کے بعد حسب دستور شراب کا دور چلا، نشہ کی حالت میں عرب کی عام عادت کے مطابق شعرو شاعری اور اپنے اپنے مفاسد کا بیان شروع ہوا، سعد بن ابی وقاص نے ایک قصیدہ پڑھا، جس میں انصار مدینہ کی بھو اور اپنی قوم کی مدح و ثناء تھی، اس پر ایک انصاری نوجوان کو غصہ آ گیا، اور اونٹ کے جھڑکے کی ہڈی سعد رضی اللہ عنہ کے سر پر مار دی، جس سے ان کو شدید زخم آ گیا، حضرت سعد رضی اللہ عنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اس انصاری جوان کی شکایت کی، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی، اَللّٰهُمَّ یٰٰہٰی الَّذِیْنَ اٰمَنُوا لَا تَقْرَءُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سٰکَنٰوْنَ، یعنی یا اللہ شراب کے بارے میں ہیں کوئی واضح بیان اور قانون عطا فرما دے، اس پر شراب کے متعلق تیسری آیت سورہ مائدہ کی مفصل نازل ہو گئی جس میں شراب کو مطلقاً حرام قرار دیا گیا، آیت یہ ہے:

یٰٰہٰی الَّذِیْنَ اٰمَنُوا لَا تَسْأَلُوا
الْمُیْسِرَ وَالْاُصْحَابَ الْاَزْلَامِ یٰٰہٰی
مَنْ اٰمَنَ فَاٰمَنَ فَاٰمَنَ فَاٰمَنَ
تَقْلِبُوْنَ ۚ اِنْ تَابَ رَبُّکُمْ لَیْسَ لَکُمْ
اَنْ یُّؤْخَذَ بِمِیْثَاقِکُمْ اَوْ اَوْ
الْبَغْضَآءِ فِی الْخَمْرِ وَالْمِیْسِرِ

تین ایسے ایمان والوں کی حالت میں
اور جو کہ اور بہت اور جوئے کے تیرا سبب گئی
ہائیں شیطانی کام میں اس سے بالکل الگ
الگ رہو تاکہ تم سب ہو شیطان قوی نہ بنو
ہے کہ شراب و جوئے کے ذریعہ تمہارے آپس
میں بغض اور ممانعت پیدا کر دے

وَيَسْتَكْبِرُونَ كَذِبًا أَهْلًا وَيَحْنُ الْعَلَوُ
فَقُلْ أَنتُمْ مَنكُفُونَ (۹۱: ۵)

اور اللہ تعالیٰ کی یاد اور نماز سے تم کو باز رکھے۔
سو کیا اب بھی باز آؤ گے۔

حُرمت شراب کے تدریجی احکام

احکام الہیہ کی اصلی اور حقیقی حکمتوں کو تو احکام الحاکمین ہی جانتا ہے، پھر احکام شریعیہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا

ہے کہ شریعت اسلام نے احکام میں انسانی جذبات کی بڑی رعایت فرمائی ہے، تاکہ انسان کو ان کے اعتبار میں زیادہ تکلیف نہ ہو، خود مستران کریم نے فرمایا: لَا يَكِلُكَ اللَّهُ تَعْسًا لَكَ وَشَقًّا (۲۸۶: ۲) یعنی اللہ تعالیٰ کسی انسان کو ایسا حکم نہیں دیتا جو اس کی قدرت اور وسعت میں نہ ہو۔ اسی رحمت و حکمت کا تقاضا تھا کہ اسلام نے شراب کے حرام کرنے میں بڑی تدریج سے کام لیا۔ شراب کی تدریجی مانعت اور حرمت کی قرآنی تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں شراب کے متعلق چار آیتیں نازل ہوئی ہیں، جن کا ذکر ادھر پڑ چکا ہے، ان میں سے ایک آیت سورۃ بقرہ کی ہے جس کی تفسیر آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں، اس میں تو شراب کا پیدا ہو جانے والے گناہوں اور مفاسد کا ذکر کر کے چھوڑ دیا گیا ہے، حرام نہیں کیا، گویا ایک مشورہ دیا کہ یہ پھوڑنے کی چیز ہے، مگر پھوڑنے کا حکم نہیں دیا۔

دوسری آیت سورۃ نساء کی لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنتُمْ سُكَارَىٰ میں خاص اوقات نماز کے اندر شراب کو حرام کر دیا گیا، باقی اوقات میں اجازت رہی۔

تیسری اور چوتھی دو آیتیں سورۃ مائدہ کی ہیں، جو ادھر مذکور ہو چکی ہیں، ان میں صاف اور قطعی طور پر شراب کو حرام قرار دیا۔

شریعت اسلام نے شراب کے حرام کرنے میں اس تدریج سے اس لئے کام لیا کہ عمر بھر کی عادت خصوصاً نشہ کی عادت کو چھوڑ دینا انسانی طبیعت پر انتہائی شاق اور مگرانہ ہوتا، علماء نے فرمایا: نِظَامُ الْعَادَةِ آمَنٌ مِنْ نِظَامِ الدِّينِ صَلَاحُهُ مِثْلُ جِسْمِهِ كَوْنُهَا كَادِرٌ دَرْدِ جِسْمِهِ کی عادت چھوڑ دینا بھاری محلوم ہوتا ہے انسان کو اپنی کسی عادت مستحضر کو بدلنا اس سے زیادہ شدید اور سخت ہے، اس لئے اسلام نے حکیمانہ اصول کے مطابق اول اس کی بڑائی ذہن نشین کرائی، پھر نمازوں کے اوقات میں منع کیا، پھر ایک خاص مدت کے بعد قطعی طور پر حرام کر دیا گیا۔ ہاں جس طرح ابتدائے تحریم شراب میں آہستگی اور تدریج سے کام لینا حکمت کا تقاضا تھا اسی طرح حرام کر دینے کے بعد اس کی مانعت کے قانون کو پوری شدت کے ساتھ نافذ کرنا بھی حکمت ہی کا تقاضا تھا، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے بارے میں اول سخت وعید و عذاب کی بتلائیں، ارشاد فرمایا کہ یہ ام المیثاق اور ام الفواحش ہے، اس کو پی کر آدمی جیسے سے گھٹے

گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ شراب اور ایمان جمع نہیں ہو سکتے، یہ دو ایسی نساتی ہیں، اور جامع ترمذی میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے بارے میں دس آدمیوں پر لعنت فرمائی، پھوڑنے والا، بنانے والا، پینے والا، پلانے والا، اس کو لاد کر لانے والا، اور جس کے لئے لائی جائے، اور اس کا بیچنے والا، خریدنے والا، اس کو بہہ کرنے والا، اس کی آمدنی کھانے والا، اور پھر صرف لربانی تعلیم و تبلیغ پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ علی اور قانونی طور پر اعلان فرمایا کہ جس کے پاس کسی قسم کی شراب موجود ہو اس کو فلاں جگہ جمع کر دے۔ صحابی میں تعین حکم کا پیشال جنڈا فرمایا اور صحابہ کرام نے پہلا حکم پاتے ہی اپنے اپنے گھر نہیں جو شراب استعمال کیلئے رکھی تھی اُس کو تو اسی وقت پہا دیا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے مدینہ کی گھلیوں میں یہ آواز دی کہ شراب حرام کر دی گئی ہے تو جس کے ہاتھ میں جو برتن شراب کا تھا اس کو وہیں پھینک دیا، جس کے پاس کوئی سبویا خم شراب کا تھا اس کو گھر سے باہر لاکر توڑ دیا، حضرت انسؓ اُس وقت ایک مجلس میں دُور جام کے ساتھی بنے ہوئے تھے، ابو طلحہ، ابو عبیدہ، بن جراح، ابی بن کعب، ہبیل، رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے جلیل القدر صحابہ موجود تھے، منادی کی آواز کان میں پڑنے ہی سب نے کہا کہ اب یہ شراب سب گرا دو، اس کے جام و سب توڑ دو، بعض روایات میں ہے کہ اعلان حرمت کے وقت جس کے ہاتھ میں جام شراب ہوں ایک پہنچا ہوا تھا اُس نے وہیں سے اس کو پھینک دیا، مدینہ میں اُس روز شراب اس طرح بہہ رہی تھی جیسے بارش کی زد کا پانی، اور مدینہ کی گھلیوں میں عرصہ ملازمت یہ حالت رہی کہ جب بارش ہوتی تو شراب کی بُو اور رنگ مٹی میں بکھر آتا تھا۔

جس وقت اُن کو یہ حکم ملا کہ جس کے پاس کسی قسم کی شراب، ہر وہ فلاں جگہ جمع کر دے، اس وقت صرف وہ ذخیرے کچھ رہ گئے تھے جو مال تجارت کی حیثیت سے بازار میں تھے، اُن کو فرمایا سب دار صحابہ کرام نے بلا تا مل معسرہ جگہ پر جمع فرمادیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تمیز لے گئے، اور اپنے ہاتھ سے شراب کے بہت سے مشکیزوں کو چاک کر دیا اور بانی دوسرے صحابہ کرام کے حوالے کر کے چاک کر دیا، ایک صحابی جو شراب کی تجارت کرتے تھے اور ملک مشم سے شراب درآمد کیا کرتے تھے اتفاقاً اس زمانے میں ابھی ساری رقم جمع کر کے ملک شام سے شراب لینے کے لئے گئے ہوئے تھے، اور جب یہ تجارتی مال لے کر واپس ہوئے تو مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی اُن کو اعلان حرمت کی خبر مل گئی، جاں نثار صحابی نے اپنے پورے سرمائے اور محنت کی مصلحت کو جس سے بڑے نفع کی امیدیں لئے ہوئے آ رہے تھے اعلان حرمت

سن کر اسی جگہ ایک پہاڑی پر ڈال دیا، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اور سوال کیا کہ اب میرے اس مال کے متعلق کیا حکم ہے، اور مجھ کو کیا کرنا چاہیے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمانِ خداوندی کے مطابق حکم دیدیا کہ سب مشکیزوں کو چاک کر کے شراب بہا دو، فرمانبردار محبتِ خدا و رسولؐ نے بلا کسی جھجک کے اپنے ہاتھ سے اپنا پورا سرمایہ زمین پر بہا دیا، یہ بھی اسلام کا ایک معجزہ اور صحابہ کرامؓ کی حیرت انگیز رے مثال اطاعت ہے جو اس واقعہ میں ظاہر ہوئی، کہ جس چیز کی عادت ہو جائے سب جانتے ہیں کہ چھوڑنا سخت دشوار ہے اور یہ حضرات بھی اس کے ایسے عادی تھے کہ تھوڑی دیر اس سے صبر کرنا دشوار تھا، ایک حکم اپنی اور فرمان نبویؐ نے ان کی عادات میں ایسا عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا کہ اب یہ شراب اور مچھ سے ایسے ہی متنفر ہیں، جیسے اس سے پہلے ان کے عادی تھے۔

اسلامی سیاست اور عام
ملکی سیاستوں کا فرق عظیم
مذکورہ آیات پھر واقعات میں حرمتِ شراب کے حکم پر مسلمانوں کے عمل کا ایک نمونہ سامنے آ گیا ہے، جس کو اسلام کا معجزہ کہو یا پیغمبرانہ تربیت کا بے مثال اثر یا اسلامی سیاست کا لازمی نتیجہ کہ نشر کی عادت جس کے چھوڑنے کا انتہائی دشوار ہونا ہر شخص کو معلوم ہے، اور عرب میں اس کا رواج اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ چند گھنٹے اس کے بغیر صبر نہیں کر سکتے تھے، وہ کیا چیز تھی جس نے ایک ہی اعلان کی آواز کان میں پڑتے ہی ان سب کے مزاجوں کو بدل ڈالا، ان کی عادتوں میں وہ انقلاب پیدا کر دیا کہ اب چند منٹ پہلے جو چیز انتہائی مرغوب بلکہ زندگی کا سرمایہ تھی وہ چند منٹ کے بعد انتہائی مبغض اور فحش و ناپاک ہو گئی۔

اس کے بالمقابل آج کی ترقی یافتہ سیاست کی ایک مثال کو سامنے رکھ لیجئے کہ اب چند سال پہلے امریکہ کے ماہرینِ صحت اور سماجی مصلحین نے جب شراب نوشی کی بے شمار اور انتہائی مہلک خرابیوں کو محسوس کر کے ملک میں شراب نوشی کو قانوناً ممنوع کرنا چاہا تو اس کے لئے اپنے نشر و اشاعت کے وہ نئے سے نئے ذرائع جو اس ترقی یافتہ سیاست کا بڑا کمال سمجھے جاتے ہیں سب ہی شراب نوشی کے خلاف ذہن ہموار کرنے پر لگا دیئے، سینکڑوں اخبارات اور رسائل اس کی خرابیوں پر مشتمل ملک میں لاکھوں کی تعداد میں شائع کئے گئے، پھر امریکی دستوں میں ترمیم کر کے امتناعِ شراب کا قانون نافذ کیا گیا، مگر ان سب کا اثر جو کچھ امریکہ میں آنکھوں نے دیکھا، اور وہاں کے اربابِ سیاست کی رپورٹوں سے دنیا کے سامنے آیا وہ یہ تھا کہ اس ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ قوم نے اس ممانعتِ قانونی کے زمانے میں عام زمانوں کی نسبت بہت زیادہ شراب استعمال کی، یہاں تک کہ مجبور ہو کر حکومت کو اپنا قانون منسوخ کرنا پڑا۔

عرب مسلمانوں اور موجودہ ترقی یافتہ امریکہ کے حالات و معاملات کا یہ عظیم منسحق تو ایک حقیقت اور واقعہ ہے جس کا کسی کو انکار کرنے کی گنجائش نہیں، یہاں خود کرنے کی بات یہ ہو کہ اس عظیم الشان فرق کا اصلی سبب اور راز کیا ہے۔

ذرا سا غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ شریعتِ اسلام نے صرف قانون کو قوم کی اصلاح کے لئے کبھی کافی نہیں سمجھا، بلکہ قانون سے پہلے ان کی ذہنی تربیت کی اور عبادت و زہادت اور فکرِ آخرت کے کیما دی نئے سے ان کے مزاجوں میں ایک بڑا انقلاب لا کر ایسے افراد پیدا کر دیئے جو رسولؐ کی آواز پر اپنی جان و مال آبر و سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو جائیں سکی زندگی کے پورے دور میں یہی انسداد سازی کا کام رہا سنتوں کے ذریعے ہوتا رہا، جب جاں نثاروں کی جماعت تیار ہو گئی اس وقت قانون جاری کیا گیا، ذہنوں کو ہموار کرنے کے لئے تو امریکہ نے بھی اپنے بے مثال ذرائع استعمال کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی، ان کے سامنے سب کچھ تھا مگر فکرِ آخرت نہیں تھی، اور مسلمانوں کے رگ پے میں فکرِ آخرت سمائی ہوئی تھی۔ کاش! آج بھی ہمارے عقلاء اس فوجِ کیمیا کو استعمال کر کے دیکھیں تو دنیا کو امن سکون نصیب ہو جائے۔

شراب کے مفاسد اور فوائد میں موازنہ
اس آیت میں شراب اور قمار دونوں کے متعلق قرآن کریم نے یہ بتلایا ہے کہ ان دونوں میں کچھ مفاسد بھی ہیں اور کچھ فوائد بھی، مگر اس کے مفاسد فوائد سے بڑھے ہوئے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ اس پر نظر ڈال جائے کہ ان کے فوائد کیا ہیں اور مفاسد کیا، اور پھر یہ کہ فوائد سے زیادہ مفاسد ہونے کے کیا وجہ ہیں، آخر میں چند نفی حناطی بیان کئے جائیں گے، جو اس آیت سے مستفاد ہوتے ہیں پہلے شراب کو لے لیجئے، اس کے فوائد تو عام لوگوں میں مشہور و معروف ہیں کہ اس سے لذت و فرحت حاصل ہوتی ہے، اور وقتی طور پر قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے، رنگ صاف ہو جاتا ہے، مگر ان حقیر وقتی فوائد کے مقابلے میں اس کے مفاسد اتنے کثیر و وسیع اور گہرے ہیں کہ شاید کسی دوسری چیز میں اتنے مفاسد اور مضرات نہ ہوں گے، بدنی انسانی پر شراب کے مضرات یہ ہیں کہ وہ رفتہ رفتہ معدے کے فعل کو فاسد کر دیتی ہے، کھانے کی خواہش کم کر دیتی ہے، چہرے کی ہیئت بگاڑ دیتی ہے، پیٹ بڑھ جاتا ہے، مجموعی حیثیت سے تمام قوی پر یہ اثر ہوتا ہے جو ایک جرمن ڈاکٹر نے بیان کیا ہے کہ جو شخص شراب کا عادی ہو چالیس سال کی عمر میں اس کے بدن کی ساخت ایسی ہو جاتی ہے، جیسے ساٹھ سالہ بوڑھے کی وہ جہانی اور قوت کے اعتبار سے ٹھیک سے ہوئے بوڑھوں کی طرح ہو جاتا ہے، اس کے علاوہ

شراب بگاڑ اور گردوں کو خراب کر دیتی ہے، بیل کی پیاری شراب کا خاص اثر ہے، یورپ کے شہروں میں بیل کی کثرت کا بڑا سبب شراب ہی کو بتلایا جاتا ہے، وہاں کے بعض ڈاکٹروں کا قول ہے کہ یورپ میں آدمی اموات مرض بیل میں ہوتی ہیں اور آدمی دوسرے امراض میں، اور اس بیماری کی کثرت یورپ میں اسی وقت سے ہوئی جبکہ وہاں شراب کی کثرت ہوئی۔

یہ تو شراب کی جسمانی اور بدنی مضرتیں ہیں، اب عقل پر اس کی مضرت کو تو ہر شخص جانتا ہے، مگر صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ شراب پی کر جب تک نشہ رہتا ہے اُس وقت تک عقل کام نہیں کرتی، لیکن اہل تجربہ اور ڈاکٹروں کی تحقیق یہ ہے کہ نشہ کی عادت خود وقت مافکہ کو بھی ضیعت کر دیتی ہے، جس کا اثر ہوش میں آنے کے بعد بھی رہتا ہے، بعض اوقات جنون تک اس کی قوت پہنچ جاتی ہے، اطباء اور ڈاکٹروں کا اتفاق ہے کہ شراب نہ جز بدن بنتی ہے اور نہ اس کا خون بنتا ہے، جس کی وجہ سے بدن میں طاقت کم ہو جاتی ہے بلکہ اس کا فعل صرف یہ ہوتا ہے کہ خون میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے جس سے دفنی طور پر قوت کی زیادتی محسوس ہونے لگتی ہے، اور یہی خون کا دفعہ ہیجان بعض اوقات اچانک موت کا سبب بھی بن جاتا ہے، جس کو ڈاکٹر ہارٹ نیل ہونے سے تعبیر کرتے ہیں۔

شراب کے شرابیں یعنی وہ رنگیں جن کے ذریعے سارے بدن میں روح پہنچتی ہے سخت ہو جاتی ہیں جس سے بڑھا پا جلدی آ جاتا ہے، شراب کا اثر انسان کے حلقوم اور نفیس پر بھی خراب ہوتا ہے، جس کی وجہ سے آواز بھاری ہو جاتی ہے، اور کھانسی دائمی ہو جاتی ہے، اور وہی آخر کار سیل تک قوت پہنچا دیتی ہے، شراب کا اثر نسل پر بھی برا پڑتا ہے، شرابی کی اولاد کمزور رہتی ہے، اور بعض اوقات اس کا نتیجہ قطع نسل تک پہنچتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شراب پینے کی ابتدائی حالت میں بظاہر انسان اپنے جسم میں چستی و چالاکی اور قوت محسوس کرتا ہے، اسی لئے بعض لوگ جو اس میں مبتلا ہوتے ہیں ان میں حقائق کا انکار کرتے ہیں، لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ شراب کا یہ زہر ایسا زہر ہے جس کا اثر دیرینہ طور پر ظاہر ہونا شروع ہوتا ہے، اور کچھ عرصہ کے بعد یہ سب مضرتیں مشاہدہ میں آ جاتی ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔

شراب کا ایک بڑا مفسدہ تمدنی ہے کہ وہ اکثر لڑائی جھگڑے کا سبب بنتی ہے، اور پھر یہ بغض و عداوت دور تک انسان کو نقصان پہنچاتی ہیں، شریعت اسلام کی نظر میں یہ مفسدہ سب سے بڑا ہے، اس لئے قرآن نے سورۃ مائدہ میں نص صریح کے ساتھ اس مفسدہ کا ذکر فرمایا: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُزَيِّدَ بَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْمِرِ (۱۰۵)**

”یعنی شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور تجربے کے ذریعے تمہارے آپس میں بغض و عداوت پیدا کر دے“ شراب کا ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ مدہوشی کے عالم میں بعض اوقات آدمی اپنا پوشیدہ راز بیان کر دیتا ہے جس کی مضرت اکثر بڑی تباہ کن ہوتی ہے، خصوصاً وہ اگر کسی حکومت کا ذمہ دار آدمی ہے اور راز بھی حکومت کا راز ہے، جس کے اظہار سے پورے ملک میں انقلاب آ سکتا ہو اور ملکی سیاست اور جنگی مصالح سب برباد ہو جاتے ہیں، ہوشیار جاسوس ایسے مواقع کے منتظر رہتے ہیں۔

شراب کا ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ وہ انسان کو ایک کھلونا بنا دیتی ہے جس کو دیکھ کر بچے بھی ہنستے ہیں، کیونکہ اس کا کلام اور اس کی حرکات سب غیر متوازن ہو جاتی ہیں، شراب کا ایک عظیم تر مفسدہ یہ ہے کہ وہ ام الخبائث ہے، انسان کو تمام بُرے سے بُرے جرائم پر آمادہ کر دیتی ہے، زنا اور قتل اکثر اس کے نتائج ہوتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ عام شراب خانے زنا اور قتل کے اڈے ہوتے ہیں، یہ شراب کی جسمانی مضرتیں ہیں، اور اس کی روحانی مضرت تو ظاہر ہی ہے، کہ نشہ کی حالت میں نہ نماز ہو سکتی ہے نہ اللہ کا ذکر نہ اور کوئی عبادت، اسی لئے قرآن کریم میں شراب کی مضرت کے بیان میں فرمایا: **وَيُضِلُّكُمْ كَثِيرًا ذِكْرَ اللَّهِ وَغِنِ الصَّلَاةِ (۱۰۵)**۔ یعنی شراب تم کو ذکر اللہ اور نماز سے روکتی ہے۔

اب مالی مضرت اور نقصان کا حال سنئے جس کو ہر شخص جانتا ہے، کسی بستی میں اگر ایک شراب خانہ کھل جاتا ہے تو وہ پوری بستی کی دولت کو سمیٹ لیتا ہے، اس کی قسبیں بے شمار ہیں، اور بعض اقسام تو بے حد گراں ہیں، بعض اعداد و شمار لکھنے والوں نے صرف ایک شہر میں شراب کا مجموعی خرچ پوری مملکت فرانس کے مجموعی خرچ کے برابر بتلایا ہے۔

یہ شراب کے دینی، دنیوی جسمانی اور روحانی مفاسد کی مختصر فہرست ہے جس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کلمہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ ام الخبائث ”یا اثم الفواحش“ ہے، جرمنی کے ایک ڈاکٹر کا یہ قول ضرب المثل کی طرح مشہور ہے کہ اس نے کہا کہ اگر آرمے شراب خانے بند کر دیے جاتیں تو میں اس کی ضمانت لیتا ہوں کہ آرمے شفا خانے اور آدھی جیل خانے بے ضرورت ہو کر بند ہو جائیں گے۔ (تفسیر المنار لفتح عبیدہ، ص ۲۲۶ ج ۲)

علامہ طنطاوی نے اپنی کتاب التجوہر میں اس سلسلے کی چند اہم معلومات لکھی ہیں ان میں سے بعض یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

ایک فرانسیسی محقق ہنری اپنی کتاب ”تحوط و سوانح فی الاسلام“ میں لکھتے ہیں: ”بہت زیادہ ہسلک ہتھیار جس سے اہل مشرق کی بچ کئی گئی اور وہ دھماکا

تو ارجح سے مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ یہ شراب تھی۔ ہم نے الہیہ اثر کے لوگوں کے خلاف یہ ہتھیار آزمایا، لیکن ان کی اسلامی شریعت ہمارے راستہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گئی، اور وہ ہمارے اس ہتھیار سے متاثر نہیں ہوتے اور نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی نسل بڑھتی ہی چلی گئی، یہ لوگ اگر ہمارے اس تحفہ کو قبول کر لیتے جس طرح کہ ان کے ایک منافق قبیلے نے اس کو قبول کر لیا ہے تو یہ بھی ہمارے سامنے ذلیل دغوار ہو جاتے، آج جن لوگوں کے گھروں میں ہماری شراب کے دودھ چل رہے ہیں وہ ہمارے سامنے اتنے حقیر و ذلیل ہو گئے ہیں کہ سر نہیں اٹھا سکتے۔ ایک انگریز قانون دان بتام کہتے ہیں کہ :

”اسلامی شریعت کی بے شمار خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں شراب حرام ہے، ہم نے دیکھا کہ جب افریقہ کے لوگوں نے اسے استعمال کرنا شروع کیا تو ان کی نسلوں میں پاگل پن سراپت کرنے لگا، اور یورپ کے جن لوگوں کو اس کا چسکہ لگ گیا ان کی بھی عقلوں میں تغیر آنے لگا، لہذا افریقہ کے لوگوں کے لئے بھی اس کی ممانعت ہونی چاہئے، اور یورپین لوگوں کو بھی اس پر شدید سزائیں دینی چاہئیں۔“

غرض جس بھلے مانس نے بھی ٹھنڈے دل سے غور کیا وہ بے اختیار پکار اٹھا کہ یہ جیس ہے، شیطانی عمل ہے، زہر ہے، تباہی اور بربادی کا ذریعہ ہے، اس آئم الخبائث سے باز آ جاؤ،

فَهَلْ أَنتُم مِّنْهُمْ هُونٌ - (۱۱:۵)

شراب کی حرمت و ممانعت کے متعلق قرآن کریم کی چار آیتوں کا بیان اور پر آچکا ہے سورہ نحل میں ایک جگہ اور بھی نشہ کی چیزوں کا ذکر ایک دوسرے انداز سے آیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بھی یہاں ذکر کر دیا جائے، تاکہ شراب و نشہ کے متعلق تمام قرآنی ارشادات مجموعی طور پر سامنے آجائیں، وہ آیت یہ ہے :

وَمِنْ شَرِّهِ الشَّيْءُ الَّذِي تَتَذَكَّرُونَ	اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم لوگ نشہ
الْأَعْنَابُ سَخِيحٌ وَرَنٌّ يَمْشِي	کی چیز اور عمدہ کھانے کی چیزیں بناتے ہو،
مَنْكَرٌ أَذِيٌّ قَاحِشٌ، إِنَّ فِي	بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے بڑی دلیل
ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (۱۶:۶۷)	جو عقل رکھتے ہیں۔“

پہلے آیتوں میں حق تعالیٰ کی ان نعمتوں کا ذکر تھا جو انسانی غذائیں پیدا کرنے میں عجیب و غریب صنعت و قدرت کا مظہر ہیں، اس میں

پہلے دودھ کا ذکر کیا جس کو قدرت نے حیوان کے پیٹ میں خون اور فضلہ کی آلائشوں سے الگ کر کے صاف ستھری غذا انسان کے لئے عطا کر دی، جس میں انسان کو کسی مزید صنعت کی ضرورت نہیں، اسی لئے یہاں لفظ نسقیکم استعمال فرمایا کہ ہم نے دودھ پلایا، اس کے بعد سنسرایا کہ کھجور اور انگور کے کچھ پھلوں میں سے بھی انسان اپنی غذا اور نفع کی چیزیں بناتا ہے، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ کھجور اور انگور کے پھلوں میں سے اپنی غذا اور صنعت کی چیزیں بنانے میں انسانی صنعت کا کچھ دخل ہے، اور اس دخل کے نتیجہ میں وہ طرح کی چیزیں بناتی ہیں، ایک نشہ آور چیز جس کو غریب شراب کہا جاتا ہے، دوسری رزق حسن یعنی عمدہ رزق کہ کھجور اور انگور کو تازہ کھانے میں استعمال کریں یا خشک کر کے ذخیرہ کر لیں، مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا ملہ سے کھجور اور انگور کے پھل انسان کو دیدیئے، اور ان سے اپنی غذا وغیرہ بنانے کا اختیار بھی دیدیا، اب یہ اس کا انتخاب ہے کہ اس سے کیا بنائے، نشہ آور چیز بنا کر عقل کو خراب کرے یا غذا بنا کر قوت حاصل کرے۔

اس تفسیر کے مطابق اس آیت سے نشہ آور شراب کے حلال ہونے پر کوئی استدلال نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہاں مقصود قدرت کے عطیات اور ان کے استعمال کی مختلف صورتوں کا بیان ہے، جو ہر حال میں نعمت خداوندی ہے، جیسے تمام غذائیں اور انسانی منفعت کی چیزیں کہ ان کو بہت سے لوگ ناجائز طریقوں پر بھی استعمال کرتے ہیں، مگر کسی کے غلط استعمال سے اصل نعمت نعت ہونے سے نہیں بچل جاتی، اس لئے یہاں یہ تفصیل بتلانے کی ضرورت نہیں کہ ان میں کو نسا استعمال حلال ہے کو نسا حرام ہے، تاہم ایک لطیف اشارہ اس میں بھی اس طرف کر دیا کہ ”سکر“ کے مقابل ”رزق حسن“ رکھا، جس سے معلوم ہوا کہ سکر اچھا رزق نہیں، سکر کے معنی جھوڑے پھل کے نزدیک نشہ آور چیز کے ہیں، رزق المعانی، قرطبی جصاص)۔

یہ آیات اتفاق امت کی ہیں، اور شراب کی حرمت اس کے بعد مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، نازل آیات کے وقت اگرچہ شراب حلال تھی اور مسلمان مام طور پر پیتے تھے، مگر اس وقت بھی اس آیت میں اشارہ اس طرف کر دیا گیا کہ اس کا پیا اچھا نہیں، بعد میں صراحت شراب کو شدت کے ساتھ حرام کرنے کے لئے قرآنی احکام نازل ہو گئے (دہا ملخص مانی الجصاص والقرطبی)۔

۱۵۔ بعد مامانے اس کے معنی سکر یا بے نشہ نمیز کے ہیں (جصاص، قرطبی)، مگر اس جگہ اس اختلاف کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ۱۲۔

حرمت قمار (جوا)

میسر مصدر ہے، اور اصل لغت میں اس کے معنی تقسیم کرنے کے ہیں، یا سر تقسیم کر نیوالے کو کہا جاتا ہے، جاہلیت عرب میں مختلف قسم کے جوتے رائج تھے جن میں ایک قسم یہ بھی تھی کہ اونٹ ذبح کر کے اس کے حصے تقسیم کرنے میں جو اکیلے ہوتا تھا، بعض کو ایک یا زیادہ حصے ملتے بعض محروم رہتے تھے، محروم رہنے والے کو پوتے اونٹ کی قیمت اور اگر نا پڑتی تھی، گوشت سب فقرائیں تقسیم کیا جاتا تھا استعمال نہ کرتے تھے۔

اس خاص جوتے میں چونکہ فقر کا فائدہ اور جو اکیلے والوں کی تفاوت بھی تھی، اسی لئے اس کھیل کو باعث فخر سمجھے تھے، جو اس میں شریک نہ ہوتا اس کو بخوس اور مخوس کہتے تھے۔ تقسیم کی مناسبت سے قمار کو میسر کہا جاتا ہے، تمام صحابہؓ و تابعینؓ اس پر متفق ہیں کہ میسر میں قمار یعنی جوتے کی تمام صورتیں داخل اور سب حرام ہیں، ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اور جصاصؒ نے احکام العسکریؒ میں نقل کیا ہے کہ مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ابن عمرؓ اور قتادہؓ اور معاذ بن صالحؓ اور عطاءؓ اور طاؤسؓ نے فرمایا:

المیسر القمار حتی لعب الصنادیق بالکعب والجنین، یعنی ہر قسم کا قمار میسر ہے، یہاں تک کہ بچوں کا کھیل لکڑی کے ٹکڑوں اور اخروٹ وغیرہ کے ساتھ۔

اور ابن عباسؓ نے فرمایا انکھاطرۃ من الکھتارۃ یعنی مخاطرہ قمار میں سے ہے۔ (روح البیان)

مخاطرہ کے معنی ہیں کہ ایسا معاملہ کسب جائے جو نفع و ضرر کے درمیان دائر ہو، یعنی یہ بھی احتمال ہو کہ بہت سا مال مل جائے اور یہ بھی کہ کچھ نہ ملے، جیسے آجکل کی لاشری کے مختلف طریقوں میں پایا جاتا ہے، یہ سب قسمیں قمار اور میسر میں داخل اور حرام ہیں، اس لئے میسر یا قمار کی تعریف یہ ہے کہ جس معاملہ میں کسی مال کا مالک بنانے کو ایسی شرط پر موقوف رکھا جائے جس کے وجود و عدم کی دونوں جانبیں مساوی ہوں، اور اسی بناء پر نفع خالص یا نادان خالص برداشت کرنے کی دونوں جانبیں بھی برابر ہوں دشامی، ص ۲۵۵ جلد ۲ کتاب الخطر والاباحۃ، مثلاً یہ بھی احتمال ہے کہ زید پر نادان پڑ جائے، اور یہ بھی ہے کہ عمر پر پڑ جائے، اس کی جتنی قسمیں اور صورتیں پہلے زمانے میں رائج تھیں یا آج رائج ہیں یا آئندہ پیدا ہوں، سب میسر اور قمار اور جو اکیلے گا، معنی حل کرنے کا چلتا ہوا کاروبار اور تجارتی لاشری کی عام صورتیں سب اس میں داخل ہیں، ہاں اگر صرف ایک جانب کے العام مقرر کیا جائے

کہ جو شخص فلاں کام کرے گا اس کو یہ انعام ملے گا، اس میں مضائقہ نہیں، بشرطیکہ اس شخص سے کوئی فیس وصول نہ کی جائے، کیونکہ اس میں معاملہ نفع و ضرر کے درمیان دائر نہیں، بلکہ نفع اور عدم نفع کے درمیان دائر ہے۔

اسی لئے اعادیث صحیحہ میں شرط نفع اور جو سر وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا ہے، جن میں مسال کی ہرجیت پائی جاتی ہے، تاہم اگر روپیہ کی ہرجیت ہو تو وہ بھی میسر میں داخل ہے۔ صحیح مسلم میں بروایت بریدہؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص نزد شیر (جو سر) کھیلتا ہے وہ گویا خنزیر کے گوشت اور خون میں اپنے ہاتھ دھو رہا ہے، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ شرط نفع میسر یعنی جوتے میں داخل ہے، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا شرط نفع تو نزد شیر سے بھی زیادہ بڑی ہے (تفسیر ابن کثیر)

ابتداء اسلام میں شراب کی طرح قمار بھی حلال تھا، مگر جب سورۃ روم کی آیات غُلِبَتِ الرُّومُ نازل ہوئی، اور مفسر آن نے خبر دی کہ اس وقت روم اگرچہ اپنے حریف کسری سے مغلوب ہو گئے، لیکن چند سال بعد پھر رومی غالب آجائیں گے اور مشرکین مکہ نے اس کا انکار کیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان سے اسی طرح قمار کی شرط پھرائی، کہ اگر اتنے سال میں رومی غلب آئے تو اتنا مال تمہیں دینا پڑے گا، یہ شرط مان لی گئی، اور واقعہ قرآن کی خبر کے مطابق پیش آیا، تو ابوبکرؓ نے یہ مال وصول کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے، آپؐ نے اس واقعہ پر اظہار مسرت فرمایا مگر مال کو صدقہ کرنے کا حکم دیدیا۔

کیونکہ جو چیز آئندہ حرام ہونے والی تھی اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حلال ہونے کے زمانے میں بھی اس سے محفوظ فرما دیا تھا، اسی لئے شراب اور تمباکو سے ہمیشہ آپؐ نے جہتنباب کیا، اور خاص خاص صحابہؓ کرام بھی ان چیزوں سے ہمیشہ محفوظ رہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جبریل امینؑ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جعفر طیار کی چار خصلتیں زیادہ محبوب ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ سے پوچھا کہ آپ میں وہ چار خصلتیں کیا ہیں، عرض کیا کہ میں نے اس کا اظہار اب تک کسی سے نہیں کیا تھا، مگر جب کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے خبر دی تو عرض کرتا ہوں کہ وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ میں نے دیکھا کہ شراب عقل کو زائل کر دیتی ہے اس لئے میں کسی اس کے پاس نہیں گیا، اور میں نے یہوں کو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں کسی کا نفع و ضرر نہیں، اس لئے جاہلیت میں بھی کسی بُت پرستی نہیں کی، اور مجھے چونکہ اپنی پیروی اور لوگوں کے معاملہ میں سخت غیرت ہے اس لئے میں نے کسی زنا نہیں کیا، اور میں نے دیکھا کہ بھوٹ بولنا دناہیت اور زالت کی بات ہر

اس لئے کبھی بھلائی میں بھی بھٹکتے نہیں بولا (روح السبیل)

قمار کے سامنے اور اجتماعی نقصان (تارکینِ بخت کے متعلق بھی قرآن کریم نے وہی ارشاد فرمایا جو شراب کے متعلق آیا ہے) کہ اس میں کچھ منافع بھی ہیں مگر نفع سے اس کا نقصان و ضرر بڑھا ہوا ہے، اس کے منافع کو تو ہر شخص جانتا ہے، کہ جیت جاتے تو بیٹے بیٹے ایک فقیر بد حال آدمی ایک ہی دن میں مالدار و سرمایہ دار بن سکتا ہے، مگر اس کی معاشی، اجتماعی، سماجی اور روحانی خرابیاں اور مفاسد بہت کم لوگ جانتے ہیں، اس کا اجتماعی بیان یہ ہے کہ جوئے کا کھیل سارا اس پر دائر ہے کہ ایک شخص کا نفع دوسرے کے ضرر پر موقوف ہے، جیتنے والے کا نفع ہی نفع ہارنے والے کے نقصان ہی نقصان کا نتیجہ ہوتا ہے، کیونکہ اس کا ردِ بارسے کوئی دولت بڑھتی نہیں وہ اسی طرح بھید حالت میں رہتی ہے اس کھیل کے ذریعے ایک کی دولت سلب ہو کر دوسرے کے پاس پہنچ جاتی ہے، اس لئے قمار مجموعی حیثیت سے قوم کی تباہی اور انسانی افلاق کی موت ہے، کہ جس انسان کو نفع رسائی خلق اور ایثار و ہمدردی کا پیکر ہونا چاہئے، وہ ایک خوشخوار و درندہ کی خاصیت اختیار کر لے کہ دوسرے بھائی کی موت میں اپنی زندگی، اس کی مصیبت میں اپنی راحت اس کے نقصان میں اپنا نفع سمجھنے لگے، اور اپنی پوری قابلیت اس خود غرضی پر صرف کرے، بخلاف تجارت اور بیع و شراء کی جہانز صورتوں کے، ان میں طرفین کا فائدہ ہوتا ہے، اور بذریعہ تجارت اموال کے تبادلہ سے دولت بگھٹی ہے، اور خریدنے والا اور بیچنے والا دونوں اس کا فائدہ محسوس کرتے ہیں۔

ایک بھاری نقصان جوئے میں یہ ہے کہ اس کا عادی اصل کمائی اور کسبِ معاش کا محروم ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کی خواہش ہی رہتی ہے کہ بیٹے بھائے ایک شرط لگا کر دوسرے کا مال چند منٹ میں حاصل کرے، جس میں نہ کوئی محنت ہے نہ مشقت، بعض حضرات نے جوئے کا نام میسر رکھنے کی یہ وجہ بھی بیان کی ہے کہ اس کے ذریعہ آسانی سے دوسرے کا مال اپنا بن جاتا ہے، جوئے کا معاملہ اگر در چار آدمیوں کے درمیان دائر ہو تو اس میں بھی مذکورہ مضرتیں بالکل نمایاں نظر آتی ہیں، لیکن نئے نئے دور میں جس کو بعض سطحی نظر والے انسان عاقبت نا اندیشی سے ترقی کا دور کہتے ہیں، جیسے شراب کی نئی نئی قسمیں اور نئے نئے نام رکھ لئے گئے، سود کی نئی نئی قسمیں اور نئے نئے اجتماعی طسریقے بنگلہ گ کے نام سے ایجاد کر لئے گئے ہیں، اسی طرح قمار اور جوئے کی بھی ہزاروں قسمیں چل گئیں جن میں بہت سی قسمیں ایسی اجتماعی ہیں کہ قوم کا تقوٰۃ اعتقار و ردِ پیر جمع ہوتا ہے، اور جو نقصان ہوتا ہو وہ ان سب پر تقسیم ہو کر نمایاں نہیں رہتا، اور جس کو یہ رقم ملتی ہے اس کا فائدہ نمایاں ہوتا ہے، اس لئے بہت سے لوگ اس کے شخصی نفع کو دیکھتے ہیں، لیکن قوم کے اجتماعی نقصان پر دھیان نہیں دیتے، اس لئے ان کا خیال ان نئی قسموں کے جواز کی طرف چلا جاتا ہے، حالانکہ

اس میں وہ سب مضرتیں موجود ہیں جو در چار آدمیوں کے جوئے میں پائی جاتی ہیں، اور ایک حیثیت سے اس کا ضرر اس قدیم قسم کے قمار سے بہت زیادہ اور اس کے خراب اثرات دور رس اور پوری قوم کی برابری کا سامان ہیں، کیونکہ اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ ملت کے مام افراد کی دولت گھٹتی جائیگی اور چند سرمایہ داروں کے سرمایہ میں مزید اضافہ ہوتا رہے گا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پوری قوم کی دولت سمٹ کر محدود افراد اور محدود خاندانوں میں مرکوز ہو جائے گی، جس کا مشاہدہ سوشل بازار اور قمار کی دوسری قسموں میں روزمرہ ہوتا رہتا ہے، اور اسلامی معاشیات کا اہم اصول یہ ہے کہ ہر ایسے معاملے کو حرام قرار دیا جس کے ذریعے دولت پوری ملت سے سمٹ کر چند سرمایہ داروں کے حوالے ہو سکے، قرآن کریم نے اس کا اعلان خود تقسیم دولت کا اصول بیان کرتے ہوئے اس طرح فرمایا ہے، اِنِّیْ لَا یُکُوْنُ ذُوْ لِقَابَیْنِ الْاَغْنِیَا وَیُنْکَذَرُ (۵۹: ۵۹)، یعنی مالِ فتنے کی تقسیم مختلف طبقوں میں کرنے کا جو اصول قرآن نے مقرر کیا ہے اس کا منشاء یہ ہے کہ دولت سمٹ کر صرف سرمایہ داروں میں جمع نہ ہو جائے۔

قمار میں جوئے کی خرابی یہ بھی ہے کہ شراب کی طرح قمار بھی آپس میں لڑائی جھگڑے اور فتنہ و فساد کا سبب ہوتا ہے، ہارنے والے کو طبعی طور پر جیت جانے والے سے نفرت اور عداوت پیدا ہوتی ہے، اور یہ تمدن و معاشرت کے لئے سخت مہلک چیز ہے، اسی لئے قرآن حکیم نے خاص طور پر اس مفسدہ کو ذکر فرمایا ہے،

لَمَّا یَرْسُدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوَدِعَ
بَیِّنَکُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۃَ فِی
الْاَیْمٰمِ وَالْیَمِیْنِ وَیَصُدُّ کُمْ
عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ وَتَعٰینِ الصَّلٰوۃِ (۵۹: ۵۹)

شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے
کے ذریعے تمہارے آپس میں عداوت اور بغض
و نفرت پیدا کر دے اور تم کو اللہ کے ذکر اور نماز
سے روک دے ۵

اسی طرح قمار کا ایک لازمی اثر یہ ہے کہ شراب کی طرح آدمی اس میں مست ہو کر ذکر اللہ اور نماز سے غافل ہو جاتا ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے شراب اور قمار کو ایک ہی جگہ ایک انداز سے ذکر فرمایا ہے کہ معنوی طور پر قمار کا بھی ایک نشہ ہوتا ہے جو آدمی کو اس کے پھلے بُرے کی فکر سے غافل کر دیتا ہے، مذکورہ آیت میں بھی ان دونوں چیزوں کو جمع کر کے دونوں کے یہ مفاسد ذکر فرمائے ہیں، کہ وہ آپس کی عداوت و بغض کا سبب بنتی ہیں، اور ذکر اللہ اور نماز سے مانع بن جاتی ہیں۔

قمار کی ایک اصولی خرابی یہ بھی ہے کہ یہ باطل طریقہ پر دوسرے لوگوں کا مال ہضم کرنے کا ایک طریقہ ہے، کہ بغیر کسی معقول معاوضہ کے دوسرے بھائی کا مال لے لیا جاتا ہے، اسی کو

قرآن کریم نے ان الفاظ میں منع فرمایا ہے۔

لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ

تو لوگوں کے مال باطل طریقہ پر مت

یَا بُنَايِلِ - (۲: ۱۸۸)

کھاؤ۔

قمار میں ایک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ دعتہ بہت سے گھر بار ہو جاتے ہیں، لکھتی آدمی فقیر بن جاتا ہے، جس سے صرف یہی شخص متاثر نہیں ہوتا، جس نے جرم قمار کا ارتکاب کیا ہے، بلکہ اس کا پورا گھرانہ اور خاندان معیشت میں پڑ جاتا ہے، اور اگر غور کیا جائے تو پوری قوم اس سے متاثر ہوتی ہے، کیونکہ جن لوگوں نے اس کی مالی ساکھ کو دیکھ کر اس سے معاہدے اور معاملہ کئے ہوئے ہیں یا قرض دیئے ہوئے ہیں وہ اب دیوالیہ ہو جائے گا تو ان سب پر اس کی بربادی کا اثر پڑنا لازمی ہے۔

قمار میں ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ اس سے انسان کی قوت عمل سست ہو کر رہی منافع پر لگ جاتی ہے، اور وہ بجائے اس کے کہ اپنے ہاتھ یا دماغ کی محنت سے کوئی دولت بڑھا کر اس کی فکر اس بات میں محصور ہو کر رہ جاتی ہے کہ کسی طرح دوسرے کی کمائی پر اپنا قبضہ جائے۔ یہ مختصر فرست ہو قمار کے مفسدہ کی جن سے نہ صرف اس جرم کا مرتکب متاثر ہوتا ہو بلکہ اس کے سب متعلقین اہل دعیال اور پوری قوم متاثر ہوتی ہے، اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا: **وَإِنَّهُمْ مِمَّا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا**، یعنی شراب و قمار کے مفسدان کے نفع سے زیادہ ہیں۔

چند فقہی ضابطے اور فوائد | اس آیت میں شراب اور قمار کے بعض فوائد کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے رکنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے جس سے ایک اہم نتیجہ

یہ نکل آیا کہ کسی چیز یا کسی کام میں کچھ دنیوی منافع ہونا اس کے منافی نہیں ہے کہ اس کو شرعاً حرام قرار دیا جائے، کیونکہ جس طرح محسوسات میں اس دوا اور غذا کو مضر کہا جاتا ہے جس کی مضریتیں بہ نسبت اس کے فائدے کے زیادہ سخت ہوں، درندوں تو دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی چیز بھی منافع سے غالی نہیں، نہ ہر قاتل میں سانپ اور بچھو میں، درندوں میں کتے فوائد ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے ان کو مضر کہا جاتا ہے، اور ان کے پاس جانے سے بچنے کی ہدایت کی جاتی ہے، اسی طرح معنوی اعتبار سے جن کاموں کے مفسدان کے منافع سے زائد ہوں شرعاً ان کو حرام کر دیا جاتا ہے، چوری، ڈاکہ، زنا، اغوا، دھوکہ، فریب، وغیرہ تمام جرائم میں کوئی ناسمجھ ایسا ہے جس میں کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اگر یہ بالکل بے فائدہ ہوتے تو کوئی عقل و ہوش والا انسان ان کے پاس نہ جاتا، حالانکہ ان سب جرائم میں کامل دہی لوگ ہوتے ہیں جو ہوشیاری عقلمندی میں معروف سمجھے جاتے ہیں، اس سے ہی معلوم ہوا کہ فوائد تو کچھ نہ کچھ تمام جرائم میں ہیں، مگر چونکہ انکی

مضریت فائدہ سے بڑھی ہوئی ہے، اس لئے کوئی عقلمند انسان ان کو مفید اور جائز نہیں کہتا، شریعت اسلام نے شراب اور قمار کے تحت حرام قرار دیا ہے، کہ اس کے فوائد سے زیادہ مضریتیں اور دنیوی مضریتیں ہیں۔

ایک اور فقہی ضابطہ | اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جلب منفعت سے دفع مضریت مقدم ہے، یعنی ایک کام کے ذریعے کچھ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے اور ساتھ ہی کوئی مضریت بھی پہنچتی ہے تو مضریت سے بچنے کے لئے اس منفعت کو چھوڑ دینا ہی ضروری ہوتا ہے، ایسی منفعت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جو مضریت کے ساتھ حاصل ہو۔

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ

اور تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہے جو کچھ اپنے خرچ سے اس طرح بیان کرتا ہے اللہ

لَكُمْ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۱۸﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ط

تجہا واسطے علم تاکہ تم فکر کرو، دنیا و آخرت کی باتوں میں

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الَّتِي تُقْرِضُ قُلِ إِصْلَاحُ لَهَا خَيْرٌ مِنْ أَنْ تُنَافِلَهُمْ

اور تم سے پوچھتے ہیں تمہوں کا قرض کہہ دے مسوازان کے کام کا بہتر ہے اور اگر ان کا خرچ طو قودہ

فَاخْرُؤْ أَمْوَالُكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ

تمہاں بھائی میں اور اللہ جانتا ہے خراب کرنے والے اور سوار کرنے والے کو اور اگر اللہ چاہتا تو

لَاَعْتَدْتُمْ لِلَّهِ عِزًّا إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۱۹﴾ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُرَ

تم پر مشقت ڈالنا، بیشک اللہ زبردست جو تدبیر والا، اور نکاح مت کرو مشرک عورتوں سے

حَتَّى يُؤْمِنَ وَلَا مَآئِمَّةٌ خَيْرٌ مِنْ مَّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ

جب تک ایمان نہ لے آئیں اور ایستہ لونڈی مسلمان بہتر ہے مشرک بیوی سے اگرچہ وہ تم کو بہل گئے،

وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُرَ كَيْنَ حَتَّى يُؤْمِنُوا وَلَعَبْدٌ مُؤْمِنٌ خَيْرٌ مِنْ

اور نکاح نہ کرو مشرکین سے جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور ایستہ غلام مسلمان بہتر ہے مشرک

مُشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ أُولَئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ وَاللَّهُ يَدْعُو

سے اگرچہ وہ تم کو بہلا گئے وہ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف اور اللہ بلاتا ہے

إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ

جنت کی طرف اور بخشش کی طرف اپنے حکم سے اور بتلاتا ہے اپنے حکم کو لوگوں کو تاکہ وہ

يَتَذَكَّرُونَ ﴿۲۲۱﴾

تصیحت قبول کریں۔

خُلاصۂ تفسیر

۱۹ سُوہواں حکم، مقدار اتفاق اور لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ (خیر خیرات میں) کتنا خرچ کیا کریں آپ فرمادیجئے کہ جتنا آسان ہو کہ اس کے خرچ کرنے سے خود پریشان ہو کر دنیوی تکلیف میں یا کسی کا حق ضائع کر کے آخری تکلیف میں پڑ جائیں، اللہ تعالیٰ اس طرح احکام کو صاف صاف بیان فرماتے ہیں تاکہ تم (کو ان کا علم ہو جائے اور اس علم کی وجہ سے ہر عمل کرنے سے پہلے دنیا و آخرت کے معاملات میں (ان احکام کو) سوچ لیا کرو اور سوچ کر ہر معاملہ میں ان احکام کے موافق عمل کیا کرو۔

۲۰ سُوہواں حکم، مخالفتِ تمیم رچو نکہ ابتداء میں مثل ہندوستان کے عرب میں بھی تمیموں کا حق دینے میں پوری حسیادت نہ تھی، اس لئے یہ دعید سنائی گئی کہ تمیموں کا مال کھانا ایسا ہے جیسا دوزخ کے انگکے پیٹ میں بھرنا، تو سننے والے ڈر کے مارے اتنی احتیاط کر لے گئے کہ ان کا کھانا بھی الگ بکولتے اور الگ رکھواتے، اور اتفاقاً اگر بچہ کم کھانا تو کھانا بچتا اور سڑتا تھا، کیونکہ اس کا استعمال نہ ان لوگوں کے لئے جائز تھا، اور نہ تمیم کے مال کو صدقہ کر دینے کا اختیار تھا، اس طرح تکلیف بھی ہوتی اور تمیم کا نقصان بھی، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا، اس کے متعلق آیت میں یہ ارشاد آیا اور لوگ آپ سے تمیم بچوں (کے خرچ علیحدہ یا شامل رکھنے) کا حکم پوچھتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ اصل مقصود ہمارا ان کے اموال کھانے کی ممانعت سے یہ ہے کہ ان کی مصلحت کو ضائع نہ کیا جائے، اور جب خرچ شامل رکھنے میں ان کی مصلحت ہے (تو) ان کی مصلحت کی رعایت رکھنا علیحدہ خرچ رکھنے سے جو خلافِ مصلحت ہے، زیادہ بہتر ہے اور تم ان کے ساتھ خرچ شامل رکھو تو کچھ ڈر کی بات نہیں کیونکہ وہ (بچے) تمہارے (دین) بھائی ہیں اور بھائی بھائی شامل رہا ہی کرتے ہیں اور اللہ تم مصلحت کے ضائع کرنے والے کو اور مصلحت کی رعایت رکھنے والے کو (الگ الگ) جانتے ہیں اس لئے کھانے پینے میں اشتراک ایسا نہ ہونا چاہئے جس میں یشیم کی مصلحت ضائع ہو جائے اور بلا علم و بلا قصد کچھ کی بیشی ہو بھی جائے تو چونکہ اللہ تعالیٰ کو اس کی

تیک یہی معلوم ہے اس لئے اس پر مواخذہ نہ ہوگا، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو اس معاملہ میں سخت قانون معتر کر کے، تم کو مصیبت میں ڈال دیتے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ زبردست ہیں (مگر قانون سہل اس کو مقرر فرمایا کہ وہ) سخت دالے بھی، میں (ایسا حکم نہیں دیتے جو نہ ہو سکے)۔

۱۸ اور نکاح مت کر دو کہ کافر عورتوں کے ساتھ جب تک کہ مسلمان اٹھارہواں حکم مناکحت کفار نہ ہو جاویں اور مسلمان عورت (چاہے) لونڈی (کیوں نہ ہو وہ

ہزار درجہ) بہتر ہے کافر عورت سے (چاہے وہ آزادی بی بی کیوں نہ ہو) گودہ رکافر عورت بوجہ مال یا جمال کے، تم کو اچھی معلوم ہو (مگر پھر بھی واقع میں مسلمان عورت ہی اس سے اچھی ہے) اور (اسی طرح اپنے اختیار کی عورتوں کو کافر مردوں کے نکاح میں مت درجہ تک وہ مسلمان نہ ہو جائے اور مسلمان مرد (چاہے) غلام (ہی کیوں نہ ہو وہ ہزار درجہ) بہتر ہے کافر مرد سے (چاہے وہ آزادی کیوں نہ ہو) گودہ رکافر مرد بوجہ مال یا جاہ کے، تم کو اچھی معلوم ہو (مگر پھر بھی واقع میں مسلمان ہی اس سے اچھا ہے، اور وہ ان کافروں کے بڑا ہونے کی اور وہی اصل سبب ان سے مانعت نکاح کا ہے یہ ہے کہ یہ (کافر) لوگ دوزخ (میں) جانے کی تحریک دیتے ہیں (کیونکہ کفر کی تحریک کرتے ہیں اور اس کا انجام جہنم ہے) اور اللہ تعالیٰ جنت اور مغفرت (کے) حاصل کرنے کی تحریک کرتے ہیں اپنے حکم سے (اور اس حکم کا ہر طور اس طرح ہوا کہ کفار کے متعلق یہ حکم صادر فرمایا کہ ان سے نکاح نہ کیا جائے، تاکہ ان کی تحریک کے اثر سے پوری حفاظت رہ سکے، اور اس سے محفوظ رہ کر جنت اور مغفرت حاصل ہو جائے) اور اللہ تعالیٰ اس واسطے اپنے احکام بتلا دیتے ہیں تاکہ وہ لوگ نصیحت پر عمل کریں (اور سختی جنت و مغفرت ہو جاویں)۔

۱۹ فَوَائِدِ زَبَانِ الْقُرْآن مسئلہ: جو قوم اپنی وضع اور طرز سے اپنی کتاب سمجھ جاتے ہوں، لیکن عقائد کی تحقیق کرنے سے کتابی ثابت نہ ہوں اس قوم کی عورتوں سے نکاح درست نہیں، جیسے آجکل عورتوں کو عام لوگ عیسائی سمجھتے ہیں، حالانکہ تحقیق سے ان کے بعض عقائد بالکل ملحدانہ ثابت ہوئے کہ خدا کے قائل نہ عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے معتقدہ انجیل کی نسبت آسمانی کتاب ہونے کا اعتقاد سوائے لوگ عیسائی نہیں ایسی جماعت میں کی جو عورت ہوا سے نکاح درست نہیں لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں کہ بلا تحقیق یورپ کی عورتیں بیاہ لاتے ہیں۔

۲۰ مسئلہ: اس طرح جو مرد ظاہری حالت میں مسلمان سمجھا جائے لیکن عقائد اس کے کفر تک پہنچے ہوں اسے مسلمان عورت کا نکاح درست نہیں اور اگر نکاح ہو جائے کے بعد ایسے عقائد خراب ہو جاویں تو نکاح کو جائز جیسے آجکل بہت آدمی اپنے مذہب کے نادانانہ سنسنے اثر سے اپنے عقائد تباہ کر لیتے ہیں لوگ واپس پر و جب تک کہ پیام آنے کے وقت اول عقائد کی تحقیق کر لیا کریں تب زبان دیں۔

معارف و مسائل

مسلم و کافر کا باہمی ازدواج ممنوع ہے آیات مذکور میں ایک اہم مسئلہ یہ بیان فرمایا گیا کہ مسلمان مردوں کا نکاح کافر عورتوں سے اور کافر مردوں کا نکاح مسلمان عورتوں سے جائز نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کافر مرد اور عورتیں انسان کو جہنم کی طرف لے جانے کے سبب بنتے ہیں، کیونکہ ازدواجی تعلقات، آپس کی محبت و مودت اور یکجہلیت کو چاہتے ہیں، اور بغیر اس کے ان تعلقات کا اصلی مقصد پورا نہیں ہوتا، اور شرکین کے ساتھ اس قسم کے تعلقات قریب محبت و مودت کا لازمی اثر ہے کہ ان کے دل میں بھی کفر و شرک کی طرف میلان پیدا ہو یا کم از کم کفر و شرک سے نفرت ان کے دلوں سے نکل جائے، اور اس کا انجام یہ ہے کہ یہ بھی کفر و شرک میں مبتلا ہو جائیں اور اس کا نتیجہ جہنم ہے، اس لئے فرمایا گیا کہ یہ لوگ جہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ انسان کو جنت اور مغفرت کی طرف دعوت دیتا ہے، اور صاف صاف اپنے احکام بیان فرمادیتا ہے تاکہ لوگ نصیحت پر عمل کریں، اس جگہ چند باتیں قابل غور ہیں۔

اول یہ کہ اس آیت میں لفظ مشرک سے اگر مطلقاً غیر مسلم مراد ہوں تو قرآن کریم کی ایک دوسری آیت کی بنا پر اہل کتاب کی غیر مسلم عورتیں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے **وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ** (۵۰)، اور اگر مشرک سے خاص وہ غیر مسلم مراد ہیں جو اہل کتاب نہیں تو یہ آیت اپنی جگہ عام ہے تمام ان غیر مسلموں کو جو کسی پیغمبر اور آسمانی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ مسلم و کافر کے درمیان ازدواجی تعلقات کو حرام قرار دینے کی جو وجہ قرآن کریم میں بیان فرمائی گئی ہے کہ ان کے ساتھ ایسے تعلقات شریعہ کفر و شرک میں مبتلا ہو جانے کا سبب بن سکتے ہیں، یہ بات تو بظاہر تمام غیر مسلم فرقوں میں مصادی ہے، پھر اہل کتاب کی عورتوں کو مستثنیٰ کرنے کی کیا وجہ ہے۔

جواب ظاہر ہے کہ اہل کتاب کا اختلاف اسلام کے ساتھ بہ نسبت دوسرے غیر مسلموں کے کم اور ہلکا ہے، کیونکہ عقائد اسلام کے تین عمود ہیں توحید، آخرت، رسالت، ان میں سے عقیدہ آخرت میں تو اہل کتاب یہود و نصاریٰ بھی اپنے اصل مذہب کے اعتبار سے مسلمانوں کے ساتھ متفق ہیں، اسی طرح خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا خود ان کے اصل مذہب میں بھی کفر ہے، یہ دوسری بات ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت و محبت کے غلو میں مشرک بنک جا پہنچے۔

اب بنیادی اختلاف صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول نہیں

مانتے، اور اسلام میں یہ عقیدہ بھی بنیادی عقیدہ ہے، اس کے بغیر کوئی انسان مؤمن نہیں ہو سکتا، بہر حال دوسرے غیر مسلم فرقوں کی نسبت سے اہل کتاب کا اختلاف ہلکا اور کم ہے، اس لئے اس میں مفسدہ کا خطرہ زیادہ نہیں۔

تیسری بات قابل غور یہ ہے کہ جب اہل کتاب کا اختلاف ہلکا قرار دے کر ان کی عورتوں سے نکاح مسلمان کا جائز ہوا تو اس کے برعکس مسلمان عورتوں کا نکاح بھی غیر مسلم اہل کتاب سے جائز ہو جانا چاہئے، مگر ذرا غور کرنے سے فرق واضح ہو جاتا ہے کہ عورت کچھ نقطہ ضعیف ہوا اور پھر شوہر اس پر ماکم اور نگران بنایا گیا ہے، اس کے عقائد و نظریات سے عورت کا متاثر ہو جانا مستبعد نہیں، اس لئے اگر مسلمان عورت غیر مسلم کتابی کے نکاح میں رہے تو اس کے عقائد خراب ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے، بخلاف اس کے کہ غیر مسلم کتابی عورت مسلمان کے نکاح میں رہے تو اس کے خیالات کا اثر شوہر پر پڑنا اصولاً مستبعد ہے، کوئی بے اصول اور افراط کا شکار ہو جائے یہ اس کا اپنا قصور ہے۔

چوتھی بات قابل غور یہ ہے کہ ازدواجی تعلقات میں جو کچھ اثر ہوتا ہے وہ طرفین پر یکساں ہوتا ہے، اس لئے جیسے یہ اندیشہ ہے کہ مسلمان کے عقائد غیر مسلم سے متاثر ہو جائیں اسی طرح یہ بھی قوا احتمال ہے کہ معاملہ برعکس ہو، غیر مسلم کے عقائد مسلمان سے متاثر ہو جائیں وہی اسلام قبول کر لے تو اس کا مقتضایہ ہے کہ مسلم و غیر مسلم کے ازدواجی تعلقات کو ممنوع نہ کیا جائے۔

لیکن یہاں بحث کی بات یہ ہے کہ جب کسی چیز میں ایک نفع کی امید بھی ہو اور کسی ضرر کا خطرہ بھی ہو تو عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ ضرر سے بچنے کا اہتمام نفع کی فکر سے زیادہ ضروری ہے، غار کا ایک حکیمانہ مقولہ مشہور ہے کہ عقل مند تریاق بیعتین دزہر گہاں بخور دے اس لئے اس نفع کی امید کو نظر انداز کیا گیا کہ شاید وہ غیر مسلم متاثر ہو کر اسلام قبول کر لے، اہتمام اس کا کیا گیا کہ مسلمان متاثر ہو کر کفر میں مبتلا نہ ہو جائے۔

پانچویں بات قابل غور یہ ہے کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے مسلمان مردوں کو نکاح کی اجازت کے بھی معنی یہ ہیں کہ اگر نکاح کر لیا جائے تو نکاح صحیح ہو جائے گا، اولاد ثابت ہو جائے گی، لیکن روایات حدیث اس پر شاہد ہیں کہ یہ نکاح بھی پسندیدہ نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کو اپنے نکاح کے لئے دیندار صالح عورت تلاش کرنا چاہئے تاکہ خود اس کے لئے بھی دین میں معین ثابت ہو، اور اس کی اولاد کو کم زور دیندار ہونے کا موقع میسر نہ آئے، اور جب غیر مسلم مسلمان عورت سے نکاح پسند نہیں کیا گیا تو یہ غیر مسلم سے کیسے پسند کیا جاتا، یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جب غیر مسلم عورتی عراق دشنام کے مسلمانوں میں کچھ ایسے اندیشے

کی کثرت ہونے لگی تو بذریعہ مشرمان اُن کو اس سے روک دیا گیا، اور اس پر توجہ دلائی گئی کہ یہ ازدواجی تعلق دینا نہ بھی مسلم گھرانوں کے لئے خرابی کا سبب ہے، اور سیاست بھی در کتاب الآثار (علامہ محمدؒ) اور آج کے غیر مسلم اہل کتاب یہودی و نصاریٰ اور ان کے سیاسی مفکر و فریب اور سیاسی شادیاں اور مسلم گھرانوں میں داخل ہو کر ان کو اپنی طرف مائل کرنا اور ان کے راز حاصل کرنا وغیرہ جس کا استرا خود بعض مسیحی مصنفین کی کتابوں میں میجر جنرل اکبر کی کتاب حدیث و فاع میں اس کی کچھ تفصیلات حوالوں کے ساتھ مذکور ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاردن اعظم کی دور میں نظریں ان واقعات کو دیکھ رہی تھیں خصوصاً اس زمانہ کے یورپ کے اکثر وہ لوگ جو عیسائی یا یہودی کہلاتے جاتے ہیں، اور مردم شماری کے رجسٹروں میں ان کی قومیت عیسائی یا یہودی لکھی جاتی ہے اگر ان کے مالا کی تحقیق کی جائے تو ان میں بکثرت ایسے لوگ ملیں گے جن کو عیسائیت اور یہودیت سے کوئی تعلق نہیں وہ بالکل ملحد بے دین ہیں، نہ عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں نہ انجیل کو، نہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان ہے نہ تورات پر نہ خدا تعالیٰ پر نہ آخرت پر ظاہر ہے کہ علمت نکاح کا استرانی حکم ایسے لوگوں کو شامل نہیں، ان کی عورتوں سے نکاح قطعاً حرام ہے ایسے لوگ ظاہر ہے کہ آیت قرآن وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُذِنَ لَكُنَّ بِهِنَّ مَا كَانَ لَكُمْ بِهِمْ حَتَّىٰ يُنْفِقَا خُدَّائِهِمَا مِمَّا كَانُوا لَهُمْ (نساء: ۳۵) کے تحت داخل نہیں ہوتے، غیر مسلموں کی طرح ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح بھی قطعاً حرام ہے۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحْضِيِّ قُلْ هُوَ أَذَىٰ فَأَعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي

اور جو سے بچتے ہیں حکم حیض کا کہہ دے وہ گندگی ہے سو تم الگ رہو عورتوں سے چھٹ

الْمَحْضِيَّ وَلَا تَقْرَبُوا هُنَّ حَتَّىٰ يَطْهَرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ

کے وقت اور نزدیک نہ ہوا ان کے جب تک پاک نہ ہوئیں پھر جب خوب پاک ہو جاویں تو جاذبان کے

مِنْ حَيْثُ أَمَرَ اللَّهُ مَا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ

پاس جہاں سے حکم دیا تم کو اللہ نے بیشک اللہ کو پسند آتے ہیں تو بہ کرنے والے اور پسند آتے ہیں

الْمُتَطَهِّرِينَ ﴿۲۰﴾ نِسَاءُ كُمُ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاَنْتُمْ حَرْثُ كُمْ اَنْتُمْ

گندگی سے بچنے والے، تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں سو جاذ اپنی کھیتی میں جہاں سے

سَلَّمْتُمْ زَوْقًا مَّا اَلَا نَفْسِكُمْ وَاقْرَءُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوا اَنَّكُمْ

چاہو اور آگے کی تدبیر کرو اپنے واسطے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ تم کو

مَلِكُكُمْ وَكَثِيرٌ مِّنْكُمْ مِّنْكُمْ

اس سے ملنا ہو اور خوش خبری سننا ایمان والوں کو

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۱۹، حیض میں جماع (۲۰) وَكَثِيرٌ مِّنْكُمْ مِّنْكُمْ (۲۱) اور لوگ

کی عزت اور پاکی کی شرائط آپ سے حیض کی حالت میں صحبت وغیرہ کرنے کا حکم پوچھتے ہیں، آپ

فرما دیجئے کہ وہ (حیض) اندک کی چیز ہے، تو حالت حیض میں عورتوں کے ساتھ صحبت کرنے سے

علحدہ رہا کرو اور اس حالت میں، ان سے قربت مت کرو جب تک وہ (حیض) پاک نہ ہو جاوے

پھر جب وہ (عورتیں) اچھی طرح پاک ہو جاویں کہ ناپاکی کا شک شبہ نہ رہے (تو ان کے پاس

آ جاؤ لیکن ان سے صحبت کرو) جس جگہ سے تم خدا تعالیٰ نے اجازت دی ہے (یعنی آگے سے)

بقیہ اللہ تعالیٰ بحسب رکھتے ہیں تو بہ کرنے والوں سے (مثلاً اتفاقاً یا بے احتیاطی سے حالت

حیض میں صحبت کر بیٹھا پھر متنبہ ہو کر قریب کر لی) اور صحبت رکھتے ہیں پاک سات رہنے والوں سے (جو

حالت حیض میں صحبت کرنے سے اور دوسرے مہیات سے بچتے ہیں، اور حالت پاکی میں اجازت

صحبت کی دینا پھر اس قید سے اجازت دینا کہ آگے کے موقع میں صحبت ہو اس لئے کہ تمہاری بیوی

تمہارے لئے (بمنزلہ) کمیت کے ہیں (جس میں لطف بھائے تم کے اور بچہ بھائے پیداوار کے ہے)

سو اپنے کمیت میں جس طرف سے چاہو آزاد اور جس طرح کھیتوں میں اجازت ہے اسی طرح

بیویوں کے پاس پاکی کی حالت میں ہر طرف سے آنے کی اجازت ہے خواہ کر دے ہو یا پیچھے

سے یا آگے بیٹھ کر ہو یا اوپر یا نیچے لیٹ کر ہو، یا جس ہیئت سے ہو، مگر آنا ہو ہر حال میں کمیت

کے اندر کہ وہ خاص آگے کا موقع ہے، کیونکہ پیچھے کا موقع کمیت کے مشابہ نہیں، اس میں صحبت

نہ ہو، اور ان لذات میں ایسے مشغول مت ہو جاؤ کہ آخرت ہی کو بھول جاؤ، بلکہ آئندہ کے واسطے

اپنے لئے کھلا اعمال صالحہ کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ سے ہر حال میں ڈرتے رہو، اور یہ یقین رکھو

کہ بے شک تم اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے والے ہو اور اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسے

ایمان داروں کو جو نیک کام کریں، خدا سے ڈریں، خدا تعالیٰ کے سامنے جائے کافین رکھیں (جوئی

کی خبر سننا دیجئے کہ ان کو آخرت میں ہر طرح کی نعمتیں ملیں گی)۔

وَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَتَّقُوا وَتُصَلُّوا

اور مت بناؤ اللہ کے نام کو نشان اپنی قسمیں کھانے کے لئے کہ سلوک کرنے سے اور پرہیزگاری اور رکوع

بَيْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۸﴾

میں سلوک کرنے سے بچ جاؤ اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۸، ایک کام نہ کرنے اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں کے ذریعہ سے ان امور کا حجاب مت بناؤ کہ تم نبی کے اور کی قسم کی ممانعت تقویٰ کے اور اصلاح فیما بین خلق کے کام کرو یعنی اللہ کے نام کی قسم نہ کھاؤ کہ تم بینک کام نہ کریں گے، اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتے جانتے ہیں (تو زبان سنبھال کر بات کرو، اور دل میں برائیالات مت لادو)

لَا يُؤْخَذُ كُمْ بِالْعُفْوٰی اَیْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ یُّؤْخَذُ كُمْ

بِیْمَانِكُمْ بِمَا كَسَبْتُمْ فَاُولٰٓئِكَ مَكْحُوۡمٌ ۝۲۸ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۲۹﴾

جس کا قصہ کیا تمہارے دلوں نے اور اللہ بخشنے والا تحمل کرنے والا ہے

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۹، بھڑائی قسمیں کھانیکا حکم اللہ تعالیٰ تم پر آخرت میں دار دیگر نہ فرماویں گے تمہاری قسموں میں ایسی بیہودہ قسم پر جس میں بلا قصد جھوٹ بولا گیا،

لیکن دار دیگر نہ فرما دیں گے اس بھڑائی قسم پر جس میں تمہارے دلوں نے جھوٹ بولنے کا ارادہ کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ غفور ہیں کہ ایسی بیہودہ قسم پر دار دیگر نہ فرمائی، حلیم ہیں کہ قصداً بھڑائی قسم کھانے کی سزا میں آخرت تک کی ہلست دی

لَّذِیۡنَ یُّؤْلُوۡنَ مِنْ نِّسَابِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ

جو لوگ قسم کھا لیتے ہیں اپنی عورتوں کے پاس جانے سے ان کے لئے ہلست ہر چار مہینے کی پھر اگر

فَاَعُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۳۰﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ

اہم مل گئے تو اللہ بخشنے والا ہنس رہا ہے، اور اگر ٹھہرایا چھوڑ دیجئے کہ

فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۹﴾

تو بیشک اللہ سنتے والا جانتے والا ہے

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۹، ایلا رکا حکم اللہ تعالیٰ (الی قول) سَمِيعٌ عَلِیۡمٌ یعنی جو لوگ (مطلقہ مدت یا چار ماہ یا زائد مدت کے لئے) قسم کھا جیتے ہیں اپنی بیبیوں کے پاس جانے سے ان کیلئے

چار مہینے تک کی ہلست ہے سوا اگر ان چار مہینے کے اندر یہ لوگ (اپنی قسم کو توڑ کر عورت کی طرف) رجوع کریں تب تو نکاح باقی رہے گا اور اللہ تعالیٰ (ایسی قسم کو توڑنے کا گناہ و کفارہ سے) معاف کر دیں گے (اور چرکہ اب باقی کے حقوق ادا کرنے کا اس پر وقت فراہم کرے، اور اگر بالکل چھوڑ ہی دینے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے (اور اس لئے چار ماہ کے اندر قسم توڑ کر رجوع نہیں کیا) تو دوبارہ گزرتے ہی قطعی طلاق پڑ جائیگی اور اللہ تعالیٰ (ان کی قسم کو بھی) سنتے ہیں (اور ان کے اس پختہ ارادے کو بھی) جانتے ہیں (اس لئے اس کے متعلق حکم مناسب ارشاد فرمایا)۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوۡنٍ ۚ وَلَا یَحِلُّ

اور طلاق والی عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو تین حیض تک اور ان کو حلال

لَهُنَّ اَنْ یَّكُنَّ مِنْ مَّا خَلَقَ اللّٰهُ فِیۡ اَسْرَ حَاوِیٰتٍ اِنْ كُنَّ یُؤْمِنُ

ہیں کہ چھار رکھیں جو پیدا کیا اللہ نے ان کے پیٹ میں اگر وہ ایمان رکھتی ہیں

بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَبُعُوۡلَتُهُنَّ اَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْا

اللہ پر اور پہلے دن پر اور ان کے خاوند حق رکھتے ہیں ان کے واپس لینے کا اس وقت میں اگر چاہیں

اِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیۡ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ

سلوک سے رہنا، اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے دستور کے موافق اور مردوں کو

عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ۚ وَاللّٰهُ عَزِیۡزٌ حَكِیۡمٌ ﴿۳۰﴾

عورتوں پر فضیلت ہے، اور اللہ زبردست ہے تدبیر والا۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۰، مطلقہ (الی قول) اِنْ اَرَادُوْا اِصْلَاحًا اور طلاق دی ہوئی عورتیں جن میں اتنی صفتیں ہوں، خاوند نے ان سے صحبت یا خلوت چھوڑ کی ہو

وَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَتَّقُوا وَتُصَلُّوا

اور مت بناؤ اللہ کے نام کو نشان اپنی قسمیں کھانے کے لئے کہ سلوک کرنے سے اور پرہیزگاری اور رکوع

بَيْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۴﴾

میں سلوک کرنے سے بچ جاؤ اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۴، ایک کام نہ کرنے اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں کے ذریعہ سے ان امور کا حجاب مت بناؤ کہ تم نبی کے اور کی قسم کی ممانعت تقویٰ کے اور اصلاح فیما بین خلق کے کام کرو یعنی اللہ کے نام کی قسم نہ کھاؤ کہ تم بینک کام نہ کریں گے، اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتے جانتے ہیں (تو زبان سنبھال کر بات کرو، اور دل میں برائیالات مت لادو)

لَا يُؤْخَذُ كُمْ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤْخَذُ كُمْ

بیش پکڑنا تم کو اللہ بیہودہ قسموں پر تمہاری، لیکن پکڑنا ہے تم کو ان قسموں پر

بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿۲۵﴾

جس کا قصد کیا تمہارے دلوں نے اور اللہ بخشنے والا تحمل کرنے والا ہے

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۵، بھوٹی قسمیں کھانیکا حکم اللہ تعالیٰ تم پر آخرت میں دار دیگر نہ فرماویں گے تمہاری قسموں میں ایسی بیہودہ قسم پر جس میں بلا قصد جھوٹ بولا گیا،

لیکن دار دیگر نہ فرما دیں گے اس بھوٹی قسم پر جس میں تمہارے دلوں نے جھوٹ بولنے کا ارادہ کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ غفور ہیں کہ ایسی بیہودہ قسم پر دار دیگر نہ فرمائی، حلیم ہیں کہ قصداً جھوٹی قسم کھانے کی سزا میں آخرت تک کی ہلست دی

لَّذِينَ يُؤْلُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ

جو لوگ قسم کھا لیتے ہیں اپنی عورتوں کے پاس جانے سے ان کے لئے ہلست ہر چار مہینے کی پھر اگر

فَاعَوْذُوا فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۲۶﴾ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ

اہم مل گئے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے، اور اگر ٹھہرایا چھوڑ دیجئے کہ

فَإِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۶﴾

تو بیشک اللہ سنتے والا جانتے والا ہے

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۶، ایلا رکا حکم لِّلَّذِينَ يُؤْلُونَ (الی قول) سَمِيعٌ عَلِيمٌ یعنی جو لوگ (بلا قصد و ہمت یا چار ماہ یا زائد مدت کے لئے) قسم کھا جیتے ہیں اپنی بیبیوں کے پاس جانے سے ان کیلئے

چار مہینے تک کی ہلست ہے سوا اگر ان چار مہینے کے اندر یہ لوگ (اپنی قسم کو توڑ کر عورت کی طرف رجوع کریں) تب تو نکاح باقی رہے گا اور اللہ تعالیٰ (ایسی قسم کو توڑنے کا گناہ و کفارہ سے) معاف کر دیں گے (اور چرک اب باقی کے حقوق ادا کرنے کا اس پر وقت فراہم کرے، اور اگر بالکل چھوڑ ہی دینے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے (اور اس لئے چار ماہ کے اندر قسم توڑ کر رجوع نہیں کیا) تو دوبارہ گزرتے ہی قطعی طلاق پڑ جائیگی اور اللہ تعالیٰ (ان کی قسم کو بھی) سنتے ہیں (اور ان کے اس پختہ ارادے کو بھی) جانتے ہیں (اس لئے اس کے متعلق حکم مناسب ارشاد فرمایا)۔

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ وَلَا يَحِلُّ

اور طلاق وال عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو تین حیض تک اور ان کو حلال

لَهُنَّ أَنْ يَكُنَّ مِمَّنْ مَّا خَلَقَ اللّٰهُ فِي أَسْرَاحِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنُ

ہیں کہ چھار رکھیں جو پیدا کیا اللہ نے ان کے پیٹ میں اگر وہ ایمان رکھتی ہیں

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبَعُولَهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

اللہ پر اور پہلے دن پر اور ان کے خاوند حق رکھتے ہیں ان کے واپس لینے کا اس وقت میں اگر چاہیں

إِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ

سلوک سے رہنا، اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے دستور کے موافق اور مردوں کو

عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۷﴾

عورتوں پر فضیلت ہے، اور اللہ زبردست ہے تدبیر والا۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۷، مطلقہ وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ (الی قول) إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا اور طلاق دی ہوئی مدت اربعہ مہینے کیان عورتیں جن میں اتنی صفتیں ہوں، خاوند نے ان سے صحبت یا خلوت چھوڑ چکی ہو

ان کو جین آتا ہو، آزاد ہو، یعنی شرعی قاعدہ سے لونڈی نہ ہوں) اپنے آپ کو نکاح سے روکے رکھیں، تین جین ختم ہوئے) تنگ (اور اس کو عزت کہتے ہیں) اور ان عورتوں کو یہ بات حلال نہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ ان کے رحم (بچہ دان) میں پیدا کیا ہو (خواہ صل ہو یا جین) اس کو پوشیدہ کریں (کیونکہ اس کے پوشیدہ کرنے سے عزت کا حساب غلط ہو جاوے گا) اگر وہ عورتیں اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر یقین رکھتی ہیں (جو اس کے کہ اس یقین کا مقتضایہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈریں کہ قیامت میں نافرمانی پر سزا نہ ہو جاوے) اور ان عورتوں کے شوہر (جب کہ ان کو طلاق رجعی ملے ہو جس کا بیان آگے آئے گا) ان کے (بلا تجد نکاح) پھر نکاح لینے کا حق رکھتے ہیں اس عزت کے اندل اور اس کو نکاح لینے کو رجعت کہتے ہیں) بشرطیکہ رجعت کرنے سے (اصلاح کا قصد رکھتے ہوں) (ورنہ تنگ کرنے کے لئے رجعت کرنا لا حاصل ہے، مگر رجعت تو ہو ہی جاوے گی اور یہ حکم اصلاح کا اس لئے کیا گیا کہ) عورتوں کے حقوق ہیں (مردوں پر) جو کہ دفع و جوب ہیں، مثل اپنی کے حقوق کے ہیں جو ان عورتوں پر ہیں (مردوں کے کہ ان کو) قاعدہ (شرعی) کے موافق (داد کیا جاوے) اور راتنی بات ضرور ہے کہ مردوں کا ان کے مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے (اس لئے ان کے حقوق کی نوعیت عورتوں کے حقوق کی نوعیت سے بڑھی ہوئی ہے) اور اللہ تعالیٰ تو ہر دست رحاکم) ہیں۔ (اور حکیم رہیں) ہیں۔

مسائل متعلقہ آیت (۱) اگر غلبہ شہوت سے حالت جین میں صحبت ہو گئی، تو خوب تو بہ کرنا از بیان العشر آں واجب ہے اور کچھ خیر خیرات بھی دیدے تو زیادہ بہتر ہے۔

(۲) پیچھے کے موقع میں اپنی بی بی سے بھی صحبت کرنا حرام ہے۔

(۳) لغو قسم کے رد معنی ہیں، ایک تو یہ کہ کسی گزری ہوئی بات پر جھوٹی قسم بلا ارادہ کل گئی، یا کھلی تو ارادے سے، مگر اس کو اپنے گمان میں صحیح سمجھتا ہے جیسے اپنے علم و گمان کے مطابق قسم کھا بیٹھا کہ زیادہ آگیا جو اور واقع میں وہ نہ آیا تھا، یا آئندہ بات پر اس طرح قسم کل گئی کہ کہنا چاہتا تھا کچھ اور بے ارادہ منہ سے قسم کل گئی اس میں گناہ نہیں ہوتا، اور اس کو اس واسطے توبہ کہتے ہیں آخرت میں اس پر مواخذہ نہیں ہوگا، اور اس کے مقابلہ میں جس پر مواخذہ ہونے کا ذکر منسخر مایا ہے یہ وہ قسم ہے جو قصداً جھوٹی سمجھ کر کھائی ہو اس کو غلو تس کہتے ہیں، اس میں گناہ ہوتا ہے، مگر امام ابو حنیفہ کے نزدیک کفارہ نہیں آتا، اور لغو بالمعنی اللہ کو میں ہر درجہ اولیٰ کفارہ نہیں، اس آیت میں انہی دونوں کا بیان ہے، جن میں کفارہ نہیں۔

دوسرے معنی لغو کے یہ ہیں جس پر کفارہ نہ ہو اور اس کو لغو اس لئے کہیں گے کہ مواخذہ نہ رہی یعنی کفارہ اس پر نہیں آتا، اس معنی کے لحاظ لفظ لغو لغو تس کو بھی شامل ہے، کہ اس میں

اگرچہ گناہ ہوتا ہے لیکن کفارہ نہیں آتا، اس کے مقابلہ میں وہ قسم جس پر کفارہ بھی آتا ہو منعقد کہلاتی ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ قصداً یوں قسم کھائے کہ میں فلاں فعل کروں گا، یا فلاں کام نہ کروں گا اس میں خلاف کرنے سے کفارہ لازم آتا ہے۔

(۴) اگر کوئی قسم کھائے کہ اپنی بیوی سے صحبت نہ کروں گا اس کی چار صورتیں ہیں: ایک یہ کہ کوئی مدت معین نہ کرے، دوم یہ کہ چار مہینے کی مدت کی قید لگا دے، سوم یہ کہ چار ماہ سے زیادہ کی مدت کی قید لگا دے، چہارم یہ کہ چار ماہ سے کم کی مدت کا نام لے، پس صورت اول، دوم اور سوم کو شرع میں ایلا کہتے ہیں، اور اس کا حکم یہ ہے کہ اگر چار ماہ کے اندر اپنی قسم توڑ ڈالے اور بیوی کے پاس چلا آوے تو قسم کا کفارہ ادا کرنا باقی ہے، اور اگر چار ماہ گزر گئے اور قسم نہ توڑی، تو اس عورت پر قطعی طلاق پڑ گئی، یعنی بلا نکاح رجوع کرنا درست نہیں رہا، البتہ اگر دونوں رضامندی سے پھر نکاح کر لیں تو درست ہے، حنبلہ کی ضرورت نہ ہوگی، اور چوتھی صورت کا حکم یہ ہے کہ اگر قسم توڑے تو کفارہ لازم ہوگا، اور اگر قسم پوری کر لی جب بھی نکاح باقی ہے، (بیان القرآن)

معارف و مسائل

مرد و عورت کے فرق اور میاں بیوی کے باہمی حقوق و درجات پر ایک ایک جامع آیت

وَلَقَدْ مِثْلُ الَّذِي نِيَّ عَلَيْهِمْ بِالْمَعْقُودِ مِنَ الْآيَةِ، یہ آیت عورتوں اور مردوں کے باہمی حقوق و درجات پر ایک شرعی ضابطہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد کئی دکر تک اسی ضابطہ کی اہم جزئیات کا بیان ہوا ہے۔

اسلام میں عورت کا موقف | اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے عورت کے اس موقف کی کچھ تشریح کر دی جائے جو اسلام نے اس کو عطا کیا ہے، جس کو سمجھ لینے کے بعد یقینی طور پر اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ایک عادلانہ اور معتدل نظام کا مقتضی یہی تھا، اور یہی وہ مقام ہے جس سے ادنیٰ پنج یا انحراف انسان کے دین و دنیا کے لئے عظیم خطرہ بن جاتا ہے۔

غور کیا جائے تو دنیا بھر دو پیریں ایسی ہوتی ہیں جو اس عالم کی بقا اور تعمیر و ترقی میں عود کا درجہ رکھتی ہیں، ایک عورت، دوسرے دولت، لیکن تصویر کا دوسرا رخ دیکھا جائے تو یہی دونوں چیزیں دنیا میں فساد و خون ریزی اور طرح طرح کے فتنوں کا سبب بھی ہیں، اور غور کرنے سے اس نتیجہ پر پہنچنا کچھ دشوار نہیں کہ یہ دونوں چیزیں اپنی اصل میں دنیا کی تعمیر و ترقی اور اس کی رونق کا ذریعہ ہیں، لیکن جب کہیں ان کو اپنے اصلی مقام اور موقف سے اِدھر اُدھر کر دیا جاتا ہے تو یہی

چیزیں دنیا میں سب سے بڑا زلزلہ بھی ہن جاتی ہیں۔

فترآن نے انسان کو نظام زندگی دیا ہے اس میں ای دو لون چیسروں کو اپنے اپنے صحیح مقام پر ایسا رکھا گیا ہے کہ ان کے فوائد و عزائم زیادہ سے زیادہ حاصل ہوں اور فتنہ و فساد کا نام نہ رہے۔ دولت کا صحیح مقام اس کے حاصل کرنے کے ذرائع اور خرچ کرنے کے طریقے اور تقسیم دولت کا عادلانہ نظام یہ ایک مستقل علم ہے جس کو "اسلام کا معاشی نظام" کہا جاسکتا ہے اس کا بیان اللہ کسی اور موقع پر ہوگا، احقر کا مطبوعہ رسالہ "تقسیم دولت" بھی ضروری اشارات کا کام دے سکتا ہے۔

اس وقت عورت اور اس کے حقوق و فرائض کا ذکر ہے اس کے متعلق آیت مذکورہ میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جس طرح عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں جن کی ادائیگی ضروری ہے اسی طرح مردوں پر عورتوں کے حقوق ہیں جن کا ادا کرنا ضروری ہے، ہاں اتنا فرق ضروری ہے کہ مردوں کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے اور تقریباً ہی مضمون سورۃ نسا کی آیت میں اس طرح آیا ہے۔

الزَّكَاةَ ۖ قُلُومًا مِّنْ عَمَلِكُمْ ۚ وَبِالْوَدَّاعَةِ ۚ	یعنی مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس واسطے
فَقَضَلْنَا مِنَّمَا تَكُونُ عَلَيْهِمْ قُلُومًا ۚ وَبِالْوَدَّاعَةِ ۚ	کہ بڑائی اللہ نے دی ایک کو ایک پر اور
بِمَا أَتَقَرَّبُوا إِلَيْهِمْ ۚ وَأَمَّا إِلَيْهِمْ ۚ	اس واسطے کہ خرچ کئے انہوں نے اپنے مال

اسلام سے پہلے معاشرہ اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں تمام دنیا کی اقوام میں جاری تھا کہ عورت میں عورت کا درجہ کی حیثیت مگر طوطی استعمال کی اشیاء سے زیادہ نہ تھی، چوبازوں کی طرح اس کی خیر و فردخت ہوتی تھی، اس کو اپنی شادی سیاہ میں کسی قسم کا کوئی اختیار نہ تھا، اس کے ادبیا جس کے حوالے کر دیتے رہاں جانا پڑتا تھا، عورت کو اپنے رشتہ داروں کی میراث میں کوئی حصہ نہ ملتا تھا بلکہ وہ خود مگر طوطی اشیاء کی طرح مالی وراثت بھی جاتی تھی، وہ مردوں کی ملکیت تصور کی جاتی تھی، اس کی ملکیت کسی چیسر پر نہ تھی، اور جو چیزیں عورت کی ملکیت کہلاتی تھیں ان میں اس کو مرد کی اجازت کے بغیر کسی قسم کے تصرف کا کوئی اختیار نہ تھا ہاں اس کے شوہر کو ہر قسم کا اختیار تھا کہ اس کے مال کو جہاں چاہے اور جس طرح چاہے خرچ کر ڈالے، اس کو پوچھنے کا بھی کوئی حق نہ تھا، یہاں تک کہ یورپ کے وہ مالک جو آجکل دنیا کے سب سے زیادہ تمدن ملک سمجھے جاتے ہیں ان میں اب بھی اگر اس حد کو پہنچے ہوئے تھے کہ عورت کے انسان ہونے کو بھی تسلیم نہ کرتے تھے۔

عورت کے لئے دین و مذہب میں بھی کوئی حصہ نہ تھا نہ اس کو عبادت کے قابل سمجھا جاتا تھا نہ جنت کے، آدمی کی بعض مجلسوں میں باہمی مشورہ سے یہ طے کیا گیا تھا کہ وہ ایک ناپاک جانور ہے جس میں روح نہیں، عام طور پر باپ کے لئے لڑکی کا قتل بلکہ زندہ درگور کر دینا جائز سمجھا جاتا تھا،

بلکہ یہ عمل باپ کے لئے عزت کی نشانی اور شرافت کا معیار تصور کیا جاتا تھا، بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ عورت کو کوئی بھی قتل کر دینے نہ تو اس پر قصاص واجب ہے نہ خون بہنا، اور اگر شوہر مر جائے تو بیوی کو بھی اس کی لاش کے ساتھ جلا کر سستی کر دیا جاتا تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بعد اور آپ کی نبوت سے پہلے مششہ میں فرانس نے عورت پر یہ احسان کیا کہ بہت سے اختلافات کے بعد یہ تسرار داد پاس کی کہ عورت ہے تو انسان مگر وہ صرف مرد کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ الغرض پوری دنیا اور اس میں بسنے والے تمام اقوام و مذاہب نے عورت کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہوا تھا کہ جس کو من کر بدن کے گرد گئے کھڑے ہو جاتے ہیں، اس بیچاری مخلوق کے لئے نہ کہیں عقل دانٹ سے کام لیا جاتا تھا نہ عدل و انصاف سے۔

قربان جاتیے رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے لئے ہونے دین حق کے جس نے دنیا کی آنکھیں کھولیں، انسان کو انسان کی قدر کرنا سکھایا، عدل و انصاف کا قانون جاری کیا، عورتوں کے حقوق مردوں پر ایسے ہی لازم کئے جیسے عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں، اس کو آزاد و خود مختار بنایا، وہ اپنی جان و مال کی ایسی ہی مالک مسترادی تھی جیسے مرد کوئی شخص خواہ باپ دادا ہی ہو بالغ عورت کو کسی شخص کے ساتھ نکاح پر مجبور نہیں کر سکتا، اور اگر بلا اس کی اجازت کے نکاح کر دیا جائے تو وہ اس کی اجازت پر موقوف رہتا ہے، اگر نا منظور کر دے تو باطل ہو جاتا ہے، اس کے اموال میں کسی مرد کو بغیر اس کی رضا و اجازت کے کسی تصرف کا کوئی حق نہیں، شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد وہ خود مختار ہے کوئی اس پر جبر نہیں کر سکتا، اپنے رشتہ داروں کی میراث میں اس کو بھی ایسا ہی حصہ ملتا ہے جیسا کہ کون کو، اس پر خرچ کرنے اور اس کے راضی رکھنے کو شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے ایک عبادت قرار دیا، شوہر اس کے حقوق واجبہ ادا نہ کرے تو وہ اسلامی عدالت کے ذریعہ اس کو ادا، حقوق پر دردمندان پر مجبور کر سکتی ہے۔

عورتوں کو مردوں کی سیادت اور عورت کو اس کے حقوق مناسبہ نہ دینا ظلم و جور اور قساوت و شقاوت و نگرانی سے بالکل آزاد کر دینا بھی تھی جس کو اسلام نے مثایا ہے، اسی طرح ان کو کھلے ہمارے چھوڑ دینا خواہ مال کا بہت بڑا سبب ہے اور مردوں کی نگرانی و سیادت سے آزاد کر دینا، اس کو اپنے گزارے اور معاش کا خود مشغل بنانا بھی اس کی حق تلفی اور بربادی ہے نہ اس کی ساخت اس کی متعل ہے اور نہ مگر بلو کانون کی ذمہ داری اور اولاد کی تربیت کا عظیم الشان کام جو فطرۃ اس کے سپرد ہے وہ اس کا متعل ہے۔

علاوہ ازیں مردوں کی سیادت و نگرانی سے نکل کر عورت پورے انسانی معاشرہ کے لئے خطۃ عظیم ہے جس سے دنیا میں نساد و خون ریزی اور طرح طرح کے فتنے پیدا ہوتا لازمی اور روزمرہ کا مشاہدہ

ہے، اس لئے قرآن کریم نے عورتوں کے حقوق و واجبات کے بیان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ
وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ كَبِيرٌ اور دوسرے لفظوں میں
یہ کہ مردان کے نگران اور ذمہ دار ہیں۔

مگر جس طرح اسلام سے پہلے جاہلیتِ اولیٰ میں اقوامِ عالم سب اس غلطی کا شکار تھیں کہ
عورتوں کو ایک گھریلو سامان یا چوپایہ کی حیثیت میں رکھا ہوا تھا، اسی طرح اسلام کے زمانہ انصاف
میں جاہلیتِ آخری کا دور شروع ہوا، اس میں پہلی غلطی کا ردِ عمل اس کے بالمقابل دوسری غلطی کی
صورت میں کیا جا رہا ہے، کہ عورتوں پر مردوں کی اتنی سیادت سے بھی چشمِ کارا حاصل کرنے اور کراہ
کی سبب مسلسل جاری ہے، جس کے نتیجے میں غم و بے حیائی عام ہو گئی، دنیا جھگڑوں اور فساد کا گھر
بن گئی، قتل و خون ریزی کی اتنی کثرت ہو گئی کہ جاہلیتِ اولیٰ کو مات دیدی، عرب کا مشہور مقولہ کہ
”أَلْبَاهِنُ أَمَّا مَطْلُكُ أَوْ مُمْلِكُكَ“ (دین جاہل آدمی کبھی اعتدال پر نہیں رہتا، اگر افراط یعنی
حد سے زیادہ کرنے سے باز آتا ہے تو کوتاہی اور تقصیر میں مبتلا ہو جاتا ہے)۔

یہی حال اس وقت ابنائے زمانہ کا ہے کہ یا تو عورت کو انسان کہنے اور سمجھنے کے لئے بھی تیار
نہ تھے اور آگے بڑھے تو یہاں تک پہنچے کہ فردوں کی سیادت و نگرانی جو فردوں عورتوں اور پوری
دنیا کے لئے عین حکمت و مصلحت ہے اس کا بخرا بھی گردن سے اُٹا رہا جا رہا ہے، جس کے نتائج بد و نازد
آنکھوں کے سامنے آ رہے ہیں، اور یقین کیجئے کہ جب تک وہ قرآن کے اس ارشاد کے سامنے نہ جھکیں
ایسے فتنے روز بڑھتے رہیں گے۔

آج کی حکومتیں دنیا میں قیام امن کے لئے روز نئے نئے قانون بناتی ہیں، اس کے لئے
نئے نئے ادارے قائم کرتی ہیں، کروڑوں روپیہ ان پر صرف ہوتا ہے، لیکن فتنے جس چٹھے سے پھوٹ
رہے ہیں اس کی طرف دھیان نہیں دیتیں، اگر آج کوئی کمیشن اس تحقیق کے لئے بٹھایا جائے کہ
فساد و خون ریزی اور باہمی جنگ و جدل کے اسباب کی تحقیق کرے تو خیال یہ ہے کہ پچاس فی صد سے
زائد ایسے جرائم کا سبب عورت اور اس کی بے ہمار آزادی نکلتے گی، مگر آج کی دنیا میں نفس پرستی کے
غلبہ نے بڑے بڑے حکماء کی آنکھوں کو خیر کیا ہوا ہے خواہشِ نفسانی کے خلاف کسی مصلحانہ
تدبیر کو گوارا نہیں کیا جاتا۔

اللہ تعالیٰ ہمارے قلوب کو نور فرمائیں اور اپنی کتاب اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ
وسلم کی ہدایات پر پورا عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، کہ وہی دنیا و آخرت میں سرمایہٴ سعادت ہے۔

مسئلہ: اس آیت کے ضمن میں یہ معلوم ہوا کہ ستران حکیم نے زوجین کو ان کے ذمہ
عائد ہونے والے فرائض بتلائے کہ مردوں کے ذمہ عورتوں کے حقوق ادا کرنا ایسا ہی فرض ہے جیسے کہ
عورتوں پر مردوں کے حقوق کا ادا کرنا فرض ہے اس میں اشارہ ہے کہ ہر فریق کو اپنے حقوق کا مطالبہ
کرنے کے بجائے اپنے فرائض پر نظر رکھنا چاہئے، اور اگر وہ ایسا کر لیں تو مطالبہٴ حقوق کا قضیہ ہی دنیا
میں نہیں آئے گا، کیونکہ مرد کے فرائض ہی عورت کے حقوق میں اور عورت کے فرائض ہی مرد کے
حقوق میں، جب فرائض ادا ہو گئے تو خود بخود حقوق ادا ہو جائیں گے، آج کل دنیا کے سارے جھگڑے
یہاں سے چلتے ہیں کہ ہر شخص اپنے حقوق کا مطالبہ تو سامنے رکھتا ہے مگر اپنے فرائض کی ادائیگی سے غافل
اس کا نتیجہ مطالبہٴ حقوق کی جنگ ہوتی ہے جو آج کل عام طور پر حکومتوں اور عوام میں زوجین
میں، اور دوسکراہلِ معاملہ میں چلی ہوئی ہے، قرآن کریم کے اس اشارہ نے معاملہ کے رخ کو یوں بدلا
ہے کہ ہر شخص کو چاہئے کہ اپنے فرائض پورا کرنے کا اہتمام کرے، اور اپنے حقوق کے معاملہ میں
مساہلت اور عفو و درگزر سے کام لے، اگر اس سترانی تعلیم پر دنیا میں عمل ہونے لگے تو گھروں اور
خانہ دانوں کے بلکہ ملکوں اور حکومتوں کے بیشتر نزاعات ختم ہو جائیں۔

مرد و عورت میں درجہ کا تقرب دنیا میں نظامِ عالم اور انسانی فطرت اور خود عورتوں کی مصلحت کا
دنہی معاملات میں ہے، آخرت کی فضیلت میں اس کا کوئی اثر نہیں مگرانی کا نہ صرف حق دیا جائے بلکہ ان پر لازم کیا جائے، اس کا بیان
آیت ”وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ“ میں آیا ہے، لیکن اس سے سب مردوں کا سب عورتوں
سے افضل ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ فضیلت عند اللہ کا تمام ترمذار ایمان اور عمل صالح پر ہے، وہاں
درجات کی ترقی و تہترل ایمان اور عمل کے درجات کے مطابق ہوتا ہے، اس لئے امورِ آخرت میں
یہ ضروری نہیں کہ مردوں ہی کا درجہ عورتوں سے بلند ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے اور حسب تصریح آیات
در روایات ایسا ہو گا بھی کہ بعض عورتیں اپنی طاعت و عبادت کے ذریعہ بہت سے مردوں پر فائق
ہو جائیں گی، ان کا درجہ بہت سے مردوں سے بڑھ جائے گا۔

ستران مجید میں احکامِ شرعیہ اور اعمال کی جزا و سزا اور ثواب و عذاب کے بیان میں اگرچہ
حسب تصریح قرآن کریم عورتیں اور مرد بالکل برابر ہیں اور جن احکام میں کچھ فرق ہے، ان کو مستقل
طور پر وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، لیکن عام طور پر خطاب مردوں کو کیا گیا ہے، اور صیغہ مذکر
کے استعمال کئے گئے ہیں، اور یہ بات صرف قرآن کریم کے ساتھ مخصوص نہیں، عام طور پر حکومتوں کے
قوانین میں بھی صیغہ مذکر کے استعمال کئے جاتے ہیں، حالانکہ قانونِ مرد و عورت کے لئے عام ہوتا ہے
اس کا ایک سبب تو وہی منسوق ہے جس کا ذکر ستران کریم کی آیات میں مذکور ہوا ہے، کہ مردوں کو عورتوں

ہر ایک حیثیت سے تفوق حاصل ہے۔

دوسری بات شاید یہ بھی مضمحل ہو کہ مستورات کے ذکر کے لئے بھی ستر ہی بہتر ہے، لیکن قرآن کریم میں جا بجا مردوں کی طرح عورتوں کا ذکر نہ ہونے سے ان کو خیال پیدا ہوا تو اتم المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا اظہار کیا تو سورۃ احزاب کی یہ آیت نازل ہو گئی۔
 اِنَّ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ
 مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا مستقل ذکر واضح کر دیا گیا کہ طاعت و عبادت اور اس کی وجہ سے حق تعالیٰ کے قرب و رضا اور درجات جنت میں عورتوں کا درجہ مردوں سے کچھ کم نہیں، یہ روایت لسانی ہنسبہ احمد اور تفسیر ابن جریر وغیرہ میں مفصل مذکور ہے۔

اور تفسیر ابن کثیر میں ایک روایت یہ ہے کہ بعض مسلمان عورتیں ازواج مطہرات کے پاس آئیں اور کہا کہ قرآن کریم میں جا بجا مردوں کا ذکر ہے عورتوں میں سے ازواج مطہرات کا بھی مستقل ذکر ہو کر مگر عام مسلمان عورتوں کا ذکر نہیں، اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ دنیوی نظام میں عورتوں پر مردوں کا ایک گونہ تفوق اور حاکمیت اعلیٰ مصلحت اور حکمت کا تقاضا ہے، اور دنیا کی جزائر و سوا اور درجات کا آخرت میں کوئی فرق نہیں۔

قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ بھی مشہور اور بھی وضاحت سے اس طرح مذکور ہے۔
 مِّنْ عَمَلِكُمْ صَالِحَاتٍ
 ذِكْرًا ذُنُوبَكُمْ وَأَن تَكُونَ مِنَ الْخَالِفِينَ
 خیر و طاعت (۹۴: ۱۶)
 اس تمہید کے بعد اصل آیت کے الفاظ پر غور کیجئے، ارشاد فرمایا لَنْ يَخْلُقَ اللهُ لَكُمْ مِثْلًا مِّنْ عَمَلِكُمْ صَالِحَاتٍ
 ان کے حقوق مردوں کے ذمہ ہیں جیسے کہ ان کے ذمہ مردوں کے حقوق ہیں، اس میں عورتوں کے حقوق کا ذکر مردوں کے حقوق سے پہلے کیا جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مرد تو اپنی قوت اور خدا داد تفوق کی بنا پر عورت سے اپنے حقوق وصول کر رہے ہیں، مگر عورتوں کے حقوق کی ہوتی چاہئے، اگر وہ عادتاً اپنے حقوق زبردستی وصول نہیں کر سکتیں۔

دوسرا اشارہ اس میں یہ بھی ہے کہ مردوں کو عورت کے حقوق ادا کرنے میں مبالغہ کرنا چاہئے، اور یہاں جو لفظ "مثل" کے ساتھ دونوں کے حقوق کی مثلیت اور مساوات کا ارشاد ہے اس کا یہ مطلب تو ہو ہی نہیں سکتا کہ جس طرح کے کام مرد کرے اسی طرح کے عورت بھی، یا برعکس کیونکہ مرد عورت میں تقسیم کار اور ہر ایک کے فرائض نظر قضا جدا ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ دونوں کے حقوق کی

اورائیگی یکساں طور پر واجب ہے، اور اس میں کوتاہی اور تفصیر کی سزا بھی یکساں ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ قرآن کریم نے ایک مختصر سے جملے میں ایک عظیم الشان فہم حقوق و فرائض کو کیا سمایا ہے، کیونکہ مہم آیت میں عورتوں کے تمام حقوق مردوں پر اور مردوں کے تمام حقوق عورتوں پر داخل اور شامل ہیں (بحر محیط) اس جملے کے آخر میں ایک لفظ بِالْعُرْوَةِ اور بڑھا کر آپس میں پیش آنے والے جگر وں کا خاتمہ فرما دیا کہ حقوق کی ادائیگی معروف طریقے پر کی جائے، کیونکہ معروف کے معنی یہ ہیں کہ جو مشرقاً بھی منکر و ناجائز نہ ہو اور عام عادات اور عورت کے لحاظ سے بھی اس میں کوئی تشدد اور زیادتی نہ ہو اس کا حاصل یہ ہوا کہ مرد و عورت کے حقوق اور ان کو ازیت سے بچانے کے معاملہ میں خالص ضابطہ پڑی کافی نہیں، بلکہ عام عرف و عادت کے اعتبار سے دیکھا جائے گا کہ اس معاملہ میں دوسرے کو کوئی ایذا یا ضرر تو نہیں پہنچتا جو چیزیں عرف و عادت کے اعتبار سے ایذا اور اضرار کی قرار دی جائیں وہ ممنوع و ناجائز ہوں گی، مثلاً بے رخی، بے اتھالی یا ایسے افعال اور حرکات جن سے دوسرے کو ایذا پہنچے، یہ چیزیں قانونی دفعات میں تو نہیں آسکتیں، مگر بِالْعُرْوَةِ کے لفظ نے ان کا احاطہ کر لیا، اس کے بعد فرمایا ذَلِيلًا عَلَىٰ عَمَلِكُمْ دَرَجَۃً اس کا مشہور مطلب مفہوم تو یہی ہے کہ حقوق طرفین مساوی ہونے کے باوجود حق تعالیٰ نے فردوں کو عورتوں پر ایک درجہ کا تفوق اور حاکمیت عطا فرمادی ہے، اور اس میں بڑی حکمتیں ہیں جس کی طرف آخر آیت کے الفاظ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيْمٌ میں اشارہ فرمایا ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس جملے کا مطلب یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ مردوں کو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے مقابلہ میں بڑا درجہ دیا ہے، اس لئے ان کو زیادہ تحمل سے کام لینا چاہئے کہ اگر عورتوں کی طرف سے ان کے حقوق میں کوئی کوتاہی ہو بھی جائے تو ان کا درجہ یہ ہے کہ یہ اس کو برداشت کریں، اور صبر سے کام لیں، اور ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں (قرطبی)

الْطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ فَاِذَا مَسَّكُمُ الْمَوْتُ وَفِیْ اَوْتَسَرِّحُمْ بِاَحْسَنِ وَا لَا

طلاق جس سے دو بار تک اس کے بعد رکھ لینا موافق دستور کے یا چھوڑ دینا سبیل طرح سے اور تم کو

یَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْ تَاْخُلُوْا مِنْهَا اَنْتُمْ مَّوْهُنٌ شِیْئًا اِلَّا اَنْ يَّخَافَا

روا نہیں کہ لیسو کچھ اپنا دیا ہوا عورتوں سے مگر جبکہ خاندان عورت دونوں ڈریں اس

اَلَا یُقِیْمَا حُلَّ وَا لِّلّٰهِ اِنْ خِفْتُمْ اَلَا یُقِیْمَا حُلَّ وَا لِّلّٰهِ

بات سے کہ قائم نہ رکھ سکیں مگر حکم اللہ کا پھر اگر تم ڈرو اس بات کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں اللہ کا حکم

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا

تو کہہ گناہ نہیں دونوں پر اس میں کہ عورت بدلہ دے جو شوہر سے جدا ہو کر آگے مت رجوع

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝

اور جو کوئی بڑھ چلے اللہ کی باندھی ہوئی حدوں سے سو وہی لوگ ہیں ظالم ، پھر اگر اس عورت کو طلاق

فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدِ مَحْضِيَّتِكَ زَوْجًا غَيْرُهَا فَإِنْ طَلَّقَهَا

دی دینی تیسری بار تو اب حلال نہیں اسکو وہ عورت اس کے بعد جب تک کہ نکاح نہ کرے کسی غرض سے اس کے سوا پھر اگر طلاق دے

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ لَمَّا أَنْ يَقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ وَ

دوسرا خاوند تو کہہ گناہ نہیں ان دونوں پر کہ باہم مل جاویں اگر خیال کریں کہ قائم رکھیں گے اللہ کا حکم اور یہ حدیں

تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝

باندھی ہوئی ہیں اللہ کی بیان فرماتا ہے ان کو واسطے جاننے والوں کے

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۵، طلاق رجعی کی تعداد

طلاق دو مرتبہ کی ہے پھر (دوسرے طلاق دینے کے بعد دوبار اختیار ہے) خواہ (یہ کہ رجعت کر کے عورت کو) قاعدہ کے مطابق رکھ لے (خواہ وہ)

کر رجعت نہ کرے، عذرت پوری ہونے سے (اور اس طرح) اچھے طریقے سے اس کو چھوڑ دے۔

حکم نمبر ۲۶، خلع

اور تہا سے یہ بات معلوم نہیں کہ (تیسریوں کو چھوڑنے کے وقت ان سے) کچھ بھی لو (اگرچہ وہ یہی اسی (مال) میں سے رکھیں نہ ہو جو تم نے (دی ہوئی) ان کو دیا تھا اگر (ایک صورت البتہ حلال ہے)

وہ (یہ کہ) کوئی میاں بیوی ایسے ہوں کہ دونوں کو خطرہ ہو کہ (دوبارہ حقوق زوجیت) وہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ ضابطوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے مگر تم کو (یعنی میاں بیوی کو) یہ خطرہ ہو کہ وہ دونوں ضوابط خداوندی کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہ ہوگا، اس حال کے لینے دینے نہیں جس کو دے کر عورت اپنی جان چھوڑے، (بشرطیکہ ہر سے زیادہ نہ ہو) یہ سب احکام خدائی ضابطے ہیں، تم ان پر

بہرہ نکالنا اور جو شخص خدائی ضابطوں (کو توڑ کر) باہر نکل جائے تو ایسے لوگ اپنا ہی نقصان کرنے والے ہیں۔

حکم نمبر ۲۷، تین طلاقیں کے بعد حلال

پھر اگر (دو طلاقیں کے بعد) کوئی (تیسری) طلاق (دی) دیدے تو پھر وہ عورت اس (تیسری طلاق

دینے کے بعد اس شخص کے لئے حلال نہ ہوگی جب تک وہ اس خاوند کے سوا دوسرے شخص کے ساتھ

عذت کے بعد نکاح نہ کرے، (اور حقوق زوجیت صحبت کے ادا نہ کرے) پھر اگر یہ دوسرا خاوند اس کو طلاق دیدے (اور اس کی عذت بھی گزر جائے) تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ

دوبارہ آپس میں نکاح کر کے بدستور پھر مل جاویں، بشرطیکہ دونوں کو اپنے اوپر یہ اعتماد ہو کہ آئندہ خاوندی ضابطہ کو قائم رکھیں گے اور یہ خاوندی ضابطے ہیں حق تعالیٰ ان کو بیان فرماتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے جو اللہ سے

معارف و مسائل

طلاق و نکاح کے احکام پورے قرآن کریم میں بہت سی آیتوں میں آئے ہیں مگر یہ چند آیتیں جو یہاں مذکور ہیں طلاق کے مسائل میں اہم ضابطوں کی حیثیت رکھتی ہیں ان کو سمجھنے کیلئے پہلے نکاح کی شرعی حیثیت کو جاننا ضروری ہے۔

نکاح و طلاق کی شرعی حیثیت | نکاح کی ایک حیثیت تو ایک باہمی معاملے اور معاہدے کی ہو، جیسے اور مستقیمہ لفظ عام بیع و شراء اور لین دین کے معاملات ہوتے ہیں، دوسری

حیثیت ایک سنت اور عبادت کی ہے، اس پر تو تمام امت کا اتفاق ہے کہ نکاح عام معاملہ و معاہدات سے بالاتر ایک حیثیت شرعی عبادت و سنت کی رکھتا ہے، اسی لئے نکاح کے

منعقد ہونے کے لئے باجماع امت کچھ ایسی شرائط ضروری ہیں جو عام معاملات بیع و شراء میں نہیں ہوتیں۔

اول تو یہ کہ ہر عورت سے اور ہر مرد سے نکاح نہیں ہو سکتا، اس میں شریعت کا ایک

مستقبل قانون ہے، جس کے تحت بہت سی عورتوں اور مردوں کا آپس میں نکاح نہیں ہو سکتا۔

دوسرے تمام معاملات و معاہدات کے منعقد اور مکمل ہونے کے لئے کوئی گواہی شرط

نہیں، گواہی کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب فریقین میں اختلاف ہو جائے، لیکن نکاح ایسا

معاملہ نہیں، یہاں اس کے منعقد ہونے کیلئے بھی گواہوں کا سامنے ہونا شرط ہے، اگر مرد و عورت

بغیر گواہوں کے آپس میں نکاح کر لیں، اور دونوں میں کوئی مشترک بھی اختلاف و عکبار بھی نہ کرے

اس وقت بھی شرعاً وہ نکاح باطل کا عدم ہے جب تک گواہوں کے سامنے دونوں کا ایجاب و

قبول نہ ہو، اور سنت یہ ہے کہ نکاح اعلان عام کے ساتھ کیا جائے، اسی طرح کی اور بہت سی

شرائط اور آداب ہیں، جو معاملہ نکاح کے لئے ضروری یا مستحسن ہیں۔

۱۱م عظیم ابو حنیفہ اور بہت سے دوسرے حضرات ائمہ کے نزدیک تو نکاح میں معاملہ اور معاہدہ کی حیثیت سے زیادہ عبادت و سنت کی حیثیت غالب ہے، اور قرآن و سنت کے شواہد اس پر قائم ہیں۔

نکاح کی اجمالی حقیقت معلوم کرنے کے بعد طلاق کو سمجھنے، طلاق کا حاصل نکاح کے

معاملے اور معاہدے کو ختم کرنا ہے، جس طرح شریعت اسلام نے نکاح کے معاملے اور معاہدے کو ایک عبادت کی حیثیت دے کر عام معاملات و معاہدات کی سطح سے بلند رکھا ہے اور بہت سی پابندیاں اس پر لگائی ہیں اسی طرح اس معاملہ کا ختم کرنا بھی عام لین دین کے معاملات کی طرح آزاد نہیں رکھا، کہ جب چاہیے جس طرح چاہے اس معاملہ کو فسخ کر دے، اور دوسرے سے معاملہ کرے، بلکہ اس کے لئے ایک خاص حکیمانہ قانون بنایا ہے، جس کا بیان آیات مذکورہ میں کیا گیا ہے اسلامی تعلیمات کا اہل رخ یہ ہے کہ نکاح کا معاملہ اور معاہدہ عمر بھر کے لئے ہو، اس کے توڑنے اور ختم کرنے کی کبھی نوبت ہی نہ آئے، کیونکہ اس معاملہ کے انقطاع کا اثر صرف فریقین پر نہیں پڑتا، نسل و اولاد کی تباہی و بربادی اور بعض اوقات خاندانوں اور قبیلوں میں فساد و تکبر کی نوبت پہنچتی ہے، اور پورا معاشرہ بڑی طرح اس سے متاثر ہوتا ہے، اسی لئے جو اسباب اور وجوہ اس معاملہ کو توڑنے کا سبب بن سکتے ہیں قرآن و سنت کی تعلیمات نے ان تمام اسباب کو راہ سے ہٹانے کا پورا انتظام کیا ہے، نہ وہ جن کے ہر معاملے اور ہر حال کے لئے جو ہدایتیں قرآن و سنت میں مذکور ہیں ان سب کا حاصل یہی ہے کہ یہ رشتہ ہمیشہ زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوتا چلا جائے، ٹوٹنے نہ پائے، ناموافقیت کی صورت میں اول اہتمام و تفہیم کی پھر زجر و تنبیہ کی ہدایتیں دی گئیں اور اگر بات بڑھ جائے اور اس سے بھی کام نہ چلے تو خاندان ہی کے چند افراد کو حکم اور ثالث بنا کر معاملہ طے کرنے کی تعلیم دی آیت **مَنْكُم مِّنْ أَهْلِيهِ وَبَيْنَهُمْ مِّنْ أَهْلِيهِمْ**، ۲۳۰ میں خاندان ہی کے افراد کو ثالث بنانے کا ارشاد کس قدر حکیمانہ ہے، کہ اگر معاملہ خاندان سے باہر گیا تو بات بڑھ جائے اور دلوں میں زیادہ بے حد پیدا ہو جائے گا خطرہ ہے۔

لیکن بعض اوقات ایسی صورتیں بھی پیش آتی ہیں کہ اصلاح حال کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں، اور تعلق نکاح کے مطلوبہ ثمرات حاصل ہونے کے بجائے طرفین کا آپس میں مل کر رہنا ایک عذاب بن جاتا ہے، ایسی حالت میں اس ازدواجی تعلق کا ختم کر دینا ہی طرفین کے لئے راحت اور سلامتی کی راہ ہو جاتی ہے، اس لئے شریعت اسلام نے بعض دوسرے مذاہب کی طرح یہ بھی نہیں کیا کہ رشتہ ازدواج ہر حال میں ناقابل فسخ ہی رہے، بلکہ طلاق اور فسخ نکاح کا قانون بنایا، طلاق کا اختیار تو صرف مرد کو دیا، جس میں عادتاً فکر و تدبیر اور تحمل کا مادہ عورت سے زائد ہوتا ہے، عورت کے ہاتھ میں یہ آزاد اختیار نہیں دیا، تاکہ وقتی تاثرات سے مغلوب ہو جائے عورت میں بہ نسبت مرد کے زیادہ ہے وہ طلاق کا سبب نہ بن جائے۔

لیکن عورت کو بھی بالکل اس حق سے محروم نہیں رکھا کہ وہ شوہر کے ظلم و ستم پہنے ہی پر مجبور ہو جائے، اس کو یہ حق دیا کہ حاکم مشرع کی عدالت میں اپنا معاملہ پیش کر کے اور شکایات

کا ثبوت دے کر نکاح فسخ کر اسکے اطلاق حاصل کر سکے، پھر مرد کو طلاق کا آزاد اختیار تو دیا، مگر ازل تو یہ کہہ دیا کہ اس اختیار کا استعمال کرنا اللہ کے نزدیک بہت مبغض و مکروہ ہے، صرف مجبوری کی حالت میں اجازت ہے، حدیث میں ارشاد نبوی ہے:

ابغض الحلال الى الله الطلاق
یعنی حلال چیزوں میں سے مکروہ زیادہ مبغض اور مکروہ اللہ کے نزدیک طلاق ہے۔

دوسری پابندی یہ لگائی کہ حالت غیظ و غضب میں یا کسی وقتی اور ہنگامی ناگواری میں اس اختیار کو استعمال نہ کریں، اسی حکمت کے ماتحت حالت حیض میں طلاق دینے کو ممنوع قرار دیا، اور حالت ہلم میں بھی، جس طہر میں صحت و ہستری ہو چکی ہے، اس میں طلاق دینے کو اس بنا پر ممنوع قرار دیا کہ اس کی وجہ سے عورت کی عدت طویل ہو جائے گی، اس کو تکلیف ہوگی، ان دونوں چیزوں کے لئے قرآن کریم کا ارشاد یہ آیا **فَطَلِّقُوهُنَّ رِحْلَةَ بَعْضِكُمْ**، ۲۳۱ یعنی طلاق دینا ہر تو ایسے وقت میں دو جس میں بلا وجہ عورت کی عدت طویل نہ ہو، حیض کی حالت میں طلاق ہوتی تو موجودہ حیض کی عدت میں شمار نہ ہوگا، اس کے بعد طہر اور پھر طہر کے بعد حیض سے عدت شمار ہوگی، اور جس طہر میں ہستری ہو چکی ہے، اس میں یہ امکان ہے کہ حل رہ گیا ہو تو عدت وضع حل تک طے نہ ہو جائیگی طلاق دینے کے لئے مذکورہ وقت طہر کا مقرر کرنے میں یہ بھی حکمت ہے کہ اس انتظار کے وقفہ میں بہت ممکن ہو کہ غصہ فرد ہو، معافی تلافی ہو کر طلاق کا ارادہ ہی ختم ہو جائے۔

تیسری پابندی یہ لگائی کہ معاہدہ نکاح توڑنے اور فسخ کرنے کا طریقہ بھی وہ نہیں رکھا جو عام بیع و شراء کے معاملات و معاہدات کا ہے کہ ایک مرتبہ معاہدہ فسخ کر دیا تو اسی وقت اسی منٹ میں فریقین آزاد ہو گئے، اور پہلا معاملہ بالکل ختم ہو گیا، ہر ایک کو اختیار ہو گیا کہ دوسرے سے معاہدہ کرے، بلکہ معاملہ نکاح کو قطع کرنے کے لئے ازل تو اس کے تین درجے تین طلاقوں کی صورت میں رکھے گئے، پھر اس پر عدت کی پابندی لگا دی کہ عدت پوری ہونے تک معاملہ نکاح کے بہت سے اثرات باقی رہیں گے عورت کو دوسرا نکاح حلال نہ ہوگا، مرد کے لئے بھی بعض پابندیاں باقی رہیں گی۔

چوتھی پابندی یہ لگائی کہ اگر صاف و صریح لفظوں میں ایک یا دو طلاق دی گئی ہے تو طلاق دیتے ہی نکاح نہیں ٹوٹا، بلکہ رشتہ ازدواج عدت پوری ہونے تک قائم ہے، دوسری عدت میں اگر یہ اپنی طلاق سے رجوع کرے تو نکاح سابق بحال ہو جائے گا۔

لیکن یہ رجوع کرنے کا اختیار صرف ایک یا دو طلاق تک محدود کر دیا گیا، تاکہ کوئی ظالم شوہر ایسا نہ کر سکے کہ ہمیشہ طلاق دیتا رہے، پھر رجوع کر کے اپنی قید میں رکھتا رہے، اس کو

حکم یہ دیدیا کہ اگر کسی نے تیسری طلاق بھی دیدی تو اب اس کو رجوع کرنے کا بھی خستہ پار نہیں بلکہ اگر دونوں راضی ہو کر آپس میں دوبارہ بھی نکاح کرنا چاہیں تو بغیر ایک مخصوص صورت کے جس کا ذکر آگے آتا ہے، دوبارہ نکاح بھی آپس میں حلال نہیں۔

آیات مذکورہ میں اسی نظام طلاق کے اہم احکام کا ذکر ہے، اب ان آیات کے الفاظ پر غور کیجئے، پہلی آیت میں اول تو ارشاد فرمایا: اِنْ طَلَّقَ مَرْءٌ مِّنْهُنَّ یعنی طلاق دو ہی مرتبہ ہے، پھر ان دونوں مرتبہ کی طلاقوں میں یہ چمک دکھ دی کہ ان سے نکاح بالکل ختم نہیں ہوا، بلکہ عدت پوری ہونے تک مرد کو اختیار ہے کہ رجوع کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے، یا پھر رجوع نہ کرے، عدت پوری ہونے دے، عدت پوری ہونے پر نکاح کا تعلق ختم ہو جائے گا، اسی مضمون کو ان الفاظ میں ارشاد فرمایا: فَاِنْ طَلَّقَ مَرْءٌ مِّنْهُنَّ اَوْ كَسِرَتْ يَدَا اِحْسَانٍ یعنی یا تو شرعی قاعدے کے مطابق رجعت کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے، یا پھر خوب صورتی اور خوش معاملگی کے ساتھ اس کی عدت پوری ہونے دے تاکہ وہ آزاد ہو جائے۔

ابھی تیسری طلاق کا ذکر نہیں آیا، درمیان میں ایک اور مسئلہ بیان فرما دیا جو ایسے حالات میں عمر نامذہب بحث آجاتا ہے، وہ یہ کہ بعض ظالم شوہر بیوی کو نہ رکھنا چاہتے ہیں، نہ اس کے حقوق کی فکر کرتے ہیں، نہ طلاق دیتے ہیں، بیوی تنگ ہوتی ہے، اس کی بھوری سے یہ ناجائز فائدہ اٹھا کر طلاق دینے کے لئے اس سے کچھ مال کا یا کم از کم مہر کی معافی یا واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں، قرآن کریم نے اس کو حرام قرار دیا، ارشاد فرمایا: وَلَا يَجُوزُ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا كَسَبْتُمْ مِنْ شَيْءٍ یعنی تمہارے لئے حلال نہیں کہ طلاق کے معاوضہ میں ان سے اپنا دیا ہوا مال اور مہر وغیرہ واپس لیتے۔ البتہ ایک صورت اس سے مستثنیٰ فرمادی کہ اس میں مہر کی واپسی یا معافی جائز کر دی، وہ یہ کہ عورت بھی یہ محسوس کرے کہ طبیعتوں میں بعد و مخالفت کی وجہ سے میں شوہر کے حقوق ادا نہیں کر سکتی، اور مرد بھی یہی سمجھے تو ایسی صورت میں یہ بھی جائز ہے کہ مہر کی واپسی یا معافی کے بدلے میں طلاق دی جائے اور لی جائے۔

یہ مسئلہ ضمنی بیان فرمانے کے بعد پھر تیسری طلاق کا ذکر اس طرح فرمایا: فَاِنْ طَلَّقَهَا ثَلَاثًا مِّنْهُنَّ اَوْ كَسِرَتْ يَدَا اِحْسَانٍ۔ یعنی اگر اس شخص نے تیسری طلاق بھی دے ڈالی (جو شرعاً پسندیدہ نہ تھی) تو اب نکاح کا معاملہ بالکل ختم ہو گیا، اس کو رجعت کرنے کا کوئی خستہ پار نہ رہا، اور چونکہ اس نے شرعی حدود سے تجاوز کیا کہ بلا وجہ تیسری طلاق دیدی تو اس کی سزا یہ ہے کہ اب اگر یہ دونوں راضی ہو کر پھر آپس میں نکاح کرنا چاہیں تو وہ بھی نہیں کر سکتے اب ان کے آپس میں دوبارہ نکاح کے لئے شرط یہ ہے کہ یہ عورت (عدت طلاق پوری کر کے)

میں دوسرے مرد سے نکاح کرے اور حقوق زوجیت ادا کر کے دوسرے شوہر کے ساتھ رہے، پھر اگر اتفاق سے وہ دوسرا شوہر بھی طلاق دیدے (یا مرنے) تو اس کی مدت پوری کرنے کے بعد پہلے شوہر سے نکاح ہو سکتا ہے، آیت کے آخری جملے فَاِنْ طَلَّقَهَا ثَلَاثًا مِّنْهُنَّ اَوْ كَسِرَتْ يَدَا اِحْسَانٍ کا یہی مطلب ہے۔

میں طلاق اور اس کے یہاں مسترآن کریم کے اسلوب بیان پر غور کرنے سے یہ بات پوری وضاحت احکام کی تفصیل کے ساتھ سامنے آجاتی ہے کہ طلاق دینے کا اصل شرعی طریقہ یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ دو طلاق تک پہنچا جائے، تیسری طلاق تک نوبت پہنچانا مناسب نہیں، الفاظ آیت اِنْ طَلَّقَ مَرْءٌ مِّنْهُنَّ کے بعد تیسری طلاق کو حرج (اِنْ) کے ساتھ فَاِنْ طَلَّقَهَا فرمانے میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے، درجہ سیدھی تعبیر یہ تھی کہ اِنْ طَلَّقَ ثَلَاثًا کہا جاتا، اس کو چھوڑ کر یہ تعبیر اختیار کرنے میں واضح اشارہ ہے کہ تیسری طلاق تک پہنچنا نہیں چاہئے، یہی وجہ ہے کہ امام مالک اور بہت سے فقہاء نے تیسری طلاق کی اجازت ہی نہیں دی وہ اس کو طلاق بدعت کہتے ہیں، اور دوسرے فقہاء نے میں طلاق کو صرف اس شرط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے کہ الگ الگ تین طہروں میں تین طلاقیں دی جائیں، ان فقہاء کی اصطلاح میں اس کو بھی طلاق سنت کے لفظ سے تعبیر کر دیا گیا ہے، مگر اس کا یہ مطلب کسی کے نزدیک نہیں ہے کہ اس طرح تین طلاقیں دینا مسنون اور محبوب ہے، بلکہ طلاق بدعت کے مقابلے میں اس کو طلاق سنت اس معنی سے کہہ دیا گیا کہ یہ صورت بھی بدعت میں داخل نہیں۔

قرآن و سنت کے ارشادات اور تعامل صحابہؓ و تابعین سے عدت طلاق کے متعلق جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب طلاق دینے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہے تو طلاق کا احسن طریقہ یہ ہے کہ صرف ایک طلاق حالت طہر میں دیدے جس میں جماعت مذکی ہو، اور یہ ایک طلاق دے کر چھوڑ دے، عدت ختم ہونے کے ساتھ رشتہ نکاح خود ٹوٹ جائے گا، اس کو فقہاء نے طلاق احسن کہا ہے، اور حضرات صحابہؓ نے اسی کو طلاق بہتر طریق قرار دیا ہے۔ ابن ابی شیبہؒ نے اپنے مصنف میں حضرت ابراہیمؒ سے نقل کیا ہے کہ صحابہؓ کرام طلاق دینے میں اس کو پسند کرتے تھے کہ صرف ایک طلاق دے کر چھوڑ دی جائے اور عدت طلاق تین حیض پورے ہونے دیتے جائیں تاکہ عورت آزاد ہو جائے۔

قرآن کریم کے الفاظ مذکورہ سے اس کی بھی اجازت نکلتی ہے کہ دو طلاق تک دیدی جائے

مگر مؤثران کے لفظ میں اس طرف اشارہ فرما دیا گیا ہے کہ دو طلاق بیک لفظ و بیک وقت نہ ہوں بلکہ دو طہروں میں الگ الگ ہوں، انطلاقاً خلافاً سے بھی دو طلاق کی اجازت ثابت ہو سکتی تھی، مگر مؤثران ایک ترتیب و تراخی کی طرف مشیر ہے، جس سے مستفاد ہوتا ہے کہ دو طلاقیں ہوں تو الگ الگ ہوں، مثال سے یوں بھی کہ کوئی شخص کسی کو دو دفعہ الگ الگ دفعہ دے تو اس کو دو مرتبہ دینا نہیں کہتے، الفاظ قرآن میں دو مرتبہ دینے کا مقصد یہی ہے کہ الگ الگ طہریں دو طلاق دی جائیں (روح المعانی)

بہر حال دو طلاقوں تک قرآن حکیم کے الفاظ سے ثابت ہے، اس لئے باتفاق ائمہ فقہاء یہ طلاق سنت میں داخل ہے، یعنی بدعت نہیں، تیسری طلاق کے غیر مستحق ہونے کی طرف تو خود اسلوب قرآن میں واضح اشارہ پایا جاتا ہے، اس کے غیر مستحق ہونے میں کسی کا بھی اختلاف نہیں۔ اور حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے تیسری طلاق کا بغض کر دیا ہونا ثابت ہوتا ہے، آم نسا نے بروایت محمود بن لبید نقل کیا ہے کہ:-

ان خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن رجل طلق امرأته ثلاثاً تطليقات جميعاً فقام غضباً ناثراً قال اي لعجب بكتاب الله وانما بين اظهر كبر حق قام رجل وقال يا رسول الله الا اخذت رضائي كتاب الطلاق، ص ۹۶	رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دی کے متعلق خبر دی گئی جس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دی تھیں، آپ غصہ ہو کر کھڑے ہو گئے، اور فرمایا کیا اللہ کی کتاب کی تکمیل کیا جاتا ہے، حالانکہ میں تمھاری درمیان موجود ہوں اتنے میں ایک آدمی کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا اے اللہ کے رسول کیا میں کو قتل کروں!
---	--

اس حدیث کی اسناد کو حافظ ابن قیم نے صحیح علی شرط مسلم قرار دیا ہے (ذاد المعاد) اور جوہر نفی میں علامہ اردوبی نے اس حدیث کی سند کو صحیح اور ابن کثیر نے اسناد جید، ابن حبشہ نے زوائد موفقیون فرمایا ہے۔

اس بنا پر حضرت امام مالکؒ اور بعض دوسرے ائمہ فقہاء نے تیسری طلاق کو مطلقاً ناجائز اور طلاق بدعت قرار دیا ہے، دوسرے ائمہ نے تین طہروں میں تین طلاقوں کو اگرچہ طلاق سنت میں داخل کہہ کر طلاق بدعت سے نکال دیا ہے، مگر اس کے غیر مستحق ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت اسلام نے جو طلاق کے تین درجے تین طلاقوں کی صورت میں رکھے ہیں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان تینوں درجوں کو عبور کرنا ضروری یا بہتر ہے، بلکہ منشاء

شریعت کا تو یہ ہے کہ اول تو طلاق پر اقدام ہی ایک بغوض و مکروہ فعل ہے، اگر مجبوری اس وقت دام کی نوبت آجائے تو اس کے کم سے کم درجے یعنی ایک طلاق پر اکتفا کیا جائے اور عدت گزارنے کے بعد دوبارہ طلاق نہ ہو جائے، اور عدت ختم ہونے ہی پہلی ایک طلاق رشتہ زوجیت قطع کرنے کے لئے کافی ہو جائے گی، اور عورت آزاد ہو کر دوسرے شخص سے نکاح کر سکے گی، یہی طریقہ طلاق احسن کہلاتا ہے، اس طریقے میں یہ حکمت اور فائدہ بھی ہے کہ صریح الفاظ طلاق سے ایک طلاق دینے کی صورت میں طرفین کے لئے مصالحت کی راہیں کھلی ہیں، عدت ختم ہونے سے پہلے پہلے تو صرف طلاق سے رجوع کر لینا بقا نکاح کے لئے کافی ہو گا، اور عدت ختم ہو جانے کے بعد اگرچہ نکاح ٹوٹ چکے گا اور عورت آزاد ہو جائے گی، مگر پھر بھی یہ گنجائش باقی رہے گی کہ اگر دونوں میں اب مصالحت ہو جائے اور باہم نکاح کرنا چاہیں تو نکاح جدید اس وقت ہو سکتا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص اس طلاق احسن کے طریقے پر اکتفا نہ کرے، دوران عدت میں مزید ایک طلاق صریح اور صاف لفظوں میں دے تو اس نے قطع نکاح کے دو درجے طے کر لئے جس کی ضرورت نہ تھی اور ایسا کرنا شرعاً پسندیدہ بھی نہ تھا، مگر بہر حال دو درجے طے ہو گئے، مگر ان دو درجوں کے طے ہو جانے تک بھی بات وہی رہی کہ دوران عدت میں رجعت کا اختیار باقی ہو، اور عدت ختم ہو جانے کے بعد ہر اضی طرفین نکاح جدید ہو سکتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ دو طلاق تک پہنچنے میں شوہر نے اپنے اختیارات کی ایک کڑی اور توڑ ڈالی اور اس مرحلہ پر پہنچ گیا کہ اگر اب ایک مرتبہ بھی طلاق دیدے تو معاملہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔

جس شخص نے یہ دو درجے طلاق کے طے کر لئے اس کے لئے آگے یہ ہدایت دی گئی کہ **يَتَعَنَ ذِي اَوْتَرْتَيْنِ يَخْتَارُ**، اس میں کائنات کے ہر ذوق کے لفظوں میں دو حکم بتلائے گئے، اول یہ کہ عدت کے دوران رجعت کر لینا نکاح جدید کا محتاج نہیں، بلکہ صرف اس کا یعنی طلاق سے رجعت کر کے روک لینا کافی ہے، اگر ایسا کر لیا تو سابق نکاح ہی کی بنیاد پر تعلق زوجیت بحال ہو جائے گا۔

دوسرے اس میں شوہر کو یہ ہدایت دی گئی کہ اگر اس کا ارادہ اصلاح حال اور صلح و صفائی کے ساتھ زندگی گزارنے کا ہے تب تو رجعت پر اقدام کرے ورنہ چھوڑ دے کہ عدت گزار کر تعلق زوجیت ختم ہو جائے، ایسا نہ ہو کہ بغیر ارادہ اصلاح کے محض عورت کو پریشان کرنے کے لئے رجعت کرے۔

اس کے بالمقابل **اَوْتَرْتَيْنِ يَخْتَارُ** فرمایا، تشریح کے لئے کھول دینے اور چھوڑ دینے کے ہیں، اس سے اشارہ کر دیا کہ قطع تعلق کے لئے کسی مزید طلاق یا دوسرے کسی عمل کی

مذہب نہیں، بغیر رجعت کے عدت ختم ہو جانا ہی تعلقات زوجیت ختم کرنے کے لئے کافی ہو۔ امام حدیث ابو داؤد نے بروایت ابو رزین اسدی نقل کیا ہے کہ اس آیت کے نزول پر ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے الطَّلَاقِ مَرَّتَيْنِ فرمایا، تیسری طلاق کا یہاں کیوں ذکر نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا کہ تَنْسِيْ بِكُم بِمَا خَسَانِ جو بعد میں مذکور ہے وہی تیسری طلاق ہے، (روح المعانی) مطلب اس کا چہرہ علماء کے نزدیک یہ ہے کہ جو کام تعلقات زوجیت کے کلی انقطاع کا تیسری طلاق سے ہوتا وہی کام اس طرز عمل سے ہو جاتا کہ عدت کے اندر رجعت ذکر کرے، اور جس طرح اِمْتَنَانٌ کے ساتھ بِتَعْرِؤْ کی قید لگا کر یہ ہدایت شرعی کی کہ رجعت کر کے بیوی کو روکا جائے تو جس سلوک کے ساتھ روکا جائے وہی طسرح تَنْسِيْ بِكُم کے ساتھ بِمَا خَسَانِ کی قید لگا کر یہ ہدایت دیدی کہ طلاق ایک معاملہ کا نسخ ہے، شریف انسان کا کام یہ ہے کہ جس طرح معاملہ اور معاہدہ خوش دلی اور محنت سلوک کے ساتھ کیا جاتا ہے، اسی طرح اگر فریغ معاہدہ کی ضرورت پیش آجائے تو اس کو بھی غصہ یا لڑائی جھگڑے کے ساتھ نہ کریں، بلکہ وہ بھی احسان و سلوک کے ساتھ کریں، کہ رخصت کے وقت مطلقہ بیوی کو کچھ تحفہ، کپڑے وغیرہ کا دے کر رخصت کریں، جس کا ذکر قرآن کریم کی دوسری آیت میں ہے:

مَتَّحُوْنَ عَلَيْكَ الْمَوْسِعُ قَدْ رُفَا
وَعَلَى الْمَعْتُوْرِ قَدْ رُفَا۔ (۲۳۶:۲)

اور اگر اس نے اس پر بھی ایسا نہ کیا بلکہ تیسری طلاق بھی دے ڈالی تو اب اس نے اپنے سائے اختیار شریعت کی دی ہوئی آسانیوں کو نظر انداز کر کے بلاوجہ اور بلا ضرورت ختم کر دینے تو اب اس کی سزا یہ ہے کہ نہ رجعت ہو سکے اور نہ بغیر دوسری شادی کے آپس میں نکاح ہو سکے۔ اگر کسی نے غیر محسن یا غیر مشروع طریقہ سے اس کا جواب عقلی اور عرفی طور پر تو یہی ہے کہ کسی فعل کا جرم و تین طلاق دیدی تو اس کا اثر کیا ہوگا؟ گناہ ہونا اس کے مؤثر ہونے میں کہیں بھی مانع نہیں ہوتا، قتل ناحق جرم و گناہ ہے، مگر جس کو گولی یا تلوار مار کر قتل کیا گیا ہے وہ تو قتل ہو ہی جاتا ہے، اس کی موت تو اس کا انتظار نہیں کرتی کہ یہ گولی جائز طریقہ سے ماری گئی ہے یا ناجائز طریقہ سے، چوری کرنا اتفاق مذاہب جرم و گناہ ہے، مگر جو مال اس طرح غائب کر دیا گیا وہ تو ہاتھ سے بچل ہی جاتا کہ اس طرح تمام معاصی اور جبرائیم کا یہی حال ہے کہ ان کا جرم و گناہ ہونا ان کے مؤثر ہونے میں مانع نہیں ہوتا۔

اس اصول کا مقتضی یہی ہے کہ شریعت کی دی ہوئی آسانیوں کو نظر انداز کرنا اور بلاوجہ

اپنے سائے اختیار طلاق کو ختم کر کے تین طلاق تک پہنچا اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا سبب ہوا جیسا کہ سابقہ روایت میں لکھا جا چکا ہے، اور اس لئے جہور امت کے نزدیک یہ فعل غیر مستحسن اور بعض کے نزدیک ناجائز ہے، مگر ان سب باتوں کے باوجود جب کسی نے ایسا اقدام کر لیا تو اس کا وہی اثر ہونا چاہئے جو جائز طلاق کا ہوتا، یعنی تین طلاق واقع ہو جائیں، اور رجعت ہی کا اختیار نہیں، نکاح جدید کا اختیار بھی سلب ہو جائے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ اس پر شاہد ہے کہ انہما بخصنے کے باوجود آپ نے تینوں طلاقیں کو نافذ فرمایا، جس کے بہت سے واقعات کتب حدیث میں مذکور ہیں اور جن علماء نے اس مسئلہ پر مستقل کتابیں لکھی ہیں ان میں ان واقعات کو صحیح کر دیا ہے، حال میں مولانا ابوالزہرہ محمد سرفراز صاحب کی کتاب عمدة الاثر بھی اس مسئلہ پر شائع ہو گئی ہے جو بالکل کافی ہے، یہاں صرف دو تین حدیثیں نقل کی جاتی ہیں۔

عمود بن لبید کی روایت جو بحوالہ نسائی اور پر لکھی گئی ہے اس میں تین طلاقیں بیک وقت دینے پر انتہائی ناراضگی کا اظہار تو منقول ہے، یہاں تک کہ بعض صحابہ نے اس شخص کو مستوجب قتل سمجھا، مگر یہ کہیں منقول نہیں کہ آپ نے اس کی طلاق کو ایک رجعتی طلاق قرار دیکر بیوی اس کے حوالے کر دی ہو۔

بلکہ دوسری روایت جو آگے آئی ہے جس طرح اس میں اس کی تصریح موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمر کی بیک وقت تین طلاق کو باوجود ناراضی کے نافذ فرمادیا، اسی طرح مذکورہ حدیث عمود بن لبید کے متعلق قاضی ابوبکر بن عربی نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمر کی تین طلاقیں کی طرح اس کی بھی تین طلاقیں کو نافذ فرمادیا تھا، ان کے الفاظ یہ ہیں:

فلم يرده النبي صلى الله عليه وسلم
بل امضاها كما في حديث عويسر
العجلاني في اللعان حيث مضى
طلاقه المشلاش ولم يرده
وتحذير بين ابن ابي طبع مصر
از عمدة الاثر

دوسری حدیث صدیقہ عائشہؓ کی صحیح بخاری میں بالفاظ ذیل ہے:

ان رجلاً طلق امرأته ثلاثاً
~ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاق

فَنَزَوِجَتْ فَطَلَّقَ فَشَلَّ السَّبِيحُ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَحَصَلَ
لِلْأَوَّلِ قَالَ لَاحِقِي يَذَرُكِ عَيْلَتَهَا
كَمَا ذَا قَبْلَ الْأَوَّلِ

صحیح بخاری، ص ۲۷۹، ج ۲
صحیح مسلم، ص ۴۶۳

دی اس عورت نے دوسری جگہ نکاح کیا
تو اس دوسرے شوہر نے بھی اُسے طلاق
دی یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا
کیا یہ عورت پہلے شوہر کے لئے حلال ہے؟
آپ نے فرمایا نہیں جب تک کہ دوسرا
شوہر اس سے بچہ نہ کرے لطف اندوز نہ ہوگا

جس طرح پہلے شوہر نے کیا تھا، اس وقت تک طلاق دینے سے پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں ہوگی؟
اتفاقی روایت سے ظاہر یہی ہے کہ یہ تینوں طلاق بیک وقت دی گئی تھیں، شروع حدیث
فتح الباری عمدۃ القاری قسطلانی وغیرہ میں روایت کا مفہوم یہی استرار دیا گیا ہے کہ بیک وقت تین
طلاق دی گئیں اور حدیث میں یہ فیصلہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین طلاق کو
نافذ قرار دے کر یہ حکم دیا کہ جب تک شوہر ثانی سے ہیبت نہ ہو جائے، تو اس کے
طلاق دینے سے شوہر اول کے لئے حلال نہیں ہوگی۔

تیسری روایت حضرت عویمر جلالیؓ کی ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کے سامنے اپنی بیوی سے لعان کیا، اور اس کے بعد عرض کیا:

فَلَمَّا خَرَفَا قَالَ عُوَيْمِرُ كُنْتُ بَشًّا
عَلَيْهَا يَا رَسُولَ اللَّهِ أَنْ أَسْكُتَهَا
فَطَلَّقَهَا ثَلَاثًا قَبْلَ أَنْ يَأْمُرَهُ
النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
دمح بخاری، فتح الباری، ص ۳۰۱، ج ۲
صحیح مسلم، ص ۱۵۲۸

پس جب وہ دونوں لعان سے فارغ
ہو گئے تو عویمر نے کہا اے اللہ کے رسول میں
اس پر عبث بولنے والا ہوں گا، اگر میں نے
اس کو اپنے پاس رکھ لیا تو عویمر رضی اللہ عنہ
نے اس کو تین طلاقیں دیدی قبل اس کے
کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم انھیں حکم دے۔

اور ابو ذرؓ نے اس واقعہ کو بروایت حضرت ہبل بن سعد نقل کر کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

فَالْفَنُّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ مَا صَنَعَ عِنْدَ
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
مَنْعَةً قَالَ سَعْدُ بْنُ حَفْصٍ هَذَا
عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ فَمَضَتْ السَّنَةُ بَعْدَ ذَلِكَ

تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے لہ
فرادیا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کے سامنے جو کچھ پیش آیا وہ سنت قرار پایا
سعدؓ فرماتے ہیں اس موقع پر میں رسول
کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھا
پس اس کے بعد لعان کرنے والوں کے

الْمُتَلَاحِظِينَ أَنْ يَفْتَرِقَ بَيْنَهُمَا
ثُمَّ لَا يَجْعَلُ حَالَهُنَّ أَبْدَانًا دُونَ الْأَوَّلِ
ص ۲۰۱، طبع اصم المطابع

بارے میں یہ طریقہ رائج ہو گیا کہ ان کے درمیان
تفریق کر دی جائے، اور پھر وہ کسی بھی
جمع نہ ہوں؟

اس حدیث میں پوری وضاحت کے ساتھ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
حضرت عویمرؓ کی بیک وقت تین طلاق کو تین ہی قرار دے کر نافذ فرمایا ہے۔

اور محمود بن لبید کی سابقہ روایت میں بھی ابو بکر ابن عربی کی روایت کے مطابق تین طلاقوں
کو نافذ کرنے کا ذکر موجود ہے، اور بالفرض یہ بھی نہ ہوتا تو یہ کہیں منقول نہیں کہ آپ نے اس کو ایک
طلاق دینے سے استرار دے کر بیوی اس کے سپرد کر دی ہو۔

الحاصل مذکورہ تینوں احادیث سے یہ ثابت ہو گیا کہ اگرچہ تین طلاق بیک وقت رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سخت ناراضی کا موجب تھیں مگر بہر حال اثر ان کا یہی ہوا کہ تینوں
طلاقیں واقع قرار دی گئیں۔

حضرت فاروق اعظمؓ کا واقعہ مذکورہ صدر تحریر سے یہ ثابت ہوا کہ بیک وقت تین طلاق کو تین قرار
اور اس پر اشکال جواب دینا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ تھا، مگر یہاں ایک
اشکال حضرت فاروق اعظمؓ کے ایک واقعہ سے پیدا ہوتا ہے، جو صحیح مسلم اور اکثر کتب حدیث
میں منقول ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ
الطَّلَاقُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَابْنِ بَكْرٍ
وَسُنَّتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ طَلَّاقُ
الْثَلَاثِ وَاحِدَةٌ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ
الْخَطَّابِ إِنَّ النَّاسَ قَلِيلٌ يَسْتَجْلُوا
فِي أَمْكَانَتِ الْهَمِ فَبِهِ أَمَّا فُلُو
أَمْضَيْنَا عَلَيْهِمْ فَأَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ

تبعث ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ:
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور حضرت
ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں اور حضرت عمرؓ کی خلافت
کے ابتدائی دو سالوں میں طلاق کا یہ طریقہ تھا۔
تین طلاقوں کو ایک قرار دیا جاتا تھا تو حضرت عمرؓ
نے فرمایا کہ لوگ جلدی کرنے لگے ہیں، ایک ایسا معاملہ
میں جس میں ان کے لئے ہلکتی تھی تو مناسب رہو گا
ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں، تو آپ نے ان پر نافذ کر دیا۔

(صحیح مسلم، ص ۴۴۷، ج ۱)

فاروق اعظمؓ کا یہ اعلان فقہاء صحابہؓ کے مشورہ سے صحابہ و تابعین کے مجمع عام میں ہوا کسی سے
اس پر انکار یا تردید منقول نہیں، اسی لئے حافظ حدیث امام ابن حجرؒ نے اس پر اجماع نقل کیا
ہے، زر قانی شرح مظاہر میں یہ الفاظ ہیں:

والجہود علی وقوع الثلاث بل
یحییٰ ابن عبد البر الاجماع
قائل ان خلافہ لا یلتفت الیہ
وذرقانی شرح مؤطا ص ۱۶۷ (۳۳۰)

اور شیخ الاسلام نوویؒ نے شرح مسلم میں فرمایا:

قال الشافعی ومالك والوحيفة
واسمٰن وجسائر العلماء من
السلف والخلف یقیم الثلاث
وقال طائفة وبعض اهل الظاهر
لا یقیم بنی الا واحد۔

(شرح مسلم ص ۱۳۷۸)

امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں منسرایا:

فخطب عمر بن الخطاب
جميعا وفيهم اصحاب رسول الله
صلی الله علیه وسلم رضي الله
عنهم الذين قد علموا ما تقتضی
من ذلك في زمن رسول الله
صلی الله علیه وسلم فلم ينكروا عليه
منهم منكر ولم يردوا فقام

(شرح معانی الآثار ص ۲۸۹)

اور جہود امت میں طلاق کے واقعہ پر
پر متفق ہیں، بلکہ ابن عبد البر نے اس پر اجماع
نقل کر کے فرمایا کہ اس کا خلاف شانہ ہے
جس کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا۔

امام شافعی، امام مالک، امام ابو حنیفہ،
امام احمد اور مسند و طحاوی کے جامع علماء
نے فرمایا کہ تین طلاقیں واقع ہونے پر اور
طاؤس اور بعض اہل ظاہر نے کہا کہ اس سے
ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے؟

نہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے
ساتھ لوگوں کو مخاطب فرمایا اور ان لوگوں
میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ
بھی تھے جن کو اس سے پہلے رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے طریقے کا
علم تھا، تو ان میں سے کسی انکار کرنے والے
نے اسے رد نہیں کیا، اور کسی رد کرنے والے

مذکورہ واقعہ میں اگرچہ امت کے لئے عمل کی راہ باجماع صحابہؓ و تابعینؓ مسترد ہو گئی کہ تین
طلاقیں بیک وقت دینا اگرچہ غیر مستحسن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا سبب ہے، مگر
اس کے باوجود جس نے اس غلطی کا ارتکاب کیا اس کی بیوی اس پر حرام ہو جائے گی، اور بعض
دوسرے شخص سے نکاح و طلاق کے اس کے لئے حلال نہ ہوگی۔

لیکن علی اور نظری طور پر یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں، اول تو یہ کہ سابقہ تحریر میں متعدد
روایات حدیث کے حوالے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تین طلاق بیک وقت دینے والے پر
خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طلاق کو نافذ فرمایا ہے، اس کو رجعت یا نکاح جسدی کی

اجازت نہیں دی، پھر اس واقعہ میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے اس کلام کا کیا مطلب ہوگا،
کہ عہد رسالت میں اور عہد صدیقی میں اور دو سال تک عہد فاروقی میں تین طلاق کو ایک ہی مانا جاتا
تھا، فاروق اعظمؓ نے تین طلاق کا فیصلہ منسرایا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر واقعہ اسی طرح تسلیم کر لیا جائے کہ عہد رسالت، عہد صدیقی میں
تین طلاق کو ایک مانا جاتا تھا، تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس فیصلہ کو کیسے بدل دیا، اور بالفرض
ان سے کوئی غلطی بھی ہو گئی تھی تو تمام صحابہ کرامؓ نے اس کو کیسے تسلیم کر لیا؟

ان دونوں سوالوں کے حضرات فقہاء و محدثین نے مختلف جوابات دیے ہیں، ان میں
صاف اور بے تکلف جواب وہ ہے جس کو امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اصح کہہ کر نقل کیا ہے،
کہ فاروق اعظمؓ کا یہ منسردمان اور اس پر صحابہ کرامؓ کا اجماع طلاق ثلاث کی ایک خاص صورت
کے متعلق منسردمانا جائے، وہ یہ کہ کوئی شخص تین مرتبہ تجھ کو طلاق تجھ کو طلاق تجھ کو طلاق
کہے یا میں نے طلاق دی طلاق دی طلاق دی کہے۔

یہ صورت ایسی ہے کہ اس کے معنی میں دو احتمال ہوتے ہیں، ایک یہ کہ کہنے والے
نے تین طلاق دینے کی نیت سے یہ الفاظ کہے ہوں، دوسرے یہ کہ تین مرتبہ محض تاکید کے لئے
مکر رہا ہو، تین طلاق کی نیت نہ ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ نیت کا علم کہنے والے ہی کے اقرار سے
ہو سکتا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں صدق و دیانت عام اور غالب تھی،
اگر ایسے الفاظ کہنے کے بعد کسی نے یہ بیان کیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی، بلکہ محض تاکید
کے لئے یہ الفاظ مکرر ہوئے تھے تو آپؐ اس کے علنی بیان کی تصدیق فرمادیتے اور اس کو ایک ہی
طلاق منسرد دیتے تھے۔

اس کی تصدیق حضرت رکابہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے، جس میں مذکور ہے کہ
انہوں نے اپنی بیوی کو لفظ البتہ کے ساتھ طلاق دیدی تھی، یہ لفظ عرب کے عربی عام میں تین
طلاق کے لئے بولا جاتا تھا، مگر تین اس کا منہم صریح نہیں تھا، اور حضرت رکابہؓ نے کہا کہ میری
نیت تو اس لفظ سے تین طلاق کی نہیں تھی، بلکہ ایک طلاق دینے کا قصد تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم نے ان کو قسم دی، انہوں نے اس پر حلف کر لیا، تو آپؐ نے ایک ہی طلاق قرار دیدی۔

یہ حدیث ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی میں مختلف سندوں اور مختلف الفاظ کے
ساتھ منقول ہے، بعض الفاظ میں یہ بھی ہے کہ حضرت رکابہؓ نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی تھیں
مگر ابوداؤد نے ترجیح اس کو دی ہے کہ دراصل رکابہؓ نے لفظ البتہ سے طلاق دیدی تھی، یہ لفظ چونکہ
عام طور پر تین طلاق کے لئے بولا جاتا تھا، اس لئے کسی راوی نے اس کو تین طلاق سے تعبیر کر دیا ہو

بہر حال اس حدیث سے یہ بات باتفاق ثابت ہو کہ حضرت رکانہ کی طلاق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اُس وقت قرار دیا جب کہ انہوں نے علف کے ساتھ بیان دیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے تین طلاق کے الفاظ صریح اور صاف نہیں کہے تھے پھر عین کی نیت نہ کرنے کا کوئی احتمال ہی نہ رہتا، ان سوال کی کوئی ضرورت نہ رہی۔ اس واقعہ نے یہ بات واضح کر دی کہ جن الفاظ میں یہ احتمال ہو کہ تین کی نیت کی ہے یا ایک ہی کی تاکید کی ہے، اُن میں آپ نے حلفی بیان پر ایک قرار دیدیا، کیونکہ زمانہ صدق و نیت کا تھا، اس کا احتمال بہت بعید تھا کہ کوئی شخص جھوٹی قسم کھالے۔

صدیق اکبرؓ کے عہد میں اور فاروق اعظمؓ کے ابتدائی عہد میں دو سال تک یہی طریقہ جاری رہا، پھر حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے زمانے میں یہ محسوس کیا کہ اب صدق و دیانت کا معیار ٹھٹھ رہا ہے، اور آئندہ حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق اور گھٹ جائے گا، دوسری طرف ایسے واقعات کی کثرت ہو گئی کہ تین مرتبہ الفاظ طلاق کہنے والے اپنی نیت صرف ایک طلاق کی بیان کرنے لگے تو یہ محسوس کیا گیا کہ اگر آئندہ اسی طرح طلاق دینے والے کے بیان نیت کی تصدیق کر کے ایک طلاق قرار دی جاتی رہی تو بعید نہیں کہ لوگ شریعت کی دی ہوئی اس سہولت کو بے جا استعمال کرنے لگیں، اور بڑی کو واپس لینے کے لئے جھوٹ کہہ دیں کہ نیت ایک ہی کی تھی، فاروق اعظمؓ کی فراست اور انتظام دین میں دور بینی کو بھی صحابہؓ نے درست سمجھ کر اتفاق کیا، یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج مشناس تھے، انہوں نے سمجھا کہ اگر ہمارے اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہوتے تو یقیناً وہ بھی ایسے لوگ کی محفی نیت اور صاحب معاملہ کے بیان پر مدار رکھ کر فیصلہ نہ فرماتے، اس لئے قانون یہ بنادیا کہ اب جو شخص تین مرتبہ لفظ طلاق کا تکرار کرے گا اس کی تین ہی طلاقیں قرار دی جائیں گی اس کی یہ بات نہ سنی جائے گی کہ اس نے نیت صرف ایک طلاق کی کی تھی۔

حضرت فاروق اعظمؓ کے مذکورہ صدر واقعہ میں جو الفاظ منقول ہیں وہ بھی اسی مضمون کی شہادت دیتے ہیں، انہوں نے فرمایا:

ان الناس قد استعجلوا فی
امور کانت لهم فیہ اناة فلو
امضینا علیہم

”لوگ جلدی کرنے لگے ہیں ایک ایسے
معاملہ میں جن میں اُن کے لئے ہلکت تھی،
تو مناسب بیگا کہ ہم اس کو ان پر نافذ کریں“

حضرت فاروق اعظمؓ کے اس فرمان اور اس پر صحابہ کرامؓ کے اجماع کی یہ توجیہ جو بیان کی گئی ہے اس کی تصدیق روایات حدیث سے بھی ہوتی ہے، اور اس سے ان دونوں سوالوں

کا خود بخود حل نکل آتا ہے کہ روایات حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تین طلاق کو تین ہی سترار دے کر نافذ کرنا متعدد واقعات سے ثابت ہے، تو حضرت ابن عباسؓ کا یہ فرمانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ عہد رسالت میں تین کو ایک ہی مانا جاتا تھا، کیونکہ معلوم ہوا کہ ایسی طلاق جو تین کے لفظ سے دی گئی یا تکرار طلاق تین کی نیت سے کیا گیا اس میں عہد رسالت میں بھی تین ہی سترار دی جاتی تھیں ایک قرار دینے کا تعلق ایسی طلاق سے ہے جس میں ثلاث کی تصریح نہ ہو یا تین طلاق دینے کا سترار نہ ہو، بلکہ تین بطور تاکید کے کہنے کا دعویٰ ہو۔

اور یہ سوال بھی ختم ہو جاتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کو ایک قرار دیا تو فاروق اعظمؓ نے اس کی مخالفت کیوں کی، اور صحابہ کرامؓ نے اس سے اتفاق کیسے کر لیا، کیونکہ اس صورت میں فاروق اعظمؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی سہولت کے بے جا استعمال سے روکا ہے، معاذ اللہ آپ کے کسی فیصلہ کے خلاف کیا یہاں کوئی شائبہ نہیں۔

اس طرح تمام اشکالات رفع ہو گئے، واللہ، اس جگہ مسئلہ طلاق ثلاث کی مکمل بحث اور اس کی تفصیلات کا احاطہ مقصود نہیں، وہ شرح حدیث میں بہت مفصل ہے، اور بہت سے علماء نے اس کو مفصل رسالوں میں بھی واضح کر دیا ہے، سمجھنے کے لئے اتنا بھی کافی ہو، واللہ العزیز العلیم

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَلْيُغْنِ أَجَلُهُنَّ فَامْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ

اور جب طلاق دی ختم نے عورتوں کو پھر پہنچیں اپنی مدت کو تو رکھ لو ان کو عرفانی دستور کے

سَرَّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا وَمَنْ

چھوڑ دو ان کو بھل طرح سے اور نہ روکے رکھو ان کو ستانے کیلئے تاکہ ان پر زیادت کر دو اور جو ایسا

يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا

کر کجا نہ بیشک اپنا ہی نقصان کرے گا، اور مت ٹھہراؤ اللہ کے احکام کو ہنس

وَأَذْكُرُوا الْعَمَتِ اللَّهُ عَلَيْكُمْ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ

اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے اور اس کو جو اناری تم پر کتاب اور

وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ

علم کی باتیں کرتا ہے تم کو نصیحت کرتا ہے اس کے ساتھ اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ اللہ سب کچھ

بہر حال اس حدیث سے یہ بات باتفاق ثابت ہو کہ حضرت رکائٹہ کی طلاق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اُس وقت قرار دیا جب کہ انھوں نے علف کے ساتھ بیان دیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے تین طلاق کے الفاظ صریح اور صاف نہیں کہے تھے نہ پھر عین کی نیت نہ کرنے کا کوئی احتمال ہی نہ رہتا نہ ان سوال کی کوئی ضرورت رہتی۔ اس واقعہ نے یہ بات واضح کر دی کہ جن الفاظ میں یہ احتمال ہو کہ تین کی نیت کی ہے یا ایک ہی کی تاکید کی ہے، اُن میں آپ نے حلفی بیان پر ایک قرار دیدیا، کیونکہ زمانہ صدق و نیت کا تھا، اس کا احتمال بہت بعید تھا کہ کوئی شخص جھوٹی قسم کھالے۔

صدیق اکبرؓ کے عہد میں اور فاروق اعظمؓ کے ابتدائی عہد میں دو سال تک یہی طریقہ جاری رہا، پھر حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے زمانے میں یہ محسوس کیا کہ اب صدق و دیانت کا معیار گھٹ رہا ہے، اور آئندہ حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق اور گھٹ جائے گا، دوسری طرف ایسے واقعات کی کثرت ہو گئی کہ تین مرتبہ الفاظ طلاق کہنے والے اپنی نیت صرف ایک طلاق کی بیان کرنے لگے تو یہ محسوس کیا گیا کہ اگر آئندہ اسی طرح طلاق دینے والے کے بیان نیت کی تصدیق کر کے ایک طلاق قرار دی جاتی رہی تو بعید نہیں کہ لوگ شریعت کی دی ہوئی اس سہولت کو بے جا استعمال کرنے لگیں، اور بڑی کو واپس لینے کے لئے جھوٹ کہہ دیں کہ نیت ایک ہی کی تھی، فاروق اعظمؓ کی فراست اور انتظام دین میں دور بینی کو بھی صحابہؓ نے درست سمجھ کر اتفاق کیا، یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج مشناس تھے، انھوں نے سمجھا کہ اگر ہمارے اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہوتے تو یقیناً وہ بھی ایسے لوگ کی محفی نیت اور صاحب معاملہ کے بیان پر مدار رکھ کر فیصلہ نہ فرماتے، اس لئے قانون یہ بنادیا کہ اب جو شخص تین مرتبہ لفظ طلاق کا تکرار کرے گا اس کی تین ہی طلاقیں قرار دی جائیں گی اس کی یہ بات نہ سنی جائے گی کہ اس نے نیت صرف ایک طلاق کی کی تھی۔

حضرت فاروق اعظمؓ کے مذکورہ صدر واقعہ میں جو الفاظ منقول ہیں وہ بھی اسی مضمون کی شہادت دیتے ہیں، انھوں نے فرمایا:

ان الناس قد استعجلوا فی
امور کانت لهم فیہ اناة فلو
امضینا علیہم

”لوگ جلدی کرنے لگے ہیں ایک ایسے
مسائل میں جن میں اُن کے لئے ہلکت تھی،
تو مناسب یہ تھا کہ ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں“

حضرت فاروق اعظمؓ کے اس فرمان اور اس پر صحابہ کرامؓ کے اجماع کی یہ توجیہ جو بیان کی گئی ہے اس کی تصدیق روایات حدیث سے بھی ہوتی ہے، اور اس سے ان دونوں سوالوں

کا خود بخود حل نکل آتا ہے کہ روایات حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تین طلاق کو تین ہی سترار دے کر نافذ کرنا متعدد واقعات سے ثابت ہے، تو حضرت ابن عباسؓ کا یہ فرمانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ عہد رسالت میں تین کو ایک ہی مانا جاتا تھا، کیونکہ معلوم ہوا کہ ایسی طلاق جو تین کے لفظ سے دی گئی یا تکرار طلاق تین کی نیت سے کیا گیا اس میں عہد رسالت میں بھی تین ہی سترار دی جاتی تھیں ایک قرار دینے کا تعلق ایسی طلاق سے ہے جس میں ثلاث کی تصریح نہ ہو یا تین طلاق دینے کا سترار نہ ہو، بلکہ تین بطور تاکید کے کہنے کا دعویٰ ہو۔

اور یہ سوال بھی ختم ہو جاتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کو ایک قرار دیا تو فاروق اعظمؓ نے اس کی مخالفت کیوں کی، اور صحابہ کرامؓ نے اس سے اتفاق کیسے کر لیا، کیونکہ اس صورت میں فاروق اعظمؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی سہولت کے بے جا استعمال سے روکا ہے، معاذ اللہ آپ کے کسی فیصلہ کے خلاف کیا یہاں کوئی شائبہ نہیں۔

اس طرح تمام اشکالات رفع ہو گئے، واللہ، اس جگہ مسئلہ طلاق ثلاث کی مکمل بحث اور اس کی تفصیلات کا احاطہ مقصود نہیں، وہ شرح حدیث میں بہت مفصل ہے، اور بہت سے علماء نے اس کو مفصل رسالوں میں بھی واضح کر دیا ہے، سمجھنے کے لئے اتنا بھی کافی ہو، واللہ العزیز العظیم

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَلْيُغْنِ أَجَلُهُنَّ فَامْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ

اور جب طلاق دی ختم نے عورتوں کو پھر پہنچیں اپنی مدت کو تو رکھ لو ان کو عرفانی دستور کے

سَرَّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا وَمَنْ

چھوڑ دو ان کو بھل طرح سے اور نہ روکے رکھو ان کو ستانے کیلئے تاکہ ان پر زیادت کر دو اور جو ایسا

يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا

کر کجا نہ بیشک اپنا ہی نقصان کرے گا، اور مت شعراء اللہ کے احکام کو ہنس

وَأَذْكُرُوا لِعَمَتِ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ

اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے اور اس کو جو اناری تم پر کتاب اور

وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ

علم کی باتیں کرتا ہے تم کو نصیحت کرتا ہے اس کے ساتھ اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ اللہ سب کچھ

عَلَيْكُمْ ۖ وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَلَبَعْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْصِلُوهُنَّ
 أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَائُوا بَيْنَهُمُ بِالْمَعْرُوفِ ۚ ذَٰلِكَ

جانتا ہے، اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر پورا کر چکیں اپنی عدت کو تو اب نہ رد کو ان کو

اَنْ يَنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَائُوا بَيْنَهُمُ بِالْمَعْرُوفِ ۚ ذَٰلِكَ

اس سے کہ نکاح کر لیں اپنے انہی خاوندوں سے جبکہ ماضی ہو جاوے آپس میں موافق دستور کے یہ نصیحت

يُوعِظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكُمْ أَزْكَى

اس کو کی جاتی ہے جو کہ تم میں سے ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اس میں تمہارا راز

لَكُمْ وَأَظْهَرُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝

بڑی خبر ان پر اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۸، عورتوں اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دی ہو، پھر وہ اپنی عدت گزرنے کے قریب پہنچ جائیں تو تم کو مطلق رکھنے کی ممانعت

ان کو قاعدہ کے موافق (رجعت کر کے) نکاح میں رہنے دو، یا قاعدہ کے موافق ان کو

رہائی دو، اور ان کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے مت رد کو اس ارادہ سے کہ ان پر ظلم کیا جائے، اور جو شخص یہاں

برتاؤ کرے گا تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، اور حق تعالیٰ کے احکام کو کھینچ دینا، اور حق تعالیٰ کی جرم پر نصیبیہ بیان

کوداد کر دے، اور جو شخص کتاب و حکمت کی باتوں کو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر اس حیثیت سے مازل فرمائی ہے کہ ان کے

ذریعہ تم کو نصیحت فرماتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔

حکم نمبر ۲۹، عورتوں کو نکاح ثانی اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دیدو اور عورتیں اپنی میعادِ عدت پوری کر چکیں

سے منع کرنے کی ممانعت تو تم ان کو اس امر سے مت رد کو کہ وہ اپنے (تجویز کے ہوئے) شوہروں سے طلاق

کر لیں، جبکہ باہم سب رضا مند ہو جائیں قاعدہ کے موافق، اس ضمن سے نصیحت کی جاتی ہے اس شخص کو جو تم میں سے

اللہ تعالیٰ اور روزِ قیامت پر یقین رکھتا ہو، اس نصیحت کا قبول کرنا تمہارے لئے زیادہ مفید اور زیادہ پاکی کی

بات ہے، اور اللہ تعالیٰ (تمہاری مصلحتوں کو) جانتے ہیں تم نہیں جانتے۔

معارف و مسائل

ان سے پہلے بھی وہ آیتوں میں قانونِ طلاق کی اہم دشمنات اور اسلام میں طلاق کا عادلانہ اور معتدلانہ

نظام قرآن کریم کے حکیمانہ اسلوب کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے، اب مذکورہ اصول و ذرائع میں چند احکام و مسائل مذکور ہیں۔

احکام طلاق کے بعد رجعت یا انقطاع پہلی آیت میں پہلا مسئلہ یہ ارشاد ہوا ہے کہ جب مطلقہ جہی

نکاح دونوں کے لئے خاص ہدایت عورتوں کی عدت گزرنے کے قریب آئے تو شوہر کو دو اختیار

حاصل ہیں، ایک یہ کہ رجعت کر کے اس کو اپنے نکاح میں رہنے دے، دوسرے یہ کہ رجعت نہ

کرے، اور تعلقِ نکاح ختم کر کے اس کو بالکل آزاد کر دے۔

لیکن دونوں اختیاروں کے ساتھ قرآن کریم نے یہ قید لگائی کہ رکھنا ہو تو قاعدہ کے

مطابق رکھا جائے، اور چھوڑنا ہو تب بھی شرعی قاعدے کے مطابق چھوڑا جائے، اس میں

بالکلیہ حق کا لفظ دونوں جگہ ملتا ہے، لہذا اس کی طرف اشارہ فرما دیا ہے کہ رجعت کے

لئے بھی کچھ شرائط اور قواعد ہیں اور آزاد کرنے کے لئے بھی، دونوں حالتوں میں سے جس کو بھی

اختیار کرے شرعی قاعدے کے موافق کرے، بعض وقتی غصے یا جذبات کے ماتحت نہ کرے اور

عورتوں کے شرعی قواعد کا کچھ حصہ تو خود قرآن میں بیان کر دیا گیا ہے، باقی تفصیلات رسولِ کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں۔

مثلاً اگر واقعہ طلاق کے بعد مفارقت کے ناگوار احوال کا خیال کر کے رائے یہ ہو جائے

کہ رجعت کر کے نکاح قائم رکھنا ہے تو اس کے لئے شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے خصہ ناراضی

کو دل سے نکال کر خیر معاشرت کے ساتھ زندگی گزارنا اور حقوق کی ادائیگی کا خیال رکھنا

پیش نظر ہو، عورت کو اپنی قید میں رکھ کر سستانا اور تکلیف پہنچانا مقصود نہ ہو، اسی کے لئے آیت

مذکورہ میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے گئے، وَلَا تَمْسِكُوهُنَّ جُنَاحًا لِّغَضَبٍ ۚ یعنی عورتوں کو اپنی

نکاح میں اس لئے نہ رد کو کہ ان پر ظلم کر دو۔

دوسرا قاعدہ رجعت کا یہ ہے جو سورۃ طلاق میں ذکر کیا گیا ہے، وَأَشْهَدُ وَأَذْهَبُ

عَنْكُمْ وَمَنْ أَقْبَلَ الشَّهَادَةَ فَلَهُ (۲۰۶۵)، اور آپس میں سے دو معتبر شخصوں کو گواہ کرنا، پھر اگر

گواہی کی حاجت پڑے تو ٹھیک ٹھیک اللہ کے واسطے بلا دروغی گواہی دو۔

مطلب یہ ہے کہ جب رجعت کا ارادہ کر دو تو اس پر دو معتبر مسلمانوں کو گواہ بنا لو، اس

میں کوئی فائدہ نہیں، ایک یہ کہ اگر عورت کی طرف سے رجعت کے خلاف کوئی دعویٰ ہو تو اس

گواہی سے کام لیا جاسکے۔

دوسرے خود انسان کو اپنے نفس پر بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہئے، اگر رجعت پر شہادت

کا قاعدہ نہ جاری کیا جاتے تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص عدت پوری گذر جانے کے بعد بھی اپنی

غرض یا شیطانی اغواء سے یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ میں نے عدت گزرنے سے پہلے رجعت کر لی تھی۔

ان مفاسد کے انسداد کے لئے قرآن نے یہ قاعدہ مقرر فرما دیا کہ رجعت کر دو تو اس پر

فرمایا گیا کہ اگر ان دونوں کی رضامندی نہ ہو کوئی کسی پر زور نہ بردستی کرنا چاہے تو سب کو روکنے کا حق ہے، یا رضامندی بھی ہو مگر شرعی قاعدہ کے موافق نہ ہو، مثلاً بلا نکاح آپس میں میاں بیوی کی طرح رہنے پر رضامند ہو جائیں، یا تین طلاقیں کے بعد ناجائز طور پر آپس میں نکاح کر لیں، یا ایام عدت میں دوسرے شوہر سے نکاح کا ارادہ ہو تو ہر مسلمان کو یا مخصوص اُن لوگوں کو جن کا ان مرد و عورت کے ساتھ تعلق ہے روکنے کا حق حاصل ہے، بلکہ بھترہ استطاعت روکنا واجب ہے۔

اسی طرح کوئی لڑکی بلا اجازت اپنے اولیاء کے اپنے کفو کے خلاف دوسرے کفو میں نکاح کرنا چاہے، یا اپنے ہر مثل سے کم پر نکاح کرنا چاہے جس کا اثر خاندان پر پڑتا ہے جس کا اس کو حق نہیں، تو یہ رضامندی بھی قاعدہ شرعی کے مطابق نہیں، اس صورت میں لڑکی کے اولیاء کو اس نکاح سے روکنے کا حق حاصل ہے، اِذَا نَزَّاهُنَّ مِمَّا فَتَاكِ الْفَاطِمَةُ اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ مائتہ بالغہ لڑکی کا نکاح بغیر اس کی رضایا اجازت کے نہیں ہو سکتا۔

آیت کے آخر میں تین جملے ارشاد فرمائے گئے، ایک یہ کہ ذَلِكُمْ يُوعَظُ بِهِ مَنِ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، یعنی یہ احکام اُن لوگوں کے لئے ہیں جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، اس میں اشارہ نہرا دیا گیا کہ اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آدمی ان احکام الہیہ کا پورا پابند ہو، اور جو لوگ ان احکام کے اتباع میں کوتاہی کرتے ہیں وہ سمجھ لیں کہ ان کے ایمان میں خلل ہے۔

دوسرا جملہ یہ ارشاد نہرا دیا کہ ذَلِكُمْ اَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ وَالْحَقُّ ان احکام کی پابندی تمہارے لئے پائی اور صفائی کا ذریعہ ہے، اس میں اشارہ فرمایا گیا کہ ان کی خلاف ورزی کا نتیجہ گناہوں کی غلاظت میں آلودگی اور فتنہ و فساد ہے، کیونکہ عاتقہ بالغہ جو ان لڑکیوں کو مطلقاً نکاح سے روکا گیا تو ایک طرف اُن پر ظلم اور ان کی حق تلفی ہے، اور دوسری طرف اُن کی عفت و عصمت کو خطرہ میں ڈالتا ہے، تیسرے اگر خدا نخواستہ وہ کسی گناہ میں مبتلا ہوں، تو اس کا وبال ان لوگوں پر بھی عائد ہوگا جنہوں نے ان کو نکاح سے روکا، اور وبال آخرت سے پہلے بہت ممکن ہے کہ ان مجبور عورتوں کا یہ ابتلا خود مردوں میں جنگ و جدال اور قتل و قتال تک فوبت پہنچائے جیسا کہ رات دن مشاہدہ میں آتا ہے، اس صورت میں وبال آخرت سے پہلے ان کا عمل دنیا ہی میں وبال بن جائے گا، اور اگر مطلقاً نکاح سے تو نہ روکا، مگر ان کی پسند کے خلاف دوسرے شخص سے نکاح پر مجبور کیا گیا تو اس کا نتیجہ بھی دائمی مخالفت اور فتنہ و فساد یا طلاق و خلع ہوگا، جس کے ناگوار

اثرات ظاہر ہیں، اس لئے فرمایا گیا کہ ان کو ان کے تجویز کئے ہوئے شوہروں سے نکاح کرنے سے روکنا ہی تمہارے لئے پائی اور صفائی کا ذریعہ ہے۔

تیسرا جملہ یہ ارشاد نہرا دیا کہ ذَلِكُمْ يَعْظَمُ لَا تَعْلَمُونَ یعنی تمہاری مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ جانتے ہیں تم نہیں جانتے، اس ارشاد کا منشا یہ ہے کہ جو لوگ مطلقہ عورتوں کو نکاح سے روکتے ہیں وہ اپنے نزدیک اس میں کچھ مصالح اور فوائد سوچتے ہیں، مثلاً اپنی عزت و غیرت کا تحفظ، یا یہ کہ ان کی شادی کے بدلے کچھ مالی منفعت حاصل کی جائے، اس شیطانی تمکبیس اور بے جا مصلحت اندیشی کے ازالہ کے لئے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مصلحتوں اور فائدوں سے خوب واقف ہیں، اُن کی رعایت کر کے احکام دیتے ہیں، اور تم چونکہ حقان امور اور معاملات کے انجام سے بے خبر ہو، اس لئے اپنے ناتمام غور و فکر اور ناقص رائے سے کبھی ایسی چیزوں کو مصلحت اور فائدہ سمجھ لیتے ہو جن میں تمہاری ہلاکت و بربادی ہے، تم جس عزت و غیرت کو سمجھتے پھرتے ہو مگر مطلقہ عورتیں بے قابو ہو گئیں تو سب عزت خاک میں مل جائے گی، اور مالی منافع کے ناجائز تصورات ممکن ہے کہ تمہیں ایسے فتنوں اور جھگڑوں میں مبتلا کر دیں جن میں مال کے ساتھ جان کا بھی خطرہ ہو جائے۔

قرآن کریم نے اس جگہ ایک قانون پیش فرمایا کہ مطلقہ عورتوں کو اپنی مرضی کے مطابق نکاح سے روکنا جرم ہے، اس قانون کو بیان فرمانے کے بعد اس پر عمل کرنے کو سہل اور اس کے لئے عوام کے ذہنوں کو ہموار کرنے کے واسطے تین جملے ارشاد فرمائے جن میں سے پہلے جملے میں روز قیامت کے صاب اور جہانم کی سزا سے ڈرا کر انسان کو اس قانون پر عمل کرنے کے لئے آمادہ فرمایا، دوسرے جملے میں اس قانون کی خلاف ورزی میں جو مفسد اور انسانیت کے لئے مضر ہیں ان کو مبتلا کر قانون کی پابندی کے لئے تیار کیا، تیسرے جملے میں یہ ارشاد فرمایا کہ تمہاری اپنی مصلحت بھی اسی میں ہے کہ خدا تعالیٰ کے بتائے ہوئے قانون کی پابندی کرو، اس کے خلاف کرنے میں اگر تم کوئی مصلحت سوچتے ہو تو وہ تمہاری کوتاہ نظری اور عواقب سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔

قرآن کریم کا یہ اسلوب اور طرز بیان صرف یہیں نہیں بلکہ تمام احکام میں جاری ہے، کہ ایک قانون بتایا جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ اور آخرت کے حساب و عذاب سے ڈرایا جاتا ہے، ہر قانون کے آگے بھی اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی يَبْصُرُ مَا تَعْمَلُونَ، اِنَّ اللّٰهَ يَبْصُرُ مَا تَعْمَلُونَ، وغیرہ جملے لگائے ہوئے ہیں، قرآن ساری دنیا اور قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے ایک مکمل نظام حیات اور ہر شعبہ زندگی پر حاوی قانون

ہو، اس میں حدود و تعزیرات کا بھی بیان ہے، لیکن اس کی اداساری دنیا کے قانون کی کتابوں سے نرالی ہے، اس کا طرز بیان حاکمانہ سے زیادہ مرتبہ ہے، اس میں ہر قانون کے بیان کے ساتھ اس کی سرکشی کی گئی ہے کہ کوئی انسان اس قانون کی خلاف ورزی کر کے مستحق سزا نہ بنے، دنیا کی حکومتوں کی طرح نہیں کر انھوں نے ایک قانون بنادیا، اور مشالہ کر دیا جو کوئی اس قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ اپنی سزا اٹھاتا ہے۔

اس کے علاوہ اس اسلوب قرآن اور اس کے مخصوص انداز بیان سے ایک دُور رس بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کو دیکھنے سے بچنے کے بعد انسان اس قانون کی پابندی صرف اس بنا پر نہیں کرتا کہ اگر خلاف کرے گا تو دنیا میں اس کو کوئی سزا مل جائے گی، بلکہ دنیا کی سزا سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور آخرت کی سزا کی فکر ہوتی ہے، اور اسی فکر کی بنا پر اس کا ظاہر و باطن خفیہ و علانیہ برابر ہو جاتا ہے، وہ کسی ایسی جگہ میں بھی قانون کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا جہاں کسی ظاہری یا خفیہ پولیس کی بھی رسائی نہ ہو، کیونکہ اس کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ ہر جگہ حاضر و ناظر اور ذرہ ذرہ سے باخبر ہیں، یہی سبب ہے کہ فشر آئی تعلیم نے جو اصول معاشرت تیار کئے تھے ہر مسلمان اس کی پابندی کو اپنا مقصد حیات تصور کرتا تھا۔

فشر آئی نظام حکومت کا یہی مستیاز ہے کہ اس میں ایک طرف قانون کی حدود و قیود کا ذکر ہے، فرد دوسری طرف تربیت و تہذیب کے ذریعہ انسان کے اخلاق و کردار کو ایسا بلند کیا گیا ہے کہ قانونی حدود و قیود اس کے لئے ایک طبعی چیز بن جاتی ہیں، جس کے سامنے وہ اپنے جذبات اور تمام نفسانی خواہشات کو پس پشت ڈال دیتا ہے، دنیا کی حکومتوں اور قوموں کی تاریخ اور انہیں جسرم و سزائے واقعات پر ذرا گہری نظر ڈالنے تو معلوم ہو گا کہ نرے قانون سے کبھی کسی قوم یا فرد کی اصلاح نہیں ہوتی محض پولیس اور فوج سے کبھی جرائم کا انسداد نہیں ہوا جب تک قانون کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے خوف و عظمت کا بسکہ اس کے قلب پر نہ بیٹھے، جرائم سے روکنے وال چیز دراصل خوف خدا اور خوف حساب آخرت ہے، یہ نہ ہو تو کوئی شخص کسی سے جرائم کو نہیں چھڑا سکتا۔

وَالْوَالِدَتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ

اور بچے والی عورتیں دودھ پلا دیں اپنے بچوں کو دو برس پورے جو کوئی چاہے کہ پوری

أَنْ يُمْلِمَ الرِّضَاعَةَ عَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِشْقُهُنَّ وَكِتَابَتُهُنَّ

کرے دودھ کی دھت اور لڑکے والے لین باپ پر ہے کھانا اور کپڑا اُن عورتوں کا

بِالْمَعْرُوفِ لَا تَكْلَفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَارُّ وَالِدٌ بَوْلًا

موانع دستور کے، تکلیف نہیں دی جاتی کسی کو مگر اس کی گنجائش کے موافق، نہ نقصان دیا جائے اور اس کے بچہ کی

وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِرَدٍّ وَعَلَى الْوَالِدِ مِثْلُ ذَلِكَ فَإِنْ أَرَادَ الْفَصْلُ

دو سے اور نہ اس کو جس کا وہ بچہ ہے لین باپ کو اس کے بچہ کی وجہ اور اڑوں پر بھی یہی لازم کہ پھر اگر باپ چاہیں کہ دودھ

عَنْ تَرْضَاهُ مِنْهُمَا وَتَشَاوِرْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَإِنْ أَرَادَ ثَمَرَانِ

پھر اگر باپ دودھ سے رضاعت دے تو اس پر کچھ عشاء نہیں اور اگر تم لوگ چاہو کہ دودھ

تَسْرِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا أَنَّمْتُمْ

پورا کسی دایہ سے اپنی اولاد کو تو بھی تم پر کچھ عشاء نہیں جب کہ حوالے کر دو جو تم نے دینا نہیں چاہتا

بِالْمَعْرُوفِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ

موانع دستور کے اور ڈرو اللہ سے اور جان لے کہ اللہ تمہارے سب کاموں کو خوب دیکھتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳ رضاعت | اور امیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دودھ پلایا کریں (یہ مدت اس کے لئے ہے) جو شیر خوارگی

کی تکمیل کرنا چاہے، اور جس کا بچہ ہے اس کے لئے ہے ان ماؤں کا کھانا کپڑا قاعدہ کے موافق، اور کسی شخص کو کوئی حکم نہیں دیا

جائے اگر اس کی برداشت کے موافق کسی ماں کو یہ نہیں ہو پھر پلانا چاہئے اس کے بچہ کی وجہ سے اور کسی کے بچہ کی تکلیف دینی

چاہئے اس کے بچہ کی وجہ سے اور اگر باپ زندہ نہ ہو تو (مثلاً طریق مذکور کے) بچہ کی پرورش کا انتظام) اس کے (محرم قرابت

دار کے) ذمہ ہے جو (شرعاً بچہ کا) وارث (ہونے کا حق رکھتا) ہے پھر (یہ بچہ لوگ) اگر دونوں (ماں اور باپ) دو سال تک (یا)

دودھ پھر پلانا چاہیں، یہی رضاعت دینا اور دستور سے تو بھی ان دونوں پر کسی قسم کا گناہ نہیں اور اگر تم لوگ (ماں باپ کے ہوتے

ہوئے بھی کسی معلوت ضروری سے مثلاً یہ کہ ماں کا دودھ اچھا نہیں پتہ کو منہ ہوگا) اپنے بچوں کو کسی اور ماں کا دودھ پلانا چاہو

تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، جبکہ اُن کے حوالے کر دو جو کچھ ان کو دینا ہے کیا ہے، قاعدہ کے موافق، اور حق تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور

یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھ رہا ہے۔

معارف و مسائل

اس آیت میں رضاعت یعنی بچوں کو دودھ پلانے کے متعلق احکام ہیں، اس سے پہلے اور بعد کی آیات میں طلاق کے احکام مذکور ہیں، درمیان میں دودھ پلانے کے احکام اس مناسبت سے

ذکر کئے گئے ہیں کہ عموماً طلاق کے بعد بچوں کی پرورش اور دودھ پلانے یا پلوانے کے معاملات زیر نزاع آجاتے ہیں، اور ان میں جھگڑے فساد ہوتے ہیں، اس لئے اس آیت میں ایسے مسئلہ احکام بیان فرمادیتے گئے جو عورت و مرد دونوں کے لئے سہل اور مناسب ہیں، خواہ دودھ پلانے یا چھڑانے کے معاملات قیام نکاح کی حالت میں پیش آئیں یا طلاق دینے کے بعد، بہرہ و مشورہ اس کا ایک ایسا نظام بتا دیا گیا جس سے جھگڑے فساد یا کسی فرقہ پر ظلم و تعدی کا راستہ نہ رہے۔ مثلاً آیت کے پہلے جملے میں ارشاد فرمایا، وَالَّذِينَ اسْتَأْذَنُوا فَارْجُوهُمْ اؤ لاکہ ہن عورتین خواہن لیکن آما اذ ان یقیمہ الرضاعتہ، یعنی مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلایا کریں دو سال کامل جبکہ کوئی عذر قوی اس سے پہلے دودھ پھڑانے کے لئے مجبور نہ کرے۔

اس آیت سے رضاعت کے چند مسائل معلوم ہوئے۔

دودھ پلانا ماں کے اول یہ کہ دودھ پلانا دیا نہ ماں کے ذمہ واجب ہے، بلا عذر کسی عذرا ناراضی کے ذمہ واجب ہے سبب دودھ نہ پلانے تو گنہگار ہوگی، اور دودھ پلانے پر وہ شوہر سے کوئی اجرت و معاوضہ نہیں لے سکتی، جبکہ اس کے اپنی نکاح میں ہو، کیونکہ وہ اس کا اپنا فرض ہے۔

پوری مدت رضاعت دو سہرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ پوری مدت رضاعت دو سال ہے، جب تک کوئی خاص عذر مبالغہ نہ ہو بچے کا حق ہے کہ یہ مدت پوری کی جائے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دودھ پلانے کے لئے پوری مدت دو سال دی گئی ہے، اس کے بعد دودھ نہ پلایا جائے، البتہ بعض آیات قرآن اور احادیث کی بناء پر امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک اگر تین مہینے یعنی ڈھائی سال کے عرصہ میں بھی دودھ پلادیا تو احکام رضاعت کے ثابت ہو جائیں گے، اور اگر بچے کی کمزوری وغیرہ کے عذر سے ایسا کیا گیا تو گناہ بھی نہ ہوگا، ڈھائی سال پورے ہونے کے بعد بچہ کو ماں کا دودھ پلانا باتفاق حرام ہے۔

اس آیت کے دوسرے جملے میں ارشاد ہے وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ لاکہ تمکلف نفس الا و شعہا، یعنی باپ کے ذمہ ہے ماؤں کا کھانا اور کپڑا قاعدہ کے موافق، کسی شخص کو ایسا حکم نہیں دیا جاتا جس کو وہ برداشت نہ کر سکے۔

اس میں پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ ماؤں کے لئے تو قرآن نے لفظ وَالَّذِينَ اسْتَأْذَنُوا استعمال کیا، مگر باپ کے لئے مختصر لفظ وَالَّذِينَ چھوڑ کر وَالْمَوْلُودِ لَهُ اختیار فرمایا، حالانکہ قرآن میں دوسری جگہ لفظ والد بھی مذکور ہے، وَالَّذِينَ اسْتَأْذَنُوا سے ظاہر ہے کہ یہاں والد کی جگہ مَوْلُودِ کے اختیار کرنے میں ایک خاص راز ہے، وہ یہ کہ پورے قرآن کریم کا ایک خاص اسلوب اور طریق بیان ہے کہ وہ کسی قانون کو دنیا کی حکومتوں کی طرح بیان نہیں کرتا، بلکہ مرتبہ اور مشفقانہ

طرز سے بیان کرتا ہے، اور ایسے انداز سے بیان کرتا ہے، جس کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا انسانی کے لئے آسان ہو جائے۔

یہاں بھی چونکہ بچے کا نفقہ باپ کے ذمہ ڈالا گیا ہے، حالانکہ وہ ماں باپ کی مستاع مشترک ہے، تو ممکن تھا کہ باپ کو یہ حکم کچھ بھاری معلوم ہو اس لئے بچے والے کے حقوق کا لحاظ اختیار کیا (وہ شخص جس کا بچہ ہے) اس میں اس طرف اشارہ کر دیا کہ اگرچہ بچے کی تولید میں ماں اور باپ دونوں کی شرکت ضرور ہے، مگر بچہ باپ ہی کا کہلاتا ہے، نسب باپ ہی سے چلتا ہے، اور جب بچہ اس کا ہوا تو ذمہ داری خرچ کی اس کو بھاری نہ معلوم ہونی چاہئے۔

بچے کو دودھ پلانا ماں کے ذمہ تقسیم المسئلہ شرعیہ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ اگرچہ دودھ پلانا اور ماں کا نان و نفقہ و ضرورتا ماں کے ذمہ ہے، لیکن ماں کا نان نفقہ اور ضروریات زندگی باپ باپ کے ذمہ ہیں کے ذمہ ہے، اور یہ ذمہ داری جس وقت تک بچے کی ماں اس کے نکاح میں یا عدت میں ہے اس وقت تک اور طلاق اور عدت پوری ہونے کے بعد نفقہ ضرورتاً خود جیت تو ختم ہو جائے گا، مگر بچے کو دودھ پلانے کا معاوضہ دینا باپ کے ذمہ پھر بھی لازم رہے گا (منظری)

زوج کا نفقہ شوہر کی حیثیت چوتھا مسئلہ اس پر اتفاق ہے کہ بیاہن پوری دونوں امیر مالدار ہوں تو نفقہ طرہ کے مناسب ہونا چاہئے یا زوج کی واجب ہوگا اور دونوں غریب ہوں تو نفقہ غریبانہ واجب ہوگا، البتہ جب دونوں کے حالات مالی مختلف ہوں تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، صاحب ہدایہ نے خصائص کے اس قول پر فتویٰ دیا ہے کہ عورت غریب اور مرد مال دار ہو تو اس کا نفقہ درمیانہ حیثیت کا دیا جائے گا کہ غریبوں سے زائد مال داروں سے کم، اور گرجی کے نزدیک اعتبار شوہر کے حال کا ہوگا، فتح القدیر میں بہت فقہاء کا فتویٰ اس پر نقل کیا ہے، واللہ اعلم فتح القدیر جلد ۲

آیت مذکورہ میں احکام کے بعد ارشاد فرمایا لَا تَنْصَرِفُوا إِلَىٰ ذَٰلِكُمْ لاکہ تو کسی کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف میں ڈالنا جائز ہے، اور نہ کسی باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے، مطلب یہ ہے کہ بچے کے ماں باپ آپس میں عداوت نہ کریں، مثلاً ماں دودھ پلانے سے معذور ہو اور باپ اس پر یہ سمجھ کر زبردستی کرے کہ آخر اس کا بھی تو بچہ ہے، یہ مجبور ہوگی اور پلا دے گی، یا باپ مفلس ہے، اور ماں کو کوئی معذوری بھی نہیں پھر دودھ پلانے سے اس لئے انکار کرے کہ اس کا بھی تو بچہ ہے، جھک مار کر کسی سے پلوالے گا۔

ماں کو دودھ پلانے پر مجبور لَا تَنْصَرِفُوا إِلَىٰ ذَٰلِكُمْ لاکہ تو کسی کو اس کے بچے کی وجہ سے کسی ضرورت کے سبب انکار کرے کرنے یا نہ کرنے کی تفصیل ماں اگر بچے کو دودھ پلانے سے کسی ضرورت کے سبب انکار کرے

تو باپ کو اسے مجبور کرنا جائز نہیں، اور اگر بچہ کسی دوسری عورت یا جانور کا دودھ نہیں لیتا تو ماں کو مجبور کیا جائے گا، یہ مسئلہ وَلَا مَوْلَاؤُ ذَا لَكَ بِتَوْلَدِہِ سے معلوم ہوا۔

عورت جب تک سحاح میں ہے چھٹا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر بچہ کی ماں دودھ پلانے کی اجرت تو اپنے بچے کو دودھ پلانے کی اجرت سے قوجب تک اس کے سحاح یا عدت کے اندر ہے، اجرت کے مطالبہ کا حق نہیں، یہاں اس کا مان نفقہ جو باپ کے ذمہ ہے وہی کافی ہے، مزید اجرت کا مطالبہ باپ کو ضرر پہنچاتا ہے، اور اگر طلاق کی عدت گزر چکی ہے اور نفقہ کی ذمہ داری ختم ہو چکی ہے، اب اگر یہ مطلقہ بیوی اپنے بچے کو دودھ پلانے کا معاوضہ باپ سے طلب کرتی ہے تو باپ کو دینا پڑے گا، کیونکہ اس کے خلاف کرنے میں ماں کا نقصان ہے، شرط یہ ہے کہ یہ معاوضہ اتنا ہی طلب کرے کہ جتنا کوئی دوسری عورت لیتی ہے، زائد کا مطالبہ کرے گی تو باپ کو حق ہوگا کہ اس کی بجائے کسی آنا کا دودھ پلاوے۔

قیم بچے کے دودھ پلانے آیت متذکرہ میں اس کے بعد یہ ارشاد ہے: **وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ** یعنی اگر باپ زندہ نہ ہو تو بچے کو دودھ پلانے یا پلانے کا انتظام اس شخص پر ہے جو بچے کا جائز وارث اور محرم ہو، یعنی اگر بچہ مر جائے تو جن کو اس کی وراثت پہنچتی ہو وہی باپ نہ ہونے کی حالت میں اس کے نفقہ کے ذمہ دار ہوں گے، اگر ایسے وارث کئی ہوں تو ہر ایک پر بقدر میراث اس کی ذمہ داری عائد ہوگی، امام اعظم ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ قیم بچے کو دودھ پلانے کی ذمہ داری وارث پر ڈالنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نابالغ بچے کا خرچہ دودھ پھرانے کے بعد بھی وارثوں پر ہوگا، کیونکہ دودھ کی کوئی خصوصیت نہیں، مقصود بچے کا گذارہ ہے، مثلاً اگر قیم بچے کی ماں اور دادا زندہ ہیں تو یہ دونوں اس بچے کے محرم بھی ہیں، اور وارث بھی، اس لئے اس کا نفقہ ان دونوں پر بقدر حصہ میراث عائد ہوگا، یعنی ایک ہتائی خرچہ ماں کے ذمہ اور دو ہتائی دادا کے ذمہ ہوگا، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قیم پوتہ کا حق دادا پر اپنے نابالغ بیٹوں سے بھی زیادہ ہو، کیونکہ بالغ اولاد کا نفقہ اس کے ذمہ نہیں اور قیم پوتے کا نفقہ اس کے ذمہ واجب ہے، ہاں میراث میں بیٹوں کے موجود ہوتے ہوئے پوتے کو حقدار بنانا اصول میراث اور انصاف کے خلاف ہے، کہ قریب تر اولاد کے ہوتے ہوئے بعید کو دینا معقول بھی نہیں، اور صحیح بخاری کی حدیث لَا ذَنْبَ رَجُلٍ ذَكَرَہِ بَعْدَہِ خَلَاۡفَہُ ہے، البتہ دادا کو یہ حق ہے کہ اگر ضرورت ہے تو قیم پوتہ کے لئے کچھ وصیت کر جائے، اور یہ وصیت بیٹوں کے حصہ سے زائد بھی ہو سکتی ہے اسی طرح قیم پوتہ کی ضرورت کو بھی پورا کر دیا گیا اور وراثت کا اصول کہ قریب کے ہوتے ہوئے بعید کو نہ دیا جائے یہ بھی محفوظ رہا۔

دودھ چھڑانے کے احکام اس کے بعد آیت متذکرہ میں ارشاد ہوتا ہے **وَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا**، یعنی اگر بچے کے ماں باپ دونوں آپس کی رضامندی اور باہمی مشورے سے یہ ارادہ کریں کہ شیر خواری کی مدت یعنی دو سال سے کم میں ہی دودھ چھڑادیں، خواہ ماں کی معذوری کے سبب یا بچے کی کسی بیماری کے سبب، تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں، آپس کے مشورے اور رضامندی کی مشروط اس لئے لگائی کہ دودھ چھڑانے میں بچے کی مصلحت پیش نظر ہونی چاہئے، آپس کے لڑائی جھگڑے کا بچے کو سختہ مشق نہ بنائیں۔

ماں کے سوا دوسری عورت آخر میں ارشاد فرمایا گیا **وَإِنْ أَرَادَتْ أَنْ تَرْضِعُوهُ فَاجْعَلُوا لَهُ مِثْلَ مَا يُرِضُهَا**، **فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ لَتِئْتُنَّ بِالنَّعْتِ وَلَا لِيُنَّ بِالنَّعْتِ** اگر تم یہ چاہو کہ اپنے بچوں کی کسی مصلحت سے ماں کی بجائے کسی آنا کا دودھ پلاؤ تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں، شرط یہ ہے کہ دودھ پلانے والی کی ہوا اجرت معسرہ کی گئی تھی وہ پوری پوری ادا کر دیں، اور اگر اس کو معسرہ اجرت نہ دی گئی تو اس کا گناہ ان کے ذمہ نہیں گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ماں دودھ پلانے پر راضی ہے لیکن باپ یہ دیکھتا ہے کہ ماں کا دودھ بچے کے لئے مضر ہے تو ایسی حالت میں اس کو حق ہے کہ ماں کو دودھ پلانے سے روک دے اور کسی آنا سے پلاوے۔

اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ جس عورت کو دودھ پلانے پر رکھا جائے اس سے معاملہ تنخواہ یا اجرت کا پوری صفائی کے ساتھ طے کر لیا جائے کہ بعد میں جھگڑا نہ پڑے، اور پھر وقت مقررہ پر یہ طے شدہ اجرت اس کو سپرد بھی جائے، اس میں مال مثول نہ کرے۔

یہ سب احکام رضاعت بیان کرنے کے بعد قرآن نے اپنے مخصوص اذکار و اسلوا کے ساتھ قانون پر عمل کو آسان کرنے اور ظاہر و غائب ہر حال میں اس کا پابند رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کے علم محیط کا تصور سامنے کر دیا، ارشاد ہوتا ہے **وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ** یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور یہ سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کھلے اور چھپے اور ظاہر و غائب کو پوری طرح دیکھ رہا ہے، اور وہ تمہارے دلوں کے غمی ارادوں اور نیٹوں سے باخبر ہیں، اگر کسی فریق نے دودھ پلانے یا چھڑانے کے مذکورہ احکام کی خلاف ورزی کی یا بچے کی مصلحت کو نظر انداز کر کے اس بارے میں کوئی فیصلہ کیا تو وہ حق سزا ہوگا

وَالَّذِينَ يَتَّبِعُونَ مَنَکُہِمْ دُونَ أَمْرٍ آجَائٍ لَّنْ بَصِيرٌ اور جو لوگ مجاہدین ختم میں سے اور چھوڑ جا دیں اپنی عورتیں تو جانے کہ وہ عورتیں انتظام میں کیسی ہیں

أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ۖ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا

فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝ وَلَا جُنَاحَ

عَلَيْكُمْ فِي مَا عَرَضْتُمْ بِهِ مِنْ خُطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنُتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ

ثُمَّ بَرَأْتُمْ مِنْ تِلْكَ الْفَوَاحِشِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَصَدِّقُونَ ۝

ثُمَّ بَرَأْتُمْ مِنْ تِلْكَ الْفَوَاحِشِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَصَدِّقُونَ ۝

ثُمَّ بَرَأْتُمْ مِنْ تِلْكَ الْفَوَاحِشِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَصَدِّقُونَ ۝

ثُمَّ بَرَأْتُمْ مِنْ تِلْكَ الْفَوَاحِشِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَصَدِّقُونَ ۝

ثُمَّ بَرَأْتُمْ مِنْ تِلْكَ الْفَوَاحِشِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَصَدِّقُونَ ۝

ثُمَّ بَرَأْتُمْ مِنْ تِلْكَ الْفَوَاحِشِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَصَدِّقُونَ ۝

ثُمَّ بَرَأْتُمْ مِنْ تِلْكَ الْفَوَاحِشِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَصَدِّقُونَ ۝

ثُمَّ بَرَأْتُمْ مِنْ تِلْكَ الْفَوَاحِشِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَصَدِّقُونَ ۝

ثُمَّ بَرَأْتُمْ مِنْ تِلْكَ الْفَوَاحِشِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَصَدِّقُونَ ۝

ثُمَّ بَرَأْتُمْ مِنْ تِلْكَ الْفَوَاحِشِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَصَدِّقُونَ ۝

ثُمَّ بَرَأْتُمْ مِنْ تِلْكَ الْفَوَاحِشِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَصَدِّقُونَ ۝

ثُمَّ بَرَأْتُمْ مِنْ تِلْكَ الْفَوَاحِشِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَصَدِّقُونَ ۝

ثُمَّ بَرَأْتُمْ مِنْ تِلْكَ الْفَوَاحِشِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَصَدِّقُونَ ۝

ثُمَّ بَرَأْتُمْ مِنْ تِلْكَ الْفَوَاحِشِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَصَدِّقُونَ ۝

ثُمَّ بَرَأْتُمْ مِنْ تِلْكَ الْفَوَاحِشِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَصَدِّقُونَ ۝

ثُمَّ بَرَأْتُمْ مِنْ تِلْكَ الْفَوَاحِشِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَصَدِّقُونَ ۝

ثُمَّ بَرَأْتُمْ مِنْ تِلْكَ الْفَوَاحِشِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَصَدِّقُونَ ۝

ثُمَّ بَرَأْتُمْ مِنْ تِلْكَ الْفَوَاحِشِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَصَدِّقُونَ ۝

ثُمَّ بَرَأْتُمْ مِنْ تِلْكَ الْفَوَاحِشِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَصَدِّقُونَ ۝

ثُمَّ بَرَأْتُمْ مِنْ تِلْكَ الْفَوَاحِشِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَصَدِّقُونَ ۝

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۱۲: شوہر کی وفات کے بعد اگر عورت نے اپنے شوہر سے چار مہینے اور دس دن پہرے (یعنی عید کی) میعاد

تعمیم کر لیں تو تم کو (بھی) کچھ گناہ نہ ہوگا، ایسی بات کہ عورتیں اپنی ذات

کے لئے کچھ کارروائی (نکاح کی) کریں قاعدہ کے موافق (البتہ اگر کوئی بات خلاف قاعدہ شرع

کے کریں اور تم باوجود روک ٹوک کے ذرا دیر تو تم بھی شریک گناہ ہو گے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال کی خبر رکھتے ہیں،

حکم نمبر ۱۳: عورت میں (نکاح) دینے کے بارے میں کوئی بات (اشارہ) کہہ دو (مثلاً یہ کہ مجھ کو ایک نیک

عورت سے نکاح کی ضرورت ہے) یا اپنے دل میں (آئندہ نکاح کرنے کے ارادہ کو) پوشیدہ رکھو جب

بھی گناہ نہیں اور وہ اس اجازت کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات معلوم ہے کہ تم ان عورتوں کا

(ضرور) ذکر ذکر کرو گے (سو خبر ذکر ذکر کرو) لیکن ان سے (صاف لفظوں میں) نکاح کا وعدہ

داد و منت (مست) کرو مگر یہ کہ کوئی بات قاعدہ کے موافق ہو ورنہ منافقہ نہیں، اور وہ بات

قاعدہ کے مطابق یہی ہے کہ اشارہ (کو) اور تم تعین نکاح (فی الحال) کا ارادہ بھی مست کرو،

یہاں تک کہ عدت اپنے مقررہ وقت پر ختم ہو جائے، اور یقین رکھو اس کا کہ اللہ تعالیٰ کو اطلاع ہے تمہارے

دلوں کی بات کی سوا اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو اور ناجائز امر کا دل میں ارادہ بھی مت کیا کرو، اور (یہ بھی)

یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ معاف بھی کرنے والے ہیں اور حلیم بھی ہیں۔

معارف مسائل

عدت کے (۱) جس کا خاوند مر جائے اس کو عدت کے اندر خوشبو لگانا، سنگھار کرنا، سرمد اور تیل

بل ضرورت دوا لگانا، مہندی لگانا، رنگین کپڑے پہننا درست نہیں، اور صریح گفتگو سے نکاح

ثانی بھی درست نہیں، جیسا اہل آیت میں آتا ہے، اور رات کو دوسرے گھر میں رہنا بھی درست

نہیں، ترجمہ میں نکاح کے ساتھ جو رخصت کہا گیا ہے اس سے یہی امور مراد ہیں، اور یہی حکم ہے

اس عورت کا جس پر طلاق یا تین واقع ہوئی، یعنی جس کا رجعت درست نہیں، مگر اس کو اپنے گھر

سے دن کو بھی بدون سخت مجبوری کے نکلنا درست ہے۔

(۲) اگر چاند رات کو خاوند کی وفات ہوئی تب تو یہ مہینے خواہ تیس کے ہوں خواہ انیس

کے ہوں، چاند کے حساب پر پورے کئے جاویں گے، اور اگر چاند رات کے بعد وفات ہوئی ہے

تو یہ سب مہینے تیس دن کے حساب پر پورے کئے جاویں گے، پس کل ایک سو تیس دن پورے

کریں گے، اس سلسلہ سے بہت لوگ غافل ہیں، اور جس وقت وفات ہوئی ہو جب یہ مدت

گزر کر وہی وقت آئے گا، عدت ختم ہو جاوے گی، اور یہ جو فرمایا کہ اگر عورتیں قاعدہ کے موافق کچھ

کریں تو تم کو بھی گناہ نہ ہوگا، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کوئی کام خلاف شرع کرے

تو اور دل پر بھی واجب ہوتا ہے کہ بشرط قدرت اس کو روکیں، ورنہ یہ لوگ بھی گنہگار ہوتے

ہیں، اور قاعدہ کے موافق سے یہ مراد ہے کہ جو نکاح تجویز ہو وہ مشرفاً صحیح اور جائز ہو، تمام

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ أَوْ تَفْسُوهُنَّ
 کچھ گناہ نہیں تم پر اگر طلاق دو تم عورتوں کو اس وقت کہ ان کو ہاتھ بھی نہ لگا یا ہو اور نہ معتسر کیا ہو ان کے
 فَرِيضَةٍ ۖ وَمَتَّعُوهُنَّ عَلَى الْمَوْسِعِ قَدَرُهَا وَعَلَى الْمَقْتَدِرِ ۚ قَدْ رُكِبَ مَا
 لئے کچھ ہوا اور ان کو کچھ خرچہ دو مقدور دالے پر اس کے موافق ہو اور تنگی دالے پر اس کی موافق جو خرچہ کر
 بِالْمَعْرُوفِ وَفِ حَقِّهَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ۝۳۷ وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ
 قاعدہ کے موافق ہو لازم ہو تنگی کر لے والوں پر ۱ اور اگر طلاق دو ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے اور
 أَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً ۖ فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا
 ٹھہرا ہے تمہیں ان کے لئے ہر قیاس لازم ہوا آدھا اس کا کہ تم معتسر کر چکے تھے عمر یہ کہ درگزر
 أَنْ تَعْفُوْنَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بَيْنَهُمَا عَقْدُ النِّكَاحِ وَأَنْ تَعْفُوا أَخْبَرُ
 کریں عورتیں یا درگزر کرے وہ شخص کہ اس کے اختیار میں ہو کہ نکاح کی بین خاوند اور تم مرد درگزر کرو تو قریب
 لِلْقَوَىٰ ۖ وَلَا تَسُوا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۖ إِنْ أَلَّ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝۳۸
 ہی پر ہر گاہی اور نہ بھلاؤ احسان کرنا آپس میں بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو خوب دیکھتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۷ طلاق قبل الدخول کی صورت طلاق قبل الدخول کے سنی یہ ہیں کہ زوجین میں ایک جان اور خلوت
 میں ہر کے وجوب اور عدم وجوب کا بیان صحیح ہے پہلے ہی طلاق کی نوبت آجائے اس کی دو صورتیں ہیں یا
 تو اس نکاح کے وقت ہر معتسر کی مقدار متعین نہیں کی گئی یا مقدار ہر متعین کر دی گئی پس پہلی
 صورت کا حکم اولاً مذکور ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ (الای قولہ) حَقَّاعِلَى الْمُحْسِنِينَ ۝
 میں تم پر دہرا کچھ مواخذہ نہیں اگر بیبیوں کو ایسی حالت میں طلاق دیدو کہ نہ ان کو تم نے ہاتھ لگایا
 ہے اور نہ ان کے لئے کچھ ہر معتسر کیا ہے (سو اس صورت میں ہر اپنے ذمہ مت سمجھا اور (مشر)
 ان کو ایک) فائدہ پہنچاؤ صاحب وسعت کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے اور تنگ دست
 کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے ایک خاص قسم کا فائدہ پہنچانا جو قاعدہ کے موافق واجب ہے
 خوش معاملہ لوگوں پر دین سب مسلمانوں پر کیونکہ خوش معاملگی کا بھی سب ہی کو حکم ہے ہر او اس

سے ایک جوڑا پڑوں کا دینا ہے۔
 اور دوسری صورت کا حکم یہ ہے، وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ (الای قولہ) إِنْ أَلَّ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ
 بصیرت اور اگر تم ان بیبیوں کو طلاق دو قبل اس کے کہ ان کو ہاتھ لگاؤ اور ان کے لئے کچھ
 ہر بھی مقرر کر چکے تھے تو (اس صورت میں) جتنا ہر تم نے مقرر کیا ہو اس کا نصف (واجب) ہو
 (اور نصف معاف) مگر (دو صورتیں اس مجموعی حکم سے مستثنیٰ ہیں) ایک صورت تو یہ کہ وہ عورتیں
 (اپنا نصف) بھی معاف کر دیں (تو اس صورت میں نصف بھی واجب نہ رہا) یا (دوسری
 صورت) یہ ہے کہ وہ شخص رعایت کرے جس کے ہاتھ میں نکاح کا تعلق (رکھنا اور توڑنا) ہو
 یعنی خاوند پورا ہر ہی اس کو دیدے تو اس صورت میں خاوند کی مرضی سے پورا ہی ہر او اکڑا ہو گا
 اور (الای) تمہارا (اپنے حق کو) معاف کر دینا بہ نسبت وصول کرنے کے تقویٰ سے زیادہ قریب
 ہے (کیونکہ معاف کرنے سے ثواب ملتا ہے اور ثواب کا کام کرنا ظاہر ہے کہ تعوی کی بات ہو)
 اور آپس میں احسان (اور رعایت) کرنے سے غفلت مت کرو بلکہ ہر شخص دوسرے کے
 ساتھ رعایت کرنے کا خیال رکھا کرے بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو خوب دیکھتے
 ہیں تو تم اگر کسی کے ساتھ رعایت و احسان کر دے اللہ تعالیٰ اس کی جزائے خیر تم کو
 دیں گے (بیان القرآن)

معارف و مسائل

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ (الای قولہ) إِنْ أَلَّ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بصیرت کے
 لحاظ سے چار صورتیں ہو سکتی ہیں ان میں سے دو کا حکم ان آیات میں بیان کیا گیا ہے ایک یہ کہ ہر معتسر
 نہ صحبت و خلوت، دوسری یہ کہ ہر تو مقرر ہو لیکن صحبت و خلوت کی نوبت نہ آئے، تیسری صورت
 یہ ہے کہ ہر بھی معتسر ہو اور صحبت کی بھی نوبت آدے، اس میں جو ہر مقرر کیا ہے پورا دینا ہو گا،
 یہ حکم شرع مجید میں دوسرے مقام پر بیان کیا گیا ہے، چوتھی صورت یہ ہے کہ ہر متعین نہ کیا،
 اور صحبت یا خلوت کے بعد طلاق دی، اس میں ہر مثل پورا دینا ہو گا، یعنی جو اس عورت کی قوم میں
 رواج ہے، اس کا بیان بھی ایک دوسری آیت میں آیا ہے۔

مذکورہ آیت میں پہلی دو قسموں کا حکم بیان کیا گیا ہے، اس میں سے پہلی صورت کا حکم یہ ہے
 کہ ہر کچھ واجب نہیں مگر زوج پر واجب ہے کہ اپنے پاس سے عورت کو کچھ دیدے، کم از کم یہی
 کہ ایک جوڑا پٹریے کا دیدے، دراصل شرع کریم نے اس عطیہ کی کوئی مقدار متعین نہیں کی
 البتہ یہ بھلا دیا کہ مالدار کو اپنی حیثیت کے مطابق دینا چاہئے، جس میں اس کی ترغیب ہے کہ صاحبِ بیت

اس میں تنگی سے کام نہ لے، حضرت حسنؑ نے ایسے ہی ایک واقعہ میں مطاہرہ عورت کو بیس ہزار کا علیہ دیا، اور قاضی شریحؒ نے پانسو درہم کا، اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ادنیٰ درجہ پر ہر کہ ایک جوڑا کپڑے کا دیدرے (قرطبی)

اور دوسری صورت کا حکم یہ ہے کہ جس عورت کا ہر نکاح کے وقت مقرر ہوا ہو، اور اس کو قبل صحبت و خلوت مجھ کے طلاق دیدی ہو تو مقرر کئے ہوئے ہر کا نصف مرد کے لئے واجب ہوگا، البتہ اگر عورت معاف کر دے یا مرد پورا دیدے تو اختیار ہی بات ہے، جیسا کہ آیت: **إِلَّا أَنْ يَعْفُوَنَّ أَوْ يُعْفُوا إِلَيْهِ** کا الٹکاچ سے معلوم ہوتا ہے۔

(۱) مرد کے پورا ہر دینے کو بھی معاف کئے لفظ سے شاید اس لئے تعبیر کیا کہ عام عادت عرب کی یہ تھی کہ ہر کی رقم شادی کے ساتھ ہی دیدی جاتی تھی، تو طلاق قبل از خلوت کی صورت میں وہ نصف واپس لینے کا حق دار ہو گیا، اب اگر وہ رعایت کر کے اپنا نصف واپس نہ لے تو یہ بھی معاف ہی کر لے، اور معاف کر لے کر افضل اور اقرب بالتقویٰ قرار دیا، کیونکہ یہ معافی علامت اس کی ہے کہ تعین نکاح کا قطع کرنا بھی احسان اور حسن سلوک کے ساتھ ہوا جو مقصد شریعت اور موجب ثواب عظیم ہے، خواہ معافی عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے۔

(۲) **أَلَّذِي يَعْفُو عَنْ نِكَاحِ** کی تفسیر خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی: **وَلِي عَقْدَةِ النِّكَاحِ الزَّوْجُ**، یعنی عقدہ نکاح کا مالک شوہر ہے، یہ حدیث دارقطنی میں بروایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جبہ عن شوقل ہے، اور حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ بھی (قرطبی) اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ نکاح مکمل ہو جانے کے بعد نکاح کو قائم رکھنے یا ختم کرنے کا مالک شوہر ہے، طلاق دی دے سکتا ہے، عورت کا طلاق میں کوئی اختیار نہیں۔

لِحِفْظِ أَعْلَى الصَّلَاةِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَتَوَمُّؤَيْهِ قُنْتَيْنِ ۝

خبردار ہو سب نمازوں سے اور پنج والی نماز سے اور کھڑے رہو اللہ کے آگے اوب سے

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَأَدِّكُمْ وَأَلَّكُمْ كَمَا

پھر اگر تم کو ڈر ہو کسی کا تو پیادہ پڑھو یا سوار پھر جس وقت تم امن پاؤ تو یاد کرو اللہ کو جس طرح

عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۝

کہ تم کو سکھایا ہے جس کو تم نہ جانتے تھے۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۳ نمازوں کی حفاظت کا بیان | اس سے آگے جیسے طلاق وغیرہ کے احکام ہیں، درمیان میں نماز کے احکام بیان مندرجہ اشارہ اس طرف ہے کہ مقصود اصلی توجہ الی الحق ہے، اور معاشرت اور معاملات کے احکام سے علاوہ اور مصامتوں کے اس توجہ کی حفاظت اور ترقی بھی مقصود ہو، چنانچہ جب ان کو خدائی احکام سمجھ کر عمل کیا جاوے گا تو توجہ لازم ہوگی، پھر یہ کہ ان احکام میں ادائے حقوق عباد بھی ہے اور حقوق عباد کے اتلاف سے درگاہ الہی سے دوری ہوتی ہے، جس کے لازم میں سے حق و عہد دونوں کی طرف سے بے توجہی ہے، چونکہ نماز میں یہ توجہ زیادہ ظاہر ہو اس لئے اس کے درمیان میں لانے سے اس توجہ کے مقصود ہونے پر زیادہ دلالت ہوگی، تاکہ بندہ اس توجہ کو ہر وقت پیش نظر رکھے۔

لِحِفْظِ أَعْلَى الصَّلَاةِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ والی قول، تاکہ تلوکوا تعلّمون، حفاظت کرو سب نمازوں کی (عموماً اور درمیان والی نماز یعنی عصر کی خصوصاً) اور (نماز میں) کھڑے ہو اگر اللہ کے سامنے عاجز بنے ہوئے، پھر اگر تم کو (باقاعدہ نماز پڑھنے میں کسی دشمن وغیرہ کا) اندیشہ ہو تو کھڑے کھڑے یا سوار پر چڑھے چڑھے (جس طرح بن سکے خواہ قبلہ کی طرف بھی نہ ہو) یاد ہو اور گور کو رکوع و سجود صرف اشارہ ہی سے ممکن ہو، پڑھ لیا کرو (اس حالت میں بھی اس پر محافظت رکھو اس کو ترک مت کرو) پھر جب تم کو (بالکل) اطمینان ہو جاوے (اور اندیشہ جانا کر) تو تم خدا تعالیٰ کی یاد (یعنی اولے نماز) اس طریق سے کرو جو تم کو (اطمینان کی حالت میں) سکھایا ہے جس کو تم (پہلے سے) نہ جانتے تھے۔

معارف مسائل

کثرت سے علماء کا قول بعض احادیث کی دلیل سے یہ ہے کہ پنج والی نماز نماز عصر کے بعد اس کے ایک طرف دو نمازیں دن کی ہیں فجر اور ظہر اور ایک طرف دو نمازیں رات کی ہیں، مغرب اور عشاء، اس کی تاکید خصوصیت کے ساتھ اس لئے کی گئی کہ اکثر لوگوں کو یہ وقت کام کی مصروفیت کا ہوتا ہے، اور عاجزی کی تفسیر حدیث میں سکوت کے ساتھ آئی ہے۔

اسی آیت سے نماز میں باتیں کرنے کی ممانعت ہوتی ہے، پہلے کلام کرنا درست تھا۔ اور یہ نماز کھڑے کھڑے اشارہ سے جب صحیح ہوگی جب ایک جگہ کھڑا ہو سکے، اور اس میں سجدے کا اشارہ ذرا زیادہ پست کرے، اور چلنے سے نماز نہیں ہوگی، البتہ جب ایسا ممکن نہ ہو، مثلاً عین لڑائی کا وقت ہو، تو نماز کو قضا کر دیا جاوے گا، دوسرے وقت پڑھ لیں۔ (بیان القرآن)

وَالَّذِينَ يَتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا ۖ وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ

اور جو لوگ تم میں سے مر جاویں اور چھوڑ جاویں اپنی عورتیں تو وہ وصیت کر دیں اپنی عورتوں کے لئے

مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرِ إِخْرَاجٍ ۚ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا

خرچ دینا ایک برس تک بغیر نکالنے کے مگر سے بھر اگر وہ عورتیں آپ نکل جاویں تو کچھ گناہ نہیں تم پر اس میں کہ

فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَعْرُوفٍ ۚ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۳۱﴾

کر دیں وہ عورتیں اپنے حق میں بھلی بات اور اللہ زبردست ہے حکمت والا

وَلِلْمُطَلَّاقِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُسْقِنِ ﴿۳۲﴾ كَذَلِكَ

اور طلاق دی ہوئی عورتوں کے واسطے خرچ دینا ہے فائدہ کے موافق لازم ہر پر ہر کاروں پر اسی طرح

يُمَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۳۳﴾

بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے واسطے اپنے حکم تاکہ تم سمجھ لو۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۵، بیوہ عورت کی سکونت اور متاع کی بعض اقسام کا بیان

لوگ وفات پا جاتے ہیں تم میں سے اور چھوڑ جاتے ہیں بیویوں کو (ان کے

ذمہ لازم ہے کہ وہ وصیت کر جایا کریں اپنی بیویوں کے واسطے ایک سال تک (دان و نفقہ

اور گھر میں سکونت رکھنے سے) منتفع ہونے کی اس طور پر کہ وہ گھر سے نکال نہ جا دیں ہاں اگر چاہیں

دس دن کے بعد یا وضع حل کے بعد عدت گزار کر خود نکل جاویں تو تم کو کوئی گناہ نہیں،

اس قاعدہ کی بات میں جس کو اپنے بارے میں (تجویز کریں) جیسے نکاح وغیرہ اور اللہ تعالیٰ

زبردست ہیں (ان کے خلاف حکم مت کر دو) اور حکمت والے ہیں (کہ تمام احکام میں تمہارا

مصلحتیں ملحوظ رکھی ہیں گو تمہاری فہم میں نہ آسکیں)

وَلِلْمُطَلَّاقِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ۚ (الای قولہ) لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۚ اور سب طلاق

دی ہوئی عورتوں کے لئے کچھ فائدہ پہنچانا (کسی درجہ میں معسر ہی) قاعدہ کے موافق (اور یہ) مقرر ہوا

ہے ان پر جو (شرک و کفر سے) پرہیز کرتے ہیں (یعنی مسلمانوں پر خواہ یہ معسر ہو نا واجب کے

درجہ میں ہو یا استیجاب کے مرتبہ میں) اسی طرح حق تعالیٰ تمہارے (عمل کرنے کے) لئے اپنے احکام

بیان فرماتے ہیں اس توقع پر کہ تم (ان کو) سمجھو (اور عمل کرو)۔

معارف مسائل

(۱) وَالَّذِينَ يَتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ (الای قولہ) وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۚ

وفات زدوں کی عدت ایک سال تھی اور اسلام میں بجائے ایک سال کے چار مہینے دس دن

مقرر ہوئے جیسا کہ اقبل میں آیت یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا بَلَغَتِ الْمُسْتَقِيمَةُ أَشْهُرَ وَعَشْرًا سے معلوم ہو چکا ہے

مگر اس میں عورت کی اتنی رعایت رکھی گئی تھی کہ چونکہ اس وقت تک میراث کا حکم نازل نہ ہوا تھا،

اور بیوی کا کوئی حصہ میراث میں معسر نہ ہوا تھا، بلکہ اوروں کے حق کا مدار محض مردے کی

وصیت پر تھا جیسا کہ آیت کُتِبَ عَلَيْكُمُ إِذَا أَحْصَيْتُمْ (۱۸۰:۲) کی تفسیر میں معلوم ہو چکا ہے، اسلئے

یہ حکم ہو گیا تھا کہ اگر عورت اپنی مصلحت سے خاوند کے ترکہ کے گھر میں رہنا چاہے تو سال بھر تک

اس کو رہنے کا حق حاصل ہے، اور اسی کے ترکہ سے اس مدت میں اس کو نان نفقہ بھی دیا جاوے

اس آیت میں اسی کا بیان ہے اور خاوندوں کو حکم ہے کہ اس طرح کی وصیت کر جایا کریں،

اور چونکہ یہ حق عورت کا تھا، اس کو اس کے وصول کرنے نہ کرنے کا اختیار حاصل تھا اس لئے

دارثوں کو تو گھر سے نکالنا جائز تھا، لیکن خود اس کو جائز تھا کہ خود اس کے گھر نہ رہے، اور اپنا

حق درخ کو چھوڑ دے، بشرطیکہ عدت پوری ہو چکے، اور نکاح وغیرہ سب درست تھا، اور یہی

مراد ہے قاعدہ کی بات سے، البتہ عدت کے اندر نکلا اور نکاح کرنا وغیرہ سب گناہ تھا عورت

کے لئے بھی اور جو منہج کر سکے اور نہ روکے اس کے لئے بھی، پھر جب آیت میراث کی نازل

ہوئی، گھر بار سب ترکہ میں سے عورت کا حق مل گیا، سو اپنے حصہ میں رہے، اور اپنے حصہ

سے خرچ کرے، یہ آیت منسوخ ہو گئی۔

(۲) وَلِلْمُطَلَّاقِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ۚ (الای قولہ) لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۚ

پہلی آیات میں بھی آپکا ہے مگر وہ صرف دو قسم کی مطلقات کے لئے تھا جن کو صحبت خلوت

سے پہلے طلاق ہو گئی ہو، ایک کو فائدہ پہنچانا یہ تھا کہ جوڑا دیا جائے، دوسری کو فائدہ پہنچانا یہ

تھا کہ آدھا مہر دیا جائے، اب وہ طلاق و ایان رہ گئیں جن کو صحبت یا خلوت کے بعد طلاق دی جاوے

سوائے جس کا مہر معسر رکھا گیا ہو اس کو فائدہ پہنچانا یہ ہے کہ پورا مہر دینا چاہئے، اور جس کا مہر معسر

نہ اور قاعدہ سے مراد یہ تفصیل ہو جاتے گی، اور ہر صورت کے وجوب اور استحباب کا فرق دوسرے دلائل سے ثابت

کھا جائے گا، اور خدا کو واجب کے معنی میں نہیں ملے اور علیٰ الزام کے لئے نہ ہوگا، بلکہ بعض تاکید کے لئے

ہوگا کہ درجہ استیجاب ہی ہیں (بیان العسکران)

نہ کیا جاوے اس کے لئے بعد دخول کے ہر مثل واجب ہو، یہ متاع بمعنی مطلق فائدہ پہنچانا اس تفصیل سے تو واجب ہے، اور اگر متاع سے مراد فائدہ خاص یعنی تحفہ یا جوڑا دینا ہی لیا جائے تو ایک مطلقہ کو تو دینا واجب ہے، جس کا ذکر اقبل میں آچکا ہے، اور باقی سب اقسام میں مستحب، اور اگر متاع سے مراد نفقہ لیا جاوے تو جس طلاق میں عدت ہے اس میں عدت گزرنے تک واجب ہے، خواہ طلاق رجعی ہو یا بائن، غرض آیت اپنے الفاظ عامہ سے سب صورتوں کو شامل ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ

کیا نہ دیکھا تو نے ان لوگوں کو جو کہ نکلے اپنے گھروں سے اور وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے

فَقَالَ لَهُمْ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى

پھر فرمایا ان کو اللہ نے کہ مر جاؤ پھر ان کو زندہ کر دیا بیشک اللہ فضل کرنے والا ہے

النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿۲۴۳﴾ وَقَالُوا إِنِّي نَسِيتُ اللَّهَ

لوگوں پر لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے اور لڑوا اللہ کی راہ میں

وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۴۴﴾

اور جان لو کہ اللہ بے شک سب کو سناتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

دائے مخاطب، کیا تجھ کو ان لوگوں کا قصہ تحقیق نہیں ہوا جو کہ اپنے گھروں سے نکل گئے اور وہ لوگ ہزاروں ہی تھے موت سے بچنے کے لئے سوائے اللہ

ان کے لئے (حکم) فرمادیا کہ مر جاؤ (سب مر گئے) پھر ان کو جلا دیا، بیشک اللہ تعالیٰ بڑا افضل کرنے والے ہیں لوگوں کے حال پر مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے اور اس واقعہ پر غور کر کے اللہ کی راہ میں قتال کرو اور یقین رکھو اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں رجاء کرنے اور نہ کرنا لوگوں کی باہمی سننے اور ہر ایک کی نیت جاننے ہیں، اور سب کو مناسب جزا دیں گے

معارف و مسائل

یہ تین آیتیں جو اوپر مذکور ہوئی ہیں ان میں ایک عجیب مبلغ انداز میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان و مال کی قربانی پیش کرنے کی ہدایت ہے کہ ان احکام کے بیان کرنے سے پہلے تاریخ کا ایک اہم واقعہ ذکر کیا گیا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ موت و حیات تقدیر الہی کے

تاریخ ہے، جنگ و جہاد میں جانا موت کا سبب نہیں اور بزدلی سے جان بچانا موت سے بچنے کا ذریعہ نہیں، تفسیر ابن کثیر میں سلب صحابہ اور تابعین کے حوالہ سے اس واقعہ کی تشریح یہ بیان کی ہو کہ بنی اسرائیل کی کوئی جماعت ایک شہر میں بستی تھی، اور وہاں کوئی سخت دبا، طاعون وغیرہ پھیلا، یہ لوگ جو تقریباً دس ہزار کی تعداد میں تھے گھبرا اٹھے، اور موت کے خوف سے اس شہر کو چھوڑ کر سب کے سب دو پہاڑوں کے درمیان ایک وسیع میدان میں جا کر مقیم ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے ان پر اور دنیا کی دوسری قوموں پر یہ واضح کرنے کے لئے کہ موت سے کوئی شخص بھاگ کر جان نہیں چھڑا سکتا، دو فرشتے بھیج دیے، جو میدان کے دونوں سروں پر آکھڑے ہوئے، اور کوئی ایسی آواز دی جس سے سب کے سب بیک وقت فرے ہوئے رہ گئے، ایک بھی زندہ نہ رہا، اس پاس کے لوگوں کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی، یہاں پہنچے، دس ہزار انسانوں کے کفن و دفن کا انتظام آسان نہ تھا، اس لئے ان کے گرد ایک احاطہ کھینچ کر حظیرہ جیسا بنادیا، ان کی لاشیں حسب دستور محل مٹھیں، ہڈیاں پڑی رہ گئیں، ایک زمانہ دراز کے بعد بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر جن کا نام حسرت قبیل بتلایا گیا ہے، اس مقام پر گزرے، اس حظیرہ میں جگہ جگہ انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے بکھرے ہوئے دیکھ کر حیرت میں رہ گئے، بذریعہ وحی ان کو ان لوگوں کا پورا واقعہ بتلا دیا گیا، حضرت حزقیل علیہ السلام نے دعا کی کہ یا اللہ ان لوگوں کو بھر زندہ فرما دے، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی، اور انھیں حکم دیا گیا کہ آپ ان شکستہ ہڈیوں کو اس طرح خطاب کریں۔

ایہا العظام البالیۃ ان اللہ

تین لے ہڈیوں اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ ہر ہڈی اپنی جگہ جمع ہو جائے۔

یا مریک ان تجتمعی

پیغمبر کی زبان سے خدا تعالیٰ کا حکم ان ہڈیوں نے سنا اور حکم کی تعمیل کی، جن کو دنیا پر قتل بے شعور سمجھتی ہے مگر دنیا کے ہر ذرہ ذرہ کی طرح وہ بھی تابع فرمان اور اپنے وجود کے مناسب عقل و ادراک رکھتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی مطلع ہیں، مگر ان کریم نے آیت اَعْلٰی سَمْعٌ لِّشَعْرِ خَلْقِ شَعْرَی (۵۰:۱۲) میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا فرمایا پھر اس کو اس کے مناسب حال ہدایت فرمائی، مولانا ردی نے ایسے ہی امور کے متعلق فرمایا ہے

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند

بامن و تو مردہ باحق زندہ اند

بہر حال ایک آواز پر ہر انسان کی ہڈیاں اپنی اپنی جگہ لگ گئیں، پھر حکم ہوا کہ اب ان کو یہ آواز دو۔

ایہا العظام ان اللہ یا مریک | تین لے ہڈیوں اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے کہ

ان تکلمی لحنًا وعصبًا وحبلًا | اپنا گوشت ہیں لڑا اور شے اور کمال درست کرنا
یہ کہنا تھا کہ ہڈیوں کا ہڑوہا پھر ان کے دیکھتے دیکھتے ایک شکل لاش بن گئی، پھر حکم ہوا کہ
اب ارواح کو یہ خطاب کیا جائے۔

اہتما الاصل ان الله يامر ان
ان تخرج كل روح الى الجسد
الذي كانت تعمده
یعنی اے ارواح تمیں اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے
کہ اپنے اپنے بدنوں میں لوٹ آئیں جن کی تعمیر
رجات ان سے وابستہ تھی۔

یہ آواز دیتے ہیں ان کے سامنے سارے لاشے زندہ ہو کر کھڑے ہو گئے، اور حیرت سے چاروں طرف
دیکھنے لگے، سب کی زبانوں پر تھا مَبْهَمَاتُكَ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ۔

یہ واقعہ ہلکے دنیا کے ظالموں اور عقلاء کے لئے دعوتِ فکر اور منکرینِ قیامت پر محبت
قائمہ ہونے کے ساتھ اس ہدایت پر بھی مشتمل ہے کہ موت کے خوف سے بھاگنا غواہِ جہاد سے
ہو یا کسی دباؤ و طاعون سے اللہ تعالیٰ اور اس کی تقدیر پر ایمان رکھنے والے کے لئے ممکن نہیں، جبکہ
یہ ایمان ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے اس سے ایک سیکنڈ پہلے آسکتی ہے، اور ایک سیکنڈ
مؤخر ہو سکتی ہے، اس لئے یہ حرکت فضول بھی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہونے کی
وجہ بھی۔

اب اس واقعہ کو مفسران کے الفاظ سے دیکھئے، بیان واقعہ کے لئے قرآن نے مَسْرً یا
أَتَمَّ مَرًّا إِلَى الَّذِينَ تَخْرُجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ، یعنی کیا آپ نے ان لوگوں کے واقعہ کو نہیں دیکھا جو
اپنے گھروں سے بھڑت موت شکل کھڑے ہوتے تھے؟

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ہزاروں
برس پہلے کا ہے، اس کے دیکھنے کا حضورؐ سے سوال ہی نہیں ہو سکتا، تو یہاں أَتَمَّ مَرًّا فرماتے کا کیا
مقصد ہے، مفسرین نے فرمایا ہے کہ ایسے تمام مواقع میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لفظ
أَتَمَّ مَرًّا کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، حالانکہ واقعہ آپ کے زمانے سے پہلے کا ہے، جس کے دیکھنے
کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا، ان سب مواقع میں رویت سے رویت قلبی مراد ہوتی ہے جس کے معنی
میں علم و ادراک یعنی أَتَمَّ مَرًّا ایسے مواقع میں أَتَمَّ مَرًّا کے معنی میں ہوتا ہے، لیکن اس کو لفظ أَتَمَّ
مَرًّا سے تعبیر کرنے میں حکمت اس واقعہ کے مشہور و مشہور ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے، کہ یہ واقعہ
ایسا یقینی ہے جیسے کوئی آج دیکھ رہا ہو اور دیکھنے کے قابل ہو، أَتَمَّ مَرًّا کے بعد حسرتِ اِلٰی
بڑھانے سے اذرتے زبان اس کی طرف اشارہ بھی ہوتا ہے۔

اس کے بعد مفسران میں ان کی ایک بڑی تعداد ہونے کا بیان فرمایا گیا وَهَذَا كُنُوزٌ

یعنی وہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے، اس تعداد کی تعیین میں روایات مختلفہ ہیں، لیکن عربی
زبان کے قاعدہ سے یہ لفظ جمع کثرت ہے، جس کا اطلاق دس سے کم پر نہیں ہوتا، اس سے معلوم
ہوا کہ ان کی تعداد دس ہزار سے کم نہ تھی۔

اس کے بعد ارشاد ہے فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مَوْتُوا، یعنی کہہ دیا ان کو اللہ تعالیٰ نے کہ مر جاؤ
اللہ تعالیٰ کا یہ حکم بلا واسطہ بھی ہو سکتا ہے اور بلا واسطہ کسی فرشتے کے بھی، جیسے دوسری آیت میں
ارشاد ہے، اِذَا أَمَرْنَا لُؤْلُؤًا أَنْ يَمُوتَ يَمُوتَ (۸۲:۳۶)۔

اس کے بعد فرمایا ہے إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ، یعنی اللہ تعالیٰ بڑا فضل کرنے
والے ہیں لوگوں پر، اس میں وہ فضل بھی داخل ہے جو بنی اسرائیل کی اس قوم کو دوبارہ زندہ کر کے
فرمایا، اور یہ فضل بھی شامل ہے جو یہ واقعہ امت محمدیہ کو بتلا کر ان کے لئے درسِ عبرت بنا یا۔

آخر میں غفلت شعار انسان کو بیدار کرنے کے لئے فرمایا وَفَكُنْ أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ
یعنی اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کے ہزاروں مظاہر انسان کے سامنے آتے رہتے ہیں، مگر اس کے
ادراک کرنا انسان شکر گزار نہیں ہوتے۔

مسائل متعلفہ

اس آیت سے چند مسائل اور احکام مستفاد ہوتے ہیں۔

۱۔ **مہمہ اللہ** | اول یہ کہ تقدیر الہی کے مقابلے میں کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی، اور جہاد سے یا
طاعون وغیرہ سے بھاگنا جان بچانے کا ذریعہ نہیں ہو سکتا، اور نہ ان میں قائم رہنا
موت کا باعث ہوتا ہے، بلکہ موت کا ایک وقت معین ہے نہ اس میں کمی ہو سکتی ہے نہ زیادتی۔

۲۔ **مہمہ اللہ** | دوم اس مسئلہ یہ ہے کہ جس شہر میں کوئی وبائی مرض طاعون وغیرہ
پھیل چکا ہو اس سے بھاگ کر کہیں پھیل چکا ہو اس سے بھاگ کر دوسری جگہ جانا جائز نہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
ان جہادوں کا حکم ہیں | کے ارشاد میں اس پر اتنا اور اضافہ ہے کہ دوسرے لوگوں کو وہاں جانا
بھی درست نہیں، حدیث میں ہے:

ان هذا القسم عذب به الاسم
فلم يدر ماذا أصعب منه في الاسم
فلا تدخلوها وادفعوا بارض
والتعب ما فلا تخرجوا فراسا
(بخاری، مسلم، ابن کثیر)

یعنی اس بیماری طاعون کبیر اللہ تعالیٰ نے
تم سے پہلے قوموں پر عذاب نازل فرمایا ہے
سو جب تم سنو کہ کسی شہر میں طاعون وغیرہ
وبائی مرض پھیل رہا ہے تو وہاں نہ جاؤ، اور اگر
کسی جگہ میں وہ مرض پھیل جائے اور تم وہاں
ہو تو وہاں سے بھاگ کر نہ بھگو۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے ایک مرتبہ ملک شام کے قصد سے سفر کیا، سرحد شام پر جو تک کے قریب ایک مقام سترغ ہے، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ملک شام میں سخت طاعون پھیلا ہوا ہے، یہ طاعون ملک شام کی تاریخ میں ایک عظیم سانحہ تھا، یہ طاعون عمواس کے نام سے مشہور ہے، کیونکہ اول یہ طاعون ایک بستی عمواس نامی میں شروع ہوا، جو بیت المقدس کے قریب ہے، پھر سارے ملک میں پھیل گیا، ہزار ہا انسان جن میں بیت سے صحابہؓ و تابعینؓ بھی تھے، اس طاعون میں شہید ہوئے۔

فاروق اعظمؓ نے طاعون کی شدت کی خبر سنی تو اس مقام پر ٹھہر کر صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا کہ ہمیں ملک شام میں اس وقت جانا چاہئے یا رہیں ہونا مناسب ہے، اس وقت جتنے حضرات مشورہ میں شریک تھے ان میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق کوئی حکم سنا ہو، بعد میں حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے اطلاع دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس معاملے کے متعلق یہ ہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ذکر الوجد فقال رجز و عن اسب
عن سب به الامم ثم بقى منه
بقية في ذل المروية و ياتي
الاخرى فمن يبع به بارض
فلا يقدر من عليه و من كان
بارض وقع بها فلا يخرج ذراعا
منه، رواه البخاري عن انس
من ذين و اخرجه الاثمة بمثله۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے جب یہ حدیث سنی تو رفقہ کو واپسی کا حکم دیدیا، حضرت ابو عبیدہؓ ملک شام کے عامل و امیر و گورنر بھی اس مجلس میں موجود تھے، فاروق اعظمؓ کا یہ حکم سن کر فرماتے گئے، افراسام من قد رائدہ، یعنی کیا آپ اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگنا چاہتے ہیں! فاروق اعظمؓ نے جواب میں فرمایا، ابو عبیدہؓ کا ش یہ بات کوئی اور کہتا، یعنی تمہاری زبان سے ایسی بات قابلِ تعجب ہے، اور پھر فرمایا:

فمن نفر من قد رائدہ الخ
قد رائدہ الخ
بیشک ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ ہی کی تقدیر
کی طرف بھاگتے ہیں۔

مطلب یہ تھا کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ اللہ ہی کے حکم کے مطابق کر رہے ہیں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔

دراما طاعون لشدت ہوئی | رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مذکور سے معلوم ہوا کہ جس شہر یا بستی کی بھشتیں میں طاعون وغیرہ امراض وبائی پھیلے ہوئے ہوں باہر والوں کو وہاں جانا ممنوع ہے اور وہاں کے رہنے والوں کو اس جگہ سے بخوبی موت بھاگنا ممنوع ہے۔

اور اس کے ساتھ اسلام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ نہ کسی جگہ جانا موت کا سبب ہے، نہ کہیں سے بھاگنا نجات کا سبب، اس اہم عقیدہ کے ہوتے ہوئے حکم مذکور بڑی دور رس حکمتوں پر مبنی ہے، باہر والوں کو وہاں جانے سے روکنے کی ایک حکمت تو یہ ہے کہ ممکن ہے وہاں پہنچ کر کسی کی عمر ختم ہو چکی ہو اور اس مرض میں مبتلا ہو کر انتقال ہو گیا تو مرنے والے کو کسی یہ گمان ہو گا کہ اگر میں یہاں نہ آتا تو زندہ رہتا، اور دوسروں کو بھی یہی خیال ہو گا کہ یہاں آنے سے اس کی موت واقع ہوئی، حالانکہ جو کچھ ہوا وہ پہلے سے لکھا ہوا تھا، اس کی عمر اتنی ہی تھی، کہیں بھی رہتا، اس وقت اس کی موت لازمی تھی، اس حکم میں مسلمانوں کے عقیدہ کو تذبذب سے بچایا گیا کہ وہ غلطی کا شکار نہ ہوں۔

دوسری حکمت یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان کو یہ ہدایت دی ہے کہ جس جگہ طبیعت پہنچنے کا خطرہ ہو یا جہاں ہلاکت کا اندیشہ ہو وہاں نہ جائے، بلکہ معتد در بھرا میں چیزوں سے بچنے کی فکر کرے جو اس کے لئے مضر یا ہلاکت کا سبب بن سکتی ہیں، اور اپنی جان کی حفاظت ہر انسان کے ذمے پر واجب قرار دی ہے، اس قاعدہ کا تقاضا بھی یہی ہے کہ تقدیر الہی پر ایمان کامل رکھتے ہوئے احتیاطی تدبیروں میں کمی نہ کرے، اور ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ ایسی جگہ نہ جائے جہاں جان کا خطرہ ہو۔

اسی طرح اس بستی کے رہنے والوں کو بخوبی موت وہاں سے بھاگنے کی ممانعت میں بھی بہت سی حکمتیں ہیں۔

ایک حکمت تو اجتماعی اور عوامی ہے کہ اگر یہ بھاگنے کا سلسلہ چلا تو امیر اور پیسے والے اور قدرت و طاقت والے آدمی تو بھاگ جائیں گے، مگر بستی میں ایسے ضعیف، مرد و عورت کا بھی عادی ہونا لازمی ہے جو کہیں جانے پر قدرت نہیں رکھتے، ان کا حشر کیا ہو گا، اول تو وہ تنہا رہ کر ہیبت ہی سے مرنے لگیں گے، پھر ان میں جو بیمار ہیں ان کی خبر گیری کون کرے گا، مر جائیں گے تو دُفن کفن کا انتظام کیسے ہو گا۔

دوسری حکمت یہ ہے کہ جو لوگ اس جگہ موجود ہیں بعید نہیں کہ ان میں اس مرض کے جراثیم اڑ کر پھیلے ہوں ایسی حالت میں وہ سفر کریں گے تو اور زیادہ مصیبتوں اور مشقتوں کے شکار ہوں گے۔

سفر کی حالت میں بیمار ہوئے تو ظاہر ہے کہ ان پر کیا گذرے گی، ابن المدینی نے ملنا کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

ما فرأى أحد من الصواب فسلم
(قربلی)

یعنی جو شخص وہاں سے بھاگتا ہے وہ بھی سلام
نہیں دیتا۔

تیسری حکمت یہ بھی ہے کہ اگر ان میں مرض کے جراثیم سرایت کر چکے ہیں تو یہ فحش بستیوں میں پہنچیں گے، تو وہاں وہابی جراثیم پھیلیں گے، اور اگر اپنی جگہ صبر و توکل کے ساتھ ٹھہرے رہے تو بہت ممکن ہے کہ مرض سے نجات حاصل ہو جائے، اور بالفرض اسی مرض میں موت مقدر تھی تو ان کو اپنے مبر و ثبات کی وجہ سے درجہ شہادت کا ملے گا، جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے:

روى البخارى عن يحيى بن يعمر
عن عائشة أنها أخبرته أنه
سألت رسول الله صلى الله عليه
وسلم عن الطاعون فأخبرها
النبي صلى الله عليه وسلم أنه
كان من أبايحه الله على من
يشاء فنجله الله رحمة
للمؤمنين فليس من عبس
يقم الطاعون فيسكت في بلد
صابراً يعلم أنه لن يصيبه إلا
ما كتب الله له إلا كان له مثل
أجر شهيد وهذا تفسير لقوله
صلى الله عليه وسلم الطاعون
شهادة والمطعون شهيد

(قربلی ص ۲۳۵ ج ۲)

میں ارشاد ہے کہ طاعون شہادت ہے اور طاعون زدہ شخص شہید ہے۔

بعض خاص صورتوں کا استثناء | حدیث کے الفاظ میں فلا تخرجوا ذرا منہ آیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص موت سے فرار کے لئے نہیں بلکہ اپنی کسی دوسری ضرورت سے دوسری جگہ چلا جائے تو وہ اس ممانعت میں داخل نہیں، اسی طرح اگر کسی شخص کا عقیدہ اپنی جگہ پختہ ہو

کہ یہاں سے دوسری جگہ چلا جانا بھگے موت سے نجات نہیں دے سکتا، اگر میرا وقت آگیا ہے تو جہاں جاؤں گا موت لازمی ہے، اور وقت نہیں آیا تو یہاں رہنے سے بھی موت نہیں آئے گی! یہ عقیدہ پختہ رکھتے ہوئے محض آپ ہوا کی تبدیلی کے لئے یہاں سے چلا جائے تو وہ بھی ممانعت سے مستثنیٰ ہے۔

اسی طرح کوئی آدمی کسی ضرورت سے اس جگہ میں داخل ہو جہاں وہاں پھیلی ہوئی ہے، اور عقیدہ اس کا پختہ ہو کہ یہاں آنے سے موت نہیں آئے گی وہ اللہ کی مشیت کے تابع ہے، تو ایسی حالت میں اس کے لئے وہاں جانا بھی جائز ہوگا۔

تیسرا مسئلہ اس آیت سے استفادہ ہوا کہ خوف موت چہاد سے بھاگنا بھی حرام ہے، قرآن کریم میں یہ مسئلہ دوسری جگہ زیادہ تفصیل اور وضاحت سے آیا ہے، جس میں بعض خاص صورتوں کو مستثنیٰ بھی فرمایا گیا ہے۔

جو مضمون اس آیت کا ہے تقریباً یہی مضمون دوسری آیت میں چہاد سے بھاگنے والوں یا اس میں شامل نہ ہونے والوں کے بارے میں آیا ہے، ارشاد یہ ہے:

الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا مَعَهُ مُسْتَرْسِدُونَ
فَقَدْ قَالُوا أَطَاعُوا مَا قَاتُوا
لَهُمْ قَادَرَتُهُمْ وَأَتَوْا
الْمُؤْتُونَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ

یعنی کچھ لوگ خود بھی چہاد میں شریک نہ ہوئے
اور چہاد میں شریک ہو کر شہید ہو جانے والوں
کے متعلق لوگوں سے کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے
ہماری بات نہ سنی اس لئے مارے گئے، اگر یہ ہمارے
ساتھ لڑتے تو قتل نہ ہوتے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ آپ ان سے فرما دیں کہ اگر موت کے
بہانہ بنا کر ہتھیاریں ہے، تو اوروں کی کیا فکر کرتے ہو تم خود اپنی فکر کرو اور اپنے آپ کو موت سے
بھاگ رہے ہیں چہاد میں جانے نہ جانے پر موقوف نہیں، تمہیں گھر بیٹھے ہوئے بھی آخر موت آئے گی۔

ممانعت قدرت سے ہے کہ صحابہ کرام کے سب بڑے جنگی جرنیل سیف اللہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کی اسلامی عمر ساری چہاد ہی میں گزاری ہے، وہ کسی چہاد میں شہید نہیں ہوئے، بیمار ہو کر گھر میں وفات پائی، وفات کے قریب اپنے بستر پر مرنے کا افسوس کرتے ہوئے مگر والوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ میں فلاں فلاں عظیم الشان جنگوں اور چہادوں میں شریک ہوا، اور میرا کوئی عھدو ایسا نہیں جس میں تیر یا نیزے یا چوٹ کے زخم کا اثر و نشان نہ ہو، مگر افسوس ہے کہ میں اب گدھے کی طرح بستر پر مر رہا ہوں، خدا تعالیٰ بزدلوں کو آگام نہ دے، اُن کو میری نصیحت پہنچاؤ۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کا یہ واقعہ بطور تھوڑا لایا گیا تھا، اگلی آیت میں چہاد و قتال

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الْحَيُّ الْقَيُّومُ
(قرطبی)

مطلات کس قدر ابوالدھاج کے لئے تیار ہیں
(یعنی جنت میں)

۳) قرض میں واپسی کے وقت اگر زیادتی کی شرط ٹھہرائی گئی ہو اور اپنی طرف سے قرض سے کچھ زیادہ ادا کر دیا، تو یہ پسندیدہ ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
ان خیارکم احسنکم
قضاء
میں بہترین شخص وہ ہے جو اپنے حق (قرض) کو اچھے طریقے سے ادا کرے۔

لیکن اگر زیادتی کی شرط ٹھہرائی گئی تو وہ حرام ہے اور سود ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ مِثْقَال ذَرَّةٍ مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ إِذْ قَالُوا لِسَيِّدِنَا
کیا دیکھا تو نے ایک جماعت بنی اسرائیل کو موسیٰ کے بعد جب انہوں نے کہا اپنے نبی سے
لَهُمْ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ
مقرر کرو ہمارے لئے ایک بادشاہ تاکہ ہم لڑیں اللہ کی راہ میں پیغمبر نے کہا کیا تم سے کبھی یہ توقع ہو کر
عَلَيْكُمْ الْقِتَالُ أَلَا تَقَاتِلُونَ قَالُوا مَا نَالُوا لَنَا الْقِتَالُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ
اگر حکم ہو لڑائی کا تو ہم اس وقت لڑو وہ بولے ہم کو کیا کہ ہم نہ لڑیں اللہ کی راہ میں اور ہم
قَدْ أَخْرَجَنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَاؤُنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا
تو نکال دیئے گئے اپنے گھروں سے اور بیٹوں سے پھر جب حکم ہوا ان کو لڑائی کا تو وہ سب پھر گئے
إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ
مگر تھوڑے سے ان میں کے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو ظالموں کو اور فرمایا ان سے ان کے نبی نے
إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ
یہ کہ اللہ نے مقرر فرمایا تھا اسے طالت کو بادشاہ کہنے لگے کیونکر ہو سکتی ہے اس کو حکومت
عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ الْمَالِ ۚ
ہم پر اور ہم زیادہ مستحق ہیں سلطنت کے اس سے اور اس کو نہیں ملی کثایت مال میں
قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَشَرَّاهُ فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ
پیغمبر نے کہا بیشک اللہ نے پسند فرمایا اس کو تم پر اور زیادہ فراخی دی اس کو علم اور جسم میں

وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ وَقَالَ لَهُمْ
اور اللہ دیتا ہے ملک اپنا جسکو چاہے اور اللہ بے غش و فراغ ہے جاننے والا اور کھاتا امر میں

نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ
ہے ان کے نبی نے کطاوت کی سلطنت کی نشانی یہ کہ آوی تھوڑا پاس ایک صندوق کہ جس میں نعل خاطر ہے

مِنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ
تھوڑا رب کی طرف سے اور کچھ بھی ہوئی چیزیں ہیں ان میں سے جو چھوڑ گئی تھی موسیٰ اور ہارون کی اولاد اور

الْمَلَائِكَةُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝
ملائکہ کہ اس صندوق کو فرشتے بیشک اس میں پوری نشانی ہے تمہارا واسطی اگر تم یقین رکھتے ہو،

فَلَمَّا أَصَلَّ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ
پھر جب ابراہیم طالت لڑیں لے کر کہا ہے شک اللہ تمہاری آزمائش کرتا ہے ایک نہریں

فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي ۚ وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا
سوں نے ان پر اس نہر کا تو وہ میرا نہیں اور جس نے اس کو نہ چکھا تو وہ بیشک میرا ہے مگر

مَنْ أَغْرَقَ غُرْفَةً فِئْتٍ فَيَسِّرَ فَنَسِيَ بَوَائِمَهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ ۖ
جو نہریں سے ایک گھوڑا اپنے ساتھ لے گیا یا سب سے اس کا پانی مگر تھوڑوں نے ان میں سے

فَلَمَّا جَاذَرَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ
پھر جب ابراہیم طالت اور ایمان والے ساتھ اس کے تو کہنے لگے طاقت نہیں ہم کو آج

بِطَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا اللَّهَ كَمْ
طالت اور اس کے لڑکوں سے لڑنے کی کہنے لگے وہ لڑیں کو خیال تھا کہ ان کو اللہ سے ملانے والا

مِنْ فِتْنَةٍ قَلِيلٌ فَلَمَّا خَلَّيَا فِئْتَهُ كَثِيرَةً يَأْذِنُ اللَّهُ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝
تھوڑی جماعت غالب ہوئی بڑی جماعت پر اللہ کے حکم سے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہو

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا مَبْرَأً وَكُنْتَ
اور جب سامنے ہوئے جالوت کے اور اس کی فوجوں کے تو بولے اے رب ہمارا ڈال دے ہمارے سامنے مبراؤ

أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿۵۵﴾ فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ

دکھ ہمارا پاؤں اور ہماری مدد کر اس کافر قوم پر ۔ پھر شکست دی مومنوں کو کافروں کے ہاتھوں سے

وَقَتْلَ دَاوُدَ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مَا

اور داؤد کو دلا داونے جالوت کو اور دی داؤد کو اللہ نے سلطنت اور حکمت اور سکھایا ان کو جو چاہا

يَشَاءُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمُ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ

اور اگر نہ ہوتا دفع کر دینا اللہ کا ایک کو دوسرے کو خراب ہو جاتا ملک ۔

وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۵۶﴾

لیکن اللہ بہت بھلا ہے جہاں کے لوگوں پر ۔

خلاصہ تفسیر

رابط آیات مقصود اس مقام میں زیادہ ترغیب قتال کی ہے، اور پر کا قصہ اسی کی تحدید ہے، اتفاق فی سبیل اللہ کا مضمون اسی کی تائید ہے، آگے طاوت و جالوت کا قصہ اسی کی تاکید ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے اس قصے میں قبض و بسط کا بھی مشاہدہ کرایا، جس کا ذکر قبل کی آیت وَاللَّهُ يَبْغِضُ وَيُبْغِضُ میں آیا ہے، اگر نیکو بادشاہ بنانا اور بادشاہ سے بادشاہت چھین لینا سب اسی کے خست یار میں ہے۔

طاوت اور جالوت کا قصہ (اسے خطاب کیا) تم کو بنی اسرائیل کی جماعت کا قصہ جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا ہے، تحقیق نہیں ہوا، (جس سے پہلے

ان پر کافر جالوت غالب آچکا تھا، اور ان کے کئی صوبے دبا لئے تھے) جب کہ ان لوگوں نے اپنے ایک پیغمبر سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے کہ ہم (اس کے ساتھ ہو کر) اللہ کی راہ میں (جالوت سے) قتال کریں، اس پیغمبر نے فرمایا کہ کیا یہ احتمال ہے اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے کہ تم (اس وقت) جہاد نہ کرو، وہ لوگ کہنے لگے کہ ہمارے واسطے ایسا کونسا سبب ہوگا کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں، حالانکہ جہاد کے لئے ایک محرک بھی ہے، وہ یہ کہ ہم دُعا کا فروں کے ہاتھوں) اپنی بستیوں اور اپنے فرزندوں سے بھی جدا کر دیئے گئے ہیں (کیونکہ ان کی بعض بستیاں بھی کافروں نے دبا لی تھیں اور ان کی اولاد کو بھی قید کر لیا گیا تھا) پھر جب ان لوگوں کو جہاد کا حکم ہوا تو باستثناء ایک قلیل مقدار کے (باقی) سب پھر گئے، (جیسا کہ آگے جہاد کی غرض سے بادشاہ کے معشر رہنے کا اور ان لوگوں کے پھر جانے کا تفصیل بیان آتا ہے) اور

اللہ تعالیٰ ظالموں کو دین خلافت محکم کرنے والوں کو، خوب جانتے ہیں، (سب کو مناسب ہوا دیں گے) اور ان لوگوں سے ان کے پیغمبر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر طاوت کو بادشاہ معزز

فرمایا، کہنے لگے ان کو ہم پر حکمرانی کا کیسے حق حاصل ہو سکتا ہے، حالانکہ بہ نسبت ان کے ہم حکمرانی کے زیادہ مستحق ہیں، اور ان کو کچھ الی وسعت بھی نہیں دی گئی، (کیونکہ طاوت غریب آدمی تھے) ان پیغمبر نے

دعوت میں، (فرمایا کہ اول تو) اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقابلے میں ان کو منتخب فرمایا ہے (اور انتخاب کی مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں) اور (دوسرے) علم (سیاست و حکمرانی) اور جہاد میں اس کو زیادہ مہارت (اور بادشاہ ہونے کے لئے اس علم کی زیادہ ضرورت ہے، تاکہ ملکی انتظام پر قادر ہو اور جہاد

میں باہر امن ہے) کرمات و مخالفت کے قلب میں وقعت و ہیبت ہو، اور (دوسرے) اللہ تعالیٰ (دھمکے ہیں) اپنا ملک جس کو چاہیں دیں (ان سے کوئی سوال کا منصب نہیں رکھتا) اور (چوتھے)

اللہ تعالیٰ وسعت دینے والے ہیں (ان کو مال و دنیا کیا مشکل ہے، جس کے اعتبار سے تم کو شہر ہو اور) جانے والے ہیں (کہ کون یا اقت سلطنت کی رکھتا ہے) اور (جب ان لوگوں نے پیغمبر سے

یہ درخواست کی کہ اگر کوئی ظاہری جہت بھی ان کی منجانب اللہ بادشاہ ہونے کی ہم مشاہدہ کر لیں تو اور زیادہ اطمینان ہو جائے، اس وقت) ان سے ان کے پیغمبر نے فرمایا کہ ان کے (منجانب اللہ) بادشاہ ہونے کی یہ علامت ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق (بدون تمہارے لئے ہوئے) آجائے

میں میں سکین (اور برکت) کی چیز ہے، تمہارے رب کی طرف سے (یعنی تورات اور تورات کا منجانب اللہ ہو لگا ہوا ہے) اور کچھ بھی ہوئی چیزیں ہیں جن کو حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام

چھوڑ گئے ہیں (یعنی ان حضرات کے کچھ ملبوسات وغیرہ، غرض) اُس صندوق کو فرشتے نے آدیں (اس طرح کے صندوق کے آجانے) میں تم لوگوں کے واسطے پوری نشانی ہے اگر تم یقین لائے

دائے ہو، پھر جب بنی اسرائیل نے طاوت کو بادشاہ تسلیم کر لیا اور جالوت کے مقابلے کے لئے نکلیں ہو گئے اور) طاوت فوجوں کو لے کر اپنے مقام یعنی بیت المقدس سے عمالقہ کی

طرف، چلے گئے انہوں نے اپنے ہمراہی پیغمبر کی وحی کے ذریعے دریافت کر کے ساتھیوں سے (ہمارا آپ حق تعالیٰ (استقلال و بے استقلالی میں) تمہارا امتحان کریں گے ایک نہر کے ذریعے

(جوراء میں آدے گی اور تم شدت تشنگی کے وقت اُس پر گزرو گے) سو جو شخص اس سے افراط کے ساتھ اپنی پیروی کا وہ تو میرے ساتھیوں میں نہیں، اور جو اس کو زبان پر بھی نہ رکھے (اور اصل

حکم یہ ہے) وہ میرے ساتھیوں میں ہے، لیکن جو شخص اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے (تو اتنی نصرت ہے، طرہ وہ ہر راستے میں آتی و پیاس کی تھی شدت) سو سب لے اس سے (بے تحاشا) پینا شروع

کر دیا، پھر صندوق سے آدمیوں نے ان میں سے راہنما کی، کسی نے بالکل نہ پیا ہوگا، کسی نے

چلوں سے زیادہ نہ پایا ہوگا) سو جب طاہوت اور جو زمینیں ان کے ہمراہ تھے نہر سے پار اتر گئے، اور اپنے بیج کو دیکھا تو تھوڑے سے آدمی رہ گئے، اُس وقت بعض آدمی آپس میں کہنے لگے کہ آج تو ہمارا بیج اتنا کم ہے کہ اس حالت سے ہم میں جاہوت اور اس کے لشکر کے مقابلے کی طاقت نہیں معلوم ہوتی (یہ لشکر) ایسے لوگ جن کو یہ خیال (پیش نظر) تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رو برو پیش ہونے والے ہیں کہنے لگے کہ کثرت سے (ایسے واقعات ہو چکے ہیں کہ بہت سی چھوٹی چھوٹی جماعتیں بڑی بڑی جماعتوں پر خدا کے حکم سے غالب آگئی ہیں) اصل چیز استقلال ہے اور اللہ تعالیٰ استقلال والوں کا ساتھ دیتے ہیں اور جب دیارِ عالمہ میں پہنچے اور جاؤ اور اس کی فوجوں کے سامنے میدان میں آگئے تو دربار میں حق تعالیٰ سے کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار ہم پر (یعنی ہمارے قلوب پر) استقلال (میرے) نازل فرمائیے اور (مقابلہ کی وقت) ہمارے قدم جمائے رکھتے، اور ہم کو اس کا فرقہ پر غالب کیجئے، پھر طاہوت والوں نے جاہوت والوں کو خدا تعالیٰ کے حکم سے شکست دیدی اور داؤد علیہ السلام نے (جو کہ اس وقت طاہوت کے لشکر میں تھے اور اس وقت تک نبوت وغیرہ نہ ملی تھی) جاہوت کو قتل کر ڈالا (اور مظہر و منصور واپس آئے) اور اس کے بعد (ان کو) یعنی داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے سلطنت اور حکمت (یہاں حکمت سے مراد نبوت ہے) عطا فرمائی اور بھی جو منظور ہوا انکو تعلیم فرمایا جیسے بغیر آلات کے زرہ بنانا اور جانوروں کی بولی سمجھنا آگے اس واقعہ کی مصلحت مآثر فرماتے ہیں) اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بعض آدمیوں کو (جو کہ مفسد ہوں) بعضوں کے ذریعے سے (جو کہ مصلح ہوں) وقتاً فوقتاً دفع کرتے رہا کرتے ہیں (یعنی اگر مصلحین کو مفسدین پر غالب نہ کرتے رہتے) تو سرزمین (تمام) فساد سے پُر ہو جاتی، لیکن اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں جہاں والوں پر اس لئے وقتاً فوقتاً اصلاح فرماتے رہتے ہیں۔

معارف و مسائل

- ۱۔ اِذَا قَالُوا لِلنَّبِيِّ لَعْنُكُمْ اَبَعَثَ لَنَا طَائِفًا مِّنْكُمْ فِي سِيْرِ بَنِي إِسْرَآئِيلَ، ان بنی اسرائیل نے حق تعالیٰ کے احکام کو چھوڑ دیا تھا، کفارِ عالمہ ان پر مسلط کر دیئے گئے، اُس وقت ان لوگوں کو اصلاح کی فکر ہوئی، اور جن نبی کا یہاں ذکر ہے ان کا نام شموئیل مشہور ہے۔
- ۲۔ اَنْ يَّاتِيَكُمْ التَّائِبُوتُ، بنی اسرائیل میں ایک صندوق چلا آتا تھا، اس میں تبرکات تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہ انبیاء کی بنی اسرائیل اس صندوق کو لڑائی میں آگے دیکھتے، اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے فتح دیتا، جب جاہوت بنی اسرائیل پر غالب آیا، تو یہ صندوق بھی

لے گیا تھا، جب اللہ تعالیٰ کو صندوق کا پہنچانا منظور ہوا تو یہ کیا کہ وہ کافر جہاں صندوق کو رکھتے ہیں وہاں اور بلا آئی، پانچ شہر ویران ہو گئے، ناچار ہو کر دو دویلوں پر اس کو لاد کر ایک ڈیا فرشتے ہیلوں کو ایک کر طاہوت کے دروازے پر پہنچا گئے، بنی اسرائیل اس نشانی کو دیکھ کر طاہوت کی (ادشاست پر یقین لائے، اور طاہوت نے جاہوت پر فوج کشی کر دی اور موسم نہایت گرم تھا۔

۳۔ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بَشَعًا، اس امتحان کی حکمت اور توجہ احقر کے ذوق میں معلوم ہوتی ہے کہ ایسے مواقع پر جوش و خروش میں بھیڑ بھڑکا بہت ہو جایا کرتا ہے، لیکن وقت پر جانے والے کم ہوتے ہیں، اور اُس وقت ایسوں کا اکثر جانا باقی لوگوں کے پاؤں بھی اکھاڑ دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگوں کا ملین کرنا منظور تھا، اس کا یہ امتحان معسر رکھا گیا جو کہ نہایت ہی مناسب ہے، کیونکہ قتال میں ضرورت استقلال و جفاکشی کی ہوتی ہے، سو شدتِ پیاس کے وقت بے وقت الٹی ملنے پر مضطرب کرنا دلیلِ استقلال کی اور اندھے بازوں کی طرح جاگڑنا دلیلِ بے استقلال کی ہے آگے فرقہ طاعت ہو کہ زیادہ پانی پینے والے غیبی طور پر بھی زیادہ بیکار اور اذکار رفتہ ہو گئے، ہزاروں المعانی میں بسند ابن ابی حاتم حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے، اور اس قصے میں جو احوال و اقوال مذکور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تین قسم کے لوگ تھے۔

۱۔ اھل ایمان جو امتحان میں پورے اترے، اور کائنات میں جو امتحان میں پورے اترے، مگر اپنی قلت کی فکر ہوئی، اور اکمل جن کو یہ بھی فکر نہیں ہوئی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ تَتْلُوْهُ اَعْلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۚ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۵۱﴾

اے اہل ایمان! اللہ کی تم پر تلاوت کی جا رہی ہے بالحق! اور تم میں سے ایک رسول ہے۔

خلاصہ تفسیر

یاد رکھو کہ قرآن کریم کا ایک بڑا مقصد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اثبات بھی ہے، اس لئے جس جگہ مصلحوں کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے اس کا اعادہ کر دیا جاتا ہے، اس موقع پر اس قصہ کی صحیح خبر دینا جب کہ آپؐ نے نہ کسی سے پڑھا نہ کہیں سنا نہ دیکھا، ایک مجزہ ہے جو آپؐ کی نبوت کی صحیح دلیل ہے، اس لئے ان آیات میں آپؐ کی نبوت پر استدلال فرماتے ہیں:

یہ روایتیں جن میں یہ قصہ مذکور ہوا، اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو صحیح طور پر ہم استدلال کے لئے ہیں اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ بلاشبہ پیغمبروں میں سے ہیں،

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِنْهُمْ

یہ سب رسولانِ فضیلت دی ہم نے ان میں بعض کو بعض سے کوئی تو وہ ہے

مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضُهُمْ دَرَجَاتٍ ۚ وَآخِذَا عَنِ ابْنِ مَرْيَمَ

کہ کلام فرمایا اس سے اللہ نے اور بلند کئے بعضوں کے درجے اور دئے ہم نے عیسیٰ مریم کے بیٹے

الْبَيْتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتُلُوا الَّذِينَ

کو معجزہ مریم اور قوت دی اس کو روح القدس یعنی جبریل اور اگر اللہ چاہتا تو نہ لڑتے وہ لوگ

مِنْ بَعْدِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَلَكِنْ اخْتَفَوْا فَوَيْلٌ لَهُمْ

جو ہوئے ان پیغمبروں کے پیچھے بعد اس کے کہ پہنچ چکے ان کے پاس صاف ہمت لیکن ان میں اختلاف پڑ گیا،

مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَقْتُلُوا لَكِنْ

پھر کوئی تو ان میں ایمان لایا اور کوئی کافر ہوا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ باہم نہ لڑتے، لیکن

اللَّهُ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ﴿۵۷﴾

اللہ کرتا ہے جو چاہے۔

خلاصہ تفسیر

بعض انبیاء اور امتوں کے کچھ احوال یہ حضراتِ مرسلین (جن کا ذکر ابھی آگیا ہے) ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے، (مثلاً بعضے

ان میں وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ (بلداوسط فرشتہ کے) ہم کلام ہوئے ہیں، (مراد موسیٰ علیہ السلام) اور بعضوں کو ان میں بہت سے درجوں میں (اعلیٰ مقام سے) سرفراز کیا، اور ہم نے حضرت

عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو کھلے کھلے دلائل (یعنی معجزات) عطا فرمائے، اور ہم نے ان کی تائید روح القدس (یعنی جبریل علیہ السلام) سے فرمائی رہبر وقت یہود سے انکی مخالفت

کرنے کے لئے ساتھ رہتے تھے) اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو (امت کے) جو لوگ ان (پیغمبروں) کے بعد ہوئے ہیں رکبھی دین میں اختلاف کر کے) باہم قتل و قتال نہ کرتے بعد

اس کے کہ ان کے پاس (امروں کے) دلائل (پیغمبروں کی معرفت) پہنچ چکے تھے (جن کا متنازعہ وجود ان کے قبول پر متفق رہنا) لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کو بعض حکمتیں منظور تھیں اس لئے ان میں اتقان

نہ ہیں انہیں پیدا کیا) وہ لوگ باہم (دین میں) مختلف ہوئے، سو ان میں کوئی تو ایمان لایا، اور کوئی کافر رہا، (پھر اس اختلاف میں فوجیت قتل و قتال بھی پہنچ گئی) اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو وہ لوگ باہم قتل و قتال نہ کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ (اپنی حکمت سے) جو چاہتے ہیں (اپنی قدرت سے) وہی کرتے ہیں۔

معارف و مسائل

(۱) تِلْكَ الرُّسُلُ الْآیۃ اس مضمون میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مرد تسلیم دینا ہوا کیونکہ جب آپ کی رسالت دلیل سے ثابت تھی جسکو تِلْكَ الرُّسُلُ الْآیۃ میں بھی فرمایا ہوا اور پھر بھی منکرین نہ مانتے تھے، تو یہ آپ کے رنج و اندوس کا محل تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ بات سننا ہی کہ اور بھی پیغمبر مختلف درجوں کے گزرے ہیں، لیکن ایمان مام کسی کی امت میں نہیں ہوا، کسی نے موافقت کی کسی نے مخالفت، اور اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہوتی ہیں مگر ہر شخص پر منکشف نہ ہوں، مگر اجمالاً اتنا عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ کوئی حکمت ضرور ہے۔

(۲) تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ یہاں یہ اشکال پیش آسکتا ہے کہ یہ آیت صراحتاً اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ بعض انبیاء بعض سے افضل ہیں، حالانکہ حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَفْضَلُوا بَيْنَ الْأَنْبِيَاءِ اللَّهُ يَزِيْرُ مَا يَشَاءُ

انبیاء کے درمیان تفضیل نہ کیا کرو۔

لَا تَخْتَلِفُوْنِ عَلٰی مُوسٰی۔

مجھے موسیٰ پر فضیلت نہ دو۔

اور فرمایا:

لَا اَقُوْلُ اَنْ اَحَدًا اَفْضَلُ مِنْ

یونس بن مثنیٰ

میں نہیں کہہ سکتا کہ کوئی یونس بن مثنیٰ سے افضل ہے۔

ان احادیث میں بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دینے کی ممانعت وارد ہوئی ہے، جو اب یہ ہے کہ احادیث کا مطلب یہ ہے کہ دلیل کے بغیر اپنی رائے سے بعض کو بعض پر فضیلت دواں نہ کرے کسی نبی کے افضل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے یہاں ان کا مرتبہ بہت زیادہ ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کا علم رائے اور قیاس سے حاصل نہیں ہو سکتا، لیکن قرآن و سنت کی کسی دلیل سے اگر بعض انبیاء کی بعض پر فضیلت معلوم ہو گئی تو اس کے مطابق اعتقاد رکھا جائے گا۔

وہا آپ کا یہ ارشاد کہ لا اقول ان احد افضل من یونس بن متى اور لا تخبرونی علی
موسیٰ تو یہ اس وقت سے متعلق ہے جب کہ آپ کو یہ علم نہیں دیا گیا تھا کہ آپ تمام انبیاء سے افضل
ہیں، بعد میں بذریعہ وحی آپ کو یہ بات بتلا دی گئی اور صحابہ کرام سے آپ نے اس کا اہتمام بھی فرمایا
(منظہری)

(۳) وَمِنْكُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللَّهُ، موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہم کلامی گو بلا واسطہ فرشتہ کے ہو مگر بے حجاب نہ تھی، پس سورۃ شوریٰ کی آیت مَا كَانَ لِشَيْءٍ أَنْ يَكْلَمَهُ اللَّهُ الْفَرْدِ، جس میں بے حجاب کلام کی نفی کی گئی اس سے کچھ تعارض نہ رہا، البتہ بعد موت کے بے حجاب کلام ہونا بھی شرعاً ممکن ہے، پس وہ شوریٰ کی آیت دنیا کے اعتبار سے ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَكُمْ يَوْمٌ لَا

اے ایمان دارو خرچ کرو اس میں سے جو تم نے تم کو روزی دی پہلے اس دن کے آنے سے

بِعِيبِهِ وَلَا خُلَّةً وَلَا شَفَاعَةً وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٢٧﴾

کہ جس میں ذخیرہ و فروخت ہو اور دانشانی اور تہ سفارش اور جو کافر میں وہی ہیں ظالم ۔

خلاصہ تفسیر

الفانی سبیل اللہ میں آجمل کرنا، اے ایمان والو خرچ کرو ان چیزوں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں قبل اس کے کہ وہ دن آجائے (یعنی قیامت کا دن) جس میں (کوئی چیز) اعمالِ خیر کا بدل نہ ہو سکے گی، کیونکہ اس میں) نہ تو خرید و فروخت ہوگی (کہ کوئی چیز دے کر اعمالِ خیر کی خرید کرے) اور نہ (ایسی) دوستی ہوگی (کہ کوئی تم کو اپنے اعمالِ خیر دیدے) اور نہ (بلا افزا) ایسی کسی کی (کوئی سفارش) ہوگی (جس سے اعمالِ خیر کی تم کو حاجت نہ رہے) اور کافر ہی لوگ ظلم کرتے ہیں (کہ اعمال اور مال کو بہ موقع استعمال کرتے ہیں، اس طرح کہ طاعاتِ بدنیہ و مالیہ کو ترک اور معصیت مالیہ و دینیہ کو اختیار کرتے ہیں تم تو ایسے نہ بنو)۔

معارف ومسائل

اس سورۃ میں عبادات و معاملات کے متعلق احکام کی شرح بیان فرمائی، جن میں سب کی تعمیل اللہ کی نافرمانی اور ہماری ہے، اور تمام اعمال میں زیادہ دشوار انسان کو جان اور مال کا خسارہ

کرنا ہوتا ہے، اور احکام الہی اکثر جو دیکھے جاتے ہیں یا جان کے متعلق ہیں یا مال کے، اور گناہ میں بندہ کو جان یا مال کی محبت اور رعایت ہی اکثر مبتلا کرتا ہے، مگر یا ان دونوں کی محبت گناہوں کی جڑ اور اس سے نجات جملہ طاعات کی سہولت کا منشاء ہے، اس لئے ان احکامات کو بیان فرما کر قتال اور اتفاق کو بیان نہرمانا مناسب ہوا، **وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ** الخ میں اول کا بیان تھا اور **مَنْ ذِي الْقُرْبَىٰ يُفْرِضْ** الخ میں دوسرے کا ذکر ہے، اس کے بعد قصہ طالوت سے اول کی تاکید ہوئی **لَوَابِ أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ** الخ سے دوسرے کی تاکید منظور ہے، اور چونکہ اتفاق مال پر بہت سے امور عبادات و معاملات کے موقوف ہیں، تو اس کے بیان میں زیادہ تفصیل اور تاکید سے کام لیا، چنانچہ اب جو رکوع آتے ہیں ان میں اکثروں میں امر ثانی یعنی اتفاق مال کا ذکر ہے، خلاصہ معنی یہ ہوا کہ عمل کا وقت ابھی ہے، آخرت میں تو نہ عمل بچے ہیں، نہ کوئی دوستی سے دیتا ہے، نہ کوئی سفارش سے بچھڑا سکتا ہے، جب تک پکڑنے والا نہ چھوڑے۔

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، زمرہ ہے سب کا تھامنے والا نہیں بکڑ سکتی اس کو اونگھ اور نہ نیند

لَهُ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا

اس کا ہر جھگڑا آسمانوں اور زمین میں ہے اور ایسا کون ہے جو سفارش کرے اس کے پاس نگرانی

يَا ذِي النُّفُلِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ

اجازت سے جانتا ہے جو کچھ خلقت کے دو پروردگار اور جو کچھ اُن کے پیچھے پادار وہ سب احاطہ نہیں

مَنْ عَلَيْهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۖ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ ۖ

کر رکھے۔ کسی چیز کا اس کی معلوماتیں سے مگر جتنا کہ دہی چاہے گنجائش ہو اس کی کرسی میں تمام آسمانوں اور زمین

وَلَا يُؤَدُّهُ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴿٢٥﴾

اور گراں نہیں اس کو تھا منا ان کا اور وہی ہے سب کے برتر عظمت والا

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ (ایسا ہے کہ) اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، زندہ ہے (جس کو کسی موت نہیں آسکتی) سنبھالنے والا ہے (تمام عالم کا) نہ اس کو آدھنگہ دیا جکتی ہے اور نہ نیند (دبا سکتی ہے)۔

اسی کے ملک میں سب کچھ (یعنی آسمانوں میں موجودات) ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس (کسی کی) سفارش کرے جسے بدون اس کی اجازت گئے وہ جانتا ہے ان تمام موجودات کے تمام حاضر و غائب حالات کو اور وہ موجودات اس کی معلومات میں سے کسی چیز کو اپنے احاطہ علی میں نہیں لاسکتے مگر جس قدر علم دینا وہی چاہے اس کی کرسی راسخی بڑی ہے کہ اس نے سب آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ان دونوں آسمان و زمین کی حفاظت کچھ گراں نہیں گذرتی اور وہ عالی شان عظیم الشان ہے۔

معارف و مسائل

آیت الکرسی کے یہ آیت قرآن کریم کی عظیم ترین آیت ہے، احادیث میں اس کے بڑے فضائل و برکات خاص فضائل مذکور ہیں مسند احمد کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سب آیات کے افضل قرار دیا ہے، اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ قرآن میں کونسی آیت سب سے زیادہ عظیم ہے، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا آیت الکرسی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا، اے ابوالمنذر تمہیں علم مبارک ہو۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن میں عظیم تر آیت کونسی ہے؟ فرمایا آیت الکرسی، (ابن کثیر عن احمد بن محمد) حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورہ بقرہ میں ایک آیت ہے جو سیدۃ آیات القرآن ہے، وہ جس گھر میں پڑھی جائے شیطان اس سے بچل جاتا ہے۔

انسانی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ہر نماز فرض کے بعد آیت الکرسی پڑھا کرے تو اس کو جنت میں داخل ہونے کے لئے بجز موت کے کوئی مانع نہیں ہے، یعنی موت کے بعد فوراً وہ جنت کے آثار اور راحت و آرام کا مشاہدہ کرنے لگے گا۔

اس آیت میں اللہ جل شانہ کی توحید ذات و صفات کا بیان ایک عجیب و غریب انداز میں بیان کیا گیا ہے، جس میں اللہ جل شانہ کا موجود ہونا، زندہ ہونا، سمیع و بصیر ہونا، شکم ہونا، واجب الوجود ہونا، دائم و باقی ہونا، سب کائنات کا موجد و خالق ہونا، تغیرات اور تاثرات سے بالاتر ہونا، تمام کائنات کا مالک ہونا، صاحب غلظت و جلال ہونا، کہ اس کے آگے کوئی بغیر اس کی اجازت کے بول نہیں سکتا، ایسی قدرت کا مالک ہونا کہ ساری عالم اور اس کی کائنات کو پیدا کرنے والی رکھنے اور ان کا نظام محکم قائم رکھنے سے اس کو نہ کوئی تھکان پیش آتا ہے نہ سستی، ایسے علم

محیط کا مالک ہونا جس سے کوئی کھلی یا چھپی چیز کا کوئی ذرہ یا قطرہ باہر نہ رہے، یہ اجمالی مفہوم ہے اس آیت کا، اب تفصیل کے ساتھ اس کے الفاظ کے معنی سنئے:

اس آیت میں دس جملے ہیں، پہلا جملہ ہے **اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ**، اس میں لفظ **اللَّهُ** اسم ذات ہے، جس کے معنی ہیں وہ ذات جو تمام کمالات کی جامع اور تمام نقائص سے پاک **لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ** میں اس ذات کا بیان ہے، کہ قابل عبادت اس ذات کے سوا کوئی چیز نہیں۔

دوسرا جملہ ہے **الْعَلِيُّ الْغُيُومُ** لفظ **الْعَلِيُّ** کے معنی عربی زبان میں ہیں زندہ، اس لئے کہ یہ لفظ لاکر یہ بتلاتا ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والا ہے، وہ موت سے بالاتر ہے، لفظ **غُيُومُ** قیام سے نکلا ہے، قیام کے معنی کھڑا ہونا، قائم کھڑا ہونے والے کو کہتے ہیں، قیوم اور تمام مبالغہ کے صیغے کہلاتے ہیں، ان کے معنی ہیں وہ جو خود قائم رہ کر دوسروں کو قائم رکھتا اور سنبھالتا ہے، قیوم حق تعالیٰ کی خاص صفت ہے، جس میں کوئی مخلوق شریک نہیں ہو سکتی، کیونکہ جو چیزیں خود اپنے وجود و بقا میں کسی دوسرے کی محتاج ہوں وہ کسی دوسری چیز کو کیا سنبھال سکتی ہیں؟ اس لئے کہی انسان کو قیوم کہنا جائز نہیں، جو لوگ عبد القیوم کے نام کو بگاڑ کر صرف قیوم بولتے ہیں گنہگار ہوتے ہیں۔

اللہ جل شانہ کے اس بار صفات میں حتی و قیوم کا مجموعہ بہت سے حضرات کے نزدیک اہم علم ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوہ بدر میں میں نے ایک وقت یہ چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھوں آپ کیا کر رہے ہیں، پہنچا تو دیکھا کہ آپ سجدہ میں پڑے ہوئے بار بار یا علی یا قیوم یا حتی یا قیوم کہہ رہے ہیں۔

تیسرا جملہ **لَا تَأْخُذُكَ شَيْءٌ** **لَا تَكُونُ لَكَ دُونُ شَيْءٍ** ہے، لفظ **تَأْخُذُكَ** میں کے زہر کے ساتھ، اُدھم کو کہتے ہیں، جو فتنہ کے ابتدائی آثار ہوتے ہیں، اور **تَكُونُ لَكَ دُونُ شَيْءٍ** مکمل نیند کو، اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ جل شانہ اُدھم اور نیند سے بے غری رہتا ہے، پچھلے جملے میں لفظ قیوم نے جب انسان کو یہ بتلایا کہ اللہ جل شانہ ساری آسمانوں زمینوں اور ان میں ساری والی تمام کائنات کو تحائف اور سنبھالتے ہوئے ہیں اور ساری کائنات اسی کے ہمارے قائم ہے، تو ایک انسان کا خیال اپنی جبلت و فطرت کے مطابق اس طرف جانا ممکن ہے کہ جو ذات پاک اتنا بڑا کام کر رہی ہے اس کو کسی وقت تھکان بھی ہونا چاہئے کچھ وقت آرام اور نیند کے لئے بھی ہونا چاہئے، اس دوسرے جملے میں محدود علم و بصیرت اور محدود قدرت رکھنے والے انسان کو اس پر متنبہ کر دیا کہ اللہ جل شانہ کو اپنے اوپر یا دوسری مخلوقات پر قیاس نہ کرے، اپنا جیسا سمجھے، وہ مثل و مثال سے بالاتر ہے، اس کی قدرت کا علم کے سامنے یہ ساری کلام نہ کہ مشکل ہیں، نہ اس کے لئے بھکان کا سبب ہیں، اور اس کی ذات پاک تمام تاثرات اور محکمی تعب اور ادھم اور نیند سے بالاتر ہے۔

جو تھا جملہ ہے لَمْ تَكُنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَيْءٍ اس کے شروع میں لفظ لَمْ کا لام ملکی کے معنی کے لئے آگیا ہے، جس کے معنی یہ ہوتے کہ تمام چیزیں جو آسمانوں یا زمین میں ہیں سب اللہ کی ملک ہیں، وہ مختار ہے، جس طرح چاہے اُن میں تصرف فرمائے۔

پانچواں جملہ بِرَحْمَتِهِ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ لَا يَذَرُ شَيْءًا یعنی ایسا کون ہے جو اس کے آگے کسی سفارش کر سکے بدون اس کی اجازت کے، اس میں چند مسائل بیان فرادیئے ہیں:

اول یہ کہ جب اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا مالک ہے، کوئی اس سے بڑا اور اس کے اوپر حکم نہیں تو کوئی اس سے کسی کام کے بارے میں باز پرس کرنے کا بھی حق دار نہیں، وہ جو حکم جاری فرمائیں اس میں کسی کو چون و چسپراکی مجال نہیں، ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص کسی سفارش و شفاعت کرے سو اس کو بھی واضح فرمادیا کہ بارگاہِ عزت و جلال میں کسی کو مجالِ دم زدن نہیں، ہاں کچھ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ہیں جن کو خاص طور پر کلام اور شفاعت کی اجازت دیدی گئی، غرض بلا اجازت کوئی کسی کی سفارش و شفاعت بھی نہ کر سکے گا، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر میں سب سے پہلے میں ساری امتوں کی شفاعت کروں گا، اسی کا نام مقامِ محمود ہے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے۔

چھٹا جملہ ہے يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ آيَاتٍ لِّكُلِّ شَيْءٍ یعنی اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کے لئے کچھ کے نام حالات و اوقات سے واقعہ و باخبر ہے، آگے اور پیچھے کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ اُن کے پیدا ہونے سے پہلے اور پیدا ہونے کے بعد کے تمام حالات و واقعات حق تعالیٰ کے علم میں ہیں، اور یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ آگے سے مراد وہ حالات ہیں جو انسان کے لئے کھلے ہوئے ہیں، اور پیچھے سے مراد اس سے مخفی واقعات و حالات ہوں تو معنی یہ ہوں گے کہ انسان کا علم تو بعض چیزوں پر ہے، اور بعض پر نہیں، کچھ چیزیں اس کے سامنے کھلی ہوئی ہیں کچھ چھپی ہوئی، مگر اللہ جل شانہ کے سامنے یہ سب چیزیں برابر ہیں، اس کا علم ان سب چیزوں کو یکساں محیط ہے، اور ان دونوں مفہوموں میں کوئی تعارض نہیں، آیت کی وسعت میں یہ دونوں داخل ہیں۔

ساتواں جملہ وَلَا يَكُونُ لَكُمْ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ہے، یعنی انسان اور تمام مخلوقات اللہ کے علم کے کسی حصہ کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے، مگر اللہ تعالیٰ ہی خود جس کو جتنا حصہ علم عطا کرنا چاہیں صرف اتنا ہی اس کو علم ہو سکتا ہے، اس میں بتلادیا گیا کہ تمام کائنات کے ذرہ ذرہ کا علم محیط صرف اللہ جل شانہ کی خصوصی صفت ہے، انسان یا کوئی مخلوق اس میں شریک نہیں ہو سکتی۔

آٹھواں جملہ ہے وَسِعَتْ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ، یعنی اس کی کرسی اتنی بڑی ہے

جس کی وسعت کے اندر ساتوں آسمان اور زمین سائے ہوئے ہیں، اللہ جل شانہ نشست و برخاست اور خیز و مکان سے بالاتر ہیں، اس قسم کی آیات کو اپنے معاملات پر قیاس نہ کیا جائے، اس کی کیفیت و حقیقت کا ادراک انسانی عقل سے بالاتر ہے، البتہ مستند روایات حدیث سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ عرش اور کرسی بہت عظیم الشان جسم ہیں جو تمام آسمان اور زمین سے بڑھا بیڑے ہیں ابن کثیرؒ نے بروایت حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کرسی کیا اور کیسی ہے، آپؐ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ ساتوں آسمانوں اور زمینوں کی مثال کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے ایک بڑے میدان میں کوئی حلقہ انگشتری جیسا ڈال دیا جائے۔

اور بعض دوسری روایات میں ہے کہ عرش کے سامنے کرسی کی مثال بھی ایسی ہی ہے جیسے ایک بڑے میدان میں انگشتری کا حلقہ۔

نواں جملہ ہے وَلَا يَكُونُ لَكُمْ مِنْ عِلْمِهِ شَيْءٌ یعنی اللہ تعالیٰ کو ان دونوں عظیم مخلوقات آسمان و زمین کی حفاظت کچھ گراں نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ اس قادر مطلق کی قدرت کا ملکہ سامنے یہ سب چیزیں نہایت آسان ہیں۔

دسواں آخری جملہ ہر وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ یعنی وہ عالی شان اور عظیم الشان ہے، پچھلے نو جملوں میں حق تعالیٰ کی ذات و صفات کے کمالات بیان ہوئے ہیں، ان کو دیکھنے اور سمجھنے کے بعد ہر عقل رکھنے والا انسان ہی کہنے پر مجبور ہے کہ ہر عزت و عظمت اور بلندی و برتری کی مالک و سزاواردہی ذات پاک ہے، ان دس جملوں میں اللہ جل شانہ کی صفاتِ کمال اور اس کی توحید کا مضمون پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ آگیا۔

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ

درود حق نہیں دینے کے معاملہ میں بیشک جدا ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے اب جو کوئی نہ مانے گمراہ

بِالطَّاعُونَ وَيُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ

کرنے والوں کو اور یقین لادے اللہ پر تو اس نے پکڑ لیا حلقہ مضبوط جو ٹوٹنے والا

لَقَدْ أَعَانَ اللَّهُ مَوْلَاهُ عِيسَىٰ

نہیں اور اللہ سب کچھ سننا جانتا ہے

خلاصہ تفسیر

دین اسلام کے قبول کرنے میں زبردستی کو کافی ثقیلہ کوئی موقع نہیں دیکھو۔
ہدایت یقیناً عمر ایسی سے ممتاز ہو چکی ہے یعنی اسلام کا حق ہونا دلائل سے
واضح ہو چکا ہے، تو اس میں اکراہ کا موقع ہی کیا ہے، اکراہ تو غیر پسندیدہ چیز پر مجبور کرنے سے ہوتا ہے،
اور جب اسلام کی غرض یقیناً ثابت ہے، تو جو شخص شیطان سے بد اعتقاد ہو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ
خوش اعتقاد یعنی اسلام قبول کرے، تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تمام لیا جو کسی طرح ٹوٹ نہیں
سکتا اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والے ہیں (اقوال ظاہری کے) اور خوب جاننے والے ہیں (احوال باطنی کے)

معارف مسائل

اسلام کو مضبوط پکڑنے والا چونکہ ہلاکت اور محرومی سے محفوظ رہتا ہے، اس لئے اس کے
ایسے شخص سے تشبیہ دی جو کسی مضبوط رسی کا حلقہ ہاتھ میں مضبوط تمام کر گرنے سے مامون رہتا ہو
اور جس طرح ایسی رسی کے ٹوٹ کر گرنے کا خطرہ نہیں اور یوں کوئی رسی ہی چھوڑ دے تو اور بات ہے، اسی
طرح اسلام میں کسی قسم کی ہلاکت اور خسار نہیں ہے، اور خود کوئی اسلام کو ہی چھوڑ دے تو اور بات
ہے (بیان القرآن)

اس آیت کو دیکھتے ہوئے بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ
دین میں زبردستی نہیں ہو، حالانکہ اسلام میں جہاد اور قتال کی تعلیم اس کے معارض ہے۔

اگر زور و غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اسلام
میں جہاد اور قتال کی تعلیم لوگوں کو قبولِ ایمان پر مجبور کرنے کے لئے نہیں ہے، ورنہ جزیہ لے کر کفار کو اپنی
زمین داری میں رکھنے اور ان کی جان و مال و آبرو کی حفاظت کرنے کے اسلامی احکام کیسے جاری ہوتے
بلکہ دفعِ فساد کے لئے ہے، کیونکہ فساد اللہ تعالیٰ کو نا پسند ہے جس کے دپے کافر بہتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ
فرماتے ہیں:-

وَيَتَّبِعُونَ فِي الْأَسْوَاقِ فَسَادًا وَاللَّهُ
لَا يُحِبُّ الْمُنْفِيسِينَ (۱۳، ۱۴)

یہ لوگ زمین میں فساد کرتے پھرتے ہیں اور اللہ
تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا

اس لئے اللہ تعالیٰ نے جہاد اور قتال کے ذریعے سے ان لوگوں کے فساد کو دور کرنے کا حکم
دیا ہے، پس ان لوگوں کا قتل ایسا ہی ہے جیسے سانپ، بھتہ اور دیگر موذی جانوروں کا قتل۔

اسلام نے عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور اپاہج وغیرہ کے قتل کو عین میدانِ جہاد میں بھی سختی سے
رکھا ہے، کیونکہ وہ فساد کرنے پر قادر نہیں ہوتے، ایسے ہی ان لوگوں کے بھی قتل کرنے کو روکا ہو
جو جزیہ ادا کرنے کا وعدہ کر کے قانون کے پابند ہو گئے ہوں۔

اسلام کے اس طرزِ عمل سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ جہاد اور قتال سے لوگوں کو ایمان قبول
کرنے پر مجبور نہیں کرتا، بلکہ اس سے وہ دنیا میں ظلم و ستم کو مٹا کر عدل و انصاف اور امن و امان قائم
رکھنا چاہتا ہے، حضرت عمرؓ نے ایک نصرانی بڑھیا کو اسلام کی دعوت دی تو اس کے جواب میں اس
کہا: اَنَا عَجُوزٌ كَبِيرَةٌ وَالْمَوْتُ إِلَيَّ قَرِيبٌ "تین میں ایک قریب المرگ بڑھیا ہوں، آخری وقت
میں اپنا مذہب کیوں چھوڑ دوں؟" حضرت عمرؓ نے پرسش کر اس کو ایمان پر مجبور نہیں کیا، بلکہ یہی آیت
تلاوت فرمائی: لَا أَكْرَاهُ فِي الدِّينِ مَيْمَنَ دِينِ يَمِينٍ میں زبردستی نہیں ہے:-

درحقیقت ایمان کے قبول پر جبر و اکراہ ممکن بھی نہیں ہے، اس لئے کہ ایمان کا تعلق ظاہری
اعضاء سے نہیں ہے، بلکہ قلب کے ساتھ ہے، اور جبر و اکراہ کا تعلق صرف ظاہری اعضاء سے ہوتا
ہے، اور جہاد و قتال سے صرف ظاہری اعضاء ہی متاثر ہو سکتے ہیں، لہذا اس کے ذریعہ سے ایمان
کے قبول کرنے پر جبر ممکن ہی نہیں ہے، اس سے ثابت ہوا کہ آیاتِ جہاد و قتال آیت "لَا أَكْرَاهُ
فِي الدِّينِ مَيْمَنَ دِينِ يَمِينٍ" کے معارض نہیں ہیں۔ (منظہری، مستطبی)

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ

اشد دھماکہ ہے ایمان والوں کا مکان ہے ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف اور جو لوگ

كَفَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ يُخْرِجُهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ

کافر ہوئے ان کے رفیق ہیں شیطان نکلتے ہیں ان کو روشنی سے اندھیروں کی طرف

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۱۵﴾

یہی لوگ ہیں دوزخ میں رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا إِلَىٰ قَوْلِهِ خَالِدُونَ ۚ اللَّهُ تَعَالَىٰ سَاحِي ۚ هِيَ ان لوگوں

کا جوا ایمان لاتے، ان کو دلفراہ تارکیوں سے نکال کر یا بجا کر فوراً اسلام کی طرف

لاتا ہے، اور جو لوگ کافر ہیں ان کے ساتھی شیطان ہیں (انسی یا جنتی) وہ ان کو نور (اسلام) سے

نکال کر یا بجا کر کفر کی طرف لے جاتے ہیں، ایسے لوگ (جو اسلام کو چھوڑ کر کفر

خستہ ساز کریں) دوزخ میں رہنے والے ہیں (اور) یہ لوگ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے۔

اس آیت سے ایمان کا سب سے بڑی نعمت اور کفر کا سب سے بڑی مصیبت ہونا

بھی معلوم ہوا اور یہ بھی کہ کافروں کی دوستی میں بھی غلطی ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ
كِبَارًا دَبَّحَا تو نے اس شخص کو جس نے چمگڑا کیا ابراہیم سے اس کے رب کی بابت اس وحی کی وحی

إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ
لے اسکو سلطنت جب کہا ابراہیم نے میرا رب جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے وہ بولا میں ہی چلاتا ہوں اور مارتا ہوں

قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالنَّمِيسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا
کہا ابراہیم نے بیشک وہ لاتا ہے سورج کو مشرق سے اب تو لے آ اس کو

مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
مغرب سے تب حیران رہ گیا وہ کافر اور اللہ سیدھی راہ نہیں دکھاتا

الظَّالِمِينَ ﴿۵﴾

بے انصافیوں کو۔

خلاصہ تفسیر

و اے مخاطب، کیا تجھ کو اس شخص کا قصہ تحقیق نہیں ہوا یعنی مزدکا جس نے
ابراہیم (علیہ السلام) سے مباحثہ کیا تھا اپنے پروردگار کے (وجود کے) بارے میں دینی توبہ وہ خدا
کے وجود ہی کا مستکر تھا اس وجہ سے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو سلطنت دی تھی دینی چاہئے تو یہ تھا کہ
نعمت سلطنت پر احسان ماننا اور ایمان لانا اس کے برعکس انکار اور کفر شروع کر دیا اور یہ جہت
اس وقت شروع ہوا تھا جب ابراہیم علیہ السلام نے (اس کے پوچھنے پر کہ خدا کیسا ہے جواب میں)
فرمایا کہ میرا پروردگار ایسا ہے کہ وہ چلاتا ہے اور مارتا ہے یعنی زندہ کرنا اور مارنا اس کی قدرت میں ہے
وہ کوڑے معزز چلانے مارنے کا مطلب تو سمجھا نہیں کہنے لگا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں میں
بھی چلاتا اور مارتا ہوں (چنانچہ جسکو چاہوں قتل کر دوں یہ تو مارنا ہے اور جسکو چاہوں قتل سے معاف
کر دوں یہ چلاتا ہے) ابراہیم علیہ السلام نے جب دیکھا کہ بالکل ہی بعیدی عقل کا ہے کہ اس کو چلاتا
اور مارتا سمجھتا ہے حالانکہ چلانے کی حقیقت بے جان چیز میں جان ڈال دینا ہے اسی طرح مارنے کا
معاملہ سمجھو اور قرآن سے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ چلائے اور مارے کی حقیقت سمجھ گاہ نہیں اس لئے اس ضرورت
سے دوسکر جواب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ (اچھا) اللہ تعالیٰ آفتاب کو (روزانہ) مشرق

سے نکالتا ہے تو ایک ہی دن (مغرب سے نکال کر دکھلا) اس پر متحیر رہ گیا وہ کافر اور کچھ جواب
نہیں آیا اس کا معترضی یہ تھا کہ وہ ہدایت کو قبول کرتا، گو وہ اپنی گمراہی پر جا رہا اس لئے ہدایت نہ ہوئی
اور اللہ تعالیٰ (کی عادت ہے کہ) ایسے بے جا راہ چلنے والوں کو ہدایت نہیں فرماتے۔

معارف و مسائل

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کافر کو دنیاوی عزت و شرف اور ملک و
سلطنت عطا کر دیں تو اس نام سے تعبیر کرنا جائز ہے، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت
مناظرہ اور مجادلہ کرنا بھی جائز ہے، تاکہ حق و باطل میں فرق ظاہر ہو جائے (قرطبی)

بعضوں کو یہ شبہ ہوا کہ اس کو یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ اگر خدا موجود ہے تو وہی مغرب سے نکالے،
دفع اس شبہ کا یہ ہے کہ اس کے قلب میں بلا اختیار یہ بات پڑ گئی کہ خدا ضرور ہے، اور یہ مشرق سے نکالنا
اسی کا فعل ہے، اور وہ مغرب سے بھی نکال سکتا ہے، اور یہ شخص بغیر ہے، اس کے کہنے سے ضرور ایسا ہوا
اور ایسا ہونے سے انقلاب عظیم عالم میں پیدا ہو گا، کہیں اور لینے کے دینے نہ پڑ جائیں، مثلاً لوگ
اس شخص کو دیکھ کر مجھ سے مغرب ہو کر ان کی راہ پر ہوں، اور اسی جہت میں سلطنت جاتی رہے،
پہچاہے تو اس لئے ذرا اور دوسرا کوئی جواب تھا نہیں، اس لئے حیران رہ گیا (بیان القرآن)

أَوَلَمْ يَكُنْ لِرَبِّكَ قُرْيَةٌ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّى يُحْيِي
کہا نہ دیکھا تو نے اس شخص کو کہ گذرا وہ ایک شہر پر اور وہ گرجا تھا اپنی جھتوں پر بولا کیونکر زندہ کرے گا

هَٰذَا اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِنَا قَامَتَهُ اللَّهُ مِائَةً عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ
اس کو اللہ مر گئے پیچھے، پھر مردہ رکھا اس شخص کو اللہ نے تئو برس پھاڑا اس کو کہا تو کہنی

كَمْ كُنْتُ قَالَ كُنْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَئِنْ مِائَةً
تو کہنی کتنے دن رہا بولا میں رہا ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم کہا نہیں بلکہ تو رہا تئو برس

عَامٍ فَالْظُّرُّ إِلَى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانْظُرْ إِلَى جَحَاشِكَ
اب دیکھو اپنا کھانا اور پینا، سٹر نہیں گیا، اور دیکھ اپنے گدے کو

وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِئُهَا ثُمَّ
اور ہم نے تجھ کو نمونہ بنانا چاہا لوگوں کی واسطے اور دیکھ ہڈیوں کی طرف کہ ہم انکو کس طرح اُٹھا کر جوڑ دیتے ہیں

تَكُونُهَا لَحْمًا نَّجِسًا لَّكَ اللَّهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ

بہر آن پر پہناتے ہیں گوشت، پھر جب اس پر ظاہر ہوا یہ حال تو کہ اٹھا کہ مجھ کو معلوم ہو کہ بیک

قَدِيرٌ

اللہ ہر چیز پر قادر

خلاصہ تفسیر

اَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْبَةٍ وَهِيَ نَارٌ تَنْجُوهُ (الی قول) اَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ
یہ نام کو اس طرح کا قصہ بھی معلوم ہے، جیسے ایک شخص تھا کہ (چلتے چلتے) ایک بستی پر ایسی
حالت میں اس کا گزر ہوا کہ اس کے مکانات اپنی چھتوں پر گر گئے تھے، یعنی پہلے چھتیں گریں
پھر ان پر دیواریں گر گئیں، مراد یہ ہے کہ کسی حادثہ سے وہ بستی ویران ہو گئی تھی، اور سب آدمی مریض
گئے تھے، وہ شخص یہ حالت دیکھ کر حیرت سے کہنے لگا کہ (معلوم نہیں) اللہ تعالیٰ اس بستی کو
یعنی اس کے مردوں کو اس کے مرے پیچھے کس کیفیت سے (قیامت میں) زندہ کریں گے (یہ تو
یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں مردوں کو جلا دیں گے، مگر اس وقت کے چلانے کا جو خیال غالب ہوا
تو بوجہ اس امر کے عجیب ہونے کے ایک حیرت سی دل پر غالب ہو گئی، اور چونکہ خدا تعالیٰ ایک کام
کو کئی طرح کر سکتے ہیں، اس لئے طبیعت اس کی متلاشی ہوئی کہ خدا جانے جلا دینا کس صورت سے
ہو گا، اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اس کا تماشا اس کو دنیا ہی میں دکھلا دیں، تاکہ ایک نظیر کے واقع ہو جائے
سے لوگوں کو زیادہ ہدایت ہو (اس لئے) اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی جان قبض کر کے اس کو
تو بڑی تک مردہ رکھا، پھر (سو برس کے بعد) اس کو زندہ اٹھایا (اور پھر) پوچھا کہ تو کتنی مدت
اس حالت میں رہا؟ اس شخص نے جواب دیا کہ ایک دن رہا ہوں گا، یا ایک دن سے بھی کم (تو بڑی
مدت قلیل ہے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ تو (اس حالت میں) سو برس رہا ہے، (اور اگر
اپنے بدن کے اندر تغیر نہ ہونے سے تعجب ہو) تو اپنے کھانے پینے کی چیز کو دیکھ لے کہ (ذرا
نہیں مڑی مٹی کی ایک قدرت تو ہماری یہ ہے) اور (دوسری قدرت دیکھنے کے واسطے) اپنے
(سواری کے) گدھے کی طرف نظر کر کہ گل سسٹر کر کیا حال ہو گیا ہے، اور ہم عنقریب اس کو
ترے سامنے زندہ کئے دیتے ہیں) اور (ہم نے تجھ کو اس لئے مار کر زندہ کیا ہے) تاکہ ہم تجھ کو
اپنی قدرت کی ایک نظیر لوگوں کے لئے بنادیں کہ اس نظیر سے بھی قیامت کے روز زندہ
ہونے پر استدلال کر سکیں) اور اب اس گدھے کی، ہڈیوں کی طرف نظر کر کہ ہم ان کو کس طرح

ترکیب دیئے دیتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھا دیتے ہیں، پھر اس میں جان ڈال دیتے ہیں، غرض
یہ سب امور یوں ہی کر دیئے گئے (پھر جب یہ سب کیفیت اس شخص کو (مشاہدہ سے) واضح ہو گئی
تو بے ہمتی و جوش میں آکر) کہ اٹھا کہ میں (دل سے) یقین رکھتا ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ
ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ ارْنِي كَيْفَ تُنْجِي الْمَوْتَىٰ قَالَ أَوْمِئًا

اور یاد کر جب کہا ابراہیم نے اے پروردگار میرے دکھلاؤ مجھ کو کیونکر زندہ کرے گا تو مرگ، فرمایا یا تو یہ یقین کر

قَالَ بَلَّغْ وَلَكِنَّ لِيْطْمَئِنُّ قَلْبِيْ قَالَ فُخِّدْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ

کہا کیوں نہیں لیکن اس واسطے کہ چاہتا ہوں کہ تسکین ہو جاؤ میری دل کو فرمایا تو چار پرندوں کو چار جانور اڑنے والے

فَصَرَّ هُنَّ إِلَيْكَ لَمَّا جَعَلَ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا مِّنْهُنَّ

پھر ان کو بلانے اپنے ساتھ، پھر رکھنے ہر پہاڑ پر ان کے بدن کا ایک ایک ٹکڑا پھر ان کو بھلا

يَا تَبٰرَكَ سَعِيَاظًا وَاعْلَمَنَّ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ

چلے آویں گے تیرے پاس دڑتے ہوئے اور جان لے کہ بیشک اللہ زبردست حکمت والا

خلاصہ تفسیر

اور اس وقت کے واقعہ کو یاد کر جبکہ ابراہیم علیہ السلام نے (حق تعالیٰ سے) عرض کیا کہ
اے میرے پروردگار مجھ کو یہ (دکھلا دیجئے کہ آپ مردوں کو قیامت میں مثلاً کس کیفیت سے
زندہ کریں گے) یعنی زندہ کرنے کا تو یقین ہے، لیکن زندہ کرنے کی مختلف صورتیں اور کیفیتیں
ہو سکتی ہیں وہ معلوم نہیں، اس لئے وہ معلوم کرنے کو دل چاہتا ہے، اس سوال سے کسی کم سمجھ
آدمی کو اس کا مشبہ ہو سکتا تھا کہ معاذ اللہ ابراہیم علیہ السلام کو مرنے کے بعد زندہ ہونے پر ایمان
یقین نہیں، اس لئے حق تعالیٰ نے خود یہ سوال قائم کر کے بات کھول دی، چنانچہ ابراہیم علیہ السلام
سے اس سوال کے جواب میں اول (ارشاد فرمایا کہ کیا تم راس پر یقین نہیں لاتے، انھوں نے
جواب میں عرض کیا کہ یقین کیوں نہ لاتا، لیکن اس عرض سے یہ درخواست کرتا ہوں تاکہ میرے
قلب کو (یعنی صورت زندہ کرنے کی مشاہدہ کرنے سے) سکون ہو جاوے (ذہن دوسرے احتمال
سے چکر میں نہ پڑے) ارشاد ہوا کہ اچھا تو تم چار پرندے لو پھر ان کو (پال کر) اپنے لئے بھلاؤ،

اُن کی خوب شناخت ہر جادوے (پھر سب کو ذبح کر کے اور ہڈیوں پر دو سمیت ان کا قہر سا کر کے اس کے کئی حصے کروا دینی پہاڑ اپنی مرضی سے انتخاب کر کے) ہر پہاڑ پر اُن میں سے ایک ایک حصہ رکھ دو اور (پھر اُن سب کو بلاؤ (دیکھو) تمہارے پاس زندہ ہو کر) دوڑ دوڑ کر چلے آویں گے اور خوب یقین رکھو اس بات کا کہ حق تعالیٰ زبردست (قدرت والے) ہیں (سب کچھ کر سکتے ہیں پھر بھی بعض باتیں نہیں کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ) حکمت والے (بھی) ہیں، (ہر کام حکمت و مصلحت کے مطابق کرتے ہیں)

معارف و مسائل

حضرت خلیل اللہ کی درخواست یہ ہمیشہ اقصیٰ ہے جو آیت مذکورہ میں بیان فرمایا گیا ہے جس کا خلاصہ حیات بعد الموت کا مشاہدہ ہے کہ خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے یہ درخواست کی کہ مجھے اس کا مشاہدہ کرا دیجئے کہ آپ مژدوں کو کس طرح زندہ کریں گے؟ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس درخواست کی کیا وجہ ہے؟ کیا آپ کو ہماری قدرت کا ملکہ پر یقین نہیں کہ وہ ہر چیز پر جادو ہے، ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا واقعی حال عرض کیا کہ یقین تو کیسے نہ ہوتا، کیونکہ آپ کی قدرت کا ملکہ کے مظاہر ہر لحظہ ہر آن مشاہد میں آتے رہتے ہیں اور غور و فکر کرنے والے کے لئے خود اس کی ذات میں اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے، لیکن انسانی فطرت ہے کہ جس کام کا مشاہدہ نہ ہو خواہ وہ کتنا ہی یقینی ہو اس میں اس کے خیالات منتشر رہتے ہیں کہ یہ کیسے اور کس طرح ہو گا؟ یہ ذہنی انتشار سکون قلب اور اطمینان میں غلغلہ نامداز ہوتا ہے، اس لئے یہ مشاہدہ کی درخواست کی گئی کہ احیاء موتی کی مختلف صورتوں اور کیفیتوں میں ذہنی انتشار واقع نہ ہو کر قلب کو مسکون و اطمینان حاصل ہو جائے۔

حق تعالیٰ نے ان کی درخواست قبول فرمائی کہ ان کے مشاہدہ کی بھی ایک ایسی عجیب صورت تجویز فرمائی جس میں منکرین کے تمام شبہات و غدشات کے ازالہ کا بھی مشاہدہ ہو جائے، وہ صورت یہ تھی کہ آپ کو حکم دیا گیا کہ چار پرندے جانور اپنے پاس جمع کر لیں، پھر اُن کو پاس رکھ کر بلا لیں کہ وہ ایسے بل جائیں کہ آپ کے بلانے سے آجایا کریں، اور ان کی پوری طرح شناخت بھی ہو جائے، یہ شبہ نہ ہے کہ شاید کوئی دوسرا پرندہ آگیا ہو، پھر ان چاروں کو ذبح کر کے اور ہڈیوں اور پردوں سمیت اُن کا خوب قہر سا کر کے اس کے کئی حصے کر دیں، اور پھر اپنی تجویز سے مختلف پہاڑوں پر اس قہر کا ایک ایک حصہ رکھ دیں، پھر اُن کو بلا لیں، تو وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ملکہ سے زندہ ہو کر دوڑے دوڑے آپ کے پاس آجائیں گے۔

تفسیر روح المعانی میں بسند ابن المنذر حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسا ہی کیا، پھر ان کو پکارا تو فوراً ہڈی سے ہڈی پر سے پڑا خون سے خون، گوشت سے گوشت جل ملا کر سب اپنی اپنی اصلی ہیئت میں زندہ ہو کر دوڑنے ہوئے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس آ گئے، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابراہیم قیامت کے روز اس طرح سب اجزاء و اجساد کو جمع کر کے ایکے م سے ان میں جان ڈالوں گا قرآن کے الفاظ میں يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا اللَّهَ تَعَالَىٰ اے، کہ یہ پرندے دوڑتے ہوئے آئیں گے، جس سے معلوم ہوا کہ اُن کو نہیں آئیں گے، کیونکہ آسمان میں اُن کو آنے میں نظروں سے اوجھل ہو کر بدل جانے کا شبہ ہو سکتا ہے، زمین پر چل کر آنے میں یہ بالکل سامنے رہیں گے، اس وقت میں حق تعالیٰ نے قیامت کے بعد حیات بعد الموت کا ایسا نمونہ حضرت خلیل اللہ کو دکھلایا جس نے مشرکین اور منکرین کے سارے شبہات کا ازالہ مشاہدہ سے کرا دیا۔

حیات بعد الموت اور عالم آخرت کی زندگی پر سب سے بڑا اشکال منکرین کہہ ہی ہوتا ہے کہ انسان مرنے کے بعد مٹی ہو جاتا ہے، پھر یہ مٹی کہیں ہوا کے ساتھ اُڑ جاتی ہے، کہیں پانی کے ساتھ بہہ جاتی ہے، کہیں درختوں اور کھیتوں کی شکل میں برآمد ہوتی ہے، پھر اس کا ذرہ ذرہ دنیا کے اطراف بعید میں پھیل جاتا ہے، ان منتشر ذروں اور اجزاء انسانی کو جمع کر دینا اور پھر ان میں روح ڈال دینا سطحی نظروں سے انسان کی اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ سب کو اپنی قدرت اپنی مشیت پر قیاس کرتا ہے، وہ اپنے سے مافوق اور ناقابل قیاس قدرت میں غور نہیں کرتا۔ حالانکہ اگر وہ ذرا سا اپنے ہی وجود میں غور کرے تو اسے نظر آئے کہ آج بھی اس کا وجود ساری دنیا میں بکھرے ہوئے اجزاء و ذرات کا مجموعہ ہے، انسان کی آفرینش جن ماں اور باپ کے ذریعے ہوتی ہے، اور جن غذاؤں سے اُن کا خون اور جسم بنتا ہے وہ خود چلن کے تحت لطف گوشتوں سے سمٹے ہوئے ذرات ہوتے ہیں، پھر پیدائش کے بعد انسان جس غذا کے ذریعے نشوونما پاتا ہے، جس سے اس کا خون اور گوشت بدست بنتا ہے، اس میں غور کرے تو اس کی غذاؤں میں ایک ایک چیز ایسی ہے جو تمام دنیا کے مختلف ذرات سے بنی ہوئی ہے، دودھ پیتا ہے تو وہ کسی گھائے، بھینس یا بکری کے اجزاء ہیں، اور ان جانوروں میں یہ اجزاء اُس گھاس دانے سے پیدا ہونے جو انھوں نے کھائے ہیں، یہ گھاس دانے معلوم نہیں کہیں کس خطہ زمین سے آئے ہیں، اور ساری دنیا میں پھیلے والی ہواؤں نے کہاں کہاں کے ذرات کو ان کی تربیت میں شامل کر دیا ہے، اسی طرح دنیا کا دانہ دانہ اور پھل اور ترکاریاں اور انسان کی تمام غذائیں اور دوائیں جو اس کے بدن کا جزو بنتی ہیں وہ کس کس گوشتہ عالم سے کس کس طرح حق تعالیٰ کی قدرت کا ملکہ

اور نظام محکم نے ایک انسان کے بدن میں جمیع فرادے، اگر غافل اور کوتاہ نظر انسان دنیا کو چھوڑ کر اپنے ہی تن بدن کی تحقیق (ریسرج) کرنے بیٹھ جائے تو اس کو یہ نظر آئے گا کہ اس کا وجود خود ایسے بے شمار اجزاء سے مرکب ہے جو کوئی مشرق کا ہے کوئی مغرب کا، کوئی جنوبی دنیا کا کوئی شمالی حصہ کا، آج بھی دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اجزاء قدرت کے نظام محکم نے اس کے بدن میں جمیع فرادے ہیں، اور مرنے کے بعد یہ اجزاء پھر اسی طرح منتشر ہو جائیں گے، کوئی دوسری مرتبہ پھر ان کا جمیع فرادے اس کی قدرت کاملہ کے لئے کیا دشوار ہے جس نے پہلی مرتبہ اس کے وجود میں ان منتشر ذرات کو جمیع فرادے کیا تھا۔

واقعہ مذکورہ پر چند سوالات آیت مذکورہ بالا کے مضمون میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں،
جوابات اول یہ کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ سوال ہی کیوں پیدا ہوا، جبکہ وہ حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر ایمان لائے میں اس وقت کی ساری دنیا سے زیادہ یقین پر تھے؟

اس کا جواب اس تقریر کے ضمن میں آچکا ہے جو اوپر کی گئی ہے کہ درحقیقت حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سوال کسی شک و شبہ کی بناء پر نہ تھا ہی نہیں، بلکہ سوال کا منشاء صرف یہ تھا کہ حق تعالیٰ قیامت میں مردوں کو زندہ کریں گے، ان کی قدرت کاملہ سے یہ کسی طرح بھی مستبعد یا حیرت انگیز نہیں، بلکہ یقینی ہے، لیکن مردہ کو زندہ کرنے کا کام انسان کی طاقت سے باہر ہے، اس نے کبھی کبھی مردہ کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھا نہیں اور مردہ کو زندہ کرنے کی کیفیات اور صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں، انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز اس کے مشاہدہ میں نہ ہو اس کی کیفیات کی کھوج لگانے کی فکر میں رہا کرتا ہے، اس میں اس کا خیال مختلف راہوں پر چلتا ہوا جس میں ذہنی انتشار کی تکلیف بھی برداشت کرتا ہے، اس ذہنی انتشار کو رفع کر کے قلب کو سکون مل جانے ہی کا نام الطینان ہے، اسی کے لئے حضرت خلیل اللہ نے یہ درخواست پیش فرمائی تھی۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایمان اور الطینان میں کیا فرق ہے، ایمان اس اختیاری یقین کا نام ہے جو انسان کو رسول کے اعتماد پر کسی غیب کی بات کے متعلق حاصل ہو جائے، اور الطینان سکون قلب کا نام ہے، بعض اوقات لفظوں سے غائب کسی چیز پر یقین کا مل تو ہوتا ہے، مگر قلب کو سکون اس لئے نہیں ہوتا کہ اس کی کیفیات کا علم نہیں ہوتا، یہ سکون صرف مشاہدہ سے حاصل ہو سکتا ہے، حضرت خلیل اللہ کو بھی حیات بعد الموت پر تو کامل ایمان و یقین تھا، سوال صرف کیفیت احیاء کے متعلق تھا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ جب حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سوال زندہ کرنے کی کیفیت سے متعلق تھا، اصل حیات بعد الموت میں کوئی شک و شبہ نہ تھا، تو پھر ارشاد ربانی **اَوْ لَمْ تُؤْمِنُ** یعنی کیا آپ کو یقین نہیں؟ فرمانے کا کوئی موقع نہیں رہتا؟
جواب یہ ہے کہ جو سوال حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیش فرمایا کہ اصل واقعہ میں کوئی شک نہیں، لیکن اس سوال کا ایک مفہوم تو یہی ہے کہ زندہ کرنے کی کیفیت دریافت کرنا منظور ہے۔

انہی الفاظ سوال کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہو سکتا ہے جو اصل قدرت میں شبہ یا انکار سے پیدا ہو کرتا ہے، جیسے آپ کسی بوجھ کے متعلق یہ یقین رکھتے ہیں کہ فلاں آدمی اس کو نہیں اٹھا سکتا اور آپ اس کا عاجز ہونا ظاہر کرنے کے لئے کہیں کہ دیکھیں تم کیسے اس بوجھ کو اٹھاتے ہو، چونکہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سوال کا یہ غلط مفہوم بھی کوئی لے سکتا تھا اس لئے حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس غلط بات سے بری ثابت کرنے کے لئے ہی یہ ارشاد فرمایا **اَوْ لَمْ تُؤْمِنُ** تاکہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے جواب میں بتلی فرما کر انفراد پر رازوں کی زد سے نکل جائیں۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ اس سوال ابراہیم سے کم از کم اتنا تو معلوم ہوا کہ ان کو حیات بعد الموت پر الطینان حاصل نہ تھا، حالانکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر عالم غیب سے پردہ اٹھا دیا جائے تو میرے یقین و الطینان میں کوئی زیادتی نہ ہوگی، کیونکہ مجھے ایمان بالغیب ہی سے الطینان کامل حاصل ہے، تو جب بعض امتیوں کو درجہ الطینان حاصل ہو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کے خلیل کو الطینان کا درجہ حاصل نہ ہو؟

اس کے متعلق یہ سمجھ لینا چاہئے کہ الطینان کے بھی بہت سے درجات ہیں، ایک وہ الطینان ہو جو اولیاء اللہ اور صدیقین کو حاصل ہوتا ہے، اور ایک اس سے اعلیٰ مقام الطینان ہو جو عام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو حاصل ہوتا ہے، اور ایک اس سے بھی مافوق ہے، جو خاص خاص کو بصورت مشاہدہ عطا فرمایا جاتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو جو درجہ الطینان کا حاصل تھا وہ بلاشبہ حضرت خلیل اللہ کو حاصل تھا، بلکہ اس سے اعلیٰ درجہ الطینان جو مقام نبوت کے ساتھ خاص ہے، اس الطینان میں حضرت خلیل اللہ اور سب امتیوں سے فائق تھے، پھر جس کو وہ طلب فرماتے ہیں وہ سب کے لئے معتمد الطینان ہے جو خاص خاص انبیاء کو عطا فرمایا جاتا ہے، جیسے سرور کائنات سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت و دوزخ کا مشاہدہ کرنا الطینان خاص بخشا گیا۔

الغرض اس سوال کی وجہ سے یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اطمینان حاصل نہ تھا، یہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اطمینان کامل جو مشاہدہ سے حاصل ہوا کرتا ہے وہ نہ تھا، اسی کے لئے یہ درخواست فرمائی تھی۔

آیت کے آخر میں فرمایا، اِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيْمٌ۔ بین اللہ تعالیٰ زبردست ہیں، اور حکمت والے ہیں، زبردست ہونے میں قدرت کا ملکہ کا بیان فرمایا، اور حکمت والا کہہ کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ مقتضائے حکمت ہر ایک کو حیات بعد الموت کا مشاہدہ نہیں کرایا جاتا، ورنہ حق جل شانہ کے لئے کوئی دشوار نہیں کہ ہر انسان کو مشاہدہ کرا دیں، مگر پھر ایمان بالنبی کی جو فضیلت ہے وہ قائم نہیں رہ سکتی۔

مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ

مثال اُن لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں ایسی ہو کہ جیسے ایک دانہ اس سے آگین

سَبْعَ سَنَائِلٍ فِي كُلِّ سَنَةٍ وَمَا تَرْكُ حَبَّةٍ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ

سات بائیس ہر سال میں تنو تنو دانے اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے

يَتَّخِذُ اللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝۱۶۱ اَلَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي

چاہے اور اللہ بے نہایت بخشش کرنے والا ہے، سب کچھ جانتا ہے، جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال

سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى لَهُمْ

اللہ کی راہ میں، پھر خرچ کر کے پیچیدہ نا احسان رکھتے ہیں اور نہ ستاتے ہیں انہی کے لئے ہے

أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝۱۶۲

ثواب اُن کا اپنے رب کے یہاں، اور نہ ڈر ہے اُن پر اور نہ غمیں ہوں گے،

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ تَتَّبِعُهَا أَذًى وَاللَّهُ

جواب دینا نرم اور درگزر کرنا بہتر ہے اس خیرات سے جس کے پیچھے ہوشیاری اور اللہ بے پروا

غَنِيٌّ حَلِيمٌ ۝۱۶۳ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطُلُوا صَدَقَتِكُمْ بِالْمَنِّ

ہو نہایت غفلت والا، اے ایمان والو! مت غفلت نہ کرو اپنی خیرات احسان رکھ کر

وَالَّذِي كَانِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَ

اور ایذا دے کر اس شخص کی طرح جو خرچ کر لے اپنا مال لوگوں کے دکھانے کو اور یقین نہیں رکھتا کہ اللہ

الْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ ثَرَابٌ فَأَصَابَهُ

پراور قیامت کے دن ہر سوا اس کی مثال ایسی ہو جیسے صاف پتھر کے اُس پر پڑی ہے کچھ مٹی پھر برسات آئی

وَأَبِلَ فَتَرَكَهُ صَلْدًا لَا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ

زور کا سینہ زور چھوڑا اس کو بالکل صاف کچھ ہاتھ نہیں لگتا ایسے لوگوں کے ثواب میں چیز کا جو انھوں نے کایا اور اللہ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝۱۶۴ وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ

نہیں دکھاتا، سیدھی راہ کا فردن کو، اور مثال اُن کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ

ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ حَبَّةٍ كَبُرَتْ

کی خوشی حاصل کرنے کو اور اپنے دلوں کو ثابت کر کے ایسی ہو ایک بارغ ہو بلند زمین پر

أَصَابَهَا وَابِلٌ فَانْتَأَتْ أَكْطَا ضَعْفَيْنِ فَإِن لَّمْ يُصِيبْهَا وَابِلٌ فَطُلُ

اس پر پڑا زور کا سینہ قزلبا وہ بارغ اپنا پھیل دو چند اور اگر نہ پڑا اس پر سینہ تو پھواری کاں ہے،

وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝۱۶۵ أَيُّدُكُمْ أَمْ أَنْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ

اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتا ہے، کیا پسند آتا ہے تم میں سے کسی کو یہ کہ ہر دے اس کا ایک بارغ

مِّنْ تَخْيِيلٍ وَأَعْيَابٍ تَجْرِي مِّنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ

کھجور کا اور انگور کا بہتی ہوں نیچے اس کے بہریں اس کو اس بارغ میں اور بھی ہے

الشَّجَرِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّتٌ ضَعُفَاءٌ مِّمَّا أَصَابَهَا

طرح کا میوہ ہو حاصل اور آگیا اس پر بڑھاپا اور اس کی اولاد میں ضعیف تب آ پڑا اس بارغ پر

إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ

ایک بجولا جس میں آگ تھی جس سے وہ بارغ جل اٹھا، ایوں سمجھانا ہے تم کو اللہ آیتیں

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ۝۱۶۶

تاکہ تم غور کرو۔

خلاصہ تفسیر

جو لوگ اللہ کی راہ میں (یعنی امور خیر میں) اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی حالت (یعنی اللہ) ایسی ہے جیسے ایک راہ کی حالت جس سے (فرض کرو) سات بالیں ہمیں (اور) ہر بال کے اندر ستودا لے ہوں (اسی طرح خدا تعالیٰ ان کا ثواب سات سو حصہ تک بڑھاتا ہے) اور یہ السنو فی خدا تعالیٰ چسکو چاہتا ہے (بعد اس کے اخلاص اور مشقت کے) عطا فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں ان کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں وہ سب کو یہ السنو فی دے سکتے ہیں مگر ساتھ ہی (جانتے والے) بھی (اس لئے) اخلاص نیت وغیرہ کو دیکھ کر عطا فرماتے ہیں) جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر خرچ کرنے کے بعد نہ تو (جس کو دیا ہے اس پر زبان سے) احسان جتلاتے ہیں اور نہ (برتاؤ سے اس کو) آزار پہنچاتے ہیں ان لوگوں کو ان کے عمل کا ثواب ملے گا ان کے پروردگار کے پاس (جا کر) اور نہ قیامت کے دن، ان پر کوئی خطرہ ہوگا اور نہ یہ مغموم ہوں گے (ناداری کے وقت جواب میں معقول و مناسب بات کہہ دینا اور اگر سائل بدتمیزی سے قصہ دلاوے یا اصرار سے تنگ کرے تو اس سے) درگزر کرنا اور جزا بہتر ہے ایسی خیرات دینے سے جس کے بعد آزار پہنچا یا جائے اور اللہ تعالیٰ بخود غنی ہیں کسی کے مال کی ان کو حاجت نہیں، جو کوئی خرچ کرتا ہے اپنے واسطے پھر آزار کس بنا پر پہنچا یا جائے اور آزار دینے پر جو فوراً سزا نہیں دیتے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ (بھی) ہیں اے ایمان والو ہم احسان جتلاتے ہیں یا آزار پہنچا کر اپنی خیرات کے ثواب بڑھنے کو برباد مت کر دو جس طرح وہ شخص (خود خیرات کے اصل ثواب ہی کو برباد کر دیتا ہے) جو اپنا مال خرچ کرتا ہے (محض) لوگوں کو دکھلانے کی غرض سے اور ایمان نہیں رکھتا اللہ پر اور یوم قیامت پر مراد اس سے (تقریباً) نبی ایمان کے منافق ہے) سو اس شخص کی حالت ایسی ہے جیسے ایک چکنا پتھر (فرض کرو اس پر) جب کچھ مٹی (آگئی) ہو اور اس مٹی میں کچھ گھاس پھوس جم آیا ہو) پھر اس پر زور کی بارش پڑ جائے سو اس کو جیسا تھا ویسا ہی بالکل صاف کر دے (اسی طرح اس منافق کے ہاتھ سے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ ہو گیا جو ظاہر میں ایک نیک عمل جس میں امید ثواب ہو معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کے لفاق نے اس شخص کو ویسا ہی کورا ثواب سے خالی چھوڑ دیا، چنانچہ قیامت میں) ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی (کیونکہ کمائی نیک عمل ہے اور اس کا ہاتھ لگنا ثواب کا ملنا ہے) اور ثواب ملنے کی شرط ایمان اور اخلاص ہے اور ان لوگوں میں یہ مغفود ہے، کیونکہ ریاکار بھی ہیں اور کافر بھی ہیں) اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو قیامت کے

روز ثواب کے گھر میں جنت کا) راستہ نہ بتلا دیں گے کیونکہ کفر کی وجہ سے ان کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوا جس کا ثواب آخرت میں ذخیرہ ہوتا اور وہاں حاضر ہو کر اس کے صلہ میں جنت میں پہنچانے جاتے) اور ان لوگوں کے خرچ کئے ہوئے مال کی حالت جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے (جو کہ خاص اس عمل سے ہوگی) اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں (کو اس عمل شاق کا خوگر بنا کر ان) میں پختگی پیدا کریں (تاکہ دوسرے اعمال صالحہ سہولت سے پیدا ہو کر) پس ان لوگوں کے نفعات و صدقات کی حالت (مثل حالت ایک باغ کے ہے جو کسی ٹیلے پر ہو کہ اس جگہ کی ہوا لطیف اور بار آور ہوتی ہے اور اس پر زور کی بارش پڑی ہو پھر وہ بارش لطافت ہوا اور بارش کے سبب اور باغوں سے یا اور دفعوں سے) دونا (چوگنا) پھل لایا ہو اور اگر ایسے زور کا میٹھ نہ پڑے تو ہلکی پھوار (یعنی خفیف بارش) بھی اس کو کافی ہے (کیونکہ زمین اور مرقع اس کا اچھا ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے ہیں (اس لئے جب وہ اخلاص دیکھتے ہیں ثواب بڑھا دیتے ہیں) بھلا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہو کہ اس کا ایک باغ ہو کہ جو روں کا اور انگوروں کا (یعنی زیادہ درخت اس میں ان کے ہوں اور اس باغ کے درختوں کے) نیچے ہنریں چلتی ہوں (جس سے وہ خوب سرسبز و شاداب ہوں اور) اس شخص کے یہاں اس باغ میں (علاوہ جو روں اور انگوروں کے) اور بھی ہر قسم کے (مناسب) میوے ہوں اور اس شخص کا بڑھا پالا گیا ہو (جو کہ زمانہ زیادہ احتیاج کا ہوتا ہے) اور اس کے اہل و عیال بھی ہوں جنہیں رکمانے کی قوت نہیں اس صورت میں اہل و عیال سے بھی اس کو توقع خبر گیری کی نہیں ہوگی، بس وجہ معاش صرف وہی باغ ہو) سو ایسی حالت میں یہ قصہ ہو کہ اس باغ پر ایک بگولہ آئے جس میں آگ (کا مادہ) ہو پھر اس سے وہ باغ جل جائے (ظاہر بات ہے کسی کو اپنے لئے یہ بات پسند نہیں آسکتی، پھر اسی کے مشابہ تو یہ بات بھی ہے کہ اول صدقہ دیا یا کوئی اور نیک کام کیا جس کے قیامت میں کارآمد ہونے کی امید ہو جو کہ وقت ہو گا غایت احتیاج کا اور زیادہ مدد قبول ہو گا اپنی طاعات پر پھر ایسے وقت میں معلوم ہو گا کہ ہمارے احسان جتلاتے یا غریب کو ایذا دینے سے ہماری طاعات باطل یا بے برکت ہو گئیں، اس وقت کیسی سخت حسرت ہوگی کہ کیسی کیسی آرزوؤں کا خون ہو گیا پس جب تم مثال کے واقعہ کو پسند نہیں کرتے تو ابطال طاعات کو کیسے گوارا کرتے ہو) اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمہارے (سمجھانے کے) لئے تاکہ تم سو جا کر (اور سوچ کر اس کے موافق عمل کیا کر دو)۔

معارف و مسائل

یہ سورۃ بقرہ کا چھتیسواں رکوع ہے جو آیت نمبر ۲۱۱ سے شروع ہوتا ہے، اب سورۃ بقرہ کے پانچ رکوع باقی ہیں جن میں آخری رکوع میں تو کلیات اور اہم اصولی چیزوں کا بیان ہے، اس سے پہلے چار رکوع میں آیت نمبر ۲۱۱ سے ۲۸۳ تک کل ۷۲ آیات ہیں، جن میں مالیات سے متعلق خاص ہدایات اور ایسے ارشادات ہیں کہ اگر دنیا آج ان پر پوری طرح مامل ہو جائے تو معاشی نظام کا وہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے جس میں آج کی دنیا چار سو بھٹک رہی ہے، کہیں سرمایہ داری کا نظام ہے تو کہیں اس کا توڑ عمل اشتراکیت اور اشتالیست کا نظام ہے، اور ان نظاموں کے باہمی ٹکراؤ نے دنیا کو قتل و قتال اور جنگ و جدال کا ایک جہنم بنا رکھا ہے، ان آیات میں اسلام کے معاشی نظام کے ایک اہم پہلو کا بیان ہے، جس کے دو حصے ہیں:

۱۔ اپنی ضرورت سے زائد مال کو اللہ کی رضا کے لئے حاجت مند و مفلس لوگوں پر خرچ کرنے کی تعلیم جس کو صدقہ و خیرات کہا جاتا ہے۔

۲۔ دوسرے سود کے لین دین کو حرام قرار دے کر اس سے بچنے کی ہدایات۔ ان میں سے پہلے دو رکوع صدقہ و خیرات کے فضائل اور اس کی ترغیب اور اس کے متعلق احکام و ہدایات پر مشتمل ہیں، اور آخری دو رکوع سود کی کاروبار کی حرمت و مانعت اور قرض اؤ صار کے جائز طریقوں کے بیان میں ہیں۔

جو آیات اور رکوع گئی ہیں ان میں اول اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے فضائل کا بیان فرمایا گیا اس کے بعد ایسی شراائط کا بیان ہے جن کے ذریعے صدقہ و خیرات اللہ کے نزدیک قابل قبول اور موجب ثواب بن جائے، پھر ایسی چیزوں کا بیان ہو جو انسان کے صدقہ و خیرات کو برباد کر کے نیکی برباد گناہ لازم کا مصداق بنا دیتی ہیں۔

اس کے بعد دو مثالیں بیان کی گئی ہیں، ایک ان نفقات و صدقات کی جو اللہ کے نزدیک مقبول ہوں دوسرے ان نفقات و صدقات کی جو غیر مقبول اور فاسد ہوں۔

یہ پانچ مضمون ہیں جو اس رکوع میں بیان ہوئے ہیں۔

یہاں ان مضامین سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے کو کہیں بہ لفظ انفاق بیان فرمایا ہے، کہیں بہ لفظ اطعام، کہیں بہ لفظ صدقہ اور کہیں بہ لفظ ایتاء الزکوٰۃ، ان الفاظ تشریحی اور ان کے جگہ جگہ استعمال پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ انفاق، اطعام، صدقہ عام ہیں، جو ہر قسم کے صدقہ و خیرات اور رخصتے انہی حاصل کرنے

کے لئے ہر قسم کے خرچ پر جاری ہے، خواہ فرض و واجب ہوں، یا نفلی اور مستحب، اور زکوٰۃ فرض کے لئے قرآن نے ایک ممتاز لفظ ایتاء الزکوٰۃ استعمال فرمایا ہے، جس میں اس کی طرت اشارہ ہو کہ اس خاص صدقہ کے لئے حاصل کرنے اور خرچ کرنے دونوں میں کچھ خصوصیات ہیں۔

اس رکوع میں اکثر لفظ انفاق سے اور کہیں لفظ صدقہ سے تعبیر کی گئی ہے، جس کا مفہوم یہ ہو کہ یہاں عام صدقات و تبرعات کا بیان ہے، اور جو احکام یہاں ذکر کئے گئے ہیں وہ ہر قسم کے صدقات اور اللہ کے لئے خرچ کرنے کی سب صورتوں کو شامل اور عاوی ہیں۔

اللہ کی راہ میں خرچ پہلی آیت میں ارشاد فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں یعنی چھ میں کرنا ایک مثال یا جہاد میں، یا فقراء و مساکین اور یتیموں پر یا بہ نیت امداد اپنے عزیزوں و دستوں پر، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایک دانہ گہوں کا عمدہ زمین میں بولے، اس دانہ سے گہیوں کا ایک پودا نکلے، جس میں سات خوشے گہیوں کے پیدا ہوں، اور ہر خوشے میں سو دانے ہوں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دانہ سے سات سو دانے حاصل ہو گئے۔

مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے کا اجر و ثواب ایک سے لے کر سات سو تک پہنچتا ہے، ایک پیسہ خرچ کرے تو سات سو پیسوں کا ثواب حاصل ہو سکتا ہے۔

میسج و معتبر احادیث میں ہے کہ ایک نیکی کا ثواب اس کا دس گنا ملتا ہے، اور سات سو گئے تک پہنچ سکتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ جہاد اور حج میں ایک درہم خرچ کرنے کا ثواب سات سو درہم کے برابر ہے، یہ روایت ابن کثیر نے بحوالہ مسند احمد بیان کی ہے۔

الغرض اس آیت نے بتلایا کہ اللہ کی راہ میں ایک روپیہ خرچ کرنے والے کا ثواب ستاسو روپے کے خرچ کے برابر ملتا ہے۔

قبولیت صدقات کی لیکن تشریح کریم نے اس مضمون کو بجائے مختصر اور صاف لفظوں میں بیان کرنے مثبت شراائط کے دانہ گندم کی مثال کی صورت میں بیان فرمایا، جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح کا ششکار ایک دانہ گندم سے سات سو دانے اُسی وقت حاصل کر سکتا ہے، جب کہ یہ دانہ عمدہ ہو خراب نہ ہو، اور دانہ ڈالنے والا کا ششکار بھی کا ششکار ہی کے فن سے پورا واقف ہو، اور جس زمین میں ڈالے وہ بھی عمدہ زمین ہو، کیونکہ ان میں سے اگر ایک چیز بھی کم ہو گئی تو یا یہ دانہ ضائع ہو جائے گا ایک دانہ بھی نہ نکلے گا، اور یا پھر ایسا بار آور نہ ہوگا کہ ایک دانہ سے سات سو دانے بن جائیں۔

اسی طرح عام اعمال صالحہ اور خصوصاً انفاق فی سبیل اللہ کی مقبولیت اور زیادتی اجر کے لئے بھی یہی تین شرطیں ہیں کہ جو مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے وہ پاک اور حلال ہو

کیونکہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک اور حلال مال کے سوا کسی چیز کو قبول نہیں فرماتے۔
دوسرے خرچ کرنے والا بھی نیک نیست اور صالح ہو، بدعتی یا نام و نمود کے لئے خرچ کرنے والا اس نادانقت کا شکار کی طرح ہے جو دانہ کو کسی ایسی جگہ ڈال دے کہ وہ ضائع ہو جاتے۔

تیسرے جس پر خرچ کرے وہ بھی صدقہ کا مستحق ہو، کسی نااہل پر خرچ کر کے ضائع نہ کریں اس طرح اس مثال سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بہت بڑی فضیلت بھی معلوم ہو گئی، اور ساتھ ہی اس کی عین شرطیں بھی، کہ مال حلال سے خرچ کرے، اور خرچ کر لے کا طریقہ بھی سنت کے مطابق ہو، اور مستحقین کو تلاش کر کے ان پر خرچ کرے، محض جیب نکال ڈالنے سے یہ فضیلت حاصل نہیں ہوتی۔

دوسری آیت میں صدقہ کرنے کے صحیح اور مستحسن طریقہ کا بیان اس طرح فرمایا گیا، ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں، اور نہ جن کو دیا گیا ہے ان کو کوئی ایذا پہنچاتے ہیں ان کا ثواب ان کے رب کے پاس محفوظ ہے، نہ ان پر آئندہ کے لئے کوئی خطرہ ہو، اور نہ گذشتہ پر کوئی بوجھ و غم۔

قبولیت صدقہ کی منفی شرائط | اس آیت میں صدقہ کے قبول ہونے کی دو منفی شرطیں بیان فرمائی گئی ہیں، ایک یہ کہ دے کر احسان نہ جتائیں، دوسرے یہ کہ جس کو دیں اس کو عملاً ذلیل و خوار نہ سمجھیں، اور کوئی ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے وہ اپنی حقارت و ذلت محسوس کرے یا اس کو ایذا پہنچے۔

تیسری آیت **قَوْلُ الْمُعْتَرِفِ** میں بھی صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی ان دو شرطوں کی مزید وضاحت کی گئی ہے، جن کا بیان اس سے پہلے آیت میں ہو چکا ہے، ایک یہ کہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کر کے کسی پر احسان نہ جتائیں، دوسرے یہ کہ جس کو دیں اس کے ساتھ کوئی ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے وہ اپنی ذلت و حقارت محسوس کرے، یا جس سے اس کو ایذا پہنچے۔

وضاحت اس طرح کی گئی کہ ناداری یا معذوری کی حالت میں سائل کے جواب میں کوئی معقول و مناسب غلہ پیش کر دینا، اور اگر سائل بدتمیزی سے غصہ دلا دے تو اس سے درگزر کرنا ہزار درجہ بہتر ہے، ایسی خیرات دینے سے جس کے بعد اس کو ایذا پہنچائی جائے، اور اللہ تعالیٰ خود غنی و عظیم ہیں، ان کو کسی کے مال کی حاجت نہیں، جو خرچ کرتا ہے اپنے نفع کے لئے کرتا ہے، تو ایک عاقل انسان کو خرچ کرنے کے وقت اس کا لحاظ رکھنا چاہئے، کہ میرا کسی پر احسان نہیں، میں اپنے نفع کے لئے خرچ کر رہا ہوں، اور اگر لوگوں کی طرف سے کوئی ناشکری بھی محسوس کرے تو اخلاق الہیہ کے تابع ہو کر غفور و درگزر سے کام لے۔

چوتھی آیت میں اس مضمون کو دوسرے عنوان سے اور بھی تاکید کے ساتھ اس طرح ارشاد فرمایا کہ اپنے صدقات کو برادر نہ کرو، زبان سے احسان جتلا کر یا برتاؤ سے ایذا پہنچا کر۔

اس سے واضح ہو گیا کہ جس صدقہ و خیرات کے بعد احسان جتلانے یا مستحقین کو ایذا پہنچانے کی صورت ہو جائے وہ صدقہ باطل کا عدم ہے، اس پر کوئی ثواب نہیں، اس آیت میں صدقہ کے قبول ہونے کی ایک اور شرط کا اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جو شخص لوگوں کے دکھائے اور نام و نمود کے واسطے خرچ کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی صاف پتھر پر کچھ مٹی جم جائے، اور اس میں کوئی دانہ بوسے پھر اس پر زور کی بارش پڑ جائے اور وہ اس کو بالکل صاف کر دے، ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی، اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو راستہ نہ دکھلائیں گے، اس سے قبولیت صدقہ و خیرات کی یہ مشروط معلوم ہوئی، کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا ہو اور ثواب آخرت کی نیت سے خرچ کرے، دکھلانے یا نام و نمود کی نیت سے نہ ہو، نام و نمود کی نیت سے خرچ کرنا، اپنے مال کو برادر کرنا ہے، اور آخرت پر ایمان رکھنے والا مومن بھی اگر کوئی خیرات محض نام و نمود اور ریاء کے لئے کرتا ہے تو اس کا بھی یہی حال ہو کہ اس کو کوئی ثواب نہیں ملتا، پھر اس جگہ **لَا يَذُوقُ ثَمَارَ الْإِيمَانِ** کے اضافہ سے شاید اس طرف اشارہ کرنا منظور ہو کہ ریاء کاری، اور نام و نمود کے لئے کام کرنا اس شخص سے متصور ہی نہیں جو اللہ تعالیٰ اور دنیا آخرت پر ایمان رکھتا ہے، ریاء کاری اس کے ایمان میں خلل کی علامت ہے۔

آیت کے آخر میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو راستہ نہ دکھائیں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بھی ہوتی ہدایات اور آیات جو سب انسانوں کے لئے عام ہیں، ان کو جو ان ہدایات پر نظر نہیں کرتے بلکہ تمسخر اور استہزاء کرتے ہیں، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ ان کو توفیق سے محروم کر دیتے ہیں، جن کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی ہدایت قبول نہیں کرتے۔

پانچویں آیت میں صدقہ مقبولہ اور انفاق مقبول کی ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ جو لوگ اپنے مال خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی نیت سے خرچ کرتے ہیں کہ اپنے نفسوں میں بخل پیدا کریں ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی باغ ہو کسی ٹیلے پر اور اس پر زور کی بارش پڑی ہو، پھر وہ اپنا پھل لایا ہو و چنداں اور اگر ایسے زور کی بارش بھی نہ پڑے تو ٹیلے پھول بھی اس کے لئے کافی ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے جانتے ہیں۔

اس میں اخلاص نیت اور رعایت شرائط مذکورہ کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بڑی فضیلت اس مثال سے واضح کر دی گئی کہ نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ تمہارا بھی خرچ کیا جائے تو وہ کافی اور موجب خیرات آخرت ہے۔

چھٹی آیت میں صدقہ و خیرات میں شرائط مذکورہ کی خلاف ورزی کر لے پر صدقہ کے باطل و مردود ہونے کا بیان بھی ایک مثال میں اس طرح واضح فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہو کہ اس کا ایک باغ ہو جو کھجور اور انگوروں کا اس کے نیچے پھریں بہتی ہوں، اور اس شخص کے باغ میں ہر قسم کے میوے ہوں اور اس شخص کا بڑھا پا آگیا ہو، اور اس کے اہل و عیال بھی ہوں جن میں قوت نہیں، ان حالات میں اس باغ پر ایک گجولہ آدے جس میں آگ ہو، پھر وہ باغ جل جائے اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمھارے لئے تاکہ تم سوچا کرو۔

مطلب یہ ہے کہ خلاف شرائط صدقہ کرنے کی مثال ایسی ہی ہے کہ بظاہر وہ صدقہ کر کے آخرت کے لئے بہت سا ذخیرہ جمع کر رہا ہے، لیکن اللہ کے نزدیک یہ ذخیرہ کچھ بھی کام نہیں آتا۔

اور اس مثال میں جو چند قیدی بڑھائی گئیں کہ اس کا بڑھا پا آگیا، اس کے اولاد بھی بڑا اور اولاد بھی چھوٹے سچے جو ضعیف کمزور ہیں، ان قیدوں کا مقصد یہ ہے کہ جو ان کی حالت میں کسی کا باغ یا کھیتی جل جائے تو اسے یہ امید ہو سکتی ہے کہ پھر باغ لگا لوں گا، اور جس شخص کے اولاد نہ ہو اور اس کو دوبارہ باغ لگانے کی امید بھی نہ ہو تو باغ جل جانے کے بعد بھی اس کو کوئی خاص فکر معاش کی نہیں ہوتی، اکیلا آدمی جس طرح چاہے تنگی ترشی سے گزارا کر سکتا ہے، اور اگر اولاد بھی ہو مگر جوان صالح ہوں جن سے یہ توقع کی جائے کہ وہ باپ کا ہاتھ بٹائیں گے، اور مدد کریں گے، ایسی صورت میں بھی انسان کو باغ کے جل جانے یا لٹ جانے پر بھی کچھ زیادہ صدمہ نہیں ہوتا، کیونکہ اولاد کی فکر سے فارغ ہے، بلکہ اولاد اس کا بھی بوجھ اٹھا سکتی ہے، غرض یہ تینوں قیدی شدت جستیاچ کو بیان کرنے کے لئے لائی گئیں، کہ ایسا شخص جس نے اپنا مال اور محنت خرچ کر کے ایک باغ لگایا، اور وہ باغ تیار ہو کر پھل بھی دینے لگا، اور اسی حالت میں اس کا بڑھا پا اور کمزوری کا زمانہ بھی آگیا، اور یہ شخص صاحب عیال بھی ہے، اور عیال بھی چھوٹے اور کمزور بچے ہیں، تو ان حالات میں اگر لگا یا ہو باغ جل جائے تو صدمہ شدید ہو گا، اور تکلیف بے حد ہوگی۔

اسی طرح جس شخص نے رباہ کاری سے صدقہ و خیرات کیا یہ گویا اس نے باغ لگایا، پھر موت کے بعد اس کی حالت اس بوڑھے جیسی ہو گئی جو کالے اور دوبارہ باغ لگانے کی قدرت نہیں رکھتا، کیونکہ موت کے بعد انسان کا کوئی عمل ہی نہیں رہا، اور جس طرح عیال دار بوڑھا اس کا بہت محتاج ہوتا ہے کہ پھل کمانی محفوظ ہوتا کہ ضعیفی میں کام آئے، اور اگر اس حالت میں اس کا باغ اور مال متاع جل جائے تو اس کے دکھ اور دکھ کی انتہاء نہ رہے گی، اسی طرح یہ صدقہ و خیرات جو رباہ خورد کے لئے کیا گیا تھا، عین ایسے وقت ہاتھ سے جاتا ہے گا جب کہ وہ اس کا بہت حاجت مند ہوگا۔

اس پوری آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی ایک بڑی شرط اخلاص ہے، کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے خرچ کیا جائے، کسی نام و نمود کا اس میں دخل نہ ہو۔

اب اس پورے رکوع کی تمام آیات پر مکرر نظر ڈالئے تو ان سے الفاق فی سبیل اللہ اور صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی کچھ شرائط معلوم ہوں گی:

اول اس مال کا حلال ہونا جو اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے، دوسرے طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، تیسرے صحیح مصرف میں خرچ کرنا، چوتھے خیرات دے کر احسان نہ جملانا، پانچویں ایسا کوئی معاملہ نہ کرنا جس سے اُن لوگوں کی تحقیر ہو جن کو یہ مال دیا گیا ہے، چھٹے جو کچھ خرچ کیا جائے اخلاص نیت کے ساتھ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہو، نام و نمود کے لئے نہ ہو۔

دوسری شرط یعنی طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے وقت اس کا لحاظ رہے کہ کسی حقدار کی حق تلفی نہ ہو، اپنے عیال کے ضروری اخراجات بغیر ان کی رضا مندی کے بندیا کم کر کے صدقہ و خیرات کرنا کوئی امر ثواب نہیں، حاجت مند داروں کو محروم کر کے سائے مال کو صدقہ و خیرات یا وقف کر دینا تعلیم سنت کے خلاف ہے، پھر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ہزاروں صورتیں ہیں۔

طریق سنت یہ ہے کہ مصرف کی اہمیت اور ضرورت کی شدت کا لحاظ کر کے مصرف کا انتظام کیا جائے، عام طور پر خرچ کرنے والے اس کی رعایت نہیں کرتے۔

تیسری شرط کا حاصل یہ ہے کہ ثواب ہونے کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ اپنے خیال میں کسی کام کو نیک سمجھ کر نیک نیتی سے اس میں صرف کر دے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مصرف شریعت کی رُود سے جائز اور مستحسن بھی ہو، کوئی شخص ناجائز کھیل تماشوں کے لئے اپنی جائداد وقف کر دے تو وہ بجائے ثواب کے عذاب کا حق ہوگا، یہی حال تمام اُن کاموں کا ہو جو شریعت کی رُود سے مستحسن نہیں ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طِبَقَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا

اے ایمان والو خرچ کر دستھری چیزیں اپنی کمائی میں سے اور اس چیز میں سے کہ جو

لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلَكُمْ مِنَ الْخَيْثِ مِنْهُ تَنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ

ہم نے پیدا کیا تمہارے واسطے زمین سے اور قصد ذکر و غندی چیز کا اس میں سے کہ اس کو خرچ کرنا، حالانکہ تم

چھٹی آیت میں صدقہ و خیرات میں شرائط مذکورہ کی خلاف ورزی کر لے پر صدقہ کے باطل و مردود ہونے کا بیان بھی ایک مثال میں اس طرح واضح فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہو کہ اس کا ایک باغ ہو جو کھجور اور انگوروں کا اس کے نیچے پھریں بہتی ہوں، اور اس شخص کے باغ میں ہر قسم کے میوے ہوں اور اس شخص کا بڑھا پا آگیا ہو، اور اس کے اہل و عیال بھی ہوں جن میں قوت نہیں، ان حالات میں اس باغ پر ایک گجولہ آوے جس میں آگ ہو، پھر وہ باغ جل جائے اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمھارے لئے تاکہ تم سوچا کرو۔

مطلب یہ ہے کہ خلاف شرائط صدقہ کرنے کی مثال ایسی ہی ہے کہ بظاہر وہ صدقہ کر کے آخرت کے لئے بہت سا ذخیرہ جمع کر رہا ہے، لیکن اللہ کے نزدیک یہ ذخیرہ کچھ بھی کام نہیں آتا۔

اور اس مثال میں جو چند قیدیں بڑھائی گئیں کہ اس کا بڑھا پا آگیا، اس کے اولاد بھی بڑا اور اولاد بھی چھوٹے سچے جو ضعیف کمزور ہیں، ان قیدوں کا مقصد یہ ہے کہ جوانی کی حالت میں کسی کا باغ یا کھیتی جل جائے تو اسے یہ امید ہو سکتی ہے کہ پھر باغ لگا لوں گا، اور جس شخص کے اولاد نہ ہو اور اس کو دوبارہ باغ لگانے کی امید بھی نہ ہو تو باغ جل جانے کے بعد بھی اس کو کوئی خاص فکر معاش کی نہیں ہوتی، اکیلا آدمی جس طرح چاہے تنگی ترشی سے گزارا کر سکتا ہے، اور اگر اولاد بھی ہو مگر جوان صالح ہوں جن سے یہ توقع کی جائے کہ وہ باپ کا ہاتھ بٹائیں گے، اور مدد کریں گے، ایسی صورت میں بھی انسان کو باغ کے جل جانے یا لٹ جانے پر بھی کچھ زیادہ صدمہ نہیں ہوتا، کیونکہ اولاد کی فکر سے فارغ ہے، بلکہ اولاد اس کا بھی بوجھ اٹھا سکتی ہے، غرض یہ تینوں قیدیں شدت جستیاچ کو بیان کرنے کے لئے لائی گئیں، کہ ایسا شخص جس نے اپنا مال اور محنت خرچ کر کے ایک باغ لگایا، اور وہ باغ تیار ہو کر پھل بھی دینے لگا، اور اسی حالت میں اس کا بڑھا پا اور کمزوری کا زمانہ بھی آگیا، اور یہ شخص صاحب عیال بھی ہے، اور عیال بھی چھوٹے اور کمزور بچے ہیں، تو ان حالات میں اگر لگا یا ہوا باغ جل جائے تو صدمہ شدید ہو گا، اور تکلیف بے حد ہوگی۔

اسی طرح جس شخص نے رباہ کاری سے صدقہ و خیرات کیا یہ گویا اس نے باغ لگایا، پھر موت کے بعد اس کی حالت اس بوڑھے جیسی ہو گئی جو کمالے اور دوبارہ باغ لگانے کی قدرت نہیں رکھتا، کیونکہ موت کے بعد انسان کا کوئی عمل ہی نہیں رہا، اور جس طرح عیال دار بوڑھا اس کا بہت محتاج ہوتا ہے کہ پھل کمانی محفوظ ہوتا کہ ضعیفی میں کام آئے، اور اگر اس حالت میں اس کا باغ اور مال متاع جل جائے تو اس کے دکھ اور دکھ کی انتہاء نہ رہے گی، اسی طرح یہ صدقہ و خیرات جو رباہ خورد کے لئے کیا گیا تھا، عین ایسے وقت ہاتھ سے جانا ہے گا جب کہ وہ اس کا بہت حاجت مند ہوگا۔

اس پوری آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی ایک بڑی شرط اخلاص ہے، کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے خرچ کیا جائے، کسی نام و نمود کا اس میں دخل نہ ہو۔

اب اس پورے رکوع کی تمام آیات پر مکرر نظر ڈالئے تو ان سے الفاق فی سبیل اللہ اور صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی کچھ شرائط معلوم ہوں گی:

اول اس مال کا حلال ہونا جو اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے، دوسرے طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، تیسرے صحیح مصرف میں خرچ کرنا، چوتھے خیرات دے کر احسان نہ جملانا، پانچویں ایسا کوئی معاملہ نہ کرنا جس سے اُن لوگوں کی تحقیر ہو جن کو یہ مال دیا گیا ہے، چھٹے جو کچھ خرچ کیا جائے اخلاص نیت کے ساتھ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہو، نام و نمود کے لئے نہ ہو۔

دوسری شرط یعنی طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے وقت اس کا لحاظ رہے کہ کسی حقدار کی حق تلفی نہ ہو، اپنے عیال کے ضروری اخراجات بغیر ان کی رضا مندی کے بندیا کم کر کے صدقہ و خیرات کرنا کوئی امر ثواب نہیں، حاجت مند داروں کو محروم کر کے سائے مال کو صدقہ و خیرات یا وقف کر دینا تعلیم سنت کے خلاف ہے، پھر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ہزاروں صورتیں ہیں۔

طریق سنت یہ ہے کہ مصرف کی اہمیت اور ضرورت کی شدت کا لحاظ کر کے مصرف کا انتظام کیا جائے، عام طور پر خرچ کرنے والے اس کی رعایت نہیں کرتے۔

تیسری شرط کا حاصل یہ ہے کہ ثواب ہونے کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ اپنے خیال میں کسی کام کو نیک سمجھ کر نیک نیتی سے اس میں صرف کر دے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مصرف شریعت کی رُود سے جائز اور مستحسن بھی ہو، کوئی شخص ناجائز کھیل تماشوں کے لئے اپنی جائداد وقف کر دے تو وہ بجائے ثواب کے عذاب کا حق ہوگا، یہی حال تمام اُن کاموں کا ہو جو شریعت کی رُود سے مستحسن نہیں ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طِبَقَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا

اے ایمان والو خرچ کر دستھری چیزیں اپنی کمائی میں سے اور اس چیز میں سے کہ جو

لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ مِنْ رِزْقِكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا الْغَيْبَ مِنْهُ تَنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ

ہم نے پیدا کیا تمہارے واسطے زمین سے اور قصد ذکر و غنہ کی چیز کا اس میں سے کہ اس کو خرچ کر دو، حالانکہ تم

يَا خِزْيَةُ إِلَّا أَنْ تُغِيضُوا فِيهِ وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿٢٨﴾

اس کو کہیں نہ لو گے مگر یہ کہ چشم پوشی کرجاؤ اور جان رکھو کہ اللہ بے پروا ہے اور غنیوں والا ،

الْكَافِرُ يُعَذِّبُكُمْ بِالْفَقْرِ وَيَا مَرْكُومًا بِالْفَحْشَاءِ وَاللَّهُ يَعْلَمُكُمْ

شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگدستی کا اور حکم کرتا ہے بھائی کا اور اللہ وعدہ دیتا ہے تم کو

مَغْفِرَةً مِنْهُ وَفَضْلًا وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٩﴾ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ

اپنی بخشش اور فضل کا اور اللہ بہت کثافت والا ہے سب کچھ جانتا ہے، عنایت کرتا ہے کچھ جس کو

يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ

چاہے اور جس کو سمجھ مل ہے اس کو بڑی عزت مل اور نصیحت دی قبول کرتے ہیں

إِلَّا أُولَ الْأَكْبَابِ ﴿٣٠﴾ وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ

جو عقل والے ہیں ، اور جو خرچ کر دے تم خیرات یا قبول کر دے کوئی مٹت تو

تَذَرُّهَا إِنْ تَبَدَّلَ اللَّهُ يَعْلَمُهَا وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنَ الْأَنْصَارِ ﴿٣١﴾ إِنْ تَبَدَّلَ

بیشک اللہ کو سب معلوم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ، اگر ظاہر کر کے دو

الْقَدَّاسِ فَنِعْمَ هِيَ وَإِنْ تُخَفُّوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفَقْرَاءَ فَهِيَ

خیرات تو کیا اچھی بات ہے ، اور اگر اس کو چھپاؤ اور فقیروں کو پہنچاؤ تو وہ

خَيْرٌ لَّكُمْ وَيَكْفُرْ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ

بہتر ہے تمہارے حق میں اور دور کر دے گا کچھ گناہ تمہارے اور اللہ تمہارے کاموں سے

خَيْرٌ ﴿٣٢﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هَذَا مِنْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ

خوب خبر داتا ہے تیرا نہ نہیں اُن کو راہ پر لانا اور لیکن اللہ راہ پر لادے جس کو چاہے ،

وَمَا تُسْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا نَفْسِكُمْ وَمَا تُسْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ

اور جو کچھ خرچ کر دے تم مال سوا پہنچاؤ واسطے جب تک کہ خرچ کر دے اللہ ہی کی رضا جوئی

اللَّهُ وَمَا تُسْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ لِيُؤْتِيَا لَكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَظْلَمُونَ ﴿٣٣﴾

میں اور جو خرچ کر دے خیرات سوہری لے گی تم کو اور تمہارا حق نہ رہے گا ،

لِنَفْقَةٍ أَمْ الْذِينَ أَحْصُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا

خیرات کی فقیروں کیلئے ہے جوڑ کے ہوتے ہیں اللہ کی راہ میں چل پھر نہیں سکتے

فِي الْأَرْضِ يُحَسِّبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ

تک میں سمجھیں ان کو نادانقت مالدار اُن کے سوال نہ کرنے سے تو پہچانتا ہے ان کی

بِسْمِهِمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا وَمَا تُسْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ

اُن کے چہرے سے ، نہیں سوال کرتے لوگوں سے پٹ کر ، اور جو کچھ خرچ کر دے گا ان کی چیز وہ

اللَّهُ بِهِ عَلِيمٌ ﴿٣٤﴾ الَّذِينَ يُسْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِالْئِيلِ وَالنَّهَارِ

بیشک اللہ کو معلوم ہے ، جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں رات کو اور دن کو

سِرًّا أَوْ عَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا تَخَوْفُ عَلَيْهِمْ

چھپا کر اور ظاہر میں تو اُن کے لئے ثواب ہر ان کا اپنے رب کے پاس اور نہ ڈرہی اُن پر

وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٣٥﴾

اور نہ وہ غمیں ہوں گے ۔

مُحَلِّصَةٌ تَفْسِير

اے ایمان والو ذریعہ کام میں خرچ کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور (عمدہ چیز کو)

اس میں سے جو کہ ہم نے تمہارے کام میں لانے کے لئے زمین سے پیدا کیا اور ردی (ناکارہ) چیز

کی طرف ہمت مت لے جا یا کر دے اس میں سے خرچ کر دو حالانکہ (دوسری ہی چیز اگر کوئی تم کو تمہارا)

حق واجب کے عوض یا سوغات میں دینے لگے تو تم کہیں اس کے لینے والے نہیں ، ہاں مگر چشم پوشی

(اور رعایت) کرجاؤ (تو اور بات ہے) اور یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں (جو ایسی

ناکارہ چیزوں سے خوش ہوں) تعریف کے لائق ہیں (یعنی ذات و صفات میں کامل ہیں تو ان کے

دربار میں چیز بھی کامل تعریف کے لائق ہی پیش کرنا چاہئے) شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے ،

کہ اگر خرچ کر دے یا اچھا مال خرچ کر دے تو محتاج ہو جاؤ گے) اور تم کو بڑی بات (یعنی بخل)

کا مشورہ دیتا ہے ، اور اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ کرتا ہے (خرچ کرنے پر اور اچھی چیز خرچ کرنے پر)

اپنی طرف سے گناہ معاف کر دینے کا اور زیادہ دینے کا (یعنی چونکہ ایک جگہ خرچ کرنا طاعت ہے

اور طاعت سے معصیت کا کفارہ ہو جاتا ہے، لہذا اس سے گناہ بھی معاف ہوتے ہیں اور حق تعالیٰ کسی کو دنیا میں بھی اور آخرت میں تو سب کو خرچ کا عوض بھی زیادہ کر کے دیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ وسعت دالے ہیں وہ سب کچھ دے سکتے ہیں، غریب جاننے والے ہیں ریت کے موافق غمزدہ دیتے ہیں اور یہ سب مصلحتیں بہت ظاہر ہیں، لیکن ان کو وہی سمجھتا ہے جس کو دین کا فہم ہو اور اللہ تعالیٰ ان کا فہم جسکو چاہتے ہیں دیدیتے ہیں اور ریح تو یہ ہے کہ جس کو دین کا فہم مل جاوے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی کہ جو نہ دنیا کی کوئی نعمت اس کے برابر نافع نہیں، اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں (یعنی جو عقل صحیح رکھتے ہیں) اور تم لوگ جو کسی قسم کا خرچ کرتے ہو یا کسی طرح کی نذر مانگتے ہو سو حق تعالیٰ کو سب کی بقیہ اطلاع ہے اور بے جا کام کرنے والوں کا رقیامت میں کوئی ہمارا ہی (حمایتی) نہ ہو گا، اگر تم ظاہر کر کے دو صدقات کو تم بھی ابھی بات ہے اور اگر ان کا اخفاء کرو اور اخفاء کے ساتھ، فقیروں کو دید و سب اخفاء تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے تمہارے کچھ گناہ بھی دور کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں کی خوب خبر رکھتے ہیں، اگرچہ کہ بہت سے صحابہ کفار کو بائیں مصلحت خیرات نہ دیتے تھے کہ شاید اسی تدبیر سے کچھ لوگ مسلمان ہو جاویں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی رائے دی تھی اس لئے اس آیت میں دونوں طرح کے خطاب کر کے ارشاد فرماتے ہیں کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان (کا فرد) کو ہدایت پر لے آنا کچھ آپ کے ذمہ (فرض واجب) نہیں (جس کے لئے اتنی دوا درازا ہتمام کئے جاویں) لیکن (یہ تو) خدا تعالیٰ کا کام ہے (جس کو چاہیں ہدایت پر لے آریں)۔ آپ کا کام صرف ہدایت کا پہنچا دینا ہے خواہ کوئی ہدایت پر آوے یا نہ آوے اور ہدایت کا پہنچا دینا کچھ اس ممانعت پر موقوف نہیں) اور (اے مسلمانو!) جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اپنے فائدہ کی غرض سے کرتے ہو اور اس فائدہ کا بیان یہ ہے کہ تم اور کسی غرض سے خرچ نہیں کرتے بجز رضا جوئی ذات پاک حق تعالیٰ کے (کہ ثواب اس کے لازم سے ہے اور یہ ہر حاجت مند کی رفع حاجت کرنے سے حاصل ہوتی ہے، پھر مسلمان فقیر کی تخصیص کیوں کی جائے) اور (نیز) جو کچھ مال خرچ کر رہے ہو یہ سب (یعنی اس کا عوض اور ثواب) پورا پورا تم (ہی) کو دے آخرت میں مل جائیگا اور تمہارے لئے اس میں ذرا کمی نہ کی جاوے گی (سو تم کو اپنے عوض سے مطلب رکھنا چاہئے) اور عوض ہر حال میں ملے گا پھر تم کو اس سے کیا بحث کہ ہمارا صدقہ مسلمان ہی کو ملے کافر کو نہ ملے، و ملا اصل حق ان حاجت مندوں کا ہے جو مقید ہو گئے ہوں اللہ کی راہ (یعنی دین کی خدمت) میں، اور اسی خدمت دین میں مقید اور مشغول رہنے سے) وہ لوگ (طلب معاش کے لئے) کہیں ملک میں چلے پھرنے کا رعبہ (امکان نہیں رکھتے) اور (ناواقف ان کو بالدار خیال کرتا ہے) ان کے

سوال سے بچنے کے سبب سے (البتہ) تم ان لوگوں کو ان کے طرز و ریت سے پہچان سکتے ہو (کیونکہ فرقہ و فائدہ سے چہرے اور بدن میں ایک گونہ اضمحلال ضرور آجاتا ہے اور یوں) وہ لوگوں سے پست کر مانگتے نہیں پھرتے (جس سے کوئی ان کو حاجت مند سمجھے، یعنی مانگتے ہی نہیں، کیونکہ اکثر جو لوگ مانگنے کے عادی ہیں وہ پست کر ہی مانگتے ہیں) اور ان لوگوں کی خدمت کرنے کو جو مال خرچ کر دے بیشک حق تعالیٰ کو اس کی ثواب اطلاع ہے (اور لوگوں کو دینے سے ان کی خدمت کا فیض زیادہ ثواب دیں گے) جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو رات میں اور دن میں (یعنی بلا تخصیص اوقات) پوشیدہ اور آشکارا (یعنی بلا تخصیص حالات) سو ان لوگوں کو ان کا ثواب ملے گا (نیابت کے روز ان کے رب کے پاس (جا کر) اور نہ (اس روز) ان پر کوئی خطہ (واقع ہونے والا) ہے اور نہ وہ معلوم ہوں گے۔

معارف و مسائل

اس سے قبل کے رکوع میں اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا بیان تھا، اب اس سے متعلقہ امور کا مزید بیان اس رکوع کی سات آیات میں کیا گیا ہے، جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَتُنْفِقُوا رِيقًا غَيْرِ مَحْشُورٍ** ہ شان نزول سے طیب کے معنی عمدہ کے لئے گئے ہیں، کیونکہ بعض لوگ خراب چیزیں لے لےتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی تھی، اور بعض نے عموم لفظ سے طیب کی تفسیر حال سے کی ہے، کیونکہ پوری عمدہ جب ہی ہوتی ہے جب حلال بھی ہو، پس اس بنا پر آیت میں اس کی بھی تاکید ہوگی، اور پہلی تفسیر پر دوسرے دلائل سے اس تاکید کو ثابت کیا جاوے گا، اور یاد رکھو کہ یہ اس شخص کے لئے ہے جس کے پاس عمدہ چیز ہو اور پھر وہ بڑی بھی چیز خرچ کرے، جیسا کہ لفظ **مَا تَكْتُمُونَ** اور اخراجنا اس کے موجود ہونے پر اور **لَا تَكْتُمُونَ الْخَيْرَ مِنْكُمْ**، عمدہ کئی چیز کے خرچ کرنے پر دلالت کر رہا ہے، اور جس کے پاس اچھی چیز ہو یہی نہیں وہ اس مانعت سے بڑی ہے، اور اس کی وہ بڑی ہی مقبول ہی لفظ **مَا تَكْتُمُونَ** سے بعض علماء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ والد کا اپنے بیٹے کی کمائی سے کھانا جاتا رہے، بقولہ علیہ السلام۔

تمہاری اولاد تمہاری کمائی کا ایک پارٹر
حصہ ہے، پس تم اپنی اولاد کی کمائی سے مزے
سے کھاؤ۔

أُولَٰئِكَ مِنْ طَيْبِ الْمَكْتُمِ
تَكْتُمُوا مِنْ أَمْوَالِ أُولَٰئِكَ
هَيْثُا (مشرقی)

عشر ارضی کے احکام | **مِمَّا اخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ** میں لفظ **اخْرَجْنَا** سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ عسری زمین میں عشر واجب ہے، اس آیت کے

عموم سے امام ابو حنیفہؒ نے استدلال کیا ہے کہ عشری زمین کی ہر قلیل و کثیر پیداوار پر عشر واجب ہوا سورۃ انعام کی آیت اَنْتُمْ اَوْلَا حَقِّهِ يَوْمَ حَصَادِهِم (۶:۱۱۷) وجوب عشر میں بالکل صریح اور واضح ہے عشر و خراج شریعت اسلامی کے دو اصطلاحی لفظ ہیں، ان دونوں میں ایک بات مشترک ہے کہ اسلامی حکومت کی طرف سے زمینوں پر عائد کردہ ٹیکس کی ایک حیثیت ان دونوں میں ہے فرق یہ ہے کہ عشر فقط ٹیکس نہیں بلکہ اس میں ٹیکس سے زیادہ اصلی حیثیت عبادت مالی کی ہے، مثل زکوٰۃ کے، اسی لئے اس کو زکوٰۃ الارض بھی کہا جاتا ہے، اور خراج غائص ٹیکس ہے، جس میں عبادت کی کوئی حیثیت نہیں، مسلمان چونکہ عبادت کے اہل اور پابند ہیں، ان سے جو زمین کی پیداوار کا حصہ لیا جاتا ہے اس کو عشر کہتے ہیں، اور غیر مسلم چونکہ عبادت کے اہل نہیں، ان کی زمینوں پر جو کچھ عائد کیا جاتا ہے اس کا نام خراج ہے، عملی طور پر زکوٰۃ اور عشر میں یہ بھی فرق ہے کہ سونا چاندی اور تجارت کے مال پر زکوٰۃ سال بھر گزرنے کے بعد عائد ہوتی ہے، اور عشر زمین سے پیداوار حاصل ہوتے ہی واجب ہوجاتا ہے۔

دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ اگر زمین سے کوئی پیداوار نہ ہو تو عشر ساقط ہو جاتا ہے، لیکن اموال تجارت اور سونے چاندی پر اگر کوئی نفع بھی نہ ہو تب بھی سال پورا ہونے پر ان پر زکوٰۃ فرض ہوگی، عشر و خراج کے مسائل کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، کتب فقہ میں مذکور ہے، اور احق نے اپنی کتاب نظام الاراضی میں بھی تفصیل سے لکھ دیا ہے، جس میں پاکستان و ہندوستان کی زمینوں کے خصوصی احکام بھی لکھے گئے ہیں۔

اَنْتُمْ اَوْلَا حَقِّهِ يَوْمَ حَصَادِهِم (۶:۱۱۷) وَمَا يَدْرُ اِلَّا اَنْتُمْ اَوْلَا حَقِّهِ (۶:۱۱۸) جب کس کے دل میں یہ خیال آئے کہ اگر خیرات کروں گا تو مفلس ہو جاؤں گا، اور حق تعالیٰ کی تاکید سن کر بھی اسکی ہمت نہ ہو، اور دل چاہے کہ اپنا مال خرچ نہ کرے، اور وعدہ الہی سے اعراض کر کے وعدہ شیطانی پر طبیعت کو میلان اور اعتماد ہو تو اس کو یقین کر لینا چاہئے کہ یہ معنوں شیطان کی طرف سے ہے، یہ منہ کے کہ شیطان کی توہم نے کبھی صورت بھی نہیں دیکھی، حکم کرنا تو دور کنار رہا، اور اگر یہ خیال آوے کہ صدقہ و خیرات سے گناہ بخنہ جائیں گے، اور مال میں بھی ترقی اور برکت ہوگی تو جان لے کہ یہ معنوں اللہ کی طرف سے آیا ہے، اور خدا کا شکر کرے اور اللہ کے خزانے میں کمی نہیں، اس کے ظاہر و باطن نیت و عمل کو خوب جانتا ہے۔

حکمت کے معنی اور تفسیر
یٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَلْبَحْكْمَةُ مِّنْ رَّبِّكَ اَنْتُمْ اَوْلَا حَقِّهِ (۶:۱۱۷) لفظ حکمت قرآن کریم میں بار بار آیا ہے، اور ہر جگہ اس کی تفسیر میں مختلف معنی بیان کئے گئے ہیں، تفسیر بحر محیط میں اس جگہ تمام اقوال مغیرین کو جمع کیا ہے، وہ تقریباً تین ہیں، مگر آخر میں فرمایا

کہ درحقیقت یہ سب اقوال متقارب ہیں، ان میں کوئی اختلاف نہیں، صرف تعبیرات کا فرق ہے، کیونکہ لفظ حکمت، احکام یا کسر کا مصدر ہے، جس کے معنی ہیں کسی عمل یا قول کو اس کے تمام اوصاف کے ساتھ مکمل کرنا۔

اسی لئے بحر محیط میں آیت بقرہ اِنَّهُ اللّٰهُ الْمَلِكُ وَالْحَكْمَةُ (۲:۲۵۵) جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ہے، اس کی تفسیر میں فرمایا:

وَالْحَكْمَةُ وَضْعُ الْاَمْرِ فِي

”حکمت کے اصل معنی ہر شے کو اس کے محل میں رکھنے

مَجْلِعِهَا عَلَى الصَّوَابِ وَكَمَالُ

کے ہیں اور امر کا کمال صرف نبوت ہو سکتا ہے

وَالْحَكْمَةُ بِهَا يَحْصُلُ الْمُنْتَهٰى

اس لئے یہاں حکمت کی تفسیر نبوت کی گئی ہے

امام راغب اصفہانیؒ نے مفردات القرآن میں فرمایا کہ لفظ حکمت جب حق تعالیٰ کے لئے استعمال کیا جائے تو معنی تمام امشیاء کی پوری معرفت اور مستحکم ایجاد کے ہوتے ہیں، اور جب غیر اللہ کی طرف اس کی نسبت کی جاتی ہے تو موجودات کی صحیح معرفت اور اس کے مطابق عمل مراد ہوتا ہے۔

اسی مہنوم کی تفسیر میں مختلف الفاظ میں کی گئی ہیں، کہی جگہ اس سے مراد قرآن ہے، کسی جگہ حدیث، کسی جگہ علم صحیح، کہیں عمل صالح، کہیں قول صادق، کہیں عقل سلیم، کہیں فقه فی الدین کہیں اصابت رائے اور کہیں خشیت اللہ، اور آخری معنی تو خود حدیث میں بھی مذکور ہیں، اِذَا مَسَّ الْحِكْمَةَ خَشِيَ اللّٰهُ یعنی اصل حکمت خدا تعالیٰ سے ڈرنا ہے، اور آیت يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَلْبَحْكْمَةُ (۲:۲۵۵) میں حکمت کی تفسیر صحابہؓ و تابعینؓ سے حدیث و سنت منقول ہے، اور بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ آیت ذیل لَفْظُ يُّوْثِيَ الْحِكْمَةَ میں یہ سب چیزیں مراد ہیں۔ (بحر محیط، ص ۳۲۰، ج ۲)

اور ظاہر یہی قول ہے، اور ارشاد قرآنی وَمَنْ يُّؤْتِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ سَعِيْرًا كَثِيْرًا سے بھی اس کی طرف اشارہ نکلتا ہے، کہ معنی اس کے یہ ہیں کہ جس شخص کو حکمت دیدی گئی اس کو خیر کثیر دیدی گئی، واللہ اعلم۔

وَمَا يَدْرُ اِلَّا اَنْتُمْ اَوْلَا حَقِّهِ (۶:۱۱۸) وَمَا لِلظَّالِمِيْنَ مِنْ اَنْصَابٍ (۶:۱۱۹) کسی قسم کے خسر خرچ کرنے میں سب خرچ آگئے، وہ بھی جس میں سب شرائط مذکورہ کی رعایت ہو، اور وہ بھی جس میں نکل کی یا بعض کی رعایت نہ ہو، مثلاً فی سبیل اللہ نہ ہو، بلکہ معصیت میں ہو یا انفاق میں رہا، شامل ہو یا انفاق کر کے اس پر احسان جتلا نا ہو، یا حلال یا حرام مال نہ ہو، اسی طرح نذر کے عموم میں سب نذریں آگئیں، مثلاً عبادت مالیہ کی نذر، اور اسی مناسبت سے انفاق کے ساتھ نذر کو لائے ہیں یا عبادت دینیہ کی نذر ہو، پھر وہ مطلق ہو یا کسی امر پر معلق ہو، پھر یہ کہ اس کا ایفاء کیا گیا ہو یا نہ

کیا گیا ہو، اور مقصود اس کہنے سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان سب چیزوں کا علم ہے وہ اس کی جزاء دیں گے، یہ اس لئے سنایا تاکہ حدود و شرائط کی رعایت کی ترغیب اور عدم رعایت سے ترہیب ہو، اور بے جا کام کرنے والوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو ضروری شرائط کی رعایت نہیں کرتے، ان کو صریحاً وعید سنادی۔

إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ رَاقِيَةٌ ۚ وَاللَّهُ يَتَعَلَّمُ سَعِيرًا ۚ بظاہر آیت فرض اور نفل سب صدقات کو شامل ہے، اور سبب اخفاء ہی افضل ہے، اس میں دینی مصلحت بھی ہے، کہ ریا سے اجد ہے، لینے والا بھی نہیں شرماتا، اور دنیوی مصلحت بھی ہے کہ اپنے مال کی مقدار عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتی، اور مراد ان فضیلت اخفاء سے آیت میں انفضلیت فی نفسہ ہے، پس اگر کسی مقام پر کسی مارض سے شلوار بچہ بہت یا امید اقتدار وغیرہ سے اہلکار کو ترجیح ہو جائے تو انفضلیت فی نفسہ کے منافی نہیں، چنانچہ عَمَلُكُمْ فِي مَتَابَعَةِ كَفَارَةٍ مَسِيئَاتِ اَلْجَاهِلِيَّةِ کے ساتھ تو خاص نہیں، صرف اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے اخفاء کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے کہ اخفاء میں نیچے اگر کوئی ظاہری فائدہ نظر نہ آئے تو منقبض نہیں ہونا چاہئے، اس کو کہتے ہیں گناہ اللہ معاف کرتا ہے، اور یہ تمھارے لئے فائدہ عظیم ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ مَنَاسِكٌ ۚ رَاقِيَةٌ ۚ وَاللَّهُ يَتَعَلَّمُ سَعِيرًا ۚ اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ نیت بھی تمھاری اصل میں اپنے ہی نفع حاصل کرنے کی ہے، اور واقع میں بھی حاصل خاص تم ہی کو ہوگا، پھر ان زوائد پر کیوں نظر کی جاتی ہے، کہ یہ نفع خاص اسی طریق سے حاصل کیا جاوے کہ مسلمان ہی کو صدقہ دیں، اور کافر کو نہ دیں۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ اس صدقہ سے مراد صدقہ نفلی ہے جس کا ذمی کافر کو بھی دینا جائز ہے، زکوٰۃ مراد نہیں ہے، کیونکہ وہ سوائے مسلمان کے کسی دوسرے کو دینا حرام ہے۔ (منظری)

مسئلہ: حربی کا فر کو کسی قسم کا صدقہ وغیرہ دینا جائز نہیں۔
مسئلہ: کافر ذمی یعنی غیر حربی کو صرف زکوٰۃ و عشر دینا جائز نہیں، اور دوسرے صدقات واجبہ و نفل سب جائز ہیں، اور آیت میں زکوٰۃ داخل نہیں۔

يَلْفُظُونَ مِنَ الْغَنِيِّ ۚ وَاللَّهُ يَتَعَلَّمُ سَعِيرًا ۚ (القول)، فَإِنَّ اللَّهَ يَلْفُظُهُمْ بِمَا يَلْفُظُونَ ۚ مراد وہ تمام لوگ ہیں جو دینی مشغولیت کی وجہ سے دوسرا کوئی کام نہیں کر سکتے۔
يَخْتَصِمُونَ مِنَ الْغَنِيِّ ۚ (التعقيب)، اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی فقیر تبتی کپڑے پہنے ہوئے ہو تو اس کی وجہ سے اس کو غنی نہیں کہا جائے گا، بلکہ اس کو فقیر ہی کہا جائے گا۔

اور اپنے آدمی کو زکوٰۃ دینا بھی صحیح ہوگا (قرطبی)
تَعْنِي فَنِعْمًا ۚ بِسَمْعِهِمْ ۚ سے معلوم ہوا کہ علامات کو دیکھ کر حکم لگانا صحیح ہے، چنانچہ اگر کوئی مردہ اس قسم کا پایا جائے کہ اس پر زنا ہے اور اس کا عقد بھی نہیں کیا ہوا ہو تو اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا (قرطبی)

لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا ۚ اس آیت سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ پست کر نہیں دیتے لیکن بغیر پست کر مانگنے کی نفی نہیں ہے، چنانچہ بعض حضرات کا یہی قول ہے، لیکن جمہور کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سوال بالکل ہی نہیں کرتے، لِأَنَّهُمْ مَتَّعُوْنَ عَنْ الْمَسْأَلَةِ عَقَّةً تَامَةً (قرطبی)

آٹھویں آیت الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ آمَرَ الدِّينِ بِالْأَيْدِي وَالْأَرْجُلِ ۚ وَاللَّهُ يَتَعَلَّمُ سَعِيرًا ۚ عظیم اور فضیلت کا بیان ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے عادی ہیں، تمام حالات و اوقات میں رات میں اور دن میں، خفیہ اور علانیہ ہر طرح فی سبیل اللہ خرچ کرتے رہتے ہیں، اس کے ضمن میں یہ بھی بتلایا کہ صدقہ و خیرات کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں، نہ رات اور دن کی کوئی تعین ہے، اس طرح خفیہ اور علانیہ دونوں طرح سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ثواب ہے، بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ خرچ کیا جائے، نام و نمود مقصود نہ ہو، خفیہ خرچ کرنے کی فضیلت بھی اسی حد تک ہو کہ علانیہ خرچ کرنے کے لئے کوئی ضرورت داعی نہ ہو، اور جہاں ایسی ضرورت ہو وہاں علانیہ خرچ کرنا ہی افضل ہے۔

روح المعانی میں بحوالہ ابن عساکر نقل کیا ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے چالیس ہزار دینار اللہ کی راہ میں اسی طرح خرچ کئے کہ دس ہزار دن میں، دس ہزار رات میں، دس ہزار خفیہ اور دس ہزار علانیہ، بعض مفسرین نے اس آیت کا شان نزول اسی واقعہ صدیق اکبرؓ کو لکھا ہے، اسکے شان نزول کے متعلق اور بھی مختلف اقوال ہیں۔

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقْوَمُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَخْطُ

جو لوگ کھاتے ہیں سود نہیں اٹھیں گے قیامت کو مگر جس طرح اٹھتا ہے وہ شخص کہ جس کے حواس

السَّيْطَانِ مِنَ الْمَسِّ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا ۚ

کھڑکڑ ہوں جن نے پست کر یہ حالت ان کی اس واسطے ہو کہ انھوں نے کہا کہ بیع اگر ہی تو ایسی چیز ہے جو دینا

وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا ۚ فَمَنْ جَاءَكَ مَوْعِظَةٌ مِنْ

حالاکہ اللہ نے حلال کیا بیع و سود اگر ہی تو اور حرام کیا بیع و سود کو، پھر موعظہ نبی نصیحت اپنے رب کی

رَبِّهِ قَاتِلْهُ فَاَلَمْ تَكُنْ لَكَ آيَاتٌ ۚ وَمَنْ عَادَ

طرت سے اور وہ باز آگیا تو اس کو واسطے ہر چہ پہلے ہر چکا اور معاملہ اس کا اللہ کے حوالے ہو اور جو کوئی

فَاُولَٰئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ يَمْحَقُ اللَّهُ

پھر بزرگ سرد تو وہی لوگ ہیں دوزخ والے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ، شان ہے اللہ

الرَّيْبُ اَوِ يَرْبِي الصَّدَقَاتِ ۚ وَاللَّهُ لَا يُغْنِي عَنْكَ كَثْرَتُ

سود اور بڑھاتا ہر تجارت کو اور اللہ خوش نہیں کسی نامشکر گنہگار سے ،

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ

جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک کئے اور قائم رکھا نماز کو اور

اٰتَوْا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَاَلَا

دیتے رہے زکوٰۃ ان کیلئے ہے ثواب ان کا ان کے رب کے پاس اور نہ ان کو خوف ہے اور

لَهُمْ يَخْشَوْنَ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوْا مَا

وہ غمگین ہوں گے ، اے ایمان والو! اللہ سے اور چھوڑ دو جو کچھ

بَقِيَ مِنَ الرِّبَا اِنَّ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ اِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاَدْنُوْا

باقی رہ گیا ہے سود اگر تم کو یقین ہے اللہ کے فرمانے کا ، پس اگر نہیں چھوڑتے تو تیار ہو جاؤ

يَخْرِبُ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ اِنْ تَبْتَغُوا فَلََكُمْ رُءُوسُ اَمْوَالِكُمْ

لہنے کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اگر توبہ کرتے ہو تو تمہارا واسطے ہر اصل مال تمہارا

لَا تُظْلَمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝ اِنْ كَانَ دُوْعُسِيْ ۙ فَتَنْظِرُ ۙ اِلٰى

نہم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر کوئی ، اور اگر ہے تنگدست تو بہت دینی چاہئے کشاکش

مَيْسَرَةٍ ۙ اَوْ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاتَّقُوا

ہونے تک اور بخش دو تو بہت بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم کو سمجھ ہے ، اور ڈرتے رہو

يَوْمَ تَأْتِيْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللَّهِ ۙ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ

اس دن سے جہنم لوٹائے جائیں گے اللہ کی طرف پھر پورا دیا جائے گا ہر شخص کو جو کچھ اس نے کایا اور

لَا يُظْلَمُونَ ۝

اُن پر ظلم نہ ہوگا

خلاصہ تفسیر

جو لوگ سود کھاتے ہیں (یعنی لیتے ہیں) انہیں کھڑے ہوں گے (قیامت میں قبروں سے) مگر

جس طرح کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص جس کو شیطان نے جھلی بنا دیا ہو پلٹ کر (یعنی حیران و ہوش)

پس از اس لئے ہوگی کہ ان (سود خوار) لوگوں نے (سود کے حلال ہونے پر استدلال کرنے کے

لئے) کہا تھا کہ بیچ بھی تو مثل سود کے ہے ، کیونکہ اس میں بھی مقصود نفع حاصل کرنا ہوتا ہے ،

اور بیع بقیہ حلال ہے ، پھر سود بھی جو کہ اس کا مثل ہے حلال ہونا چاہئے (حالانکہ دونوں

میں کھلا فرق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (جو کہ مالک ہیں احکام کے) بیچ کو حلال فرمایا ہے اور سود

کو حرام کر دیا ہے (اس سے زیادہ اور کیا فرق ہوگا) پھر جس شخص کو اس کے پروردگار کی طرف

(اس بارہ میں) نصیحت پہنچی اور وہ (اس سود کے فعل اور اس کفر کے قول سے) یعنی حلال کہنے

سے باز آگیا (یعنی حرام سمجھنے لگا اور لینا بھی چھوڑ دیا) تو جو کچھ (اس حکم کے آنے سے) پہلے

(لینا) ہو چکا ہے وہ اس کا بار (یعنی ظاہر شرع کے نزدیک اس کی یہ توبہ قبول ہوگئی) اور لیا ہوا

مال اس کی ملک ہے (اور باطنی) معاملہ اس کا (کہ وہ دل سے باز آیا ہے یا منافقانہ توبہ کر لی ہے)

(یہ خدا کے حوالے رہا) ، اگر دل سے توبہ کی ہوگی عند اللہ نافع ہوگی ورنہ کا عدم ہوگی ، تم کو

بدگمانی کا کوئی حق نہیں) اور جو شخص (نصیحت مذکور سن کر بھی) اسی قول اور اس فعل کی

طرت) پھر خود کرے تو روبرو اس کے کہ ان کا یہ فعل خود گناہ کبیرہ ہے) یہ لوگ دوزخ میں

جائیں گے (اور روبرو اس کے کہ ان کا یہ قول کفر ہے اس لئے) وہ اس (دوزخ) میں ہمیشہ

رہیں گے (اور گو سود لینے سے فی الحال مال بڑھتا نظر آتا ہے ، لیکن مال کا کار) اللہ تعالیٰ سود

کو مٹاتے ہیں (کبھی تو دنیا ہی میں سب برباد ہو جاتا ہے ورنہ آخرت میں تو یقینی برباد ہو)

کیونکہ وہاں اس پر عذاب ہوگا) اور (برخلاف اس کے صدقہ دینے میں گو فی الحال مال گھٹتا

معلوم ہوتا ہے ، لیکن مال کا اللہ تعالیٰ) صدقات کو بڑھاتے ہیں ، (کبھی تو دنیا میں بھی

ورنہ آخرت میں تو یقیناً بڑھتا ہے ، کیونکہ وہاں اس پر بہت سا ثواب ملے گا ، جیسا اوپر

آیات میں مذکور ہوا) اور اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا (بلکہ مبغوض رکھتے ہیں) کسی کفر کرنے

والے کو (جو کہ قول مذکور کے مثل کلمات کفر منہ سے بکے) اور اسی طرح پسند نہیں کرتے

کسی گناہ کے کام کرنے والے کو (جو کہ فعل مذکور یعنی سود کے مثل کلمات کفر منہ سے بکے) اور اسی طرح پسند نہیں کرتے

کسی گناہ کے کام کرنے والے کو (جو کہ فعل مذکور یعنی سود کے مثل کلمات کفر منہ سے بکے) اور اسی طرح پسند نہیں کرتے

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے اور (بالخصوص) نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ دی، ان کے لئے ان کا ثواب ہوگا ان کے پروردگار کے نزدیک اور (آخرت میں) ان پر کوئی خطرہ واقع ہونے والا نہیں ہوگا اور نہ وہ (کسی مقصود کے قوت ہونے سے) مغلوب ہوں گے،

لئے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو (کیونکہ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ کی اطاعت کی جائے) پھر اگر تم (اس پر عمل) نہ کرو گے تو اسٹہمارسین جو جنگ کا اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے (یعنی تمہارے خلاف جہاد ہوگا) اور اگر تم توبہ کر لو گے تو تم کو تمہارے اصل اموال مل جاویں گے (اس قانون کے بعد) نہ تم کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے نہ کہ تم اصل مال سے زیادہ لینے لگو اور نہ تم پر کوئی ظلم کرنے پاوے گا (کہ تمہارا اصل مال بھی نہ دلا جاوے) اور اگر (قرضدار) تنگ دست ہو اور اس لئے میعاد پر نہ دے سکے (تو اس کو) ہمت دینے کا حکم ہے (سود کی تک) یعنی جب اس کے پاس ادا کی گنجائش ہو (اور یہ بات) کہ بالکل معاف ہی کر دو اور زیادہ بہتر ہے تمہارے لئے، اگر تم کو (اس کے ثواب کی) خبر ہو۔

اور (مسلمانو!) اس دن سے ڈرو جس میں تم (سب) اللہ تعالیٰ کی پیشی میں لائے جاؤ گے پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا (یعنی اس کا بدلہ) پورا پورا ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا، (تو تم پیشی کے لئے اپنی کارگزاری درست رکھو، اور کسی قسم کی خلاف ورزی مت کرو) ۴

معارف و مسائل

ان آیات میں ربہ یعنی سود کی حرمت اور اس کے احکام کا بیان شروع ہوا ہے، یہ مسئلہ کئی حیثیتوں سے بہت اہم ہے، ایک طرف سود و ربا پر شرع و سنت کی شدید وعیدیں اور دوسری طرف دنیا کی اقتصادیات میں اس کا جو لازم بن جانا اور اس سے نجات کی مشکلات کا مسئلہ طویل الذیل ہے، اور کئی حیثیتوں سے اس پر غور کرنا ہے۔

اول اس بارے میں شرع کی آیات کی صحیح تفسیر اور احادیث صحیحہ کے ارشادات میں غور کر کے یہ متعین کرنا کہ شرع و سنت کی اصطلاح میں ربا کیا چیز ہے، اور کن کن معاملات کو شامل ہے، اور اس کی حرمت کس بھمت و مصلحت پر مبنی ہے، اس میں کس قسم کی مضرتیں ہیں۔ دوسری حیثیت اس کی عقلی اور معاشی ہے کہ کیا فی الواقع سود و ربا ایسی چیز ہے جو دنیا کی اقتصادی ترقی کی ضامن ہو سکے، اور جس کو نظر انداز کرنے کا لازمی نتیجہ تجارت اور عوام اقتصادیات کی تباہی ہو، یا سارا بکھریں صرف خدا تعالیٰ اور آخرت سے غافل رہاؤں کی پیداوار ہو، ورنہ نیز اس کے بھی تمام معاشی مسائل حل ہو سکتے ہیں، اور نہ صرف مشکلات کا حل بلکہ دنیا میں اقتصاد امن و اطمینان سود کے چھوڑنے پر موقوف ہے، اور یہ کہ دنیا کے اقتصادی مصائب کا سبب بڑا سبب سود و ربا ہے۔

یہ دوسری بحث ایک معاشی اور اقتصادی مسئلہ ہے، جس کے تحت میں بہت سی اصولی اور فروعی طویل بحثیں ہیں، جن کا تعلق تفسیر شرع سے نہیں، اس لئے اس جگہ پہلی ہی بحث پر اکتفا کیا جاتا ہے، وہ بھی خاصی طویل ہے۔

یہ تہ آیاتیں ہیں جن میں سود کی حرمت اور احکام کا بیان ہے، ان میں سے پہلی آیت کے پہلے جملہ میں سود خوردوں کے انجام بد اور محشر میں ان کی رسوائی اور گراہی کا ذکر ہے، ارشاد ہو کہ جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں کھڑے ہوتے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ آدمی جس کو کسی شیطان جن نے لپٹ کر خبطی بنا دیا ہو، حدیث میں ہے کہ کھڑے ہونے سے مراد محشر میں قبر سے اٹھنا ہے کہ سود خورد جب قبر سے اٹھے گا تو اس پاگل و مجنون کی طرح اٹھے گا جس کو کسی شیطان جن نے خبطی بنا دیا ہو۔

اس جملہ سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی کہ جنات و شیاطین کے اثر سے انسان بیہوش یا مجنون ہو سکتا ہے، اور اہل تجربہ کے متواتر مشاہدات اس پر شاہد ہیں، اور حافظ ابن قیم جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اطباء اور فلاسفہ نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے، کہ صرع، بیہوشی یا جنون مختلف اسباب سے ہو سکتا ہے، ان میں بعض اوقات جنات و شیاطین کا اثر بھی اس کا

سبب ہوتا ہے، جن لوگوں نے اس کا انکار کیا ہے ان کے پاس بجز ظاہری استبعاد کے کوئی دلیل نہیں۔

دوسری بات یہ غور طلب ہو کہ شرآن نے یہ نہیں فرمایا کہ سود خور محشر میں پھل یا بھجنوں ہو کر اٹھیں گے، بلکہ دیوانہ پن یا بے ہوشی کی ایک خاص صورت کا ذکر کیا ہے، کہ جیسے کسی کو شیطان نے پست کر خطی بنا دیا ہو، اس میں شاید یہ اشارہ ہے کہ بیہوش و بھجنوں تو بعض اوقات چُپ چاپ پڑا بھی رہتا ہے، اُن کا یہ حال نہ ہوگا، بلکہ شیطان کے خطی بنائے ہوؤں کی طرح بھواس اور ہڈیاں اور دوسری مجنونانہ حرکتوں کی وجہ سے پہچانے جائیں گے۔

اور شاید اس طرف بھی اشارہ ہو کہ بیماری سے بیہوش یا بھجنوں ہو جانے کے بعد چونکہ احساس بالکل باطل ہو جاتا ہے، اس کو تکلیف یا عذاب کا بھی احساس نہیں رہتا، اُن کا یہ حال نہ ہوگا، بلکہ آسیب زدہ کی طرح تکلیف و عذاب کو پوری طرح محسوس کرے گا۔

اب یہاں یہ دیکھنا ہے کہ جرم و سزائیں کوئی مناسبت ہونی چاہئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سزا کسی شخص یا جماعت کے کسی جرم کے مقابلہ میں دی جاتی ہے، وہ یقیناً اس جرم کے مناسب ہوتی ہے، اس لئے سود خوروں کو خطی بنا کر محشر میں اٹھانا شاید اس کا اظہار ہو کہ سود خور روپے پیسہ کی حرص میں اس قدر مدہوش ہوتا ہے کہ اس کو نہ کسی غریب پر رحم آتا ہے نہ کسی کی شرم مانع ہوتی ہے، وہ چونکہ اپنی زندگی میں درحقیقت بیہوش تھا، اس لئے محشر میں بھی اسی حالت میں اٹھایا گیا، یا پسند اس لئے دی گئی کہ دنیا میں اس نے عقلی رنگ میں اپنی بے عقلی کو ظاہر کیا، کہ بیع کو مثل سود قرار دیا، اس لئے اس کو بے عقل کر کے اٹھا دیا گیا۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آیت میں سود کھانے کا ذکر ہے اور مراد مطلقاً سود لینا اور اس کا استعمال کرنا ہے، خواہ کھانے میں استعمال کرے یا لباس میں یا مکان اور اس کے فرنیچر میں، لیکن اس کو کھانے کے لفظ سے اس لئے تعبیر کیا کہ جو چیز کھائی جائے اس کی راہی کا کوئی امکان نہیں رہتا، بخلاف دوسری ضرورتوں کے استعمال کے کہ اس چیز کو واپس لیا دیا جاسکتا ہے، اس لئے محفل قبضہ اور تصرف کو کھا جانے کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہو اور نہ صرف عربی زبان میں بلکہ اردو، فارسی وغیرہ اکثر زبانوں کا یہی محاورہ ہے۔

اس کے بعد دوسرے جملہ میں سود خوروں کی اس سزا کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ ان لوگوں نے دوجرم کئے ایک تو بذریعہ سود کے حرام مال کھایا، دوسرے اس کو حلال سمجھا اور

حرام کہنے والوں کے جواب میں یہ کہا بیع و شراء بھی تو ربی کی مثل ہے، جس طرح ربی کے ذریعہ نفع حاصل کیا جاتا ہے اسی طرح بیع و شراء کے ذریعہ نفع مقصود ہے، اگر سود حرام ہے تو بیع بھی حرام ہونی چاہئے، حالانکہ اس کے حرام ہونے کا کوئی قائل نہیں، اس جگہ بظاہر مقتضائے مقام یہ تھا کہ لوگ یوں کہتے کہ ربی بھی تو مثل بیع کے ہے، جب بیع حلال ہو تو ربی بھی حلال ہونا چاہئے، مگر انھوں نے طرز بیان بدل کر حرام کہنے والوں پر ایک قسم کا اتہاز کیا، کہ تم ربی کو حرام کہتے ہو تو بیع کو بھی حرام کہو۔

تیسرے جملے میں ان لوگوں کے اس قول کا جواب حق تعالیٰ نے یہ دیا کہ یہ لوگ بیع کو ربی کی مثل اور برابر قرار دیتے ہیں، حالانکہ بحکم خداوندی ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو حلال قرار دیا اور دوسرے کو حرام، پھر دونوں برابر کیسے ہو سکتے ہیں۔

اس جواب میں یہ بات قابل غور ہے کہ ان لوگوں کا اعتراض تو عقلی طور پر تھا کہ جب دونوں معاملوں کا مقصد نفع کمانا ہے تو دونوں کا حکم ایک ہی ہونا چاہئے، اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے عقلی شبہ کا جواب عقلی طور پر فرق بیان کر کے نہیں دیا، بلکہ حاکمانہ انداز میں یہ جواب دیا کہ مالک الملک و الملکوت اللہ جل شانہ ہے وہ ہی ہر چیز کے نفع و ضرر اور بھلے برے کو پوری طرح جانتا ہے، جب اس نے ایک کو حلال اور دوسرے کو حرام قرار دیدیا، تو سمجھ لو کھج چیسز کو حرام کیا ہے اس میں ضرور کوئی نقصان و ضرر اور کوئی خباثت ہے، خواہ عام انسان اس کو محسوس کرے یا نہ کرے، کیونکہ مجموعہ نظام عالم کی پوری حقیقت اور اس کے نفع و ضرر کا احاطہ صرف وہی علیم و خیر کر سکتا ہے، جس کے علم سے کوئی ذرہ جہاں چھپا ہوا نہیں ہے، عالم کے افراد یا جماعتیں اپنے اپنے مصالح اور مضرتوں کو پہچان سکتے ہیں، پورے عالم کے نفع و ضرر کا احاطہ نہیں کر سکتے، بعض چیسز ایسی ہوتی ہیں کہ وہ کسی شخص یا جماعت کے حق میں مفید نظر آتی ہیں، مگر پوری قوم یا پورے ملک کے لئے اس میں مضرت ہوتی ہو اس کے بعد تیسرے جملہ میں یہ ارشاد ہے کہ سود حرام ہونے سے پہلے جس شخص نے کوئی رقم جمع کر لی تھی، لیکن جب سود کو حرام قرار دیدیا گیا، تو اگر آئندہ کے لئے اس نے توبہ کر لی، اور باز آگیا، تو اس سے پہلے جمع شدہ رقم ظاہر شرع کے حکم سے اُسی کی ہو گئی، اور باطنی معاملہ اس کا کہ وہ دل سے باز آیا، یا منافقانہ توبہ کر لی، اس کا یہ معاملہ خدا کے حوالہ ہے۔ اگر دل سے توبہ کی ہے تو عند اللہ نافع ہوگی ورنہ کالعدم ہوگی، عام لوگوں کو بدگمانی کرنے کا حق نہیں ہو، اور جو شخص نصیحت سن کر بھی اسی قول و فعل کی طرف پھر عود کرے تو

چونکہ یہ فعل سود خوری گناہ ہے، یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے، اور چونکہ اُن کا یہ قول کہ سود مثل بیع کے حلال ہے کفر ہے اس لئے وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

دوسری آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سود کو مٹانے میں اور صدقات کو بڑھانے میں، یہاں سود کے ساتھ صدقات کا ذکر ایک خاص مناسبت سے لایا گیا ہے، کہ سود اور صدقہ دونوں کی حقیقت میں بھی تضاد ہے، اور ان کے نتائج بھی متضاد ہیں، اور عموماً ان دونوں کاموں کے کر لے والوں کی غرض و نیت بھی متضاد ہوتی ہے۔

حقیقت کا تضاد تو یہ ہے کہ صدقہ میں تو بغیر کسی معاوضہ کے اپنا مال دوسروں کو دیا جاتا ہے، اور سود میں بغیر کسی معاوضہ کے دوسرے کا مال لیا جاتا ہے، ان دونوں کاموں کے کرنے والوں کی نیت اور غرض اس لئے متضاد ہے کہ صدقہ کرنے والا محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور ثوابِ آخرت کے لئے اپنے مال کو کم یا ختم کر دینے کا نیکو قصد کرتا ہے، اور سود لینے والا اپنے موجود مال پر ناجائز زیادتی کا خواہشمند ہے، اور نتائج کا متضاد ہونا شرعاً ان کریم کی اس آیت سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ سود سے حاصل شدہ مال کو یا اس کی برکت سے شادی نہیں کرتا، اور صدقہ کرنے والے کے مال یا اس کی برکت کو بڑھاتے ہیں جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ مال کی ہوس کو نیوالے کا مقصد پورا نہیں ہوتا، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے والا جو اپنے مال کی کمی پر راضی تھا، اس کے مال میں برکت ہو کر اس کا مال یا اس کے ثمرات و فوائد بڑھ جاتے ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ آیت میں سود کو مٹانے اور صدقات کو بڑھانے کا کیا مطلب ہے؟ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ مٹانا اور بڑھانا آخرت کے متعلق ہے کہ سود خور کو اس کا مال آخرت میں کچھ کام نہ آئے گا بلکہ اس پر وبال بن جائے گا، اور صدقہ خیرات کرنے والوں کا مال آخرت میں ان کے لئے ابدی نعمتوں اور راحتوں کا ذریعہ بنے گا، اور یہ بالکل ظاہر ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں، اور عامہ مفسرین نے فرمایا ہے کہ سود کا مٹانا اور صدقہ کا بڑھانا آخرت کے لئے تو ہے ہی، مگر اس کے کچھ آثار دنیا میں بھی مشاہدہ میں آتے ہیں۔ سود جس مال میں شامل ہو جاتا ہے، بعض اوقات تو وہ مال خود ہلاک و برباد ہو جاتا ہے، اور پچھلے مال کو بھی ساتھ لے جاتا ہے، جیسے کہ ربوہ سسٹم کے بازاروں میں اس کا ہمیشہ مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، کہ بڑے بڑے کروڑ پتی اور سرمایہ دار دیکھتے دیکھتے دیوالیہ اور فستیر بن جاتے ہیں، بے سود کی تجارتوں میں بھی نفع و نقصان کے احتمالات رہتے ہیں، اور بہت سے تاجروں کو نقصان بھی کسی تجارت میں ہو جاتا ہے، لیکن ایسا نقصان کہ عمل کروڑ پتی تھا، اور آج ایک ایک پیسہ کی بھیک کا محتاج ہے، یہ صرف سود اور سسٹم کے بازاروں میں ہی ہوتا ہے۔

اور اہل تجربہ کے بے شمار بیانات اس بارے میں مشہور و معروف ہیں کہ سود کا مال فوری طور پر کتنا ہی بڑھ جائے، لیکن وہ عموماً پائیدار اور باقی نہیں رہتا، جس کا فائدہ اولاد اور نسلوں میں چلے، اکثر کوئی نہ کوئی آفت پیش آکر اس کو برباد کر دیتی ہے، حضرت معمرؓ نے فرمایا کہ ہم نے بزرگوں سے سنا ہے کہ سود خور پر چالیس سال گزرنے نہیں پاتے، کہ اس کے مال پر حاق دینیں گھاٹا آجاتا ہے۔

اور اگر ظاہری طور پر مال منافع دہر باد بھی نہ ہو تو اس کے فوائد و برکات و ثمرات سے محرومی تو یقینی اور لازمی ہے، کیونکہ یہ بات کچھ مخفی نہیں کہ سونا چاندی خود تو نہ مقصود ہے نہ کار آمد نہ اس سے کسی کی بھوک مٹ سکتی ہے، نہ پیاس نہ سردی نہ گرمی سے بچنے کے لئے اور نہ بچایا جاسکتا ہے، نہ وہ کپڑوں اور برتنوں کا کام لے سکتا ہے، پھر اس کو حاصل کرنے اور محفوظ رکھنے میں ہزاروں مشقتیں اٹھانے کا منشاء ایک عقلمند انسان کے نزدیک اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ سونا چاندی ذریعہ ہیں ایسی چیزوں کے حاصل کرنے کا کہ جن سے انسان کی زندگی خوشگوار بن سکے، اور وہ راحت و عزت کی زندگی گزار سکے، اور انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ یہ راحت و عزت جس طرح اسے حاصل ہوئی اس کی اولاد اور متعلقین کو بھی حاصل ہو۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو مال و دولت کے فوائد و ثمرات کہلا سکتے ہیں، اس کے نتیجے میں یکہنا بالکل صحت ہوگا کہ جس شخص کو یہ ثمرات و فوائد حاصل ہوئے اس کا مال ایک حیثیت سے بڑھ گیا، اگرچہ دیکھنے میں کم نظر آئے، اور جس کو یہ فوائد و ثمرات کم حاصل ہوئے اس کا مال ایک حیثیت سے گھٹ گیا، اگرچہ دیکھنے میں زیادہ نظر آئے۔

اس بات کو سمجھ لینے کے بعد سود کا کاروبار اور صدقہ و خیرات کے اعمال کا جائزہ لیجئے، تو یہ بات مشاہدہ میں آجائے گی کہ سود خور کا مال اگرچہ بڑھتا ہوا نظر آتا ہے مگر وہ بڑھنا ایسا ہے کہ جیسے کسی انسان کا بدن درم وغیرہ سے بڑھ جائے، درم کی زیادتی بھی تو بدن ہی کی زیادتی ہے، مگر کوئی سمجھدار انسان اس زیادتی کو پسند نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ زیادتی موت کا پیغام ہے، اسی طرح سود خور کا مال کتنا ہی بڑھ جائے، مگر مال کے فوائد و ثمرات یعنی راحت و عزت سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔

یہاں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ آج تو سود خوروں کو بڑی سے بڑی راحت و عزت حاصل ہر وہ کوٹھیوں، بنگلوں کے مالک ہیں، عیش و آرام کے سارے سامان ہتیا ہیں، کھانے، پینے، پہننے اور رہنے پہننے کی ضروریات بلکہ فضولیات بھی سب اُن کو حاصل ہیں، تو کر چا کر اور شان و شوکت کے تمام سامان موجود ہیں، لیکن غور کیا جائے تو ہر شخص سمجھ لے گا کہ سامانِ دنیا

اور راحت میں بڑا فرق ہے، سامانِ راحت تو ٹیکڑیل اور کارخانوں میں بنتا اور بازاروں میں بکتا ہے وہ سونے چاندی کے عوین حاصل ہو سکتا ہے، لیکن جس کا نام راحت ہے وہ کسی ٹیکڑی میں بنتی ہے، نہ کسی منڈی میں بکتی ہے، وہ ایک ایسی رحمت ہے جو براہِ راست حق تعالیٰ کی طرف سے دی جاتی ہو وہ بعض اوقات ہزاروں سامان کے باوجود حاصل نہیں ہو سکتی، ایک عیندگی راحت کو دیکھ لیجئے کہ اس کے حاصل کرنے کے لئے یہ تو کر سکتے ہیں کہ سونے کے لئے مکان کو بہتر سے بہتر بنائیں، کھانا اور روشنی کا پورا اعتدال ہو، مکان کا فرش چھریہ زیب، دل خوش کن ہو، چار پائی اور گھوڑے اور بچے حسبِ منشا ہوں، لیکن کیا عیندگی کا آجانا ان سامانوں کے ہیا ہونے پر لازمی ہے؟ اگر آپ کو کسی اتفاق نہ ہوا ہو تو ہزاروں وہ انسان اس کا جواب نفی میں دیں گے جن کو کسی عارضہ سے عیند نہیں آتی، اب امریکہ جیسے مال دار متمدن ملک کے متعلق بعض رپورٹوں سے معلوم ہوا کہ وہاں پچھتر فی صد آدمی خواب آور گولیوں کے بغیر سو ہی نہیں سکتے، اور بعض اوقات خواب آور دوائیں بھی جواب دیدیتی ہیں، عیند کے سامان تو آپ بازار سے خرید لائے، مگر عیند آپ کسی بازار سے کسی قیمت پر نہیں لاسکتے، اسی طرح دوسری راحتوں اور لذتوں کا حال ہے کہ ان کے سامان تو روپیہ پیسے کے ذریعہ حاصل ہو سکتے ہیں، مگر راحت و لذت کا حاصل ہونا ضروری نہیں۔

یہ بات سمجھ لینے کے بعد سود خوروں کے حالات کا جائزہ لیجئے تو ان کے پاس آپ کو سب کچھ ملے گا مگر راحت کا نام نہ پائیں گے، وہ اپنے کروڑ کروڑ پڑھ کر ڈر اور ڈر پڑھ کر ڈر کو دو کر ڈر ڈرناٹے میں ایسے مست نظر آئیں گے، کہ ان کو اپنے کھانے پینے کا ہوش ہے، نہ اپنی بیوی بچوں کا کتنی کئی میل چل رہے ہیں، دوسرے ملکوں سے جہاز آ رہے ہیں، ان کی اُدھیڑ بن ہی میں صبح سے شام اور شام سے صبح ہو جاتی ہے، افسوس ہے کہ ان دیوانوں نے سامانِ راحت ہی کا نام راحت سمجھ لیا ہے، اور حقیقت میں راحت سے کوسوں دور ہیں۔

یہ حال تو ان کی راحت کا ہے، اب عزت کو دیکھ لیجئے، یہ لوگ چونکہ سخت دل اور بے رحم ہو جاتے ہیں، ان کا پیشہ ہی یہ ہوتا ہے کہ مفلسوں کی مفلسی سے یا کم یا یہ لوگوں کی کم ہائی سے فائدہ اٹھائیں، ان کا خون چوس کر اپنے بدن کو پالیں، اس لئے ممکن نہیں کہ لوگوں کے دلوں میں ان کی کوئی عزت ردِ قار ہو، اپنے ملک کے بیٹوں اور ملک شام کے یہودیوں کی تانیخ پڑھ جائیے، ان کے حالات کو دیکھ لیجئے، ان کی تجوریاں کتنے ہی سونے چاندی اور جواہر سے بھری ہوں، لیکن دنیا کے کسی گوشے میں انسانوں کے کسی طبقہ میں ان کی کوئی عزت نہیں، بلکہ ان کے اس عمل کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب مفلس لوگوں کے دلوں میں ان کی طرف سے بغض و نفرت پیدا ہوتی ہے، اور آج کل تو دنیا کی ساری جنگیں اسی بغض و نفرت

کی مظاہر ہیں، محنت و سرمایہ کی جنگ ہے دنیا میں اشتراکیت اور اشتعالیت کے نظریے پیدا کئے، کمیونزم کی تحریکیں سرگرمیاں اس بغض و نفرت کا نتیجہ ہیں، جن سے پوری دنیا قتل و قتل اور جنگ و جدال کا جہنم بن کر رہ گئی ہے، یہ حال تو اپنی راحت و عورت کا ہے، اور تجربہ شاید ہے کہ سود کا مال سود خور کی آنے والی نسلوں کی زندگی کو بھی خوشگوار نہیں بناتا، یا ضائع ہو جاتا ہے، یا اس کی خواست سے وہ بھی مال و دولت کے حقیقی ثمرات سے محروم و ذلیل رہتے ہیں، لوگ یورپ کے سود خوروں کی مثال سے شاید فریب میں آئیں کہ وہ لوگ تو سب کے سب خوش حال ہیں، اور ان کی نسلیں بھی پھولتی پھلتی ہیں، لیکن اول تو ان کی خوش حالی کا اجمال خاکہ عرض کر چکا ہوں۔

دوسرے ان کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی مردم خور دوسرے انسانوں کا خون چوس کر اپنا بدن پالتا ہو اور ایسے کچھ انسانوں کا جھٹھ ایک محلہ میں آباد ہو جائے، آپ کسی کو اس محلہ میں لے جا کر مشاہدہ کرائیں کہ یہ سب کے سب بڑے صحت مند اور سرسبز و شاداب ہیں، لیکن ایک عقلمند آدمی کو جو انسانیت کی فلاح کا خواہشمند ہے صرف اس محلہ کا دیکھنا نہیں، بلکہ اس کے مقابل ان بستیوں کو بھی دیکھنا، جن کا خون چوس کر ان کو ادھ موا کر دیا گیا ہے، اس محلہ اور ان بستیوں کے مجموعہ پر نظر ڈالنے والا کبھی اس محلہ کے فریب ہونے پر خوش نہیں ہو سکتا، اور جمہوری حیثیت سے ان کے عمل کو انسانی ترقی کا ذریعہ نہیں بتا سکتا، بلکہ اس کو انسان کی ہلاکت و بربادی ہی کہنے پر مجبور ہوگا۔

اس کے بالمقابل صدقہ خیرات کرنے والوں کو دیکھئے کہ ان کو کبھی اس طرح مال کے پیچھے حیران و سرگرداں نہ پائیں گے، ان کو راحت کے سامان اگرچہ کم حاصل ہوں، مگر سامانِ دالوں سے زیادہ اطمینان اور سکونِ قلب جو اصلی راحت ہے ان کو حاصل ہوگی، دنیا میں ہر انسان ان کو عزت کی نظر سے دیکھے گا۔

يَتَذَكَّرُ اللَّهُ الْمَوْلَىٰ وَبِزِيْرِ الْقَسِي قَسِي

خلا یہ ہے کہ اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا اور صدقہ کو بڑھاتا ہو، یہ مضمون آخرت کے اعتبار سے تو بالکل صاف ہے ہی، دنیا کے اعتبار سے بھی اگر ذرا حقیقت سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بالکل کھلا ہوا ہے، یہی ہے مطلب اس حدیث کا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان الزیادۃ ان کثر قان عاقبتہ
تصیر الی قلی

یعنی سود اگرچہ کتنا ہی زیادہ ہو جائے مگر اگر
نتیجہ اس کا قلت ہے۔

یہ روایت مستند احمد اور ابن ماجہ میں مذکور ہے۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہے: **وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفّٰرٍ اَکْثَرٍ** یعنی اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے کسی کفر کرنے والے کو کسی گناہ کا کام کرنے والے کو، اس میں اشارہ فرمادیا ہو کہ جو لوگ سود کو حرام ہی نہ سمجھیں وہ کفر میں مبتلا ہیں اور جو حرام سمجھنے کے باوجود عملاً اس میں مبتلا ہیں وہ گنہگار فاسق ہیں۔

تیسری آیت میں مومنین صالحین جو نماز و زکوٰۃ کے پابند ہیں ان کے اجر عظیم اور آخرت کی راحت کا ذکر ہے، چونکہ اس سے پہلے آیت میں سود و غور و دل کے لئے عذاب جہنم اور ان کی ذلت و خواری کا ذکر آیا تھا، مسترآن کریم کے عام اسلوب کے مطابق اس کے ساتھ ہی ایمان و عمل صالح کے پابند نماز و زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے ثواب اور درجات آخرت کا ذکر کر دیا گیا۔

چوتھی آیت **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الزَّيْذِلَاتِ إِنَّكُمْ كُنْتُمْ مِّنْهُ مُؤْمِنِينَ** کا خلاصہ یہ ہے کہ سود و ربوہ کی حرمت نازل ہونے کے بعد جو سود کی بقایا رقیبہ کی ذمہ ہائی تھیں ان کا لینا دینا بھی حرام کر دیا گیا۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ سود کی حرمت نازل ہونے سے پہلے عام عرب میں سود کا رواج پھیلا ہوا تھا، آیات مذکورہ سے پہلی آیتوں میں اس کی مانعت آئی تو حسب عادت تمام مسلمانوں نے سود کے معاملات ترک کر دیئے، لیکن کچھ لوگوں کے مطالبات سود کی بقایا رقیبہ کے دوسرے لوگوں پر تھے، اسی میں یہ واقعہ پیش آیا کہ بنی ثقیف اور بنی مخزوم کے آپس میں سودی معاملات کا سلسلہ تھا، اور بنو ثقیف کے لوگوں کا کچھ سودی مطالبہ بنی مخزوم کی طرف تھا، بنو مخزوم مسلمان ہو گئے تو اسلام لانے کے بعد انھوں نے سود کی رقم ادا کرنا جائز نہ سمجھا، ادھر بنو ثقیف کے لوگوں نے مطالبہ شروع کیا، کیونکہ یہ لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے، مسگر مسلمانوں سے مصالحت کر لی تھی، بنو مخزوم کے لوگوں نے کہا کہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد ہم اپنی اسلامی کمائی کو سود کی ادائیگی میں خرچ نہ کریں گے۔

یہ جملہ امکہ مکرمہ میں پیش آیا، اس وقت مکہ فتح ہو چکا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مکہ کے امیر حضرت معاذؓ اور دوسری روایت میں عتاب بن اسیدؓ تھے، انھوں نے اس جھگڑے کا قضیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بغرض دریافت حکم لکھ بھیجا،

اس پر مسترآن کی یہ آیت نازل ہوئی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد سود کے تمام سابقہ معاملات ختم کر دیئے جائیں، پچھلا سود بھی وصول نہ کیا جائے، صرف اس المال وصول کیا جائے۔

یہ اسلامی قانون رائج کیا گیا تو مسلمان تو اس کے پابند تھے ہی، جو غیر مسلم قبائل بطور صلح و معاہدہ اسلامی قانون کو قبول کر چکے تھے وہ بھی اس کے پابند ہو چکے تھے، لیکن اس کے باوجود جب حجۃ الوداع کے خطبہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قانون کا اعلان کیا تو اس کا اظہار فرمایا کہ یہ قانون کسی خاص شخص یا قوم یا مسلمانوں کے مالی مفاد کے پیش نظر نہیں، بلکہ پوری انسانیت کی تعمیر اور صلاح و فلاح کے لئے جاری کیا گیا ہے، اسی لئے ہم سب کے پہلے مسلمانوں کی بہت بڑی رقم سود جو غیر مسلموں کے ذمہ تھی اس کو چھوڑنے میں ثواب ان کو بھی اپنے بقایا سود کی رقم چھوڑنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہئے، چنانچہ اس خطبہ میں ارشاد فرمایا:

الا ان کل ربا کان فی الجاہلیۃ موضوع عنکم کلہ لکمہ و من اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون و اول ربا موضوع ربا العباس ابن عبد المطلب کلہ، رابن کثیر بحوالہ ابن ابی حاتم: "یعنی زائد جاہلیت میں جو سودی معاملات کئے گئے سب کا سود چھوڑ دیا گیا، اب ہر شخص کو اصل رستم ملے گی، سود کی زائد رقم نہ ملے گی، نہ تم زیادتی وصول کر کے کسی پر ظلم کر سکو گے اور نہ کوئی اصل راس المال میں کمی کر کے تم پر ظلم کر سکے گا، اور سب کے پہلے جو سود چھوڑا تھا وہ عباس بن عبد المطلب کا سود ہے، جس کی بہت بھاری رقیبہ غیر مسلموں کے ذمہ بطور سود کے ماندہ ہوتی تھیں" قرآن مجید کی آیت متذکرہ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ اور بقایا سود چھوڑنے کا حکم مذکور ہے۔

اس آیت کو شروع اس طرح کیا گیا کہ مسلمانوں کو خطاب کر کے **اُولَئِیۡمُ الَّذِیۡنَ کَانَ** سنایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اس کے بعد اصل مسئلہ کا حکم بتلایا گیا، یہ مسترآن حکیم کا وہ خاص طرز ہے جس میں وہ دنیا بھر کے قانون کی کتابوں سے متاثر ہے، کہ جب کوئی ایسا قانون بنایا جاتا ہے جس پر عمل کرنے میں لوگوں کو کچھ دشواری معلوم ہو تو اس کے آگے پیچھے خدا تعالیٰ کے سامنے پیشی اعمال کے حساب اور آخرت کے عذاب و ثواب کا ذکر کر کے مسلمانوں کے دلوں اور ذہنوں کو اس پر عمل کرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے، اس کے بعد حکم سنایا جاتا ہے، یہاں بھی پچھلے ماندہ شدہ سود کی رقم کا چھوڑ دینا انسانی طبیعت پر بار ہو سکتا تھا، اس لئے پہلے **اَتَّقُوا اللَّهَ** فرمایا، اس کے بعد حکم دیا **وَمَا بَقِيَ مِنَ الزَّيْذِلَاتِ** یعنی چھوڑ دو بقایا سود کو، آیت کے آخر میں فرمایا **اِنَّ کُنْتُمْ مِّنْهُ مُؤْمِنِیۡنَ**، یعنی اگر تم ایمان دلے ہو، اس میں اشارہ کرو یا کہ ایمان کا تقاضا یہ ہو

کہ حکم خداوندی کی اطاعت کی جائے، اس کی خلاف ورزی ایمان کے منافی ہے، یہ حکم چونکہ طہارح پر مبنی تھا، اس لئے حکم سے پہلے (اقْعُوا الذِّمَّةَ) اور حکم کے بعد (إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ) کے ارشاد ملا دیئے گئے۔

اس کے بعد پانچویں آیت میں اس حکم کی مخالفت کرنے والوں کو سخت وعید سنائی گئی جس کا مضمون یہ ہے کہ اگر تم نے سود کو نہ چھوڑا تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ میں لو، یہ وعید شدید ایسی ہے کہ کفر کے سوا اور کسی بڑے سے بڑے گناہ پر قرآن میں ایسی وعید نہیں آئی پھر اس آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا ہے:

وَأِنْ كُنْتُمْ فَلَکُمْ زُكُوفٌ أَمْوَالِکُمْ لَا تَغْلِبُوهَا وَلَا تَغْلِبُوهَا، یعنی اگر تم توبہ کرو اور آئندہ کے لئے سود کی بقایا رقم چھوڑنے کا عزم کر لو تو تمہیں تمہارے اصل راس المال مل جائیں گے، نہ تم اصل راس المال سے زائد حاصل کر کے کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے اور نہ کوئی اصل راس مال میں کمی یا دیر کر کے تم پر ظلم کرنے پائے گا، اس میں اصل راس المال دینے کو اس شرط کے ساتھ مشروط کیا ہے کہ تم توبہ کر لو اور آئندہ کو سود چھوڑنے کا عزم کر لو، تب اصل راس المال ملے گا۔

اس سے بظاہر اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اگر سود چھوڑنے کا عزم کر کے توبہ نہ کی تو اصل راس المال بھی نہ ملے گا، سو اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر مسلمان ہو جانے کے باوجود سود کو حرام نہ سمجھے، اس لئے سود چھوڑنے کے لئے توبہ نہیں کرتا تب توبہ شخص اسلام سے خاچ اور مرتد ہو گیا، جس کا حکم یہ ہے کہ مرتد کا مال اس کی ملک سے ہٹل جاتا ہے، پھر جو زمانہ اسلام کی کمائی ہے وہ اس کے مسلمان وارثوں کو مل جاتی ہے، اور جو کفر کے بعد کی کمائی ہے تو وہ بیت المال میں جمع کر دی جاتی ہے، اس لئے سود سے توبہ نہ کرنا اگر حلال سمجھنے کی بنا پر ہو تو اس کو اصل راس المال بھی نہ ملے گا، اور اگر حلال تو نہیں سمجھتا مگر عملاً باز نہیں آتا اور اس کے ساتھ جتنے بنا کر حکومت اسلامیہ کا مقابلہ کرتا ہے تو وہ باغی ہے، اس کا بھی سب مال ضبط کر کے بیت المال میں امانت رکھا جاتا ہے، کہ جب یہ توبہ کر لے تب اس کا مال اس کو واپس دیدیا جائے، شاید اس قسم کی جزئیات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے بصورت شرط فرمایا گیا،

وَأِنْ كُنْتُمْ فَلَکُمْ زُكُوفٌ أَمْوَالِکُمْ، یعنی اگر تم توبہ نہ کرو گے تو تمہارے راس المال بھی ضبط ہو جائیں گے۔

اس کے بعد چھٹی آیت میں سود خوری کی انسانیت سوز حرکت کے بالمقابل پاکیزہ اخلاق اور غریبوں اور ناداروں کے ساتھ مہلت کے سلوک کی تعلیم دی جاتی ہے، ارشاد

۴۲

ہوتا ہے، وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ، وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ، یعنی اگر تمہارا مدیون تنگ دست ہو، تمہارا شریض اور اگر نے پر قادر نہ ہو تو حکم شرعی یہ ہے کہ اس کو فراخی اور آسودگی کے وقت تک ہلت دی جائے، اور اگر تم اس کو اپنا قرض معاف ہی کر دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔

سود خوروں کی عادت توبہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مدیون مفلس ہے اور معاد مقررہ پر وہ قرض ادا نہیں کر سکتا تو سود کی رقم اصل میں جمع کر کے سود و سود کا سلسلہ چلاتے ہیں، اور سو کی مقدار بھی اور بڑھا دیتے ہیں۔

یہاں حکم الحاکمین نے یہ قانون بنادیا کہ اگر کوئی مدیون واقعی مفلس ہے، ادا سے قرض پر قادر نہیں تو اس کو تنگ کرنا جائز نہیں، بلکہ اس کو اس وقت تک ہلت دینی چاہئے جب تک کہ وہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو جائے، ساتھ ہی اس کی ترغیب بھی دیدی کہ اس غریب کو اپنا قرض معاف کر دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔

یہاں معاف کرنے کو تشرآن نے بلفظ صدقہ تعبیر فرمایا ہے، جس میں اشارہ ہو کہ یہ معافی تمہارے لئے بحکم صدقہ ہو کر موجب ثواب عظیم ہوگی، نیز یہ جو فرمایا کہ معاف کر دینا تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، حالانکہ بظاہر تو ان کے لئے نقصان کا سبب ہو کہ سود تو چھوڑا ہی تھا اصل راس المال بھی گیا، مگر تشرآن نے اس کو بہتر فرمایا، اس کی دود وجہ ہیں، اول تو یہ کہ یہ بہتری اس دنیا کی چند روزہ زندگی کے بعد مشاہدہ میں آجائے گی، جب کہ اس حقیر مال کے بدلہ میں جنت کی دائمی نعمتیں اس کو ملیں گی۔

دوسرے شاید اس میں اس طرف بھی اشارہ ہو کہ دنیا میں بھی تمہیں اس عمل کی بہتری کا مشاہدہ ہو جائے گا، کہ تمہارے مال میں برکت ہوگی، برکت کی حقیقت یہ ہے کہ تنہا مال میں کام بہت بھل جاتیں، یہ ضروری نہیں کہ مال کی نعمت دار یا تعداد بڑھ جائے، سو یہ مشاہدہ ہے کہ صدقہ خیرات کرنے والوں کے مال میں بے شمار برکت ہوتی ہے، ان کے تنہا مال سے اتنے کام نکل جاتے ہیں کہ حرام مال والوں کے بڑے بڑے اموال سے وہ کام نہیں نکلتے اور جس مال میں بے برکتی ہوتی ہے اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ جس مقصد کے لئے خرچ کرتا ہے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا، یا غیر مقصود چیزوں میں مثلاً دوا، علاج اور ڈاکٹروں کی فیسوں میں ایسے مالداروں کی بڑی بڑی رقمیں خرچ ہو جاتی ہیں، جس کا غریبوں کو کبھی سا بقہ نہیں پڑتا، اول تو اللہ تعالیٰ ان کو تندرستی کی نعمت عطا فرماتے ہیں، کہ علاج میں کچھ خرچ کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے، اور اگر کبھی بیماری آتی بھی تو معمولی اخراجات سے تندرستی

حاصل ہو جاتی ہے، اس لحاظ سے مدیون مفلس کو مسترض معاف کر دینا جو بظاہر اس کے لئے نقصان نظر آتا تھا، اس سترائی تعلیم کے پیش نظر وہ ایک مفید و نافع کام بن گیا۔

مدیون مفلس کے ساتھ نرمی و مہربانی کی تعلیم کے لئے احادیث صحیحہ میں جو ارشادات وارد ہوئے ہیں، ان کے چند جملے سنئے، طہرانی کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کے سر پر اس روز اللہ کی رحمت کا سایہ ہو جبکہ اس کے سوا کسی کو کوئی سایہ سر چھپانے کے لئے نہ ملے گا تو اس کو چاہئے کہ تنگ دست مفروض کے ساتھ نرمی اور مہربانی کا معاملہ کرے، یا اس کو معاف کر دے۔

اسی مضمون کی حدیث صحیح مسلم میں بھی ہے، اور سند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی مفلس مدیون کو مہلت دے گا تو اس کو ہر روز اتنی رستم کے صدقہ کا ثواب ملے گا، جتنی اس مدیون کے ذمہ واجب ہے، اور یہ حساب میعاد و قرض پورا ہونے سے پہلے مہلت دینے کا ہے، اور جب میعاد قرض پوری ہو جائے اور وہ شخص ادا کرنے پر قادر نہ ہو اس وقت اگر کوئی مہلت دے گا تو اس کو ہر روز اس کی دُگنی رقم صدقہ کر لے کا ثواب ملے گا۔

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کی دعا قبول ہو یا اس کی مصیبت دور ہو تو اس کو چاہئے کہ تنگ دست مدیون کو مہلت دیدے۔

اس کے بعد آخری آیت میں پھر روز قیامت کا خوف اور محشر کے حساب کتاب اور ثواب و عذاب کے ذکر پر احکام سود کی آیات کو ختم کیا، ارشاد فرمایا:

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۚ (یعنی ڈرو اس روز جس میں تم سب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی میں لائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اپنے اپنے عمل کا پورا پورا بدلہ ملے گا)۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت نزول کے اعتبار سے سب سے آخری آیت ہے، اس کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی، اس کے اکتیس روز بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی، اور بعض روایات میں صرف نو دن بعد وفات ہونا مذکور ہے۔

یہاں تک رہا کہ احکام سے متعلقہ سورۃ بقرہ کی آیات کی تفسیر آتی ہے، رہا کہ حرمت و مانعت پر ستر آن کریمؐ میں سورۃ بقرہ میں مذکورہ سات آیتیں اور سورۃ آل عمران میں ایک آیت، سورۃ نساء میں دو آیتیں آئی ہیں، اور ایک آیت سورۃ روم میں بھی ہے، جس کی تفسیر میں اختلاف ہے، بعض حضرات نے اس کو بھی سود بیاج کے مفہوم پر محمول کیا ہے، بعض نے دوسری تفسیر بیان کی ہے، اس طرح ستر آئی حکیم کی دس آیتیں ہیں، جن میں سود و ربا کے

احکام مذکور ہیں۔

سود کی پوری حقیقت بتلانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان باقی آیات کا ترجمہ اور تفسیر بھی اسی جگہ لکھ دی جائے جو سورۃ آل عمران اور سورۃ نساء اور سورۃ روم میں آتی ہیں، تاکہ تمام آیات یک جا ہو کر ربا کی حقیقت سمجھنے میں آسانی ہو۔

آل عمران کے تیرہویں رکوع کی ایک سو تیسویں آیت یہ ہے:

لَا يَجْعَلِ اللَّهُ لِلَّذِينَ آمَنُوا إِلَّا تَسْكُدًا
الَّذِينَ آمَنُوا مَتَاعًا مُّضَعَفَةً ۚ
وَاللَّهُ تَعْلَمُ كَيْفَ يُقْلِبُ ۚ (۲۸۱-۲۸۲)

”یعنی اے ایمان والو! سود مت کھاؤ جسے
زائد اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، امید ہے
کہ تم کامیاب ہو“

اس آیت کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے کہ جاہلیت عرب میں سود خوردی کا عام طور پر یہ طریق تھا کہ ایک خاص میعاد معین کے لئے اُدھار سود پر دیا جاتا تھا، اور جب وہ میعاد آگئی اور قرضدار اس کی ادائیگی پر قادر نہ ہوا تو اس کو مزید مہلت اس شرط پر دی جاتی تھی کہ سود کی معتد اور بڑھادی جائے، اسی طرح دوسری میعاد پر بھی ادائیگی نہ ہوتی تو سود کی معتد اور بڑھادی یہ واقعہ عام کتب تفسیر میں بالخصوص لباب النقول میں ہر روایت مجاہد مذکور ہے۔

جاہلیت عرب کی اس ملت کش رسم کو مٹانے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی، اسی لئے

اس آیت میں اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً (یعنی کئی حصے زائد) فرما کر ان کے مرد و چہ طریقہ کی مذمت اور ملت کشی و خود غرضی پر تنبیہ فرما کر اس کو حرام قرار دیا، اس کے معنی یہ نہیں کہ اضعاف بمعنی نہ ہو تو حرام نہیں، کیونکہ سورۃ بقرہ اور نساء میں مطلقاً ربا کی حرمت صاف صاف مذکور ہے، اضعاف مضاعف ہو یا نہ ہو، اس کی مثال ایسی ہے جیسے قرآن کریم میں جاہل فرمایا گیا کہ لَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِنَا ثَمَنًا قَلِيلًا (یعنی میری آیتوں کے بدلہ میں تھوڑی سی قیمت مت لو) اس میں تھوڑی سی قیمت اس لئے فرمایا کہ آیات الہیہ کے بدلہ میں اگر ہفت قہلم کی سلطنت بھی لے لے تو وہ تھوڑی ہی قیمت ہوگی، اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کی آیات کے بدلے میں تھوڑی سی قیمت لینا تو حرام ہے اور زیادہ لینا جائز، اسی طرح اس آیت میں اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً کا لفظ ان کے شرمناک طریقہ پر فکر کرنے کے لئے لایا گیا، حرمت کی شرط نہیں۔

اور اگر سود کے مرد و چہ طریقوں پر غور کیا جائے تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جب سود خوردی کی عادت پڑ جائے تو پھر وہ سود تنہا سود ہی نہیں رہتا، بلکہ لازماً اضعاف مضاعف ہو جاتا ہے، کیونکہ جو رستم سود سے حاصل ہو کر سود خورد کے مال میں شامل ہوئی تو اب اس سود کی زائد رقم کو بھی سود پر چلائے گا تو سود مضاعف ہو جائے گا، اور یہی سلسلہ آگے چلا تو اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً

ہو جائے گا، اس طرح ہر سوراخ صاف مضاعف بن کر رہے گا۔

اور سورۃ نثار میں دو آیتیں سورۃ کے متعلق یہ ہیں:

فَيُظْلِمُونَ الَّذِينَ يَدَّوْا وَآخَرُونَ
عَلَيْهِمْ ظُلُمَاتٍ أَجَلَتْ لَهُمْ
وَبَصَدَّ هُمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ
كَثِيرًا ۖ وَأَخَذَهُمُ الرُّبُوبُ
وَقَدْ نُفِرَ عَنْهُمْ وَأُظْلِمَهُمْ
أَمْوَالُ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۚ
أَعَدَّ نَارَ الْكَافِرِينَ مِنْهُمْ
عَنْ أَبِي الْيُمَاةَ (١٦٠ - ١٦١)

یعنی یہود کے انہی بڑے بڑے جرائم کے سبب ہم نے بہت سی پاکیزہ چیزیں جڑاؤ کے لئے حلال تھیں اُن پر حرام کر دیں اور بسبب اس کے کہ وہ بہت آدمیوں کو رشد کی راہ سے مانع بن جاتے تھے، اور بسبب اس کے کہ وہ صودہ لیا کرتے تھے، حالانکہ ان کو اُن کی عادت کی گنجائی تھی اور بسبب اس کے کہ وہ لوگوں کا مال ناحق طریقے سے کھا جاتے تھے، اور ہم نے

ان دوہوں کیلئے جو ان میں کافر ہیں دردناک سزا کا سامان مسترد کر رکھا ہے ۛ

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ شریعت موسویہ میں بھی سود حرام تھا، اور یہود نے جب اس کی مخالفت کی تو دنیا میں بھی اُن کو یہ مناسب سزا دی گئی کہ انھوں نے حرمِ دنیا کی خاطر حرام کھانا شروع کر دیا، تو اللہ تعالیٰ نے اُن پر بعض حلال چیزیں بھی حرام فرمادیں۔

اور سورۃ رزم کے چوتھے رکوع کی اُنتالیسویں آیت میں ہے:

وَمَا أَسْأَلُكُمْ مِنْ رَبٍّ إِلَّا بِمَا
فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْتَدُّ
عِنْدَ اللَّهِ وَمَا أَسْأَلُكُمْ مِنْ
زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ
قَالَ لَيْكُمُ هَذِهِ الصُّعُفُونَ ٣٩

”یعنی جو چیز تم اس لئے دو گے کہ وہ لوگوں کے مال میں پہنچ کر زیادہ ہو جائے تو یہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا، اور جو زکوٰۃ دو گے جس سے اللہ کی رضا مطلوب ہو تو ایسے لوگ خدا کے پاس بڑھاتے رہیں گے۔“

بعض حضرات مفسرین نے لفظ رباً اور زیادتی پر نظر کر کے اس آیت کو بھی سود بیاج پر محمول فرمایا ہے، اور یہ تفسیر سن رمانی ہے کہ سود بیاج کے لینے میں اگرچہ بظاہر مال کی زیادتی نظر آتی ہے، مگر درحقیقت وہ زیادتی نہیں، جیسے کسی شخص کے بدن پر درم ہو جائے تو بظاہر وہ اس کے جسم میں زیادتی ہے، لیکن کوئی عقلمند اس کو زیادتی سمجھ کر خوش نہیں ہوتا، بلکہ اس کو بلاکت کا مقدمہ سمجھتا ہے، اس کے بالمقابل زکوٰۃ و صدقات دینے میں اگرچہ بظاہر مال میں کمی آتی ہے، مگر درحقیقت وہ کمی نہیں بلکہ ہزاروں زیادتیوں کا موجب ہے۔

جیسے کوئی شخص مازہ ناسرہ کے اخراج کے لئے مہل سستا ہے، یا نفع کھلو اگر خون بھگوتا ہے، تو بظاہر سودہ کزور نظر آتا ہے اور اس کے بدن میں کمی محسوس ہوتی ہے، مگر جاننے والوں کی نظر میں یہ کمی اس کی زیادتی اور قوت کا پیش خیمہ ہے۔

اور بعض علماء تفسیر نے اس آیت کو سو دینا چاہی کی منافعت پر محمول ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ جو شخص کسی کو اپنا مال اعتلاص و نیک بختی سے نہیں، بلکہ اس قیمت سے دے کہ میں اس کو یہ چیز دوں گا تو وہ مجھے اس کے بدلہ میں اس سے زیادہ دے گا، جیسے بہت سی برادریوں میں فوتہا کی رسم ہے کہ وہ ہدیہ کے طور پر نہیں بلکہ بدلہ لینے کی غرض سے دی جاتی ہے، یہ دینا چونکہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنی غرض کے لئے ہے اس لئے آیت میں فرمایا کہ اس طرح اگرچہ ظاہر میں مال بڑھ جائے مگر وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا، ہاں جو زکوٰۃ صدقات اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے دیئے جائیں ان میں اگرچہ بظاہر مال گھٹتا ہے، مگر اللہ کے نزدیک وہ دو گنا اور چھ گنا ہوتا جاتا ہے۔

اس تفسیر پر آیت مذکورہ کا رد مضمون ہو جائے گا جو دوسری ایک آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا ہے، وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (۱۱، ۱۲) یعنی آپ کسی پر احسان اس نیت سے نہ کریں کہ اس کے بدل میں کچھ مال کی زیادتی آپ کو حاصل ہو جائے گی۔

اور سورۃ روم کی اس آیت میں بظاہر یہ دوسری تفسیر ہی رائج معلوم ہوتی ہے، اقول قر
اس لئے کہ سورۃ روم بھی ہے، جس کے لئے اگرچہ ضروری نہیں کہ اس کی ہر آیت مکی ہو، مگر
غالب گمان بھی ہونے کا ضرور ہے، جب تک اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ ملے، اور آیت
کے مکی ہونے کی صورت میں اس کو حرمت سود کے مفہوم پر اس لئے محمول نہیں کیا جاسکتا کہ حرمت
سود مدینہ میں نازل ہوئی ہے، اس کے علاوہ اس آیت سے پہلے جو مضمون آیا ہے اس سے بھی
دوسری تفسیر ہی کا رجحان معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس سے پہلے ارشاد ہے :

فَاتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْيَتَامَىٰ وَالسَّيْلَىٰ ذَٰلِكَ خَيْرٌ لِّمَن يَّرِىٰ وَت
 وَجْهَ اللَّهِ (۲۸:۲) قرابت دار کو اس کا حق دیا کرو اور یتیم اور مسافر کو بھی یہ ان لوگوں کے لئے
 بہتر ہے جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں و

اس آیت میں رشتہ داروں اور مساکین اور مسافروں پر خرچ کرنے کے ثواب ہونے کے لئے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اس میں نیست اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی ہو، تو اس کے بعد والی آیت مذکورہ میں اس کی توضیح اس طرح کی گئی کہ اگر مال کسی کو اس غرض سے دیا جلتے کہ اس کا بدلہ اس کی طرف سے زیادہ ملے گا تو یہ رضا جوئی حق تعالیٰ کے لئے خرچ نہ ہوا

اس لئے اس کا ثواب نہ ملے گا۔

بہر حال ممانعتِ سود کے مسئلہ میں اس آیت کو چھوڑ کر بھی مذکورۃ الصدقیہ کی آیتیں آئی ہیں جن میں سے سورۃ آل عمران کی ایک آیت میں اضاعت مضاعت سود کی حرمت بیان کی گئی ہے، اور باقی سب آیتوں میں مطلق سود کی حرمت کا بیان ہے، اس تفصیل سے یہ تو واضح ہو گیا کہ سود خواہ اضاعت مضاعت اور سود در سود ہو یا اکہر اسود، بہر حال حرام ہے، اور حرام بھی ایسا شدید کہ اس کی مخالفت کرنے پر اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ سنا یا گیا ہے۔

مسئلہ سود و ربا

کی کچھ مزید

تشریح و تفصیل

آج کل ربا چونکہ عام نظامِ تجارت کا رکنِ اعظم اور غائب نہیں گیا ہے، اس لئے جب کتاب و سنت کی آیات و روایات میں اس کی حرمت و ممانعت ملنے آتی ہے تو عام طبائع اس کی حقیقت کو سمجھنے سمجھنے کے وقت اس کی حرمت سے چمکپاتی ہیں، اور حیلہ جوئی کی طرف مائل ہوتی ہیں، مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ بحث کا مخیر یہ کر کے اس کے ہر پہلو پر علیحدہ علیحدہ غور و فکر کرنا چاہئے، غلط ملط کرنے کا نتیجہ بحث کے اُبھنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا، یہاں بحث کے تین حصے ہیں:

اول یہ کہ قرآن و سنت میں ربا کی کیا حقیقت ہے اور وہ کن کن صورتوں پر جاری ہے؟
دوسرے یہ کہ اس ربا کی حرمت و ممانعت کس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے؟
تیسرے یہ کہ سود و ربا کتنا ہی بُرا ہی، لیکن آج کل کی دنیا میں وہ نظامِ معاشیات و تجارت کا رکنِ اعظم بن چکا ہے، اگر نستر آئی احکام کے ماتحت اس کو چھوڑ دیا جائے تو نظامِ بنک و تجارت کیسے چلے گا؟

اصل ربا کی تعریف میں کبھی کوئی ابہام نہیں رہا اب سنئے کہ لفظ ربا و رباوی زبان کا معرُف لفظ ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مخالطہ کا جواب۔

بعثت اور نزولِ قرآن سے قبل جاہلیتِ عرب میں بھی یہ لفظ متعارف تھا، اور نہ صرف متعارف بلکہ ربا کا لائنِ دین عام طور پر جاری تھا، بلکہ سورۃ نسا کی آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ربا کا لفظ اور اس کے معاملات زمانہِ قورات میں بھی معروف تھے اور قورات میں بھی اس کو حرام

نستر دیا گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ ایسا لفظ جو زمانہِ قدیم سے عرب اور اس کے قرب و جوار میں معروف تھا آتا ہے اور اس پر لائنِ دین کا رواج چل رہا ہے، اور نستر آن اس کی حرمت و ممانعت بیان کرنے کے ساتھ یہ بھی خبر دیتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی امت پر بھی سود و ربا حرام کیا گیا تھا، اس لفظ کی حقیقت کوئی ایسی مبہم چیز نہیں ہو سکتی جس کے سمجھنے سمجھانے میں دشواریاں پیش آئیں۔ یہی وجہ ہو کہ جب مشہہ ہجری میں سورۃ بقرہ کی آیات ربا کی حرمت کے متعلق نازل ہوئیں تو صحابہ کرام سے کہیں منقول نہیں کہ ان کو لفظ ربا کی حقیقت سمجھنے میں کوئی اشتباہ پیش آیا ہو، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ معاملات کی طرح اس کی تحقیق کی نوبت آئی ہو بلکہ جس طرح شراب کی حرمت نازل ہوتے ہی صحابہ کرام نے اس پر عمل کیا، اسی طرح ربا کی حرمت نازل ہوتے ہی ربا کے سب معاملات ترک کر دیئے، پچھلے زمانہ کے معاملہ میں مسلمانوں کا جو ربا غیر مسلموں کے ذمہ واجب الاداء تھا وہ بھی مسلمانوں نے چھوڑ دیا اور جو غیر مسلموں کا مسلمانوں کے ذمہ واجب الاداء تھا، اور مسلمان نزولِ ممانعت کے بعد اس کو دنیا نہیں چاہتے تھے اس کا جھگڑا امیرِ مکہ کی عدالت میں پیش ہوا، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، تو اس کا فیصلہ سورۃ بقرہ کی آیات میں آسمان سے نازل ہوا کہ پچھلے زمانہ کے بقایا ربا کا لائنِ دین بھی اب جائز نہیں۔

اور اس میں چونکہ غیر مسلموں کو یہ شکایت کا موقع مل سکتا تھا کہ ایک سلامی جسٹس شرعی کی وجہ سے ہمارا روپیہ کیوں مارا جائے تو اس کے ازالہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ واضح کر دیا کہ اس حکم شرعی کا اثر صرف غیر مسلموں پر نہیں، بلکہ مسلمانوں پر بھی یکساں ہے، اور سب سے پہلے جو سود کی رقم چھوڑی گئی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکمِ محترم حضرت عباسؓ کی کثیر التعداد رقم تھی۔

الغرض ربا کی ممانعت ہونے کے وقت ربا کا مفہوم کچھ مخفی نہ تھا، عام طور پر معروف تھا وہی ربا جس کو عرب ربا کہتے تھے، اور اس کا لائنِ دین کرتے تھے، قرآن نے حرام کیا، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو صرف اخلاقی انداز میں نہیں، بلکہ قانونِ مملکت کی حیثیت سے نافذ فرمایا، البتہ بعض ایسی صورتوں کو بھی آپؐ نے ربا میں شامل قرار دیا جس کو عام طور پر ربا نہیں سمجھا جاتا تھا، انھیں صورتوں کی تصمین میں حضرت فاروقِ اعظمؓ کو اشکال پیش آیا، اور انہی میں ائمہ مجتہدین کے نظریات میں اختلاف ہوا، درنہ اصل ربا جس کو عرب ربا کہتے تھے نہ اس میں کسی کو شک یاہ کا موقع تھا، نہ اس میں کسی اختلاف ہوا۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی مراد معاملات بیع و شراء کی وہ صورتیں اور ان کی تفصیلات ہیں جو جاہلیت عرب میں ربا نہیں سمجھی جاتی تھیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ربا میں داخل و مشرک دے کر حرام فرمایا، باقی اصل ربا جو تمام عرب میں معروف و مشہور تھا اور صحابہ کرام نے اس کو چھوڑا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا قانون نافذ فرمایا، اور حجۃ الوداع کے خطبہ میں اس کا اعلان کیا، اس میں فاروق اعظم کو کوئی اشکال یا اشتباہ ہوئے کا کوئی امکان نہیں، پھر جب فاروق اعظم کو ربا کی جن خاص صورتوں میں ہشتباہ پیش آیا تو اس کا حل یہ تجویز فرمایا کہ جن صورتوں میں ربا کا شبہ بھی ہو ان کو بھی چھوڑ دیا جائے مگر حیرت ہے کہ آج بعض وہ لوگ جو یورپ کی ظاہری شیطاں اور دولت مندوں اور موجودہ نظام تجارت وغیرہ میں سود کے رکن بن جانے سے مرعوب ہیں، انہوں نے فاروق اعظم کے اس ارشاد کا یہ نتیجہ نکالا کہ ربا کا مفہوم ہی مجمل رہ گیا تھا، اس لئے اس میں دلتے کی گنجائش ہے، جس کے غلط ہونے کا کافی مواد سامنے آچکا ہے، احکام القرآن میں ابن عربی نے ان لوگوں پر سخت انکار کیا ہے جنہوں نے اس فاروقی ارشاد کی بناء پر آیات ربا کو مجمل کہا تھا۔

ابن عربی نے احکام القرآن میں فرمایا:

إِنَّ مَنْ زَعَمَ أَنَّ هَذِهِ الْأَيَّاتُ
مُتَّحِلَةٌ فَلَمْ يَفْهَمْ مَعْنَاهَا
الَّذِي يَقُولُ إِنَّ اللَّهَ لَعَلَّ
أَرْسَلَ رَسُولًا إِلَى قَوْمٍ هُوَ
مِنْهُمْ يُلْقِيهِمْ وَآتَاكَ عَلَيْهِ
كِتَابَهُ نَبِيًّا رَأَيْتَهُ بِلِسَانِهِ
وَلَيْسَانِهِمْ وَالزَّبَانِي اللَّعَنَةُ
الزَّبَانِي وَالْمَرَادِيهِ فِي
الْآيَةِ كُلِّ زِيَادَةٍ لَا يُقَابِلُهَا عَوْنٌ

میں نے یہ کہا کہ یہ آیت مجمل ہے، اس کے
شرعیات کی تصریحات کو نہیں سمجھا، کیونکہ اللہ
تعالیٰ نے اپنے رسول کو ایسی قوم کی طرف
بھیجا کہ وہ خود اس قوم میں سے تھے انہی کی
زبان میں سمجھا، ان پر اپنی کتاب آسمانی کے
لئے انہی کی زبان میں نازل فرمائی اور لفظ
ربا کے معنی ان کی زبان میں زیادتی کے ہیں
اور مراد آیت میں وہ زیادتی ہے جس کے
مقابلہ میں مال نہیں بلکہ میعاد ہے۔

اور امام رازی نے تفسیر تیسیر میں فرمایا کہ ربا کی دو قسمیں ہیں، ایک ادھار کا ربا دوسرے
نقد بیع میں زیادہ لینے کا ربا، پہلی قسم وہ ہے جو زمانہ جاہلیت میں مشہور و معروف تھی،
اور اب جاہلیت اس کا لین دین کرتے تھے، اور دوسری قسم وہ ہے جو حدیث نے بیان کی،
کہ فلاں فلاں چیزوں کی بیع و شراء میں کسی زیادتی ربا میں داخل ہے۔
اور احکام القرآن جصاص میں ہے کہ ربا کی دو قسمیں ہیں، ایک بیع و شراء کے اندر

دوسری بغیر بیع و شراء کے اور زمانہ جاہلیت کا ربا وہی دوسری قسم کا تھا، اور اس کی تعریف یہ
ہو کہ وہ مشرک جن میں بحساب میعاد کوئی نفع لیا جائے، اور یہی مضمون ابن رشد نے بدایۃ المجتہد
میں لکھا ہے، اور مشرکین ادھار پر نفع لینے کے ربا کا حرام ہونا مسترآن، سنت اور اجماع امت سے
ثابت کیا ہے۔

امام طحاوی نے شرح معانی الآثار میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے کلام کرتے ہوئے
یہ بتلایا ہے کہ مشرکین میں جو ربا مذکور ہے اس سے علی اور واضح طور پر وہ ربا مراد ہے جو مشرکین
ادھار پر لیا دیا جاتا تھا، اور اس کو زمانہ جاہلیت میں ربا کہا جاتا تھا، اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کے بیان اور آپ کی سنت سے دوسری قسم کے ربا کا علم ہوا، جو خاص خاص اقسام بیع و
شراء میں کسی زیادتی یا ادھار کرنے کا نام ہے، اور اس ربا کے حرام ہونے پر بھی اعداد بیش
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم متواتر آتی ہیں، مگر اس قسم کے ربا کی تفصیلات پوری واضح نہ
ہونے کے سبب اس میں بعض صحابہ کرام کو اشکال پیش آیا، اور فقہار کے اختلافات
ہوئے (معانی الآثار ص ۲۳۲ ج ۲)

اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے تجلۃ اللہ الباقیہ میں منسرایا ہے کہ ربا ایک حقیقی
ہے اور ایک وہ جو مجسم ربا ہے، حقیقی ربا مشرکین ادھار پر زیادتی لینے کا نام ہے، اور مجسم ربا
وہ ہے جس کا بیان حدیث میں آیا کہ بعض خاص چیزوں کی بیع میں زیادتی لینے کو ربا کہا گیا
ہے، اور ایک حدیث میں جو آیا ہے (لا با الا فی النسیئۃ درولہ البخاری) یعنی ربا صرف
ادھار میں ہے، اس کا یہی مطلب ہے کہ حقیقی اور اصلی ربا جس کو عام طور پر ربا سمجھا اور کہا جاتا ہے
وہ ادھار پر نفع لینے کا نام ہے اس کے سوا حقیقی اقسام اس کے ساتھ ملحق کی گئی ہیں وہ سب
کلمہ ربا میں داخل ہیں۔

اس تفصیل سے چند چیزیں واضح ہو گئیں

اول یہ کہ نزول مشرکین سے پہلے ربا ایک متعارف چیز تھی، فرض ادھار پر مجسم
میعاد زیادتی لینے کو ربا کہا جاتا تھا۔
دوسرے یہ کہ مشرکین میں حرمت ربا نازل ہوتے ہی سب صحابہ کرام نے اس ربا کو ترک
کر دیا، اس کے معنی سمجھنے سمجھانے میں کسی کو نہ اشکال پیش آیا نہ ہشتباہ۔
تیسرے یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ چیزوں کے بارہ میں یہ ارشاد فرمایا
کہ ان کی باہمی بیع و شراء میں براہری شرط ہے، کی بیشی ربا میں داخل ہے، اور ان میں ادھار

کرنا بھی رہا میں داخل ہے، یہ چھ چیزیں سونا، چاندی، گہیوں، جو، کھجور، انگور ہیں، اور اسی قانون کے تحت عرب میں مردہ اقسام بیع مزابنہ، حی قاتلہ وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں چھ چیزوں کی بیع و شراء میں کمی بیشی اور ادھار کو تو حرام رہا میں داخل کر کے حرام قرار دیدیا تھا، لیکن اس میں یہ بات محل تفرقہ و اجتہاد تھی کہ یہ حکم ان چھ چیزوں کے ساتھ مخصوص ہے یا دوسری اشیاء میں بھی ہے، اور اس کا ضابطہ کیا ہوا؟ اس ضابطہ میں فقہاء نے اپنے اپنے غور و فکر اور اجتہاد سے مختلف صورتیں تجویز کیں، اور چونکہ یہ ضابطہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہ فرمایا تھا اس میں اشتباہ رہنے کے سبب حضرت فاروق اعظمؓ نے اس پر اظہارِ افسوس کیا کہ کاش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی اس کا کوئی ضابطہ بیان فرمادیتے تو مشتبہ حالات میں اطمینان پیدا ہو جاتا، اور پھر یہ ارشاد منسرا یا کہ جہاں رہا کا شبہ بھی ہو اس سے بچنا چاہئے۔

پچھلے یہ معلوم ہوا کہ اصلی اور حقیقی ربا جس کو فقہاء نے ربا القرآن یا ربا القرض کے نام سے موسوم کیا ہے وہی ہے جو عرب میں مشابہت تھا یعنی قرض ادھار پر بحساب مبادلہ نفع لینا، دوسری قسم کے ربا جو حدیث میں بتلائے گئے وہ سب اسی ربا کے ساتھ ملحق اور اسی کے حکم میں ہیں، اور جو کچھ خلافت و اختلاف امت میں ہوا وہ سب اسی دوسری قسم کے معاملات رہا میں ہوا، پہلی قسم کا ربا جو ربا القرآن کہلاتا ہے اس کے حرام ہونے میں پوری امت متحدہ میں کسی کوئی اختلاف نہیں ہوا۔

اور آجکل جو ربا انسانی معاشیات کا مدار سمجھا جاتا ہے، اور مسئلہ سود میں جو زیر بحث ہے وہ یہی رہا ہے جس کی حرمت قرآن کی سات آیات اور چالیس سے زیادہ احادیث اور اجماع امت سے ثابت ہے۔

ربا کی دوسری قسم جو بیع و شراء کے ضمن میں ہوتی ہے نہ اس کا درواج عام ہے نہ اس میں کوئی بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

یہاں تک یہ بات واضح ہو گئی کہ مسترآن و سنت میں ربا کی حقیقت کیا ہے جو مسئلہ سود کی پہلی بات ہے۔

حرمت سود کی بحث مصلحت اس کے بعد دوسری بحث اسکی پر کہ ربا کی حرمت و ممانعت کس بحث و مصلحت پر مبنی ہے، اور اس میں وہ کونسی روحانی یا معاشی مضرتیں ہیں، جن کی وجہ سے اسلام نے اس کو اتنا بڑا گناہ قرار دیا ہے۔

اس جگہ پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ دنیا کی ساری مخادقات اور ان کے معاملات

میں ایسی کوئی چیز نہیں جس میں کوئی بھلائی یا فائدہ نہ ہو، سانپ، بھتو، بھیڑیا، شیر اور سنسکرمیا جیسے ذہر قاتل میں بھی انسان کے لئے ہزاروں فوائد ہیں۔

کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

چوری، ڈاکہ، بدکاری، رشوت، ان میں کوئی ایسی چیز نہیں جس میں کچھ نہ کچھ فائدہ نہ ہو، مگر ہر مذہب و ملت اور ہر مکتب فکر میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس چیز کے منافع زیادہ اور مضرتیں کم ہیں ان کو نافع و مفید کہا جاتا ہے، اور جن کے مفاسد و مضرت زیادہ اور منافع کم ہیں ان کو مضر اور بیکار سمجھا جاتا ہے، قرآن کریم نے بھی شراب اور قمار کو حرام قرار دیتے ہوئے اس کا اعلان فرمایا کہ ان میں بڑے گناہ بھی ہیں، اور لوگوں کے کچھ منافع بھی، مگر ان کے گناہ کا وبال منافع کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے، اس لئے ان چیزوں کو اچھا یا مفید نہیں کہا جاتا بلکہ ان کو نہایت مضر اور تباہ کن سمجھ کر ان سے جہتناب لازم ہے۔

ربا، یعنی سود کا بھی یہی حال ہے، اس میں سود خور کے لئے کچھ وقتی نفع ضرور نظر آتا ہے، لیکن اس کا دنیوی اور اخروی وبال اس نفع کے مقابلہ میں نہایت شدید ہے۔

ہر چیز کے نفع و نقصان یا مفاسد و مصالح کا موازنہ کرنے میں یہ بات بھی ہر عقل مند کے نزدیک قابل نظر ہوتی ہے کہ اگر کسی چیز میں نفع محض وقتی اور ہنگامی ہو اور نقصان اس کا دیر پا یا دائمی تو اس کو کوئی عقل مند مفید اشیاء کی فہرست میں شمار نہیں کر سکتا، اسی طرح اگر کسی چیز کا نفع شخصی اور انفرادی ہو اور اس کا نقصان پوری ملت اور جماعت کو پہنچتا ہو تو اس کو بھی کوئی ہوشمند انسان مفید نہیں کہہ سکتا، چوری اور ڈاکہ میں چور ڈاکو کا تو نفع کھلا ہوا ہے، مگر وہ پوری ملت کے لئے مضر اور ان کے امن و سکون کو برباد کرنے والا ہے، اسی لئے کوئی انسان چوری اور ڈاکہ کو اچھا نہیں کہتا۔

اس تمہید کے بعد مسئلہ سود پر نظر ڈالتے تو اس میں ذرا سا غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں سود خور کے وقتی اور ہنگامی نفع کے مقابلہ میں اس کا روحانی اور اخلاقی نقصان اتنا شدید ہے کہ وہ اس کو انسانییت سے نکال دیتا ہے، اور یہ کہ اس کا جو وقتی نفع ہے وہ بھی صرف اس کی ذات کا نفع ہے، اس کے مقابلہ میں پوری ملت کو نقصان عظیم اور معاشی بحران کا شکار ہونا پڑتا ہے، لیکن دنیا کا حال یہ ہے کہ جب اس میں کوئی چیز و راجح یا جاتی ہو تو اس کی خرابیاں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں، اور صرف اس کے فوائد سامنے رہ جاتے ہیں، اگرچہ وہ فوائد کتنے ہی حقیر و ذلیل اور ہنگامی ہوں اس کے نقصانات کی طرف دھیان نہیں جاتا اگرچہ وہ کتنے ہی شدید اور عام ہوں۔

رسم درواج طبائع انسانی کے لئے ایک کلوروفارم ہے جو اس کو بے حس بنا دیتا ہے، بہت کم افراد ہوتے ہیں جو چلے ہوئے رسم درواج پر تحقیقی نظر ڈال کر یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس میں فائدے کتنے ہیں اور نقصان کتنا، بلکہ اگر کسی کے متنبہ کرنے سے اس کے نقصانات سامنے بھی آجائیں، تو پابندی رسم درواج اس کو صحیح راستہ پر نہیں آنے دیتی۔

سودوربا اس زمانہ میں ایک دہائی مرض کی صورت اختیار کر چکا ہے اور اس کا رواج ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے، اس نے انسانی فطرت کا ذائقہ بدل دیا ہے کہ کرڈر کو میٹھا سمجھنے لگی، اور چیز پوری انسانیت کے لئے معاشی بربادی کا سبب بنی، اس کو معاشی مسئلہ کا حل سمجھا جانے لگا، آج اگر کوئی مفکر محقق اس کے خلاف آواز اٹھاتا ہے تو اس کو دیوانہ سمجھا جاتا ہے۔

یہ سب کچھ ہے، لیکن وہ ڈاکٹر اکثر نہیں بلکہ انسانیت کا ڈاکو ہے جو کسی ملک میں دبا پھیل جانے کو اور علاج کے غیر مؤثر ہونے کا مشاہدہ کرنے کی بناء پر اب یہ طے کرے کہ لوگوں کو یہ سمجھائے کہ یہ مرض مرض ہی نہیں، بلکہ عین شفا اور عین راحت ہے، ماہر ڈاکٹر کا کام ایسے وقت میں بھی یہی ہے کہ لوگوں کو اس مرض اور اس کی ضرورت سے آگاہ کرتا رہے، اور علاج کی تدبیریں بتاتا رہے۔

انبیاء علیہم السلام اصلاح خلق کے ذمہ دار ہو کھاتے ہیں، وہ کبھی اس کی پروا نہیں کرتے کہ کوئی ان کی بات سنے گا یا نہیں، وہ اگر لوگوں کے سننے اور ماننے کا انتظار کیا کرتے تو ساری دنیا کفر و شرک ہی سے آباد ہوتی، کلمہ لا الہ الا اللہ کا ماننے والا اس وقت کون تھا جب کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی تبلیغ و تعلیم کا حکم منجانب اللہ ملا تھا؟ سودوربا اگرچہ آج کی معاشیات میں ریڑھ کی ہڈی سمجھا جانے لگا ہے، لیکن حقیقت وہ ہے جو آج بھی بعض حکمائے یورپ نے تسلیم کی کہ وہ معاشیات کے لئے ریڑھ کی ہڈی نہیں بلکہ ریڑھ کی ہڈی میں پیدا ہو جانے والا ایک کیڑا ہے، جو اس کو کھا رہا ہے۔

مگر افسوس ہے کہ آجکل کے اہل علم و فن بھی کبھی رسم درواج کے تنگ دائرہ سے آزاد ہو کر اس طرف نظر نہیں کرتے، اور سیکڑوں برس کے تجربے بھی ان کو اس طرف متوجہ نہیں کرتے کہ سودوربا کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عام خلق خدا اور تمام ملت فقر و فاقہ اور معاشی بحران کا شکار ہو، اور وہ غریبے غریب تر ہوتے چلے جائیں، اور چند سرمایہ دار پوری ملت کے مال سے فائدہ اٹھا کر، یا یوں کہتے کہ ملت کا خون چوس کر اپنا بدن بڑھاتے اور پالتے چلے جائیں، اور حیرت ہے کہ جب کبھی ان حضرات کے سامنے اس حقیقت کو بیان

کیا جاتا ہے، تو اس کے جھٹلانے کے لئے ہمیں امریکہ اور انگلینڈ کے بازاروں میں لے جا کر سود کی برکات کا مشاہدہ کرانا چاہتے ہیں، اور یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ سود و ربا کی بدولت کیسے پھلے اور پھولے ہیں، لیکن اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی مردم خوروں کی کسی قوم اور ان کے عمل کی برکات کا مشاہدہ کرانے کے لئے آپ کو مردم خوروں کے محل میں لے جا کر یہ دکھلائے کہ یہ کتنے موٹے تانے اور تند رست ہیں، اور اس سے یہ ثابت کرے کہ ان کا یہ عمل بہترین عمل ہے۔

لیکن اس کو کسی سمجھ دار آدمی سے سابقہ پڑے تو وہ کہے گا کہ تم مردم خوروں کے عمل کی برکات مردم خوروں کے محل میں نہیں دوسٹر بخٹوں میں جا کر دیکھو جہاں سیکڑوں ہزاروں مرد بے پڑے ہوئے ہیں جن کا خون اور گوشت کھا کر یہ درندے پلے ہیں، اسلام اور اسلامی شریعت کبھی ایسے عمل کو درست اور مفید نہیں مان سکتی جس کے نتیجہ میں پوری انسانیت اور ملت تباہی کا شکار ہو، اور کچھ افراد یا ان کے جتنے پھولتے پھلتے چلے جائیں۔

سودوربا کی معاشی خرابیاں

سودوربا میں اگر کوئی دوسرا عیب بھی اس کے سوا نہ ہوتا کہ اس کے نتیجہ میں چند افراد کا نفع اور پوری انسانیت کا نقصان ہے تو یہی اس کی مانعت اور قابل نفرت ہونے کے لئے کافی تھا، حالانکہ اس میں اس کے علاوہ اور بھی معاشی خرابیاں اور روحانی تباہ کاریاں پائی جاتی ہیں پہلے اس کو سمجھئے کہ سود کے ذریعہ ملت کی تباہی اور خاص افراد کا نفع کیونکر ہو سکتا ہے؟ سودوربا کے مہاجنی اور فسر سودہ طریقہ میں تو ایسا سمجھنا اپن تھا کہ عام ملت کا ضرر اور کسی خاص فرد کا نفع ہر مومن عقل دل سے سمجھ میں آجاتا تھا، مگر آجکل کی نئی روشنی جس کو نئی اندھیری کہنا زیادہ موزوں ہے، اس نے جس طرح شراب کو مشینوں میں صاف کر کے چوری اور ڈاک کی نئی نئی صورتیں ایجاد کر کے بدکاری و بے حیائی کے نئے نئے ڈھنگ نکال کر کے سب کو ایسا مہذب بنایا ہے کہ سطحی نظروں کو اس کی اندرونی خرابیاں نظر نہ آئیں، اسی طرح ربا اور سود کے لئے بجاے شخصی دکاوڑوں کے مشترک کمپنیاں بنائی ہیں جن کو بینک کہا جاتا ہے، اور اب دنیا کی آنکھوں میں خاک چھونکنے کے لئے یہ بتلایا جاتا ہے کہ ربا کے اس جدید طریقہ سے پوری ملت کا فائدہ ہے، کیونکہ عوام جو اپنے روپے سے تجارت کرنا نہیں جانتے یا قلت سرمایہ کی بناء پر نہیں کر سکتے ان سب کا روپیہ بینکوں میں جمع ہو کر ان میں سے ہر ایک کو گو قلیل ہی بھی کچھ نہ کچھ نفع سود کے نام سے مل جاتا ہے، اور بڑے تاجروں کو یہ موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ بینکوں سے سودی قرض لے کر بڑی تجارت کر کے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس طرح سود ایسی مبارک چیز بن گئی کہ

ساری ملت کے افراد کو اس سے نفع پہنچ رہا ہے۔

لیکن ذرا انصاف سے کام لیا جائے تو یہ وہ اہل ہندوستان ہے جو شراب کی گندی پھٹیوں کو صاف ستھرے ہوٹلوں میں اور عصمت منسروشی کے اڈوں کو سنیادوں اور شبیہ نگاریوں میں تبدیل کر کے زہر کو تریاق اور مضر کو مفید بنا کر دکھانے کے لئے عمل میں لاتی گئی ہے اور جس طرح اہل بصیرت پر یہ بات روشن ہے کہ اخلاق سوز جرائم کو جدید غلات پہنانے کا نتیجہ اس کے سوا نہیں کہ یہ جرائم پہلے سے زیادہ ہو گئے، اور ان کا نہ ہر پہلے سے زیادہ تیز ہو گیا، اسی طرح سود و ربا کی اس نئی شکل نے سود کے چند آنے فی سیکڑہ عوام کے منہ کو لگا کر ایک طرف ان کو اپنے جرم کا شریک کر لیا، اور دوسری طرف اپنے لئے اس جرم کے ارتکاب کا غیر محدود میدان منسراہم کر لیا۔

کون نہیں جانتا کہ یہ چند آنے فی سیکڑہ کا سود جو بینکوں اور ڈاکخانہ جات سے لوگوں کو ملتا ہے یہ کسی طرح ان کے معاش کی کفالت نہیں کر سکتا، اس لئے وہ مجبور ہیں کہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے کوئی مزدوری یا ملازمت تلاش کریں، تجارت کی طرف اول تو ان کی نظر خود نہیں جاتی، اور اگر کسی کو اس طرف توجہ بھی ہو جائے تو پوری ملت کا سرمایہ بینکوں میں جمع ہو کر جو صورت تجارت کی بن گئی ہے اس میں کسی چھوٹے سرمایہ دان کو داخل ہونا خود اپنی موت کو دعوت دینے سے کم نہیں، کیونکہ بینک کوئی بڑا سرمایہ قرض پر صرف اسی کو دے سکتے ہیں جس کی بازار میں اپنی ساکھ ہو اور بڑا کاروبار ہو، دس لاکھ کے مالک کو ایک کروڑ قرض مل سکتا ہے، وہ اپنے ذاتی روپے کی نسبت دس گنا زیادہ کی تجارت چلا سکتا ہے اور تھوڑے سرمایہ دان کے لئے کوئی ساکھ ہوتی ہے نہ بینک اس پر اعتماد کرتے ہیں کہ ان کو دس گنا زیادہ قرض دیدیں، ایک ہزار کی مالیت دانے کو دس ہزار تو کیا ایک ہزار ملنا بھی مشکل ہے، اور جب کہ ایک شخص جو ایک لاکھ کی ملکیت رکھتا ہے وہ لاکھ بینک کا سرمایہ لگا کر دس لاکھ کی تجارت کرتا ہے، اور قرض کر لیتے کہ اس کو ایک روپیہ فی صد نفع ہوتا ہے تو گویا اس کو اپنے ایک لاکھ پر دس فی صد نفع ہوا، اس کے بالمقابل اگر کوئی شخص صرف اپنے ذاتی روپے سے ایک لاکھ کی تجارت کرتا ہے اس کو ایک لاکھ پر صرف ایک ہی فی صد کا نفع ہوگا، جو اس کے مزدوری اخراجات کے لئے بھی کافی نہ ہوں گے، اور مارکیٹ میں بڑے سرمایہ دانوں کو عام ملنا جس نفع اور رعایت کے ساتھ ملتا ہے وہ چھوٹے سرمایہ دانوں کو میسر نہیں آسکتا، اس لئے چھوٹے سرمایہ دانوں کو مفلوج اور محتاج ہو کر رہ جاتا ہے، اور اگر اس کی شامت آتی، اور اس نے بھی کسی ایسی تجارت میں ہاتھ ڈال دیا تو بڑے سرمایہ دانوں کو اپنی خدائی کا شریک

سمجھ کر کچھ اپنی گرہ سے نقصان اٹھا کر بھی بازار کو ایسا ڈالون کر دیتا ہے کہ چھوٹے سرمایہ والا اصل اور نفع سب ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تجارت صرف ان چند افراد میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے جو بڑے سرمایہ دار ہیں۔

۱۔ یہ ملت پر کتنا بڑا ظلم ہے کہ ساری ملت اصلی تجارت سے محروم ہو کر صرف بڑے سرمایہ داروں کی دست نگر بن جائے، ان کو وہ جتنا نفع دینا چاہیں بخشش کے طور پر دیدیں۔

۲۔ اور دراصل اس سے بڑا نقصان جس کی زد میں پورا ملک آ جاتا ہے یہ ہے کہ ایسی صورت میں ہشیا کے نرخ پران بڑے سرمایہ داروں کا قبضہ ہو جاتا ہے، وہ گراں سے گراں فروخت کر کے اپنی گرہ مضبوط کر لیتے اور پوری ملت کی گرہیں کھلو لیتے ہیں، اور قیمت بڑھانے کے لئے جب چاہیں مال کی فروخت بند کر دیتے ہیں، اگر ساری ملت کا سرمایہ بینکوں کے ذریعہ کچھ کران خود غرض لوگوں کی پردریش نہ کی جاتی اور یہ مجبور ہوتے کہ صرف اپنے ذاتی سرمایہ سے تجارت کریں، تو نہ چھوٹے سرمایہ دانوں کو یہ مصیبت پیش آتی، اور نہ یہ خود غرض درندے پوری تجارت کے ناخدا بننے، چھوٹے سرمایہ دانوں کی تجارت کے منافع سامنے آتے تو دوسروں کا حوصلہ بڑھتا، تجارت کا کاروبار عام ہوتا، جس سے ہر ایک کا اسٹاٹ ملوہ ہوتا، جس سے ہزاروں حاجتمندوں کی روزی پیدا ہوتی، اور تجارتی نفع بھی عام ہوتا، اور ہشیا کی ارزانی پر بھی یقینی اثر پڑتا، کیونکہ باہمی مقابلہ (کمپٹیشن) ہی ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ کوئی آدمی اس پر تیار ہوتا ہے کہ اپنا نفع کم کرے، اس عیار نہ طریق کار پر پوری قوم کو ایک ہلک بیماری لگادی اور دوسرے اس کی ذہنیست خراب کردی کہ اس بیماری ہی کو شفا کچھ بینکوں کے سود سے ملت کا ایک تیسرا معاش نقصان اور دیکھتے کہ جس شخص کا سرمایہ دس ہزار ہے، اور وہ بینک سے سودی قرض لے کر ایک لاکھ کا کاروبار کرتا ہے، اگر کہیں اس کا سرمایہ ڈوب گیا، اور تجارت میں اس کو نقصان پہنچ گیا، اور وہ دیوالیہ ہو گیا، تو خود کیجئے کہ نقصان صرف دس فی صد تو اس پر پڑا، باقی نوٹے فی صد نقصان پوری ملت کا ہوا، جن کا سرمایہ بینک سے لیکر اس نے لگایا تھا، اگر بینک نے دیوالیہ کے نقصان کو سر دست خود ہی برداشت کر لیا، تو یہ ظاہر ہے کہ بینک تو قوم کی جیب ہے، اس کا نقصان انجام کار قوم پر عائد ہوگا، جس کا حاصل یہ ہوا کہ سرمایہ دار کو جب تک نفع ہوتا رہا تو نفع کا وہ تنہا مالک تھا، اس میں ملت کے لئے کچھ نہ تھا یا برائے نام تھا، اور جب نقصان آیا تو نوٹے فی صد نقصان پوری ملت پر پڑ گیا۔

۳۔ سود سے ایک معاشی نقصان یہ بھی ہے کہ سود خور جب گھاسے میں آجائے تو پھر وہ بچنے کے قابل نہیں رہتا، کیونکہ اتنا سرمایہ تو تھا نہیں جس کے نقصان کو یہ برداشت کر سکے، نقصان کے وقت اس پر دوسری مصیبت ہوتی ہے، ایک تو اپنا نفع اور سرمایہ گیا، اور دوسرے سے بینک کے قرض میں دب گیا، جس کی ادائیگی کے لئے اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں، اور بے سود کی تجارت میں اگر سارا سرمایہ بھی کسی وقت چلا جائے تو فقیر ہی ہو گا مگر قرض تو نہ ہو گا۔

۱۹۵۵ء میں پاکستان میں روٹی کے تیر بار پرشرا آئی ارشاد کے مطابق حاکم کی آفت آئی اور حکومت نے کروڑوں روپے کا نقصان اٹھا کر تاجروں کو سنبھالا، مگر کسی نے اس پر غور نہیں کیا کہ وہ سب سود کی غوشت تھی، کیونکہ کاٹن کے تاجروں نے اس کا رو باڑی میں شتر سرمایہ بینکوں کا لگایا ہوا تھا، اپنا سرمایہ برائے نام تھا، بقضائے خداوندی روٹی کا بازار اتنا گر گیا کہ اس کے دام ایک سو بچیس سے گر کر دس پر آ گئے، تاجر اس قابل نہ رہے کہ بینکوں میں مارجن پوری کرنے کے لئے روپیہ واپس دیں، مجبور ہو کر مارکیٹ بند کر دی گئی، اور حکومت سے فریاد کی، حکومت نے دس کے بجائے نوے کے دام لگا کر خود مال خریدا اور کروڑوں روپیہ کا نقصان برداشت کر کے ان تاجروں کو دیوالیہ ہونے سے بچا لیا، حکومت کا روپیہ کس کا تھا وہی بچاری غریب ملت و قوم کا، غرض بینکوں کے کاروبار کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ پوری ملت کے سرمایہ سے چند افراد نفع اٹھاتے ہیں اور جہاں نقصان ہو جاتا ہے تو وہ پوری قوم و ملت پر پڑے۔

خوش پروری اور ملت کشی کی ایک اور مثال

سود و ربا کی ملت کشی اور افراد پروری کا اجمالی نقشہ آپ کے سامنے آچکا ہے، اس کے ساتھ ایک اور ہوشیارسی اور چالاکی دیکھئے کہ سود خوروں نے جب اپنے تجربہ سے بھی اس چیمبر کو محسوس کیا جو قرآن کا ارشاد ہے **يَمْحُجُّ اللَّهُ ذُنُوبَ بَعْضِ الْبَاقِ** یعنی سود کے مال میں بھائی کی آفتیں آنا لازمی ہیں، جس کے نتیجے میں دیوالیہ ہونا پڑتا ہے، تو ان آفتوں سے بچنے کے لئے دو مستقل ادارے بنائے، ایک بیمہ (انشورنس) دوسرے سسٹم کا بازار، کیونکہ تجارت میں نقصان آنے کی دو وجہ ہو سکتی ہیں، ایک کوئی آسانی آفت کہ ہمارا ڈوب گیا، یا جل گیا یا کوئی اور ایسی ہی آفت آگئی، دوسرے کہ سامان کا خرچ اس کی قیمت خرید سے کم ہو گیا، ان دونوں صورتوں میں لگا ہوا سرمایہ چونکہ اپنا نہیں بلکہ ملت کا مشترکہ سرمایہ ہے، اس لئے ان کا نقصان کم اور ملت کا زیادہ ہے، مگر انھوں نے اس تھوڑے سے نقصان کو بھی ملت ہی کے سر پر

ڈالنے کے لئے، ایک طرف تو بیمہ کمپنیاں کھولیں، جس میں بینکوں کی طرح پوری ملت کا سرمایہ جمع رہتا ہے، اور جب کسی سودی آفت سے ان سود خوروں پر کوئی نقصان آتا ہے تو بیمہ کے ذریعہ وہ پورا نقصان بھی ملت کے مشترک سرمایہ پر ڈال دیتے ہیں۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ بیمہ کمپنیاں خدا کی رحمت ہیں، ڈوبتے کو سہارا دیتی ہیں، لیکن اگلی حقیقت کو دیکھیں اور سمجھیں تو یہاں بھی وہی فریب ہو کہ ناگہانی حوادث کے وقت امداد کا لالچ دے کر ملت کا سرمایہ جمع کیا گیا، مگر اس سے بھاری رقموں کا فائدہ تو صرف اونچے سرمایہ داروں کو ملتا ہے جو بعض اوقات خود ہی اپنی سسرودہ موٹر کو آگ لگا کر یا کہیں بھرا کر اور بیمہ کمپنی سے رقم لے کر نئی موٹر خریدنا چاہتے ہیں، تنو میں ایک رو کوئی غریب بھی ایسا ہوتا ہو گا جس کو ناگہانی موت کے سبب کچھ پیسے مل جاویں۔

اور دوسری قسم یعنی نرخ گھٹ جانے کے خطرے سے بچنے کے لئے سسٹم کا بازار گرم کیا، اس سسٹم کے ذریعہ تمام افراد ملت کو متاثر کیا گیا، تاکہ جو نقصان ان کو قیمت گھٹ جانے کی وجہ سے ہونے والا تھا وہ پھر ملت پر منتقل کر دیں۔

اس مختصر بیان میں آپ نے اتنا سمجھ لیا ہو گا کہ بینکوں کا سود اور اس کی تجارت پوری انسانیت کے لئے فقر و فاقہ اور معاشی تنگدستی کا موجب ہے، ہاں چند مال دار افراد کے اموال میں اس سے اضافہ بھی ہوتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ملت بگڑتی ہے اور چند افراد بگڑتے ہیں، اور ملک کا سرمایہ سمٹ کر ان کے ہاتھ میں آ جاتا ہے، عام حکومتوں نے اس عظیم مفسدہ کو محسوس کیا، لیکن اس کا علاج یہ تجویز کیا کہ بڑے سرمایہ داروں کے لئے انکم ٹیکس کی مشرح بڑھادی یہاں تک کہ آخری شرح ایک روپیہ میں سے ساڑھے پندرہ آنے کر دی گئی، تاکہ سرمایہ ان کے پاس سے منتقل ہو کر پھر قومی خزانے میں پہنچ جائے۔

لیکن سب کو معلوم ہے کہ اس قانون کے نتیجے میں عام طور پر کارخانوں کے حساب فزنی اور جمل بننے لگے، اور بہت سا سرمایہ حکومت سے چھپانے کے لئے پھر دفتروں کی شکل میں منتقل ہونے لگا۔

خلاصہ یہ ہو کہ دولت سمٹ کر قوم کے چند افراد میں مقید ہو جانے کی انتہائی معتر ملک کے معاش اور اقتصادی حالات کے لئے سب پر واضح ہے، اسی لئے انکم ٹیکس کی شرح اتنی زیادہ بڑھائی جاتی ہے، لیکن تجربہ شاہد ہے کہ یہ تدبیر مرض کا علاج ثابت نہ ہوتی، جس کی بڑی وجہ یہ ہو کہ مرض کے اصلی سبب کو نہیں پہچانایا گیا، اس لئے علاج کی مثال یہ ہو گئی کہ ۵

درہ بہست و دشمن اندر حسانہ بود

دولت بڑے سرمایہ داروں کی طرف سے ملنے کا پہلی سبب صرف سودی کاروبار اور قومی سرمایہ سے خاص خاص انسداد کی بے جانف اندوزی ہے، جب تک اسلام کی تعلیمات کے مطابق انکو بند نہ کیا جائے اور اس کاروبار نہ دیا جائے کہ ہر شخص صرف اپنے سرمایہ سے تجارت کرے اس وقت تک اس مرض کا علاج نہیں ہو سکتا۔

ایک شبہ اور اس کا جواب | اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بینکوں کے ذریعہ پوری قوم کا سرمایہ جمع ہو کر کچھ نہ کچھ فائدہ عوام کو بھی ملے، لیکن اگر بینکوں کی قلیل ہو اور بڑے سرمایہ داروں نے اس سے زیادہ فائدہ حاصل کر لیا ہو، لیکن اگر بینکوں میں سرمایہ جمع کرنے کا طریقہ نہ ہو تو اس کا نتیجہ وہی ہو گا جو پہلے زمانہ میں تھا کہ لوگوں کا سرمایہ دفتینوں اور خزیروں کی شکل میں زمین کے اندر رہ کر تاتھا، جس سے نہ ان کو فائدہ ہو گا نہ کسی دوسرے شخص کو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام نے جس طرح سود کو حرام قرار دے کر اس کا دروازہ بند کیا ہے کہ پوری قوم کی دولت سمٹ کر خاص خاص سرمایہ داروں میں محدود ہو جائے اسی طرح زکوٰۃ کا فریضہ سرمایہ کیس کی صورت میں عائد کر کے ہر مال دار کو اس پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے سرمایہ کو منجھد حالت میں نہ رکھے، بلکہ تجارت اور کاروبار میں لگائے، کیونکہ زکوٰۃ سرمایہ کیس کی صورت میں ہونے کی بنا پر اگر کوئی شخص اپنا روپیہ یا سونا چاندی دفتین کر کے رکھتا ہے تو ہر سال اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں نکلتے نکلتے سرمایہ فنا ہو جائے گا، اس لئے ہر سمجھدار انسان اس پر مجبور ہو گا کہ سرمایہ کو کام میں لگا کر اس سے فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو فائدہ پہنچائے، اور اسی نفع میں سے زکوٰۃ ادا کرے۔

فریضہ زکوٰۃ ایک حیثیت | اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ فریضہ زکوٰۃ ادا کرنے میں جیسے یہ عظیم الشان فائدہ مغیر ہے کہ قوم کے فقراء و مساکین کی ترقی کا ضامن ہے، درست کرنے کے لئے بھی یہ فریضہ تجارت کی ترغیب کا ایک بہترین ذریعہ ہے کیونکہ ہر انسان جب یہ دیکھے گا کہ نقد سرمایہ کو بند رکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ نفع تو کچھ ہوا نہیں، اور سال کے ختم پر چالیسواں حصہ کم ہو گیا، تو ضرور اس کو اس طرف توجہ کرنا پڑے گی کہ اس مال کو کسی تجارت پر لگائے، اور دوسری طرف چونکہ سود ہے، روپیہ چلانا حرام ٹھہرا تو تجارت کی یہ صورت نہ رہے گی، کہ لاکھوں انسانوں کے سرمایہ سے صرف ایک انسان تجارت کرے بلکہ ہر مالدار خود تجارت میں آنے کی فکر کرے گا، اور جب کہ بڑے سرمایہ دار بھی صرف اپنے

سرمایہ سے تجارت کرے گی تو چھوٹے سرمایہ داروں کو تجارت میں وہ مشکلات پیش نہ آئیں گی جو بینکوں سے سودی روپیہ لے کر بڑی تجارت چلانے کی صورت میں پیش آتی ہیں، اس طرح پورے ملک میں تجارت اور اس کے منافع عام ہوں گے، اور اس کے نتیجہ میں ملک کے غریب و فقراء کو فائدہ پہنچے گا۔

سودی روحانی بیماریاں | یہاں تک سود کی معاشی اور اقتصادی تباہ کاری کا ذکر تھا اب سنئے کہ سودی کاروبار انسان کے اخلاق اور روحانی کیفیات پر کیسے خراب اثرات ڈالتا ہے۔

۱۔ انسانی اخلاق میں سب سے بڑا جو ہر ایشیاء و سخاوت کا ہے کہ خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو راحت پہنچانے کا جذبہ ہو، سود کے کاروبار کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ جذبہ فنا ہو جاتا ہے، سود خور اپنے پاس سے کسی کو نفع پہنچانا تو کیا دوسرے کو اپنی کوشش اور اپنے سرمایہ سے اپنے برابر آنا نہیں دیکھ سکتا۔

۲۔ وہ مصیبت زدہ پر رحم کھانے کے بجائے اس کی مصیبت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی فکر میں رہتا ہے۔

۳۔ سود خوری کے نتیجہ میں مال کی حرص اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں مست ہو کر اپنے بھلے اور بڑے کو بھی نہیں پہچانتا، اس کے انجام بد سے بالکل غافل ہو جاتا ہے۔

کیا سود کے بغیر کوئی ارباب کی حقیقت اور اس کی دینی و دنیوی خرابیوں کا بیان کسی قدر تفصیل سے آچکا ہے، اب ہم سری تجارت میں چل سکتے؟ بحث یہ باقی ہو کر باقی معاشی اور روحانی خرابیاں اور قرآن و سنت میں اس کی شدید حرمت و ممانعت تو واضح ہو گئی، لیکن موجودہ دور میں جبکہ رہاں تجارت کا رکن اعظم بنا ہوا ہے، ساری دنیا کے کاروبار اسی پر چل رہے ہیں، اس سے نجات حاصل کرنے کی تدبیر کیا ہو؟ بینک سسٹم کو ترک کر دینا اس زمانہ میں گویا تجارت کو بند کر دینا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب کوئی مرض عام ہو کر رہاں کی صورت اختیار کر لے تو علاج معالجہ دشوار ضرور ہو جاتا ہے، لیکن بے کار نہیں ہوتا، اصلاح حال کی کوششیں انجام کار کامیاب ہوتی ہیں البتہ صبر و استقامت اور ہمت سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ اس کا یہ بھی ارشاد ہے:

مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۚ (۷۸: ۲۲) | یعنی اللہ تعالیٰ نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی سہی نہیں ڈالی ہے | اس لئے ضرور ہے کہ رہاں سے چہستاناب کا کوئی ایسا راستہ ضرور ہو گا جس میں معاشی اور

اقتصادی نقصان بھی نہ ہوا اندرونی اور بیرونی تجارت کے دروازے بھی بند نہ ہوں اور با سے نجات بھی ہو جائے۔

اس میں پہلی بات تو یہی ہے کہ بطلی نظر میں بینکنگ کے موجودہ اصول کو دیکھتے ہوئے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بینک سسٹم کا مدار ہی سود پر ہے، اس کے بغیر بینک چل ہی نہیں سکتے، لیکن یہ خیال قطعاً صحیح نہیں رہا کے بغیر بھی بینک سسٹم اسی طرح قائم رہ سکتا ہے، بلکہ اس سے بہتر اور نافع و مفید صورت میں آ سکتا ہے، البتہ اس کے لئے ضرورت ہو کہ کچھ حضرات ماہرین شریعت اور کچھ ماہرین بینک کے مشورہ اور تعاون سے اس کے اصول اور سر فو تجو یز کریں، تو کامیابی کچھ دور نہیں، اور جس دن بینک سسٹم شرعی اصول پر آگیا تو انشاء اللہ دنیا دیکھ لے گی کہ اس میں پوری قوم و ملت کی کیسی فلاح ہے، ان اصول و قواعد کی تشریح کا یہ موقع نہیں، جن کی بناء پر بینک سسٹم کو بغیر با کے چلایا جاسکتا ہے۔

ربا اور سود کی ایک ضرورت کچھ تجارتی اغراض کے لئے ہوتی ہے اس کا انتظام تو بینک کے موجودہ اصول میں ترمیم کے ذریعہ ہو جائے گا، اور دوسری ضرورت سود و ربا میں مبتلا ہونے کی فقیروما جہند لوگوں کی ہنگامی اور وقتی ضرورتیں ہوا کرتی ہیں، اس کا بہترین علاج اسلام میں پہلے سے بصورت زکوٰۃ و صدقات راجحہ موجود ہے، لیکن دین اور علم دین سے بیکری اور بے پردائی کا نتیجہ جو جس آجکل نظام زکوٰۃ بھی مدخل کر دیا ہو، بے شمار مسلمان ہیں جو نماز کی طرح زکوٰۃ کے پاس نہیں جاتے، اور جو لوگ نکالتے بھی ہیں ان میں اکثر بڑے سرمایہ والے حضرات حساب کر کے پوری زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، اور جو لوگ پوری زکوٰۃ نکالتے بھی ہیں تو وہ بس زکوٰۃ کا نکالنا ہی جانتے ہیں کہ اپنی جیب سے نکال دیں، حالانکہ حکیم الہی زکوٰۃ کے نکالنے کا نہیں، بلکہ ادا کرنے کا ہے اور ادا کرنا جب صحیح ہو سکتا ہے جب اس کے مستحقین کو پہنچا کر ان کو مالکا نہ قبضہ دیدیا جائے، اب غور کیجئے کہ ایسے مسلمان کتنے ہیں جو مستحقین کو تلاش کرنے کی فکر کریں، پھر ان کو پہنچانے کا اہتمام کریں، مسلمان قوم کتنی ہی کم سرمایہ سہی، لیکن اگر ہر مسلمان جس پر زکوٰۃ فرض ہے وہ زکوٰۃ پوری ادا کرے، اور ادا کرنے کا صحیح طریقہ اختیار کرے کہ مستحقین کو پہنچائے اور ادا کرنے کا اہتمام کرے، تو یقیناً کسی مسلمان کو اس کی ضرورت نہ ہے، کہ وہ قرض کی ضرورت سے سود و ربا میں مبتلا ہو، اور اگر شرعی قاعدہ کے مطابق

۱۵۰ احقر نے چند علماء کے مشورے سے سود و بیکاری کا مسودہ وضع ہوا کیا کر بھی دیا تھا اور بیکاری کے بعض ماہرین نے موجودہ دور میں قابل عمل قیلم بھی کر دیا تھا، اور بعض حضرات نے اس کو شروع بھی کرنا چاہا مگر ابھی تک عام نا جروں کی توجہ اس طوط ہوئی ہے سبب اور حکومت کی طرف اس کو منظور حال نہ ہونے کے سبب چل نہیں سکا، فانی مدظلہ العالی

اسلامی حکومت عادلہ بن جائے اور اس کے تحت شرعی ہیئت المال قائم ہو جائے، اور تمام مسلمانوں کے اموال ظاہر کی زکوٰۃ اس میں جمع ہوا کرے تو اس ہیئت المال سے ہر ایک ضرورت مند کی ضرورت پوری کی جاسکتی ہے، اور کسی بڑی رقم کی ضرورت پڑ جائے تو بطور قرض بھی بغیر سود کے دیا جاسکتا ہے، اور اس طرح بیکار پھرنے والوں کو چھوٹی و کانیں سر اگر یا کسی صنعت میں لگا کر بھی کام میں لگایا جاسکتا ہے، کسی یورپین ماہر نے صحیح کہا کہ مسلمانوں کا نظام زکوٰۃ ایسی چیز ہو کہ اگر مسلمان اس کے پابند ہو جائیں تو اس قوم میں کوئی مفلس اور مصیبت زدہ نظر نہ آئے۔

الغرض اس زمانے میں سود و ربا کے معاملات و با کی طرح پھیل جانے سے یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ موجودہ زمانہ میں سود کا کاروبار چھوڑ دینا معاش و اقتصادی خود کشی کے مراد ہے، اور اس زمانہ کا آدمی سودی کاروبار کرنے میں معذور ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ جب تک پوری قوم یا اس کی کوئی معتد بہ جماعت یا کوئی اسلامی حکومت پوری توجہ کے ساتھ اس کام کا ہتھ نہ کرے افراد و عادی کے لئے دشواری ضرور ہے، مگر معذور پھر بھی نہیں کہا جاسکتا۔

اس وقت ہمارے اس بیان کے دو مقصد ہیں، اول یہ کہ مسلمانوں کی جماعتیں اور حکومتیں جو اس کام کو صحیح طور پر کر سکتی ہیں اس طر متوجہ ہوں اور مسلمانوں کو بلکہ پوری دنیا کو سود کے مخوس اثرات سے نجات دلائیں۔

دوسرے یہ کہ کم از کم علم سب کا صحیح ہو جائے، مرض کو مرض تو سمجھنے لگیں، حرام کو حلال سمجھنے کا دوسرا گناہ جو پہلے گناہ سے زیادہ عظیم ہے، کم از کم اس کے تو مرتکب نہ ہوں علی گناہ میں کچھ نہ کچھ ظاہری فائدہ بھی ہے، لیکن یہ دوسرا علی اور عقیدہ کا گناہ کہ اس کو حلال ثابت کرنے کی کوشش کی جائے، پہلے سے عظیم تر بھی ہے، اور لغو و فضول بھی ہوگا سود کو حرام سمجھنے اور اپنے گناہ کا اعتراف کرنے میں تو کوئی مالی نقصان بھی نہیں ہوتا، کوئی تجارت بھی بند نہیں ہوتی، ہاں اعتراف جرم کا نتیجہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ کسی وقت توبہ کی توفیق ہو جانے سے اس سے بچنے کی تدبیر سوچیں۔

اس وقت اسی مقصد کے پیش نظر آخر میں چند روایات حدیث اور ارشاد است رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی پیش کرتا ہوں جو اپنی آیات قرآنی کا بیان ہے جن میں سود و ربا کی شدید ممانعت اور اس پر سخت عذاب کی وعیدیں آتی ہیں، تاکہ گناہ کے گناہ ہونے کا احساس تو پیدا ہو، اور اس سے بچنے کی فکر ہو، کم از کم یہ صورت تو نہ رہے کہ

اس حرام کو حلال بنا کر ایک گناہ کے دو گناہ بنالیں، اور بڑے بڑے صالح و نیک مسلمان جو رات کو ہتھکڑیاں ڈال کر اللہ میں گزاریں صبح جب مکان یا کارخانہ میں پہنچیں تو انہیں یہ خیال بھی نہ آئے کہ ہم سود و قمار کے معاملات میں مبتلا ہو کر کچھ گناہ کر رہے ہیں۔

سود کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات

① رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سات ہلک چیزوں سے بچو! صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا، ایک اللہ تعالیٰ کے ساتھ دعائت میں یا اس کی مخصوص صفات میں، کسی غیر اللہ کو شریک کرنا، دوسرے چاد کرنا، تیسرے کسی شخص کو ناحق قتل کرنا، چوتھے سود کھانا، پانچویں یتیم کا مال کھانا، چھٹے جہاد کے وقت میدان سے بھاگنا، ساتویں کسی پاک دامن عورت پر ہمت باندھنا (یہ حدیث صحیح بخاری اور مسلم میں ہے)

② رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے کج رات دو شخصوں کو دیکھا جو میرے پاس آئے، اور مجھے بیت المقدس تک لے گئے، پھر ہم آگے چلے تو ایک خون کی ہنردیکھی جس کے اندر ایک آدمی کھڑا ہوا ہے، اور دوسرا آدمی اس کے کنارہ پر کھڑا ہوا ہے جب یہ ہنر والا آدمی اس سے باہر آنا چاہتا ہے تو کنارہ والا آدمی اس کے منہ پر تھماتا ہے، جس کی چوٹ سے بھاگ کر پھر وہ وہیں چلا جاتا ہے جہاں کھڑا تھا، پھر وہ بکھلے کا ارادہ کرتا ہے، تو پھر یہ کنارہ والا آدمی بھی معاملہ کرتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ان دونوں ساتھیوں سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے جو میں دیکھ رہا ہوں؟ انھوں نے بتلایا کہ خون کی ہنر میں قید کیا ہوا آدمی سود کھانے والا اپنے منہ کی سزا پا رہا ہے (یہ حدیث صحیح بخاری کتاب البیوع میں ہے)

③ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود لینے والے پر بھی لعنت فرمائی، اور سود دینے والے پر بھی، اور بعض روایات میں سودی معاملہ پر گواہی دینے والے اور اس کا دلیقہ لکھنے والے پر بھی لعنت آتی ہے۔

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں فرمایا کہ یہ سب گناہ میں برابر ہیں، اور بعض روایات میں شاہد کا تب پر لعنت اس صورت میں ہے جبکہ ان کو اس کا علم ہو کہ یہ سود کا معاملہ ہے۔

④ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ چار آدمی ایسے ہیں کہ ان کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ ان کو جنت میں نہ داخل کرے، اور جنت کی نعمت

نہ پہنچنے دے، وہ چار یہ ہیں، شراب پیئے کا عادی اور سود کھانے والا اور یتیم کا مال ناحق کھانے والا اور اپنے والدین کی نافرمانی کرنے والا۔ (یہ روایت مستدرک حاکم میں ہے)

⑤ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی جو سود کا ایک درہم کھاتا ہے وہ پچیس مرتبہ بدکاری کرنے سے زیادہ سخت گناہ ہے، اور بعض روایات میں ہے کہ جو گوشت مال حرام سے بنا ہو اس کے لئے آگ ہی زیادہ مستحق ہے، اسی کے ساتھ بعض روایات میں ہے کہ کسی ملّا کی آبروریزی سود سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے۔ (یہ روایت مسند احمد طبرانی وغیرہ میں ہے)

⑥ اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ محل کو قابل استعمال ہونے سے پہلے فروخت کیا جائے، اور نہ فرمایا کہ جب کسی بستی میں بدکاری اور سود کا کاروبار پھیل جائے تو اس نے اللہ تعالیٰ کے عذاب کو اپنے اوپر دعوت دیدی۔ (یہ روایت مستدرک حاکم میں ہے)

⑦ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی قوم میں سود کے لین دین کا رواج ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ان پر ضرور ریاست کی گرائی مسلط کر دیتا ہے، اور جب کسی قوم میں رشوت عام ہو جائے تو دشمنوں کا وعقب غلبہ ان پر ہو جاتا ہے (یہ روایت مسند احمد میں ہے)

⑧ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب معراج میں جب ہم ساتویں آسمان پر پہنچے تو میں نے اپنے اوپر عدد برقی کو دیکھا، اس کے بعد ہم ایک ایسی قوم پر گزرے جن کے پیٹ رہائشی مکانات کی طرح پھولے اور پھیلے ہوئے ہیں، جن میں سانپ بھرے ہیں جو باہر سے نظر آ رہے ہیں، میں نے جبرئیل امین سے پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ یہ سود خور ہیں (یہ روایت مسند احمد کی ہے)

⑨ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت بن مالکؓ سے فرمایا کہ ان گناہوں سے بچو جو معاف نہیں کئے جاتے، ان میں سے ایک مال غنیمت کی چوری ہے، اور دوسرے سود کھانا اور طہرائی

⑩ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو تم نے قرض دیا ہو اس کا ہدیہ بھی قبول نہ کرو (ایسا نہ ہو اس نے ہدیہ قرض کے عوض میں دیا ہو، جو سود ہے، اس لئے اس کے ہدیہ قبول کرنے سے بھی احتیاط چاہئے)

رباہ کی تعریف اور اس کی حقیقت اور اس کی دیوبی تباہ کاری کے متعلق قرآن مجید کی سات آیتیں اور احادیث نبویہ کے دس ارشادات اس جگہ بیان ہو چکے ہیں، سوچئے سمجھئے والے مسلمان کیلئے اتنا کافی ہے، اور اس مسئلے کے باقی ماندہ پہلوؤں پر بحث اور مکمل تحقیق کے لئے احقر کی ایک مستقل کتاب بنام (مسئلہ سود) شائع ہو چکی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَّيْتُمْ بِدِينٍ إِلَى آخِلٍ مِمَّنْ فَاتَّبِعُوهُ
 اے ایمان والو جب تم آپس میں معاملہ کرو اور کسی وقت مقرر تک تو اس کو کلمہ پیا کرو
 وَلْيَكْتَسِبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ مِمَّا
 اور چاہئے کہ کلمہ دے بہادر درمیان کوئی لکھنے والا انصاف اور انکار نہ کرے لکھنے والا اس سے کہ کلمہ دیوے جیسا
 عَلَّمَهُ اللَّهُ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ
 سکھایا اسکا اللہ نے سوا سکو چاہئے کہ کلمہ دے اور بتلا جائدہ شخص کہ جس پر قرض ہو اور ڈرے اللہ سے جو اس کا رب ہے
 وَلَا يَخْشَ مِنْهُ شَيْئًا فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ
 اور کم نہ کرے اس میں سے کچھ بھر اگر وہ شخص کہ جس پر قرض ہو بے عقل ہے یا ضعیف ہے یا
 لَا يَسْطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ
 آپ نہیں بتلا سکتا تو بتلا دے کار گزار اس کا انصاف اور گواہ کرد دو شاہد اپنے
 مِنْ بَرِّ جَالِكُمُ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتٌ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ
 مردوں میں سے بھر اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے کہ جس کو تم پسند
 مِنَ الشَّهَادَةِ فَإِنْ أُضِلَّ أَحَدُهُمَا فَتَدْرِكْهُ الْآخَرَةُ وَالَّذِي
 کرنے ہو گواہوں میں تاکہ اگر بھول جائے ایک ان میں سے تو یاد دلاوے اس کو دوسری اور انکار
 يَأْبَ الشَّهَادَةَ إِذَا مَادَّعَوْاهُ وَلَا تَسْمَعُوا أَنْ تَكْتُبُوا صَغِيرًا أَوْ
 نہ کریں گواہ جس وقت بتلاوے جادیں اور کالی نہ کر داس کے لکھنے سے چوٹا ہو معاملہ یا
 كَبِيرًا إِلَى آخِلِهِ ذَلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَى
 بڑا اس کی بیعت تک اس میں پورا انصاف ہے اللہ کے نزدیک اور بہت درست رکھنے والا ہر گواہی کو
 الْأَقْرَبُ تَابُوا إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُهَا بَيْنَكُمْ
 اور نزدیک ہر کہ شہر میں نہ چڑھ کر سودا ہو انھوں ہاتھ لینے دیتے ہو اس کو آپس میں تو ہم پر
 فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا وَأَشْهَدُوا إِذَا أَتَا بِعَثَمٍ
 کچھ گناہ نہیں اگر اس کو نہ لکھو اور گواہ کر لیا کرو جب تم سودا کرو

وَلَا يُضَارَسَ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ وَإِنْ تَفَعَّلُوا فَإِنَّهُ شَوْقٌ بِكُمْ
 اور نقصان نہ کرے لکھنے والا اور نہ گواہ اور اگر ایسا کر تو یہ گناہ کی بات ہے تمہارے اندر
 وَاتَّقُوا اللَّهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۳۹﴾ وَإِنْ كُنْتُمْ
 اور ڈرتے ہو اللہ سے اور اللہ تم کو سکھلاتا ہے اور اللہ ہر ایک چیز کو جانتا ہے اور اگر تم
 عَلَى سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهْنِ مَقْبُوضَةً فَإِنْ آمَنْتُمْ بِبَعْضِ
 سفر میں ہو اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو گروہ ہاتھ میں رکھنی چاہئے پھر اگر اعتبار کرے ایک دوسرے
 بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي فِي أَيْمَانِهِ أَمَانَتَهُ وَلْيَسْتَقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا تَكْتُمُوا
 کا تو چاہئے کہ پورا کرے وہ شخص کہ جس پر اعتبار کیا اپنی امانت کو اور نہ ڈرے اللہ سے جو اس کا رب ہے
 الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿۴۰﴾
 گواہی کو اور جو شخص اس کو چھپا دے تو بے شک گنہگار ہو دل اس کا اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب جانتا ہے

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو جب معاملہ کرنے لگو اور ہار کا رخوہ دام اوہار ہوں یا جو چیز خریدنا ہے
 دو ادھار ہو جیسے بیع سلم میں ایک میعاد معین تک (کے لئے) تو اس کی یادداشت و دستاویز
 کو لکھ لیا کرو اور یہ ضرور ہے کہ تمہارے آپس میں (جو کوئی لکھنے والا ہو وہ) انصاف کے ساتھ
 لکھے یعنی کسی کی رعایت کر کے مضمون میں کی بیٹی نہ کرے اور لکھنے والا لکھنے سے انکار بھی نہ کرے
 جیسا کہ خدا نے اس کو دکھانا سکھایا ہے اس کو چاہئے کہ لکھ دیا کرے اور (کاتب کو) وہ شخص
 (بتلاوے اور) لکھو دے جس کے ذمہ وہ حق واجب ہو کہ ذمہ نہ دستاویز کا حاصل اقرار حق کا ہوتا
 ہے تو جس کے ذمہ حق ہے اسی کا اقرار ضرور ٹھہرا اور (لکھاتے وقت) اللہ تعالیٰ سے جو اس کا
 پروردگار ہے ڈرتا رہے اور اس (حق) میں سے ذرہ برابر (بتلانے میں) کی نہ کرے پھر جس شخص کے
 ذمہ حق واجب تھا وہ اگر ضعیف العقل یعنی معترہ یا مجنون ہو یا ضعیف البدن یعنی نابالغ یا
 پیر فرقت ہو یا (اور کسی اتفاقی امر سے) خود ریمان کرنے کی اور) لکھانے کی قدرت نہ رکھتا ہو
 مثلاً گڑبگاہے اور لکھنے والا اس کا اشارہ نہیں سمجھتا یا مثلاً دوسرے مالک کا رہنے والا ہو اور
 زبان غیر رکھتا ہے اور لکھنے والا اس کی بولی نہیں سمجھتا تو (ایسی حالت میں) اس کا کارکن

ٹھیک ٹھیک طور پر لکھوائے اور دو شخصوں کو اپنے مردوں میں سے گواہ (بھی) کر لیا کہ درود شرعی اصل دار ثبوت دعویٰ کا یہی گواہ ہیں گو دستاویز نہ ہو اور خالی دستاویز بدو گواہوں کے لیے معاملات میں حجت اور معتبر نہیں دستاویز بکھنا صرف یادداشت کی آسانی کے لیے ہے کہ اس کا مضمون دیکھ کر اور منکر طبعی طور پر اکثر تمام واقعہ یاد آجاتا ہے جیسا عنقریب قرآن ہی میں آتا ہے) پھر اگر وہ دو گواہ مرد (میسٹر) نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں (گواہ بنائی جائیں) ایسے گواہوں میں سے جن کو تم (ان کے معتبر ہونے کی وجہ سے) پسند کرتے ہو (اور ایک مرد کی جگہ دو عورتیں اس لیے تجویز کی گئیں) تاکہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی ایک بھی (شہادت کے کسی حصہ کو خواہ وہ سے یا شہادت کے وقت بیان کرنے سے) بھول جائے تو ایک دوسری کو یاد دلا دے اور یاد دلانے کے بعد شہادت کا مضمون مکمل ہو جائے اور گواہ بھی انکار نہ کیا کریں جب (گواہ بننے کے لیے) بلا کر جایا کریں کہ اس میں اعانت ہے اپنے بھائی کی (اور تم اس (دین) کے (بار بار) لکھنے سے آگستا مست کرو خواہ وہ (معاملہ دین کا) چھوٹا ہو یا بڑا ہو) یہ تمھارے انصاف کا زیادہ قائم رکھنے والا ہے اللہ کے نزدیک اور شہادت کا زیادہ درست رکھنے والا ہے اور زیادہ سزا دار ہے اس بات کا کہ تم (معاملہ کے متعلق) کسی شبہ میں نہ پڑو (اس لئے تمھاری پسینا اچھلے) مگر یہ کہ کوئی سودا دست بدست ہو جس کو باہم لیتے دیتے ہو تو اس کے نہ لکھنے میں تم پر کوئی الزام (اور معذرت) نہیں اور راتنا اس میں بھی ضرور کیا کرو کہ اس کے خرید و فروخت کے وقت گواہ کر لیا کرو (شاید کل کو کوئی بات نکل آئے مثلاً بائع کہنے لگے کہ مجھ کو دام ہی وصول نہیں ہوئے یا یہ چیز میں نے فروخت ہی نہیں کی یا مشتری کہنے لگے کہ میں نے تو واپسی کا اختیار بھی لے لیا تھا یا ابھی تو بیچ پوری میرے پاس نہیں پہنچی) اور جس طرح ہم نے اوپر کاتب اور گواہ کو منع کیا ہے کہ کتابت اور شہادت سے انکار نہ کریں اسی طرح ہم تم کو بھی تاکید کرتے ہیں کہ تمھاری طرف سے کسی کاتب کو تکلیف نہ دی جائے اور نہ کسی گواہ کو (مثلاً اپنی مصلحت کے لئے ان کی کسی مصلحت میں خلل ڈالاجائے) اور اگر تم ایسا کر دو گے تو اس میں تم کو گناہ ہوگا اور خدا تعالیٰ سے ڈرو (اور جن کاموں سے اس نے منع کیا ہے وہ مت کرو) اور اللہ تعالیٰ (کا تم پر احسان ہے کہ تم کو (احکام مفیدہ کی) تعلیم فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں کے جانتے والے ہیں تو وہ مطیع اور عاصی کو بھی جانتے ہیں ہر ایک کو مناسب جزا دیں گے) اور اگر تم (دین کا معاملہ کرانے کے وقت) کہیں سفر میں ہو اور (دستاویز لکھنے کے واسطے وہاں) کوئی کاتب نہ پاؤ (سو ایسی حالت میں اطمینان کا ذریعہ) دین رکھنے کی چیزیں (ہیں) جو (دیون کی طرف سے) صحیح حق کے قبضہ میں دیدی جائیں اور اگر (ایسے وقت میں بھی) ایک دوسرے کا اعتبار کرتا ہو

(اور اس لئے دین کی ضرورت نہ سمجھے) تو جس شخص کا اعتبار کر لیا گیا ہے (یعنی دیون) اس کو چاہئے کہ دوسرے کا حق (پرورا) ادا کر دے اور اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرے (اور اس کا حق نہ مارے) اور شہادت کا اخفاء مت کرو اور جو شخص اس کا اخفاء کرے گا اس کا قلب گنہگار ہوگا اور اللہ تعالیٰ تمھارے کئے ہوئے کاموں کو خوب جانتے ہیں (سو اگر کوئی اخفاء کرے گا اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ضرور ہے سو وہ سزا دیں گے)۔

معارف و مسائل

قرض اور ادھار کے لئے اقرار نامہ | آیات مذکورہ میں قانون معاملات جن کو آجکل کے قانون لکھنے کی ہدایت اور متعلقہ احکام میں معاہدات کہا جاتا ہے اس کے اہم اصول کا بیان ہے اور اس کے بعد ضابطہ شہادت کے خاص اصول کا ذکر ہے۔

آجکل تو زمانہ لکھنے لکھانے کا ہے اور تحریر ہی انسان کی زبان کی قائم مقام بن گئی ہے لیکن آپ چودہ سو سال پہلے زمانہ کی طرف مڑ کر دیکھتے تو اس وقت دنیا کا سب کاروبار صرف زبانی ہوتا تھا، لکھنے لکھانے اور دستاویز بنایا کرنے کا اصول نہ تھا، سب پہلے قرآن نے اس طرف توجہ دلائی اور منسرا یا۔

إِذَا شَأْنُكُمْ مَعَهُ يَوْمَ آتِجِلْ شَيْئُكُمْ فَاتَّبِعُوهُ، یعنی جب تم آپس میں ادھار کا معاملہ کیا کرو کسی معین مدت کے لئے تو اس کو لکھ لیا کرو۔ اس میں ایک اصول تو یہ بتلا دیا کہ ادھار کے معاملات کی دستاویز لکھنی چاہئے، تاکہ بھول چوک یا انکار کے وقت کام آئے۔

دوسرا مسئلہ یہ بیان منسرا یا گیا کہ ادھار کا معاملہ جب کیا جائے تو اس کی میعاد ضرور مقرر کی جائے، طبع معین مدت کے لئے ادھار دینا لینا جائز نہیں، کیونکہ اس سے جھگڑے فساد کا دروازہ کھلتا ہے، اسی وجہ سے فقہاء نے فرمایا کہ میعاد بھی ایسی معسر ہونا چاہئے جس میں کوئی ابھام نہ ہو، حینہ اور تاریخ کے ساتھ معین کی جائے، کوئی مبہم میعاد نہ رکھیں، جیسے کہیتی کھٹے کے وقت، کیونکہ وہ موسم کے اختلاف سے آگے پیچھے ہو سکتا ہے، اور چونکہ لکھنا اس زمانے میں عام نہ تھا، اور آج بھی عام ہونے کے بعد دنیا کی بیشتر آبادی دیہی ہے جو لکھنا نہیں جانتی تو یہ ممکن تھا کہ لکھنے والا کچھ کا کچھ لکھ دے جس سے کسی کا نفع اور کسی کا نقصان ہو جائے، اس لئے اس کے بعد ارشاد فرمایا۔

وَلَا تَكْتُمُوكُمْ كَاتِبُكُمْ بِالْعَدْلِ، یعنی یہ ضروری ہے کہ تمھارے درمیان کوئی لکھنے

والا انصاف کے ساتھ لکھے۔

اس میں ایک تو اس طرف ہدایت کی گئی کہ کاتب کسی فریق کا مخصوص آدمی نہ ہو، بلکہ غیر جانبدار ہو، تاکہ کسی کو شبہ اور غلبان نہ رہے، دوسرے کاتب کو ہدایت کی گئی کہ انصاف کے ساتھ لکھے، دوسرے کے فانی نفع کے لئے اپنا دائمی نقصان نہ کرے، اس کے بعد کاتب کو اس کی ہدایت کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ ہنر دیا ہے کہ وہ کچھ لکھ سکے ہے اس کا شکر ادا یہ ہے کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے۔

اس کے بعد یہ بتلایا گیا کہ دستاویز کی کتابت کس کی طرف سے ہو تو فرمایا: **وَلْيَشْهَدْ الشَّاهِدَانِ عَلَى الْكُتَّابِ**، یعنی لکھوادے وہ آدمی جس کے ذمہ حق ہے، مثلاً سزا خریدا اور قیمت کا ادھار کیا تو جس شخص کے ذمہ ادھار ہے وہ دستاویز کا مضمون لکھوانے کیونکہ یہ اس کی طرف سے اقرار نامہ ہوگا، اور لکھوانے میں بھی یہ احتمال تھا کہ کوئی کمی بیشی کر دے، اس لئے فرمایا: **وَلْيَشْهَدْ الشَّاهِدَانِ عَلَى الْكُتَّابِ**، یعنی اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرتا ہے اور حق کے لکھوانے میں ذرہ برابر کمی نہ کرے، معاملات میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس شخص پر حق ماند ہو وہ خیف لعل یا سٹھیا ہوا بوڑھا یا نابالغ بچہ یا گولٹا ہو یا کوئی دوسری زبان بولنے والا ہو جس کو کاتب نہیں سمجھتا، اس لئے دستاویز لکھوانے پر اس کو قدرت نہیں ہوتی اس لئے اس کے بعد فرمایا کہ اگر ایسی صورت پیش آئے تو ان کی طرف سے ان کا دلی لکھوادے مجنون اور نابالغ کی طرف سے تو دلی کا ہونا ظاہر ہے کہ ان کے سامنے معاملات دلی ہی کی معرفت ہوا کرتے ہیں، اور اگر کچھ یاد دوسری زبان بولنے والے کا دلی بھی یہ کام کر سکتا ہے، اور اگر وہ کسی کو اپنا وکیل بنائے تو بھی ہو سکتا ہے، قرآن میں اس جگہ لفظ دلی دونوں معنی پر حاوی ہے۔

ضابطہ شہادت کے یہاں تک معاملات میں دستاویز لکھنے اور لکھوانے کے اہم اصول کا بیان چنانچہ اہم اصول تھا آگے یہ بتلایا گیا کہ دستاویز کی صورت تحریر کو کافی نہ سمجھیں، بلکہ اس پر گواہ بھی بنالیں کہ اگر کسی وقت باہمی نزاع پیش آجائے تو عدالت میں ان گواہوں کی گواہی سے فیصلہ ہو سکے، یہی وجہ ہے کہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ محض تحریر حجت شرعی نہیں جب تک کہ اس پر شہادت شرعی موجود نہ ہو خالی تحریر پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، آجکل کی عام عدالتوں کا بھی یہی دستور ہے کہ تحریر پر زبانی تصدیق و شہادت کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر رہیں۔

گواہی کیلئے دو مرد یا ایک مرد اس کے بعد ضابطہ شہادت کے چند اہم اصول بتلائے گئے، مثلاً (۱) گواہ دو مرد یا ایک مرد و دو عورتیں ہونا ضروری ہیں، ایک

اکیلہ مرد یا عورت دو عورتیں عام معاملات کی گواہی کے لئے کافی نہیں۔

گواہوں کی شرائط (۱) دوسرے یہ کہ گواہ مسلمان ہوں، لفظ میں ترجمان میں اس کی طرف ہدایت کی گئی ہے (۲) دوسرے یہ کہ گواہ ثقہ اور عادل ہوں جن کے قول پر اعتماد کیا جاسکے، فاسق و فاجر نہ ہوں، **وَالشَّاهِدَانِ مِنَ الشُّعْبَةِ** آج میں یہ حکم مذکور ہے۔

گواہی دینے سے بعد مذکورہ شرائط اس کے بعد لوگوں کو یہ ہدایت کی گئی کہ جب ان کو کسی معاملہ میں گواہ انکار کرنا گناہ ہے بنانے کے لئے بلایا جائے تو وہ آنے سے انکار نہ کریں، کیونکہ شہادت

ہی احیائے حق کا ذریعہ اور جھگڑے چکانے کا طریقہ ہے، اس لئے اس کو اہم قومی خدمت سمجھ کر تکلیف برداشت کریں، اس کے بعد پھر معاملات کی دستاویز لکھنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا سب کو لکھنا چاہئے، اس میں اکٹا میں نہیں، کیونکہ معاملات کا قلمبند کر لینا انصاف کو قائم رکھنے اور صحیح شہادت دینے اور شک و شبہ سے بچنے کے لئے بہترین ذریعہ ہے، ہاں اگر کوئی معاملہ دست بدست ہوا دھار نہ ہو اس کو اگر نہ لکھیں تب بھی کچھ حرج نہیں مگر اتنا اس میں بھی کیا جائے کہ معاملہ پر گواہ بنالیں کہ شاید کسی وقت فریقین میں کوئی نزاع و اختلاف پیش آجائے، مثلاً بائع کہے کہ قیمت وصول نہیں ہوئی، یا مشتری کہے کہ مجھے بیع پوری وصول نہیں ہوئی، تو اس جھگڑے کے فیصلہ میں شہادت کام آئے گی۔

اسلام میں صلہ و انصاف قائم کرنے کا اہم اصول آیت کے شروع میں لکھنے والوں کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ لکھنے یا شہادت دینے سے

انکار نہ کریں، تو یہاں یہ احتمال تھا کہ لوگ ان کو پریشان کریں گے، اس لئے آخر آیت میں فرمایا **وَلَا يَعْصُوا مَا يَأْمُرُونَ**، یعنی کسی لکھنے والے یا گواہی دینے والے کو نقصان نہ پہنچایا جائے، یعنی ایسا نہ کریں کہ اپنی مصلحت اور فائدہ کے لئے ان کی مصلحت اور فائدہ میں خلل ڈالیں پھر فرمایا **وَأَن تَقُولُوا نَحْنُ قَدْ كَتَبْنَا**، یعنی اگر تم نے لکھنے والے یا گواہ کو نقصان پہنچایا تو اس میں تم کو گناہ ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ لکھنے والے یا گواہ کو نقصان پہنچانا حرام ہے، اسی لئے فقہائے فرمایا کہ اگر لکھنے والا اپنے لکھنے کی مزدوری مانگے یا گواہ اپنی آمد و رفت کا ضروری خرچ طلب کرے تو یہ اس کا حق ہے، اس کو ادا نہ کرنا بھی اس کو نقصان پہنچانے میں داخل اور ناجائز ہے، اسلام نے اپنے نظام عدالت میں جس طرح گواہ کو گواہی دینے پر مجبور کیا ہے اور گواہی چھپانے کو سخت گناہ قرار دیا ہے، اس طرح اس کا بھی انتظام کیا کہ لوگ گواہی سے بچنے پر مجبور نہ ہو جائیں، اسی دو طرفہ احتیاط کا یہ اثر تھا کہ ہر معاملہ میں سچے بے غرض گواہ

دل جاتے اور فیصلے جلد اور آسان حق کے مطابق ہو جاتے آج کی دنیا نے اس مسترانی اصول کو نظر انداز کر دیا ہے تو سارا نظام عدالت برباد ہو گیا، واقعہ کے اصل اور سچے گواہ ملنا تقریباً مغفور ہو گیا ہر شخص گواہی سے جان چرانے پر مجبور ہو گیا، وجہ یہ کہ جس کا نام گواہی میں آ گیا اگر معاملہ پولیس اور فوجداری کا ہے تو روز وقت بے وقت تھانیدار صاحب اس کو بلا بھیجے ہیں، اور بعض اوقات گھنٹوں بٹھاسے رکھتے ہیں، دیوانی عدالتوں میں بھی گواہ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جاتا ہے جیسے یہ کوئی مجرم ہے، پھر روز روز مقدمہ کی پیشیاں بدلتی ہیں، تاریخیں لگتی ہیں، گواہ بچارہ اپنا کاروبار اور مزدوری اور ضروریات چھوڑ کر آنے پر مجبور ہو، ورنہ وارنٹ کے ذریعہ گرفتار کیا جاتا اس لئے کوئی شریف کاروباری آدمی کسی معاملہ کا گواہ بننا اپنے لئے ایک مذبذب سمجھے اور مقدمہ اس سے بچنے پر مجبور کر دیا گیا، صرف پیشہ ور گواہ ملتے ہیں، جن کے ہاں جھوٹ سچ میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا، مسترآن حکیم نے ان بنیادی ضروریات کو اہمیت کے ساتھ بتلا کر ان تمام خرابیوں کا انسداد فرمایا، آیت کے آخر میں ارشاد ہے: **وَاتَّقُوا اللَّهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ** یعنی ڈرو اللہ سے، اور اللہ تعالیٰ تمہیں اصول صحیح کی تعلیم دیتا ہے (یہ اس کا احسان ہے) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے، چونکہ اس آیت میں بہت سے احکام آئے ہیں، بعض فقہاء نے میں اہم مسائل فقہی اس آیت سے نکالے ہیں، اور مسترآن کریم کی عام عادت یہ کہ قانون بیان کرنے سے آگے اور پیچھے خوب خدا اور خوب روز جزاء دلا کر لوگوں کے ذہنوں کو تعمیل حکم کے لئے آمادہ کرتا ہے، اسی طریقہ کے مطابق اس آیت کا خاتمہ خوب خداوندی پر کیا اور یہ بتلایا کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی جیسز نہیں ہوتی نہیں، اگر تم کسی ناجائز حیلہ سے بھی کوئی خلافت ورزی کرو گے تو خدا کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔

دوسری آیت میں دو اہم مضمون بیان فرمائے گئے، ایک یہ کہ اُدھار کے معاملہ میں اگر کوئی یہ چاہے کہ اعناد کے لئے کوئی جیسز گردی رکھ لے تو اس کی بھی اجازت ہے، مگر اس میں لفظ مقبوضۃ سے اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ شے مرہون سے قلع اٹھانا اس کے لئے جائز نہیں، مگر جس کو صرف اتنا حق ہے کہ اپنے قرض وصول ہونے تک اس کی چیز پر اپنا قبضہ رکھے، اور منافع اس کے وہ سب اصل مالک کا حق ہیں۔

دوسرا مضمون یہ ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو کسی نزاعی معاملہ کا صحیح علم ہو وہ شہادت کو نہ چھپائے، اور اگر اس نے چھپایا تو اس کا دل گہنگار ہے، دل کو اس لئے گہنگار فرمایا کہ کوئی شخص اس کو خالی زبان ہی کا گناہ نہ سمجھے کیونکہ اقل ارادہ تو دل ہی سے ہوا ہے، اس لئے اول گناہ دل ہی کا ہے۔

۴۴

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَفِي الْاَرْضِ وَانْ تَبَدَّلْ مَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ

اللہ ہی کا ہے جو کہہ کہ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اگر ظاہر کرو گے اپنے جی کی بات

اَوْ تَخْفَوْا يَحْسِبْكُمُ اللّٰهُ فَيَخْفٰى عَنْ يُّسَاءٍ وَيَعْنَبُ مَنْ

یا چھپاؤ گے اس کو حساب لے گا اس کا تم سے اللہ پھر بچنے کا جس کو چاہے اور مذبذب کرے گا جس کو

يُّسَاءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

چاہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

خلاصہ تفسیر

اللہ ہی کی ملک میں ہیں سب (مخلوقات) جو کہہ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں، (جیسے خود زمین و آسمان بھی اسی کی ملک میں ہیں) اور جب وہ مالک ہیں تو ان کو اپنی مالک و اشیاء میں ہر طرح قانون بنانے کا حق ہے، اس میں کسی کو مجال کلام نہ ہونی چاہئے، جیسا کہ ایک قانون یہ ہے کہ، جو باتیں عقائد فاسدہ یا اخلاقی مذمومہ یا گناہوں پر بچنے عزم و ارادہ کی، تمہارے نفسوں میں ہیں ان کو اگر تم زبان و جوارح سے ظاہر کرو گے مثلاً زبان سے کلمہ کفر کہہ دیا یا اپنے بکبر، حسد وغیرہ کا خرد اظہار کر دیا یا کسی گناہ جس کا قصد تھا اس کو کفر ہی ڈالا، یا کہ (دل ہی میں) پوشیدہ رکھو گے (دونوں حالتوں میں) حق تعالیٰ تم سے (مثل دوسرے معاصی کے آن کا) حساب لیں گے پھر (حساب لینے کے بعد پھر کفر و شرک کے) جس کے لئے (بخشنا) منظور ہوگا بخش دیں گے اور جس کو سزا دینا، منظور ہوگا سزا دیں گے اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں شہادت کے اہلکار کا حکم اور چھپانے کی ممانعت مذکور تھی یہ آیت بھی اسی مضمون کا تکرار ہے۔ انسان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ شہادت کا چھپانا حرام ہے، اگر تم نے معاملہ کو جاننے ہوئے چھپایا تو رب علیم و خبیر تم سے اس کا حساب لے گا، حضرت ابن عباسؓ، عکرمہؓ، شعبیؓ اور مجاہدؓ سے یہی تفسیر منقول ہے (قرطبی)

اور علوم الفاظ کے اعتبار سے عام ہے، اور تمام اعتقادات، عبادات اور معاملات کو شامل ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا مشہور قول اس آیت کی تفسیر میں بھی ہے اور معنی آیت

کے یہ ہیں کہ حق تعالیٰ اپنی مخلوق کے تمام اعمال کا محاسبہ فرمائیں گے، وہ عمل بھی جس کو وہ کر گزرے ہیں اور وہ بھی جن کا دل سے بچتہ ارادہ کر لیا، اور اس کو دل میں چھپا کر رکھا، مگر عمل کی توبہ نہیں آئی، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں بروایت حضرت ابن عمر منقول ہے، کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ مومن قیامت کے روز اپنے رب سے رعب و عجب و عظمیٰ سے قریب کیا جائے گا یہاں تک کہ حق تعالیٰ اس کے ایک ایک گناہ کو یاد دلائیں گے، اور سوال کریں گے کہ تو جانتا ہے کہ تو نے یہ گناہ کیا تھا، بندہ مومن اقرار کرے گا، حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے دنیا میں بھی تیری پردہ پوشی کی، اور تیرا گناہ لوگوں میں ظاہر نہیں ہونے دیا، اور میں آج اس کو معاف کرتا ہوں، اور حسنات کا اعمال نامہ اس کو دیدیا جائے گا، لیکن کفار اور منافقین کے گناہوں کو جمع نام میں بیان کیا جائے گا۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا کہ یہ وہ دن ہے جس میں پرشیدہ چیزوں کا جائزہ لیا جائے گا، اور دلوں کے پرشیدہ راز کھولے جائیں گے، اور یہ کہ میرے کاتب اعمال فرشتوں نے تو تمہارے صریح وہ اعمال لکھے ہیں جو ظاہر تھے، اور میں اُن چیزوں کو بھی جانتا ہوں جن پر فرشتوں کو اطلاع نہیں، اور نہ انھوں نے وہ چیزیں تمہارے نامہ اعمال میں لکھی ہیں، اور اب وہ سب تمہیں بتلاتا ہوں، اور ان پر محاسبہ کرتا ہوں، پھر جس کو چاہوں گا بخش دوں گا اور جس کو چاہوں گا عذاب دوں گا، پھر مومنین کو معاف کر دیا جائے گا اور کفار کو عذاب دیا جائے گا۔ (قرطبی)

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:-

إِنَّ اللَّهَ حَيَّ وَرَعْنُ أَعْيُنِي عَمَّا

خَفَتْ أَنْفُسُهُمَا مَا لَمْ يَكُنْ مَرُورًا

أَوْ يَحْتَمِلُ رَايَهُ (قرطبی)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دل کے ارادہ پر کوئی عذاب و عتاب نہیں، اور تمام قرطبی نے دیا کہ یہ حدیث احکام دنیا کے متعلق ہے، طلاق، حلق، تیغ، ہتھکڑیاں، وغیرہ جہنم میں ارادہ کرنے سے منع نہیں ہو جاتے، جب تک اُن کو زبان سے یا عمل سے نہ کیا جائے، اور آیت میں جو کچھ مذکور ہے وہ احکام آخرت سے متعلق ہے، اس لئے کوئی تناقض نہیں، اور دوسرے حضرات علماء نے اس شبہ کا جواب یہ دیا ہے کہ جس حدیث میں دل کی چھپی ہوئی چیزوں کی معافی مذکور ہے اس سے مراد وہ وساوس اور غیر اختیار خیالات ہیں جو انسان کے دل میں بغیر قصد و ارادہ کے آجاتے ہیں، بلکہ اُن کے خلاف کا ارادہ کرنے پر بھی وہ آتے رہتے ہیں، ایسے غیر

اختیاری خیالات اور وساوس کو اس امت کے لئے حق تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے، اور آیت مذکور میں جس محاسبہ کا ذکر ہے اس سے مراد وہ ارادے اور نیتیں ہیں جو انسان اپنے قصد و اختیار سے اپنے دل میں جانتا ہے، اور اس کے عمل میں لانے کی کوشش بھی کرتا ہے، پھر اُفتان سے کچھ موافق پیش آجائے کی بناء پر اُن پر عمل نہیں کر سکتا، قیامت کے دن ان کا محاسبہ ہوگا پھر حق تعالیٰ جس کو چاہیں اپنے فضل و کرم سے بخش دیں، جس کو چاہیں عذاب دیں، جیسا کہ مذکورہ حدیث بخاری و مسلم میں گذر چکا ہے، اور چونکہ آیت مذکورہ کے ظاہری الفاظ میں دو قسم کے خیالات داخل ہیں خواہ اختیاری ہوں یا غیر اختیاری، اس لئے جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ کو سخت فکر و غم لاحق ہو گیا، کہ اگر غیر اختیار خیالات و وساوس پر بھی مواخذہ ہونے لگا تو کون نجات پائے گا، صحابہ کرامؓ نے اس فکر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، تو آپؐ نے سب کو یہ تلقین فرمائی کہ جو کچھ حکم ربانی نازل ہوا اس کی تعمیل و اطاعت کا بچتہ قصد کرو اور کہو: سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا، یعنی ہم نے حکم سن لیا اور تعمیل کی، صحابہ کرامؓ نے اس کے مطابق کیا اور اس پر یہ جملہ قرآن کا نازل ہوا: لَا يَخْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وَرَءَهَا، یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی قدرت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ غیر اختیار خیالات و وساوس اور خیالات پر مواخذہ نہیں ہوگا، اس پر صحابہ کرامؓ کا اطمینان ہو گیا، یہ حدیث صحیح مسلم میں بروایت ابن عباسؓ نقل کی گئی ہے (قرطبی) یہ پوری آیت آگے آرہی ہے۔

اور تفسیر مظہری میں ہے کہ انسان پر جو اعمال اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کئے گئے ہیں یا حرام کئے گئے ہیں وہ کچھ تو ظاہری اعضاء و جوارح سے متعلق ہیں، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور تمام معاملات اسی قسم میں داخل ہیں، اور کچھ اعمال و احکام وہ بھی ہیں جو انسان کے قلب اور باطن سے تعلق رکھتے ہیں، ایمان و اعتقاد کے تمام مسائل تو اسی میں داخل ہیں، اور کفر و شرک جو سب سے زیادہ حرام و ناجائز ہیں ان کا تعلق بھی انسان کے قلب سے ہی ہے، اخلاق و صفات و معتبر، قناعت سخاوت وغیرہ، اسی طرح اخلاق رذیلہ کبر، حسد، بغض، حسد و نینا جہنم وغیرہ سب چیزیں ایک درجہ میں حرام قلبی ہیں، ان سب کا تعلق بھی انسان کے اعضاء و جوارح سے نہیں بلکہ دل سے اور باطن سے ہے۔

اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے کہ جس طرح اعمال ظاہر کا حساب قیامت میں لیا جائے اسی طرح اعمال باطن کا بھی حساب ہوگا، اور خطا پر بھی مواخذہ ہوگا، یہ آیت سورہ بقرہ کے اخیر میں لائی گئی، اس میں بڑی حکمت ہے، کیونکہ سورہ بقرہ ستر آں کریم کی ایسی بڑی اور ہم سورہ

ہے جس میں احکام الہیہ کا بہت بڑا حصہ آگیا ہے، اس سورۃ میں اصولی اور فروعی معاش و معاد کے متعلق اہم ہدایات، نماز، زکوٰۃ، روزہ، قضا، حج، جہاد، طہارت، طلاق، عدت، خلع، رضاعت، حرمت شراب، زنا اور قرض الین دین کے جائز و ناجائز طریقوں کا تفصیلی بیان آگیا ہے، اسی لئے حدیث میں اس سورت کا نام سننام العتران بھی آیا ہے، یعنی مستران کا سب سے بلند حصہ، اور ان تمام احکام کی تعمیل میں سب کی روح اخلاص ہے، یعنی کسی کام کو کرنا یا اس سے بچنا دونوں خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہوں، ان میں نام و نمود یا دوسری نفسانی اغراض شامل نہ ہوں، اور یہ ظاہر ہے کہ اخلاص کا تعلق انسان کے باطن اور قلب سے ہے سب کی درستی اسی پر موقوف ہے، اس لئے سورت کے آخر میں اس آیت کے ذریعہ انسان کو تنبیہ کر دی گئی کہ فرائض کی ادائیگی یا محرمات سے پرہیز کے معاملہ میں مخلوق کے سامنے توجیل جوئی کے ذریعہ بھی راہ فرار اختیار کی جاسکتی ہے، مگر حق تعالیٰ عظیم و خیر ہے، اس سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں، اس لئے جو کچھ کرے یہ سمجھ کر کرے کہ رتبہ حفظ میرے سب ظاہری اور باطنی حالات کو کھنڈہ ہے، اور سب کا حساب قیامت کے روز دینا ہے، یہی وہ روح ہے جو قرآن کیم انسانوں میں پیدا کرتا ہے کہ ہر قانون کے اول یا آخر میں خوب خدا اور فکر آخرت کا ایسا محافظان کے قلوب پر بٹھاتا ہے کہ وہ راست کی اندھیری میں اور خلوتوں میں بھی کسی حکم کی خلاف ورزی کرتا ہوا ڈرتا ہے۔

أَمَّنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ لَمَكُلٌ آمَنَ

ان لیا رسول نے جو کچھ آتا اس پر اس کے رب کی طرف سے اور مسلمانوں نے بھی سب نے مانا

بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نَقُولُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ

اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو کہ ہم جدا نہیں کرتے

رُسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا إِنَّكَ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ الْمُصَلِّينَ

کسی کو اس کے پیغمبروں میں سے اور کہہ اٹھے کہ ہم نے سنا اور فرمان کیا تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رب تیری رحمت تو کثرت پر ہے

لَا يَكْفُلُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا دُسْعًا لَّهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ

اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی تمنا ہے، اسی کو ملتا ہے جو اس نے کیا اور اسی پر پڑتا ہے جو اس نے کیا

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِن لَّيْسَ بِآوَاخِظَانَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا

اے ہمارے رب نہ بکڑھ ہم کو اگر ہم بھولیں یا بچرکیں، اے رب ہمارے اور نہ دیکھ ہم پر بوجھ

إِصْلَٰحًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ

بہاری جیسا رکھا تھا ہم سے اگلے لوگوں پر اے رب ہمارے اور نہ اٹھوا ہم سے وہ بوجھ کہ جس

لِنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا إِنَّكَ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ وَأَمَّا حَمَانُ أَنتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا

کی بکھڑاقت نہیں اور درگزر کر ہم سے اور بخش ہو کہو اور رحم کر ہم پر تو ہی ہمارا رب ہر مدد کر ہماری

عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿۲۸۹﴾

کافروں پر

حُلاصۃ تفسیر

اعتقاد رکھتے ہیں رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اس چیز کے حق ہونے کا جو ان کے پاس لکھ رہا کی طرف سے نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور دوسرے) مؤمنین بھی (اس کا اعتقاد رکھتے ہیں، آگے قرآن پر اعتقاد رکھنے کی تفصیل ہے کہ کس کس چیز کے عقیدہ رکھنے کو قرآن پر اعتقاد رکھنا کہا جائے گا، سب کے سب (رسول بھی اور دوسرے مؤمنین بھی) عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے حق کہ وہ موجود ہے اور واحد ہے اور ذات و صفات میں کامل ہے) اور اس کے فرشتوں کے ساتھ کہ وہ موجود ہیں اور انہوں نے پاک میں اور مختلف کاموں پر مقرر ہیں، اور اس کی کتابوں کے ساتھ (کا اصل میں سب کچھ ہیں) اور اس کے پیغمبروں کے ساتھ (کہ وہ پیغمبر ہیں اور کچھ ہیں اور پیغمبروں پر عقیدہ رکھنا ان کا اس طور پر ہے کہ کہتے ہیں اگر ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں (عقیدہ رکھنے میں) تفریق نہیں کرتے کہ کسی کو پیغمبر سمجھیں یا کسی کو نہ سمجھیں) اور ان سب نے یوں کہا کہ ہم نے (آپ کا ارشاد) سنا اور (اس کو) خوشی سے مانا، ہم آپ سے بھٹکنا چاہتے ہیں اے ہمارے پروردگار اور آپ ہی کی طرف (ہم سب کو) فتنہ ہے، یعنی ہم نے جو پہلی آیت میں کہا ہے کہ نفوس کی پوشیدہ باتوں پر بھی محاسبہ ہو گا اس سے مراد امور غیر اختیار کی نہیں بلکہ صرف امور اختیار کی ہیں (کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو احکام شرعیہ میں تکلیف نہیں بناتا، یعنی ان امور کو واجب یا حرام نہیں فرماتا، مگر اسی کا جو اس کی طاقت اور اختیار میں ہو اس کو ثواب بھی اسی کا ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی کا ہو گا جو ارادہ کرے اور جو وسعت سے باہر ہے اس کا تکلیف نہیں کیا گیا اور جس کے ساتھ قصد اور ارادہ متعلق نہیں اس کا نہ ثواب ہے نہ عذاب اور وسوسہ طاقت سے خارج ہیں تو ان کے آنے کو حرام اور ان کے نہ آنے دینے کو واجب نہیں کیا، اور نہ ان پر عذاب رکھا، اے ہمارے رب ہم پر وار نہ کر نہ فرما یہ اگر ہم بھول جاویں یا بچرکیں، اے ہمارے رب ہمارے یہ بھی درگزر

ہے کہ حساب و کتاب اور جزاء و سزا افعال اختیار کے ساتھ مخصوص ہیں افعال غیر اختیاریہ کا نہ انسان مکلف ہے نہ ان پر اس کو ثواب یا عذاب ہوتا ہے۔

اسی طرح وہ افعال جن کا تعلق باطن یعنی دل کے ساتھ ہے ان کی بھی دو قسمیں ہیں ایک اختیاری ہے کفر و شرک کا عقیدہ جس کو قصد و اختیار کے ساتھ دل میں بہایا ہے، یا سوچ سمجھ کر ارادہ کے ساتھ اپنے آپ کو بڑا سمجھنا جس کو تکبر کہا جاتا ہے یا پختہ ارادہ کرنا کہ شراب پیوں گا، اور دوسرے غیر اختیاری، مثلاً بغیر قصد و ارادہ کے دل میں کسی بڑے خیال کا آجانا، ان میں بھی حساب و کتاب اور جزاء و جزا صرف اختیاری افعال پر ہی، غیر اختیاری پر نہیں۔

اس تفسیر سے جو خود قرآن نے بیان کر دی صحابہ کرام کو اطمینان ہو گیا کہ غیر اختیاری دساروں و خیالات کا حساب و کتاب اور ان پر عذاب و ثواب نہ ہوگا، اسی معنوں کو آخر میں اور زیادہ واضح کرنے کے لئے فرمایا ہے، لَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهِمَا مَا أَكْسَبْتُمْ، یعنی انسان کو ثواب بھی اس کام کا ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے اور عذاب بھی اس کام پر ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے۔

اور مراد یہ ہے کہ ابتداءً بلا واسطہ اس عمل کا ثواب یا عذاب ہوگا جو قصد و ارادہ سے کرے، کسی ایسے عمل کا ثواب و عذاب بلا واسطہ ہو جانا جس کا اس نے ارادہ نہیں کیا اس کے منافی نہیں، اس سے اس شبہ کا جواب ہو گیا کہ بعض اوقات آدمی کو بلا قصد و ارادہ بھی ثواب یا عذاب ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن شریف کی دوسری آیات اور بہت سی روایات حدیث سے ثابت ہو کر جو آدمی کوئی ایسا نیک کام کرے جس سے دوسرے لوگوں کو بھی اس نیک کی توفیق ہو جائے تو جب تک لوگ یہ نیک کام کرتے رہیں گے اس کا ثواب اس پہلے دے دئے کو بھی ملتا ہوگا، اسی طرح اگر کسی شخص نے کوئی طریقہ گناہ کا جاری کیا تو آئندہ جتنے لوگ اس گناہ میں مبتلا ہوں گے اس کا وبال اس شخص کو بھی پہنچا جس نے اول یہ طریقہ جاری کیا تھا، اسی طرح روایات حدیث سے ثابت ہو کر کہ کوئی شخص اپنے عمل کا ثواب دوسرے آدمی کو دینا چاہے تو اس کو یہ ثواب پہنچا ہے، ان سب صورتوں میں بغیر قصد و ارادہ کے انسان کو ثواب یا عذاب ہوتا ہے۔

اس شبہ کا جواب ہو کر یہ ظاہر ہے کہ یہ ثواب عذاب بلا واسطہ اس کو نہیں پہنچا، بلکہ درجہ کے واسطے سے پہنچا ہے، اس کے علاوہ جو واسطہ بنا ہے اس میں اس کے اپنے عمل اور اختیار کو بھی دخل ضرور ہے، کیونکہ جس شخص نے کسی کا ایجا دیا ہو یا اچھا یا بُرا طریقہ اختیار کیا اس میں پہلے شخص کے عمل اختیار کا دخل ضرور ہو اگرچہ اس نے اس خاص اثر کا ارادہ نہ کیا ہو، اس طرح کوئی کسی کو ایصالِ ثواب بھی کرتا ہے جب اس نے اس پر کوئی احسان کیا ہو، اس لحاظ سے یہ دوسرے کے

کے ذکر میں لایا گیا، اس کے بعد مؤمنین کے ایمان کا علیحدہ تذکرہ کیا گیا اس میں اشارہ ہے کہ اگرچہ نفسِ ایمان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سب سلطان شریک ہیں لیکن درجہ ایمان کے اعتبار سے ان دونوں میں بڑا فرق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم مشاہدہ اور سماع کی بناء پر ہے، اور دوسرے مسلمانوں کا علم ایمان بالنبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت کی بناء پر۔

اس کے بعد اس ایمان بھل کی تفصیل بتلاتی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مؤمنین میں شریک تھا کہ وہ ایمان تھا اللہ تعالیٰ کے موجود اور ایک ہونے پر اور تمام صفات کاملہ کے ساتھ متصف ہونے پر، اور فرشتوں کے موجود ہونے پر، اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور سب رسولوں کے سچے ہونے پر۔

اس کے بعد اس کی وضاحت فرمائی کہ اس اُمت کے مؤمنین پھلی امتوں کی طرح ایسا نہ کریں گے کہ اللہ کے رسولوں میں باہمی تفرق ڈالیں کہ بعض کو نبی مانیں اور بعض کو نہ مانیں، جیسے یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی مانا مگر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی نہ مانا، اس اُمت کی یہ مدح فرمائی کہ یہ اللہ کے کسی رسول کا انکار نہیں کرتے اور پھر صحابہ کرام کے اس جملہ پر ان کی تعریف کی گئی، جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے موافق زبان سے کہا تھا، بِمَعْنَا قَوْلِ الْحَقِّ عَنْ أَقْلِكَ رَبَّنَا قَوْلِ الْكِتَابِ الْتَصْلِي

اس کے بعد دوسری آیت میں ایک خاص انداز سے وہ شبہ دور کیا گیا جو پھلی آیت کے بعض جملوں سے پیدا ہو سکتا تھا کہ دل میں چبے ہوئے خیالات پر حساب ہو تو عذاب سے کیسے بچیں گے، ارشاد فرمایا لَا يَحْكُمُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وَ شَعَرَاتٍ، یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے نام نہ کام کا حکم نہیں دیتے، اس لئے غیر اختیاری طور پر جو خیالات و دوسرے دل میں آجائیں اور پھر ان پر کوئی عمل نہ ہو تو وہ سب اللہ تعالیٰ کے نزدیک معاف ہیں، حساب اور مواخذہ صرف ان افعال پر ہوگا جو اختیار اور ارادہ سے کئے جائیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ جس طرح انسان کے اعمال و افعال جو ہر آنکھ اور زبان وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کو اعمال ظاہرہ کہا جاتا ہے، ان کی دو قسمیں ہیں ایک اختیاری جو ارادہ اور اختیار سے کئے جائیں، جیسے ارادہ سے بولنا، ارادہ سے کسی کو مارنا، دوسرے غیر اختیاری جو بلا ارادہ سرزد ہو جائیں، جیسے زبان سے کہنا چاہتا تھا کچھ اور نکل گیا کچھ، یا ریشہ سے بلا اختیار ہاتھ کی حرکت ہوئی، اس سے کسی کو تکلیف پہنچ گئی، ان میں سب کو معلوم

